
رسالہ "عالمگیر" لاہور
سالانہ نمبر
The 'Alam
LAHO

عالمگیر بکڈپو کی قابلِ مطالعہ مطبوعات

یہ کتابیں اگر آپ نے ابھی تک ملاحظہ نہیں فرمائیں تو اپنی پہلی فرصت میں طلب کیجیے

اس اشتہار کو ضرور ملاحظہ فرمائیے

تین تحریکیں اس کتاب میں تاریخ اسلام کی ان تمام حشر انگیز و انقلاب پرور تحریکات کا تذکرہ ہے جن کے ایک ایک اشارے پر شہنشاہوں کو رقص کرنا پڑا۔ مصنفہ اظہر امرتسری۔ ... قیمت عہ

نادر شاہ اور ستارا اس نے قفقاز کی پہاڑیوں سے ہمالیہ کی وادیوں تک تمام سلطنتوں کو اپنے ترکمانی گھوڑے کے سموں سے روند دیا لیکن جب اس نے عشق و محبت کی وادی میں قدم رکھا؟ نادر شاہ درانی اور راجپوت دوشیزہ ستارا کا ولولہ انگیز تاریخی ناول۔ قیمت .. عہ

زرتشت اعظم کا فرمان مذہب آتش پرستی کا پیغمبر اعظم جب عشق و محبت کے میدان میں آتا ہے تو اپنے دامن عصمت کو گناہ و ہوس کی آلائشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ قیمت عہ

تاریخی افسانے تاریخ میں ایسے افسانے بھی ملتے ہیں جن کے ہیرو عظیم الشان شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود محبت سے بہرہ اندوز ہوئے اس کتاب میں تین ایسی ہی شخصیتوں کے حالات ہیں از مولانا احمد ایم سلیے قیمت عہ

روسیو کی بے باکیاں مفکر اعظم روسیو کا شمار دنیا کے مشہور فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس کی آپ بیتی ہے۔ جس میں روسیو نے اپنی رنگین و رومان پرور زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ قیمت ... ۱۲ر

ربیعہ ترکی کے مایہ ناز ادیبہ خالدہ ادیب خانم کا ایک سحر آفریں عجیب اور انقلاب انگیز ناول جس کو جناب تجلی بی کام نے شگفتہ اردو زبان کا لباس پہنایا ہے۔ ...

کتاب التقدیر علامہ ابن قیمؒ کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ جس میں مسئلہ قضا و قدر کے ہر پہلو پر عقلی و نقلی دلائل کی رو سے مثالیں پیش کی گئی ہیں جو اس قدر دلچسپ ہیں کہ آپ ساری کتاب پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔ آٹھ سو صفحات سائز قیمت رعایتی ایک روپیہ بارہ آنے۔ ...

دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل اسلامی دنیا کی سیاست پر ایک مورخانہ اور بصیرت آموز کتاب جس میں تمام اسلامی ممالک کی سیاست کا تجزیہ بہترین انداز میں کیا گیا ہے از مولانا اظہر امرتسری۔ قیمت ...

موتیوں کا درخت علامہ جرجی زیدان کا ایک شاہکار ناول جس میں ملکہ شجرۃ الدر کی رومانی زندگی کے حالات درج ہیں۔ قیمت ...

روپ متی اور باز بہادر باز بہادر اور روپ متی کی محبت کا دریا حسن و عشق میں ڈوبا ہوا تاریخ ہند کا ایک ورق از مشتر عابدی قیمت عہ

ماہ و انجم جناب کوثر چاندپوری کے وجد آفریں افسانوں کا مجموعہ، ہر افسانہ نیاز عشق اور ناز حسن کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ قیمت ایک روپے آٹھ آنے ...

تاج شاہی حسن کے قدموں میں ہسپانیہ، ناروے اور یورپ کے دوسرے بادشاہوں کی رومانی داستانیں قیمت ...

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری ... کی دو شاہکار تصانیف جنہیں آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہوں گے

عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

عالمگیر سالنامہ ۱۹۴۲ء

جلد ۳۸ — نمبر ۱

فہرست مندرجات ماہ جون ۱۹۴۲ء

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱	[illegible]		۱۱
۲	حقائق و معارف	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۳

علمی و تاریخی مقالات

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۳	[illegible] کی تحریریں	جناب مولوی عبدالقیوم ندوی	۲۵
۴	لاہور کا ایک عجیب بادشاہ	جناب پروفیسر علم الدین سالک	[illegible]
۵	سلاطین دہلی کے عہد میں آفتاب عالم کی ضیا پاشیاں	جناب خواجہ احمد فاروقی	[illegible]
۶	[illegible]	جناب سید ارشاد حسین [illegible]	[illegible]
۷	[illegible]	جناب مولوی محمد اسمٰعیل [illegible]	[illegible]

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۸	امیر معصوم [illegible]	جناب حکیم [illegible]	[illegible]

ادبی مضامین

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۹	امیر مینائی کو چند لغات [illegible]	جناب مولوی [illegible]	
۱۰	شاعروں کی باتیں	جناب ممتاز حسین [illegible]	
۱۱	[illegible]	جناب [illegible]	[illegible]
۱۲	شاد کا مرثیہ شباب	جناب [illegible]	[illegible]

افسانے اور رومان

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱۳	پرندے	جناب میرزا ادیب [illegible]	[illegible]

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
...گی	جناب احمد ندیم قاسمی	۲۹
...ی کرسی	جناب سید احسان علی شاہ	۴۲
...یزاری	جناب شفیق الرحمان	۵۲
...ش ماسٹر	جناب سالک لکھنوی	۶۵
...ے	جناب ابو محمد امام الدین رامنگری	۷۳
...رت کے گھونٹ	جناب میرزا عنبر بھوپالی	۹۰
...ت	جناب علی احمد	۱۰۲
...ایک کہانیاں محبت کی	جناب آسی رامنگری	۱۱۱
...کی ایک رات	عبدالرحیم شبلی بی کام	۱۲۱
...کی کہانی	جناب ایس-آر- باصر	۱۴۳
آسیب زدہ مکان	جناب جمیل احمد کندھاپوری	۱۶۲
...ی فسر باد	جناب قاضی محمد داد انصاری	۱۸۱

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
۲۸	مشابہات	حضرت سیماب اکبرآبادی	۲۳
۲۹	طوفان نوح	حضرت نوح ناروی	۲۸
۳۰	عشق ومذہب	حضرت امجد حیدرآبادی	۴۱
۳۱	چاندنی	حضرت سروش ملیح آبادی	۴۷
۳۲	میخانۂ محبت	حضرت فراق گورکھپوری	۵۱
۳۳	افسانے	جناب علی احمد	۶۰
۳۴	شام وسحر	حضرت ماہر القادری	۶۱
۳۵	تغیّر	جناب سید مقبول حسین احمدپوری	۷۳
۳۶	مطلع امید	جناب اعجاز صدیقی اکبرآبادی	۸۹
۳۷	راز ونیاز	حضرت راز یزدانی رامپوری	۱۰۱
۳۸	[illegible]	جناب ناز احمد ضیا جالندھری	۱۴۴
۳۹	زندگی کے ساز نغمے	حضرت شفق رضوی عادلپوری	۱۴۵
۴۰	طرز عاصمانہ	جناب عاصم جےپوری	۱۴۷
۴۱	نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا	حضرت زیبا ناروی	۱۶۱
۴۲	ایک رنگین شام	جناب محمد عتیق الکریم ساقی	۱۷۷
۴۳	جوانی لیکے آیا ہوں	جناب محمد شرف الدین سلیم	۱۹۴

منظومات

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
...فصاحت	فصاحت جنگ حضرت جلیل	۱۸
...سرور	جناب حسرت جناگڑھی	۱۷

...عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا

ملاحظات

اٹھارہ برس کے طویل عرصے میں زمانے نے ہزاروں کروٹیں بدلیں، کتابِ کائنات کے سیکڑوں ورق اُلٹے گئے۔ درجنوں انقلابات آئے اور اصلاح و تجدید کی یادگاریں چھوڑ کر جاتے رہے۔ قوموں اور ملکوں کو حوادث و سانحات کی چوٹیں کھانا پڑیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے عالمگیر نے آغازِ سفر سے منزلِ ترقی کے لئے جو راہ ڈھونڈ نکالی تھی اس پر کسی رکاوٹ اور خوف و خطرہ کے بغیر گامزن رہا اور بفضلہ تعالیٰ اسے ہر قدم پر کامیابی و کامرانی کا نیا مرحلہ ہی دکھائی دیتا رہا۔ چنانچہ اٹھارواں سالنامہ پیش خدمت ہے۔ اگر اظہارِ حقیقت کو تعلّی یا خودستائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا تو ہم اپنی خوش قسمتی پر فخر کرنے کے مستحق ہیں کیونکہ موجودہ زمانہ میں کاغذ کی کمیابی کے باعث رسائل و جرائد کا دم ناک میں آچکا ہے۔ اوّل تو کاغذ میسر ہی نہیں آتا۔ اگر میسر آئے تو ضرورت کے مطابق کافی نہیں ہو سکتا۔ ان مشکلات کے باعث ہندوستانی صحافت موت و زندگی کے دوراہے پر کھڑی ہے لیکن یہ خدائے بزرگ و کریم کا خاص کرم ہے کہ مشکلات کے پہاڑ عالمگیر کا راستہ نہیں روک سکے۔ چنانچہ زیر نظر سالنامے سے ظاہر ہے کہ رستہ جس قدر دشوار گذار ہوتا جاتا رہا ہے اسی قدر ہمارے جوشِ راہ پیمائی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے کاغذ کی کمیابی کے باوجود اور سامانِ طباعت کی گراں قیمتی کے باوصف عالمگیر کے صوری و معنوی محاسن میں وہی محاسن نظر آئیں گے جو جنگ سے پہلے اس کے لئے سرمایۂ فخر و نازش تھے۔ اس ترقی پسندانہ ہمت مندی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمیں کس قدر مالی ایثار سے کام لینا پڑتا ہے باایں ہمہ قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا، بلکہ حتی المقدور اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا مواد پیش کیا جائے۔ چنانچہ زیر نظر اشاعت میں آپ کی دماغی و ذہنی تفریح کے لئے ہر قسم کی چیزیں نظر آئیں گی۔ علمی حقائق کے ساتھ ساتھ فرحت افزا افسانے بھی دکھائی دیں گے اور تنقیدی مقالات کی "خشکی" کو منظومات کی چاشنی سے مرطوب اور مرغوب بنایا گیا ہے۔

سالانہ نمبر ۱۹۴۲ء

از:- ادارہ

مندرجات اگرچہ توصیف و ستائش سے مستغنی ہیں لیکن بعض تعارف کی غرض سے چند مقالات کا تذکرہ چھیڑا جاتا ہے۔

منصور حلاج:- یہ مولانا محمد اسماعیل ناصح کا تحقیقی مضمون ہے۔ منصور کو رندانہ تصوف کی جس روشنی میں پیش کیا جاتا رہا ہے وہ اس کے عقاید کے لئے تاریک ترین پردہ ثابت ہو چکا ہے۔ چنانچہ صوفیوں کا ایک طبقہ اس کے الحاد کو بھی نشانۂ طریقت قرار دینے کی فکر میں ہے۔ لیکن ناصح صاحب نے اس عقل فریب طلسم کو پوری طرح توڑ کر رکھ دیا ہے۔ امید ہے یہ مضمون اپنی اہمیت کے اعتبار سے مقبولیت کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

سلاطینِ دہلی کے عہد میں آفتابِ علم کی ضیا پاشیاں یہ خواجہ احمد فاروقی کا مقالہ ہے۔ موضوع اگرچہ نیا [illegible] لیکن فاروقی صاحب نے اس مسئلہ کے چند نئے پہلوؤں کو بھی [illegible] کرانے کی کوشش کی ہے لیکن اس مقصد کے لئے چند اور مقالات کی ضرورت ہے تاکہ موضوع کی وسعت کا تقاضا پورا ہو سکے۔ امید ہے فاروقی صاحب توجہ فرمائیں گے۔

خلفا و امرائے عرب کی تحریریں:- مولوی عبد[illegible] ندوی نے اس مضمون کے ذریعہ سے رؤسائے عرب کے ارشادات و خیالات کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ مقالہ اپنی افادی حیثیت کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

لاہور کا ایک بدنصیب بادشاہ:- پروفیسر محمد عالم [illegible] سالک تحقیق و تجسس کی مشعل لے کر تاریخ کی پیچ در پیچ وادیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ یہ مضمون بھی آپ ہی کی حوصلہ مند تلاش و جستجو کا مرہونِ منت ہے جس کے مطالعہ سے تاریخ لاہور کا ایک نیم ستارت ورق قارئین کے سامنے آجائے گا۔

نباتات و جمادات کا دل:- سر جگدیش چندر بوس وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے یہ ثابت کر کے کہ نباتات و معدنیات کے پہلو میں بھی انسان کی طرح دل ہوتا ہے جو خارجی و داخلی اثرات قبول کرتا ہے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے سائنسدانوں کو انگشت

[illegible] اس تعزیے کے باعث ان کو نوبل پرائز سے سرفراز [illegible] نے ان کی تصویری کا خلاصہ پیش کر کے ادو [illegible] متعارف کیا ہے۔

[illegible] زلف و گیسو میں: — [illegible] امرتسری [illegible] مضمون نگار نے امیر رحیم کے ساتھ زلف و گیسو کے [illegible] کی سیر کی ہے۔ یہ مضمون اپنی نوعیت کے اعتبار سے [illegible] میں نرالی حیثیت رکھتا ہے۔

[illegible] صحبت میں: — مولوی بشیر احمد برہان پوری [illegible] پہلوؤں اور جزئیات پر مبصرانہ نظر رکھتے ہیں۔ آپ کا [illegible] روزمرہ اور محاورہ "زباندان حلقوں سے خراج تحسین حاصل [illegible] اس تصویر کا دوسرا پہلو ہے جس میں کتوبی الفاظ [illegible] کو موضوع گفتگو قرار دیا گیا ہے علم السنہ کی تکمیل [illegible] مقالات کی اشد ضرورت ہے۔

[illegible] کی باتیں: — ماسٹر ممتاز حسین تبسل نے اس مقالے [illegible] موتیوں کو پرونے کی کوشش کی ہے جو شاعرانہ زندگی [illegible] پریشان تھے۔

[illegible] مرثیہ شباب: — جوانی اور شباب شاعروں کا مرغوب [illegible] رہا ہے اس مضمون میں جناب عطا اللہ پالوی نے شاد کے [illegible] انداز میں جائزہ لیا ہے۔

[illegible] میرزا ادیب عام طور پر ایک رومان نویس مشہور [illegible] افسانہ نگر کر میرزا صاحب نے اپنی نفسیت دانی کا ثبوت [illegible] افسانہ نگار نے اس کہانی کے ذریعہ سے ہندوستانی [illegible] اہم مسئلہ کی جانب مبذول کی ہے۔

[illegible] جناب احمد ندیم قاسمی اپنے حقیقت آشنا افسانوں [illegible] عام حاصل کر چکے ہیں۔ "بگلی" آپ کا رنگین و [illegible] ترقی یافتہ ادب کی تمام خوبیاں جلوہ

[illegible] گری: — بقول سید احسان علی شاہ [illegible] گری کی سالی کیا ہے۔ [illegible] کے ارد گرد [illegible] ہر لحاظ [illegible] توجہ اور قابل قدر ہے۔ آپ نے اس [illegible] نفسیات کا [illegible]

بیزاری: — جناب شفیق الرحمان کے مزاحی افسانے باذوق حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ آپ کا زیر نظر افسانہ ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو مزاحی چیز وں میں بالعموم ہونی چاہئیں۔ جناب شفیق کا "نبیاخبہ پن" خاص طور پر قابل داد ہے۔

اسٹیشن ماسٹر: — جناب سالک لکھنوی کا نفسیاتی افسانہ ہے جو اس مرکزی نکتہ کے گرد گھومتا ہے کہ عورت جس گھر میں داخل ہوتی ہے اسے جنت کا ایک گوشہ بنا دیتی ہے لیکن جب اس کی محبت کو ٹھکرا دیا جائے تو وہی گھر دوزخ کا نمونہ بن جاتا ہے۔

یہ تو تھے طبعزاد افسانے اور رومان لیکن سالانہ نمبر کا دامن غیر زبانوں کے تراجم سے بھی مالا مال ہے۔ چنانچہ

قلو پطرہ کی ایک رات۔ آسیب زدہ مکان۔ تنبیدے ہائے ناکامیاں محبت کی۔ عورت۔ وغیرہ

اسی ذیل کے تحت آتے ہیں۔ افسوس قلت گنجائش کے سبب ہم ان سب پر فرداً فرداً روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔ لیکن مطالعہ کے بعد قارئین کو خود ہی ان کی خوبیوں کا احساس ہو جائے گا۔

منظومات کا حصہ حسب سابق بہت بلند پایہ اور وجد آفریں ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض بہت اچھے مقالات اور افسانے جو سالانہ نمبر میں شائع ہونے کے لئے موصول ہوئے شریک اشاعت نہیں ہو سکے کیونکہ اول تو ان میں سے بیشتر مضامین تاریخ معینہ کے بعد موصول ہوئے تھے دوسرے سالانہ نمبر میں گنجائش بھی نہ تھی انشاء اللہ یہ تمام مضامین ماہ جولائی کی اشاعت میں درج کر دیئے جائیں گے۔ قارئین انتظار فرمائیں۔

[illegible]

(نوٹ [illegible] سالانہ نمبر [illegible] خریدار [illegible] قبول فرمائیے [illegible])

حقائق و معارف

سنہ ہجری

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے۔ زیادہ تر مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنین تھے۔ عرب جاہلیۃ کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی۔ اوقات و مواسم کی حفاظت اور یادداشت کے لئے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اسی سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ منجملہ سنین جاہلیۃ کے عام الفیل تھا یعنی شاہ حبش کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سنہ کے مستعمل رہا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ اہمیت خود عہد اسلام کے واقعات نے لے لی۔ صحابہ کرام کا قاعدہ تھا کہ عہد اسلامی کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگاتے۔ ہجرۃ مدینہ کے بعد پہلی سورۂ حج کی وہ آیت نازل ہوئی تھی، جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی «اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللّٰہ علی نصرھم لقدیر» (۲۲: ۴۰) اس لئے کچھ دنوں تک یہی واقعہ بطور ایک سنہ کے مستعمل رہا۔ لوگ اسے "سنہ اذن" سے تعبیر کرتے اور یہ تعبیر وقت کے ایک خاص عدد کی طرح یادداشت میں کام دیتی۔ اسی طرح سورۂ براۃ کے نزول کے بعد "سنہ براۃ" کا بھی بول چال میں رواج رہا۔ عہد نبوی کا آخری سنہ "سنۃ الوداع" تھا۔ یعنی آنحضرت (صلعم) کے آخری حج کا واقعہ جو "حجۃ الوداع" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور ہجرۃ کے دسویں سال پیش آیا تھا۔ بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سنۃ التمحیص، سنۃ الترفئہ، سنۃ الزلزال، سنۃ الاستئناس۔ بیرونی نے آثار الباقیہ میں اس طرح کے دس سنوں کا ذکر کیا ہے۔

آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہی حالت جاری رہی لیکن حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور نظم حکومت کے قیام سے حساب و کتاب کے معاملات وسیع ہو گئے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اس معاملہ پر غور کیا گیا اور

سنہ ہجری کی ابتدا

از مولینا ابوالکلام آزاد

سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک واقعہ ہجرت پر سولہ برس گزر چکے تھے۔

ضرورت کا احساس اور صحابہ کا مشورہ

سنہ ہجری کا تقرر کیونکر عمل میں آیا؟ کیوں حضرت عمرؓ اور تمام صحابہ کا ذہن اس طرف گیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا واقعہ ہجرۃ سے کی جائے؟ یہ تاریخ اسلام کا ایک ضروری اور نتیجہ خیز مبحث تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نظر و فکر سے محروم رہا۔

اس بارے میں متعدد روایتیں منقول ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن مہران کی ہے جسے تمام مؤرخین نے نقل کیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ "ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا جس پر شعبان کا مہینا درج تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا شعبان سے مقصود کونسا شعبان ہے؟ اس برس کا یا آئندہ برس کا؟ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہ کو جمع کیا اور ان سے کہا۔ اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ حساب و کتاب کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہئے۔ ان کے یہاں اس کے طریقے کیا تھے؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو بلایا۔ اس نے کہا ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے جسے "ماہ روز" کہتے ہیں۔ اسی ماہ روز کو عربی میں "مورخ" بنا لیا گیا ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لئے جو سنہ اختیار کیا جائے اس کی ابتدا کب سے ہو؟ سب نے اتفاق کیا کہ ہجرت کے برس سے کی جائے۔ چنانچہ ہجری سنہ قرار پایا۔"

ابن حبان نے قرہ بن خالد سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے۔ اس میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے ایک عامل آیا تھا۔ اس نے کہا لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے۔ اس طرح کہ فلاں بات فلاں

سنہ میں اور سنہ کے فلاں مہینے میں ہوئی؟ اس پر حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں کو اس معاملہ کا خیال ہوا۔ پہلے انھوں نے ارادہ کیا کہ آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کے وقت سے سنہ کا حساب شروع کر دیں پھر خیال ہوا کہ آپ کی وفات سے شروع کیا جائے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ہجرۃ سے سنہ کا تقرر ہو۔"

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کی روایت سے ہوتی ہے جو محب طبری نے نقل کی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ

"ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے نام خطوط آتے ہیں۔ مگر ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ اور یہ وقت وہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کر دیئے تھے اور خراج کے اصول و قواعد طے پا گئے تھے اور اس لئے محسوس کر رہے تھے کہ ضبط اوقات کے لئے ایک خاص تاریخ قرار پا جائے۔ پرانی تاریخیں موجود تھیں لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ انھیں اختیار کریں۔ ابوموسیٰ اشعری نے لکھا تو انہیں زیادہ توجہ ہوگئی۔ صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مشورہ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرۃ کا واقعہ بنیاد ٹھہرا کر سنہ ہجری اختیار کیا جائے۔"

ابو ہلال عسکری نے الاوائل میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے کہ واقعہ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علیؓ نے دی تھی وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے؟ تو حضرت علی نے فرمایا۔ اس دن سے جس دن آنحضرتؐ نے ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے۔"

یعقوبی نے بھی اسے منجملہ امور کے قرار دیا ہے جو حضرت علی کی رائے سے قرار پائے۔ ۱۶ سنہ کے واقعات میں لکھتا ہے:-

"اسی زمانہ میں حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ ضبط کتابت کے لئے ایک تاریخ قرار دے دی جائے۔ پہلے انھیں خیال ہوا آنحضرتؐ کی ولادت سے شروع کریں پھر خیال آیا کہ آپ کی بعثت کے واقعہ سے شروع کی جائے لیکن حضرت علی نے رائے دی کہ ہجرت سے شروع کیا جائے۔"

قومی سنہ کی ضرورت و اہمیت

ان روایات کے مطالعہ کے بعد ضروری ہے کہ بعض امور پر غور کیا جائے۔

سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور صحابہ نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی کہ ایک نیا سنہ قرار دیا جائے؟ امام شعبی کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ تاریخ کے تعین و تقرر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسری قوموں کی تاریخ اختیار کریں۔ بعض روایت میں جس ہرمزان کو بلانے اور مشورہ کرنے کا ذکر ہے یہ خوزستان کا بادشاہ تھا اور مسلمان ہو کر مدینہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے (بلاذری و طبری وغیرہما)

بیرونی لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ ہی بتلایا بلکہ رومیوں کے طریقہ کی بھی تشریح کی۔ ایرانیوں کے یہاں کا آخری سنہ یزدگرد کا سنہ تھا۔ اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا۔ بعض صحابہ کو خیال ہوا۔ انہی دونوں میں سے کوئی سنہ اختیار کر لیا جائے لیکن حضرت عمرؓ اور اور لوگ اس سے متفق نہ ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع صحابہ میں زیر بحث رہے۔ اور بعض نے اسے اختیار کرنے کی رائے بھی دی۔ لیکن عام رجحان اسی طرف تھا کہ اپنا سنہ مقرر کیا جائے۔

اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ سنہ کی ضرورت اور استعمال کی بڑی جگہ حساب و کتاب کے دفاتر تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے بہ اتفاق صحابہؓ دفاتر کے لئے وہی زبانیں اختیار کر لی تھیں جو پیشتر سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ ایران کے لئے فارسی، شام کے لئے سریانی، اور مصر کے لئے قبطی تھی (مسعودی و بلاذری) ظاہر ہے کہ جب دفاتر کے لئے ایران و شام کی زبانیں اختیار کر لی گئی تھیں تو قدرتی طور پر سنہ بھی وہی اختیار کر لینا تھا جو ان زبانوں کے حساب و کتاب میں رائج تھا اور اس کے قواعد بندھے چلے آتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ اور صحابہ نے ایسا نہیں کیا۔ ایران اور روم و مصر کی زبانیں اختیار کر لیں۔ مگر سنہ اپنا قائم کرنا چاہا۔ غور کرنا چاہئے اس اجتناب کی علت کیا تھی؟

یہ علت تو قطعاً نہیں ہو سکتی کہ صحابۂ کرام محض قومی تعصب اور تنگدلی کی بنا پر دوسری قوموں کی اچھی اور کارآمد باتوں سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ اولاً تو اس بارے میں خود اسلامی احکام کا یہ حال ہے کہ رکاوٹ کی جگہ صریح ترغیب دی گئی ہے۔ ثانیاً اس عہد کے بے شمار واقعات موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے تعصبات کو اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنیت میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ دنیا کے

تمام علمی و تمدنی ذخیرہ کو خواہ کسی قوم و ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنا قومی ورثہ سمجھتے تھے۔ خود اسی عہد میں حضرت عمرؓ نے بے شمار معاملات میں غیر قوموں کے علمی اور تمدنی اصول معلوم کئے ہیں اور ان میں جو باتیں کار آمد اور ضروری نظر آئی ہیں بلا تامل اختیار کر لی ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا، وہ ایرانیوں، رومیوں اور مصریوں کو باصرار طلب کراتے اور ان سے مشورہ لیتے، دفاتر حکومت کی تقسیم، خراج و محصول کا تعین، اراضی کی پیمائش اور تشخیص، خزانہ کا قیام، حساب و کتاب کے اصول و قواعد، اور اسی طرح کے بہت سے معاملات ہیں جن میں ایرانی اور رومی قواعد کا تتبع کیا گیا۔ فقہ کا ایک اہم باب فرائض ہے یعنی ورثہ کی تقسیم کے اصول و قواعد۔ چونکہ اس کا تعلق فن حساب سے ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے چاہا اس کے قواعد کی ترتیب و درستگی کے لئے ایک ماہر حساب سے مدد لی جائے۔ مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ اس غرض سے ایک رومی مسیحی مدینہ میں طلب کیا گیا تھا۔ طلبی کے فرمان میں والی شام کو جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ ہیں: "ابعث لنا برومی یقیم لنا حساب فرائضنا"، ایک رومی کو بھیج دو تاکہ وہ ہمارے فرائض کا حساب استوار کر دے (صراط مستقیم حافظ ابن تیمیہ) جب حضرت عمرؓ کو فرائض جیسے شرعی مسئلہ کے حساب میں ایک رومی عیسائی سے مدد لینا ناگوار نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ ایرانی یا رومی سنہ کے اختیار کر لینے میں قومی تعصب کیوں مانع ہوتا جس کا تعلق صرف حساب و تاریخ سے ہے؟ پس یقیناً کوئی دوسری ہی علت ہونی چاہیے جس کی وجہ سے انھوں نے ایرانی اور رومی سنین جیسے مدون و رائج سنہ چھوڑ دیئے اور ایک سنہ از سر نو قائم کیا۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام کا دماغ جس سانچے میں ڈھال دیا تھا، وہ ایسا سانچا تھا جس میں کوئی دوسرے درجہ کا خیال سما ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ صرف اول درجہ کے خیالات کے لئے تھا۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا کے تمدنی علوم و فنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بات علمی طریقوں اور مصطلحہ لفظوں میں نہ ادا کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل و صورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے، لیکن ان کی طبیعت کی افتاد اور ذہنیت کی روش کچھ اس طرح بن گئی تھی کہ جب کبھی کسی معاملہ پر سوچ بچار کرتے تھے تو خواہ علت مرتب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں لیکن دماغ جاتا اسی طرف تھا جو علم و حکمت کے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہو سکتے ہیں۔ یہی معنی ہیں انبیاء کرام کے مقام تزکیہ کے کہ "ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ" (۲: ۱۲۹) یعنی دل و دماغ کی اس طرح تربیت کر دی جاتی ہے کہ ایک موزوں اور مستقیم سانچا ڈھل جاتا ہے۔ اب جب کبھی کوئی ٹیڑھی چیز اس میں رکھی جائے گی، وہ قبول ہی نہیں کرے گا۔ صرف سیدھی اور موزوں چیزیں ہی اس میں سما سکتی ہیں!

اسلام کی تربیت نے صحابہ کے دل و دماغ میں قومی شرف و خودداری کی روح پھونک دی تھی۔ قومی زندگی کی بنیادیں جن اینٹوں پر استوار ہوتی ہیں، ان میں سے ایک ایک اینٹ کے لئے ان کے اندر پہچان اور لگاؤ تھا۔ اگرچہ وہ لفظوں اور تعبیروں میں انھیں بیان نہ کر سکیں۔ جب حضرت عمرؓ نے سنہ اور تاریخ کی ضرورت محسوس کی تو اگرچہ متمدن اقوام کے سنین رائج و مستعمل تھے، لیکن ان کی طبیعت ان کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ ایسا کرنا نہ صرف قومی شرف و خودداری کے خلاف تھا، بلکہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ کھو دینا تھی۔

قومی زندگی کی بنیادی مقومات میں سے ایک نہایت اہم چیز سنہ اور تاریخ ہے۔ جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی، وہ گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدائش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے۔ یہ اس کی قومی زندگی کی روایات قائم رکھتا اور صفحۂ عالم پر اس کے اقبال و عروج کا عنوان ثبت کر دیتا ہے۔ یہ قومی زندگی کے ظہور و عروج کی ایک جاری و قائم یادگار رہے۔ ہر طرح کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں لیکن یہ نہیں مٹ سکتی۔ کیونکہ سورج کے طلوع و غروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اس کا دامن بندھ جاتا ہے اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی رہتی ہے۔ آج آگسٹس، بکرماجیت، جلال الدین ملک شاہ، اور اکبر اعظم کے نام ان کے سنین کی بدولت ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں، اور ہمارا حافظہ ان سے گردن نہیں موڑ سکتا!

ممکن نہ تھا کہ قومی زندگی کا ایک ایسا اہم معاملہ حضرت عمرؓ اور صحابہ کے سامنے آتا اور ان کا دماغ غلط فیصلہ کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام کی دماغی تربیت غلط ہو جاتی۔ کچھ ضروری نہیں کہ انھوں نے اپنے اس احساس کی کوئی توجیہ و تعلیل بھی کی ہو۔ نتائج تعبیر اور تعلیل سے نہیں بلکہ فعل صحیح سے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے خلاف میلان

پیدا کر سکے۔ وہ باوجود غیر قوموں کی ہر طرح کی علمی و تمدنی چیزیں قبول کر لینے کے اُن کا سنہ قبول نہ کر سکے۔ خود بخود ان کی طبیعت نے فیصلہ یہی کیا کہ قومی سنہ سب سے الگ اور ایسا ہونا چاہیے جس کی بنیاد اپنی تاریخ کے کسی قومی واقعہ پر ہو۔ انھوں نے اپنے دفترو کے لیے ایرانیوں اور رومیوں کی زبان لے لی۔ ان کے حساب و کتاب کا طریقہ قبول کر لیے۔ اُن کے حساب کی مصطلحات اور اشارات سے بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن سنہ اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ یہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اپنی ہو، اور اپنے ہی ہاتھ سے رکھی جائے۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ اور اسلام نے جو ذہنیت اُن کی پیدا کر دی تھی اُسے یہی کرنا تھا۔

متاخرین کی تعلیل و توجیہہ

افسوس ہے کہ صدر اول کے مسلمانوں کی تاریخ کا چہرہ، متاخرین کی نقاشیوں سے اپنے اصلی خال و خط کھو چکا ہے۔ ہر عہد کا مورخ دراصل اپنے عہد کی دماغی آب و ہوا کا مخلوق ہوتا ہے۔ اس لیے سلف کے واقعات کی تصویر کھینچتے ہوئے اسی رنگ و روغن سے کام لیتا ہے جو اُس کے عہد کی آب و ہوا مہیا کر سکتی ہو۔ اسلام کی حقیقی اجتماعی زندگی کا اصلی دَور صحابۂ کرام کے عہد پر ختم ہو گیا۔ اور اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، اُس دَور کی معنوی خصوصیات مفقود ہوتی گئیں۔ متاخرین اہل نظر و قلم کا زمانہ آیا تو یہ وہ وقت تھا، جب صدر اوّل کی دماغی آب و ہوا کی جگہ بالکل ایک مختلف قسم کی فضا نشو و نما پا چکی تھی۔ اس لیے ان مصنفوں نے جب اُس عہد کے حالات پر قدم اُٹھایا، تو بجائے اس کے کہ اُس عہد کا ذوق و مزاج پیدا کر کے اس کا مطالعہ کرتے، اپنے عہد کے پیدا شدہ ذوق کے رنگ میں اُس کی ہر بات رنگ ڈالی۔ تاریخ ہی پر موقوف نہیں ہے، دور تک اس معاملے کے اثرات پہنچے۔ حتیٰ کہ فقہ و احکام تک کا گوشہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر صحابہ سے لے کر آخری عہد تدوین کتب تک کی کتابیں مسلسل موجود ہوتیں اور صدیوں کی ترتیب کے ساتھ ان پر نظر ڈالی جا سکتی، تو صاف نظر آ جاتا کہ صدر اول کے واقعات و معاملات کس طرح ہر عہد میں نئے نئے لباس بدلتے آئے ہیں۔ اور اُن کی تعبیر و تشریح کی جزئیات میں ہر عہد کی ذہنی خصوصیات کا پتہ موجود ہے۔ اگر آج تیرہ صدیوں کی تیرہ مسلسل تاریخیں موجود ہوتیں، تو تم انگلی رکھ کر بتلا سکتے کہ صدر اول کے ایک ہی واقعہ نے اپنی جزئیات و صورت میں کس طرح تیرہ مختلف لباس پہن لیے ہیں؟

بطور مثال اسی واقعہ پر نظر ڈالی جائے۔ امام شعبی کی روایت میں صاف موجود ہے "فلم یحب التاریخات القدیمہ" یعنی حضرت عمر ایک تاریخ کے تعین کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، مگر پسند نہیں کرتے تھے کہ قدیم تاریخیں اختیار کریں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کی تاریخ کا اختیار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور یہ معاملہ اُن کی نظر میں ایسا تھا جس کے لیے ضروری تھی کہ مسلمانوں کی ایک قومی تاریخ قرار دی جائے۔ لیکن بعد کے مورخین نے اپنے ذوق و میلان طبع کے مطابق اس کی توجیہیں شروع کر دیں۔ واقعہ کی اصلی علت پر تو نظر نہیں گئی، نئے نئے معنی پہنانے لگے۔ میں یہاں صرف دو عہدوں کی دو مختلف نظروں کا ذکر کروں گا۔

علامہ مقریزی نے نویں صدی ہجری کے اوائل میں اپنی بے نظیر تاریخ مصر لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں حضرت عمر اور صحابہ نے ایرانی اور رومی تاریخ پسند نہیں کی، کیونکہ دونوں کے حساب میں کبیسہ تھا۔ (یعنی دورۂ ارضی کی کسر پوری کرنے کے لیے چند برسوں کے بعد مہینوں کے دنوں میں کمی بیشی۔ جس طرح کہ تقویم گریگوری میں ہر چوتھے سال ایک دن کی کمی کر دی گئی ہے) چونکہ اسلام نے "نسئی" سے روکا تھا، اور کبیسہ پر "نسئی" کا شبہ ہو سکتا تھا، اس لیے مناسب نہ تھا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا۔" مورخ موصوف کو یہ دُور از کار دقیقہ سنجی اس لیے کرنی پڑی کہ قومی تقویم کی ضرورت و اہمیت کے لیے اُن کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اور چونکہ اور کوئی معقول تعلیل سمجھ میں نہیں آئی، اس لیے ناچار "نسئی" کی شرعی ممانعت کی وادی میں پہنچ گئے۔ حالانکہ کسی اعتبار سے بھی یہ تعلیل لائق اعتنا نہیں۔ اول تو یہ اُن روایات کی خلاف ہے جو اوپر گزر چکیں، کیونکہ ان میں تمام قدیم تقویموں کی ناپسندیدگی کا ذکر ہے۔ نہ کسی خاص تقویم کا۔ ثانیاً "نسئی" کا مصطلحۂ جاہلیت اور "کبیسہ" مصطلحۂ حساب قطعاً دو مختلف چیزیں ہیں۔ "نسئی" کو اسلام نے روکا اور قرآن نے کفر کی زیادتی سے تعبیر کیا، وہ یقیناً قمری مہینوں کی طبعی ترتیب کو اس طرح درہم برہم کر دینا تھا کہ کبھی شعبان، محرم بن جاتا تھا اور کبھی رمضان ذوالحجہ قرار پا جاتا تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اعمال و طاعات کے معین اوقات اُلٹ پلٹ ہو جاتے تھے۔ اور ان کے تقرر و تعین کی اہمیت و مصلحت باقی نہیں رہتی تھی۔ لیکن "کبیسہ" بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ اس کا مقصد دوسرا ہے۔ اور اس کے اجراء کے نتائج دوسرے ہیں۔ اس کا کوئی اثر اس طرح کا مرتب نہیں ہوتا۔ وہ محض اس لیے ہے کہ سال بھر کے تین سو ساٹھ دن قرار

دسے دینے کے بعد جو کسر رہ جاتی ہے اسے کچھ عرصہ کے بعد پورا کر دیا جائے تاکہ زیادہ مدت گزرنے کے بعد مہینوں اور برسوں کا فرق نہ بن جائے۔ یہاں کسی طرح بھی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ حضرت عمر اور اکابر صحابہ "نسیئی" کی حقیقت سے اس درجہ بے خبر تھے کہ تقویم کے کبیسہ کو بھی "نسئی" سمجھ لیتے یا انھیں کبیسہ پر "نسئی" کا شبہ ہو سکتا۔

یہ نویں صدی کی ابتدا تھی۔ لیکن سو برس کے بعد یعنی ہزار دسویں صدی کے اوائل میں یہی واقعہ ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی سے تقویم و سنین کے متعلق ایک سوال کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر اور صحابہ کرام نے رومی اور ایرانی سنہ اختیار کرنے سے اس لئے اجتناب کیا کہ یہ عیسائیوں اور مجوسیوں کا سنہ تھا اور اسلام نے انھیں روک دیا تھا "کہ کفار کا طور طریقہ اختیار کر کے اس کے رواج و قبولیت کا باعث نہ ہوں"۔ اب غور کرو۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟ کہاں کفار کے طور طریقہ سے اجتناب کا معاملہ، اور کہاں یہ معاملہ جو حساب و کتاب کی ایک علمی اصول و قواعد کا معاملہ ہے! حافظ موصوف نے یہ تعلیل کرتے ہوئے عہد فاروقی کی آدھی تاریخ فراموش کر دی۔ اگر اس قسم کے معاملات میں غیر قوموں سے اخذ و استفادہ جائز نہ ہوتا، تو حضرت عمر بیشمار معاملات میں ایران و روم کے قدیم انتظامات اور تمدنی طریقوں سے فائدہ اٹھانا کیوں جائز رکھتے؟ یہ صحیح ہے کہ صحابہ کرام کو غیر قوموں کی بہت سی باتوں سے اجتناب تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتوں کو روکا اور عدم اتباع و تشبہ پر زور دیا۔ مگر باتیں دوسری ہیں، اُن کا محل دوسرا ہے، مقصد دوسرا ہے، اور اثرات دوسرے ہیں۔ اس معاملہ سے اسے کیا تعلق؟

واقعۂ ہجرۃ کا اختصاص

اس جملہ معترضہ نے بہت طول کھینچا۔ بہرحال اسی معاملہ میں پہلی بات جو قابلِ غور تھی، وہ قومی سنہ کا تقرر اور اس کی اہمیت کا احساس تھا۔ بغیر کسی دور دراز توجیہہ کے اختیار کئے، یہ بات سامنے آ جاتی ہے۔ کہ حضرت عمرؓ اور اکابر صحابہ کی اس پہلو پر نظر تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ قومی زندگی کی تقویم کے لئے قومی سنہ ضروری ہے، اور اس لئے چاہئے کہ یہ باہر سے نہ لیا جائے، اندر ہی طیار کیا جائے۔

کیف و سرور

جناب وزیرزادہ شجاعت احمد خاں مہر عثمانی زیدہ مگرمہ

مجھ کو غمِ حیات سے دُور کا واسطا نہیں
اپنی خودی میں گم ہوں میں اپنا مجھے پتا نہیں

ناز و نیاز میں وہ اب پہلا سا رابطا نہیں
حُسن میں دلکشی نہیں، عشق میں حوصلا نہیں

محوِ خیالِ یار ہوں، صد گل و صد بہار ہوں
کشمکشِ حیات سے مجھ کو کوئی گلا نہیں

لذتِ غم اٹھائیے جا، ضبط کو آزمائیے جا
عشق کے کاروبار میں شکوۂ غم روا نہیں

تو ہے مدارِ زندگی، تو ہے بہارِ زندگی
تیرے بغیر زیست میں لطف نہیں مزا نہیں

اُف رے نگاہِ دل شکار دیکھا تھا اس کو ایک بار
جب سے مجھے یہ وہم ہے پہلو میں دل رہا نہیں

حُسن کو عشق سے ہے عار، عشق ہے حُسن پر نثار
میرا یہ جرم جرم ہے، اُن کی خطا خطا نہیں

موجِ فصاحت

اُن کو دیکھے اِک زمانا ہو گیا

از امام الفن، فصاحت جنگ حضرت جلیل مدظلہ

درد کا دل میں ٹھکانا ہو گیا زندگی بھر کا تماشا ہو گیا
درد دل میں کروٹیں لینے لگا کس کی آنکھوں کا اشارا ہو گیا
مبتلائے درد ہم بھی ہو گئے اُن کا ہنس دینا بہانا ہو گیا
ماہ و انجم پر نظر پڑنے لگی اُن کو دیکھے اِک زمانا ہو گیا
تیرے جلوؤں کا میں عالم کیا کہوں ایک عالم اور پیدا ہو گیا
تھے نیاز و ناز کیا کیا خواب میں کھل گئیں آنکھیں تو پردا ہو گیا
ہاتھ آیا جب سے دامانِ خیال ذرہ ذرہ ایک صحرا ہو گیا
رہ گئے تیرِ نظر کو رو کے شیشۂ دل پارا پارا ہو گیا

ذکرِ مے آیا جو گلشن میں جلیل
پھول ساغر، سرو مینا ہو گیا

پرندے

نفسیاتی افسانہ

از:- جناب میرزا ادیب بی۔ اے (آنرز)

اسے بدقسمتی کہیئے یا ہندوستانی والدین کی تربیتی فرائض سے تام طلب ناواقفیت لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں والدین بچے کی پرورش اور تعلیم ہی کو اپنا پہلا اور آخری فرض سمجھتے ہیں۔ کاش انھیں معلوم ہو جائے کہ پرورش اور تعلیم کے علاوہ بھی بچے کی طفلانہ فطرت کے کچھ مطالبات ہیں جن کی طرف توجہ نہ کرنا باغ حیات کے اس گلِ نو دمیدہ کو انتہائی بیدردی کے ساتھ کچل دینے کے مرادف ہے۔ م۔ د

گھر کے عین سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ جس کی ٹھنڈی اور فرحت بخش چھاؤں میں ننھا راجو کھٹولے پر لیٹے اور اپنا ننھا سا انگوٹھا منہ میں ڈالے ہر وقت فضائے لامحدود میں آزادانہ اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھا رہتا تھا۔ اکثر اس کی آنکھیں پرندوں کا تعاقب کرتے کرتے تھک جاتی تھیں اور اکثر درد محسوس کر کے وہ اپنی آنکھوں کو بند بھی کر لیتا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ جس وقت وہ کسی پرندے کو بلندی پر اڑتے ہوئے دیکھتا تھا تو اس کے سینے میں ایک لذت انگیز ایک میٹھی میٹھی سی گدگدی ہونے لگتی تھی۔ اور وہ بے اختیار ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں زور زور سے ہلانے لگتا تھا۔

راجو کی ماں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا بیٹا پرندوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہتا ہے۔ اس لئے اس نے درخت کی ایک شاخ سے مٹی کا ایک پیالہ لٹکا رکھا تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ اور جس کے کناروں پر اکثر پرندے بیٹھ کر پانی پیتے رہتے تھے۔ جب کوئی پرندہ پانی پی کر پھر سے اڑ جاتا تو راجو کے ہونٹوں سے خوشی کی ایک چیخ سی نکل جاتی تھی۔

راجو سے پہلے سوہن دیوی کے ہاں چار بچے پیدا ہوئے مگر بدقسمتی سے چاروں کے چاروں کسی نہ کسی بھیانک مرض کا شکار ہو کر یکے بعد دیگرے ماں کی گود خالی کر گئے۔ اور اب راجو ہی اولاد کی بھوکی ماں کی تمام آرزوؤں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ماں کی طرح باپ بھی اپنے لختِ جگر کو دیکھ کر جیتا تھا اور دونوں کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ ان کا بچہ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے موجود رہے۔۔۔ مکند لال دفتر جاتے وقت بیوی سے کہہ جاتا۔ "بچے کا خاص خیال رکھنا۔ اور اسے کسی کے گھر میں لیکر نہ جانا۔ میرا مطلب ہے لوگوں کی بُری نظر سے بچائے" اور اس کے جواب میں سوہن دیوی بچے کے ننھے جسم کو اپنے سینے سے لگا کر اس طرح بھینچ لیتی تھی کہ بچہ حیران ہو کر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگتا تھا۔

اسی طرح ماں باپ کی عزیز ترین تمناؤں کے گہوارے میں جھولتا ہوا راجو زندگی کی اس منزل پر پہنچ گیا جسے طفولیت کی منزل کہتے ہیں۔ اب بھی راجو بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھا رہتا تھا۔ اور جب اس کی ماں اپنی مادرانہ شفقت سے لبریز آواز میں اسے لوریاں سنا سنا کر سلانے کی کوشش کرتی، تو وہ طرح طرح کے سوالات سے اسے زچ کر دیتا۔ کبھی کہتا۔ "چندا ماموں رات کو کیوں نکلتا ہے۔ دن کو کیوں نہیں نکلتا؟" کبھی پوچھتا "چڑیاں کوّے اُڑتے ہوئے کہاں چلے جاتے ہیں؟" اور کبھی سوال کرتا "بادل کتنی دُور رہتی ہیں؟" اس کی ماں کے پاس ان تمام سوالات کا صرف ایک جواب ہوتا اور وہ تھا۔ "اب سو جاؤ بیٹا، رات کو دیر تک جاگتے رہو گے تو صبح تمھاری آنکھوں میں درد ہونے لگے گا۔ دیکھو میرے لال! دیکھو تمھارے پتا جی سو گئے ہیں"۔

"تو ماتا جی! تو بتاتی کیوں نہیں چندا ماموں ــــ"

مگر اس سے پہلے کہ راجو اپنا فقرہ دہرائے اس کے باپ کی غنودگی میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دیتی "سو رہو راجو! رات کے دس بج گئے ہیں"۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بیوی کو جھڑک کر کہتا "پاگل ہو گئی ہو تم۔ خواہ مخواہ اپنا اور اس کا سر کھپا رہی ہو"۔

راجو باپ کی آواز سن کر اور قدرے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول کر نیم روشن و نیم تاریک فضا کو دیکھنے لگتا۔ بار بار اس کے دماغ میں نئے نئے سوالات پیدا ہوتے اور جب تک وہ پوری طرح سو نہ جاتا یہ سوالات برابر اس کے دماغ کے پردوں پر پھڑپھڑاتے رہتے۔

ایک بار بسنت کی رات کو اس کے باپ نے ایک کہانی سُنائی سیلانی کی کہانی جس نے دنیا کے ہر ملک کی سیر کی تھی۔ اور ہر جگہ پہنچ کر نئی نئی چیزیں دیکھی تھیں۔ اس رات کو راجو کئی گھنٹے یہی سوچتا رہا کہ سیلانی نے کیا کیا چیزیں دیکھی ہونگی۔ کوئی چیز بڑی چمکدار ہوگی جس طرح سورج یا چاند، کوئی چیز بڑی اچھی ہوگی جس طرح ٹِک ٹِک کرتی ہوئی پتاجی کی گھڑی، اور کوئی چیز بہت بڑی ہوگی۔ بابوجی کے مکان سے بھی بڑی۔ راجو کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اس نے باپ سے پوچھا: "پتاجی! میں بھی ہر ایک چیز دیکھونگا؟" مگر اُس کا سوال باپ کے خیالوں میں ڈوب گیا۔ راجو نے ارادہ کر لیا کہ جب میں بڑا ہونگا تو ضرور دنیا کے ہر ملک کی سیر کرونگا۔ اور وہ ساری چیزیں دیکھوں گا جو پری دیکھ چکی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی راجو کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہریں دوڑنے لگیں اور اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بڑے سے پرندے کی پشت پر بیٹھ کر بہت اونچا پہنچ گیا ہے۔ ایک پری اس کے پاس سے گزر رہی ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ مگر پری مسکرا کر نظروں سے غایب ہو گئی ہے۔

راجو کی عمر سات سال کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس لئے اُس کے پتاجی نے اسے محلے کے پرائمری سکول میں داخل کر دیا۔ اس دن راجو کو بڑی خوشی ہوئی۔ سکول میں اس کے نئے نئے دوست بنے اور ان نئے دوستوں نے اُسے نئی نئی باتیں سُنائیں اور جب وہ گھر میں آیا تو ماں کو تمام باتیں سنا دیں جو اس کے دوستوں نے اُسے سنائی تھیں۔

ایک روز اس کے باپ نے انتہائی پریشانی کے عالم میں سنا کہ راجو ابھی سکول سے واپس نہیں آیا۔ پہلی جماعت کے بچوں کو گیارہ بجے چھٹی ہو جاتی تھی مگر اس وقت دو بج چکے تھے اور راجو کا کوئی پتہ نہ تھا۔ [illegible] سکول سے واپس آتے وقت ایک باغ میں سے گذرتے ہوئے اس نے راجو کو دیکھا جو دو تین لڑکوں کے پاس بیٹھا ہوا [illegible] باتیں سن رہا تھا۔

جب باپ اسے گھر لے آیا۔ ماں نے پوچھا: "راجو تو چھٹی کے بعد گھر کیوں نہیں آیا۔ دوستوں کے ساتھ باغ میں کیوں چلا گیا تھا؟"

راجو نے جواب دیا: "پیارے لال کہتا تھا میں پچھلے سال پتاجی کے ساتھ کشمیر گیا تھا۔ ماتاجی وہاں اس نے اونچے اونچے پہاڑ دیکھے، بہت سی جھیلیں دیکھی تھیں۔ اور ماتاجی کیا بتاؤں میں نے بھی کہا تھا۔ میں بھی کشمیر جاؤں گا۔" اور راجو فضا میں دیکھنے لگا۔ ایک پرندہ اڑتا ہوا بلندی کی طرف جا رہا تھا کہ عقاب نے اس پر جھپٹا مارا اور اُسے پنجے میں دبا کر آناً فاناً غایب ہو گیا۔

"راجو! آئندہ گھر سے باہر نہ جایا کرو۔"

راجو نے سہم کر باپ کی طرف دیکھا، اس کا باپ غصّے کے عالم میں اس پھول کو مسل رہا تھا جسے راجو بڑے شوق سے ایک شاخ سے توڑ لایا تھا۔ راجو کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ باپ نے اُسے گود میں اٹھا لیا اور الماری میں سے مٹھائی نکال کر اس کے مُنہ میں ڈالنے لگا۔

دوسرے دن راجو نے سکول جانے کے لئے انتہائی اصرار کیا لیکن اس کا پتا تو ٹھان چکا تھا کہ کسی حالت میں بھی اپنے پیارے بچے کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیگا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہیں اس کے لختِ جگر کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

چار پانچ روز کے بعد ایک پنڈت اسے گھر آ کر پڑھانے لگا۔ جب شام کے وقت وہ گھر کی بوڑھی اور راپاہج لالٹین کی مفلوج روشنی میں اپنا آموختہ یاد کرنے کے لئے کتاب کھولتا تو اس کے ننھے سے سینے میں ایک کسک سی ہونے لگتی۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتا۔ اس وقت اس کا اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ پرندوں کی طرح فضا میں ہر طرف اُڑتا پھرے۔ تاریکی میں غایب ہوتے ہوئے پرندوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ واپس آ کر اپنی چوکی پر بیٹھ جاتا۔ اس کا دل پنجرے میں گرفتار پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا۔ اور اس کی نگاہوں کو ٹیڑھے ترچھے بھیانک حروف کی زنجیریں جکڑ لیتیں۔

راجو کے گھر سے کچھ فاصلے پر رائے بہادر راؤ پندر ناتھ کا شاندار مکان کھڑا تھا۔ راجو راؤ پندر ناتھ کو بابوجی کہہ کر پکارتا تھا۔ بابوجی کے چار بیٹے تھے جو شام کے پانچ بجے ایک چھوٹے سے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ راجو جب پہلے پہل ان سے ملا تو انھوں نے اسے اپنے کھیل میں شریک کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا تھا تمہارے کپڑے بڑے گندے ہیں ان سے بدبو آتی ہے۔

راجو کے دل پر ایک چرکا سا لگا۔ اُسے اپنے میلے کپڑوں سے گھن آنے لگی۔ وہ چپ چاپ گھر کی طرف جانے لگا۔ تمام راہ میں اس کے ہاتھ کی انگلیاں جیب میں پڑے ہوئے تانبے کے دو سکوں کے نمناک کناروں کو چھوتی رہیں مگر ایک بار بھی اس کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ وہ یہ روپیے اس لئے لایا تھا کہ سامنے والی دکان سے کوئی میٹھا سا رنگترا خرید کر کھائے۔

گھر میں پہنچ کر وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد

اس کی ماں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے بچے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے بہ رہے ہیں۔ ماں یہ منظر دیکھتے ہی بیتاب ہو گئی اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے کے دامن سے بچے کے آنسو پونچھے اور اس کی پیشانی پر بوسوں کی بارش کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں! میں مر جاؤں! کیا ہوا میرے لال کو! کس نے مارا ہے؟ قربان کروں اسے تم پر۔"

راجو نے اپنے نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے درمیان جہاں پیار کرتے وقت اس کی ماں کے منہ سے ننھی سی تھوک اڑ کر گر پڑی تھی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیری اور کہنے لگا۔ "ماتا جی! میرے کپڑے میلے ہیں، ان سے بدبو آتی ہے تو مجھے نئے کپڑے کیوں نہیں پہناتی؟"

"بس اس لئے روتا ہے میرا لاڈلا؟"

"انھوں نے کہا ہے 'تیرے کپڑے میلے ہیں۔ ہم تجھے نہیں کھیلنے دیتے۔'" اور راجو اپنی عادت کے مطابق نچلا ہونٹ لٹکا کر ناک کی رطوبت پیچھے کھینچتے ہوئے شوں شوں کی سی آواز پیدا کرنے لگا۔

"اچھا — بچہ! میں تجھے ابھی نئے کپڑے پہناتی ہوں۔ دفع کرو انھیں۔ بڑے امیر کے کہیں کے۔"

اور دوسرے دن راجو میدان میں جا کر بابو جی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اب وہ بہت خوش تھا کیونکہ اسے نئے دوست مل گئے تھے۔ کھیلنے کے بعد جب وہ بابو جی کے گھر کے پیچھے جا کر بیٹھتا تھا اور فضا میں آزادانہ اڑتے ہوئے پرندوں کے دلکش نغمے سنتا تھا تو اس کے سینے میں اسی قسم کی گدگدی سی محسوس ہونے لگتی تھی جیسے وہ عالم شیر خوارگی میں محسوس کیا کرتا تھا۔

وہ کبھی ادھر دیکھتا تھا کبھی ادھر۔ کبھی افق کے دامن میں لہراتے ہوئے بادلوں پر نگاہیں گاڑ دیتا تھا اور کبھی دور درختوں کی قطاروں میں سے گذرتی ہوئی دریا کی سفید لکیر کو دیکھنے لگتا تھا اس کی آنکھیں ایک پراسرار مسرت سے چمکنے لگتی تھیں۔ اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اڑ کر اس وسیع دنیا میں ہر جگہ پہنچ جائے۔ آسمان، تارے، چاند، دریا، الغرض ہر چیز کے قریب پہنچ کر اسے دیکھے، وہ اپنے دوستوں سے کہتا تھا "ننھے ننھے پرندے اپنے بچوں کو پروں پر بٹھا کر [illegible] لے جاتے ہیں۔ ہم بھی کسی دن پرندے [illegible] لے جائیں گے۔ پھر ہم خوب سیر کریں گے۔"

اور پھر بابو جی کے بچوں کے ذہن میں ان تمام پرندوں کے قصوں [illegible] وہ کتابوں میں پڑھ چکے تھے اور جن میں پرندوں نے یا پریوں نے بچوں کو نئے نئے ملکوں کی سیر کرائی تھی۔

"میں ہر ملک کی سیر کروں گا۔ نئے نئے دوست بناؤں گا۔" راجو خوش ہو کر کہتا تھا۔ اور یہ خیال اس کے دماغ میں اس طرح لہریں لینے لگتا تھا۔ جس طرح کسی شفاف چشمے میں چودھویں کے چاند کی سیمیں شعاعیں ناچ رہی ہوں۔

ایک دن کسی بات پر راجو اور اس کے دوستوں کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا۔ چاروں بھائیوں نے اسے مارا اور کہہ دیا آئندہ ہمارے ساتھ مت کھیلا کرو۔ راجو گھر آیا اور جب اس نے یہ واقعہ اپنے باپ کو سنایا تو باپ بولا۔

"بیٹا ان کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔ امیر آدمیوں کے بچے غریب آدمیوں کے بچوں سے کھیلنا پسند نہیں کرتے اور نہ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" راجو کھلے ہوئے منہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو دیکھنے لگا۔

کندلال کے لئے یہ باتیں کر کے بیٹے کو اس کے امیر دوستوں سے علیحدہ کرنا ایک نہایت معمولی بات تھی۔ گویا اس نے ایک حقیر پھول کو مسل دیا ہو۔ مگر یہ باتیں سن کر بچے کے دل کو کتنا صدمہ ہوا اس کا اندازہ صرف بچے کا دل ہی کر سکتا تھا۔

"اب منہ ہاتھ دھو کر بیٹھ جاؤ میں تمہارے لئے مٹھائی لاتا ہوں۔" کندلال یہ الفاظ کہہ کر اٹھا۔ اور یہ خیال کر کے کہ بیٹا مٹھائی کا ذکر سن کر بہت خوش ہو گیا ہے تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ تمام رات راجو نے بے چینی کے عالم میں گذار دی۔ باپ کے الفاظ بار بار اس کے معصوم دماغ میں ٹکراتے رہے۔ مگر ابھی تک وہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ امیر بچے غریب بچوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا امیر بچے غریب بچوں سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ غریب بچوں کے کپڑے میلے ہوتے ہیں اور ان سے بو آتی ہے اسے اپنے ارد گرد ہر چیز میلی نظر آنے لگی۔ اسے ہر چیز سے گھن آنے لگی بوڑھی اپاہج لالٹین۔ چھت کی کالی کالی کڑیاں اور اس کا میلا کچیلا بستر ——— اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ——— جب آنکھ کھلی تو اس کی نظر میلے کرتے پر پڑی۔ اس نے کرتے کا دامن ناک سے لگایا۔ مٹی کے تیل کی سی بدبو اس کے دماغ میں گھس گئی۔ اس نے جلدی سے کرتا اتارا اور اسے لپیٹ کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو اس نے پنڈت جی سے سبق لیتے وقت پوچھا۔

"امیر بچے غریب بچوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

اس پر پنڈت جی نے اپنی عینک کے اوپر سے بچے کے کملائے ہوئے اور متفکر چہرے کو دیکھا۔ اور ہاتھ میں چھڑی گھماتے ہوئے کہا۔

"نفرت! ہاں کرتے ہیں لیکن تجھے کیا؟"

"کیوں؟" راجو چلایا!

پنڈت جی کی زردی مائل مکروہ پیشانی شکن آلود ہوگئی اور انھوں نے جواب دینے کی بجائے کتاب کھول کر اپنے شاگرد کے سامنے رکھدی۔ راجو نے صفحے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ بھیانک حروف سوئیاں بن بن کر اس کی آنکھوں میں چبھنے لگے اس نے کتاب کے صفحے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "ماتا جی کہتی ہیں سارے لوگوں کو بھگوان دولت دیتا ہے۔" پھر

"اب سبق پڑھ بچے اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے"

… جی نے ڈانٹ پلائی۔ بچہ سہم کر پڑھنے لگا۔ مگر رہ رہ کر … ہیں خیال آتا تھا کہ ایسا سوال پوچھ کر اس نے کوئی قصور کیا … ہے اسی لئے پنڈت جی نے کہا ہے بچے اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے اس کے دماغ میں ایک کشمکش سی برپا ہوگئی۔ خود سوال کرتا۔ خود اس کا جواب دیتا۔ یہاں تک کہ فضا میں ایک پرندے کی صدا گونجی۔ راجو نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری اور نیم کے درخت کی ایک شاخ پر پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے کو دیکھنے لگا۔ دوسرے دن جب وہ بیدار ہوا تو اس کا بدن گرم تھا۔ ماں باپ دونوں پریشان ہوگئے۔ مکند لال بیوی سے کہنے لگا۔ "میں نے تمھیں ایک بار نہیں کئی بار کہا تھا کہ اسے گھر سے باہر نہ جانے دیا کرو۔ ہر روز ٹیلے پر جا چڑھتا ہے مگر تم سمجھتی ہی نہیں۔"

اب راجو صبح شام گھر کی چار دیواری میں پڑا رہتا تھا۔ اس کا باپ ہر روز دفتر سے آتے ہوئے طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھلونے خرید کر لے آتا تھا۔ ایک ماہ گذر گیا مگر اس کی حالت میں کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ روز بروز اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔

ایک دن وہ درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹا تھا کہ اسے پھڑ پھڑ کی سی آواز سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ درخت کی شاخ سے لٹکے ہوئے پیالے میں پانی کی بوندیں اڑ اڑ کر گر رہی تھیں۔ کمزور ہونے کے باوجود اس نے چارپائی کے اوپر کرسی رکھی اور کرسی پر چڑھ کر پیالے تک پہنچ گیا۔ پیالے کے اندر چڑیا کا بچہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اس نے بچے کو پکڑ لیا اور نیچے اتر آیا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ بچے کی چونچ اپنے منہ سے لگا کر اسے حرارت پہنچاتا رہا۔ ماں جب گھر میں آئی تو اس نے بہتیرا کہا۔ بیٹا اسے چھوڑ دو۔ مگر راجو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "ماتا جی! امیر چڑیوں کے بچے غریب چڑیوں کے بچوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ اسے ماریں گے۔"

ماں نے حیران ہو کر کہا۔ "میرے لال! پرندے کھلی ہوا میں خوش رہتے ہیں۔ اگر انھیں گرفتار کر لیں تو بیچارے گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔"

بچے نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

چار پانچ روز کے بعد راجو نے پرندے کو اڑا دیا۔ وہ فضا میں اڑتا ہوا چشم زدن میں نظروں سے چھپ گیا، وسیع، لامحدود فضا میں آزادانہ اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر ایک بار پھر راجو کے سینے میں ایک لذت انگیز —— ایک میٹھی میٹھی سی گدگدی ہونے لگی، یہاں تک کہ فضا —— ہر طرف اڑتے ہوئے پرندے —— نیم کے درخت سے لٹکا ہوا مٹی کا پیالہ —— سب کچھ آہستہ آہستہ اندھیرے میں غائب ہونے لگا۔

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر کیجیے

مشاہدات

ظلمت میں ہم آثارِ سحر دیکھ رہے ہیں!

از حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی

اب تک نگراں جانبِ در دیکھ رہے ہیں
صورت مری، آثارِ سحر دیکھ رہے ہیں

وہ جانبِ دل، سوئے جگر دیکھ رہے ہیں
ہم شوخیٔ اندازِ نظر دیکھ رہے ہیں

انساں کی زد انسان ہی پر دیکھ رہے ہیں
کیا دیکھ رہے ہیں وہ۔ اگر دیکھ رہے ہیں

اک سعیٔ مسلسل کا اثر دیکھ رہے ہیں
ظلمت میں ہم آثارِ سحر دیکھ رہے ہیں

جلوہ ترا محدود نہیں، خیر نہ ہوگا
ہم تو اسے تا حدِّ نظر دیکھ رہے ہیں

کیا جانئے یہ رہگیر ہیں، رہبر ہیں، کہ رہزن
اک بھیڑ سرِ راہگذر دیکھ رہے ہیں

اے ذوقِ نیاز ان کو تری قدر ہو کیونکر
سجدے نہیں، وہ پاؤں پہ سر دیکھ رہے ہیں

پامرد جو تھے منزلِ مقصود کو پہنچے
ہم نقش سرِ راہگذر دیکھ رہے ہیں

اے اہلِ چمن، خانہ براندازوں سے ہشیار
یہ دیکھتے رہنا وہ کدھر دیکھ رہے ہیں

پہلے تو نشیمن کی تباہی پہ نظر تھی
اب حوصلۂ برق و شرر دیکھ رہے ہیں

آئینہ بنا کر تری تصویرِ حسیں کو
اپنی نگہِ جلوہ نگر دیکھ رہے ہیں

ملتی ہے نظر ان سے تو ہوتا ہے یہ محسوس
جیسے وہ مری تابِ نظر دیکھ رہے ہیں

یہ تشنگیٔ دید، یہ طوفانِ تجلّی!
آنکھیں نہیں کھلتی ہیں مگر دیکھ رہے ہیں

عالم جو مقدر میں ہے بے بال و پری کا
پہلے ہی سے ہم نوچ کے پر دیکھ رہے ہیں

میں اوجِ ثریا سے پرے دیکھ رہا ہوں
تارے مری پروازِ نظر دیکھ رہے ہیں

بجھنا نہ ابھی چاندنی راتوں کے دھندلکو
اک پھانس ہے پیوستِ جگر دیکھ رہے ہیں

گلشن سے بہت دور، قفس سے بھی بہت دور
ہم ایک نئی شان کا گھر دیکھ رہے ہیں

جلووں کی تماشائی کبھی تھی نظر اپنی
اب جلوے تماشائے نظر دیکھ رہے ہیں

پوچھو مری پرواز کا انداز انہی سے
یہ لوگ جو ٹوٹے ہوئے پر دیکھ رہے ہیں

پھر عالمِ انساں میں ہے امکانِ تجلّی!
لیکن وہ ابھی ظرفِ نظر دیکھ رہے ہیں

ہے جذبۂ آزادیٔ گلشن بھی عجب چیز
اپنا ہی ہر اک شاخ پہ گھر دیکھ رہے ہیں

دیکھیں گے تری سمت بھی ہم اے نگہِ ناز
بالفعل تو اپنی ہی نظر دیکھ رہے ہیں

سیماب میں آئینۂ بزمِ رفقا ہوں
احباب مرا عیب و ہنر دیکھ رہے ہیں

دارالصحت رجسٹرڈ حکیم مولوی محمد نذیر انچارج پی مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظمگڈھ کے بے نظیر تحفے

قدرتی تیل رجسٹرڈ

قدرتی تیل رجسٹرڈ کی ایجاد سنہ ۱۹۰۳ء میں ہوئی ثلث ہی صدی میں اپنے بیش بہا فوائد کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہو گیا ہے۔ چنانچہ معزز ہندوستانی حکما، ڈاکٹر اور ویدصاحبان کے علاوہ ولایت کے کئی ڈاکٹروں نے بھی سرٹیفکیٹ دیئے ہیں اور اکثر اپنے مطب میں برتتے اور خاطرخواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تیل جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے ہر قسم کے دردمیں اکسیر اور فوری فائدہ دکھاتا ہے۔ بدن پر مالش کرکے نہانا خون بیماری کے نقصان اور موسمی بخار، سردی اور زکام سے محفوظ رکھتا ہے اور بدن کو چست اور قوی بناتا ہے سر پر مالش کرنے سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے بال نرم اور چمکدار ہو جاتے ہیں اور قبل از وقت سفید نہیں ہوتے۔ نزلہ زکام تر کھانسی سر آنکھ کان، دانت کمر اسپند کے درد، چوٹ، خراش، آگ سے جلنے، مستورات کے وضع حمل اور کمزور بچوں کے واسطے تریاق ہے۔ ہمارا قدرتی تیل رجسٹرڈ ہے اسلئے حریص نقال قدرتی تیل کا نام تو اپنے اشتہار میں لکھ نہیں سکتے مگر ہر ممکن طریقہ سے پبلک کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارا ہی مال بہتر ہے لہذا معزز پبلک سے درخواست ہے کہ قدرتی تیل کی خریداری میں بہت احتیاط سے کام لیں اور جب قدرتی تیل کی ضرورت ہو براہ راست کارخانہ ہذا سے طلب کریں تاکہ دھوکے سے محفوظ رہیں۔ ایک پاؤ سے کم قدرتی تیل رجسٹرڈ پارسل نہیں ہوگا قدرتی تیل مختلف شیشیوں میں پبلک بھی ملتا ہے قیمت فی سیر چار روپے علاوہ پیکنگ و محصولڈاک وغیرہ۔

روغن بہار رجسٹرڈ

جسمانی صحت کا دارومدار دماغی صحت پر ہے کامیاب زندگی اور کام کو پوری توجہ سے کرنے کے لئے دماغی سکون کی نہایت ضرورت ہے اور دماغی سکون حاصل کرنے کے واسطے حکیموں اور ڈاکٹروں کا قول ہے کہ مقوی دماغ و مفرح طبع اور خوشبودار تیل استعمال کیا جائے چنانچہ آجکل مختلف قسم کے خوشبودار تیل رائج ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کے استعمال سے فائدہ نہیں ہوتا جو دماغ کے لئے ضروری ہے۔ روغن بہار میں تمام خوبیوں کا حامل ہے جو کہ بالوں کو ضرورت ہے اور تمام معزز اجزاء سے پاک خالص سفید تل کے تیل سے تیار کیا جاتا ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس میں مضر ثابت کرنے والے کو ایک سو روپیہ نقد انعام ملے گا۔ اسکے مستقل استعمال سے ہمیشہ کے واسطے امراض دماغی سے نجات ہو جاتی ہے دماغی کام کرنیوالے معزز حضرات اور طلباء کیلئے ایک بیش بہا اور نادر تحفہ ہے بالوں کے بڑھانے میں لاجواب ہے، ان کے قدرتی رنگ کو قائم رکھتا ہے، ملائم خوبصورت اور چمکدار بناتا ہے آزمائش شرط ہے

قیمت فی سیر چھ روپے، علاوہ محصولڈاک وغیرہ

معجون بے نظیر رجسٹرڈ ← موسم سرما کا بے نظیر تحفہ

ہندوستان کی شدید گرمی سے صحت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کا بہترین موقع موسم سرما آگیا ہے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے جسمانی کمزوری کو دور کرنے کیلئے دارالصحت رجسٹرڈ مئو ناتھ بھنجن کا تیار کردہ معجون بے نظیر رجسٹرڈ استعمال فرمایئے جو صبح کا خوشگوار اور لذیذ ناشتہ بھی ہے۔ یہ معجون سالہا سال تک ہزاروں آدمیوں پر تجربہ کرنے کے بعد ۱۵ برس سے پبلک میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا مقوی اور مقوی باہ ہے۔ جملہ اعضائے رئیسہ کو قوت دیتا ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے اور جسم کے وزن کو بڑھاتا ہے۔ حرارت غریزی کی حفاظت کرتا ہے۔ تمام جسمانی کمزوری و لاغری کو دور کرکے جسم کو فربہ اور چہرہ کی رنگت کو نکھارتا ہے۔ دل و دماغ میں عجیب فرحت اور قوت پیدا کرتا ہے۔ طبیعت ہر وقت بشاش رہتی ہے۔ اس معجون میں ایسے اجزا شامل کئے گئے ہیں جو قبض کو دور کرکے معدہ کو قوت دیتا ہے جس سے ہاضمہ درست ہو جاتا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ تجربہ کیجئے آپ خود ہی اس کے فوائد کی تصدیق فرمائیں گے۔

نوٹ:۔ آدھ سیر سے کم نہیں روانہ ہوگا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر دارالصحت رجسٹرڈ مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ!

خلفاء و اُمرائے عرب کی تحریریں!

ایک نادر مقالہ

از:- الحاج مولوی عبدالقیوم ندوی

عرب خلفا اور اُمرا اگر ایک طرف ملکی معاملات اور سیاسی اقتدار و قوت کے سرتاج تھے تو دوسری طرف علوم و فنون اور ادبی و بزمی دنیا کے بھی امام و پیشوا تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ رزم و بزم کے مجموعہ اور سیاست و حکمت، علوم و معرفت کے نایاب و نادر مرقع تھے۔ ہم ذیل میں ان کی تحریرات کے چند نمونے پیش کرتے ہیں جن سے ان کی عظمت و جلالت، اور علمی ادبی اور سیاسی قابلیت و بیدار مغزی کا پتہ ملتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مختصر سی ایک سطری عبارت اپنے اندر وہ جامعیت و وسعت رکھتی تھی جو رسائل اور کتب کے ذریعہ سے بھی ادا نہیں ہو سکتی۔ اس موقع پر ہم صرف انہی عبارتوں کا ذکر کرینگے جو کسی درخواست یا سوال یا کسی حاکم کے نام حکم یا کسی اور خاص موقع پر لکھوائی گئیں۔ ان کی قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اکثر ایک ایک پونڈ کی قیمت پر فروخت ہوئیں اور جن درخواستوں پر اس قسم کی تحریریں ہوتیں وہ اس سرعت کے ساتھ بازار میں فروخت ہوتیں کہ قدردان تلاش ہی کرتے رہ جاتے۔ یہ عبارتیں جیسے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتیں عوام و خواص میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر جاتی تھیں (المقتطف جلد نہم مصر)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر ایک مختصر مگر جامع خطبہ ارشاد فرمایا اور آخر میں فرمایا سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ: عنقریب ظالم جان لینگے کہ وہ کس انقلاب میں اُلٹے جائینگے۔ یہ اگرچہ قرآن حکیم ہی کی ایک آیت ہے مگر خلیفہ کے مُنہ سے ایک خاص موقع پر نکل کر وہ شہرت حاصل کی کہ عوام و خواص کے درمیان عرصہ دراز تک جزو کلام بنی رہی۔ جہاں کسی کو کوئی دکھ پہنچتا یہ آیت شریف اس کے مُنہ پر ہوتی۔ (المدنیۃ والاسلام ڈاکٹر لطفی مصری)

ایک مرتبہ فاتح ایران حضرت سعد ابن ابی وقاص نے امیر المومنین حضرت عمر فاروق کے پاس مکان بنوانے کی درخواست بھیجی حضرت عمر نے اس پر صرف یہ عبارت تحریر فرمائی۔ اِبْنِ مَا يَكْفِيكَ

مِنَ الْحَرِّ وَالْمَطَرِ۔ ترجمہ: تو ایسا مکان بنالے جو تجھے گرمی اور بارش کی تکلیف سے بچا سکے۔ (ابن جریر طبری تذکرہ عمر ابن الخطابؓ)۔

حضرت عمرو ابن العاص فاتح مصر و روم و والی مصر کی متعدد شکایات جب بارگاہ فاروقی میں پہنچیں تو آپ نے عمرو ابن العاص کو اس مختصر سی عبارت میں رعایا پروری اور بیدار مغزی کا سب سے بلند تر سبق سکھایا۔ كُنْ لِرَعِيَّتِكَ كَمَا تُحِبُّ أَنْ يَكُونَ أَمِيرُكَ۔ تو اپنی رعایا کے لئے ایسا ہو جا جس طرح تو چاہتا ہے کہ تیرا امیر ہو۔ (تاریخ خضری جلد دوم)

عقد الفرید میں علامہ ابن عبدربہ نے لکھا ہے کہ یہ تحریر بعد میں کئی ہزار دینار سُرخ کو فروخت ہوئی۔ (عقد الفرید ابن عبدربہ)

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کا مروان بن الحکم بڑا محبوب اور معتمد امیر تھا۔ لوگوں نے اس کی بیحد شکایات لکھیں مگر آپ کی تحقیقات میں وہ زیادہ صحیح نہ تھیں۔ آپ نے ایک شکایت نامہ پر یہ آیت تحریر کر کے مروان کے پاس بھجوا دی۔ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ۔ ترجمہ: پس اگر وہ تیری نافرمانی کریں تو کہدے کہ میں تمھارے کاموں سے بری الذمہ ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ دنیائے بلاغت کے امام و تاجدار تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ نہج البلاغۃ کے مطالعہ سے جو آپ کے خطبات کا مجموعہ مشہور ہے آپ کی بلاغت و فصاحت کا اندازہ ہوتا ہے ایک مرتبہ آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسنؓ نے کسی معاملہ کے متعلق درخواست دی اور اس میں اپنی جرأت و شجاعت کا بھی تذکرہ کیا۔ حضرت علی نے اپنے دست مبارک سے یہ عبارت تحریر کر دی۔ رَأْيُ الشَّيْخِ خَيْرٌ مِنْ جَلَدِ الْغُلَامِ۔ بزرگ کی رائے نوجوان کی بہادری سے کہیں بہتر ہے۔ (کتاب الاغانی)

ایک مرتبہ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک خط کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ قیامت میں حساب کتاب کیونکر ہوگا؟ اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ عبارت تحریر کر کے قاصد کے

حوالے کر دی یُحَاسَبُوْنَ کَمَا یُرْزَقُوْنَ ان سے حساب کتاب اس طرح ہوگا جس طرح اُن کو رزق دیا جاتا ہے۔ (کتاب الاغانی)

اللہ اللہ! اس ذرا سی عبارت میں کیا کچھ نہیں فرما دیا!

حضرت امیر معاویہ کی خدمت میں ابن عامر نے درخواست کی کہ طائف کے زرخیز علاقہ سے ان کو کچھ دیا جائے۔ آپ نے اس پر یہ تحریر فرمایا عِشْ اَخْبَاتَرِیٰ عَجَبًا۔ اگر زندہ رہے تو پسندیدہ چیز دیکھوگے۔ (سیرت معاویہ ابن ابی سفیان)

عبدالملک اموی کے دربار میں حجاج بن یوسف نے چند لوگوں کے قتل کا اجازت نامہ روانہ کیا۔ اس پر بیدار مغز خلیفہ نے تحریر کرایا ۔ من یمن السائلین ان یتاتلعت بہ المختلفون ومن شومہ ان یختلف الموتلفون والی کی عمدگی یہ ہے کہ لڑتے ہوئے مل جائیں اور اس کی خرابی یہ ہے کہ ملے ہوئے لڑ پڑیں (احیا الاموی)

سلیمان بن عبدالملک بنو امیہ میں نامور خلیفہ مانا گیا ہے۔ اس کے حریف اور بد مقابل قتیبہ ابن مسلم نے معزولی کی دھمکی دی اس پر اس نے کسی مشہور شاعر کا یہ شعر لکھ کر روانہ کر دیا ؎

زعم الفرزدق ان سیقتل مربعا
فابشر بطول سلامتہ یا مربع

ترجمہ:۔ فرزدق نے گمان کیا کہ مربع قتل ہوگا۔ تو خوشخبری سنا کہ وہ لمبی اور خوشگوار زندگی پائیگا۔ (تاریخ الخلفاء)

قتیبہ بن مسلم نے دوبارہ دھمکی دی تو آپ نے سورہ آل عمران کی یہ آیت تحریر کر دی ۔ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُہُمْ شَیْئًا اگر تم نے صبر کیا اور بچتے رہے تو ان کا مکر تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ (آل عمران)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بنو امیہ میں حضرت عثمانؓ کے بعد سب سے زیادہ بزرگ متقی اور کتاب و سنت پر سب سے زیادہ عامل خلیفہ گزرے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی گورنر نے آپ کی خدمت میں شہر کو نئے سرے سے آباد کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا۔ اِبْنِہَا بِالْعَدْلِ وَنَقِّ طُرُقَہَا مِنَ الظُّلْمِ تو اسے عدل سے آباد کر اور اس کے راستوں کو ظلم سے صاف کر دے۔ علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ یہ تحریر تین ہزار دینار کو فروخت ہوئی اور عرصہ تک حکومت کا دستور اساسی بنی رہی (ابن خلکان)

عراق میں ایک مرتبہ بغاوت اور سرکشی کے آثار ظاہر ہوئے حاکم نے شکایت لکھ بھیجی۔ آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ اِرْضَ لِلنَّاسِ مَا تَرْضٰی لِنَفْسِكَ وَخُذْ بِجَرَائِمِہِمْ بَعْدَ ذَالِكَ۔ تو ان کے لئے وہ پسند کر جو اپنے لئے چاہتا ہے۔ پھر اس کے بعد ان کے جرموں پر گرفت کر۔ (سیرۃ الخلفاء والملوک)

اللہ اکبر! کس قدر رعایا نوازی، حلم، سیاسی بیداری اور بلند اخلاق کی تعلیم ہے۔ پھر چند لفظوں اور حرفوں میں! مورخین نے لکھا ہے ان چند الفاظ نے راعی و رعایا کے تعلقات پر وہ اثر ڈالا کہ زبردست خزانہ اور لاتعداد فوج سے بھی ممکن نہ تھا۔ سرکشی دور ہو گئی اور آثار بغاوت عنقا ہو گئے۔

خلیفہ عباس سفاح نے جب ۱۳۲ھ میں سلطنت بنی امیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر خلافت عباسیہ کی بنیاد رکھی اور دارالخلافہ کی تعمیر شروع کرائی تو بیشمار درخواستیں اس کے پاس آئیں کہ عاملوں نے رعایا کے مکانات غصب کر کے حکومت کے محلوں میں شامل کر لئے ہیں۔ سفاح اس پر بہت ناراض ہوا اور لکھا کہ ہٰذَا بِنَاءٌ اُسِّسَ عَلٰی غَیْرِ تَقْوٰی۔ یہ وہ تعمیر ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر نہیں رکھی گئی اور یہ لکھوا کر یا تو مکانات شامل شدہ واپس کرائے یا پھر ان کا معقول معاوضہ ادا کر دیا۔ (مروج الذہب علامہ مسعودی)

خلیفہ جعفر منصور کو کسی نے گورنر کی شکایت لکھی تو جواب میں تحریر کیا۔ "کما تکونوا یولیٰ" جیسے تم ہوگے ویسی حکومت ہوگی۔

خلیفہ مہدی عباسی ایک دن سیر و شکار کو جا رہا تھا کہ حاکم آرمینیا کے قاصد نے ایک طویل تحریر دی جس میں آرمینیا کی تباہی کا روح فرسا تذکرہ تھا۔ مہدی نے قرآن کریم کی یہ آیت لکھ دی اور شکار کو چلا گیا۔ "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاہِلِیْنَ" معافی کو شعار بناؤ۔ نیکیوں کا حکم کرو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

جب آپ کے پاس آپ کے خراسانی حاکم کی غفلت کی شکایت پہنچی تو اس حاکم کو ان الفاظ میں تنبیہ کی۔ اَنَا سَاہِرٌ وَّ اَنْتَ نَائِمٌ۔ میں تو بیدار ہوں اور تو سو رہا ہے۔ (شذرات الذہب)

خلیفہ ہارون الرشید خلفاء عباسیہ میں علمی اور مذہبی اعتبارات سے امتیازی شان کا مالک ہے۔ اس کا دستور تھا کہ دن رات میں ایک دفعہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ ایک سو رکعت نماز ادا کرتا اور ایک لاکھ درہم خیرات کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے

خراسان کے امیر کو لکھا کہ ذاقِ جُرعک لا یبتلغ تو اپنے زخم کا علاج کرکہ بڑھنے نہ پائے۔ (شذرات الذہب)

عباس وزیر اعظم کی خدمت میں کسی نااہل نے گورنری کی درخواست دی اس پر بیدار مغز وزیر نے یہ آیت قرآنی تحریر کر دی لَا نُوَلِّی بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا۔ ہم بعض پر بعض ظالموں کو ولایت سپرد نہ کرینگے۔

ایک مرتبہ جعفر برمکی کے پاس کسی قیدی نے درخواست رہائی پیش کی۔ اس نے جواب میں یہ آیت لکھا۔ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَاب۔ ہر مدت کے لئے ایک تحریر ہے۔ (سیرت جعفر برمکی)

غرض کہ اس قسم کی بیشمار نادر و گرانقدر تحریروں کے نمونے ادب و انشا اور تاریخ و سیر کی کتابوں میں ملتے ہیں جو اسلامی خلفا و امرا کی قابلیت اور فصاحت و بلاغت کے آئینہ دار ہیں۔

"تم"

کیا بات ہے کہ سامنے آتے نہیں ہو تم

از حضرت طالب باغپتی

چُپ چُپ ہو کیوں آج آنکھ اُٹھاتے نہیں ہو تم! ‌ ‌ ‌ کوئی تو بات ہے کہ بتاتے نہیں ہو تم

بے روح زندگی ہے تمنا نڈھال ہے ‌ ‌ ‌ سویا ہوا ہے عشق جگاتے نہیں ہو تم؟

اب تا کجے یہ دیر و حرم کے تعیّنات ‌ ‌ ‌ عارض سے کیوں نقاب اُٹھاتے نہیں ہو تم

حائل ہے کیوں حجابِ خرد راہِ عشق میں ‌ ‌ ‌ مانا کہ خود کو مجھ سے چھپاتے نہیں ہو تم

ہستی وبال، عشق جنوں، زندگی فریب ‌ ‌ ‌ کیا بات ہے کہ سامنے آتے نہیں ہو تم

شرما رہا ہے چاند ستاروں کی گود میں ‌ ‌ ‌ کیسی حسین رات ہے! آتے نہیں ہو تم؟

پھر تشنۂ نگاہ ہے اک طالبِ خلش
پلکوں کو کیوں زبان بناتے نہیں ہو تم

طوفانِ نوح

ہے خیر اسی کی عالم میں جو عالم کو دھوکا جانے

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی

برتاؤ کچھ ایسے تم رکھو جن کو بہتر دنیا جانے ۔ اچھے کی یہ ہے پہچان اچھی اچھا سمجھے اچھا جانے
روتا ہے یہ میری حسرت میں گریہ کا اثر اتنا جانے ۔ میں آنسو کو قطرہ سمجھوں وہ قطرہ کو دریا جانے
دم بھر میں یہ کچھ دم بھر میں یہ کچھ رہتا نہیں اک صورت پر ۔ ہے خیر اسی کی عالم میں جو عالم کو دھوکا جانے
اسرارِ محبت سے واقف اربابِ جہاں میں کوئی نہیں ۔ کیا شے ہے وفا کیا چیز جفا اس کو تیرا شیدا جانے
قسمت سے کبھی موقع جو ملے تو کس لئے میں خاموش ہوں ۔ ممکن ہی نہیں بے عرض کئے مطلب وہ مرے دل کا جانے
پردے میں جو تم ہر وقت رہو تو اس صورت سے کیا تم کو ۔ دنیا دیکھے دنیا سمجھے، دنیا مانے، دنیا جانے
یہ پہلا فرض محبت میں ہے دل کے لگانے والے کا ۔ جینے کی تمنا ہی نہ کرے مرجانے کو اچھا جانے
دیوانہ اسے میں کیوں جانوں دیوانہ اسے میں کیوں سمجھوں ۔ جو ذرّے کو ذرہ سمجھے جو صحرا کو صحرا جانے
آنکھوں میں سما جانا پہلے پھر دل میں بنانا گھر اپنا ۔ جانے تو وہی اس کو جانے کوئی یہ طریقہ کیا جانے
جس کو نہ غم و آزار و الم ہر سمت سے گھیرے رہتے ہوں ۔ دنیائے وفا و الفت میں وہ اپنے کو تنہا جانے
دعوائے رفاقت ہے جو اسے تو اس کو رفاقت کہتے ہیں ۔ کچھ حال مرے دل کا پوچھے کچھ درد مرے دل کا جانے
میں رازِ تمنا کہہ سن کر کیوں جان کو زحمت میں ڈالوں ۔ دل جانے یا الفت جانے سر جانے یا سودا جانے
بیدردوں کی محفل میں کہاں ہمدردِ محبت ہوتے ہیں ۔ جلتا ہوں مگر کوئی مجھکو جانے کہ نہ جانے کیا جانے
الزام نہ رکھو تم مجھ پر ملزم نہ مجھے تم ٹھہراؤ ۔ جو کچھ بھی دلِ شیدا نے کیا اس کو تو دلِ شیدا جانے
کیا عیش و مسرت کا ماتم کیا لطفِ گزشتہ کا چرچا ۔ اک خواب پریشاں دیکھا تھا انسان انھیں ایسا جانے
انداز و ادا ہی کو جانا تو کچھ نہ محبت میں جانا ۔ کیا وامق کے دل پر گزری اس کو بھی دلِ عذرا جانے
روداد محبت ہم اپنی بیتاب ہیں جس سے کہنے کو ۔ تشریح تمنا کیا سمجھے وہ معنیٔ حسرت کیا جانے
بدلی اٹھی، بجلی چمکی، آمادہ پلانے پر ساقی ۔ توبہ نہ نبھے یا نبھ جائے میں کیا جانوں تقویٰ جانے
کہتا ہے برا کہہ لینے دوں یہ سوچ سمجھ کر چپ ہی رہوں ۔ خود اچھا ہو تو اپنی طرح وہ اور کو بھی اچھا جانے

اے نوح محبت کی موجیں لے ڈوبیں یاس و حسرت میں
حالات مری غرقابی کے طوفاں جانے دریا جانے

پگلی

رنگین افسانہ

از جناب احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

"پرے ہٹاؤ جی ـــــ خدا کے لئے انھیں جیب میں ڈالو۔ مجھے متلی ہو رہی ہے" اور کیشب مُنہ پھیر کر رفیق کے اس ہاتھ کو پرے دھکیلنے لگا جس میں فرانسیسی کسبیوں کی ننگی تصویروں کا ایک پلندہ تھا۔

مگر رفیق ہنسے جا رہا تھا ـــــ "پگلے۔ تمہیں ان بے جان تصویروں کے نظارہ کی تاب نہیں۔ لیکن جب ایک جیتی جاگتی حسینہ تمہارے پہلو میں ٹھونس دی جائیگی اور تمہیں کہا جائے گا کہ اس سے محبت کرو۔ اس سے پیار کی باتیں کرو۔ اس کے بالوں اور گالوں سے کھیلو۔ اور پھر آج کے بعد ہمیشہ اس کے ساتھ رہو تو کیا کرو گے تم؟"

"میں شادی نہیں کرونگا" کیشب آتشدان میں لکڑیوں کو الٹنے لگا "میں برہمچاری ہی اچھا ہوں"

رفیق تصویروں سے تاش کے پتوں کی طرح کھیل رہا تھا "لیکن اگر تم اس پست دنیا سے اس قدر بلند ہو تو ہر زبان کے ادب میں رومانی عنصر کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو؟"

"میں ادب برائے ادب کا قائل ہوں"

"یعنی تم کتابیں صرف اس لئے پڑھتے ہو کہ کتابیں پڑھنے کیلئے لکھی جاتی ہیں"

"ہاں ـــــ!"

"تمہیں کوئی روحانی کیف یا جسمانی خمار محسوس نہیں ہوتا انہیں پڑھ کر ـــــ؟"

"نہیں ـــــ!"

"لیکن تمہیں وہ نظم کیوں پسند ہے جس میں عورت کے لبوں کو پنکھڑیوں سے۔ آنکھوں کو ستاروں سے۔ گالوں کو شفق آلود مرمر سے اور بازوؤں کو کنول کے لپکتے ہوئے ڈنٹھلوں سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عورت ایک سپنا ہے۔ رنگین اور اچھوتا۔ ایک پھول ہے خوبصورت اور معطر۔ ایک چاند ہے امن اور روشنی۔ ایک آسمان ہے وسیع اور باوقار ـــــ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ تم اس نظم کو اس قدر کیوں پسند کرتے ہو جس کے ہر نقطے پر عورت سوار ہے؟"

"سنا ہے کل کرکٹ کا ایک زبردست میچ ہونے والا ہے۔ ریگو سٹیڈیم میں!" کیشب جان بوجھ کر موضوع بدل رہا تھا۔ رفیق تصویروں کا پلندہ اپنی جیب میں ٹھونس کر اُٹھا۔ "کیشب، بھئی! تم نرے الو ہو تم کاٹھ کے گدڑے ہو خدا کی قسم! اول تو میرا خیال ہے کہ تم نے اپنے آپ پر ایک دبیز پردہ ڈال رکھا ہے لیکن اگر تم نرے کیشب ہی ہو، تو خدا حافظ ہے تمہارا ـــــ تم زندگی میں ہر قدم پر مُنہ کی کھاؤ گے" اور مفلر لپیٹتے ہوئے بولا۔ "اب میں جاتا ہوں، تم جانتے ہو، ہر ملاقات پر میں ایک خاص موضوع پر گفتگو کرنے کا عادی ہوں۔ آج کا موضوع تمہارے لئے ناپاک ہے اور میں کرکٹ کی باتیں کر نہیں سکتا۔ عادت سے مجبور ہوں ـــــ تمہارا سگریٹ کیس کہاں ہے؟" اور سگریٹ سلگا کر دیا سلائی کو آتش دان میں پھینکتے ہوئے بولا۔

"اچھا ـــــ رخصت!"

اور جب رفیق کے قدموں کی چاپ ہولے ہولے مدھم پڑتی ختم ہو گئی تو کیشب نے محسوس کیا جیسے رفیق کی جیب سے سب تصویریں ایک ایک کر کے اچھل پڑی ہیں اور اس کے کمرے کے روشندانوں، کھڑکیوں کے ریشمی پردوں، فرش اور دیواروں سے چپک کر رہ گئی ہیں۔ گھبرا کر اس نے آتشدان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اچانک ان شعلوں نے ایک ناچتی ہوئی فرانسیسی دوشیزہ کی صورت اختیار کر لی۔ برہنہ جسم، سنہرے بال، پارے کی طرح کانپتے اعضا ـــــ! اس کا دماغ چکرا سا گیا۔ آنکھیں جھکا کر اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "میرا سگریٹ کیس کدھر ہے؟" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اٹھ کر کرسی کے نیچے جھانکا۔ غالیچے کا ایک کونا اٹھایا تھا کہ اس کے لبوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ سگریٹ کیس اس کی اپنی مٹھی میں تھا۔ میز پر پڑے ہوئے رفیق کے فوٹو کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بڑا بستر ہے تو!" لیکن ان الفاظ میں ملا کا پیار پوشیدہ تھا

اس رات اس کی نیند غلیظ بردہ دوشیزاؤں کی جادو بھری

مسکراہٹیں برستی رہیں۔ سارے کائنات شفاف آنچلوں میں جکڑی ہوئی نظر آتی رہی اور آسمان و زمین کے درمیان پراسرار خلاؤں میں اُسے سڈول جسموں والی رقاصاؤں کی دلآویز تھرکنوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ صبح اٹھا تو کھویا کھویا۔ بستر کی چادر شکنوں کا انبار بن گئی تھی۔ دو تکیوں میں سے ایک فرش پر پڑا تھا۔ اور ایک اس کے گھٹنے کے نیچے۔ اُٹھ کر اس نے آئینہ دیکھا۔ اور پھر اپنے بے رونق چہرے پر ناک بھوں چڑھا کر بولا ــــ "آج اشنان کرنا چاہئے ــــ سستی کی بھی حد ہوتی ہے آخر"

نہا دھو کر اس نے کپڑے بدلے۔ قد آدم آئینے کے سامنے لباس کی ایک ایک شکن نہایت سلیقے سے درست کرتا رہا۔ دروازے سے آئینے تک کئی بار چل کر آیا۔ تاکہ اپنے قدم اُٹھنے کا انداز دیکھے۔ اس روز سامنے جیب کا رومال تو کمبخت کسی پہلو سجتا ہی نہ تھا اور عینک نگوڑی ناک کے بانسے تک ڈھلک آتی تھی۔ بن سنور کر وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی ماں مدت سے مر چکی تھی۔ بہن کا بیاہ ہو چکا تھا۔ برآمدے میں اس کے تایا جی بیٹھے رامائن پڑھ رہے تھے۔ انھیں پرنام کرکے وہ اپنے مکان کے بڑے گیٹ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ سامنے سڑک پر سے گرل سکول کی لاری تیزی سے گزر گئی۔ اور رفیق کی جیب سے تصویروں کا پلندہ جیسے باہر نکلا اور کسی ان دیکھے بگولے کی زد میں آکر نظروں سے غایب ہو گیا۔ کیشب کے دماغ میں فیروزی آنچل پھڑپھڑاتے رہ گئے اور دل یوں دھڑکنے لگا جیسے کوئی بچہ لوہے کے مکان میں لوہے کی گیند اُچھال رہا ہو۔

دراصل کیشب دنیا کی ہر لڑکی سے عشق کرنے کو تیار تھا لیکن اس کا تجربہ محدود تھا۔ دریچوں میں کھڑی ہوئی لڑکیوں کی طرف کئی بار اُس نے اس انداز میں دیکھا جیسے اس کی رٹی ہوئی ناولوں کے ہیرو دوشیزاؤں کو دیکھتے تھے۔ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ جب نگاہیں اُٹھاتا تو پردے تیزی سے گر جاتے اور کھڑکیاں بند ہو جاتیں۔ اور وہ لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کتابوں میں سے دوسرے ذرائع کی تلاش شروع کر دیتا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ ان دھندلی دھندلی کھڑکیوں کی پسلی طرف کئی ہزار میاں بیوی خدا جانے کس کس انداز سے ایک دوسرے پر قربان ہو رہے ہونگے۔ خدا جانے ان مردوں نے لڑکیوں کو کیسے ورغلایا۔ کون سی کتاب پڑھی انھوں نے ــــ اور کئی بار کیشب سوچا کہ اگر اسے وہ کتاب اپنی ساری جاگیر بیچنے پر بھی مل جائے تو وہ اسے ضرور خریدے گا۔ وسیع زمینوں اور عالیشان کوٹھیوں سے ایک چلبلی البیلی لڑکی بہت ــــ بہت ہی زیادہ قیمتی ہے۔ سڑک پر سے گزرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے چہل قدمی کرتی ہوئی لڑکیاں صرف اسے شوق بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں لیکن جب وہ بے پروائی سے کسی اور سڑک پر مُڑ جاتیں تو کائنات کے اُفقی کنارے سمٹنے لگتے اور کیشب کو اپنے سنگین دھندلکوں میں جکڑ لیتے۔ اور وہ کیچڑ میں پھنسے ہوئے کیکڑے کی طرح خیال ہی خیال میں بیکار ہاتھ پیر مارتا رہتا۔

چند دنوں سے وہ لڑکیوں کے متعلق بہت سوچنا بند کر چکا تھا، اس نے ایک کیرم بورڈ خرید لیا تھا۔ اور تمام دن اکیلا کمرے میں بیٹھا کیرم کھیلتا رہتا۔ اور جب کوئی خیالی حسینہ کیرم بورڈ کے ایک سرے سے سٹرائکر کو چٹکی سے اڑاتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے پستول کی لبلبی دبا دی ہے اور بیشمار گولیاں اس کے دل کو چھلنی کرتی، اس کے کمرے میں سیٹیاں بجاتی تیرتی پھر رہی ہیں۔ کیرم سے تھکا تو تاریخی کتابیں پڑھنے لگا۔ اور جب وہاں بھی علاءالدین خلجی اور ــــ بابر، ہمایوں اور ــــ جہانگیر اور ــــ اکبر کے قصوں سے مڈبھیڑ ہوئی تو جغرافیہ کی طرف پلٹا۔ لیکن ایک روز جب وہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی راجدھانیوں کے حالات پڑھ رہا تھا، تو اس کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں ــــ "پیرس میں بڑی بڑی عالیشان رقص گاہیں ہیں جو فن معماری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان عمارتوں میں آدھی رات تک برہنہ عورتیں ناچتی ہیں۔ شراب بٹتی ہے۔ ساز بجتے ہیں اور بڑے بڑے لارڈ ــــ لارڈ یعنی بڑے بڑے جاگیردار! اور پھر کیشب بھی تو اچھا خاصا جاگیردار تھا، اس کے لئے بہت بڑی رقص گاہ نہ سہی، یہی تنگ سا کمرہ ہی کافی تھا۔ لیکن کہاں پیرس، کہاں لاہور، کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی! ــــ یعنی وہ گنگو تیلی تھا۔ خیالات کی یہ بے ہنگم زنجیر توڑنے کے لئے اس نے کتاب میز پر پٹخ دی۔ اور سگریٹ کیس کھول کر ایک ہی تین سگریٹ پی گیا۔ اسی شام کو رفیق نے اس آگ کو ہوا دے دی اور کیشب ناولوں کی معلومات سے لدا پھندا قدم قدم پر ٹائی کو درست کرتا فسبت روڈ۔ میکلوڈ روڈ اور مال روڈ کے چکر کاٹنے لگا۔ ساڑھیوں میں رنگ و نور کے مجسموں کو لپٹا ہوا دیکھ کر اس نے پھر سگریٹ کیس پر حملہ بول دیا اور جب لارنس باغ پہنچا تو اسے ہلکے مالیوں اور کالج کے چھوکروں کے سوا اسے اور کوئی انسان نظر نہ آیا۔ ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر نئے محاذ قائم کرنے کی تجویزیں

سوچتا رہا اور جب سر اٹھایا تو گھاس کے سبز قطعوں پر میلہ سا لگا ہوا تھا۔ چار بج چکے تھے اور ریشمی ساڑھیوں میں لپٹی ہوئی ——— کیشب وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور باغ کے جنوبی راستے سے نکلتا سنٹرل جیل کی طرف چل پڑا۔ جیل کے شمال سے گذرتی ہوئی ویران سڑک پر پہنچکر اس نے آس پاس گنجان درختوں کو دیکھا اور سڑک سے دور ایک شیشم کے نیچے جا گرا۔ اس کے جسم کے نیچے سوکھے ہوئے پتے تالیاں بجاکر خاموش ہو گئے اور کیشب پھر انہی بے ڈھنگی سوچوں میں ڈوب گیا۔

اچانک اسے سوکھے ہوئے پتوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ قریب ہی ایک اور شیشم کے نیچے ایک سانولی سی لڑکی پتوں کا ایک انبار لگا رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کے کھدر کی ایک گھگھری اور گلابی رنگ کی ایک میلی سی انگیا پہن رکھی تھی۔ تنگ ماتھا۔ قدرے چپٹی ناک۔ بھرے بھرے گال اور سڈول بازو۔ جھکتی تو گھگھری چھتری سی بن جاتی۔ اٹھتی تو جیسے تنگ انگیا پھٹ کر دھجیاں بن جائیگی۔ گاہے گاہے اپنے ہاتھ سے ناک رگڑتی۔ کان کھجاتی۔ آنکھیں ملتی اور پتوں کی ایک ڈھیری بنا کر آگے بڑھ جاتی۔

سیمنٹ کے دریچوں پر آہنی جنگلوں میں سے جھانکتی ہوئی اُن دوشیزاؤں کا تصور چھٹ کر ناپید ہو گیا۔ اور پیرس کی رقص گاہیں جھکولے کھاتی اینٹ اینٹ ہو کر بکھر گئیں۔ کیشب ذرا سنبھل بیٹھا لیکن جب لڑکی نے اس شیشم کا رخ کیا تو کیشب کا سنبھالا ڈگمگا گیا جیب سے نوٹ بک نکال کر اس پر لکھنے لگا۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک دریا میں ایک ننھی سی مچھلی رہتی تھی ———" عظیم الشان ناولوں کے پلاٹ اس کے دماغ سے محو ہو گئے اور اس کے احساسات نے الٹی چھلانگ لگا کر اسے بچپن کے سبق دہرانے پر مجبور کر دیا۔ لڑکی تنے کے دوسری طرف پتے اکٹھے کرنے لگی تو کیشب کے دل کی دھڑکنیں اور خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹیں مل جل کر ہم آہنگ ہو گئیں۔ ایسا شور بلند ہوا جیسے کائنات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آپس میں بج رہی ہے۔

اور جب لڑکی اس کے سامنے آ گئی تو اس کی کنپٹیوں میں تناؤ سا پیدا ہو گیا اور رگوں میں سرسریاں سی رینگنے لگیں۔

لیکن لڑکی بے توجہی سے پتے اکٹھے کرتی جا رہی تھی۔ باہیں پھیلا [illegible] سمیٹتے ہوئے اس کی انگیا ضرورت سے زیادہ تن جاتی [illegible] پتے سمیٹتی وہ کیشب کے بالکل قریب [illegible] پتے سمیٹ لائی۔

"یعنی اسے میری پرواہ ہی نہیں" کیشب نے سوچا۔ مگر ایک شریف بچے کی طرح پیر کھینچ لئے۔ لڑکی کے چہرے پر دھول جمی ہوئی تھی اور تانبے کے کڑوں میں دو چار پتے اٹکے ہوئے تھے۔ بال جیشمار مینار کی صورت میں چوٹی پر ایک ننھا سا مینار بنا رہے تھے اور ——— انگیا تنی ہوئی تھی۔

لڑکی پھر بولی۔ "جرا ادھر ہو جا بابو"

کیشب نے سوچا۔ "یہ چھوکری تو میری ہتک پر تل گئی ہے۔ یعنی ان بیس بیس پتوں کو جو میرے سوٹ کو مٹی سے بچائے ہوئے ہیں اس کی ڈھیری میں ضرور شامل ہونا چاہئے!" ——— بڑی ہمت کر کے بولا۔ "لیکن ان تھوڑے سے پتوں کو رہنے دے۔ میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ اتنا ذخیرہ تو جمع کر لیا تو نے۔ ان مٹھی بھر پتوں کو کیا کرے گی تو؟" کیشب گھبرا کر بہت سی باتیں ایک سانس میں کہہ گیا۔

"ایک وخت کی ہنڈیا پکے گی" وہ بولی۔

اچانک کیشب کو روس کے کسی افسانہ نگار کا ایک قول یاد آ گیا۔ "پیسہ دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے" اور وہ جھٹ بولا۔ "ان پتوں کو رہنے دے یہاں اور ——— اور پیسے لے لے مجھ سے، لکڑی خرید لیجیو"

لڑکی کے سانولے چہرے پر سرخی سی جھلکنے لگی۔ "پیسے؟" اس نے پوچھا۔

اور کیشب جیب سے بٹوا نکال کر بولا۔ "ہاں ہاں۔ پیسے" اس نے ایک روپیہ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا۔

"پربابو ———" وہ اپنی بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں جھپکانے لگی۔ "پربابو۔ اتنے بہت سے پیسے؟ اکٹھے؟" اور وہ گھٹنے ٹیک کر ہتھیلیوں کے بل آگے جھک کر بولی۔ "تو بڑا دیالو ہے رے بابو" کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ "تو مخول کرے ہے ہم سے!"

کیشب کا دل اب اس قدر پھیل گیا تھا کہ اس کی پسلیاں تنی ہوئی کمانیں بن گئی تھیں۔ نتھنوں سے ایک ساتھ دس دس سانسیں نکال رہا تھا اور اس کی رگوں میں سرسریاں زیادہ تیزی سے دوڑنے لگی تھیں۔ بولا۔ "مخول نہیں ——— لے"

لڑکی کا منہ کھلا تھا اور گرد آلود ہونٹوں میں مبہم سی لرزش پیدا ہو چلی تھی۔ یوں ہاتھ پھیلایا جیسے قسمت آزمائی کر رہی ہے۔ کیشب کے پیچھے کھنچ گئے۔ روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اس نے

ہتھیلی کو انگوٹھے سے قدرے دبا دیا۔

لڑکی کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ روپے کو انگلیوں کے پوروں سے چھوتی ہوئی بولی۔ "ارے!" اور پھر ہنسنے لگی۔ "کھی کھی کھی کھی!" ادھر ادھر دیکھ کر وہ کیشب کے بالکل قریب کھسک آئی اور بولی۔ "تو کہاں رہتا ہے؟"

"شہر میں!" کیشب کا ماتھا تپتی ہوئی ٹھیکری بن رہا تھا۔

"شہر میں؟" وہ بولی۔ "ہوں —— اچھا تو —— تو تو شہر رہتا ہے؟" جیسے کوئی نہایت ضروری معاملہ اس کے پیش نظر ہے۔ "کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"تین میل۔" کیشب جیسے دوسری جماعت کا امتحان دے رہا تھا۔

لڑکی اب خاموشی سے ایک پتے کو توڑ رہی تھی اور کیشب اس کے لہنگے کے بالائی کنارے کے ساتھ ساتھ نظریں دوڑا رہا تھا۔ لڑکی کی نیچی گرتی ہوئی پلکوں کو دیکھ کر بولا۔ "کہاں رہتی ہو تم؟"

"یہاں"

"جیل میں؟" کیشب نے پوچھا۔

لڑکی کھی کھی کھی ہنسنے لگی۔ "تو بھول کرتا ہے بابو! واہ واہ —— جیل کے بھیتر دشمن جائیں میرے۔ باہر کوارٹروں کی صفائی کرتی ہوں" اور وہ روپیہ اچھالنے لگی۔

"تمہارے ماتا پتا؟"

"جل بھے کب کے۔ بڈھا سا چاچا ہے۔ اس کے ہاں رات گزارتی ہوں ——" اور روپیہ اب کے کیشب کی جھولی میں گر گیا۔ ادھر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ادھر کیشب نے —— روپیہ جھولی میں پڑا رہ گیا۔ اور کیشب خوف اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اس کا کنگن گھمانے لگا۔ ناولوں میں پڑھے ہوئے طریقے وہ بھول گیا اور اس کے اندر چھپا ہوا کوئی احساس اسے یہ نئی راہ سجھانے لگا۔ اس کا ہاتھ رپٹ کر لڑکی کی کہنی پہ آیا۔ پھر پلٹ کر ہتھیلی پر۔ ہتھیلی سے پھر کہنی کی طرف لپکا۔ اور اس کے بھرے بھرے کندھے تک ہو آیا۔ یہ رپٹنا اور لپکنا چند لمحے تک جاری رہا۔ آخر لڑکی بولی۔ "کوئی دیکھ لیوے تو؟"

"اندھیرے میں کون دیکھتا ہے پگلی!" کیشب اپنے آپ کو دنیا بھر کی ناولوں کا ہیرو سمجھ رہا تھا۔

"لیکن اب تو دن ہے۔"

"رات کو سہی۔"

"رات کو؟"

"ہاں ہاں رات کو —— شام پڑے تک میں یہیں رہوں گا۔"

"اچھا —— !" اور روپے کو مٹھی میں دبا کر وہ اس تیزی سے جیل کی سمت چلی جیسے ہوا پر تھرکتی جا رہی ہے۔

کیشب سارا دن سنٹرل جیل سے لارنس اور لارنس سے سنٹرل جیل کے چکر کاٹتا رہا اور جب شام پڑے کوؤں کے غول سرمئی فضا میں چیختے ہوئے اپنے بسیروں کو جانے لگے۔ اور جیل کے گھڑیال نے سات بجائے تو اسے خشک پتوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی اور جب آواز بہت قریب آ گئی تو وہ تنے کی اوٹ سے نکلا۔ "میاؤں!" ایک چیخ بلند ہوئی۔ ایک کمزور سی کتیا کا سایہ شیشموں میں سے لپکتا نہر کی طرف بھاگ گیا۔

کیشب کے دماغ میں بجلی کی رویں سی چلنے لگیں۔ پورا ایک گھنٹہ اس نے ان رووں کو دبانے کی کوشش میں گذارا۔ اور جب جیل کے گھنٹے نے آٹھ بجائے تو دور سڑک پر بجلی کی روشنی میں اسے ایک گھومتی ہوئی گٹھری دکھائی دی۔ خشک پتے چٹخنے لگے۔ اور کیشب کے چاروں طرف خیالی رقاصائیں تھرکنے لگیں۔

"آ گئی؟" اس نے قریب جا کر پوچھا۔

"ہاں!" وہ ہولے سے بولی۔ "چندر نہیں ملی۔ تمری قسم ٹھنڈ لگے ہے ہیں تو۔"

اندھیرے میں اس کا بازو پکڑتے ہوئے وہ بولا۔ "لیکن تو نے نام تو بتایا نہیں اپنا۔"

"درگی!"

اور کیشب کو یوں محسوس ہوا جیسے دراصل اس نے درگی نہیں کہا۔ "کلوپیٹرا" کہا ہے۔

سڑک پر ایک تانگا مل گیا۔ "کہاں کا مال ہے۔" کوچوان نے پوچھا اور کیشب اسے ڈپٹ کر بولا۔ "ارے تو کو چابک دکھا۔"

"چابک بابو جی!" کوچوان بولا۔ "اسے ذرا چھولوں تو ہوا میں اڑ جائے۔ پوربی گھوڑی کا بچھڑا ہے بابو جی! چابک دکھاؤں تو خدا کی قسم انڈے دینے لگے۔"

لیکن کیشب کوچوان سے کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ بیٹھا درگی کی کلائی میں کنگن گھماتا رہا۔ شاہ عالمی دروازے کے پاس دونوں اترے اور ایک اندھیری گلی میں گھس گئے۔ اپنے مکان کے قریب پہنچ کر کیشب دو چار لمحے گیٹ کے قریب دم سادھے کھڑا رہا پھر بولا۔ "درگی! میری جان —— میں ابھی آیا —— بس آنکھ کی جھپکی میں —— تم

اس جھاڑی میں چھپ جاؤ ـــ یہاں ـــ اور دیکھ جاؤ ـــ ییوں بس ٹھیک ہے!"

لیکن کر وہ مکان کے کھلے برآمدے میں آگیا اس کا اسٹیشن کتنا "کاشی" اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ اس کے پتا اپنے کمرے میں سو رہے تھے اور مالی کی کوٹھری میں بھی دیا بجھ چکا تھا۔

کتے کو برآمدے کے بڑے سرے پر بٹھا کر وہ درگی کو جھاڑی میں سے اٹھا لایا۔ بجلی جلانے سے قبل کھڑکیوں پر پردے ڈال دیئے اور جب بجلی جلی تو اس کی نظریں صوفے پر بیٹھی ہوئی درگی پر پڑیں۔ نہائی دھوئی درگی۔ ہونٹوں پر سرخی۔ انگیا پر ایرانی گوٹا کناری۔ دو لال بکھری کی گھگھری ـــ انگلیوں میں روپیہ! ـــ تیز روشنی میں اس کا رنگ بھی سفید نظر آنے لگا۔ الماری سے سینٹ کی شیشی نکال کر وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بالوں۔ انگیا اور گھگھری پر سینٹ چھڑک رہا تھا کہ مالی کی کوٹھری سے کسی کے گانے کی آواز آئی۔

لالو جار کی نٹ کھٹ چھوری!
بیٹا بھی لگا دے جی چھیلا بھی لگا دے
قدم قدم پر لٹ جھٹکا دے
مسکے ہے انگیا نگوری ـــ ہائے رام رے،

کیشب ہنسنے لگا۔ "بڑے مزے کا گیت ہے۔"

"ہم بھی گاتے ہیں۔" درگی سینٹ کی خوشبو سے نیم بیہوش ہو کر بولی
"نہیں نہیں۔" کیشب نے اس کے بھرے بھرے گالوں پر ہلکا سا طمانچہ مار کر کہا۔ "ہم یہاں گانے بجانے نہیں آئے۔"

اٹھ کر اس نے بتی بجھا دی ـــ اور جب پھر جلی تو کیشب کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ اور درگی کے سر پر ہینڈ ہیل کا فینار ایک طرف جھک گیا تھا۔ انگیا گلے میں لٹک رہی تھی اور گھگھری سے باہر گول پنڈلیاں پکے ہوئے پھل کی طرح جیسے دہک رہی تھیں۔

کیشب نے اٹھ کر انگڑائی لی۔ اور بٹوے سے ایک روپیہ نکال کر لیا ـــ "لے۔"

اب درگی کے ہاتھ میں دو روپے تھے۔ وہ خوش ہو کر دونوں کو بجانے لگی۔

"اب چل ـــ کیسا کسانست! ـــ ساتھ کے کمرے میں پتا جی ہو [illegible]
[illegible]"

"اب جا۔"

"رات تو یہیں گزاروں گی بابو! تین میل دور کیسے جاؤں اس گھونگے کے جال سے؟"

کیشب بھنا گیا۔ "لیکن اب تیرا یہاں کیا کام ـــ مالکن بن بیٹھی گھر کی۔ دو روپے تو لے لئے۔"

درگی کی آنکھیں جیسے پھٹ پڑیں گی۔ انگیا اور گھگھری کو ٹھیک کرتی ہوئی بولی۔ "پر بابو گھر دور ہے جاڑا ہے چدر نہیں، رات گزارنے دو" اور پھر نہایت دکھ بھرے لہجہ میں بولی۔ "گھر دم ہی جاؤں گی۔"

لیکن کیشب کے تمام ولولے بھاپ کی طرح تحلیل ہو چکے تھے۔ درگی کو ڈپٹ کر بولا۔ "جاتی بھی ہے اب کہ۔" اور اس نے درگی کا بازو پکڑ لیا "نکل یہاں سے۔ کلموہی ـــ چڑیل ـــ پگلی۔"

"پر بابو جی ـــ!"

لیکن کیشب اسے بازو سے گھسیٹ کر برآمدے میں لے آیا "نے جا بھاگ جا۔"

"پر بابو جی ـــ!"

اور کیشب نے اسے ہینڈ ہیل سے پکڑ کر برآمدے سے باہر دھکیل دیا۔ وہ دھکے منہ کے بل بجری پر جا گری۔ اچانک برآمدے کے پرلے سرے سے "کاشی" غراتا ہوا بڑھا۔ درگی خوف زدہ ہو کر اٹھی اور چیخیں مارتی سرپٹ دوڑی۔ کاشی اس کے پیچھے لپکا۔ چیخوں سے اندھیرا محلہ گونج اٹھا۔ کیشب تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا ساتھ کے کمرے سے اس کے پتا کی آواز آئی۔

"کیشب ـــ"

"جی!" وہ رفیق کی تصویر دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"پڑھ رہا ہوں جی۔"

"یہ کاشی کس پر جھپٹا ہے؟ اور یہ چیخیں کسی عورت کی ہیں شاید۔"

"معلوم نہیں پگلی ہوگی پتا جی۔"

"ہوں ـــ اس وقت سڑک پر گھومنے والی کوئی پگلی ہی ہوگی۔"

اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف برآمدے میں کاشی کے پیروں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

صبح جب کیشب اٹھ کر باہر جانے لگا تو برآمدے کے باہر بجری پر خون کے چند دھبے اور دو روپے پڑے تھے۔ اور کاشی لال رنگ کے گھگھرے کے ایک ٹکڑے سے کھیل رہا تھا۔

حضرت امیر مینائی

کوچہ زلف و گیسو میں!

ادبی مقالہ

از:- مولانا اظہر امرتسری

ایرانی شاعری جب ہندوستان میں آئی تو اپنے ساتھ ایران کے مقامی رنگ بھی لے آئی اور یہ رنگ قسم قسم کے الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات سے گھرا ہوا ہے۔ یہی چیزیں ہیں جن کے گرد ایرانی شاعری آج تک گھوم رہی ہے۔ اردو شاعری بھی چونکہ ایرانی سخنوری کا ہندوستانی نقش ہے اس لئے ہماری شاعری میں بھی ایسی چیزیں داخل ہو گئیں جو ہندوستانیت کی بہ نسبت ایرانیت کے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً میخانہ، ساقی، پیر مغاں، مغبچہ، زلف، گیسو، کاکل وغیرہ اس لئے اردو شاعر جب ہندوستانی معشوقیت کا جائزہ لینے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ہندوستانی مٹی کا دیا نہیں ہوتا بلکہ ایران کی جگمگاتی ہوئی قندیل ہوتی ہے۔ دور نہ جائیے ذرا زلف و گیسو کے شاعرانہ پہلو ہی پر نظر ڈالئے۔ ہندوستان کے سیاہ چشم و گندم گوں حسین اگرچہ دلفریبی و آرائش کے تمام زیوروں سے آراستہ ہیں لیکن نہ ان کے رخسار اور کنپٹی کے درمیان ایرانی [illegible] کے عقربی کاکل ہیں نہ کاندھوں پر مشکبار زلفوں کا سایہ ہے۔ بایں ہمہ اردو شاعری میں زلف و کاکل کا تذکرہ اس قدر طویل ہے کہ اسے [illegible]نے کے لئے بھی شب دراز اور زلف رسا کی ضرورت ہوگی۔ اردو شاعری کا یہ پہلو جس قدر فنی و عشقی اعتبار سے روشن ہے اسی قدر اس کی وسعت بھی اپنے اندر گوناگوں تشبیہات و استعارات [illegible] تشبیہات کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ کوئی اردو شاعر ایسا نہیں جس نے [illegible] کو مشکبار بنانے کے لئے زلف و گیسو کا تذکرہ نہ چھیڑا ہو۔ لیکن اس مختصر مضمون میں تمام شعراء کے کلام کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا [illegible] حضرت امیر مینائی کے ان شعروں کو موضوع تنقید قرار دیا جاتا ہے جو زلف و گیسو سے متعلق ہیں۔

امیر کی شاعری

امیر کی شاعری میں یکسانی نظر نہیں آتی۔ کہیں تصوف کا رنگ اس درجہ غالب ہے کہ حافظ و درد بھی ان کے نقش قدم پر چلتے نظر آتے ہیں کہیں تشبیہ و استعارہ کی اس درجہ فراوانی ہے کہ صائب و ذوق کی بلاغت تازہ ہوتی ہے۔ کہیں فلسفے کا اس انداز سے ہجوم ہے کہ شعر کے آئینہ میں ظہوری و غالب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ کہیں معاملہ بندی، خلوت افروز باتوں اور شوخی و رندی کی وہ نرالی نمائش ہے کہ داغ کو بھی کانوں پر ہاتھ دھرنے پڑتے ہیں۔ بایں ہمہ زبان کی صحت مضمون کی بلندی۔ بندش کی چستی اور خیالات کی پختگی ہر شعر میں نظر آتی ہے یہی خوبیاں ہیں جو امیر کے سارے کلام کے لئے مشترک ہیں اور انہی محاسن کے باعث امیر کی شاعری کا سورج علم و ادب کے آسمان پر سورج کی طرح روشن ہے۔ زلف و گیسو کے شعروں میں بھی ان خصوصیات کی جھلک ہے۔ کہیں آپ کو تصوف و حقیقت کی تجلیاں نظر آئیں گی اور کہیں خلوت و ہوس کی سیاہ مستیاں دکھائی دیں گی۔ لیکن سب سے زیادہ تشبیہ و استعارہ کا رنگ غالب نظر آئے گا۔

بلا و آفت۔ "بلا" کو زلف و گیسو سے خاص نسبت ہے۔ کبھی زلفوں کے چاہنے والوں پر بلا نازل ہونے لگتی ہے۔ کبھی زلف ہی بلا بن کر چمٹ جاتی ہے۔ کبھی زلف و گیسو کا تصور ہی اپنے جلو میں بلائیں لے کر آجاتا ہے۔ غرض کہ استعارہ و تشبیہ کی رسی نے زلف کو بلا سے یا بلا کو زلف سے کچھ اس درجہ باندھ دیا ہے کہ قیامت کا بھونچال بھی اس رشتہ کو نہیں توڑ سکتا۔ امیر فرماتے ہیں ؎

یاد زلف آئی دم نزع ستانے ہم کو
کس برے وقت میں گھیرا ہے بلانے ہم کو

زلف کی یاد ہی سہی لیکن اسے فرشتگان موت ہی سے تو ڈرنا چاہئے لیکن ظالم نے اس بُرے وقت میں بھی بیار محبت کو گھیرے میں لے لیا۔ زلف صرف اسیری کے لئے بلا نہیں بلکہ یہ اُڑتی ہوئی ڈائن آسمان تک مار کرتی ہے سنئے ؎

پہلا فلک پہ مہر جو زلف اس کی وا ہوئی
نازل ہمارے سر پہ یہ کالی بلا ہوئی!

زلف کے شیدائی کو صرف ایک ہی بلا کا سامنا نہیں ہوتا بلکہ اس بلا کی برکت سے زمانہ بھر کی بلائیں اسے تختۂ مشق بنانے لگتی ہیں چنانچہ

دیکے ان زلفوں کو دل جان مصیبت میں پڑی
لپٹی جاتی ہیں زمانے کی بلائیں مجھ کو

زلفوں کو دل دینا تو خیر بڑی بات ہے زلفوں کے تصور ہی کی بلا آفرینی دیکھئے ؎

دل کو بندھ جاتا ہے جس دم ترے گیسو کا خیال
نظر آتی ہیں بلائیں ہی بلائیں مجھ کو

زلف کی بلا نے صرف دنیا کے عاشقوں ہی کو نڈھال نہیں کیا بلکہ قیامت میں بھی قیامت برپا کر دی ؎

پھر نکلے حشر میں کھولے ہوئے وہ زلف دراز
بڑی بلا تو پڑے گی یہ اہل محشر پر

جب یہ بڑی بلا اہل محشر پر پڑی تو امیر بھی کھڑے تھے۔ اپنا نامۂ اعمال دیکھ دیکھ کر حسرت سے کہنے لگے۔ تھے تو ہم خود گنہگار لیکن بات کتنی ثواب کی کہہ گئے ؎

میں اپنے نامۂ اعمال کی بلائیں لوں
جو تجھ سے رنگ کہ اے گیسوئے سیاہ ملے

آخر کیوں نہ ہو ؎

لٹک رہی کتنی ہے وہ زلف لاکھوں پیچ پڑیں
بلائیں اس کی مجھے سر سے تا کمر پہنا

زلف بلا ہے ہی لیکن اس کے کھل جانے سے اور بھی بلائیں نازل ہو جاتی ہیں ؎

سو بلائیں ہوں گی نازل ایک ہے زلف بلا
کھولتے باہر نکل کر آئینہ خانے سے زلف

زلف اور رات رات اپنی سیاہی کے باعث زلف کی ہمرنگ ہے۔ اس لئے ہمارے شعراء نے از راہ استعارہ و تشبیہ زلف و گیسو کو ہمیشہ شب سے باندھا ہے جیسے امیر ؎

ہمدم دراز ہے شب فرقت تو غم نہیں
شب بھر رہے فسانۂ گیسوئے یار آج

اتنی طویل رات کے لئے افسانہ بھی دراز ہی ہونا چاہئے۔ لیکن فسانۂ گیسو کی جگہ اگر حکایت زلف ہوتی تو بہتر تھا کیونکہ گیسو اپنی انتہائی درازی کے باوجود شب فرقت کی طوالت کو نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے تو زلفوں کی ضرورت ہے۔ اگر گیسو بھی زلف کی درازی کا مقابلہ کرنے لگیں تو پھر زلفوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بال ہی سارا کام کر لیں گے۔

یہ صرف ہمارا ہی خیال نہیں بلکہ امیر خود بھی فرماتے ہیں کہ ؎

ممکن نہیں ہے عمر دو روزہ میں وصف زلف
تھوڑی سی شب دراز فسانہ ہے کیا کہوں

شب وصال تھی۔ "وہ" تھے۔ سرمستیوں کا ہجوم تھا کہ یکا یک زلف ہٹی۔ سورج کی طرح چمکتا ہوا چہرہ جلوہ گر ہو گیا۔ یہ جلوہ گری پرلطف تھی لیکن امیر مدتوں سے وہم و گمان میں مبتلا تھے۔ چنانچہ ؎

ہٹی جو زلف تو چہرے کی روشنی پھیلی
میں ڈر گیا کہیں صبح شب وصال نہ ہو

خواجہ آتش لکھنوی جب سو جاتے تھے تو انہیں خواب میں "بت" نظر آتے تھے۔ لیکن امیر کے خواب پریشانوں کا "لفظی رنگ" نہیں بلکہ ان کی پریشانی کا اثر ہے ؎

یاد زلف یار میں جمعیت خاطر کہاں
خواب آتے ہیں نظر ہم کو پریشاں رات بھر

اب ذرا بھیگی بھیگی راتوں میں زلف کا تذکرہ سنئے ؎

کیا تری زلف سیہ کو دیکھ کر شرما گئی
بھیگی بھیگی رات ہے اے مہ لقا برسات کی

آخر کیوں نہ ہو ؎

گیسوؤں سے ضیائے رُخ ہے عیاں
نور مہتاب چھن کے آیا ہے!

شب فراق کے دو مثیل ہیں۔ زلف سیاہ اور قبر کا اندھیرا ؎

زلف سیہ حور ہو یا تیرگی گور
دونوں یہ نمونے ہیں مری ہجر کی شب کے

شعر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ امیر اگرچہ جنت میں گئے لیکن وہاں "وہ" نہیں تھے۔ اس لئے حور کی دلکش زلفوں پر بھی شب فراق کا گمان ہونے لگا۔ چونکہ جنت تک پہنچنے کے لئے قبر

کی تاریکی سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ اس لئے تیرگیٔ گور کا اندازہ بھی زلف ہی سے لگایا گیا۔

دل اور زلف۔ تجدد پسند حضرات جب اُردو شاعری پر دماغی اعتراض کرتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے یہ پھبتی سوجھتی ہے کہ دل بھی کوئی ٹھکانا ہے جو زلف یا گیسو سے اُلجھ کر رہ گیا۔ حالانکہ شاعر اس احساس کو دل عشاق کی اُلجھن کے بھیس میں بتاتا ہے جو زلف کی دلکشی دل میں پیدا کرتی ہے اس لئے کیفیت کی تصویر کشی کے لئے منظر کی نقاشی اختیار کی گئی ہے۔

انقلاب زمانہ کا خون رُلانے والا نتیجہ دیکھئے۔ ؎

آج جس دل کا کوئی گاہک نہیں کل تک یہی
جوہر کا آئینہ تھا، زلف پری کا شانہ تھا

دل سے زلف آفت خیز کا سامنا ؎

ہوگیا جب سامنا اس زلفِ آفت خیز کا
پھر کے آنکھوں نے کہا ہشیار دل ہشیار دل

دل کو کام کی بات بھی بتائی جاسکتی ہے ؎

بڑھ کے آئیں ہاتھ میں لے دل وہ زلف
اب کے ایسا نالۂ شبگیر کھینچ

لیجئے دل زلف کو ہاتھ میں کیا لینے لگا کہ زلف ہی میں گھر کر گیا۔

اور یہ انکشاف بھی تلاش و تجسس کے بعد ہوا ؎

ہو نہ ہو چین زلف میں ہوگا
ہم نے دل کا پتہ لگایا ہے!

صرف آثیر ہی کا دل اسیر زلف نہیں بلکہ حالت تو یہ ہے کہ ؎

سلجھاتے ہیں جب زلف تو الجھاتے ہیں اک دل
فرق اس میں کبھی بال برابر نہیں ہوتا

دل کو قید زلف سے چھڑانے کی کوشش بھی کی گئی مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

جھٹکے دیئے ہزار ہاتھ کوئی بھی لگائے
گیسو سے کسی طرح جدا دل نہیں ہوتا

اور سنئے ؎

دل آشفتہ ذکر زلف سے کیا کیا اُلجھتا ہے
سنا جاتا نہیں قصہ پریشانیٔ پریشاں کا

زلف تو چھوڑی ٹھہری۔ لیکن دل کے لئے ایک اور بھی مصیبت ہے ؎

سینے میں عاشقوں کے کہاں عاشقوں کے دل
کچھ زلف میں ہیں کچھ تیرے چاہِ ذقن میں ہیں

یادِ گیسو کے کرشمے دیکھئے ؎

یادِ گیسو نے دکھایا ہے تماشہ کیا
شیشۂ دل میں ہمارے اُتر آئی زنجیر

مصرعہ اول "نہ" کے حشو اور مصرعہ ثانی تعقید لفظی سے محفوظ ہوتا تو شعر اور بھی بلند ہوجاتا۔

ذرا دل کی ارزانی اور رات کی چوری دیکھئے ؎

دل اُڑا لیتے ہیں وہ کھول کے زلفوں کی لٹیں
دن پھرا کرتے ہیں چوروں کے انہیں راتوں میں

مارِ زلف عرب کا سادہ مزاج شاعر زلف کو کوئلے سے تشبیہ دیتا ہے لیکن اُردو شاعر اپنے ایرانی استاد کا مقلد ہے۔ اس لئے زلف کو سانپ قرار دیتا ہے کیونکہ پیچ و خم میں دونوں ایک دوسرے کے مثیل ہیں ؎

زلف کی ناگن اور دل ؎

ڈس گئی دل کو مرے زلف کی کالی ناگن
واہ کیا حسن فسوں گر نے نکالی ناگن

اس کے علاوہ بھی ؎

ان کے گیسو تو بلا ہو کے پڑے ہیں پیچھے
بے ڈسے آج نہ چھوڑیں گے یہ کالے دل کو

بام پر زلفوں کی نمائش ہو رہی ہے ؎

بام پر کھول کے زلفوں کو وہ خود کہتے ہیں
راستے بند ہیں سانپ ہیں کرنے والے

وا یہ کس کی زلف وقفِ سیرِ گلشن ہوگئی
باغ میں لہرا کے موجِ سبزہ ناگن ہوگئی

نکہت و جنوں۔ زلف و گیسو کی جنوں خیز نکہت محبت کی آگ کو ہوا دے دے کر بھڑکاتی ہے۔ وہ زلف زلف ہی نہیں جس کے حلقے سے خوشبوؤں کی لپٹیں نہ اٹھیں۔ وہ گیسو ہی کیا جس کی عنبریں نکہت بیزیاں دماغِ عشق کو جنون سے ہمکنار نہ کر دیں۔

ان وجدانی کیفیتوں کی کہانی آثیر کی زبان سے سنئے ؎

سونگھی جو بوئے زلف بڑھا اپنا دم جنوں
طبع مریض اور دوا سے بگڑ گئی

طبع مریض کیوں نہ بگڑتی۔ وہ ابھی تو بگڑی ہوئی تھی۔
خناق ہوئے زلف کا ایسا دماغ ہے
تیرا بھی اے امیر بلا کا دماغ ہے
مگر غالب کا "دماغ" کچھ اور ہی ہے ؎
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
نکہت زلف کے متعلق بلا کا شعر ہے ؎
غش میں گر لخلخۂ زلف سنگھاتے بھی نہیں
جایئے جایئے ہم آپ میں آتے بھی نہیں
آج کل اپریشن کے وقت کلوروفارم سنگھایا جاتا ہے۔ امیر بھی اس طبی ایجاد سے متفق ہیں لیکن اس ترمیم کے ساتھ ؎
پہلے زلفوں کو سنگھا کر مجھے بیہوش کرو
پھر مرے سینے سے تم تیر کا پیکاں کھینچو
"تیر" کا حشو ہزار عقیدتوں کے باوجود خواجہ امیر مینائی کے محاسن کلام میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

قیدیان زلف ۔ زلف کے قیدیوں کے کیا کہنے اس گروہ کی اسیری ساری دنیا سے نرالی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔
پھنسا کر حلقۂ گیسو میں میرے دل کو کہتے ہیں
اسی زنداں میں رہتا ہے گنہگار آشنائی کا
دل اسیر کیوں ہوا؟ یہ بھی دل ہی کا قصور ہے ؎
دوڑا دل اس کی زلف سیہ فام کی طرف
یہ صید آپ کھنچ کے گیا دام کی طرف
طویل زلفوں کی گرانی بھی نحیف و نزار دل کے لئے ناخوشگوار نہیں
زلفیں اتنی نہ بڑھا ہے وہ بہت زار و نحیف
بیڑیاں چاہئیں ہلکی ترے دیوانے کو
دل جب قید زلف سے گھبرایا تو چلا اٹھا ؎
کی مرے دل نے تری زلف میں پھنس کر فریاد
بولی سر پیٹ کے مرے تیری محبت کیسی
لیکن اس فریاد کا اثر کیا ہوا؟ ؎
اے پری ہاں دیکھے زلفوں کو غضب تو نے کیا
اور بھی تاریک قیدیوں پہ تنگ زنداں کر دیا
آخر قیدی کا انجام کیا ہوا؟ ؎
مر گیا دیوانہ کل تو حسرت سے کہا

آج کیا ویراں نظر آتا ہے گھر زنجیر کا
زلف معشوق دل عاشق کے لئے ہی زنجیر نہیں بلکہ زنجیر کے لئے بھی زنجیر ہو جاتی ہے ؎
زلف میں حلقے بنائے ہیں شرارت دیکھنا
طوق پہنائے ہیں کیا اس شوخ نے زنجیر کو
نصیبوں کا کھیل دیکھئے ؎
اپنے اپنے ہیں نصیب اے ہمصفیران چمن
پھنس گئے تم دام میں ہم گیسوئے صیاد میں
ایک حکیمانہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎
جھیل کڑیاں سلسلۂ گیسو سے رکھتا ہے اگر
قید زنداں سے نہ گھبرا صدمۂ زنجیر کھینچ!
اس ہندی شعر کا شیرازی پہلو بھی دیکھ لیجئے ؎
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ دانا چوں بدام افتد تحمل بایدش
زور تشبیہ دیکھئے ؎
الفت زلف میں ہے طائر دل اشک فشاں
آب و دانہ مری قسمت کا اسی دام میں ہے
یہ تمنا بھی خوب ہے ؎
زاہد اس زلف میں پھنس جائے تو اتنا پوچھوں
کہئے کس طرح کٹی قبلۂ حاجات کی رات

زلف اور قسمت ۔ عشق کی قسمت کو زلف سے خاص نسبت ہے۔ ادھر زلفیں پریشان ہوئیں ادھر قسمت برہم ہو گئی ادھر کالی زلفیں لہرائیں ادھر سیہ بختی سر اٹھا اٹھا کر تباہی پھیلانے لگی کبھی کبھی سیہ بختی اور زلف میں ٹھن بھی جاتی ہے لیکن عاشق کا بخت بہر حال آرائش حسن کا محکوم ہے اس لئے بخت و قسمت کے ہر حادثے کو زلف و گیسو کی حرکت سے وابستہ رہنا پڑتا ہے۔ اس موضوع پر امیر کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے لیکن مطالعہ کے وقت استعارہ و تشبیہ کی ہم آہنگی، لفظی و معنوی لوازم کی فراوانی اور الفاظ و محاورات کا انتخاب بخاص نظر رکھئے تاکہ امیر کے شاعرانہ کمالات نذر تغافل نہ ہو سکیں۔ فرماتے ہیں ؎
گھٹائیں غم کی چھا جاتی ہیں دل پر تیرہ بختوں کے
بلا ہے رخ پہ کھلنا آپ کی زلف پریشاں کا

خدا سے ڈر نہ کر اندھیر اے بخت سیاہ اتنا
دبے جاتے ہیں گیسوئے تاباں تیری سیاہی سے

سایہ پڑا اگر مرے بخت سیاہ کا
یہ تیرگی نہ تھی تری زلف سیاہ میں

پیچ و تاب عشق کے ہوں پر ہے یہ ہمت میری
تیرے گیسو سے بدل کرتی ہے قسمت میری

زلف و شانہ۔ زلف کو شانے سے خاص نسبت ہے۔ ذرا اس مناسبت کی تصویر بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

بال کنگھی سے جو سلجھایا تو دل الجھایا
تیرہ بختوں کو بگاڑا جو سنوارے گیسو

سبحان اللہ کیا برابر کی چوٹ ہے۔ بال سلجھتے ہی دل الجھا اور گیسو سنورتے ہی تیرہ بخت بگڑ گئے۔ اس تلازم و رعایت اور مناسبت کے کیا کہنے!

شانہ زلف کے بل نکال کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن زلف اسے بھی دھمکی دیے بغیر نہیں رہتی ؎

زلف شانے سے یہ کہتی ہے نہ سر چڑھ اتنا
پیچ کچھ ایسے پڑیں گے کہ پریشاں ہو گا

لیکن شانے پر اس قسم کی دھمکیاں کیا اثر کر سکتی ہیں ؎

کیا الجھ پڑتی ہے اپنے بنکانے سے زلف
ہے بڑی نادان بحث سیدھی ہو تو اس شانے سے زلف

امیر شانے کے تجربے سے فائدہ تو اٹھاتے ہیں لیکن ڈرتے بھی ہیں۔

اے دل صد چاک شانہ بن کے جا پر یاد رکھ
ہے مزاج الجھ پڑتی ہے سلجھانے سے زلف

کوچۂ زلف۔ "کوچۂ زلف" فارسی کا خاص محاورہ ہے۔ امیر نے بھی اس کوچے کی سیر ہے مگر کس طریقے سے ملاحظہ فرمائیے۔

کوچۂ گیسو ہاتھ آیا مجھے   کالے کوسوں سیکڑوں منزل گیا

کوچے تک رسائی ہو ہی جاتی ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟

دیتے ہیں مرے دل کو لٹیں زلفوں کی
[illegible] بدل جاتی ہے نیت میری
کوچۂ [illegible] ملاحظہ فرمائیے

آتی ہے اس کے کوچۂ گیسو سے کیا ہوا
بجھ جاتی ہے یہ بزم میں کیوں بار بار شمع

"یہ" کی حشویت نہ ہوتی تو شعر آسمان خوبی سے عرش کمال تک پہنچ جاتا۔

"بلائیں زلف جاناں کی اگر لیںگے تو ہم لیںگے" تو آپ سن ہی چکے ہونگے اسی مضمون پر امیر نے بھی طبع آزمائی کی ہے ؎

ہے ہمارے دل صد چاک کا حصہ وہ زلف
شانہ ہے کون جو چھوتا ہے پرائی زنجیر

زلف کی جنوں خیزی۔ زلف و گیسو کی جنوں خیزی کا تذکرہ بھی سن لیجئے۔ شاید اس میں آپ کے لئے بھی دلچسپی کا کوئی سامان نکل آئے۔

یاد گیسو سے کہاں ہوش جنوں میں آرام
میں ہوں آزاد مگر روح مری دام میں ہے

اب ٹھہرتا ہوں کہاں مسجد میں میں وحشی مزاج
دختر رز نے دکھائی مجھکو مینا نے سے زلف

حق اسی کا ہے سلاسل پاس حق ہے فرض عین
ہے یہ حق پوشی چھپاتے ہو جو دیوانے سے زلف

دو خط عارض دو گیسو دیکھ کر آیا خیال
غول پریوں کا ہے اس کے ساتھ دیوانے بھی دو

حسن کلام

مرقومہ بالا اشعار کا انتخاب ترتیب مناسبات کے پیش نظر کیا گیا اس لئے امیر کے شاعرانہ کمالات کی پوری طرح نمائش نہ ہو سکی۔ اب ان شعروں پر نظر ڈالئے جن میں رنگ امیر جھلک رہا ہے ؎

خیال زلف و رخ ہی سات دن آنکھوں میں پھرتا ہے
اُجالا صبح وصلت کا اندھیرا شام ہجراں کا

اس شعر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں جو بلحاظ تلازم دوسرے الفاظ سے منسلک نہ ہو۔ تشبیہ و استعارہ کے اس ہجوم کے باوجود لف و نشر مرتب کو قائم رکھا گیا ہے۔

اسی قسم کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

زلف و رخ دونوں نے مجھ پر ستم اے جان کیا
اس نے حیران کیا، اس نے پریشان کیا

یہ اشعار بھی اسی قبیل سے ہیں ؎

رات دن گیسوئے محبوب کا رہتا ہے خیال
خواب آنکھوں میں مری آکے پریشاں ہوگا

بہت ہی مختصر ہے وصل کی شب کچھ تو بڑھ جائے
مری خاطر سے دم بھر کھول دو زلف پریشاں کو

زلفوں کی آڑ میں نہیں کرتے وہ چشمکیں
بجلی چمک رہی ہے یہ ابر سیاہ میں

ایسا ہوں عشق عارض و گیسو میں بے حواس
بجلی چمک کے آئے تو اس کو گھٹا کہوں

دیکھ کر اس رخ و گیسو کو میں حیراں ہوں امیر
شب تاریک میں خورشید کہاں سے آیا

ذرے افشاں کے نہیں کرمک شب تاب سے کم
ہے وہ زلفِ عرق آلود کہ برسات کی رات

مشکل ملتی ہے تری زلفِ سیہ کچھ کچھ
کیوں نہ ہو ہم کو سوادِ شبِ دیجور پسند

غل ہوا شہر میں خورشید گہن میں آیا
چھپ گیا جب تہ گیسوئے معنبر عارض

وصل میں زلفِ سیہ نے جو کیا ہے اندھیر
یہ اندھیرا تو نہ تھا ہجر کی بھی راتوں میں

پھر شبِ یاد تری زلفِ رسا آتی ہے
ہم کو دھند میں بھی جنت کی ہوا آتی ہے

صحفِ رخ اور گیسو کا خیال بروقت آنے سے کیا ہوا؟ ؎

ساتھ ہی گیسو کے آیا صحفِ رخ کا خیال
غیر گندی جاچکا تھا آج ایماں رہ گیا

اس کے ساتھ ہی داغ کے استاد ذوق کا شعر سن لیجئے۔

شکر پردے ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

لیکن نقش ثانی بھی نقش اول سے بہتر نظر نہیں آتا۔

یہ شعر کتنا حقیقت نما ہے ؎

طور آرائش کا کیا جانیں ابھی کمسن ہیں وہ
رخ ہے آئینے سے غافل بے خبر شانے سے زلف

لیکن حسرت موہانی کے اس شعر نے ارشاد امیر کی ضرورت نہیں رہنے دی

حسن سے اپنے وہ ناواقف ہیں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

امیر کے آئینے میں تو صرف سادگی حسن کا جلوہ ہے لیکن حسرت کے مرقع میں سادگی حسن اور عشق سادہ کی تصویریں دوش بدوش نظر آتی ہیں

"وہ" جنازۂ عاشق کو لحد تک بھی نہ پہنچا سکے کیوں؟

رہ گئے وہ دو قدم چل کر مری میت کے ساتھ
پاؤں میں پھندا اٹک کر گیسوئے پرخم ہوا

شعر خوب ہے لیکن مصرع ثانی کا مفہوم تعقید لفظی کے باعث پیچیدہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس شعر کی ضرورت ہی کیا تھی جب مومن کا یہ زندہ جاوید ارشاد لوگوں کو نہیں بھول سکتا۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا،

اس شعر کا جواب ڈھونڈے نہیں مل سکتا ؎

چھڑکتے ہیں وہ افشاں گیسوؤں پر خیر ہو دل کی
مسافر چھاؤں میں تاروں کی گھر سے چل نکلتا ہے

ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

بہت سنبل چمن میں آج پیچ و تاب کھاتا ہے
کسی محبوب کے شاید کہیں گیسو سنورتے ہیں!

زلف کی درازی سے معشوق کی جوانی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ امیر نے بھی اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے ؎

کوئی جو کھل کے زلفِ رسا سر سے پاؤں تک
لینے لگی بلائیں ادا سے پاؤں تک

شعر خوب ہے۔ مگر نشور واحدی کا یہ شعر بھی نظر انداز کرنے کے

قابل نہیں ہے ؎

یہ فلک بھی تھا، یہ زمیں بھی تھی مگر اک شباب کی سی کمی
تری زلف تابکمر گئی کہ جہان حسن سنور گیا

— زلف کی تشبیہ کے ساتھ عاشق کا ماتم ملاحظہ فرمایئے ؎

عاشق مرے تو سوگ تمھاری بلا کرے
تم کیوں بہ رنگ زلف سیہ پوش ہو گئے

— مرگ عاشق کو جانے دیجئے۔ اب دشمن کے سوگ میں زلف کی

پریشانی دیکھئے ؎

غیر تو زندہ ہے پھر غم ہے مری جاں کس کا
سوگ رکھے ہوئے ہے زلف پریشاں کس کا

"سوگ رکھے ہوئے ہے" ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

یہ شعر بلحاظ تغزل کس قدر بلند ہے ؎

کیا بلا جھوم کے گھنگھور گھٹا آئی ہے
ہائے اس وقت مرا گیسوؤں والا نہ ہوا

رعایت لفظی ملاحظہ فرمایئے ؎

ہم سے کہتا ہے کہ گیسو نہ چھوؤ اس بت کے
مار اللہ کی ناصح ترے سمجھانے پر

"گیسو" کو "مار" (سانپ) سے تشبیہ دی جاتی ہے اور ہندی میں مار "زد" کو کہتے ہیں لیکن ذوق کا یہ شعر اس سے بھی بلند ہے۔

زلف کی پیچ سے دل ڈرتا نہیں
بھوت بھاگے ہے وگرنہ مارے

حسن تشبیہ ؎

اس کو دیکھا تو کہا ہم نے تماشائے چمن
زلف سنبل ہے، دہن غنچہ، گل تر عارض

اس سلسلے میں مضطر مرزا پوری کا یہ شعر خوب ہے ؎

یہ قد بوٹا سا، گل سے گال، آنکھیں نرگس شہلا
جوانی تم پہ کیا آئی بہار آئی گلستاں پر

اس سلسلے میں ذیل کے اشعار خاص طور پر حسن کلام کے

ذیل میں ملاحظہ ہوں ؎

چل بدلا دیر سے کرتا ہے اشارے گیسو
مرا کیا ہے نہ دہن ہے کہ پکارے گیسو

بھرنے پہ آ چلے ہیں ہمارے بھی زخم
تم زلف مشکبو کے ذرا پیچ کھول دو

گناہگار ترے گیسوؤں کے محشر میں
بندھے ہوئے رسن زلف حور سے آئے

کرو بناؤ سنوار و تم اپنے گیسو کو
پر اس قدر کہ پریشاں کسی کا حال نہ ہو

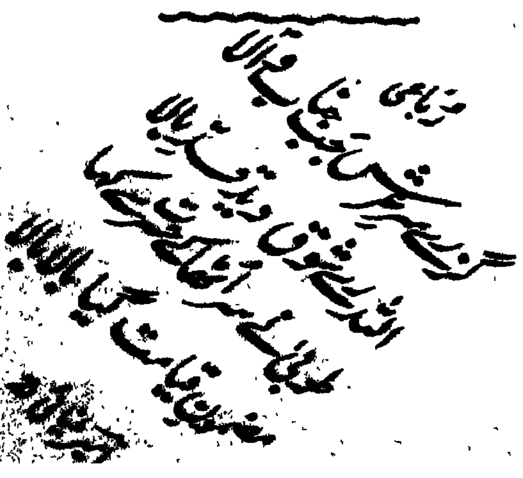
— یہ شعر کسی حد تک تشریح طلب ہے ؎

قد نے گیسو کو سر چڑھایا ہے
سرو سے بھی بلند پایا ہے

"سرو" قد کے مشابہ ہے۔ اور "گیسو" قد کے اوپر ہیں گویا گیسو کا سلسلہ سرو (قد) سے بھی بلند ہے۔ غالب نے اس سے ملتے جلتے مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

امیر مینائی نے کوچۂ زلف و گیسو کی کہاں تک سیر کی اور اس سیر میں انھیں کن مسرتوں اور کن مصیبتوں کا سامنا ہوا؟ اس کا جواب کسی حد تک زیر مطالعہ مضمون دے چکا ہے۔ لیکن بہتر تو یہ تھا کہ امیر کے زلف و گیسو کو داغ و جلال کے موازنہ سے ناپا جاتا لیکن اس طریقے سے بات بڑھنے کا احتمال ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں سوء ادب کے جرم کا بھی مرتکب نہ ہونا پڑے لہذا اس موضوع کو محدود ہی کرنا پڑا۔



عشق مذہب

از: حضرت علامہ امجد حیدر آبادی

توحید

خوش ہم سے رہے جاناں ہم عید اسے کہتے ہیں
بس ایک کے ہو جانا توحید اسے کہتے ہیں

نماز

گرنا ترے قدموں پر ہے عین نماز اپنی
سجدے میں سرافرازی ہے بندہ نوازی اپنی

روزہ

بھولے سے نہیں آتا کھانے کا خیال اب تو
دھن وصل کی رہتی ہے، ہے صوم وصال اب تو

زکوٰۃ

مرجانا محبت میں ہے عین حیات اپنی
نقد دل و جاں دینا گویا ہے زکوٰۃ اپنی

حج

عاشق کے لئے حج بھی اک خاص بہانا ہے
ہم کو درِ جاناں تک ہر حال میں جانا ہے

کام آنہ سکی آخر کچھ بخیہ گری اپنی
لے جاتی ہے جنگل کو شوریدہ سری اپنی

حلقہ درِ کعبہ پر ہے حلقہ بگوشوں کا
ہے زلفِ دلبر پر سر خانہ بدوشوں کا

اے مست مئے وحدت امجد تجھے کیا کم ہے
کوثر ہے مدینے میں، اور کعبے میں زمزم ہے

تفسیر ہو یا قرآں سب ایک ہی مطلب ہے
اسلام کے ارکاں ہیں یا عشق کا مذہب ہے

جو کچھ ہے شریعت میں وہ عین طریقت ہے
توحید محبت ہے، توحید محبت ہے

شاباں بنود مارا بے صدق دعا کردن
بے شائبۂ الفت، از فرض ادا گشتن

ٹوٹی ہوئی کرسی

ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کی بساط ہی کیا ہے۔ کرسی کیا ڈھچر کہیئے کرسی کا، بازو ٹھیک، ٹانگیں ندارد۔ پشت پر کی کئی چھتیاں غایب اور بیٹھنے کی جگہ گو مونج کی بنی ہوئی تھی لیکن جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی بیٹھی ہوئی، گویا منہ چڑاتی ہوئی۔ اپنے ماضی پر ہنستی ہوئی یا روتی ہوئی اور ایسی چیز پر اتنی لے دے ہوئی ہے کہ الامان والحفیظ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی کرسی نہیں کسی راجہ کا محل نیلام ہو رہا ہے۔

لیکن ٹھہرئیے تو! شاید میں نے ابھی تک نہیں بتایا کہ ایسی فضول چیز مجھ جیسے "ہائی کلاس" کباڑیئے کے پاس کیسے آئی؟ یہ بھی ایک پر لطف کہانی ہے۔

آپ کے اسی شہر کے بہت بڑے رئیس تھے۔ نام نہیں بتاؤنگا، لیکن یہ بتائے دیتا ہوں کہ کسی زمانے میں ان کی ٹکر کا رئیس شہر بھر میں نہ تھا۔ ہاتھی جھومتے تھے ان کے دروازے پر۔ لیکن کس کی بنی رہی ہے۔ بڑے بڑے قارون لٹ گئے۔ یہ بیچارے کس کھیت کی مولی تھے اجڑنے پر آئے تو دیکھتے ہی دیکھتے صفایا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے جھاڑو پھیر دی۔ تنکا تک باقی نہ بچا اور وہ فرنیچر جو بڑے نواب صاحب نے بڑے شوق سے خریدا تھا کباڑیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔

لیکن گزری ہوئی باتوں پر سر دھننا تو بے جا سی بات ہے اور پھر اگر زمانے کے یہ الٹ پھیر کہیں سو کر ہی رہ جائیں تو دنیا کا نظام کیونکر چلے اور ہم غریب کباڑیوں کی دال روٹی کی کیا سبیل ہو۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ رئیس اور نواب بگڑتے ہیں تو کباڑیئے بنتے ہیں۔ اس دنیا کا سلسلہ ہی کچھ ایسا ہے۔ لیکن اس بات کے باوجود مجھے ان نواب صاحب کی حالت پر بڑا رحم آتا ہے۔ اور خصوصاً جب وہ ٹوٹی ہوئی کرسی مجھے یاد آتی ہے تو میں بےچین سا ہو جاتا ہوں۔

تو خیر صاحب! اللہ آپ کا بھلا کرے! وہ کرسی ہی کی تو بات تھی۔ ایک دن میں دکان پر بیٹھا تھا۔ اور اللہ لگتی بھی یہی ہے کہ مجھے اس بات کا [illegible] بھی نہ تھا کہ اتنے بڑے رئیس کا مال یوں

ایک رومان

از جناب سید احسان علی شاہ بی۔ اے

کوڑیوں کے مول بکے گا۔ میں تو بس دکان پر بیٹھا تھا کہ کانڑا کباڑیا آگیا۔ نتھنے پھولے ہوئے، چتونیں چڑھی ہوئیں۔ بھاگے ہوئے کانڑ صاحب چلے آرہے ہیں۔ اور دکان پر آ کر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا میں نے سوچا کوئی چیز چرا بھاگا ہے۔ یہ بد معاش! اس خیال کا آنا تھا کہ میرا تو دل دھڑک اٹھا اور خشک ہوئے لبوں پر زبان پھیر کر میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"استاد!" وہ بولا۔ "لڈو کھانے والی خبر لے کر آیا ہوں۔ وہ ہیں نا .. نواب! ان کی حویلی بک گئی ہے۔ اب سامان کی باری ہے۔ چھوٹے نواب نے مجھے بلوایا تھا، لیکن تم جانو میری گرہ میں کیا دھرا ہے؟ جو میں ہاں کر لیتا، لیکن پھر بھی میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ سامان کی کیا پوچھتے ہو۔ رئیسی ٹھاٹھ کی چیزیں ہیں اور کوڑیوں کے مول ہاتھ آجائیں گی۔ تین چار ہزار میں جہاز کا سامان مل جائے گا ——— کہو ہو تیار ——؟"

میں نے کانڑے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کی بیٹھی ہوئی آنکھ جوش کی شدت سے نبض کی طرح دھڑک رہی تھی۔ اور نتھنے! اللہ تیری پناہ! نتھنے کاہے کو کسی قلعی گر کمبخت کی دھونکنی تھی۔ یہ کانڑے میاں کباڑیئے تو نام ہی کے تھے۔ البتہ تھے ایک رقم۔ عدالتوں میں چکر کاٹنا۔ ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ رئیسوں اور بنیوں کے مقدمات بڑے غور سے سنتے اور جہاں انھیں معلوم ہوا کہ فلاں رئیس کا دیوالا پٹ رہا ہے جھٹ سے اس کے یہاں پہنچے اور سامان کا خریدنا ٹھیک کر آئے۔ اس کے بعد چند کباڑیوں کو ساتھ لیا سامان انھیں دلوایا اور خود کمیشن لے کر لنبے ہوئے۔ یہ ان کا پیشہ تھا۔ لیکن آج ایسی صورت ان حضرت نے کبھی نہیں بنائی تھی۔ کہتے اور معمولی طریقے سے باتیں کر کے معاملہ ختم کر دیتے۔ اور آج سب کانڑے کا جوش غضب تھا۔ کالے بھجنگ چہرے پر سرخیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ماشاء اللہ!

میں تاڑ گیا کہ آسامی موٹی ہے اور کانڑا جوش [illegible] ہے۔ اس لئے چند [illegible] ہاتھ پھیر کر بولا "کتنے [illegible]؟"

"یہی کوئی چار پانچ ہزار!"

"چار پانچ ہزار؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "کچھ ہوش کے ناخن لو۔ سونا ہوا دو سو ہو گیا۔ چار پانچ ہزار کیا معنی؟"

اور کاتڑا بڑے رازدارانہ انداز میں میرے کان کی طرف جھکا۔ اُف! پسینے کی بدبو، میری ناک پھٹی پڑتی تھی —— اور بولا۔

"استاد! چالیس پچاس ہزار کا مال ہے۔ موقع ہے مار لو ہاتھ ورنہ سونے کی چڑیا یں —— پھُر رر!"

"دھت!" میں نے مذاق سے کہا۔ "لیکن ایسے بھی کیا ہاتھی گھوڑے خریدنا ہیں ہم کو۔"

"سونے چاندی کے تو صرف حقّے ہی حقّے ہیں۔ اور دوسرا سامان الگ۔ پانچ ہزار ساتھ لے چلو۔ اور ہاں دیکھو استاد میں نے یہ بات کسی اور کو نہیں بتائی اور نہ ہی بتانا تم، بس صبح پانچ ہزار روپیہ لے کر چلے آؤ اور سجا سجایا گھر اُٹھا لاؤ —— چاندی میں کھیلنے لگو گے چاندی میں۔"

کاتڑے کی بات بہت بڑی حد تک معقول تھی۔ اگر ایسے نواب کا کل مال چار پانچ ہزار ہی میں مل جائے تو اور چاہیئے کیا تھا؟ بڑے بڑے گدّے دار صوفے اور کرسیاں اور نہ معلوم کیا کیا میری آنکھوں تلے پھر گیا۔ میں نے کچھ سوچا۔ کاتڑے نے مجھے مزید غور کرنے سے روکا میں نے وعدہ کر لیا اور اس کی کمیشن کے پچاس روپے اسے دے بھی دیئے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔

دوسرے دن میں بڑے جوش میں تھا۔ بیوی سے لڑ کر اس سے سفید ململ کی پگڑی لی۔ اور سر پر باندھی۔ شلوار کوئی دُھلی ہوئی تھی نہیں اور میری شلوار پر روشنائی گر گئی تھی۔ اس موضوع پر بھی بیوی سے اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی۔ اور آخر مجبور ہو کر روشنائی کے دھبوں کو شلوار کی سلوٹوں میں چھپا لینے کے نسخے سے جو میری بیوی کے پاس بحیثیت صدری نسخے کے محفوظ تھا اس جھگڑے کو بھی نپٹایا۔ اندر کی صدری کی گہری جیب میں دھڑ دھڑ کرتے ہوئے چار ہزار کے نوٹ رکھے۔ اللہ کا نام لیا اور چلا نواب صاحب کی طرف۔ راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ مقابلے پر اور تو کوئی کباڑیہ ہو گا نہیں اس لئے سارے کا سارا سامان چار ہزار میں مل جائے گا۔

لیکن وہاں جو پہنچا ہوں تو ہکا بکا رہ گیا۔ کباڑیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ شہر کے کباڑیئے تو خیر میری جان پہچان والے تھے باہر سے بھی لاتعداد اور بے حساب کباڑیئے آئے

آئے ہوئے تھے۔ اور اللہ ماشاء اللہ، وہ سارے کا سارا سامان تقریباً فروخت ہو چکا تھا۔ رہ گئی تھیں باقی کچھ کرسیاں، چند میزیں، اور پرانے کاغذوں پر بھدی سی روشنائی سے لکھی ہوئی چند "قیمتی" کتابوں کے "نایاب نسخے"۔ جنہیں کسی کباڑیئے نے خریدنا پسند نہیں کیا تھا۔ کسی کا دماغ تھوڑی خراب تھا۔

کاتڑا ابھی وہیں تھا۔ مُنہ فق اور حیرت ایک آنکھ سے پڑی جھانک رہی تھی۔ میری شکل دیکھ کر مُردہ قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور مری ہوئی آواز میں بولا۔

"مارے گئے استاد! نہ جانے یہ دلوث کہاں سے پھٹ پڑے ہیں"

مجھے پہلے تو معلوم ہوا کہ مجھے بنانے چلا ہے۔ لیکن نبض کی طرح دھڑکتی ہوئی آنکھ اور اس آنکھ کے پڑوس میں ایک کالے رنگ کا چھوٹا سا گڑھا جسے بزعم خود آنکھ ہونے پر فخر تھا، پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ کاتڑا سچا ہے۔ اس لئے میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اپنی اپنی قسمت ہے۔ افسوس سے کیا حاصل؟"

"تو یہ کرسیاں وغیرہ ہی دیکھ لو۔" کاتڑا بولا۔ "گو ہیں تو پرانی لیکن شکل و صورت اچھی ہے۔ آٹھ دس آنے بھی چھوڑ جائیں تو بڑی بات ہے۔" یہ کہتے ہوئے معاً گویا اسے کچھ یاد آ گیا۔ اور اس نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے ہاتھوں میں دس دس کے وہی پانچ نوٹ تھے۔ جو شام کو میں نے اسے دیئے تھے۔

"یہ تمہارا مال ہے استاد!"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ روسیاہ کاتڑا اس وقت ایمان کے نور میں کھڑا جگمگا رہا تھا۔

میں نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لئے۔ اور اب ہم دونوں بافراغت کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میرے دل پر سے یہ بوجھ ٹل گیا تھا کہ پچاس روپے "بے فضول" میں گئے۔ اور کاتڑے کا ضمیر بھی خدشے سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنے اور کاتڑے کے درمیان ایک قسم کا رابطہ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ کاتڑا دلال نہیں ایک اچھا آدمی ہے۔ احساس فرض کا اظہار بھی عجیب چیز ہے صاحب! دو آدمیوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لے آنے میں کمال حاصل ہے اسے۔

آمدم برسر مطلب، کاتڑے سے کچھ تھوڑی بہت بحث کر لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کرسیاں اور میزیں خرید لینے میں قباحت نہیں، چنانچہ جب یہ چیزیں نیلام ہونے لگیں تو میں نے بھی بولی

دے دی۔ دو آنے سے اللہ کا نام لے کر شروع کیا تھا کہ چار پانچ کرسیاں ہیں کوئی ایک آدھ میز ہے۔ روپے بارہ آنے میں سودا پٹ جائیگا لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ میری بولی سے بڑھ کر بولی دینے والا اور تھا ہی کوئی نہیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ سب سامان دو آنے میں مل جائے گا۔

نیلام کرنے والے نے ایک دو دفعہ "دو آنے ایک ـــ دو آنے دو" کی رٹ لگائی ہی تھی کہ کہیں کونے میں سے آواز سنائی دی "ایک روپیہ"

یہ آواز سنتے ہی سب کباڑیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ قطعی جہالت تھی ایک روپے کی بولی دے دینے کی۔ میں نے اونچا سر کر کے دیکھا اور یا حیرت! دوسرے کونے میں عیدو کھڑا تھا۔ یہ عیدو اس حویلی کا بہت پرانا نمک خوار ہے۔ ابھی چھوٹا سا بچہ ہی تھا کہ یہاں آ کر نوکر ہوا اور پھر دانہ پانی نے کچھ ایسی کشش کی کہ یہیں کا ہو رہا چھوٹے نواب صاحب کی سب سے چھوٹی بہن کلثوم بی کے ساتھ کھیلتا رہا تھا اور انہی کے ساتھ جوان بھی ہوا۔ اسی وجہ سے بڑے نواب صاحب بھی اور چھوٹے نواب صاحب بھی اسے بہت اچھا سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ کلثوم بی کا ملازم خاص تھا۔ سکول جاتے وقت یا سیر وغیرہ کے لئے جب بھی کلثوم بی جاتیں تو گاڑی کے ساتھ یہی ہوا کرتا تھا۔ اسے کلثوم بی سے محبت بھی بے اندازہ تھی۔ سنا گیا تھا کہ ہزاروں دفعہ کلثوم بی نے اسے جوتے مار مار کر نکالا ہے لیکن یہ چھٹا ہوا کا ایسا دھنی ہے کہ نہیں نکلا پر نہیں نکلا۔ کلثوم بی کے لئے تڑپ اٹھنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ کوئی کلثوم بی کی گاڑی کے پاس سے ہو کر گزرا نہیں اور عیدو آپے سے باہر ہوا نہیں۔ جھٹ آستینیں چڑھا میدان میں آتا۔ اس کی وجہ سے شہر میں کچھ عجیب عجیب سی گویا بھی ہونے لگی تھیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ لیکن توبہ کیجئے صاحب اتنے بڑے گھرانے کی لڑکی بھلا ایسے نوکروں کو منہ لگائے گی؟ اونہہ! دنیا کی بھلی پوچھی ہے آپ نے، خوا مخواہ الزام لگا دیتی ہے دنیا۔ بڑی ظالم چیز ہوئی۔

اور پھر ہمیں اور آپ کو کیا پڑی ہے اس قصے میں پڑنے کی؟ دنیا جانے اور دنیا والے جانیں۔ ہمیں تو یہ دیکھ کر بعض اوقات حیرانی ہوتی ہے کہ جب سے کلثوم بی اللہ کو پیاری ہوئی ہیں۔ یہ لڑکا بیمار سا ہی چلا گیا ہے۔ پہلے پورا پہلوان تھا۔ نواب صاحب کے دستر خوان کی روٹیاں چیرتا تھا۔ مشٹنڈا ہو گیا تھا پورا، لیکن اب تو روز بروز اس کی حالت خراب ہی ہوتی جا رہی ہے۔

اس دن بھی جب سامان بک رہا تھا یہ دیوار کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا رو ہی رہا تھا۔ آنسو آنکھوں میں تھے اور آواز گھگھیائی ہوئی بھی تھی لیکن ہونٹ مسکرا رہے تھے اور خصوصاً جب کلثوم بی کے کمرے کا سامان بکنے لگا ہے تو اس سے نہیں رہا گیا اور وہ ایک دم دو آنے کی بولی کو روپے تک لے گیا۔ گویا اپنی ساری کائنات جھونک دی اس نے اس ٹوٹے پھوٹے سامان کے لئے۔

میں نے اُسے تیز آنکھوں سے دیکھا تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل کر میرے پاس آ گیا اور آہستہ سے میرے کان میں کہنے لگا۔

"یہ سامان نہ خریدیئے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "ہمارا تو بیوپار ہی یہی ہے بھئی۔"

"میں منت کرتا ہوں۔"

میں اور تیز ہو گیا۔ "لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو؟"

"میں خریدنا چاہتا ہوں۔"

"خوب!" میں نے طنزاً کہا۔ "جھونپڑے میں بیٹھ کر بھالو محلوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ ابے یہ سامان تو رکھے گا؟"

اور معاً میرے کان میں آواز آئی۔ "ایک روپیہ ایک۔ ایک روپیہ دو ـــ"

کانڑے نے مجھے کہنی ماری۔ "استاد نکلا جا رہا ہے۔"

اور میں نے تڑپ کر کہہ دیا۔ "ڈیڑھ روپیہ۔"

اور عیدو نے فوراً کہا۔ "دو روپے۔"

مجھے تاؤ ہی تو آ گیا۔ لیکن میں نے غصے کو دبا کر آہستگی سے کہا۔ "کیوں الجھتا ہے عیدو! ہاتھی لٹ گیا تو گھونگھرو کیا تو اپنے گلے میں ڈالے گا ـــ جہاں یہ بادشاہی ساری لٹ گئی ہے اسے بھی جانے دے۔"

لیکن عید نے پھر منت کی۔ "کچھ رحم کیجئے میرے حال پر ـــ نہ خریدیئے۔"

اب تو مجھے پورا غصہ آ گیا تھا۔ "اچھا" میں نے گرج کر کہا۔ "تو پھر دیکھتے ہیں کون خریدتا ہے اسے؟" اور میں نے آگے بڑھ کر کہہ دیا۔ "تین روپے۔"

عیدو نے دوبارہ مجھے کہا۔ لیکن نہ معلوم کیوں مجھے اس سے ضد ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میری جیب میں روپے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ عیدو خالی خولی ٹوکرا ہے۔ یا شاید ـ ـ ـ ـ نہ معلوم کیا وجہ تھی۔ میں جم ہی تو گیا اور ہوتے ہوتے بولی تین روپے

تک پہنچ گئی۔ میں نے آخری دفعہ عیدو کو للکار کر کہا۔ "ہٹ جا اب بھی ——— دیکھو تیرے بھلے کی کہہ رہا ہوں۔"

لیکن عیدو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ وہ برابر بولی بڑھاتا گیا۔ یہاں تک کہ تیس روپے تک نوبت پہنچ گئی۔ اس نے جب تیس روپے کہے تو سب کباڑیوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ کباڑیے نے مجھے ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سمجھا شاید مجھے اس سودے سے روکنا چاہتا ہے۔ اس لئے میں نے تلخی سے انکار کر دیا۔ "میں دیکھتا ہوں یہ ہے کتنے پانیوں میں۔" لیکن جب دوبارہ کباڑیے نے مجھے کہا ہے۔ اس وقت اس کی نبض کی طرح دھڑکتی ہوئی آنکھ میں کوئی نئی بات معلوم ہوتی تھی اس لئے میں ایک طرف گیا تو کباڑیے نے انتہائی رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"گھر کا بھیدی ہے اُستاد! اور بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ بڑے بڑے نواب لوگ چوری چکاری کے ڈر سے اپنے ہیرے موتی ایسی ہی جگہوں میں چھپا کر رکھتے تھے ——. وہ کرسی دیکھتے ہو پرانی؟ ——— کافی پرانی ہے ——— کیا خیال ہے تمہارا؟"

اور اس قسم کے ہزاروں قصے میرے ذہن میں یکدم اُبھر آئے کئی نوابوں نے اپنے جواہرات مسند کے نیچے ٹانک رکھے تھے۔ اب تو مجھے شہ مل گئی۔ اور میں آگے بڑھا ہوں تو میں نے یکدم پچاس اور پھر ساٹھ کہہ دیئے۔ عیدو آنسو پی کر چپ ہو گیا۔ اور پیچھے کھسک گیا۔ میں نے فتح کے غرور سے موچھوں پر تاؤ دیا۔ اور سامان پر قبضہ کر لیا۔

سامان ٹھیلے پر لد رہا تھا۔ اور میں دل ہی دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا کہ یکایک عیدو آ گیا۔ اور مری ہوئی آواز میں بولا۔ "آپ سب کچھ لے جائیے۔ لیکن وہ کرسی دے جائیے ——— ٹوٹی ہوئی۔ آپ کے تو کسی کام کی نہیں ——— چار آنے میں بھی کوئی نہ خریدے گا۔ اور میں اس کے ساٹھ روپے دیتا ہوں ——— میری ساری پونجی یہی ہے۔"

مَیں نے اسے سر سے پاؤں تک نفرت سے دیکھا۔ ایک کباڑیئے کو چلے تھے میاں۔ سوچا ہو گا مسکین صورت بنا کر بڑے نواب صاحب کے سارے ہیرے جواہر ساٹھ روپوں میں خرید لوں گا۔ بھلے ہم تیرے جیسے لاکھوں کو ایسی پڑھا دیں، تو ہے کس ہوا میں، لیکن ان سب باتوں کا اظہار تو نہیں کیا جاتا نا؟ اس لئے میں نے دھیمے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"تیرا کچھ دماغ بھی خراب ہو گیا ہے عیدو! ——— جا اپنا رستہ ناپ! ان ساٹھ روپوں سے کوئی اور روزگار کر ———"

عیدو میری طرف درد بھری نظروں سے تکتا رہا ——— اور میں چل دیا۔ اب میں بعض دفعہ سوچتا ہوں کہ میں نے عیدو کی بات نہیں مانی بُرا کیا۔ لیکن جو ہونا تھا ہوا، گھر پہنچا۔ سامان میں عمداً دکان پر نہیں لے گیا تھا۔ خزانے کی تلاش تھی نا؟ اور عیدو کی باتوں سے یقین ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہے اسی کرسی میں ہے ——— اس لئے میں یہ سب کباڑخانہ سیدھا گھر میں لے گیا تھا۔

ابھی سامان اُتار کر رکھا ہی تھا کہ عیدو آ گیا اور بولا۔

"اچھا جو کرسی نہیں دیتے تو مت دو۔ ایک کام کر دو۔"

"فرمایئے!" میں اکتا گیا تھا اس منحوس سے۔

"اتنی اجازت دے دو کہ کرسی کی وہ جو گدی ہے۔ اسے پھاڑ کر ایک نظر دیکھ لوں۔ لیکن کرسی علیحدہ کمرے میں لے جاؤ نگا اور اس بات کی قیمت بیس روپے دوں گا۔"

میں نے عیدو کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور نفرت سے کہا۔

"کیوں تو سڑی ہو گیا ہے ———؟ تیرا دماغ چل گیا ہے ———؟ آخر تجھے ہوا کیا ہے؟"

"کچھ نہ پوچھو اُستاد! ——— چالیس پر منظور ہے ——— اچھا پچاس ارے ظالم ساٹھ ہی لے لے۔"

اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ کرسی ہیرے جواہر سے پٹی پڑی ہے۔ یہ ٹوٹی ہوئی کرسی نہیں قارون کا خزانہ ہے اور عیدو ڈاکو ہے۔ مجھے ہتیا لینا چاہتا ہے۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے دھکے دے کر نکال دوں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔

عیدو میرے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"نہیں دو گے؟"

"نہیں!" میں نے گرج کر کہا۔ "کسی قیمت پر نہیں دوں گا ——— بدمعاش کہیں کا۔ لفنگا۔"

"اچھا!" عیدو نے جواب دیا اور چلا گیا۔ لیکن اس "اچھا" میں نہ معلوم کیا تھا کہ میں سہم گیا۔

لیکن پھر چند لمحوں کے بعد میں نے سر کو جھٹکا دیا۔ اُونہہ!

جب مجھے یقین ہو گیا کہ عیدو چلا گیا ہے تو میں لپک کر گھر میں آیا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ ابھی کرسی کی گدی پھاڑ کر دیکھوں۔ لیکن علی بابا چالیس چور والا قصہ تو معلوم ہی ہوگا آپ کو ــــ پکڑے گئے تھے علی بابا، اور محض اپنی بیویوں کی مہربانی سے۔ مجھے بھی یہ قصہ خوب یاد تھا اس سلسلے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس خزانے سے بھری ہوئی ٹوٹی کرسی کو کہیں چھپا کر رکھ دوں اور رات کو جب گھر کے سب لوگ سو جائیں تب اُٹھ کر دیکھوں ــــ یہی تدبیر سب سے زیادہ مناسب تھی۔ چنانچہ میں نے کرسی کو نچلی چھت میں بڑی احتیاط سے رکھوا دیا اور خود دکان پر چلا گیا۔

لیکن دکان پر بیٹھا کس سے جائے گھڑی گھڑی کرسی کا خیال آتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی کرسی ہے، کہیں بچے خراب نہ کر دیں۔ کہیں بیگم جلانے کے لئے توڑنے نہ بیٹھ جائے اور اسی قسم کے ہزاروں خیالات آتے اس لئے گھڑی گھڑی اُٹھتا۔ کبھی پانی کے بہانے گھر پہنچ جاتا اور کبھی کسی اور طرح۔ غرض دن میں ایک نہیں بیسوں چکر گھر کے لگا ڈالے دروازے سے ایک بار نہیں پچاس بار دیکھے ــ ٹوٹی ہوئی کرسی کو ہاتھ پھیر کر سو مرتبہ دیکھا۔ اس کی گدی کو دبا دبا کر ٹٹولا۔ گدی عام گدیوں کی طرح سے تھی۔ کوئی چیز کھنکتی نہ تھی ــــ اس لئے کچھ شبہ سا ہوتا۔ لیکن پھر خود ہی اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا کہ نواب لوگ ایسے احمق بھی تو نہیں ہوتے۔ چیز چھپائی ہے تو پھر اگر وہ ٹٹولنے ہی سے مل جائے تو کمال ہی کیا ہے۔

غرض اسی ٹالنے بالنے میں دن بیت گیا۔ شام ہوئی تو میں نے بیوی اور بچوں کے لئے قیامت کھڑی کر دی۔ "سوتے نہیں ــــ معلوم ہوتا ہے کی ہانکسیر دُھلی رکھی ہیں ــــ نیند نام کو نہیں ــــ یوں نیند نہیں آتی تو افیون کھا لو"۔ اور خود بستر پہ پہلو بدل بدل کے تسلی تو ڑلی۔ لیکن نیند تو وقت پہ ہی آتی۔ بیوی میری گیارہ بجے تک جاگتی بچوں کو کہانیاں سناتی رہی اور میں پڑا مصنوعی خراٹے لیتا رہا۔

آخر خدا خدا کر کے ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بیوی کی آنکھ لگی تو میں دبے پاؤں بستر سے نکلا۔ اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح سانس روک کے پھونک پھونک کر قدم رکھتا اٹھا۔ لیکن کم بخت راستے میں تھا ٹھوکر لگی۔ گرا اور بیوی ایک چیخ کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سوالات کی بوچھار شروع ہوئی۔ لیکن میں نے کہہ دیا کہ پانی پینے اٹھا ہوں، تم سو رہو۔ اور بلاوجہ پانی کا گلاس حلق سے نیچے اتارنا پڑا۔ اور پھر بستر تھا اور میں ــــ!

آدھ گھنٹے کے بعد میں تہیہ کر کے اُٹھا اور سیدھا نیچے اتر گیا، لیکن میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی جب میں نے دروازہ کھولا۔ نچلی چھت کی کھڑکی کھلی تھی اور ایک سایہ کھڑکی میں لٹکا ہوا تھا۔ پہلے تو میں ڈرا۔ لیکن پھر یکدم مجھے احساس ہوا کہ اگر میں اب بھی ڈرتا ہی رہ گیا تو سارا خزانہ لٹ جائے گا۔ یہ خیال ہوتے ہی میں تڑپ کر بڑھا اور اس سائے کو پکڑ لیا ــــ کمبخت عیدو!

بیوی اُتری۔ بچوں نے شور کیا۔ محلہ والے دوڑے آئے اور عیدو عین موقع واردات پر گرفتار ہو گیا ــــ وہ ٹوٹی ہوئی کرسی چرا کر لئے جا رہا تھا۔

عیدو کو حوالات میں ڈلوا کر میں نے بھی دم لیا۔ کمبخت کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ اور اس کے بعد جب بچے سو گئے تو میں پھر کمرے میں گیا۔ دروازے کی کنڈی چڑھائی۔ موم بتی جلائی اور خزانہ دیکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔

چاقو میرے ہاتھ میں تھا لیکن میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرسی بھی سانس لے رہی ہے۔

اور یقین مانئے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کرسی کی گدی پھاڑ ڈالی ــــ ایسا گھبرایا ہوا تھا میں کہ میری انگلیاں تیز ہی چاقو سے زخمی ہو گئیں۔ لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ گدی کی تہیں پھاڑتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں ہیرے بھی ہیں اور موتی بھی، لیکن کاغذوں کی کترنوں اور ناریل کے بالوں کا ڈھیر میرے کمرے میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اور نہ کوئی ہیرا تھا نہ موتی۔ میرے دل پر کوئی خنجر مار رہا تھا اور میرا دماغ غصے کی شدت سے چکرا رہا تھا۔ لیکن میرے ہاتھ کاغذ کی کترنیں نکالنے میں مصروف تھے ــــ اندھا دھند ــــ پاگلوں کی طرح ــــ بچوں کی طرح میں وہ کترنیں نکال رہا تھا۔ اور اُڑا رہا تھا، اور پھر ــــ اف میرے اللہ ایک چھوٹی سی تصویر سنہری فریم میں جڑی رکھی تھی ــــ عیدو کی تصویر ــــ اور اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

سہیلی نے جھولے پہ جب گیت گائے
تمہاری قسم تم بہت یاد آئے

اور ٹیڑھی میڑھی لکیروں میں ایک جگہ نہیں کئی جگہ "کلثوم" لکھا تھا۔

عیدو کی تصویر کے ہونٹوں پر بھی یہی نام تھا۔ میں چند لمحوں کے لئے سکتے میں آگیا ——— ٹوٹی ہوئی کرسی کا کیسا عجیب و غریب راز تھا ——— ؟

عیدو حوالات کی سلاخوں کے ساتھ سر لگائے بیٹھا تھا۔ گویا سو رہا ہو ——— نہیں مر گیا ہو۔ میں نے آواز دی۔

"عیدو! ——— عیدو بھیّا!"

اور عیدو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے وہ تصویر اس کے ہاتھ میں دے دی۔

عیدو چند لمحوں کے لئے چپ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے کبھی میری طرف دیکھتا۔ کبھی تصویر کی طرف' اور آخر چند لمحوں کے بعد ——— چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے گویا ہوش آگیا۔ اور اس نے اس تصویر کو سینے سے لگا لیا۔

پھر آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

"چھوٹی بی بی! تو کیا یہ سچ تھا؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرحومہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے اور وہ اس سے باتیں کر رہا ہے۔

چاندنی

نظم

از حضرت سروش ملیح آبادی

یوں قصرِ شب میں ناز سے آتی ہے چاندنی — چھاگل ہر اک قدم پہ بجاتی ہے چاندنی
ٹیکا قمر کا، فرق پہ چمکا کے بار بار — پھر کہکشاں کی مانگ بناتی ہے چاندنی
ہر ایک پھول کھولتا ہے اپنی چشمِ تر — یوں بانسری چمن میں بجاتی ہے چاندنی
شبنم کی آرسی میں کبھی دیکھ کر جمال — پانی میں ایک آگ لگاتی ہے چاندنی
مینا شفق کی بھر کے صراحی میں ماہ کی — پھولوں کے ساغروں میں گراتی ہے چاندنی
شفاف کوہسار کی جھیلوں میں تیر کر — آنچل ہوا میں اپنا سکھاتی ہے چاندنی
کنگن پہن کے ماہ کا اپنی کلائی میں — افشاں جبیں پہ اپنی لگاتی ہے چاندنی
جیسے کسی حسین کا ڈھلتا ہوا شباب — یوں چپکے چپکے ڈوبتی جاتی ہے چاندنی

سینے میں ہر سروش کے اک اژدہامِ نور
دامن سمیٹے اپنا وہ جاتی ہے چاندنی

لاہور کا ایک بدنصیب بادشاہ

مغلیہ تاریخ کا ایک ورق

از جناب پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم۔ اے

۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو جب جہانگیر دارو گیر جہاں سے آزاد ہوا تو تین شخص تخت کے دعویدار موجود تھے۔ شہزادہ خسرو کا فرزند اکبر میرزا داور بخش۔ شہریار اور شاہجہان۔ ان تینوں میں شہزادہ داور بخش کا دعوائے تخت و تاج تو ایک جنون سا معلوم ہوتا تھا کیونکہ دربار میں کوئی بھی ایسا شخص موجود نہ تھا۔ جو اس کی پُشت پناہی کرتا۔ علاوہ ازیں نورجہاں نے احتیاطاً اس کو نظر بند کر رکھا تھا۔ شہریار نُورجہاں کی طرف سے تخت کا دعویدار تھا۔ وہ اس کا داماد تھا۔ اور کٹ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر کام کرتا تھا۔ شاہجہان آصف الدولہ کا داماد تھا اور اُمرائے سلطنت کی ایک زبردست جماعت اس کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ مگر وہ اس وقت دارالخلافہ سے دُور دکن کی مہمات میں مشغول تھا۔

شہریار جہانگیر کے ساتھ کشمیر کی سیر کو گیا ہوا تھا۔ مگر وہاں پر مرض داء الثعلب میں ایسا مبتلا ہوا کہ داڑھی اور مونچھوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس وقت اس کے چند ہوا خواہوں نے مشورہ دیا کہ لاہور جا کر اپنا علاج کرائے۔ نورجہاں نے ہر چند اُسے سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا اور آخر کار لاہور کی طرف چل کھڑا ہوا۔ خافی خان کا بیان ہے:۔

"دریں ایام شہریار بے عیار کہ بدو سہ مرض مبتلا گردیدہ
موئے ریش و بروت باد داد و بود بتقاضائے
مصلحت ظاہر ہوا۔ خواہان بدخواہ باوجود منع نورجہان
بقصد علاج سماجت زیادہ نمودہ مرخص گردید"[1]

یہی شہریار جس کو عوام نے ناشُدنی کا لقب عطا کر رکھا تھا ابھی لاہور وارد نہیں ہوا تھا کہ جہانگیر کی وفات کی خبر اسے چند ہوا خواہوں کی معرفت ملی۔ اور ساتھ ہی اُسے نورجہاں کا خط موصول ہوا جس میں مرقوم تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ ایک زبردست فوج جمع کر کے اس کے پاس چلا آئے[2]

اسی دوران میں آصف الدولہ اور ارادت خاں جو شاہجہان کیلئے بکھتی سے کام کر رہے تھے ایک مقام پر جمع ہوئے اور بہت ہی ردو کد کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ نورجہاں کو فی الفور حراست میں لے لینا چاہیئے۔ اور اس کے سلسلۂ رسل و رسائل کو بالکل بند کر دینا چاہیئے۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو اس کے پنجہ سے نکال لینا چاہیئے۔ چنانچہ سب سے اوّل چند معتبر خواجہ سراؤں اور لونڈیوں کو نورجہاں کی حفاظت کے لئے مامور کیا گیا۔ اور بعد ازاں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو صادق خاں کے سپرد کر کے بنارسی نامی ہرکارے کو آصف الدولہ کی انگوٹھی دے کر شاہجہان کی طرف روانہ کیا گیا۔ خافی خان کا بیان ہے کہ

"آصف خاں از منزل بھنبر بنارسی نام را کہ در یلغار رفتن ید بیضا می نمود مُہر خاص انگشت خود را از عدم فرصت حوالہ نمودہ نزد شاہجہان بتاکید اکید روانہ ساخت"

آصف جاہ نے ان کارروائیوں کے بعد میرزا بلاقی الملقب داور بخش کو نظر بندی سے نکالا اور مُژدۂ سلطنت سنایا۔ جو محض خواب و خیال معلوم ہوتا تھا۔ داور بخش اتنا کم عقل نہ تھا کہ اس بڈھے مدبّر کی چال کو نہ سمجھتا۔ اس نے فی الفور بھانپ لیا۔ کہ وہ ایک قربانی کا بکرا ہے جس کی بھینٹ شاہجہان کی خاطر سلطنت کی دیوی کو چڑھائی جاتی ہے۔ اس نے بہت عذر کیا مگر صادق خاں آصف جاہ اور ارادت خاں نے اُسے پُورے طور پر یقین دلا دیا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اُسی کی بہتری کے لئے ہے۔ چار و ناچار کسے داور بخش کے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونا پڑا۔ بھنبر کے مقام پر اس کے نام کا خطبہ پڑھایا گیا۔ چتر شاہی سر پر رکھا گیا۔ مُبارک باد کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں۔ اور زر و جواہر اس پر سے نثار کیا گیا۔

نورجہاں اور اس کی ہمشیرہ دونوں سوتی دھوتی جہانگیر کی نعش لیکر لاہور پہنچیں۔ لتنے میں شہریار نے لاہور میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اور اپنی بیوی کی تحریک سے خزانہ شاہی پر بلا حیل و حجت قبضہ تسلط کر لیا اور اپنے گرد و پیش ایک نہایت زبردست لشکر جمع

---

[1] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۳۵۶، [2] شاہجہان نامہ جلد اول صفحہ ۹۶

کرنے کی فکر میں مبتلا ہوا۔ اس غرض کے لئے اس نے خزانوں کے منہ کھول دیئے جس شخص نے جو کچھ مانگا وہی اسے دیا۔ اس بخشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتے کے اندر ستر لاکھ روپیہ قدیم و جدید منصب داروں میں بٹ گیا۔ افضل خاں میر سامان لاہور نے شہریار کا وکیل ہونا منظور کیا مگر وہ اندر ہی اندر آصف جاہ سے ساز باز کر رہا تھا، اور شاہجہاں کے لئے ہر طرح کی کوشش میں مشغول تھا۔

مرزا بایسنغر آصف جاہ کو خیر باد کہہ کر شہریار کے پاس آیا۔ شہریار نے اسے سلطان سپہ سالار کا خطاب عطا کرکے اپنی افواج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ مرزا بایسنغر شہزادہ دانیال کا خلف اکبر تھا اس کے دوسرے بھائی طہمورس اور ہوشنگ بھی شہریار کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔

سلطان سپہ سالار نے پندرہ ہزار فوج کی سرکردگی میں دریائے راوی کو عبور کیا اور شاہدرہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر داور بخش کی افواج سے نبرد آزما ہوا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ ایک ہاتھی پر داور بخش نہایت تجمل و شان سے جلوہ گر تھا۔ اور دوسرے پر آصف جاہ خود سوار تھا۔ شہریار کی تمام فوج ایک ہی حملہ میں تتر بتر ہو گئی۔ کچھ ہزیمت خوردہ سپاہ آصف جاہ سے جا ملی۔ باقی ماندہ سپاہی ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ بایسنغر مرزا ہمیشہ کیلئے صفحہ تاریخ سے معدوم ہو گیا۔ عام طور پر اس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھیس بدل کر ترکستان پہنچا۔ وہاں کے امیر نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دی۔ چنانچہ وہ اپنے خسر کی مدد سے ایک مرتبہ ہندوستان کے مغربی علاقہ پر حملہ آور بھی ہوا۔

شہریار لاہور سے باہر دو تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ نیرنگئ تقدیر کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کہ ایک ترکی سپاہی اس کے پاس آیا اور اس نے شکست کی دلخراش خبر سنائی۔ شہریار اپنی سپاہ کے ساتھ لاہور کے قلعہ میں چلا آیا۔ آصف جاہ نے قلعہ کو محصور کیا۔ رات کے وقت شہریار کے چند افسر چپ چاپ آصف جاہ کے پاس آئے اور اس سے وعدہ معافی لیکر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ شہریار جان کے خوف سے حرم سرا میں چھپ گیا۔ فیروز خاں خواجہ سرا نے اسے پکڑ کر اللہ وردی خاں کے سپرد کر دیا۔ وہ اسی حالت میں داور بخش کے پاس لایا گیا جس نے حکم دیا کہ اس کو محبوس رکھا جائے۔ دو تین دن کے بعد اس کو اندھا کیا گیا۔ اس [illegible]

تاریخ برآمد ہوتی ہے ؎

زنرگس گلا بہا رچہ نتواں کشید گشید ند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من بگو کور شد دیدۂ آفتاب

۱۰۳۷ ہجری

شہزادہ طہمورس اور ہوشنگ بھی اسی وقت حراست میں لے لئے گئے۔ آصف جاہ نے ایک عرضداشت شاہجہاں کے پاس ارسال کی۔ اور التماس کی کہ تمام کام درست ہو چکے ہیں۔ جس قدر جلد ہو سکے آپ موقعہ پر پہنچ جائیں۔ جب شاہجہاں آگرہ پہنچا تو اس کے حکم سے لاہور کا بد نصیب بادشاہ یعنی شہریار مندرجہ ذیل شہزادوں کے ساتھ تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

(۱) میرزا بلاقی المشہور داور بخش۔
(۲) گرشاسپ بن خسرو۔
(۳) طہماسپ } پسران دانیال
(۴) طہمورس }

خسرو کی بیوی اور اس کی خوشدامن اس جانگسل منظر اور حادثہ کی تاب نہ لا سکی۔ چنانچہ انہوں نے خودکشی کر لی۔ ان کے ساتھ ایک سو خواصوں نے بھی اسی فعل کا ارتکاب کیا۔

قتل کے بعد ان تمام شہزادوں کی نعشیں دہلی میں منتقل کی گئیں جہاں وہ ہمایوں کے مقبرہ میں مدفون ہوئیں۔

لاہور کے اس بدنصیب بادشاہ کی حکومت صرف چند ماہ رہی ہے۔ اس کی رفیقہ حیات کی قبر بھی نورجہاں کے مقبرہ میں موجود ہے۔

اس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ نورجہاں جیسی عاقل و فرزانہ عورت سے ایسی غلطی کا ارتکاب کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک با اقبال شہزادہ کو چھوڑ کر شہریار جیسے ناشدنی کی طرفداری کرتی۔ اکثر مورخین یہ بات نہایت زور شور سے لکھتے ہیں کہ اس غلطی کا باعث نورجہاں کی لڑکی لاڈلی بیگم ہے مگر یہ بیان اپنے اندر ذرہ بھر بھی صداقت نہیں رکھتا کیونکہ اگر لاڈلی بیگم کی شادی کے اسباب و علل پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ نورجہاں نے اپنی لڑکی کی شادی جان بوجھ کر

ل اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۱۳ پادشاہ نامہ جلد اول ص ۷۹ خلاصۃ التواریخ [illegible]

شہریار سے کی تھی۔ اس شادی کے وقت جہانگیر کے چاروں بیٹے موجود تھے۔ مغربی سیاحین کے بیان سے بھی پایا جاتا ہے کہ نور جہاں سب سے اوّل اس امر کی کوشش میں مبتلا رہی کہ کسی طرح لاڈلی بیگم کی شادی شہزادہ خسرو کے ساتھ ہو جائے۔ مگر خسرو کی غیور طبیعت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ ایک عورت کا دست نگر ہو کر رہے۔ شہزادہ پرویز مست لایعقل تھا۔ اُسے شراب کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی۔ پس نور جہاں کو اس کے ساتھ رشتہ کرنے میں کوئی ذاتی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ شہریار جہانگیر کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ وہ اگر بیوقوف نہیں تھا تو عقلمند بھی نہ تھا۔ وہ جاہ و منصب کا جویا بھی نہ تھا۔ عوام اسے ناشُدنی کے لقب سے ملقب کیا کرتے تھے۔

نور جہاں جو ۱۶۲۰ء سے جہانگیر کے پردے میں سلطنت پر حکومت کر رہی تھی۔ یہ چاہتی تھی کہ جب تک وہ زندہ رہے اسی طرح برسر اقتدار رہے۔ اور جہانگیر کے بعد جو بادشاہ اورنگ نشین ہو وہ اس کے اشاروں پر کام کرے۔ اسی غرض کے لئے اس نے جہانگیر کے چاروں بیٹوں کے اخلاق و عادات کا مطالعہ کر کے آپس میں موازنہ کیا۔ خسرو بہت ہی غیور تھا۔ عوام اس کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ اور اس کے علاوہ نور جہاں اور اس کے خاندان کے ہاتھ سے شدید ترین نقصان اٹھا چکا تھا۔ اور مدت العمر سے اس کے باپ اور بھائی اور بعد ازاں خود نور جہاں کے ظلم کا تختہ مشق بن چکا تھا۔ پس اس سے صلح کی اُمید فضول اور لاحاصل تھی اور نہ ہی وہ نور جہاں کے زیر اثر رہ کر کام کر سکتا تھا۔ نور جہاں نے اس کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی کوشش بھی کی۔ مگر اس نے صاف اور کھلے الفاظ میں انکار کر دیا۔ چنانچہ مشہور سیاح ڈیلاوالا لکھتا ہے کہ

"نور جہاں نے متعدد بار اس امر کی کوشش کی کہ اس کی لڑکی جو شیر افگن سے تھی کی شادی خسرو سے ہو۔ خسرو کی بیوی نے بھی اس معاملہ میں سارا زور صرف کیا مگر اس نے ایک نہ مانی"[1]

شاہجہاں نہایت مغرور، خود پسند اور متین تھا۔ وہ ہر بات اور ہر موقعہ پر اپنی آن اور شان قائم رکھنی چاہتا تھا۔ وہ جاہ و حشمت کی کوشش میں اپنی جان تک لڑا دینے کے لئے تیار تھا۔ وہ مُلک کی سیاسیات اور سلطنت کے رموز و کنایات اور حکومت کے جوڑ توڑ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ آصف خاں کی لڑکی سے نامزد ہو چکا تھا۔ نور جہاں یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر شاہجہاں سے قرابت داری بھی ہو جائے تو بھی وہ اسکی نسبت آصف خاں کے کہنے پر زیادہ چلے گا۔ مگر سلطنت اور حکومت کے معاملات میں وہ وہی کریگا جو اس کے اپنے دماغ میں آئے گی۔ اس لئے اس نے اس معاملہ میں شہزادہ خرم کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ پرویز جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ایک عیش پرست اور جاہ طلب نوجوان تھا۔ حکماء کی جماعت متفقہ طور پر اس کے خلاف یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اس لئے نور جہاں نے اُسے بھی اس معاملہ میں نظر انداز کر دیا۔

جہانگیر کے سارے بیٹوں میں ایک شہریار ہی ایسا تھا جو اس کے اشاروں پر کام کر سکتا تھا۔ چنانچہ قرعۂ فال اسی کے نام پر پڑا۔ لاڈلی بیگم کی منگنی دسمبر ۱۶۲۰ء میں اس سے ہوئی اور اس کے ایک سال کے بعد رسم کتخدائی آگرہ میں نہایت تزک و احتشام سے ادا ہوئی۔ شہریار کا منصب آٹھ ہزار ذات اور چار ہزار سوار مقرر ہوا۔

---

[1] سفرنامہ ڈیلاوالا جلد اوّل ص ۵۶۔

رباعی

[illegible] زندگانی فانی

[illegible] جوانی فانی

[illegible]

[illegible] فانی

مے خانۂ محبت

لٹ لٹ گیا ہے اک شہر میخانۂ محبت
کیا حسن سے غرض اور کیا غایتِ محبت
دنیا کی ہیں اسی سے سب راحتیں عبارت
وہ گل بھی کیا ہے جس سے ہو اک جہاں کو وحشت
اس کی ہر اک جھلک ہی دنیائے ہوش غفلت
آج آدمی کے ہاتھوں ہے آدمی کی کیا گت؟
مول اس کو لے نہ پائیں مذہب ہو یا کہ دولت
دنیا بدل گئی ہے مجھ ناتواں کے ہاتھوں
وہ حسن کی چمک تھی پڑتی تھی دھوپ پھیکی
بچ کر زماں مکاں سے کاٹی ہے عمر میں نے
دنیا سنوارنے میں دنیا بگاڑتے ہیں
ایسوں کی بیکسی پر آنکھیں بھر آئیں اکثر
ایسی بھی زندگی کو کیوں رائگاں سمجھ لوں
شعلے نہیں ہیں جس کے رشکِ عذابِ دوزخ
لیتا نہیں خدا کو انسان اپنے بدلے
اس کے بدن میں گویا دو وقت مل رہے ہیں
دنیا دھواں دھواں سی تارے گھلے گھلے سے

اس کی ہر اک نظر ہے شرحِ جنون و حکمت

از حضرت فراق گورکھپوری

ان مست انکھڑیوں کی بھرتی کہاں ہے نیت
بس یہ کہ آدمی میں آجائے آدمیت
پائی ہے حسن نے کیا سلجھی ہوئی طبیعت
اڑتا ہوا سا رنگ اور اڑتی ہوئی سی نکہت
اس کی ہر اک نظر ہے شرحِ جنون و حکمت
الفاظ کے ہیں دھوکے تہذیب و بربریت
بڑھتی چلی ہے شاید انساں کی قدر و قیمت
کیا انقلاب آئے، اللہ تیری قدرت!
جس طرح کھو گئی ہو خورشید کی حرارت
تیری مگر وہاں بھی پڑتی رہی ضرورت
کیا عشق کو تردد؟ کیا حسن کو قباحت
جھیلیں گے جو ابد تک یارب عذابِ جنت
میں محوِ سعیِ پیہم، دل واقفِ مشیت
وہ دل ابھی نہیں ہے شائستۂ محبت
کھلتی چلی ہے شاید اب چشمِ آدمیت
وہ دوپہر کی گرمی! وہ شام کی طراوت!
اب دیکھئے کہ کیا ہو انجام سوزِ فرقت

قائل فراق ہم ہیں اس شاعری کے بس میں
آفاقیت لئے ہو شعر و فن کی واقعیت!

بیزاری

مزاحی

از جناب شفیق الرحمٰن

جب امتحان کے دنوں میں مجھے یک لخت تیس چالیس بیماریاں لاحق ہو گئیں، دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ جگر نے ہڑتال کر دی اور سو گیا، کانوں میں ہوائی جہازوں کی آوازیں آنے لگیں، ٹانسل چپکے چپکے بڑھنے لگا، اسی طرح نہ جانے کیا سے کیا ہو گیا، تو میں سیدھا میڈیسن کے سب سے قابل پروفیسر کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھے بغور ملاحظہ فرمایا، اور کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "تمھارے سب نظام اچھے بھلے ہیں۔ بس تم بیزار ہو!" میں نے بیزاری کے لئے دوا طلب کی، بولے بیزاری کے لئے دوائیں بے کار ہیں۔

اور واقعی میں بیزار تھا۔ امتحانی بیزاری میں مبتلا تھا، اس دن مجھے پتہ چلا کہ خطرناک بیماریوں میں ایک بیماری بیزاری بھی ہے جس کا ذکر طب کی کتابوں میں سرے سے غائب ہے۔ امتحان میں پاس ہوتے ہی بیزاری دور ہو گئی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد ایک مریض سے میرا سابقہ پڑا۔ اس اللہ کے بندے نے جو شکایتیں بتائی ہیں تو میں کچھ دیر کے لئے چکرا سا گیا۔ بولے۔ "جگر میں گدگدی سی اٹھتی ہے، دل کروٹ لیکر اٹھ بیٹھتا ہے، پھر دونوں ٹلملانے لگتے ہیں اور گردوں تک پہنچ جاتے ہیں، ایک زبردست انتشار پیدا ہوتا ہے۔ پھر جیسے بجلی کی تڑپ گردوں سے نکلتی ہے۔ ایک شاخ تو گردن تک آتی ہے، اور آنکھیں مٹکنے لگتی ہیں۔ دوسری شاخ تلوؤں تک پہنچتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چھلانگیں لگاتا پھروں۔ پھر حلق میں ایک گیند سی پھنس جاتی ہے، اور کانوں میں گھنٹیاں شور مچاتی ہیں۔ ناک سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں، اور طبیعت کا ولولہ لہریں مارتا ہوا خدا جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

میں سوچنے لگا کہ ایسی بیماری آج تک تو دریافت نہیں کی گئی۔ میری محنت کی تو میڈیسن میں ایک نئی بیماری کا اضافہ ہو جائے گا۔ خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں، لیکن پھر میرے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا اور خوشی کی لہر جلدی سے اتر گئی۔

میں نے پوچھا: "صاحب آپ بیزار تو نہیں ہیں؟"

وہ چونک کر بولے۔ "کیا مطلب؟"

"یعنی آپ دنیا سے بیزار تو نہیں ہیں؟" میں نے دوبارہ دریافت کیا۔

"اوہ! میں اب سمجھا، احقر کا تخلص مجبور ہے، بیزار نہیں ویسے مطلب ایک ہی ہے دونوں کا۔"

"تو گویا آپ شاعر ہیں؟"

اب مجھے پتہ چلا کہ واقعی یہ بیزار ہیں۔ مختلف آلات سے ان کا معاینہ کرتا رہا لیکن کچھ ہوتا تو معلوم بھی ہوتا۔

ان سے کہا "صاحب آپ بالکل تندرست ہیں۔"

بولے۔ "یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ تو گویا ہم یہاں تفریحاً آئے ہیں۔"

آخر تنگ آ کر انھیں بتایا کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں واقعی وہ ٹھیک ہے۔ اور ان کا دل گردوں کی جگہ رکھا ہے۔ گردے تلوؤں میں پڑے ہیں۔ جگر دماغ تک پہنچا چاہتا ہے۔ اب علاج کا سوال تھا یکایک مجھے کچھ سوجھ گیا۔

پوچھا: "کیوں صاحب! آخری غزل آپ نے کب کہی تھی؟"

بولے۔ "دو ڈھائی مہینے ہوئے۔"

پوچھا۔ "اور بیمار کب سے ہیں؟"

بولے۔ "بس یہی دو ڈھائی مہینے سے۔"

پوچھا۔ "یہ غزل آپ نے کسی کو سنائی بھی؟"

کہنے لگے۔ "نہیں تو۔"

کہا۔ "تو آپ مجھے سنا دیجئے۔"

بولے "نہیں صاحب، یہ کیا فرماتے ہیں آپ، کہاں یہ ناچیز اور کہاں اس ناچیز کا ناچیز کلام۔ لیکن خیر! اگر آپ مصر ہیں تو یہ لیجئے۔"

انھوں نے آدھ گھنٹہ تک اپنی غزل گا کر، رو رو کر (کیونکہ اس میں گانا کم اور رونا زیادہ تھا) میں نے بُری طرح داد دی۔ جب وہ غزل سنا چکے تو میں نے کہا۔ جناب فی الحال تو آپ کے علاج کی کوئی

دوست نہیں۔ اگر پھر اس قسم کا کوئی دورہ لگے تو تشریف لے آئیگا۔"
وہ ہنسی خوشی چلے گئے۔ چند مہینوں کے بعد پھر تشریف لائے۔ بُرا حال تھا۔ انتہائی بیزاری تھی۔ غزل سُنائی اور مسکراتے ہوئے تشریف لے گئے۔

اب آپ کوئی اوسط درجہ کا گھرانا لیجیئے۔ بچے بیزار ہیں کہ انہیں ڈانٹ دیا جاتا ہے۔ امی بیزار ہیں کہ نوکر کہنا نہیں مانتے۔ نوکر بیزار ہیں کہ میاں کے دوست بہت تنگ کرتے ہیں۔ اور میاں بیزار ہیں کہ بچوں کے ماموں تیسرے روز شکار کھیلنے آجاتے ہیں۔ ماموں بیزار ہیں کہ رائفل کا لائسنس اب تک نہیں ملا۔ چچا بیزار ہیں کہ ان کے صاحبزادے اپنی مرضی کے مطابق شادی کرینگے۔ ان کے صاحبزادے بیزار ہیں کہ جن خاتون کو وہ چاہتے ہیں وہ اب کھنچی کھنچی سی رہتی ہیں اور وہ خاتون بیزار ہیں کہ اب ان کا ہاضمہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اور اکثر پسلی میں درد ہو جاتا ہے۔
اب پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیزاری شروع کہاں ہوتی ہے اور ختم کہاں ہوتی ہے۔ اور یہ سب کے سب بیزار کیوں ہیں؟ کیا بیزار رہنا ان کا شغل ہے؟ کبھی آپ نے غور کیا اس پر ———؟
اسی طرح ایک موڈ (MOOD) کی بھی بہت بڑی علت ہے یہ موڈ بیزاری کا چھوٹا بھائی ہے۔ اچھے موڈ کو ہم موڈ نہیں کہتے لہٰذا یہاں صرف بُرے موڈ کا ذکر ہو رہا ہے۔ جب موڈ شروع ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر بیزاری تشریف لایا چاہتی ہے۔
"سنائیے صاحب! آپ کی صحت کیسی ہے؟"
"آج میں موڈ میں ہوں۔"
"اوہو ———!"
"کل اچھا بھلا تھا۔ آج صبح سے موڈ شروع ہو گیا۔"
"کیوں صاحب سینما چلئے گا؟"
"نہیں معاف کیجیئے میں نے ابھی موڈ کے متعلق عرض کیا تو تھا۔ یہ موڈ کیا ہوا۔ اچھا خاصا دورہ ہو گیا۔ کہ نہ جانے کس وقت پڑ جائے۔ میں اس قسم کے حضرات سے بہت ڈرتا ہوں۔ جنھیں موڈ کے دورے اکثر اٹھتے ہوں۔
مصیبت تو یہ ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ موڈ شروع کب ہوا تھا اور جائے گا کب؟ اور اگر چلا گیا ہے تو کب گیا ہے؟ اور کس وقت آن دبوچے گا؟
نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قسم کے حضرات سے باتیں کرتے وقت دل دھڑکتا رہتا ہے۔ دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ خدایا انھیں ابھی موڈ نہ آئے۔ اگر آئے بھی تو اس وقت جب ہم چلے جائیں۔
مجھے اگر معلوم ہو جائے کہ یہ صاحب موڈ میں ہیں تو میں کئی کئی دن ان کے پاس نہیں پھٹکتا۔
آپ نے کوٹھیوں کے پھاٹک پر نام کی تختیاں دیکھی ہونگی، جہاں یہ لکھا ہوتا ہے کہ "اندر ہیں"۔ یا "باہر گئے ہیں"۔ اس کے ساتھ ہی اگر موڈ کے لئے بھی چھوٹا سا خانہ بنا دیا جائے تو ہماری مشکلیں ایک حد تک آسان ہو جائیں۔
کسی سے ملنے گئے۔ لکھا ہے۔ "اندر ہیں" آگے لکھا ہے: "موڈ اچھا ہے" بس ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے بلا دھڑک اندر چلے گئے۔ اور اگر لکھا ہو "اندر ہیں" اور آگے لکھا ہے "موڈ اچھا نہیں" یا "موڈ مشکوک سا ہے" (یعنی بالفاظ دیگر بیزار ہیں) تو فوراً بواپسی ڈاک تشریف لے آیئے۔
دیکھئے نا اس قسم کے اصلاحات کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔

ایک مرتبہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ ذہن میں یہی بیٹھا ہوا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے کسی سے محبت ہو جاتی ہے اور خواہ محبت آگے چلے یا وہیں ختم ہو جائے اس کا اثر ساری عمر زایل نہیں ہوتا۔ انگریزی میں اس حرکت کو فرسٹ لو (FIRST LOVE) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ وقت کے فرمان کے سامنے مجھے بھی سر جھکانا پڑا اور یہی سمجھ کر کہ یہ پہلی اور آخری محبت ہے اپنا بُرا حال کر لیا۔ وہ خاتون مجھ سے چھ ماہ بڑی تھیں۔ ان کی صحت واجبی سی تھی۔ باتیں قنوطیوں کی سی کرتی تھیں۔ ہر وقت بیٹھی سوچتی رہتی تھیں۔ لیکن مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس وقت تو مجھے علم نہ تھا لیکن اب وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بیزار تھیں۔
کتنی مرتبہ میں نے کوشش کی کہ ان سے اپنے خلوص کا اظہار کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی تکلف میں میں انھیں کچھ نہ کہوں اور یہ کچھ نہ سمجھیں اور دونوں کا وقت مفت میں ضائع ہوتا رہے ——— لیکن میں کہہ نہ سکا جب بھی میں ارادے باندھ کر جاتا تو وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتیں کہ بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی اور میں موسم وغیرہ

کے متعلق گفتگو کرکے واپس آجاتا۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ چند دنوں کے بعد اپنے ابا کے ہمراہ کہیں باہر جائیں گی۔ ایک ماہر دوست نے بتایا کہ ایسے موقعوں پر اگر چلتے چلتے اظہار محبت کر دیا جائے تو بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ جتنے دن وہ باہر رہینگی انھیں تمھارا خیال رہے گا۔ اور جب وہ واپس آئینگی تو ان کے دل میں تم ہی تم ہوگے۔ قصہ مختصر میں ان سے ملا۔

بولیں "اررر — ! بھئی ذرا پرے بیٹھو، یہ اتنی تیز خوشبو کیوں لگائے رکھتے ہو ہر وقت — مجھے تو پہلے ہی زکام ہے تعجب ہے تمھیں زکام نہیں ہوتا"

بسم اللہ ہی غلط نکلی — !

دیکھئے ذرا میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں، بہت ضروری ہیں۔ آپ کہیں باہر جارہی ہیں نا؟"

"ہاں! جارہی ہوں، کوئی اعتراض ہے؟"

"لاحول ولاقوۃ — بھلا اعتراض کیا ہوسکتا ہے؟ ویسے آپ سن لینگی نا؟"

"سننے کو سن لونگی، کانوں میں انگلیاں تو دینے سے رہی۔ اور یہ کیوں تم لگاتار میری دہنی آنکھ کی طرف دیکھ رہے ہو؟ مانا کہ اوپر کی پلک ذرا سوجی ہوئی ہے — پھر کاٹ گیا تھا"

"لاحول ولا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ آپ کی پلک سوجی ہوئی ہے۔ یہ تو آپ خود — !"

"تو گویا تم کہنا چاہتے ہو کہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا — کیوں؟"

"نہیں تو — لاحول ولاقوۃ — بھلا میں — !"

"اور یہ کیا لاحول ولا، لاحول ولا لگا رکھی ہے۔ کوئی شیطان بیٹھا ہے یہاں — ؟"

میں چپ ہوگیا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ کہاں تو باتیں کرنے آئے تھے اور کیا اب گم سم بیٹھے ہو — بولو!"

"جی کیا خاک بولوں، جی نہیں چاہتا کچھ کہنے کو — !"

"اسی طرح بولتے ہیں بڑوں سے کہیں، کیا خاک کہوں — شاباش ہے! — پتہ بھی ہے میں تم سے چھ مہینے بڑی ہوں"

"جی ہاں! جبھی تو میں ہمیشہ آپ کا ادب کرتا ہوں، بالکل بزرگوں کی طرح — !"

"کیا کہا، بزرگوں کی طرح؟ — تو تمھارے خیال میں میں بچاس ساٹھ برس کی ہوں اور تم ننھے بچے ہو — بزرگوں کی طرح ادب کرتے ہو — چھ مہینے کا فرق بھی کوئی فرق ہوتا ہے"

— میں پھر چپ ہوگیا —

"بولتے کیوں نہیں؟ — چپ کیوں ہو؟ — وہ کون سی باتیں ہیں — ؟" وہ ڈانٹ کر بولیں۔ میں بدستور فرش کو دیکھ رہا تھا۔

"تو گویا اب تم میری اونچی ایڑی کی جوتیوں پر اعتراض کروگے؟ جبھی گھنٹہ بھر سے انھیں ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہے ہو۔ پھر کہوگے کہ جرابیں کیوں نہیں پہنیں؟"

اب میں بھلا کیا کہتا۔ اتنے میں خادمہ اندر آئی۔

وہ بولیں۔ "میرا فروٹ سالٹ لاؤ"

پھر میری طرف دیکھ کر بولیں "پیوگے فروٹ سالٹ؟"

"جی نہیں!"

"ہاں تم کیوں پینے لگے فروٹ سالٹ؟ جیسے یہ کاٹ ہی تو کھائے گا؟ اب جاکر سب سے بتادینا کہ میں فروٹ سالٹ پیتی ہوں کیوں — ؟"

"لائیے میں ایک گلاس پیئے لیتا ہوں"

"نہیں بھئی! مجھ پر احسان مت کرو، بیشک مت پیو — ہاں تو وہ باتیں کیا ہیں جو تم کہنا چاہتے ہو، ذرا جلدی سے بتا دو۔ ابھی دس پندرہ منٹ تک میری ایک سہیلی آنے والی ہیں"

میں نے سوچا کہ اب اتنا قضیہ ہوا ہے، چلو اب کہہ ہی دیں۔ میں نے بڑے پردرد لہجے میں شروع کیا۔ شاید یہ باتیں میں کبھی نہ کہتا۔ لیکن متواتر بے رخی نے اور عدم توجہی نے مجھے — !"

"تمھارا گلا کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ زکام کا اثر ہے یا نزلہ کا؟"

حالانکہ میں نے آواز کو پردرد بنانے کی کوشش کی تھی۔

"گلا تو ٹھیک ہے!"

"ٹھیک کیسے ہے؟ میں جو کہہ رہی ہوں کہ بیٹھا ہوا ہے"

"جی ہاں بیٹھا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کچھ میں کہونگا آپ سن لینگی نا؟"

"ہاں ہاں! سن لونگی، سن لونگی، سن لونگی کتنی مرتبہ تو کہا ہے کہو تو عہد نامہ لکھ کر دستخط کر دوں — اب کہہ بھی چکو"

"وہ دراصل — ہاں — میں ان باتوں کا جواب ابھی نہیں چاہتا، آپ بیشک ابھی جواب نہ دیں، میں — "

"چچ — بھلا جن باتوں کا جواب تمھیں درکار نہیں ان کے

دکھ سے فائدہ ــــ؟"

اتنے میں خوش حال آ گیا۔ اور ساتھ ہی ان کی سہیلی جس نے بالکل ان خاتون جیسا نشہ بنا رکھا تھا۔

اس کے بعد میں نے کبھی کسی سے اظہار محبت نہیں کیا۔ چند سال کے بعد اس راز کا انکشاف ہوا کہ محبت اور بیزاری ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔

اب اگر بیزاری کی وجہ سوچی جائے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بعض اوقات سینکڑوں وجوہ دریافت ہو جاتی ہیں اور بعض دفعہ ایک بھی وجہ معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر امیری اور غریبی کو لیا جائے تو جواب صفر نکلتا ہے عموماً امیر زیادہ بیزار نکلیں گے۔ غریبوں کو اول تو بیزار ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور جو بیزار ہوتے ہیں وہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم تو دنیا میں تفریحاً بھیجے گئے ہیں۔ زندگی کا لطف تو امیر اٹھا رہے ہیں۔ ادھر امیر ہیں کہ بہت سی دوائیں کھا رہے ہیں۔ بہت سے بیکار ہیں اور بیزار ہیں۔ اگر بیمار ہیں تو بھی بیزار ہیں، اگر بیمار نہیں ہیں تو بھی، اسی طرح اگر دبلے ہیں تو بھی بیزار ہیں اور اگر موٹے ہیں تو بھی، ایسے امیر گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر رشک کھا کھا کر بیزار رہتے ہیں، ان سے کوئی کہے کہ بسم اللہ بھئی جاؤ جا کر گاؤں میں رہو منع کون کرتا ہے، لیکن انہیں یہ بھی پتہ ہے کہ اگر گاؤں میں چلے گئے تو ہفتہ بھر میں بیزار ہو جائیں گے۔

کنوارے بیزار ہیں کہ شادی کر لیتے تو اچھا رہتا اور شادی شدہ حضرات بیزار ہیں کہ کیوں کر بیٹھے؟

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بین الاقوامی بیزاری کیوں ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہ یہ خواہشیں اور اُمنگیں بہانے ہیں اور ہم واقعی بیزار رہنا چاہتے ہیں۔ بیزار رہنا ہماری فطرت میں ہے، اور اگر ہم بیزار نہ ہوں تو اداس ہو جاتے ہیں۔

ہمارے لٹریچر اور خصوصاً ہماری شاعری میں حزنیہ پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ اگر ہم اسے حزنیہ لٹریچر کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ویسے بھی ہماری زندگی میں رنج کو اس قدر دخل ہے کہ جس روز ہم غمگین نہ ہوں اُداس ہو جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی آ کر ہمیں غمگین بنا جائے، جب ہم ہنستے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گناہ کر رہے ہوں، اور ہمیں ہنسنے کا کوئی حق نہیں، خصوصاً زور زور سے ہنسنے کا، اس لئے مسکراہٹ کی غرض سے بڑی لطیف شعر میں اتر جاتی ہے اور ...

اُداس ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے رنجیدہ خیالات کے سلسلے کی کڑی حفاظت سے وہیں سے شروع کر دیتے ہیں جہاں وہ قطع ہو گیا تھا۔

ایک چمکیلی صبح کو میرے ایک دوست نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے فوراً ہی شادی نہ کی تو نظام شمسی درہم برہم ہو جائے گا۔ اور دنیا ان کی شادی کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی ہے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے مشورہ لینے۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ بھئی ان معاملوں میں تو میں بالکل اناڑی ہوں۔ جو جی چاہتا ہے کر لو۔ بولے نہیں مشورہ ضروری ہے، اور وہ بھی تمہارا۔

میں نے کہا اچھا، لیکن جو کچھ کرو گے اپنی ذمہ داری پر کرو گے، یا دیگر الفاظ میں محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

بولے۔ "اس وقت میری نگاہ میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ تم سب کو دیکھ چکے ہو۔ برکت۔ رشیدہ۔ رفعت۔ ثروت اور نزہت، کیوں دیکھا ہے نا انہیں؟"

"دیکھا ہے!" میں نے اقبال جرم کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں کون سی بہتر ہوگی؟"

"سب ہی اچھی ہیں۔"

"یوں نہیں، میاں زندگی بھر کا سودا ہے، کہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔ ذرا سوچ سمجھ کر مشورہ دینا۔"

"برکت اچھی ہے۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"اول تو اس کا نام ہی یونہی سا ہے۔ برکت۔ بھلا کیا بات ہوئی، کس چیز کی برکت، کیوں برکت، بڑا غیر شاعرانہ نام ہے، ویسے خاصی ہے، لباس پہننے کی بھی تمیز ہے، لیکن ان کے ہاں ایک خاندانی مرض ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ سرگوشیوں میں بولے۔ "ان کی نانی جان کا دماغ چل گیا تھا۔"

"یعنی چل پڑا تھا، اور چلتے چلتے کہیں کا کہیں چلا گیا تھا"

"نہیں، ان کے دماغ میں خلل آ گیا تھا، اور ان کے چچا کے چچا زاد بھائی بھی کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ماموں کی ماموں زاد بہن بھی ادھر اُدھر کی ہانکتی رہتی ہیں۔"

"اور یہ ــــ؟" میں نے بڑے راز دارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ابھی تک تو خیریت ہے۔ لیکن ڈر ہے نہ جانے کب یہ مرض زور کر بیٹھے۔"

"اوہ ــــ خیر ــــ!! رشیدہ سہی۔"

"آخر کس طرح سہی رشیدہ؟" یونہی کہہ دیا۔ دیکھتے نہیں روز بروز دبلی ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے سال اس کا وزن خاصا تھا، ان سردیوں میں ساتھ آٹھ پونڈ گھٹ گیا۔ اور اب یہ پورے دو سٹون کم ہے۔"

"امتحان کی وجہ ہوگی۔"

"ابھی امتحان کی وجہ نہیں، یہ تو یوں باقاعدہ دبلی ہوتی جا رہی ہے کہ مجھے تو ڈر ہے کہیں دُبلی ہوتی ہوتی غایب ہی نہ ہو جائے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ــ لیکن پھر بھی کچھ جی نہیں چاہتا۔"

"تو پھر رفعت سہی۔"

"تم نے کبھی غور سے اس کا چہرہ دیکھا؟ ایک آنکھ چھوٹی ہے ایک بڑی۔ شاید دائیں آنکھ چھوٹی ہے۔"

"کبھی ناپ کر دیکھا؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"مذاق مت کرو۔ اور اس کے علاوہ وہ ہر وقت گم سم بیٹھی رہتی ہے۔ آج تک اسے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اس کا چہرہ بھی زرد ہے، ہاں اور اس کے بال بھی چھوٹے ہیں، گرتے بھی ہیں، دماغی کمزوری کی وجہ سے یا نزلے کی وجہ سے۔"

"اور ثروت! اس کے بال کتنے لمبے ہیں اور کیسی ہنس مکھ ہے۔"

"لیکن بھئی اس کے موٹے ہو جانے کا بڑا ڈر ہے۔ آہستہ آہستہ شروع ہوتی جا رہی ہے۔ دو تین سال تک خوب موٹی ہو جائیگی، اور وہ ہے بھی مسخری۔ جب دیکھو ہنستی رہتی ہے۔"

اب فقط ایک خاتون باقی رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا شاید یہی اچھی لگتی ہوں اور وہ ان کے ریویو سے بچ جائیں۔

"تو پھر نزہت سے کرو گے تم شادی؟"

"وہ اچھی ضرور ہے۔ اس میں خوبیاں بھی بہت سی ہیں، لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ باتونی ہے، کیا مجال جو اس کے سامنے کوئی بات تک کر سکے۔ فوراً جرح شروع ہو جاتی ہے، بس وکیل ہے بالکل۔ اور میرا امن پسند شخص۔ بحث مباحثے سے بہت گھبراتا ہوں، اب بتاؤ میں کیا کروں؟"

میں دیر تک سوچتا رہا پھر نہایت خلوص سے بولا۔

"میں تو یہی مشورہ دونگا کہ ان حالات میں تو تم صبر ہی کر لو۔"

"صبر کر لوں؟ یعنی؟"

"کنوارے رہو، تو بہت مناسب ہے، شاید کسی روز تمہیں ــ!"

"تم پھر مذاق پر اُتر آئے۔"

"اچھا تو یوں کرو کہ قرعہ اندازی کر لو۔ جس لڑکی کا نام آئے اس سے شادی کر لو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے، تمہارے سامنے دل کا راز کھولنا ہی کیا۔"

"اچھا ایک برادرانہ مشورہ دوں۔"

"ہاں ہاں!"

"تم چھٹی لے کر پہاڑ پر چلے جاؤ۔ وہاں عمدہ غذا کھاؤ۔ خوب ورزش کرو۔ مزاحیہ کتابیں پڑھو اور جب صحت درست ہو جائے تو واپس آ کر کسی ایک کا انتخاب کر لو۔"

"تو گویا یہ احترام ہے تمہارے دل میں میرے جذبات کا۔" وہ ناراض ہو کر بولے۔

میں نے آخر سچ سچ کہہ دیا۔

"بھیا قصور نہ کسی لڑکی کا ہے اور نہ تیرا ــ بس تو بیزار ہے، بالکل بیزار ہے، اپنی زندگی سے، اپنے آپ سے، دنیا سے، ہر چیز سے بیزار ہے۔ تیرا اللہ مالک ہے۔"

میں اور ایک صاحب سینما دیکھ رہے تھے۔ دفعتہً میرے ساتھی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر میرے کان میں بولے۔ "سبحان اللہ کیا ناک پائی ہے۔ جی چاہتا ہے غش کھا جاؤں ــ کھا جاؤں غش!"

"صبر کیجیے حضرت!" میں نے کہا۔ "یہ بھی کوئی غش کھانے کی جگہ ہے، کیا کہیں دودھ کا گلاس تو نہیں دیکھ لیا؟" (یہ صاحب دودھ کو دیکھتے ہی غش کھا جاتے تھے خدا جانے کیوں؟)

"نہیں یہ بات نہیں، بالکل ہمارے پیچھے ایک صاحب بیٹھے ہیں جن کی ناک قابلِ دید ہے۔" وہ سرگوشیوں میں بولے۔ "یوں لگتی ہے جیسے مصنوعی ناک ہو۔ یا یہ صاحب محض ناک کی ورزش کرتے ہوں۔"

میں نے بڑے آرٹ سے سگریٹ سلگاتے ہوئے پیچھے دیکھا۔ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا۔

"کہاں ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"پھر دیکھو، بالکل ہمارے پیچھے بیٹھا ہے، اُفوہ! وہ ناک کو رگڑ ڈالتا ہے۔ اب دیکھ بھی چکو۔"

میں نے پھر کروٹ سی لی اور پینترہ بدل کر پیچھے جھانکا۔ (آپ جانتے ہونگے کہ ایسے موقعوں پر کتنی قباحت ہوتی ہے)

"نظر نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

وہ پھر آہستہ سے بولے۔ "مجسم بیزاری ہے بالکل، ایمان سے"

دیکھنے کی چیز ہے۔ ایسی ناک کے درشن بار بار نہیں ہوتے۔ آخر تمہیں نظر کیوں نہیں آتا؟"

میں نے گردن کو مروڑ کر پیچھے جھانکا۔

اتنے میں میرے پیچھے بیٹھے ہوئے صاحب بڑے روتے لہجے میں بولے ـــ "ادھر دیکھئے حضرت! بیزار میں ہوں، اور میری ہی ناک وہ نادر شے ہے جس کی تلاش میں آپ ہیں۔ للہ مجھے جلدی سے دیکھ لیجئے اور پھر سیدھے بیٹھ جائیے۔"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک بیزار ترین چہرہ، عجیب بیزاری سے بیزار تھا۔ جس پر ایک عجیب وغریب ناک چسپاں تھی۔

اس کے بعد ان کی ناک اور ترچھی ہوتی گئی۔ اور چہرہ اور بیزار ہوتا گیا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر ہم بھی بیزار ہوتے گئے۔

ایک مختصر سی بیزاری ہم موسم کے ہیر پھیر میں خواہ مخواہ مول لے لیتے ہیں، اور بہت سے حضرات دیکھے جو موسم پر پیچ وتاب کھا کھا کر بیزار رہتے ہیں۔ کسی گرم دن میں لوگ گرمی کو خوب کوستے ہیں۔ اور کسی برسات کے دن کو یاد کرتے ہیں کہ آہا ہا، کیا ٹھنڈا اور سہانا دن تھا، اور برسات کے دن وہی حضرت بادلوں کو کوس رہے ہونگے کہ کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ صبح سے ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ، جہاں ہاتھ لگاؤ گیلا ہی گیلا ہے۔ سورج نکلے تو کوئی بات بھی ہو۔

سردیوں میں گرمیوں کا فراق ستاتا ہے۔ گرمیوں میں سردیوں کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں جس روز بیکار ہوں اس روز کام یاد آتا ہے، اور جب کام کر رہے ہوں تو بیکار رہنے کے لئے دل مچلتا ہے غرضیکہ کسی بات سے بھی تسلی نہیں۔

فرمائینگے۔ "وہ شام کیسی اچھی تھی۔"

پوچھو "کون سی شام تھی، اور اس میں کیا تھا؟"

جواب دینگے۔ "۷ ارجنوری کی ایک سہانی شام، جس میں ایک خوبصورت ترین غروب آفتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔"

آج بھی ویسی ہی شام ہے، نہایت دلفریب غروب آفتاب ہے، لیکن چونکہ وہ گذر چکی ہے اس لئے دراصل وہی اچھی تھی۔ اس شام کا ہرگز لطف نہیں اٹھایا جائے گا۔ اور اگر کبھی ذکر بھی ہوا تو وہ آج سے دو چار سال کے بعد ہوگا۔ کیونکہ عہد کر چکے ہیں کہ ہمیشہ پچھلی باتیں یاد کر کر کے بیزار رہا کریں گے۔

کسی مجلس میں لطیفے ہو رہے ہیں۔ مسکراہٹوں سے سب کے چہرے روشن ہیں۔ شگفتگی ہے۔ یکلخت ایک دُھند سی چھا جاتی ہے، جو بڑھتی جاتی ہے، لوگوں پر ایک نشہ سا چڑھنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے مُنہ لٹکنے شروع ہو جاتے ہیں۔ تنے ہوئے ہونٹ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ ماتھے پر شکنیں آجاتی ہیں۔ شگفتگی بخارات بن کر اُڑ جاتی ہے پہلے چند آدمی بیزار ہوتے ہیں۔ پھر دیکھا دیکھی اور بیزار ہونے لگتے ہیں اور ذرا سی دیر میں ساری مجلس بیزار ہو جاتی ہے۔ اس سے بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ بیزاری ایک قسم کی چھوت کی بیماری ہے جس کے جراثیم ہوا میں موجود ہوتے ہیں۔ جب چاہیں ہمیں آن دبوچتے ہیں۔

اسی طرح کئی مرتبہ یوں ہوا کہ کوئی بڑا نفیس کرکٹ میچ ہو رہا ہے، بڑی پھرتی سے کھیل کھیلا جا رہا ہے، لوگ بار بار تالیاں بجاتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔ دفعتہً بولر ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ سلپ کے فیلڈر تو گویا زمین میں دھنس جاتے ہیں، اور وقت پر اوپر نہیں اٹھتے۔ باونڈری کے فیلڈر اونگھنے لگتے ہیں اور پھر خواب خرگوش کے مزے لینے لگتے ہیں۔ وکٹ کیپر کوئی عشقیہ غزل دھیمے سُروں میں گانے لگتا ہے، اور لیگ کا فیلڈر طبلہ بجاتا ہے۔ بیٹسمین قسم کھا لیتے ہیں کہ نہ تو سکور کرینگے نہ آؤٹ ہونگے۔ بیچ بیچ شروع ہو جاتی ہے، امپائر اپنی محبوبہ کے خیال میں غرق ہو جاتے ہیں اور کسی اپیل وپیل کو خاطر میں نہیں لاتے، اس وقت فضا میں ایک عجیب "پوستیانہ" (پوست سے نکلا ہے) اثر طاری ہوتا ہے۔ دیکھنے والے اونگھنے لگتے ہیں اور چاروں طرف بیزاری ہی بیزاری ہوتی ہے تب یقین ہو جاتا ہے کہ بیزاری کے جراثیم ہوا میں موجود ہیں۔

میں نے بیزار بچے بھی دیکھے ہیں۔ جو یا تو رونے پر تل جاتے ہیں اگر آپ کسی کتے بلی کو چھیڑ دیں۔ تو وہ خواہ مخواہ ٹھنکنے لگتے ہیں، یا ان کا چہرہ اس قسم کا ہوتا ہے، جیسے کوئی بت رکھا ہو۔ انھیں چھیڑو، ہنساؤ، گدگداؤ، یا ایک آدھ ہلکا سا چانٹا رسید کر دو لیکن کیا مجال جو ان پر اثر ہوتا ہو۔ بس یونہی بیٹھے دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ مراقبے میں تو نہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک صاحب سے ملنے گیا، وہ گھر میں تھے نہیں ان کا ایک بچہ باہر آیا۔ جس کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔ پاس آکر چپکا کھڑا ہو گیا۔ نہ علیک نہ سلیک، پوچھا کہ "بھئی تمہارے

بچے کہاں ہیں؟"

جواب ملا "باہر ہیں"

پوچھا "کب تک آجائیں گے؟"

بولا۔ "پتہ نہیں، شاید آنے والے ہوں اور جو نہ آئیں تو رات تک نہ آئیں۔ ویسے آئیں گے ضرور، اکثر آجایا کرتے ہیں۔ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھئے"

میں جاکر اندر بیٹھ گیا۔ ساتھ کے کمرے سے جھڑکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی خاتون اس بچے کو دھمکا رہی تھیں کہ "تو بالکل بدتمیز ہے۔" بچہ کہہ رہا تھا: "میں نے کہا تو تھا بیٹھ جایئے" وہ بولیں: "احمق کہیں کے، ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ تشریف رکھئے" ذرا سی دیر میں وہی بچہ منہ بنائے آیا اور کواڑ کھول کر بولا "جناب تشریف رکھئے" اور واپس چلا گیا۔

اگر کوئی خاتون دھیمے سُروں میں مندرجہ ذیل گانے گنگنائیں،

ع "میرے لئے جہان میں چین نہ قرار ہے"

ع "جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے"

ع "اب میں کاہ کروں کت جاؤں؟"

ع "دکھ کے اب دن بیتت ناہیں" وغیرہ یا اسی قسم اور چیزیں الاپنے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ نہایت بیزار ہیں۔ ورنہ گانے اور بھی تو ہیں مثلاً

ع "دنیا رنگ رنگیلی بابا ۔۔۔"

ع "جگت میں پریم ہی پریم بھرا ہے"

ع "ناچو ناچو پیارے من کے مور"

یہ بھی تو گنگنائے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح بیزار حضرات کا پتہ بھی آسانی سے چل سکتا ہے۔ میں آپ کی توجہ ان بیزار ہستیوں کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو نہ صرف بیزار ہیں بلکہ بیزاری پھیلاتی بھی ہیں ان سے ہمیشہ دور رہنا چاہیئے۔ اس قسم کے حضرات جنگ کی ہولناک باتیں لے بیٹھتے ہیں خطرناک بیماریاں۔ وحشتناک وبائیں۔ زلزلوں اور طوفانوں کے ذکر، زندگی اور موت کے مسائل یہ ان کی محبوب باتیں ہیں۔ وہ قنوطی لٹریچر پڑھتے ہیں ہر وقت سرد آہیں بھرتے ہیں۔ بیزاری کی تبلیغ کرنا ان کا محبوب شغل ہے۔ وہ اکثر بیزار کن گانے گاتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ ؎

پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا
یوں ہم کو نہ دنیا سے بیزار کیا ہوتا

اور شعر بھی اس قسم کے گنگناتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ایک اور واقعہ مجھے یاد آگیا۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست ایک دن بیٹھے بٹھائے اس بری طرح عاشق ہوگئے کہ میرا ٹائم ٹیبل خراب کر دیا اور ہفتہ تک میں بالکل نہ پڑھ سکا۔ مجھ سے بولے کہ شاید ایک دو ہفتے تک میں خودکشی ہی کرلوں۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ہم دونوں نے ان خاتون کا کھوج نکالا۔ اسی میں کئی مہینے ضائع ہوگئے۔ پھر گرمیوں کی چھٹیاں آئیں۔ معلوم ہوا وہ کشمیر جا رہی ہیں۔ ہم دونوں بھی ان کے پیچھے کشمیر پہنچے۔ وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار ایک آدھ جھلک دیکھ لی۔ تین مہینے کے تعاقب کے بعد ان کے پیچھے پیچھے واپس آئے۔ میں نے بڑی تلقین کی لیکن ان کا عشق ہر ہفتہ پہلے سے تیز ہی ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے ہمت کی، اور ان خاتون کے ابا سے واقفیت پیدا کی۔ ٹورنمنٹ میں ان کو (بزرگ کو) پارٹنر بنا کر ڈبلز کھیلا۔ کالج میں ڈرامے کئے۔ خواہ مخواہ کانسرٹ کئے۔ انھیں بلایا۔ وہ بھی آئیں۔ پورے ایک سال میں میں ان کے کنبے سے بے تکلف ہوگیا۔ (آپ مہینے جمع کرتے جایئے۔ گویا دو سال تک وہ صاحب عشق کرتے رہے بغیر ان خاتون سے بات چیت کئے) مصیبت یہ تھی کہ ان لوگوں سے واقفیت صرف میری بڑھ رہی تھی اور جو در اصل عاشق تھے انھیں کوئی جانتا ہی نہ تھا۔

خیر! کئی مہینوں کے بعد موقع پاکر انھیں بھی ملایا، اور کچھ دیر کے بعد عاشق صاحب کے ہاں سے پیغام بھجوا دیا، بڑی گڑبڑ ہوئی۔ اُن خاتون کی امی صرف مجھے اپنا آنریری فرزند بنانا چاہتی تھیں! صاحب کو نہیں۔ کیسی کیسی مصیبتوں سے انھیں منایا۔ (اس منانے میں بھی کئی مہینے گزر گئے)

آخر پورے ساڑھے تین سال کے عشق کے بعد عاشق صاحب کی منگنی ان محترمہ سے ہوگئی، اور چار سال کے بعد شادی ہوگئی، اس کے بعد وہ کہیں لاپتہ ہوگئے۔ میں بھی کہیں اور چلا گیا۔

دو سال تک ان کا کوئی خط نہ آیا۔ پھر یکلخت ایک روز عجیب سا چہرہ بنا ہوا تھا۔ جیسے دنیا میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

پوچھا۔ "کیسے ہو؟"

بولے۔ "ہاں! بس ۔۔۔ کچھ یونہی!"

کہا۔ "بیگم صاحبہ کو ساتھ نہیں لائے؟"

بولے۔ "کیا فائدہ؟"

کہا۔ "چلو پکنک ہو جائے ایک"

بولے۔ "کیا فائدہ؟"

کہا۔ "آج سینما تو چلوگے نا؟"

بولے۔ "کیا فائدہ؟"

میں نے تنگ آکر کہا "اچھا جانے دو۔ چلو تمہیں اپنا باغ دکھاؤں۔ بہت سے نئے نئے پھول لگائے ہیں"

اسی لہجے میں بولے۔ "کیا فائدہ؟"

میں نے جھلا کر کہا۔ "فائدہ؟ — تمہارا کیا فائدہ؟ تمہاری زندگی کا کیا فائدہ؟ تمہارے وجود کا کیا فائدہ؟"

وہ چپ ہو گئے۔ میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"تجھے ہو کیا گیا؟ تو تو ہمیں چین سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ بات کیا ہے؟"

آخر انھوں نے رک رک کر بتایا کہ وہ بالکل بیزار ہیں۔ اب سچ مچ اُن کی زندگی کا کوئی فائدہ نہیں؛ انھیں جس قدر ان خاتون کا خبط تھا۔ اتنی ہی جلدی جی بھر گیا۔ شادی کے بعد دونوں اکٹھے رہنے لگے۔ ایک دوسرے کے نزلے اور زکام میں شریک ہوئے۔ ایک دوسرے کو چھینکتے اور کھانستے دیکھا۔ تکرر نجیاں ہوئیں۔ دفعتہً انھیں محسوس ہوا کہ وہ خاتون کوئی دیوی نہیں تھیں بلکہ معمولی انسان تھیں۔ تب انھیں ان کی ذرا ذرا سی خامیاں پہاڑ جتنی دکھائی دیں اور اس کے بعد ایک جمود آگیا۔ ایک بیزاری طاری ہو گئی۔

میں نے کہا "تو شروع سے بیزار تھا۔ مجھے افسوس آرہا ہے کہ میں نے خواہ مخواہ وقت کیوں ضائع کیا۔ اگر تجھے یہ نہ ملتیں تو تو اپنا بُرا حال کر لیتا، شاید خودکشی پر آمادہ ہو جاتا، یا اگر زندہ رہتا تو کسی اور لڑکی سے شادی نہ کرتا۔ دردناک شعر پڑھتا۔ آہیں بھرتا اور دبلا پتلا ہو کر رہ جاتا۔ اور اب یہ مل گئیں تو تیرا یہ حال ہے۔ تیرا علاج بہت مشکل ہے بھئی — تو صحیح معنوں میں بیزار ہے"

صرف ایک وقت ہمیں بیزار ہونے کا حق حاصل ہے اور وہ نزلے یا زکام کے دوران میں، یہ بیزاری طبی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ امتحان کے دنوں میں بھی ہم چند گھنٹے بیزار ہو سکتے ہیں۔

یہ بیزاریاں اس لئے جائز ہیں کہ یہ بالکل عارضی ہیں اور یونہی غائب ہو جاتی ہیں۔

میں نے اس مضمون کے شروع میں اپنی ایک امتحانی بیزاری بتائی تھی۔ ایک اور سن لیجئے۔ ہمارا سالانہ امتحان تھا۔ پرچے ختم ہو چکے تھے۔ میں ممتحن صاحب کے پاس زبانی امتحان کے لئے گیا۔ ان کے پاس میز پر ایک موٹا تازہ تندرست سا کتا بیٹھا تھا۔

بولے۔ "یہ کیسا کتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بہت پیارا ہے"

بولے۔ "خوب! تو گویا تمہیں کتے پسند ہیں"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں! میں تو کتوں کا عاشق ہوں"

بولے۔ "اچھا تو یہ کس نسل کا ہے؟"

مجھے ان کی یہ ادا بالکل نہ بھائی۔ یہ کیا مصیبت لے بیٹھے امتحان کے سوال پوچھیں۔

بولے۔ "فاکس ٹیریر ہے کیا؟"

میں چپ رہا۔

بولے۔ "یا بُل ٹیریر ہے؟"

میں چپ رہا۔

بولے۔ "اسپینیل ہے کیا؟"

میں پھر چپ رہا۔

کہنے لگے۔ "کچھ تو بولو"

میں نے بیزار ہو کر کہا "صاحب یہ بھونکنے والا کتا ہے"

اتنی مثالیں پیش کر کے بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ بیزاری چیز کیا ہے؟ اور یہ کیوں چھا جاتی ہے؟ یہ کوئی بیماری ہے؟ یا قلبی کیفیت ہے؟ اس کا تعلق روح سے ہے یا جسم سے؟

یا شاید کچھ بھی نہیں، اس کا کوئی وجود ہی نہیں، عجیب سا معمہ ہے میں نے لاعلاج مریضوں کو قہقہے لگاتے دیکھا ہے، اور نہایت دُکھیا انسانوں کو مسرور دیکھا ہے، ایسے حضرات بھی دیکھے ہیں جن کی زندگی میں صبح سے لیکر شام تک ایک بھی خوشی نہیں لیکن پھر بھی وہ مسکراتے رہتے ہیں اور دوسروں کی ہمت بندھاتے ہیں۔

مجھے یہ علم نہیں کہ انتہائی بیزاری میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے کیونکہ میں شاذ و نادر ہی بیزار ہوا ہوں لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ دل کی روشنی اور روح کی شگفتگی بیزاری کے جانی دشمن ہیں۔ خود ہی سوچئے کہ باہر باغ میں پھول رقص کر رہے ہیں۔ پتے جھوم رہے ہیں۔ سبزہ لہلہا رہا ہے۔ کلیاں شرمائے جا رہی ہیں، چاروں طرف

چونکہ ہے، موسیقی ہے، زندگی ہے، اور آپ ایک گھٹے ہوئے کمرے میں ایک کرسی پر بیزار بیٹھے ہیں — اس میں قصور کس کا ہے؟ اور آپ بیزار محض اس لئے ہیں کہ کسی نے آپ کو کچھ کہہ دیا، کوئی آپ سے بُری طرح پیش آیا، آپ نے کہیں فون کیا اور وہاں آپ کو کوئی نہیں ملا۔ یا ڈر ہے کہ کہیں کوئی آپ سے بے رخی نہ برتے، یا اگر کوئی وجہ نہیں تو آپ اس لئے بیزار ہیں کہ اگر بیزار نہ ہوں تو اور کریں بھی کیا — یہ بیزاری آپ کے دن بھر کے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔

عمر خیام کی رُباعیات تو آپ نے پڑھی ہونگی۔ اگر اتفاق نہ ہوا ہو تو فرصت میں ضرور مطالعہ کیجیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ عمر خیام کے کہنے کے مطابق ضرور سبزے پر لوٹا جائے اور نہر کے کنارے بیٹھ کر کچھ پیا جائے اور پھر رامچلتے سے چھیڑ خانی کی جائے — یہ زیادتی ہے۔ لیکن بس مسرور رہنا چاہیئے۔ اسی طرح مسرور لٹریچر اور مسرور انسانوں کی صحبت ہماری زندگی میں نئی نئی خوشیاں لے آتی ہے۔

اس چمکیلی سنہری دنیا میں، اس نیلے نیلے آسمان کے نیچے کیا کچھ نہیں؟ مسکراتے ہوئے پھول ہیں، ناچتی ہوئی تتلیاں ہیں نسیم سحری کے جھونکے، برسات کی جھڑیاں، غروب آفتاب کا رنگین شفق —— سب کچھ تو ہے۔

اور پھر جب کسی ہنس مکھ دوست اور مخلص انسان کی رفاقت میسر ہو تو پھر بیزار رہنا گناہ ہے۔

افسانے

از:-
جناب علی احمد بی۔ اے

جا رہا ہے پھر کوئی دامن چھڑا کر ہاتھ سے
جیسے بجھ جائے ہوا کے تیز جھونکے سے چراغ

ٹوٹتا جاتا ہے اُمیدوں کا عالیشان محل
جیسے ہو جائے دھندلکا رات کی ظلمت میں حل

۲

رات بہتی جا رہی ہے ظلمتوں کی دھار پر
آ رہا ہے ذہن میں بھولے ہوؤں کا یوں خیال

سنسناتی ہیں مرے ایوان میں تنہائیاں
دُور جیسے گاؤں کی بستی سے کچھ اُٹھتا دھواں

۳

کاش میرے شوق کی یہ نامکمل تشنگی
جیسے شب کو ابر پاروں کے حسین طوفان میں

یوں تری آنکھوں کے پیمانے میں جا کر ڈوب جائے
چاند کی ننھی سی کشتی ڈگمگا کر ڈوب جائے

۴

شب کو دریا کی دو بڑی موجیں
جیسے لانبی مفارقت کے بعد

متصادم تھیں یوں لب ساحل
ملیں آپس میں دو دھڑکتے دل

شام و سحر

کیا بیت گئی دل پہ یہ دل ہی کو خبر ہے

از حضرت ماہر القادری

تیرے ہی اشارے سے جہاں گرمِ سفر ہے
زلفوں میں تری شام ہے ہونٹوں پہ سحر ہے

دنیا نے یہ سمجھا کہ توجّہ کی نظر ہے
کیا بیت گئی دل پہ یہ دل ہی کو خبر ہے

کچھ تجھکو بھی اے طالبِ دیدار خبر ہے
نظریں ہی تجلّی ہیں تجلّی ہی نظر ہے

مدت ہوئی وہ کر بھی چکے پرسشِ بیمار
اور دیدۂ بیمار ابھی جانبِ در ہے

آنکھوں پہ بھروسا نہ کریں دیکھنے والے
وہ جلوہ ہے ہر لحظہ یہ اندازِ دگر ہے

بجلی کبھی چمکی، کبھی گلچیں نظر آیا
جب تک میں نشیمن میں رہا سو طرح کا ڈر ہے

تیرے لئے بیتاب ہیں عالم کی نگاہیں
اے جلوۂ خورشیدِ جہانتاب کدھر ہے

ماہر نہ وہ محفل نہ وہ جلوے نہ مدارات
مدت ہوئی خالی مری آغوشِ نظر ہے

ناعروں کی باتیں

(۱)

ایک بار لکھنؤ میں مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی مولانا شبلی کے
بیٹھے تھے کہ بیگم بھوپال کا ایک تار آیا جس میں مولانا شبلی مرحوم کی
کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اُس کتاب کے مصارف
ت خزانۂ بھوپال سے ادا کئے جائیں گے۔

مولانا شبلی اس تار کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے مگر چند سیکنڈ
بعد آپ کے چہرے پر فکر کے آثار ظاہر ہونے۔ مولانا وحیدالدین نے
انی کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔

"مجھے اس خبر کی صداقت میں شُبہ ہے۔ میں بیگم بھوپال کے دستخط
طرح پہچانتا ہوں۔ یہ دستخط بیگم صاحبہ کے نہیں"

یہ سُن کر مولانا وحیدالدین سلیم نے قہقہہ لگایا اور کہا ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

وقت مولانا شبلی مرحوم کو خیال نہ رہا کہ یہ خط نہیں تار ہے

(۲)

ایک بار غازی پور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج کے مکان پر
رپ زدہ" اصحاب کا مجمع تھا۔ وہاں ایشیائی شاعری پر بڑی نکتہ چینی
ہو رہی تھی اور یورپ کی نیچرل شاعری کی تعریف ہو رہی تھی۔ حضرت
یاض مرحوم بھی وہاں موجود تھے۔ آپ نے فرمایا۔

"میر انیس مرحوم کے نیچرل مناظر کا ذکر ہی کیا ہے۔ میں امیر مینائی کا
شعر سُنانا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر
انگریزی شعر کے ترجمہ سے ممنون فرمائیں۔"

اس کے بعد آپ نے مندرجہ ذیل شعر پڑھا ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

شعر کے سُننے کے بعد اعتراض کرنے والوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں
دیر تک وجد کی کیفیت طاری رہی۔

لطائف الادب

از جناب ماسٹر ممتاز حسین بسمل دہلوی فاضل ادیب فاضل

(۳)

مہاراجہ چندولال وزیرِ اعظم ریاست حیدرآباد بہت فیاض اور شعر نواز تھے۔ اُن کے عہدِ وزارت میں مدراس سے ایک خوشگو فارسی شاعر سید خیرالدین فائق تلاشِ معاش میں حیدرآباد آئے۔ مہینوں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اتفاق سے مہاراجہ چندولال کے ایک مُلازم سے صاحب سلامت ہو گئی۔ اُس نے فائق سے وعدہ کیا کہ کسی مناسب موقع پر مہاراجہ سے اُس کی سفارش کریگا۔

ایک دن مہاراجہ کے دربار میں اُن کے والد کی سخاوت کا ذکر ہو رہا تھا۔ مہاراجہ کے مذکورہ مُلازم نے یہ شعر پڑھا ؎

عجب نبود اگر فرزند بہتر از پدر باشد
کہ عطرِ صندل افزوں تر ز صندل می دہد بو را

حاضرین یہ شعر سُن کر پھڑک اُٹھے۔ مہاراجہ نے پوچھا "یہ شعر کس کا ہے؟" مُلازم نے جواب دیا "حضور مدراس سے ایک شاعر تلاشِ معاش میں آیا ہوا ہے اس کا شعر ہے"

مہاراجہ نے اُسی وقت فائق کو اپنے دربار میں بُلایا اور پانسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔

(۴)

جن دنوں حضرت داغ مرحوم حیدرآباد میں مقیم تھے۔ ایک شاعر آپ سے ملنے کے لئے آیا۔ داغ مرحوم نے نووارد شاعر سے اُس کا کلام سُنانے کی درخواست کی۔ شاعر نے بغیر کسی بیاض کی مدد کے اپنا کلام سُنانا شروع کیا تین گھنٹے گذر گئے مگر کلام ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ شاعر کے خیالات بہت پست اور مبتذل تھے۔ داغ مرحوم سُنتے سُنتے اُکتا گئے اور کہنے لگے۔

"بس بس معاف فرمایئے۔ دیوان حافظ تو بہت دیکھا تھا آج حافظ دیوان بھی دیکھ لیا۔"

(۵)

عبدالہادی مُلاح نوامر حوم ایک بار مولانا حسرت موہانی کے یہاں تشریف لے گئے۔ اتفاق سے ایک دوسرے شاعر بھی مولانا سے ملنے آئے

اِت چیت کے دوران میں مولانا نے وفا مرحوم سے کلام سُنانے کی فرمائش کی
وفا مرحوم نے اپنی ایک غزل پڑھی۔ مولانا حسرت موہانی داد دیتے رہے
اور دُوسرے شاعر خاموش بیٹھے رہے۔ جب وفا مرحوم اپنا کلام سُنا چکے
تو مولانا حسرت موہانی نے دُوسرے شاعر سے کلام سُنانے کی فرمائش کی
یہ سُنتے ہی وفا مرحوم سنبھل کر بیٹھ گئے اور دُوسرے شاعر کی طرف غضب
آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"آپ نے میرے کلام کی داد نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ آپ شاعر
نہیں ہیں، اب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی فنِ شعر سے واقف ہیں۔
آپ کی خاموشی کے دو معنی ہوسکتے ہیں یا تو آپ میرے اشعار کو داد کے
قابل نہیں سمجھتے یا آپ کا دماغ میرا کلام سمجھنے سے قاصر ہے۔ اِس کا فیصلہ
اِس طرح ہوسکتا ہے کہ آپ میرے کلام کی تنقیص کریں یا مجھے اجازت
دیجئے کہ میں آپ کی اِس وقت ہجو لکھوں۔"

شاعر صاحب وفا کی صاف گوئی سے بہت شرمندہ ہوئے۔

(۶)

حضرت ریاض مرحوم دربار دیکھنے کے لئے دہلی آئے ہوئے تھے۔
ایک دن ایک دوست کے ہمراہ کیمپوں کی سیر کے لئے نکل گئے۔ کھانا
نہیں کھایا تھا۔ ملاقاتوں میں دیر ہوگئی اور کھانا نصیب نہ ہُوا۔ سہ پہر کو
اُن کا دوست اُنہیں پرنس ارکاٹ کے کیمپ میں لے گیا۔ وہاں باتوں
باتوں میں رات ہوگئی۔ ریاض نے واپسی کی اجازت چاہی۔ پرنس کے
ہاں دسترخوان بچھ رہا تھا۔ میزبان نے کھانے کے لئے اصرار کیا مگر
حضرت ریاض نے از راہِ تکلف کہہ دیا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں
لیکن اُن کے دوست نے لذیذ کھانے پیٹ بھر کر کھائے۔ کھانے کے بعد
ریاض نے رخصت طلب کی، مگر پرنس نے کہا۔

"اب رات زیادہ آگئی ہے اس لئے یہیں آرام کیجئے۔"

ریاض کے دوست نے اِس تجویز کو مان لیا۔ فوراً بستروں کا
انتظام ہوگیا۔ سب آرام کرنے لگے۔ مگر جناب ریاض بھوک سے
کروٹیں بدل رہے تھے جب نیند نہ آئی تو چُپ چاپ اُٹھے اور اندھیرے
میں میز کی طرف بڑھے وہاں آپ کا ہاتھ کسی چیز سے مس ہُوا۔ آپ نے
اُسے شیرینی کی ڈلی سمجھ کر مُنہ میں رکھ لیا مگر درحقیقت وہ صابن کی
بٹی تھی۔ جناب ریاض نے بٹی مُنہ سے نکال کر رکھ دی اور رُومال سے
مُنہ صاف کرکے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ خدا خدا کرکے رات گزری۔
صبح ہوئی ناشتہ سامنے آیا۔ چائے کے ساتھ کیک اور بسکٹ تھے
حضرت ریاض نے مٹھائی اِس طرح کھائی کہ سب کی توجہ آپ کی طرف

مبذول ہوگئی۔ اُس وقت آپ کے دوست نے میزبان کو بتایا کہ
کس طرح حضرت ریاض تکلف ہی تکلف میں تمام رات بھوکے
رہے تھے۔

(۷)

جن دنوں حضرت داغ رامپور میں مقیم تھے۔ آپ نے ایک
درباری بھانڈ کی ہجو لکھ دی۔ بھانڈ نے بدلہ لینے کے لئے نواب
کلب علی خاں مرحوم سے ایک نقل کرنے کی اجازت مانگی۔ مقررہ تاریخ
حضرت داغ مرحوم بھی دربار میں حاضر تھے۔ بھانڈ نے نقل شروع
خود بادشاہ بنا اور ایک نوعمر بھانڈ کو شاہزادہ بنایا۔ شاہ اور شاہ
شیر کے شکار پر روانہ ہوئے۔ سامنے سے "شیر" بھی نکل آیا۔ بادشاہ
بھانڈ نے شیر کو دیکھتے ہی اپنے شاہزادے سے کہا۔ ابے داغ رفیقا
نقلی شاہزادہ شیر کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ بھانڈ نے کڑک کر کہا۔ ا
کمبخت داغ۔ ابے پاجی داغ!" شیر شاہزادے کی طرف بڑھا
شاہزادہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بندوق اُس کے ہاتھ سے گر پڑی
یہ دیکھ کر بادشاہ بھانڈ کو بہت غصہ آیا اور ڈفلانے داغ تُ
دو قدم آگے بڑھ کر گالیاں دینے لگا۔ ہر گالی کے آخر میں داغ آتا!
نواب نے بھانڈ کو نقل کرنے سے روک دیا۔ حضرت دا
کی آنکھوں میں خون اُترا ہُوا تھا اِس لئے آپ چُپکے سے دربار سے
نکل گئے۔

(۸)

حضرت ریاض مرحوم جوانی میں بہت خوبصورت تھے۔ عا
پیری میں ایک بار آپ کے ایک دیرینہ رفیق نے کہا۔ "کیئے آپ
زمانہ کہاں گیا جب آپ فخریہ کہا کرتے تھے ؎

دُنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس وضع کا جوان ہے کس آن بان کا"

آپ نے فرمایا۔ "جوانی گئی تو کیا ہُوا بڑھاپے کی برقعتی
ہوس اب بھی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے ؎

مے پیرِ مغاں دُخترِ رز عمر رسیدہ
بوڑھا ہوں ملے نورِ نظر چرخ کہن کی"

(۹)

رام رتن ریاست بیکانیر کے مشہور شاعر تھے۔ نہر نکلنے
وہاں پانی کی بہت قلت تھی۔ کنوؤں پر حکومت کی جانب سے
رہتا تھا اور حاجتمندوں کو باری باری پانی بھرنے کی اجا

دی جاتی تھی۔

ایک مرتبہ رام رتن پنجاب آیا۔ جب دریائے ستلج پر پہنچا تو سامنے میلوں تک لہریں لے رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوئی پہرہ دار موجود نہیں تھا اس لئے رام رتن نے دل میں کہا "آج تو جی بھر کے پانی پی لیں"

چلو میں پانی بھر کر پینے لگے تھے کہ ایک مور سے "پیہوں" کی آواز دی۔ سمجھے کوئی پہرہ دار ہے۔ پانی پھینک دیا اور کہنے لگے۔ "میں پانی نہیں پیتا صرف منہ دھوتا ہوں"

(۱۰)

ایک مرتبہ حضرت ریاض خیرآبادی لونٹ گاڑی پر سفر کر رہے تھے۔ ڈاکوؤں نے جنگل میں گاڑی پر حملہ کر دیا۔ جناب ریاض کے پاس نشتر روپے نقد رومال میں بندھے ہوئے تھے اور ایک بیگ میں چند کپڑے اور چند کتابیں تھیں۔ پاؤں میں فل بوٹ تھا آپ نے پاؤں سے بوٹ اُتار کر روپوں کا رومال بوٹ کے اندر رکھ دیا۔ جیب میں دو روپے تھے وہ ایک ساتھی کی جیب میں ڈال دیئے اور بوٹوں کو ایک جانب چھوڑ کر ڈاکوؤں کے حکم سے گاڑی سے کود پڑے۔ ڈاکوؤں نے مسافروں کو مارنا پیٹنا شروع کیا۔ آپ نے کہا "میرے بیگ میں بہت رقم ہے تم اُسے لے لو اور ہمیں دِق نہ کرو" اتنے میں ایک ڈاکو نے آپ کے ساتھی کو پکڑ لیا۔ حضرت ریاض نے کہا "اسکی جیب میں دو روپے ہیں نکال لو" ڈاکوؤں نے اُسکی جیب سے دو روپے نکال لئے۔ اس طرح اُنہیں ریاض کے کہنے پر یقین آیا۔ ڈاکوؤں نے حضرت ریاض کا وزنی بیگ اُٹھا لیا اور جنگل میں گم ہو گئے۔ بوٹ کی جانب کسی نے توجہ نہ کی۔

(۱۱)

حضرت داغ مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے ؎

"مجھے ہنس کر لگے کہنے تمہیں کو داغ کہتے ہیں
تمہیں بیٹھے ہو لالہ میں تمہیں ہو ماہ کامل ہو"

جن دنوں حضرت داغ حیدرآباد میں مقیم تھے ایک بار ایک بھانڈ نے مشاعرہ کی نقل کی۔ جب شمع اُس کے سامنے آئی تو ایک دوسرا بھانڈ پوچھنے لگا۔

"میر صاحب آپ کا تخلص کیا ہے؟"

اُس نے جواب دیا "دال" اس کے بعد کہنے لگا "مقطع عرض ہے"

مجھے ہنس کر لگے کہنے تمہیں کو دال کہتے ہیں
تمہیں بیٹھے ہو پیالی میں تمہیں بیٹھے ہو ہانڈی میں

(۱۲)

ایک بار خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کو ایک ایسے مکان میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا جہاں پہلے ایک طوائف رہتی تھی۔ رات کو مولانا سو رہے تھے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولانا کی آنکھ کھل گئی پوچھا "کون ہے؟" باہر سے آواز آئی "دروازہ کھول دو"

مولانا نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

دروازہ کھٹکھٹانے والے نے کہا "تمہیں نام سے کیا غرض دروازہ کھول دو تم کو بھی کچھ مل جائیگا"

مولانا مرحوم کو سخت طیش آیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا ایک جاٹ کھڑا تھا۔ آپ نے ڈانٹ کر اُسے بھگا دیا۔

صبح مولانا حالی مرحوم چند دوستوں کے ہمراہ بازار میں سے گزر رہے تھے۔ اتفاق سے اُسی جاٹ نے دیکھ لیا اور یہ کہتا ہوا مولانا کی طرف لپکا "ابے میراثی رات تو نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا۔ اب تجھ کو مزہ چکھاؤں گا"

مولانا کے دوستوں نے اُس بدتمیز کو ڈانٹ کر بھگایا۔

مولانا مرحوم سخت حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ جس مکان میں آپ مقیم ہیں وہاں پہلے ایک طوائف رہتی تھی اور وہ جاٹ اُسی سے ملنے آیا تھا۔

اسٹیشن ماسٹر

نفسیاتی افسانہ

از جناب سالک لکھنوی

وہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر تھا۔ اس اسٹیشن کی کل کائنات ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ٹکٹوں کے بکس، وزن کرنے کی مشین، تین کرسیاں اور ایک ٹوٹی سی میز دکھائی دیتی تھی۔ یہ اسٹیشن قلیوں سے بے نیاز تھا کیونکہ آج تک کوئی ایسا مسافر اس اسٹیشن سے سوار نہ ہوا تھا جسے اپنے اسباب کیلئے کسی مزدور کی ضرورت پڑی ہو۔

اسٹیشن ماسٹر کی کل تنخواہ اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے ضرورت سے زیادہ تھی۔ اس کی ملازمت کو سترہ سال ہو چکے تھے اور اس عرصہ میں اس نے کبھی اپنی تنخواہ کو اپنی ضرورت سے کم نہیں پایا۔ اس نے اپنی یکساں زندگی میں دنیا کے مختلف دور دیکھ ڈالے تھے یہاں تک کہ اب اس کی کنپٹیوں پر کچھ سفید بال نظر آنے لگے تھے۔

اسے عورت سے کچھ نفرت سی تھی۔ شاید اس کی جوانی کے رنگین خواب رنگین تعبیروں سے محروم رہے ہوں، یا شاید اس میں اس بیباکی کی کمی ہو جو کسی عورت کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے، بہر کیف وہ عورت سے متنفر تھا اور اسے خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ عورت سے کیوں نفرت کرتا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ابتک غیر شادی شدہ تھا۔

اس نے اپنی زندگی کے چالیس پُرسکون اور خاموش سال گذارے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے پکاتا تھا۔ صرف ایک کہار اوپر کے کام کر دیا کرتا جس کے معاوضہ میں اسٹیشن ماسٹر ہر سال اسے بلا ٹکٹ لودھیانہ پہنچانے اور لے آنے کا ذمہ دار تھا۔ لباس کے لئے اس نے کبھی نہیں سوچا۔ ریلوے کا سیاہ الپاکے کا کوٹ ریلوے کی سیاہ ٹوپی اور ریلوے ہی کی سفید پتلون، یہ اس کا کافی سے زیادہ لباس تھا۔

اس کی جائے رہائش دو کمروں کا ریلوے کوارٹر تھا۔ جس میں دن بھر گاؤں کے لڑکے غل مچایا کرتے۔ کھانے پینے کا سامان اکثر مفت مل جاتا کیونکہ گاؤں والے اس پر مہربان تھے اور بہت سی ترکاریاں اسے یونہی مل جاتیں۔ اس کی زندگی میں کوئی غم نہ تھا، وہ تھا ایک سیدھا سادہ غریب سا اسٹیشن ماسٹر!

لیکن ایک دن!

وہ ایک پسنجر ٹرین کو پاس کر رہا تھا۔ ایک ٹی۔ ٹی۔ آئی نے ایک عورت کو گاڑی سے اتار دیا۔ گاڑی چھوٹ گئی۔

عورت لباس سے ہندو معلوم ہوتی تھی۔ وہ اسٹیشن پر زار و قطار رونے لگی۔ اسٹیشن ماسٹر نے اسے بلایا اور پوچھا:۔

"تم کون ہو ---؟"

"ایک دکھیاری ---!" عورت نے سسکتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے آ رہی ہو تم؟"

"میرٹھ سے!"

"اور جاؤ گی کہاں؟"

"کاشی جاؤں گی، بابو جی!" عورت نے امید سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ٹکٹ کہاں ہے تمہارا؟"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور اسٹیشن ماسٹر کو اب خیال آیا۔ کہ اگر اس کے پاس ٹکٹ ہی ہوتا تو وہ گاڑی ہی سے کیوں اتاری جاتی؟

"کہاں جا رہی تھیں تم؟" اس نے پھر وہی سوال کیا۔ وہ بھول چکا تھا کہ عورت جواب دے چکی ہے۔

"کاشی!"

"اب کیا کرو گی؟"

عورت نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا، تو تم میرے گھر میں ٹھہرو، میں دو ایک دن میں مناسب موقعہ دیکھ کر تمہیں کاشی بھیج دوں گا!"

دوسرے دن کہار بیمار تھا۔ کوارٹر میں جھاڑو تک نہ ہوئی تھی۔ تمام برتن جھوٹے پڑے تھے۔ شام کے سات بجے جب اسٹیشن ماسٹر کوارٹر میں آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا کمرہ صاف ستھرا تھا۔ برتن منجھے منجھائے رکھے تھے۔

"کیا کھانا پکایا ہے؟" اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

"کیا پکاؤں؟ میں نہیں جانتی۔" عورت نے جواب دیا۔ اور اسٹیشن ماسٹر نے سوچا کہ اس کے گھر کا کام اس عورت نے کیا ہے۔

"اچھا تو میں اب کچھ کھانے کا بندوبست کر لوں، جب سے کہار گیا ہے مجھے ہی پکانا پڑتا ہے۔" اسٹیشن ماسٹر نے اپنا کالا کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

"میں نے کچھ پکا لیا ہے۔" عورت نے ذرا ڈرتے ڈرتے کہا۔ "گھر میں آلو پڑے تھے اور اس چھوٹے گھڑے میں آٹا بھی تھا۔ میں پکا لیتی ہوں، بابوجی!"

اسٹیشن ماسٹر نے یکایک عورت کے چہرے کو بغور دیکھا اور آج زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں ایک ہلکی سی خلش، ایک مبہم سی آرزو پیدا ہوئی جسے سمجھنا اس کے لئے اس وقت ناممکن تھا!

"اچھا۔ تو پھر لاؤ کھانا!"

اور کھانا کھاتے ہوئے اسے احساس ہوا۔ کہ روٹیاں زیادہ نرم تھیں اور آلو کی ترکاری زیادہ مزے دار۔

پھر گویا کسی نے اس سے کہہ دیا۔ عورت زندگی کو خوبصورت بنا دیتی ہے!

دو دن کے بجائے دو ہفتے گذر گئے۔ نہ عورت ہی نے جانے کا نام لیا، نہ اسٹیشن ماسٹر ہی نے یاد دلایا۔

اسٹیشن ماسٹر کو اپنی افسردہ زندگی میں ایک کیف سا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے خاموش ماحول میں ایک رنگینی سی چھا رہی تھی۔ اب اپنا گھر زیادہ روشن معلوم ہوتا تھا۔ عورت کے پاس ایک جوڑے کے سوا جسے پہنے ہوئے وہ گاڑی سے اتری تھی اور کپڑے نہ تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے گاؤں کے میلے سے اسے دو ساڑیاں خرید دیں۔

اسے خود اپنی زینت کا بھی خیال ہونے لگا تھا اور اس نے بھی کپڑے کے لباس کے علاوہ چند جوڑے بنوا لئے تھے۔ اس کے سر کے بال آہستہ تیل سے محروم نہ تھے اور چونکہ اب وہ اکثر الجھے رہتے تھے اس لئے مجبوراً اسٹیشن ماسٹر کو شہر سے ایک کنگھی بھی منگانی پڑی۔

اکثر اس کے دماغ میں خیال کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ جاتی — گھر میں یہ تبدیلی کیسے آ رہی ہے؟ — لیکن جواب اس کی سمجھ میں نہ آتا!

عورت شروع شروع بہت خوش معلوم ہوتی تھی جیسے [illegible] گنگناتی، مسکراتی رہتی، دل لگا کر کام کاج کرتی۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں سنجیدگی نمودار ہوتی، کچھ خاموش سی رہنے لگی، گویا کچھ چھپانا چاہتی ہو۔

کہار اچھا ہو کر اپنی نوکری پر آ گیا تھا۔ اب عورت کو برتن مانجھنا نہیں پڑتے تھے۔

اسٹیشن ماسٹر اور عورت میں بہت کم بات چیت ہوتی کیونکہ وہ اکثر اپنی ڈیوٹی پر رہتا اور یہ گھر میں تنہا شاید اپنی آئندہ زندگی کا پروگرام بنایا کرتی۔

ایک دن جب اسٹیشن ماسٹر کھانا کھا رہا تھا، عورت نے پوچھا:۔

"آپ کب سے اکیلے رہتے ہیں؟"

"میں تو کبھی اکیلا نہیں رہا!" اسٹیشن ماسٹر نے سوال کی اہمیت کو سمجھے بغیر فوراً جواب دے ڈالا۔

"اکیلے نہیں رہے؟ کون رہتا تھا آپ کے ساتھ؟" عورت کو ایک شبہ سا گذرا۔

"وہ کہار ہے نا؟ پندرہ برس کا پرانا آدمی ہے وہ!" اسکے لہجہ میں فخر کی جھلک موجود تھی۔

عورت مایوس ہو گئی — "اوہ! یہ کہار!" وہ بولی۔

"ہاں! بڑا پرانا آدمی ہے وہ!" اسٹیشن ماسٹر نے پر غرور لہجے میں کہا۔

عورت کو سخت غصہ آیا۔ عجیب طرح کا مرد ہے یہ تو! اس نے سوچا۔

"بیاہ نہیں کیا آپ نے؟" عورت نے دبی زبان سے پوچھا۔

اسٹیشن ماسٹر کے گلے میں نوالہ اٹک گیا۔ نوالہ نگل کر بولا

"نہیں! لیکن —!"

عورت نے پھر کچھ نہ پوچھا۔

لیکن ایک دن وہ عورت غائب ہو گئی!

دن بھر کا تھکا ماندہ اسٹیشن ماسٹر جب گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حسب معمول ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی ہے۔ شام کا کھانا بھی تیار ہے۔ لیکن عورت غائب ہے۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کہیں کسی کام سے چلی گئی ہو گی جیسے اکثر جایا کرتی تھی۔ اس نے

منہ دھویا، کپڑے بدلے اور چہل قدمی کے ارادے سے نکل پڑا۔ شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کسی اور دنیا کی بھینی بھینی خوشبو لئے ہوئے تھیں۔ فطرت پر ایک سکوت طاری تھا!

واپس آیا تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ عورت ابتک نہ آئی تھی۔ اور اب پہلی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا۔ وہ کہیں چلی تو نہیں گئی؟ یکایک اسے محسوس ہوا کہ اس کی کوئی قیمتی شے گم ہو گئی ہے جسے پانا شاید اب ناممکن ہو!

غم و غصہ کے ملے جلے جذبات کی رو میں اسے یاد آیا کہ کمہار بھی نہیں دکھائی دیا۔ وہ کہاں چلا گیا کمبخت!

لیکن نہ عورت ہی واپس آئی اور نہ کمہار دکھائی دیا۔

اسٹیشن ماسٹر بغیر کھانا کھائے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ سوچتا رہا وہ چیزیں جو ابتک نہ سوچی تھیں اور یاد کرتا رہا وہ باتیں جنہیں زندگی کے گزشتہ دور میں بھول چکا تھا! جذبات کی کشمکش، دل کی بے چینی، روح کی تپش نے اسے سونے نہ دیا۔ اس عورت کا اس سے کیا تعلق تھا؟ کچھ بھی نہیں! پھر یہ بے چینی کیوں اور کس لئے؟

لیکن اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک عجیب تکلیف سی تھی۔ جیسے کوئی ضروری اور قیمتی شے کھو گئی ہو۔ وہی کوارٹر تھا، وہی کمرہ اور کمرے کی ہر وہی چیز جسے غیر ارادی طور پر دیکھنے کی نگاہیں عادی ہو چکی تھیں۔ فرق بس یہ تھا کہ وہ عورت آئی اور چلی گئی۔ وہ جب آئی تھی اس وقت اسٹیشن ماسٹر کو مسرت کا کوئی خاص اور اچانک احساس نہ ہوا تھا تو پھر عورت کے جانے پر غم اور اچانک غم کیوں؟ — وہ سوچتا رہا۔

جذبات کی اسی ادھیڑ بن میں اسے اپنی گزشتہ زندگی یاد آئی۔ ایک دھندلے سے خواب کے مانند اسے کچھ تصویریں سی متحرک نظر آئیں۔ مبہم اور فرسودہ تصویریں! — وہ جوان تھا اور اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کو چاہتا تھا۔ لڑکی کی موٹی موٹی نگاہیں اس کی محبت کو سمجھ چکی تھیں اور اسی بات کی متمنی تھیں کہ وہ لڑکی کے ماں باپ سے لڑکی کو باقاعدہ مانگ لے۔ لیکن کونسی کمزوری تھی جس نے موجودہ اسٹیشن ماسٹر کو اس وقت ایسا کرنے سے باز رکھا تھا؟ اگر وہ ذرا ہمت سے کام لیتا، ذرا بیباکی کو دخل دیتا تو وہ لڑکی اس کی تھی۔ [illegible] کے احساس کی۔ لیکن وہ خاموش رہا اور لڑکی کی شادی [illegible] ہو گئی۔ اب وہ لڑکی؟ اسٹیشن ماسٹر نے سوچا۔ [illegible] کا آرام ہوگا، وہ [illegible] بیاہی [illegible] گھر کا

ہر طرح کا کام کرتی ہو گی — اس کی آنکھ لگ گئی۔

خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ عورت اور اس کا کمہار دونوں بھاگے جا رہے ہیں اور وہ ان کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ پھر ایک پہاڑ آ جاتا ہے لیکن نہیں یہ تو کسی کا مکان ہے اور یہ اندر کون کام کر رہا ہے۔ لو! یہ تو گاؤں والی لڑکی ہے، مانگ میں سیندور لگائے ہوئے۔ وہ کہتی ہے "تم نے مجھ سے بیاہ کیوں نہیں کیا؟" مکان پھر غائب ہو گیا، وہی پہاڑ ہے اور اس پر کمہار کھڑا ہے اور کمہار کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ عورت بھی کھڑی ہے — عورت بولی۔ "میں نے تو اتنی کوشش کی مگر تم نے پرواہ ہی نہیں کی" — اسٹیشن ماسٹر کی آنکھ کھل گئی۔

صبح ہو چکی تھی۔ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ بستر پر سے اٹھا۔ اس کے جوڑ جوڑ میں درد سا ہو رہا تھا۔ کسی طرح ڈیوٹی پر پہنچا، پارسل وزن کرنے والا مزدور مشین کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ چاپ سن کر چونک پڑا۔ اسٹیشن ماسٹر کے چہرے کو دیکھا تو گھبرا گیا۔

"کا بھیا بابوجی؟" (کیا ہوا بابوجی)

"کچھ نہیں —"

"کمہار یہ بھاگ گئی نا؟" مزدور نے بھولے پن سے پوچھا۔

"ہاں۔ تجھے کیسے معلوم ہوا؟" اسٹیشن ماسٹر نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"سسرا کمہار سنگ چلی جات رہی چہل کرتی" (سسرا کمہار کے ساتھ ہنستی ہوئی جا رہی تھی)

اسٹیشن ماسٹر خاموش ہو گیا۔ اس نے مزدور سے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ دماغ میں ایک مسلسل سنسناہٹ جاری تھی۔ یکایک اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"عورت زندگی کو تباہ کر دیتی ہے" اس نے کہا۔

اور پھر یکایک بڑی سرعت کے ساتھ اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کی نگاہوں کے سامنے کسی نے پردہ ہٹا دیا ہے — کاش وہ عورت کو انتظار کی تکلیف نہ دیتا!

سلاطین دہلی کے عہد میں آفتابِ علم کی ضیا پاشیاں!

تاریخی مقالہ

از جناب خواجہ احمد فاروقی

ہندوستان ذہنی غلامی سے اُس دن نجات حاصل کر سکے گا جس دن ہمارے سکولوں کی تمام تاریخی کتابیں آگ میں جلادی جائیں گی۔

اسکول کی اِن درسی کتابوں نے ہمیں بڑے نقصان پہنچائے ہیں ایک تو یہ کہ انھوں نے ہندوؤں و مسلمانوں کی باہمی آویزش کو فروغ دیا ہے۔ باوجود جدید تحقیقات کے[1] محمود غزنوی آج بھی ہندو مذہب کا دشمن سب سے بڑا بت شکن اور اسلام کا مبلغ سمجھا جاتا ہے۔ علاؤالدین خلجی آج بھی پدمنی کے شیدائی ہی کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اور غضب ہے کہ "ٹائمس آف انڈیا" کے مصور رسالہ نے جب دو ایک برس ہوئے اس قصہ کی پھر یاد تازہ کی تو ہمارے تاریخی حلقوں میں ایک آواز بھی اس کے خلاف بلند نہیں ہوئی۔ اسی طرح محمود تغلق کو درسی اداروں میں اب تک ایک دیوانہ اور پاگل سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ یاد ہے بخیر، چارلس کنکیڈ صاحب اس بیسویں صدی میں بھی مسلمانوں کو وحشی اور تہذیب سے ناآشنا قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مضامین Tales of Indian cavaliers کے نام سے چھپتے ہیں اور اسکول کی الماریوں کی زیب و زینت بن جاتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ ان افسانوں نے ہندو مسلمانوں کی خلیج کو کتنا وسیع کر دیا اور کتنا زہر پھیلا۔ اسی طرح تاریخ کی اِن درسی کتابوں سے اورنگ زیب کا جو نقشہ ہمارے ذہن میں مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تعصب نے مغلیہ سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا اور وہ تنہا اس جرم کا ذمہ دار ہے کہ اس نے اکبر کی مضبوط بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ حالانکہ ڈاکٹر تاراچند نے اس مسئلہ پر بڑی غیر جانبدارانہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں جو لڑائیاں ہوئیں اُن کی کوئی مذہبی حیثیت نہ تھی۔ مغلیہ سلطنت معاشی اور مالی بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۷۰۷ء میں وہ تقریباً دیوالیہ تھی۔ یہ کشتی تباہی کی چٹان کے اتنے قریب آچکی تھی کہ باوجود اورنگ زیب کی کوشش کے وہ پاش پاش ہونے سے نہ بچ سکی۔

ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں اسکول ہی میں اُستوار کی جا سکتی ہیں اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ تاریخ مورخانہ ایمانداری کے ساتھ پیش کی جائے اور جو باتیں غیر تاریخی ہیں اُن کو یک قلم خارج کر دیا جائے۔ غلط تاریخ سے دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف سے نفرت ہو گئی ہے۔ کسی ایک تاریخی درسی کتاب کو اُٹھا لیجئے اس کو الف سے لیکر ے تک پڑھئے اور اس کے بعد ذرا سوچئے۔ آپ کو معاً خیال ہوگا کہ یہ لوگ بڑے جاہل تھے۔ سوا لڑائی جھگڑے کے انہیں کسی چیز سے سروکار ہی نہ تھا۔ ہر صفحہ پر لڑائی ہی کی داستان ہے۔ نہ علوم و فنون کا تفصیل سے ذکر ہے، نہ طرزِ معاشرت کا، نہ تہذیب کا، نہ سکولوں اور کالجوں کا۔ نہ رسل و رسائل کا۔ نہ شادی کے جلسوں کا تذکرہ ہے اور نہ ادبی محفلوں کا۔ یہ تاریخ ہے یا لڑائیوں کی پوٹ ہے۔ یہ خیال درحقیقت اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ان تاریخوں میں تصویر کا ایک ہی رُخ دکھلایا گیا ہے۔ اور محض ایک ہی پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس طرح یہ تاریخیں بالکل ناقص اور نامکمل ہیں۔

آیئے آج کی صحبت میں اس امر پر غور کریں کہ سلاطین دہلی کے زمانہ میں کیا علمی ترقی ہوئی۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس عہد نے ہندوستانی تہذیب کے بنانے اور سنوارنے میں کیا حصہ لیا۔

دَورِ غزنویہ:۔ محمود غزنوی کی حکومت پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور علمی ترقی کے اعتبار سے دُنیا کی مشہور حکومتوں میں سے تھی۔ البرونی، فردوسی، عنصری، فرخی وغیرہ جیسے اہل علم اور شاعر اس کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ البرونی سنسکرت کا بڑا عالم تھا اس کی کتاب "الہند" عدیم النظیر خصوصیات کی حامل ہے۔ محمود غزنوی کے دربار میں ہندی سنسکرت کے بھی عالم تھے۔ اور غزنی میں اذان کے ساتھ ناقوس کی آواز بھی بلند ہوتی تھی۔

عہدِ غوریہ:۔ سلطان شہاب الدین غوری نے اجمیر میں بہت سے

---

[1] ملاحظہ ہو محمود غزنوی مصنفہ پروفیسر محمد حبیب بی۔ اے آکسن

مدرسے اور سکول قائم کئے اور غلاموں کی تعلیم و تربیت کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا۔ غلام خاندان کے چند ہوشیار اور ذی فہم بادشاہ اسی کوشش کا نتیجہ تھے۔ یہ ان کی قابلیت تھی جو ان کو بادشاہوں کے بیٹوں سے زیادہ ممتاز بنا دیتی تھی اور اُن کے مقابلہ پر تاج شاہی غلاموں کے سروں پر رکھ دیتی تھی۔ (ملاحظہ ہو ترجمہ طبقات ناصری ص۱۵۹)

ان مدارس میں علمی تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی اور صنعتی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ (ملاحظہ ہو ان ان لا ص۱۸۱)

خاندان غلاماں:۔ (۱۲۰۶ء — ۱۲۹۰ء) التتمش علم و فن کا بڑا قدر دان تھا۔ امیر خسرو۔ فخر الملک اور امیر کوہانی جیسے فضلائے عصر اُس کے دربار سے متعلق تھے۔ اس نے ایک بڑے کالج کی بھی بنیاد ڈالی تھی جس کو بعد میں فیروز تغلق نے مزید رونق بخشی اور اس کی عمارت کو درست کروایا۔

رضیہ بیگم کے زمانہ میں دہلی میں معزی کالج موجود تھا۔ اس کا عہد حکومت اگرچہ مختصر ہے لیکن علمی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ اِس لئے کہ وہ خود جملہ علوم کی دلدادہ تھی اور فنون سپہگری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔

ناصر الدین محمود نے ناصریہ کالج قائم کیا۔ منہاج سراج صاحب طبقات ناصری اِس ادارہ کا پرنسپل مقرر ہوا۔

بلبن کا دربار ایشیا کے درباروں میں سب سے شاندار تھا۔ امیر خسرو۔ شیخ عثمان ترمذی۔ شیخ بدر الدین عارف۔ امیر حسن۔ سید مولا۔ قطب الدین بختیار وغیرہ یکتائے روزگار تھے اور بلبن کے فیض کرم سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں تاتاریوں نے اسلامی دُنیا کے مرقع کو زیر و زبر کر رکھا تھا۔ ان کے ڈر سے بھی اہل علم جانیں چھپا کر ہندوستان پہنچتے تھے اور یہاں کی فیاضیوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔

خان شہید بڑا علم دوست شہزادہ تھا۔ اس کی تہذیب و شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو کبھی دن کا دن گذر جاتا اور وہ زانو نہ بدلتا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ اس نے ایک بیاض تیار کی تھی جس کے حُسن انتخاب پر خسرو اور حسن بھی سر دُھنتے تھے۔ اس نے کئی ادبی انجمنیں قائم کیں۔ حضرت امیر خسرو ان جلسوں کے صدر نشین ہوتے تھے۔ سعدی کا بھی اس دربار میں پہنچنے کا اِرادہ تھا۔ لیکن وہ جا نہ پہنچ سکے۔

بغرا خان نے ایک سوسائٹی قائم کی جس میں قصہ خوان۔ رقاص مغنی اور نقل کرنے والے شامل ہوتے تھے۔ اس کو ہم بجا طور پر ڈرامیٹک سوسائٹی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بہت سی انجمنیں قائم ہو گئیں جہاں شائقین علم و ادب کا مجمع رہتا تھا۔

خلجی عہد:۔ (۱۲۹۰ء — ۱۳۲۰ء) جلال الدین خلجی ابن قدر کا بڑا شاندار اور جاہ و جلال کا بادشاہ ہوا ہے۔ وہ نہایت علم دوست، رنگین طبع، خوش صحبت اور صاحب مذاق واقع ہوا تھا۔ مولانا عبدالقادر بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں ؎

آں زُلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم
واں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیر منت خواہم یک شب بکنار آئی
ہاں بانگ بلند ست ایں پوشیدہ نمی خواہم

حضرت امیر خسروؒ۔ خواجہ حسن۔ تاج الدین عراقی۔ امیر ارسلان۔ سعد الدین منطقی۔ مولانا اختیار الدین۔ قاضی مغیث۔ ملک قرا بیگ وغیرہ اہل کمال اس کے انیس، ہم صحبت اور ندمائے خاص میں داخل تھے۔ (ملاحظہ ہو ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد اول ص۲۹۲)

علاؤ الدین خلجی جس کا نام اپنے معاشی انتظام کی وجہ سے جریدۂ عالم پر ثبت ہو گیا ہے۔ اپنی علمی فیاضیوں کی وجہ سے بھی نہایت مشہور سمجھا جاتا ہے۔ ضیاء الدین برنی کا یہ بیان کہ وہ اُمی محض تھا اور علماء و فضلاء کی صحبت سے سروکار نہیں رکھتا تھا۔ قطعاً غلط ہے۔ فرشتہ اور بدایونی نے اُن علماء فضلاء اور شعراء کی طویل فہرست دی ہے جن کی موجودگی نے اس کے دربار کو رشک آسمان بنا دیا تھا۔ علاؤ الدین کے زمانہ میں ۴۵ بڑے بڑے عالم مختلف کالجوں میں درس دیتے تھے، اُن کو باقاعدہ تنخواہیں ملتی تھیں اور تمام تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ لوگ یکتائے روزگار اور انتخاب زمانہ تھے۔ بقول عبدالحق حقی کے دہلی اس زمانہ میں باکمالوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ قاضی ضیاء الدین۔ مولانا صدر الدین۔ مولانا نجم الدین۔ مولانا حمید الدین ملوری۔ مولانا نظام الدین۔ مولانا فخر الدین ہانسوی۔ مولانا شاطی۔ حسن دہلوی۔ صدر الدین علی۔ شمس الملک اور امیر خسرو اس زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ موخر الذکر نے خزائن الفتوح اسی زمانہ میں لکھی۔ علاؤ الدین نے اُن کا ایک ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو حضرت امیر خسرو دہلوی از پروفیسر محمد حبیب)

علاؤ الدین کا یہ کارنامہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے سرکاری مدارس کھولے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کام شریعت کے موافق ہے یا مخالف۔ جو میں سلطنت کی بھلائی کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اس کا حکم جاری کر دیتا ہوں۔

یہی علاؤالدین ہے جس کے تعصب اور مذہبی جوش کی داستانیں ہر درسی کتاب میں ملتی ہیں۔

قطب الدین مبارک خلجی اگرچہ بڑا عیاش سبک سر۔ رنگین طبع بادشاہ تھا لیکن علم کی قدردانی میں کسی سے کم نہ تھا۔ جب امیر خسرو نے نہ سپہر لکھی تو اس نے ہاتھی کے برابر تول کر روپئے انعام میں دیئے۔

خاندان تغلق:۔ (۱۳۲۰ء—۱۴۱۳ء) غیاث الدین تغلق بڑا فیاض، دریادل اور علم نواز بادشاہ تھا۔ حضرت امیر خسرو کو اس نے مال و دولت سے نہال کر دیا۔ اور ایک ہزار تنکہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ اس نے ایک مجموعہ قوانین بھی مرتب کروایا جس پر اپنی حکومت کی اساس قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ نانی کے قلعہ پر تغلق آباد میں ایک بڑا کالج بھی اسی نے بنوایا تھا۔

محمد تغلق کے برابر صاحب علم و فضل بادشاہ آج تک دلی کے تخت پر جلوہ افروز نہیں ہوا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ہزاروں عالم دوسرے ملکوں سے کھنچ کر اس کے دربار میں آگئے تھے۔ وہ سب کی قدردانی کرتا تھا اور داد و دہش میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ دولت آباد میں بھی اس نے بہت سے مدرسے کھلوائے، اور ان کی سرپرستی کی۔

فیروز تغلق تاریخ کا جید عالم تھا۔ فتوحات فیروز شاہی اسی کی لکھی ہوئی ہے۔ ضیاء الدین برنی اور سراج عارف بھی اسی کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ مولانا علیم اندپتی۔ مولانا خواجگی، مولانا جلال الدین، مولانا عزیز الدین خالد خانی اس زمانہ کے بڑے فاضل اور لائق اشخاص تھے۔ انہوں نے تاریخ۔ فقہ۔ جغرافیہ۔ فلسفہ اور دیگر علوم متداولہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔

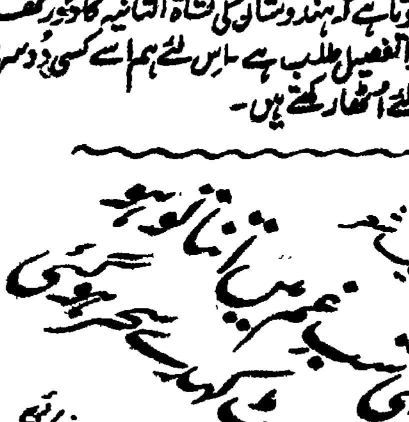
فیروز نے بیشمار مدارس اور مکاتب کھولے اور کوشش کر کے قابل لوگوں کو دور دراز کے حصوں میں بسایا تاکہ لوگ ان کے علم و فضل سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ فیروز تغلق کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے تعلیم کا ایک پورا محکمہ اور ضابطہ قائم کیا۔ ماثر رحیمی میں لکھا ہے کہ اس نے کم از کم پچاس کالج قائم کئے۔ اور ان کے خرچ کا پورا پورا بندوبست کیا۔ "مدرسہ فیروز شاہی" اپنے وقت کی گویا ایک یونیورسٹی تھی۔ جہاں دور دور سے تشنہ کامان علم آکر سیراب ہوتے تھے۔ فیروز تغلق نے علاقوں کی صنعتی، علمی اور فنی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کیا۔

سید عہد میں بدایوں نے ترقی کی۔ اور وہاں بھی دہلی اور فیروز آباد کی طرح لاتعداد کالج قائم ہو گئے۔

لودی خاندان:۔ بہلول لودی بڑا ذی علم بادشاہ تھا۔ ماثر رحیمی میں لکھا ہے کہ اس نے رعایا کی فلاح کے لئے بہت سے اسکول اور کالج کھولے۔ سکندر لودی گلرخ تخلص کرتا تھا اور علم و فن کا بڑا قدردان تھا۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ چند فضلائے عصر ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے جن میں میاں عزیز اللہ سنبھلی اور سید صدر الدین قنوجی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

سکندر لودی نے تقریباً ہر شہر میں مکتب اور مدرسے قائم کئے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ اس نے رعایا کی تعلیمی ترقی کے لئے بڑی جانفشانی اور سعی کی اور قابل پروفیسر اور استاد فراہم کئے۔ فوجی افسروں کے لئے اس نے فوج کی تعلیم لازمی قرار دیدی۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے علوم و فنون کی جانب خصوصی توجہ مبذول کی۔ طب سکندری اسی زمانہ میں مرتب ہوئی۔ آگرہ اسی زمانہ میں دار السلطنت بنا اور ہندوؤں نے اسی عہد سے فارسی کی جانب ایسی توجہ کی کہ بقول بلاک مان کے مسلمانوں کو مات کرنے لگے۔

تیمور کے حملہ کا علم و ادب پر اثر:۔ تغلق خاندان کے زوال کے بعد ہندوستان کی سیاسی وحدت کا خاتمہ ہو گیا۔ تیمور کے حملے نے (۱۳۹۸ء) رہے سہے شیرازہ کو بھی منتشر کر دیا۔ اور تمام ممالک میں صوبہ داریاں اور نوابیاں قائم ہو گئیں۔ جو بالکل آزاد اور خود مختار تھیں۔ اس مرکز کے ٹوٹ جانے کے بعد ہندوستان کا کونہ کونہ علم کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ اس اعتبار سے تیمور کا حملہ بڑی سعادت و برکت کا باعث ہوا۔ اس زمانہ میں جون پور۔ بنگال۔ گجرات۔ بہمنی۔ بیجا نگر وغیرہ نے جو مقامی علم و فن کی سرپرستی کی اس پر اگر ہم غور کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ کا دور تھا۔ یہ داستان ذرا تفصیل طلب ہے۔ اس لئے ہم اسے کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔



تغیر

ہمنشیں دل کی امیدیں حسرت آگیں ہوگئیں
ولولے بھی بجھ گئے بجھتے تبسم کی طرح!
اب کہاں روداد حسن و عشق کی راتیں کہ جب
پتیاں گل کی گریں بادِ فنا سے ٹوٹ کر
بجھ گئی شمع محبت محفلیں تاریک ہیں
کیسی دہریت؟ یہ شکوہ بھی ہے فرسودہ خیال
زندگی بھی ہوگئی اے ہمنشیں جیسے پہاڑ
یادگاریں حسن کی اب ہوگئے پیوندِ زمیں
خواب ہیں وہ انجمنہائے ثنا خوانِ غزل
ہو رہے تقلید کے اب ہو جدانِ کیفِ غم
الو العجب اے انقلاب شیوۂ اہلِ سخن
ہو چلا اب حسن میں بھی اس طرح رد و بدل
اب وہ ہم ہیں نہ وہ دل ہے نہ وسیع لبری
دیکھنا تھا ہم کو ان آنکھوں سے یہ محشر بھی آج

نظم

از جناب سید مقبول حسین احمد پوری

کیف پرور آرزوئیں غم اب دوشیں ہوگئیں
حسن داماں وہ امنگیں صرفِ تمکیں ہوگئیں
داستانیں خونفشاں اشکوں سے رنگیں ہوگئیں
خاک کا پیوند زیرِ پائے گلچیں ہوگئیں
وہ دلوں کی گرمیاں جل بھن کے اب کیں ہوگئیں
فتنہ پردازی کی سب چالیں ہی جب دیں ہوگئیں
تھیں جو پہلے تیز رو گھڑیاں وہ سنگیں ہوگئیں
پائمالِ ہر بُنِ ریحان و نسریں ہوگئیں
لغزشیں بھی جنکی ہمدم ماہ و پرویں ہوگئیں
قلبِ مضطر کی دعائیں غرق آمیں ہوگئیں
خامیاں بھی یک قلم پہلوئے تحسیں ہوگئیں
پاکے شہ کالی بلائیں محوِ تزئیں ہوگئیں
تن ہوئے ترتیب تو شکلیں سنگِ بالیں ہوگئیں
خونِ انساں سے زمینیں جب کہ رنگیں ہوگئیں

حالتِ صبر و شکیبائی کہیں مقبول کیا
یاس کی سنگینیاں پیغام تسکیں ہوگئیں

بُندے

اخلاق آموز چینی افسانہ

از جناب ابو محمد امام الدین رام نگری

کپتان ناکامورا نانکنگ کی جاپانی فوج کا ایک افسر تھا' وہ پندرہ روز کی چھٹی لیکر نانکنگ سے شنگھائی جا رہا تھا، اس لئے اس کی مسرت وشادمانی کی انتہا نہ تھی۔ بات یہ ہے کہ چین کے قدیم دارالحکومت نانکنگ میں ناکامورا کے لئے عیش وعشرت کا کوئی سامان موجود نہ تھا، نہ یہاں کوئی جاپانی ریسٹوران تھا جہاں وہ اپنے بھدے جوتے اتار کر "تاتامی" پر بیٹھتا، نہ اس شہر میں "سوکی یاکی" نصیب تھی' "ساکے" اور "گیشا"۔ بخلاف نانکنگ کے وہ شنگھائی میں ان تمام چیزوں کا لطف اٹھا چکا تھا اور انہی چیزوں کی کشش اسے شنگھائی لئے جا رہی تھی۔

ناکامورا کے تین احباب بھی اس کے ساتھ "شنگھائی نانکنگ ایکسپریس" کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے تھے' یہ سب اپنی فوجی وردی میں تھے۔ لیکن حرب وضرب کے ناگوار اور بے کیف ماحول ومشاغل سے یہ اتنے بیزار وآشفتہ خاطر ہو رہے تھے کہ آٹھ گھنٹے کے سفر میں ان کی زبان پر جنگ کا نام تک نہ آیا۔ وہ جنگ کے خیال تک کو اپنے دماغ سے دور رکھنے کے لئے کھڑکی سے باہر سر نکالے بے کاشت کے کھیتوں اور ویران بستیوں کو دیکھتے رہے۔

شنگھائی اسٹیشن پر سب ٹرین سے اترے اور بیجان پتلیوں کی طرح ایک دوسرے کو مقررہ سلام کر کے اپنے اپنے راستے پر ہو گئے۔

کپتان ناکامورا ایک رکشے کے پاس گیا اور ایک وحشتناک جھٹکے کے ساتھ اس پر بیٹھ گیا۔ رکشا والا گرتے گرتے بچا اور سنبھل کر بولا "کہاں چلنا ہوگا حضور؟ ساوی فونگ؟"

"نہیں، چاپولو"

تھوڑی دیر میں رکشا چاپولو روڈ پر پہنچ گیا، ناکامورا نے اسے ایک جاپانی دکان کے سامنے روک دیا اور رکشا قلی کے ہاتھ پر پانچ سینٹ رکھ کر اتر گیا۔ رکشا قلی گڑگڑا کر کچھ اور مانگنا چاہتا تھا مگر ناکامورا کو تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے دیکھ کر رکشا لئے بدحواس بھاگا۔

یہ دکان ناکامورا کے دوست کوبایاشی سوکی تھی جس نے ناکامورا کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا، موچی اور سبز چائے کے ناشتے کے بعد کچھ دیر دونوں جنگ کے متعلق بات چیت کرتے رہے، پھر کوبایاشی سو نے گرم پانی منگوایا اور ناکامورا غسل کر کے سو گیا۔

دوسرے روز ناکامورا نے حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور تیار ہو کر کپتان وانگ میتوک کی ملاقات کو گیا۔ وانگ کا باپ منچو خاندان کے زوال سے پہلے ایک نامور سیاستدان اور ممتاز رئیس تھا۔ اور وانگ ان دنوں شنگھائی کی کٹھ پتلی حکومت کا رکن تھا جو جاپان کی انگلیوں کے اشارے پر رقص کیا کرتی تھی۔ ناکامورا خفیہ محکمے سے تعلق رکھتا تھا اور اسی کی سفارش سے وانگ کو یہ منصب ملا تھا۔

وانگ میں نہ کوئی سیاسی اہلیت تھی نہ کاروباری لیاقت' وہ دولت وعزت حاصل کرنے کی استعداد وقابلیت سے یکسر محروم تھا۔ وہ اگر کچھ کر سکتا تھا تو یہ کہ رنگ رلیاں منائے' اور عیش اڑائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں طرح طرح کی اخلاقی دنائت ورذالت پیدا ہو گئی تھی۔ مفت کی دولت ہاتھ آنے کے بعد انسان میں اس قسم کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ بہر نوع جن دنوں جاپان نے شنگھائی پر قبضہ کیا وانگ اپنے آباء واجداد کی دولت وثروت کو عیش وعشرت کی نذر کر چکا تھا۔

وانگ جوئے کا اسقدر دلدادہ تھا کہ مسلسل تین تین روز تک ٹیبل پر بیٹھا رہ جاتا۔ درمیان میں صرف اتنی دیر کے لئے اٹھتا جتنی دیر میں وہ "لُس لُس" کھا لیتا۔ اور جن دنوں جوئے کا پروگرام نہ ہوتا کلب میں چلا جاتا اور وہاں عیاشی اور شرابخواری میں راتیں گزارتا۔

شنگھائی کی حکومت کی رکنیت کے لئے جاپانیوں کو کوئی قابل اور باوقعت چینی نہ ملا تو انہوں نے مجبوراً خانہ پری کے لئے وانگ میتک کا انتخاب کیا، لیکن وانگ کے لئے اس منصب کا قبول کرنا شرمناک بھی تھا اور خطرناک بھی، شرمناک تو اس لئے کہ جاپان کے ساتھ اشتراک وتعاون ملک کے ساتھ کھلی ہوئی

بیوفائی اور غداری کے مُرادف تھا اور خطرناک اس لئے کہ وطن پرست احرارِ چین ایسے کتنے غدارانِ مُلک کو گولیوں کا نشانہ بنا چکے تھے۔ وانگ مینٹوک بے شرمی اور حیا باختگی کے کڑوے پیالے کو تو آنکھیں بند کر کے حلق سے بآسانی اُتار سکتا تھا، لیکن حریت پسند چینیوں کے خوف سے اسے یہ منصب قبول کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، مگر جاپانیوں نے دو ہزار ڈالر ماہانہ تنخواہ اور باڈی گارڈ کے لئے الاؤنس دینے کا لالچ دلا کر اسے اپنا ہمنوا بنالیا۔ وانگ کا کام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جاپانی جو آئین و ضوابط تیار کریں وہ ان پر دستخط ثبت کر دے۔

وانگ مینٹک کے ہاں اس کثرت سے جاپانی حکام کی آمد و رفت تھی کہ اس کے محافظ نے کپتان ناکامورا کا ملاقاتی کارڈ لیجا کر دیا تو اسے مطلق تعجب نہ ہوا، وہ سمجھ گیا کہ کوئی کام ہوگا، یا ممکن ہے یوں ہی چلا آیا ہو، جاپانی جاسوس ہر وقت ہی اس کے ہاں پڑے جاتے کے پیالے خالی کرتے اور سگریٹ پھونکتے رہتے تھے۔ وہ باتیں تو طرح طرح کی کرتے، مگر سب فضول اور لغو، ان کا مقصد وانگ کے خیالات کا جائزہ لیتے رہنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ بھی ان کے بیہودہ توہمات اور احمقانہ شبہات کا اتنا خوگر ہو چکا تھا کہ ان کا گھنٹوں بیٹھے رہنا بھی اسے ناگوار نہ گذرتا تھا۔

کپتان ناکامورا اندر آیا تو وانگ نے اپنے بھاری بھرکم مجسّے کے ساتھ اُٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ دونوں میں صاحب سلامت اور مزاج پُرسی ہوئی، وانگ نے ناکامورا کو بٹھا کر مُلازم کو چائے، مٹھائی اور تربوز کے بیج لانے کا حکم دیا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ناکامورا نے کہا۔
مسٹر وانگ اجازت دیجئے تو مَیں آپ سے ایک بات کہوں؟
"ضرور، ضرور کپتان صاحب، فرمایئے، کیا بات ہے؟"
"میرے پاس موتی کے دو بُندے ہیں۔ کیا آپ ان کو دیکھنا پسند فرمائیں گے؟"
"بصد شوق کپتان صاحب! بصد شوق۔"

وانگ مینٹک سمجھ گیا کہ ناکامورا ہی کی سفارش سے اسے منصب ملا ہے اور وہ آج اس حیلے سے اس کا معاوضہ وصول کرنا چاہتا ہے، وہ کانچ کے دو ٹکڑے دیکر اس سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کریگا۔ اور اگر اس نے انکار کیا تو کسی جاپانی کو اشارہ کر کے اس کا کام تمام کرا دیگا۔

کپتان ناکامورا نے خاص انداز سے کوٹ کے بٹن کھولے اور اندر کی جیب سے ایک خوبصورت چرمی بٹوا نکالا۔
"دیکھئے تو مسٹر وانگ اسے"۔ ناکامورا نے ایک نفیس ریشمی رُومال میں بندھے ہوئے موتی کے بُندے وانگ کی طرف بڑھا دیئے۔

وانگ نے رُومال کی گرہ کھولی تو اس میں سے موتی کے دو بُندے نکلے، وانگ بُندے دیکھ کر بیساختہ چونک پڑا۔ وہ بُندے اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو تحفے میں دیئے تھے۔ ناکامورا کا خیال کسی اور طرف تھا اس لئے اس نے وانگ کا چونکنا دیکھا نہ اس کو یہ پتہ چل سکا کہ وانگ کا چہرہ یکایک سفید پڑ گیا ہے، اگر فی الواقع وانگ کے چہرے پر خون کی سُرخی تھی بھی کہاں جو ناکامورا کو پتہ چلتا، اس کی بھی خبر نہ ہوئی کہ وانگ کے قلب کی حرکت دفعتہً تیز ہو گئی۔

وانگ دیر تک موتیوں کو گھما پھرا کر دیکھتا رہا چند ہی سال قبل اس نے اپنی چھوٹی بہن کو یہ موتی دیئے تھے، ابھی تک ان کی تابش اور جلا میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ان موتیوں پر اس نے خاصی رقم صرف کی تھی۔ وہ ان کو پاکر ان کی گران قیمتی سے زیادہ اس بنا پر خوش تھا کہ اس کی گم شدہ بہن کا پتہ چل جائیگا۔ وہ زمانے کی نیرنگیوں پر غور کر رہا تھا کہ کتنے انقلابات و حوادث کے بعد آج وہ موتی پھر اس کے ہاتھ میں تھے۔
"کپتان صاحب یہ بُندے تو نہایت قیمتی اور نفیس ہیں، کیا آپ ان کو میرے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں؟"
"آپ ان کی کیا قیمت دیں گے؟"
"آپ ہی فرمایئے۔"

کپتان ناکامورا کو موتیوں کی صحیح قیمت کیا معلوم؟ اس کا اندازہ تھا کہ چند سو ڈالر کے ہوں گے، مگر وہ وانگ سے پانچ ہزار ڈالر وصول کرنا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ مول بھاؤ کے بغیر تو سودا ہوتا نہیں، اس لئے اس نے دس ہزار ڈالر قیمت کی بات چیت شروع کی۔
"آپ تو مذاق کر رہے ہیں کپتان صاحب، بیشک موتی اچھے ہیں، پھر بھی ان کی قیمت دو سو ڈالر سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔"
"مذاق نہیں مسٹر وانگ، بھلا مَیں آپ سے مذاق کروں گا،

میں آج صبح جوہری کے پاس گیا تھا اس نے دس ہزار ڈالر دام لگائے' لیکن میں نے سوچا آپ جواہرات کے شوقین رئیس ہیں آپ ان کو خرید لیں گے اس لئے میں ان کو آپ کے پاس لے آیا ہوں۔"

"یہ آپ کی قدر افزائی ہے کپتان صاحب' لیکن آجکل ہاتھ خالی ہے' پھر بھی چونکہ مجھے چیز پسند ہے' اس لئے میں ایک ہزار ڈالر تک دیدوں گا۔"

کپتان نے کہا۔ "دیکھئے وانگ صاحب اگر آپ کہیں گے تو میں آپ کو ایک ہزار چھوڑ دوں گا' نو ہی ہزار لے لونگا۔"

وانگ بولا۔ "لیکن میں زیادہ سے زیادہ دو ہزار ڈالر دے سکتا ہوں' اس سے زیادہ کے لئے مجھ میں ہمت نہیں ہے' دوسری چیز اس سے دُگنی قیمت کی ہوتی جب بھی میں اس سے زیادہ نہ دے سکتا۔"

کپتان ناکامورا سمجھتا تھا کہ وانگ ابھی اور قیمت بڑھائیگا' اس نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ جواہرات کے کتنے قدردان ہیں' اس لئے آپ کبھی پسند نہ کرینگے کہ یہ موتی کسی جوہری کے پاس چلے جائیں' اسی خیال سے میں ساڑھے سات ہزار ڈالر آپ کو دیدونگا۔"

کپتان کے آخری الفاظ بجائے خود نرم تھے۔ پھر بھی ان میں دھمکی کی آمیزش محسوس ہوتی تھی۔

وانگ نے کہا۔ "جب آپ کو میرا اتنا لحاظ ہے تو میں بھی آپ کی بات رد نہیں کرسکتا' لیکن میں آپ سے التجا کروں گا کہ آپ پانچ ہزار سے زیادہ کے لئے مجھے مجبور نہ کریں۔"

دونوں کے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑ گئی' کیونکہ سودا دونوں کے موافق طے ہوا تھا' وانگ نے دوبارہ پیالے بھرے اور چائے پیتے ہوئے دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم ہو گئے۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وانگ بولا۔ "آپ رقم کس طرح لینا پسند کریں گے؟"

"نقد ہی تو لینا چاہتا ہوں۔"

"اس کے لئے تو میں معذرت چاہتا ہوں' آج کسی طرح ادائیگی ممکن نہیں' کل تک امید ہے کہ دیدوں۔"

"اتنے کے لئے مضائقہ نہیں' کل ہی سہی۔ لیکن کل پھر میرا آپ کے ہاں آنا مناسب نہ ہوگا۔"

کچھ دیر غور کرنے کے بعد وانگ بولا۔ "مجھے کسی جاپانی ریسٹوراں میں گئے بہت روز ہو گئے' اگر میں کل شام کے لئے آپ کو کھانے کی دعوت دوں تو آپ قبول فرمائیں گے؟ اسی وقت میں آپ کی رقم بھی دیدونگا۔"

"اگر ایسا ہے مسٹر وانگ تو آپ کیوں زحمت اٹھائیں گے' میں خود آپکو مدعو کرتا ہوں۔"

"چلئے یہی سہی۔"

مقام اور وقت طے کرنے کے بعد چائے کا آخری پیالہ پی کر کپتان ناکامورا نے رخصت چاہی۔ کچھ دور تک وانگ اسے پہنچانے گیا' پھر کپتان نے ٹوپ ہاتھ میں لیکر اور وانگ نے جھک کر ایک دوسرے کو سلام کیا اور ساتھ ہی دونوں کی زبان سے نکلا۔ "اچھا اب کل۔"

کپتان باغ کی کنکریلی زمین پر سے گذرتا پھاٹک سے باہر نکل گیا' دربان نے اسے سلام کیا مگر اس نے کچھ توجہ نہ کی۔ سڑک پر ٹرام کی کھڑ کھڑ کرتی گھنٹیوں' رکشا قلیوں کی ہٹو بچو' اور موٹروں کی پوں پوں سے شور نا رہنی ہوئی تھی۔

وانگ نے چائے کا ایک اور پیالہ خالی کرکے ملازم کو کھانا لانے کا حکم دیا۔

دوسرے روز سات بجے سے کچھ پہلے ہی کپتان ناکامورا گولڈن کرشچین ریسٹوراں میں پہنچ گیا۔ یہ ریسٹوراں جاپان کے مفتوحہ شنگھائی کے حصے محلہ ہونکو کی ووشنگ اسٹریٹ کی ایک گلی میں واقع تھا۔ کپتان نے اگلے ہی روز ٹیلیفون کے ذریعہ ایک علاحدہ کمرہ ریزرو کرالیا تھا' اور کھانے کے خاص اہتمام اور دو حسین وجمیل خادماؤں کے انتظام کے لئے بھی ہدایت کردی تھی۔

وانگ ٹھیک سات بجے بند موٹر سے ریسٹوراں کے دروازے پر اترا۔ وہ آسمانی رنگ کے باریک نفیس ریشمی لباس میں تھا۔ وہ آج کئی مہینے کے بعد کسی طرح کا خوف وخطر محسوس کئے بغیر گھر سے باہر نکلا تھا۔ دستور کے مطابق دو باڈی گارڈ اسے ریسٹوراں کی طرف لے گئے۔

ایک محافظ نے ٹھوکر مار کر ریسٹوراں کے چوبی دروازے کو کھولا۔ اوپر ایک گھنٹی کی آواز سنائی دی' ریسٹوراں کا مالک وانگ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس لئے وانگ جیسے ہی چھوٹے چھوٹے درختوں اور چھوٹے سے فوارے والے مختصر سے باغ میں داخل ہوا

مالک نے بڑھ کر اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا، اور کہا۔

"جناب والا! کپتان ناکامورا آپ کا انتظار کر رہے ہیں، اِدھر سے تشریف لے چلئے . . . "

وانگ نے اپنے آدمیوں کو واپس کیا اور ریسٹوراں کے مالک نے ایک چھوکری کو وانگ کے جُوتے اُتارنے اور سلیپر پہنانے کا حکم دیا۔ اتنے میں ناکامورا بھی لکڑی کے چمکتے ہوئے زینوں سے اُتر کر نیچے آگیا، وہ آج نہایت مسرور اور بشاش تھا، اس نے بڑی گرمجوشی سے وانگ کا استقبال کیا۔

ناکامورا نے جو کمرہ ریزرو کرایا تھا وہ ریسٹوراں میں سب سے اعلیٰ درجے کا کمرہ تھا۔ اس کا رُخ شاداں باغ کی جانب تھا۔ ایک دیوار نے اسے بیرونی دُنیا سے جُدا کر دیا تھا۔ اس میں کامل خموشی اور تنہائی تھی "تاتامی" پر ریشمی تکئے نہایت قرینے سے رکھے ہوئے تھے، ایک گوشے میں گلاب کے سرخ اور سفید پھول ٹہنیوں سمیت گلدان میں زیب دے رہے تھے، جن کی خوشبو سے کمرہ معطر ہو رہا تھا۔

وانگ اور ناکامورا کمرے کے وسط میں ایک نیچے ٹیبل پر ٹانگ موڑ کر بیٹھے، کپتان نے تالی بجا کر پکارا "نائی سان!"

"ہائی!" ان کی خدمت کے لئے جو دو نازنینیں مقرر تھیں ان میں سے ایک کوکی اور آہستہ آہستہ زینوں کو طے کرتی کمرے میں آکر آنکھیں نیچی کر کے کھڑی ہو گئی۔

"نائی سان! چائے لاؤ اور کھانے کا سامان کرو۔"

حکم پاتے ہی دونوں خادمائیں طشتریوں میں انواع واقسام کی لذیذ ونفیس چیزیں سجا کر لائیں، دو گیس سٹو مچھلی اُبالنے کے لئے ٹیبل پر رکھ دیئے گئے۔ لوہے کی کڑاہی میں تیل ڈال کر گوشت اور مُرغی تلی جانے لگی، جب تک کھانا تیار ہو، کپتان اور وانگ ناشتہ کرنے لگے، ناشتے کی خوش ذائقہ اور نفیس چیزوں، شراب کی بوتلوں اور حسین و گل اندام دوشیزاؤں نے تکلفات برطرف کر دیئے۔ پینے کھانے کا شغل جیسے جیسے ترقی کرتا گیا دونوں کی زبانیں اور حرکتیں بے قید ہوتی گئیں، ایک دُوسرے کو باصرار تمام پلانے کھلانے لگا۔ آخر جب کپتان نے دیکھا کہ وانگ اب کھاتا نہیں، محض تکلف کر رہا ہے تو اس نے خادماؤں کو ٹیبل صاف کر کے شراب، پھل اور سگریٹ لانے کا حکم دیا۔ ان چیزوں کے آجانے کے بعد خادماؤں کو چھٹی دیدی گئی۔

کپتان نے کہا "ہوٹل کی لڑکیاں کتنی ہی حسین و جمیل ہوں لیکن میں تو ان کی بہ نسبت طوائفوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

"جاپانی لڑکیاں . . . " وانگ نے بات چیت شروع کی۔

چائے کا گھونٹ حلق سے اُتار کر کپتان کہنے لگا۔ "لڑکیوں کے متعلق جنگ میں مجھ کو کافی تجربہ ہوا۔ جنگ بھی عجیب چیز ہے، جاپانی فوج نے بھی حد کر دی، اس قدر مال لُوٹا جو بیان سے باہر ہے۔"

کپتان کی آنکھوں میں جنگ کے مناظر رقص کرنے لگے، اسے ایسا محسوس ہونے لگا وہ ریسٹوراں میں نہیں میدان جنگ میں ہے۔ اس کے انداز سے شرابی پن ظاہر ہو رہا تھا اور اس کی باتوں میں بھی بہک پیدا ہو گئی تھی، وہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جس وقت ہم لوگوں نے نانکنگ پر قبضہ کیا اُس وقت کی کیفیت آپ ساتھ ہوتے تو دیکھتے، ہم اپنے متعدد ساتھیوں کو کھو کر پاگل سے ہو رہے تھے۔ لیکن ہم نے بھی انتقام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔ بوڑھا، جوان، عورت، بچہ، جو چینی بھی ملا اُسے بے دریغ موت کے مُنہ میں جھونک دیا۔"

کپتان کو وانگ نے مختصر جواب دیا "اُس روز کی یاد کبھی فراموش ہونے والی نہیں کپتان!"

کپتان کہتا گیا "ہم نے چینیوں کے غول کے غول گرفتار کئے، اور دس دس، بیس بیس، پچاس پچاس جتنے بھی ملتے گئے ہم سب کو بے دریغ مشین گن کی نذر کرتے گئے، ہمارے کانوں میں اب "رٹ ٹٹ ٹٹ" کی آواز گونجا کرتی ہے جس میں مجھے موسیقی کا سا لُطف محسوس ہوتا ہے، . . . ہم پر کیا موقوف ہے، ہر سچے جنگجو کو مشین گن کی آواز موسیقی خیز معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے فتح تو حاصل کر لی لیکن جشن فتح منانے کے لئے ہمارے پاس نہ بارود باقی تھی اور نہ چراغ موجود تھے۔ پھر بھی ہم نے ایک ترکیب سوچ لی، اسیرانِ جنگ میں سے ہم نے کچھ کر لیا اور ان پر گھاس لپیٹ چھڑک کر سلائی لگا دی، پھر تو نہ پوچھئے کہ ہم نے روشنی اور چیخ پکار سے چراغاں اور آتشبازی کے کیا کیا تماشے دیکھے، لیکن کُتّوں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی، اس لئے ہمیں دُور سے اس تماشے کا لُطف اُٹھانا پڑا۔"

وانگ پر ایک سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔

کپتان نے کہا "ارے تعجب ہے بھئی، آپ تو یوں ہی بیٹھے ہوئے ہیں، پینے پلانے کے سوا دُنیا میں اور رکھا ہی کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے کپتان "سا کے" چار پانچ گھونٹ غٹ غٹ حلق سے اُتار گیا۔

وانگ نے زیادہ شراب پینے سے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے معافی چاہی، اس کے چہرے سے بیزاری و دل برداشتگی ظاہر ہو رہی تھی

اس نے آہستہ سے سوال کیا "اس کے علاوہ جنگ میں آپ کو اور قسم کے تجربات بھی تو حاصل ہوئے ہونگے کپتان صاحب!"

کپتان بولا "اجی آپ تجربات کو پوچھتے ہیں جتنی لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے تاتل مل جاتیں، اور ہم افسروں کو تو ایک سے ایک پری پیکر و گل اندام، کاش ایک بار آپ ساتھ ہوتے اور دیکھتے..."

وانگ درمیان ہی میں بول اُٹھا "آپ تو حسن و جمال کے نقاد ہیں، اگر آپ کے معیار پر کوئی اُتر سکی تو...؟"

اگر آپ یہ فرماتے ہیں تو میرے بلند معیار کے مطابق نانکنگ میں صرف ایک دوشیزہ ملی تھی، اگر ہمیں چینیوں کی ہلاکت اور اسیری کے کاموں سے فرصت ہوتی تو ہمارا سب سے خوشگوار اور پسندیدہ شغل صرف دوشیزاؤں کی تلاش و جستجو ہوتا۔"

وانگ نے کہا "کپتان صاحب! ذرا اس نانکنگ والی دوشیزہ کا حال سنائیے۔ اس طرح کی بعض لڑکیاں میرے تجربے میں بھی آ چکی ہیں"

"میری طبیعت تو ایسی ہے کہ اگر پسند کی کوئی نہیں ملتی تو چاندماری کر کے دلبستگی کر لیا کرتا ہوں۔ ایسی ویسی کے ساتھ وقت برباد کرنے کی نسبت کچھ دنوں یوں ہی رہنے میں مضائقہ ہی کون سا ہے؟

بہرحال میں کسی حسین و دلپسند دوشیزہ کی تلاش میں نانکنگ کی کوچہ گردی کر رہا تھا کہ شاندار مکان نظر آیا۔ اگرچہ وہ مکان خالی معلوم ہو رہا تھا، پھر بھی اس میں گھسنا خطرے سے خالی نہ تھا اس لئے میں احتیاطاً پانچ سات آدمیوں کو لیکر اندر داخل ہوا۔ نہایت آراستہ و پیراستہ مکان تھا۔ میں نے تمام کمروں کا گشت کیا۔ آخر اس میں میری مطلوبہ چیز مل گئی۔

"آپ نے اس مکان میں کیا دیکھا؟" وانگ نے سوال کیا۔

"ٹھہریئے بتاتا ہوں" کچھ دیر چپ رہکر کپتان نے کہنا شروع کیا۔ "زیریں منزل کے تمام کمروں کو دیکھ چکنے کے بعد ہم اوپر چڑھے۔ ہمیں شروع ہی میں جو کمرہ ملا اس پر قفل پڑا ہوا تھا جس کے توڑنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہ آئی، میں سب سے آگے تھا۔ اس لئے میں نے ایک گوشے میں ایک پری جمال اور ماہ وش چینی دوشیزہ کو دیکھا، ایسی حسین و جمیل لڑکی میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھیں، اس کی صورت، اس کی رنگت... بس میں کیا کہوں، میرے پاس الفاظ نہیں جو میں اس کی لطافت و دلربائی اور نزاکت و رعنائی کی تعریف کر سکوں، میرے آدمی تو اسے دیکھتے ہی دیدۂ شوق بن گئے، میں نے ان سب کو باہر بھیج دیا۔

وہ لڑکی ہیبت سے پیکر سکوت بن کر کھڑی تھی، میں نے جیسے ہی اُس کی جانب قدم بڑھایا وہ بے اختیار چیخ اُٹھی اور کہنے لگی۔ "نہیں، نہیں، مہربانی کر کے مجھ کو بخش دیجئے"۔ لیکن میں اس کی کب سننے والا تھا، میں نے اُسے اُٹھا کر بستر پر ڈال دیا، اُس نے اپنے کانوں کے دونوں بُندے اُتار کر میرے سامنے رکھدیئے اور گڑگڑا کر کہنے لگی "تم یہ بُندے لے لو، اور مجھ کو چھوڑ دو"۔ وہ کتنی بھولی اور بے وقوف لڑکی تھی، اُس نے بُندے بھی کھوئے اور مجھ سے بچ بھی نہ سکی۔

وانگ نے پوچھا "یہی وہ بُندے تھے جو آپ نے کل مجھ کو دیئے"؟

کپتان نے جواب دیا "جی ہاں وہی بُندے"۔

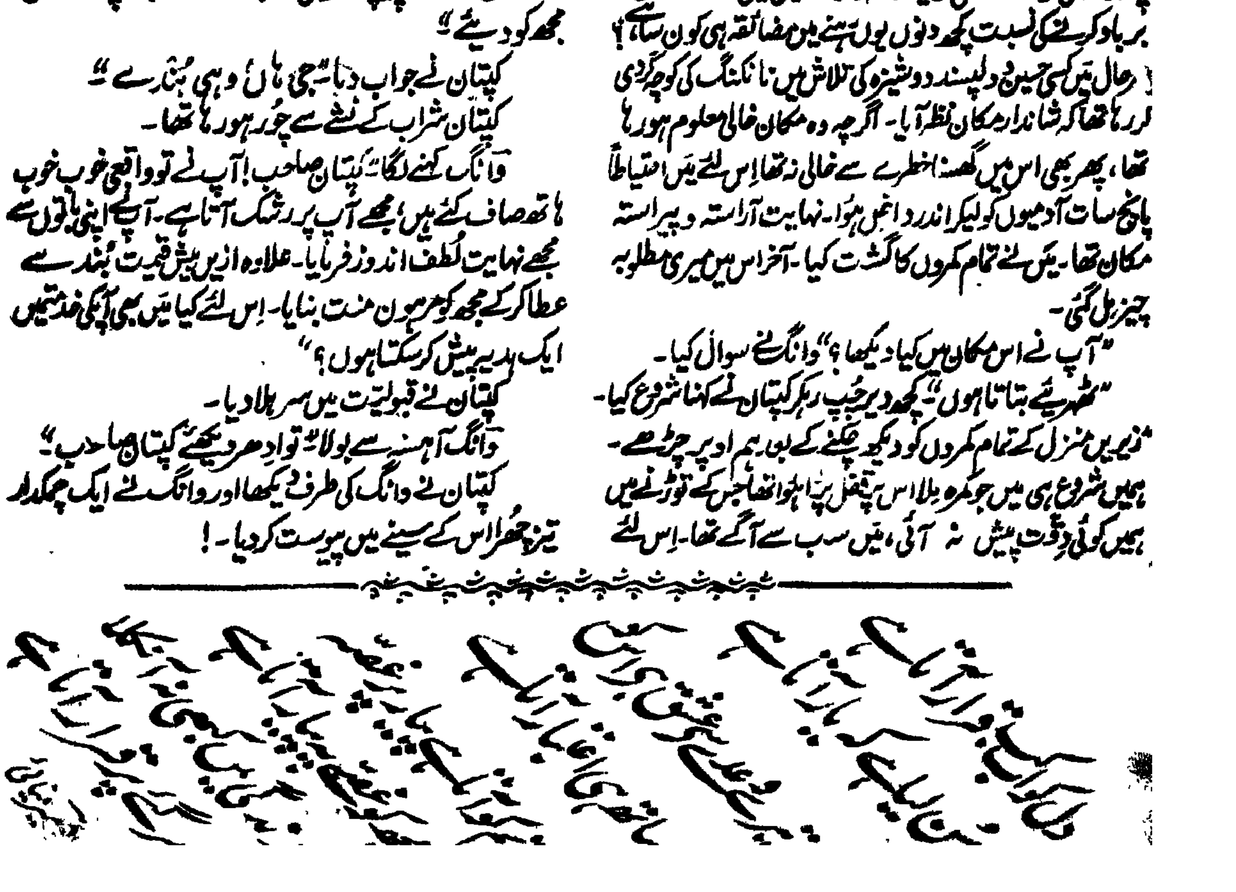
کپتان شراب کے نشے سے چُور ہو رہا تھا۔

وانگ کہنے لگا "کپتان صاحب! آپ نے تو واقعی خوب خوب ہاتھ صاف کئے ہیں، مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ آپ نے اپنی باتوں سے مجھے نہایت لطف اندوز فرمایا۔ علاوہ ازیں بیش قیمت بُندے عطا کر کے مجھ کو رہین منت بنایا۔ اِس لئے کیا میں بھی آپکی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کر سکتا ہوں؟"

کپتان نے قبولیت میں سر ہلا دیا۔

وانگ آہستہ سے بولا "تو اِدھر دیکھئے کپتان صاحب"۔

کپتان نے وانگ کی طرف دیکھا اور وانگ نے ایک چمکدار تیز چھرا اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔!



نُشر نُشٹ دُھپ میں!

علم صوت

از جناب مولوی بشیر احمد برہانپوری

زمانۂ قدیم میں چیستانوں کی طرح محض آوازوں کے مجموعوں سے بھی مدمقابل کی طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ جیسا کہ ملا دوپیازہ کے "نُشر نُشٹ دُھپ میں" والی جوابی معرکہ آرائی سے ظاہر ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ کسی نے ملا صاحب سے دریافت کیا کہ بھلا یہ تو بتایئے کہ "نُشر نُشٹ دُھپ میں" سے کیا مراد ہے۔ چونکہ ملا صاحب ماہر علم صوت تھے۔ اس لئے جواب دیا کہ بھئی ممکن ہے کہ کوئی بکری کا بچہ کسی چھت یا چھجے پر جا پہنچا ہوگا اور وہاں سے سرکے بل پھسل پڑا ہوگا۔ اور دُھپ سے زمین پر گرتے ہی مَیں مَیں کرکے چلاّ اٹھا ہوگا جس سے تمھارے لئے چیستاں سازی کا سامان فراہم ہوگیا۔ یہ جواب سن کر مدمقابل نے ملا دوپیازہ کی عقل رسائی کی داد دی۔

ہندی شاعری کے باوا آدم طوطی ہند جناب امیر خسروؒ بھی علم صوت کے زبردست ماہر تھے۔ انھوں نے مکرنیوں۔ کہہ مکرنیوں اور ڈھکوسلوں کے علاوہ علم صوت کے معرکہ آرا جوابات کی مثالیں صفحۂ قرطاس پر چھوڑی ہیں۔ چنانچہ آب حیات کے دو فارسی قطعات اس صداقت کا بین ثبوت ہیں۔ اسی طرح ان کے متعلق ایک اور قصہ مشہور ہے کہ کسی شخص نے ازراہ مزاح امیر خسرو کے سامنے کہا کہ "شار ٹر شٹر پٹر بڑ شوں" کے کیا معنی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ التجا کی کہ ان الفاظ کی تشریح کے لئے انہیں اشعار کے شکنجے میں کس کر موزوں کر دیا جائے امیر خسرو کے کچھ دیر غور کرنے کے بعد مندرجہ ذیل قطعہ مرتب کرلیا ؎

دھان دھما کا دھنک دُھوں   چھاج پھوڑ اچھر بڑ چھوں
ہانڈی ڈوئی کھڑ بڑ کھوں   شار ٹر شٹر پٹر بڑ شوں[1]

(از کتاب گدگدی حصہ اول)

[1] ترجمہ دھان کو اوکھلی میں ڈال کر دھنک دھوں کرکے کوٹا اور اسے جلد جلد چھاج میں پھوڑ کر ہانڈی میں ڈالا اور ڈوئی سے ہلا کر اسے خوب مزے لے لے کر کھایا۔

خلاق عالم نے حلق انسانی میں موسیقار کی منقار کی سی کیفیت پیدا کی ہے اگر موسیقار کی چونچ سے ۱۶۰ سُر نکلتے ہیں تو انسانی حلق میں بھی جملہ اقسام کی آوازیں نکالنے کی قوت عطا کی گئی ہے اس لئے صدہا الفاظ جوں کے توں اپنی اصواتی حالت میں رائج ہوگئے ہیں طفل انسان شکم مادر سے خارج ہوتے ہی روں روں رونے لگتا ہے یہی آواز بچے کے رونے کے لئے مقرر کی گئی۔ اگر طفل خورد سال سوتے میں پہلوئے مادر کے نیچے دب جائے تو وہ ٹیں کرکے چیخ اٹھتا ہے اس لئے یہی لفظ ماہرین علم الاصوات نے بچے کے دبنے کی آواز کے لئے صحیح مان لیا۔ چونکہ ماں اور آبا یہ دو الفاظ پہلے پہل بچے کی زبان سے نکلتے ہیں اس لئے ہر دو الفاظ لغت نگاروں نے بھی صحیح تسلیم کرلئے اگر کسی کے سوئی یا کانٹا چبھ جائے تو یکایک اس کی زبان سے لفظ "سی" نکل جاتا ہے۔ یا کسی کو لاعلمی میں ڈرایا جائے تو فرط خوف سے اس کی زبان سے لفظ "ہاؤ" خارج ہوتا ہے۔ اس لئے ان ہر دو الفاظ کو اہل زبان نے صحیح مان کر فرہنگوں میں شامل کرلیا ہے۔

ماحول کا بھی آوازوں پر عموماً اثر پڑتا ہے۔ مثلاً جو لوگ پہاڑی علاقوں میں بستے ہیں انھیں اترتے اور چڑھتے وقت اپنی گفتگو جاری رکھنی پڑتی ہے۔ اس لئے ان کی آواز میں ایک قسم کی گھگھری پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح وحشی قبائل جن کی بود و باش کوہ و دشت میں ہوتی ہے وہ پرندوں اور جانوروں کی آوازوں کی ہو بہو نقل اتارنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر کنڈر گارٹن کی نظموں میں دلآویز اصواتی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے تاکہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی پیدا ہو۔

اقصائے عالم میں ہر زبان کی بنیاد علم صوت پر رکھی گئی ہے مثلاً انگریزی میں کوئل کو ککو کہتے ہیں۔ اور حقے کو ہبل ببل کہتے ہیں ہر دو الفاظ محض کوئل کی کوک اور حقے کی گڑ گڑاہٹ سے بنائے گئے ہیں۔ پرندوں کے چہچہانے کو انگریزی میں ٹوئیٹر اور بندر کے

کلکاری مارنے کو "چہیٹر" کہتے ہیں - یہ الفاظ بھی ان کی آواز کی بنا پر ڈھالے گئے ہیں - یہی حال فارسی الفاظ کا ہے مثلاً زق زق دبق بق (جک جک بک بک) غرفش - کوکو - کلاغ وچغوک وغیرہ چونکہ کوا کلغ کلغ کیا کرتا ہے اس لئے کلاغ کہلایا اور چڑا چغو چغو کی آواز نکالتا ہے اس لئے اس کا نام چغوک پڑگیا - اسی طرح فارسی میں مرغی کے کٹ کٹ کرنے کے لئے قد قد کردن اور چڑیا کے چوں چوں کے لئے جیک جیک کردن الفاظ بنائے گئے - مکھیوں کی بھنبھناہٹ کو ونگ ونگ کردن کہتے ہیں اسی طرح عوعو کردن کتے کے بھونکنے کے لئے اور بع بع کردن بھیڑ بکری کے ممیانے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر زبان میں صدہا الفاظ محض اصوات کی مدد سے بنائے جاتے ہیں - اہل فارس اصوات کی اصواتی خوبیوں کے زمانہ قدیم سے شیدا چلے آتے ہیں - ذیل کے فارسی قطعہ میں اس کا کافی ثبوت موجود ہے ؎

شاہ پرسید از حکیم ارجمند
درجہاں آوازہا ہستند چند

گفت شاہا در جہاں آوازہا
ہست لیکن ایں چہار آمد پسند

قلقل باگ صراحی چرچر سیخ وکباب
چھچھ بوس وکنار وشرشر شلوار بند

(از کتاب ظرافت کی پڑیا)

عربی زبان میں بھی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے لئے طنین - پرندوں کی آواز کے لئے صفیر - قلم کی آواز کے لئے صریر اور شیشہ شراب کی آواز کے لئے قلقل رائج ہے -

اُردو زبان میں کوئل کی آواز کے لئے پی پی یا پی کہاں رائج ہے اسی طرح بچوں کا آغوں یا غوں غاں کرنا بھی آواز ہی کی بنا پر بنایا گیا ہے - بندر کا کگیانا یا خوخیانا اس کی اصلی آواز ہی کی بنا پر بنایا گیا ہے مرغی جب کڑکڑ کرتی ہے تو اسے کڑکڑانا کہتے ہیں بکرا جب مستی کی حالت میں پکارتا ہے تو اُسے بغبغانا کہتے ہیں - یہ لفظ اس کی اصلی حالت سے ترتیب دیا گیا ہے -

اہل زبان کے لئے جس طرح روزمرہ - محاورہ - حذف - حروف جار یا تکرار لفظی کے قواعد سے واقف ہونا لازم ولابد ہے - اسی طرح مختلف اقسام کے صوتی الفاظ پر عبور رکھنا بھی نہایت ضروری ہے انگریزی شعرا میں ٹینی سن اور لانگ فیلو اور اُردو شعرا میں سودا - انشا، اور نظیر اکبرآبادی موزوں صوتی الفاظ کے ماہر تھے - یہ مسلّمہ امر ہے کہ انسان کا مطالعہ فطرت جس قدر وسیع ہوگا وہ صوتی الفاظ پر زیادہ عبور حاصل کر سکے گا - بیسیوں شعرا اور مضمون نگار ایسے دیکھے گئے ہیں جو صوتی الفاظ کے استعمال میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں - یا غلط الفاظ استعمال کرکے نشانہ تضحیک بنتے ہیں - صحیح صوتی الفاظ کا استعمال کرنا طبع سلیم پر منحصر ہے اور روزمرہ کا ایک ضروری عنصر مانا جاتا ہے - اسی بنا پر منشی امیر مینائی نے اس طرح رائے زنی کی تھی

ہم سند کے لئے غزل میں امیر
فصحا کی زبان لیتے ہیں!

صوتی الفاظ کا استعمال کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے - مثلاً جلنے کے لئے عوام کی زبان پر بھڑ بھڑ جلنا چڑھا ہوا ہے - لیکن صحیح صحیح دھڑ دھڑ جلنا ہے جیسا کہ آگے چل کر مثالوں سے ظاہر ہوگا - منشی پریم چند نے باوجود ایک اچھے انشا پرداز ہونے کے بھینس کے ڈکرانے کے لئے ممیانا استعمال کرکے زباندانی کی لُٹیا ڈبو دی ہے - ذیل کا جملہ پڑھنے سے جملہ شکوک رفع ہو جائیں گے -

"بھینس اپنے بچھڑے کو دیکھنے کے لئے دوڑتی اور ممیاتی ہوئی آئی ——" (پریم پچیسی جلد اول)

اہل دہلی و لکھنؤ میں صوتی الفاظ میں کسی قدر فرق معلوم ہوتا ہے مثلاً دہلی میں دروازہ کھٹکھٹانا محاورہ رائج ہے - لیکن اہل لکھنؤ تھپتھپانا کہتے ہیں - مولانا شرر نے اپنی ناولوں میں کئی جگہ تھپتھپانا ہی لکھا ہے - دہلی میں لفظ جھائیں جھائیں بطور حرف تمیز استعمال ہوتا ہے جیسے "چھوٹی بہن پیٹ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ آپا مجھے بچاؤ مری جا رہی ہوں - مگر آپا ہیں کہ جھائیں جھائیں برتن مانجھ رہی ہیں" (مراۃ العروس) مگر یہی لفظ لکھنؤ میں جھگڑا فساد یا تکرار کے معنوں میں مستعمل ہے جیسے "چپراسیوں نے فوجداری کمک کرکے گھر کو گھیر لیا اور چار گھنٹے کی جھائیں جھائیں ہینشت مشت اور تکا فضیحتی کے بعد سارا سامان قرق کر لیا" (حاجی بغلول از سجاد حسین)

ماہرین علم صوت نے جانوروں کے بلانے اور بھگانے کے لئے بھی جو الفاظ بنائے ہیں ان میں یہ خوبی ہے کہ ان کا مفہوم آدمی اور جانور دونوں سمجھتے ہیں - مثلاً کتے کو بلاتے وقت لفظ تُو تُو کا اور ہنکاتے وقت دُھت کا استعمال کیا جاتا ہے - ان لفظوں سے آدمی اور کتا دونوں واقف ہوتے ہیں - پس پس کرنے سے بلی پاس چلی آتی ہے - ہو ہو کہنے سے گلّے بیل آ جاتے ہیں - بندر کو ہنکانے یا دفع کرنے کے لئے لگے لگے کہتے ہیں - کوکو کہنے سے کبوتر اُڑ جاتے ہیں - ہیل ہیل - دُست دُھت - برّی برّی - یہ الفاظ ہاتھی کے چلانے اور جوش دلانے کے لئے مستعمل ہیں دکن میں تی تی مرغیوں

کو بلانے کے لئے اور ہر ہرے بکری کے بلانے کے لئے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

سودے نامی انگریزی شاعر نے ندی کے بہاؤ کا ذکر کرکے پانی کے متعلق جملہ اقسام کے صوتی الفاظ کا استعمال کرکے اہل دانش کو محو حیرت بنا دیا ہے۔ اس کا ترجمہ اکبر الہ آبادی نے آب لڈور کے نام سے کیا ہے لیکن اس میں انگریزی زبان کی سی خوبی پیدا نہ ہو سکی۔ انگریزی گرامر نگاروں نے ہر جانور کی بولی کے لئے الگ الگ نام دیئے ہیں۔ اسی طرح ہیچرز نے چند الفاظ فراہم کئے ہیں جو تفنن طبع کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اسمائے ذی روح ۔ مکھی، بھڑ اور بھونرے کی بھن بھن بکری یا بھیڑ کی میں میں یا ممیانا۔ بلی کی خور خور یا میاؤں میاؤں۔ بیل یا بھینس کا ڈکرانا۔ گائے کا رانبھنا)۔ بندر کا کگیانا اور خوخیانا۔ طوطے کی ٹیں ٹیں۔ کوے کی کائیں کائیں۔ کوئل کا کوکنا۔ پپیہے کی پی کہاں یا پی پی ہاتھی یا دیو کا چنگھاڑنا[1]۔ سور کا جھنکارنا۔ شیر کا دہاڑنا یا ڈکارنا گرجنا اور غرانا۔ گدھے کا ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا۔ مرغ کا ککڑوں کوں کرنا، بھنبھیری کی بھیں بھیں۔ مچھر کی بیں بیں۔ اونٹ کا بلبلانا۔ مکھی کا بھنبھنانا۔ کتے کی بھوں بھوں بکرے کا مستی میں بلبلانا۔ کبوتر کی غٹر غوں۔ چڑیوں کی چوں چوں۔ مریض کا کراہنا۔ جھینگر کا جھیں جھیں کرنا۔ بلبل کا چہکنا۔ شاما کا للکارنا۔ قمری کا ٹیہو ٹیہو کرنا۔ بطخ کا قیں قیں کرنا۔ کتے کا لپ لپ کھانا۔ جانور کا سڑ سڑ پانی پینا۔ گھوڑے یا گدھے کو ٹخ ٹخ چلانا۔

اسمائے غیر ذی روح ۔ پاؤں کا کیچڑ میں گچ سے جمنا۔ تلوار کا گوشت میں کھچ سے گھسنا۔ تل تل کا بھل بھل بہنا۔ تلوار کے کھچا کھچ وار پڑنا۔ دھم سے کودنا۔ گد سے دے مارنا۔ پیروں کی چاپ، گھوڑے کی ٹاپ۔ قدم مارنے کی دھمک۔ جھانجھ کی جھنجھناہٹ۔ کرم کرم چنے کھانا۔ کھسر پھسر بات کرنا۔ کچے پھلوں کا کچر کچر کھانا۔ پتوں کا مرمر کرنا۔ کھڑاؤں یا زنجیر کی کھڑ کھڑاہٹ۔ کپڑے یا ہوا کی سرسراہٹ بجلی کی گھڑ گھڑ۔ ہوائی جہاز کی گھر گھر۔ سرہٹ کی روں روں۔ چھوٹے بچے کا اوں اوں رونا۔ غپ سے پانی میں ڈوبنا۔ غٹ غٹ پانی پینا۔ ہی ہی ہنسنا۔ تھئی تھئی ناچنا۔ پانی میں چھپ چھپ چلنا۔ ہوا کی سائیں سائیں۔ چھم چھم مینہ برسنا۔ نقارے کی دوں دوں۔ توپ

یا پرنالوں کی دھائیں دھائیں۔ چرخے کی چرخ چوں۔ گھنٹے کی ٹن ٹن انجن کی چھک چھک آواز۔ لیزم کی جھنجھناہٹ۔ موٹر کی بھوں بھوں باجے کی ڈھوں ڈھوں پوں پوں۔ موٹے آدمی کا بھد بھد چلنا۔ پانی کا ٹپ ٹپ کرنا۔ گاڑی کی گھڑ گھڑاہٹ۔ رعد کی گڑگڑاہٹ چٹ چٹ بلائیں لینا۔ چوڑیوں کا چٹ چٹ ٹوٹنا۔ کھچڑی پکنے کی کھد کھد اور کھد بد آواز۔ گولی یا تیر یا ہوا کی سنسناہٹ۔ تلوار۔ کٹورا برتن۔ تاروں اور دویوں کی جھنکار۔ پتوں کا کھڑکنا۔ زنجیر کا کھڑکھڑانا یا کھڑکنا۔ دیگوں کا کھنکنا۔ دروازے کا پھٹکا ۔ پروں کا پھڑپھڑانا بچے یا جانور کو چمکارنا۔ بیل یا گائے کو ٹھکارنا۔ ٹھکارنا۔ (برا بھلا کہنا) لشکارنا (کتے کو برانگیختہ کرنا) اور پھنکارنا یعنی سانپ کا پھوں پھوں کرنا۔

اردو قواعد نگاروں نے علم صوت پر سیر حاصل بحث نہیں کی صرف ایک آدھ مثال دینے پر اکتفا کی ہے۔ قواعد نگاروں میں سب سے پہلے مولوی امام بخش صہبائی نے اس کی چند علمی مثالیں دی ہیں مثلاً فاختہ کی بولی کے بارے میں کوتوں تھی پیسوں تھی" لکھا ہے لعل کی بولی صمٌ بکمٌ عمیٌ مالایرجعون بتایا ہے۔ چیل کی بولی کو کسطی اعجلی سے منسوب کیا ہے۔ اور تیتر کی بولی کو سبحان تیری قدرت بتایا ہے ممکن ہے کہ صہبائی نے یہ خیالات دیوان نظیر اکبرآبادی سے اخذ کئے ہوں۔ چنانچہ نظیر نے مندرجہ ذیل اشعار میں جانوروں کی آوازوں کو اس طرح باندھا ہے ؎

مرغے بولے ککڑوں ککڑوں اور مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یاد میں اس کی بھیتوں بھیتوں کرتی ہیں
قمری بولے حق سرہٗ اور بلبل بولے بسم اللہ
کبک تیتری چاروں قل اور تیتر بھی سبحان اللہ
ڈھینیز مور پپیہے کوئل کوک رہے اللہ اللہ
فاختہ کوکو تیہو تیہو طوطے بولیں حق اللہ
لال پڑھے صمٌ بکمٌ جب پہنے پوشاک سوئی
پدڑی پدتی پودنی جونری بولیں بس ہے تو ہی
چیل کسطی اعجلی کہے ہے چلل چلل مت جان میاں
کوے قاں قاں کرتے ہیں الآن کما ھو کان میاں

الغرض نظیر نے کئی جگہ ہر جانور کی بولی کے لئے آیات قرآنی سے کام لیا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے یہ معلومات قرآن کی تفسیروں سے حاصل کی ہوں۔

---

[1] دیو کے ساتھ چنگھاڑنے کا استعمال گل بکاولی میں نظر سے گزرا ہے۔

مندرجہ بالا بولیوں کے علاوہ نظیر نے ٹھن ٹھن بجنا۔ چیں بیں بجنا ہو حق یا ہو ہا کرنا۔ چھپاک سے چل دینا۔ طبلوں کا کھڑ کھڑانا۔ ترسنگے کا بھول بھوں بجنا۔ پازیب کا جھنک جھنک بجنا۔ نقارے کا دھوں دھوں بجنا۔ گھنگرو کا چھنا چھن کرنا۔ گھڑوں کا دھڑادھڑ گرنا وغیرہ الفاظ بھی باندھے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے صحیح المذاق ہونے کا پتہ چلتا ہے فسانہ عجائب میں رجب علی بیگ سرور نے بھی صوتی الفاظ کا کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہے۔

(۱) ان کے بیٹھتے ہی گانا ناچ شروع ہوا۔ سارنگی کے سُروں کی زوں زوں۔ طبلے کی تھاپ۔ بائیں کی گمک۔ خفتگانِ خاک کے ہوش کھو رہی تھی۔

(۲) فاختہ کی کوکو۔ قمری کی حق سرّہ اور کوکلا کے دم سے سناٹے کا عالم تھا۔

(۳) نقیب اور چوبداروں کا کویل کی طرح کوکنا۔ نوبت کی ٹکور جھانجھ کا شور۔ جھٹپٹا وقت۔ نور کا تڑکا۔ ترکیتوں کا سومیل کا لڑکا۔ کچھ کچھ تاروں کی چمک۔ نقاروں کی دوں دوں اور ڈھولنے کی گمک سے شورِ قیامت برپا تھا۔

اُردو شعرا میں سودا۔ نظیر اور آتشؔ نے اور نثر نگاروں میں مولوی نذیر احمد۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ علامہ راشد الخیری۔ ناصر نذیر فراق۔ مولوی سید احمد دہلوی اور مؤلف بزمِ آخر نے صوتی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ اہلِ لکھنؤ میں سے سرشار اور منشی سجاد حسین کو بھی صوتی الفاظ کے استعمال میں مہارت کامل حاصل تھی۔ ذیل میں الفاظ الصوت کی چند ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جو مستند انشا پردازوں کی کتابوں یا تحریروں سے اخذ کی گئی ہیں۔

بولنے کے لئے پٹر پٹر بولنا۔ چٹاخ پٹاخ بولنا۔ جھٹر پٹر بولنا۔ اور تڑاق پڑاق بولنا رائج ہے جیسے:۔

نہ کیجئے ہم سے بہت گفتگو تڑاق پڑاق
وگرنہ ہووے گی پھر دیدو تڑاق پڑاق (ظفر)

(۱) حضرت میکائیل کے دربار میں چڑے کا اس طرح بے باکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرینِ دربار اس قدر خوش ہوئے کہ ہر شخص اُسے کھائے کو دوڑتا۔ (توبۃ النصوح)

(۲) خانم کی زبان کیسی چٹاخ پٹاخ چلتی ہے۔ (مولانا اشہری)

(۳) چچا جان کی دلہن تمہارے سامنے وہ پٹر پٹر بولتی ہے کہ بچوں کے کان کترتی ہے۔ (راشد الخیری)

سائیں سائیں ہوا کے زور سے چلنے کے لئے مستعمل ہے اور کبھی رات کے سکوت اور خوف کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے ؎

(۱) رُت ہے برکھا کی ساون کی راتیں
چل رہی ہے ہوا سائیں سائیں! (نظم طباطبائی)

(۲) خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی
اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی (آزاد)

(۳) اب مقبرہ کیا سائیں سائیں کرتا ہے کہ دیکھنے سے جی گھبراتا ہے۔ (بزمِ آخر)

(۴) رات کے سناٹے میں سٹیشن پڑا سائیں سائیں کرتا ہے (فضل حق قریشی)

بھائیں بھائیں کرنا۔ تنہائی کی وجہ سے مکان کا خالی خالی اور وحشت انگیز نظر آنا جیسے ؎

(۱) ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں نے صبح کی خاموشی کو توڑا۔ شہر پڑا بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ (شرر)

(۲) گھر میں کوئی نہ رہنے کی وجہ سے مکان بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ (لغات النخواتین۔ اشہری)

(۳) بھائی کیا کہوں، گویا ویرانے میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دیوان خانہ خالی پڑا بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ (اردوئے معلیٰ غالب)

اہل لکھنؤ دل یا من کا بھائیں بھائیں کرنا بھی کہتے ہیں جیسے

سب کی مَتیں پلٹ گئیں سنکی سندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اداس اداس کرتا ہے من بھی بھائیں بھائیں کر (آرزو)

چھم چھم مینہ برسنا یا چھما چھم برسنا زور سے بارش ہونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور رم جھم برسنا پھوار پڑنے یا مینہ کے پھوئیوں پھوئیوں برسنے کے لئے مستعمل ہے جیسے ؎

(۱) چھما چھم مینہ کی بوندیں پڑ رہی ہیں
کہ ساون کی پری کچھ گا رہی ہے (اختر شیرانی)

(۲) آسماں سے ہو چھما چھم بارش نور و ضیا
نور کا دریا رواں ہے یا زمیں پر چاندنی (اوج گیاوی)

(۳) وہ جھوم جھوم کر بادلوں کا آنا۔ بجلی کا کوندنا۔ مینہ کا چھما چھم برسنا۔ ہوا کی سائیں سائیں۔ کوئل کی کوک۔ پپیہے کی پی کہاں۔ بلبل کی چہکار اور شیاما کی للکار عجیب بہار دکھا رہی تھی۔ (پھول مالوں کی سیر)

(۴) رات کے جب سناٹے میں رم جھم رم جھم مینہ برسے
من تنہائی سے گھبرائے تم سے ملنے جی ترسے

(علی احمد بی۔ اے)

(۵) وہ مزے وصل کے وہ مینہ کا برسنا رم جھم
اُف ری برسات کی رُت ہائے ری برسات کی رات (ریاض خیرآبادی)

چھوا چھو کرنا۔ دھوبی یا دھوبن کا دھوتے وقت مُنہ سے چھو چھو آواز نکالنا جیسے ؎

(۱) دیکھو مجھ کو ہے ایسا منتر یاد چھوا چھو کا
کپڑے لیکر جاتی ہوں چٹکے سے دھولاتی ہوں
(تعلیم و تربیت لاہور دھوبن کی نظم)

(۲) میں کلپتی ہوں تری جان کو اب آٹھ پہر
تو چھوا چھو کیا کرتا ہے پڑا دھوبن سے (خان صاحب)

کڑک اور کڑکا۔ رعد کی کڑک یا کڑکا یا بندوقوں کی کڑک کہنا صحیح ہے۔ جیسے:۔

(۱) بندوقوں کی کڑک اور ڈنکے کی آواز سے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ (دربار اکبری)

(۲) ع صدائے خندۂ گل ہے سواری کا تری کڑکا (آتش)

(۳) وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی (حالی)

(۴) کڑکیتوں کا کڑکا اور نقیبوں کی نہیب سن کر لوگ گھبرا اُٹھے۔ (فسانہ عجائب)

دھم سے کودنا۔ زور کے ساتھ اوپر سے نیچے کودنے کے لئے مستعمل ہے۔ جیسے ؎

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا
جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا (انشا)

شاید اہل لکھنؤ چھم سے کودنا کہتے ہیں جیسے:۔

"مارے شرم کے نواب صاحب چھم سے دریا میں کود پڑے" (نظم طباطبائی)

دھما دھم کودنا بھی بلحاظ محاورہ صحیح ہے جیسے:۔

کوئی بھرتے میں دھما دھم کود رہی ہے۔ کوئی ڈولن اور سیڑھیوں پر ملک ملک پھرتی ہے۔ (پھول والوں کی سیر)

تڑاقا۔ یعنی بندوق کی آواز یا تھپڑ کی آواز جیسے:۔

"بندوقوں کا ایک تڑاقا ہیبت ناک آواز کے ساتھ پہاڑوں میں گونج گیا۔ (عظیم بیگ چغتائی) محاورے میں بھوک کا تڑاقا یا دھوپ کا تڑاقا کہنا صحیح ہے۔

تڑاق سے گرنا۔ زور سے گرنا۔ تڑ سے گرنا جیسے:۔

(۱) اس نے اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ حملہ آور چکرا کر تڑاق سے زمین پر گرا۔ (سید امتیاز علی تاج)

(۲) ایک ٹھلیا میں پانی اور ایک اشرفی ڈال کر بادشاہ کے سر پر سے پھینکدی۔ ٹھلیا تڑاق سے ٹوٹ گئی۔ (بزم آخر)

تڑ تڑ بھاگنا۔ یا تڑ تڑا کر بھاگنا۔ یعنی گھوڑے کا زور سے ٹاپیں بجاتے ہوئے کسی سخت چیز پر سے گزرنا جیسے:۔

(۱) آواز کے سنتے ہی درخت کے نیچے سے گھوڑے تڑ تڑ کرتے پختہ سڑک پر آئے۔ (عظیم بیگ چغتائی)

(۲) بجلی کی طرح گھوڑا تڑ تڑا کر بھاگا۔ اور زقند مار کر نکل گیا (نامعلوم)

غڑاپ سے۔ ایکدم بیٹھنا۔ داخل ہونا۔ یا پانی میں ڈوب جانے کے لئے مستعمل ہے جیسے ؎

(۱) وہ مارے شرم کے کپڑوں سے خاک جھاڑتے ہوئے غڑاپ سے داخل دولتخانہ ہوگئے۔ (منشی سجاد حسین)

(۲) وہ پھلانگ لگا کر غڑاپ سے زین پر بیٹھ گیا۔ (عظیم بیگ چغتائی)

(۳) لڑکی نے آبخورہ غڑاپ سے مٹکے میں ڈالدیا۔ (راشد الخیری)

دھمک۔ کڑک۔ دھماکا۔ ضرب یا زور کی آواز جیسے:۔

(۱) وہ بندوق کی آواز کی دھمک سے چونک پڑا۔ (محمد امین شرقپوری)

(۲) جب کوئی سوار خربوزے کی فالیز کے قریب سے گھوڑا دوڑائے گزرتا ہے تو کسان کہتا ہے برائے خدا گھوڑا نہ دوڑا کہ اس کی دھمک سے خربوزے پھٹ جائیں گے۔ (محمد حسین آزاد)

ہنسنے کے لئے ہی ہی ہنسنا یا خل خل ہنسنا کہتے ہیں۔ جیسے:۔

(۱) قاضی جی نے ہی ہی کر کے دانت نکال دیئے۔ (دکن کا قاضی)

(۲) مگر وہ بھی اس بلا کی لڑکی ہے کہ بیٹھی خل خل ہنستی رہے اور ٹس سے مس نہ ہو۔ (راشد الخیری)

دھائیں دھائیں۔ تنہا یا تکرار کے ساتھ یہ لفظ زور سے بارش ہونے۔ گھروں کے گرنے یا توپوں کی آواز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے:۔

(۱) وہ ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی۔ دھائیں۔ اور عید کی تیاری ہونے لگی۔ (بزم آخر)

(۲) آج یہ دھائیں دھائیں توپیں کیسی چلیں۔ شاید بادشاہ سلامت عیدگاہ جانے کے لئے سوار ہوئے۔ (بزم آخر)

(۳) بادل گھور گرج کر برستا ہے اور ندی نالے دھائیں دھائیں کرتے ہیں۔ (کوثر چاندپوری)

(۴) مینہ کا یہ حال کہ دو گھنٹے جم کر پڑا۔ ذرا ہلکا ہوا ہی تھا کہ پھر

پھر دھائیں دھائیں گرنے لگا۔ (راشد الخیری)

اڑا اڑا دھم یا اڑا اڑا دھوں ۔ اس لفظ کا استعمال مکان یا آدمی کے گرنے کے لئے کیا جاتا ہے ۔ کبھی توپ کی آواز کے لئے بھی کام میں لایا جاتا ہے ۔ جیسے :۔

(۱) صاحب کا مرکز ثقل قائم نہ رہ سکا وہ سائیکل پر سے اڑا اڑا دھم کرکے آ گرے ۔ (کوثر چاند پوری)

(۲) غدر کے ایام میں کچھ دیر سناٹا رہتا اور پھر پھٹ پھٹ اڑا اڑا دھوں کی آواز شروع ہو جاتی ۔ (نذیر احمد)

دھواں دھوں ۔ بارش سے مکان گرنے کی آواز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ جیسے :۔

(۱) پانی دھونتال پڑ رہا تھا ۔ موسلا دھار بارش سے سنگین مکان ہل گئے ۔ ہر طرف سے دھواں دھوں کی آواز آ رہی تھی ۔ (راشد الخیری)

چڑ چڑانا ۔ ہوا یا طوفان کی وجہ سے چوبی اشیا کا چڑ چڑ آواز کرنا ۔ جیسے :۔

(۱) ایک موج اٹھی اور زور کا غراٹا سنائی دیا ۔ پانی کے جھکولے سے جہاز چڑ چڑانے لگا ۔ (عظیم بیگ چغتائی)

بلوں بلوں کرنا ۔ مارے بھوک کے بیتاب ہونا جیسے ۔

(۱) پھلر داسے لال، مینا سی بچیاں مارے بھوک کے بلوں بلوں کر رہی تھیں ۔ (راشد الخیری)

زناٹا ۔ زور کی آواز ۔ دندناتے ہوئے جانے کی آواز جیسے :۔

(۱) اتنے میں گاڑی گونجتی ۔ اڑتی اور سنسناتی ہوئی آئی ۔ اور اس کی رفتار کا زناٹا میرے لئے سناٹے کا عالم پیدا کر رہا تھا ۔ (عظیم بیگ)

چپڑ چپڑ کھانا ۔ کھاتے وقت منہ بجانا یا بکواس کرنے کے معنوں میں آتا ہے ۔ جیسے :۔

(۱) چپڑ چپڑ کھانا اپنے سرے کی بدتمیزی ہے ۔ (مرآۃ العروس)

(۲) میں نے تمھیں بارہا جتایا لیکن تمھاری درمیان میں چپڑ چپڑ بولنے کی عادت نہیں جاتی ۔ (عظیم بیگ چغتائی)

مولوی نذیر احمد نے جوتیوں اور شکیزے کی آواز کو بھی چپڑ چپڑ آواز کرنا لکھا ہے ۔ مثلاً ولایتی کی پیٹھ پر ہنیگ کا شکیزہ تھا ۔ ادھر جوتیوں سے اور ادھر شکیزے سے چپڑ چپڑ کی آواز چلی آتی تھی ۔ (توبۃ النصوح)

پھوں پھوں کرنا ۔ پھونکنے کی آواز جیسے :۔

(۱) گیلی لکڑیوں کی پھوں پھوں سے آنکھوں میں پانی بھر آیا (راشد الخیری)

تھپ تھپ ۔ لپ لپ ۔ جیسے :۔

(۱) عورتوں نے تھپ تھپ روٹی پکائی ۔

(۲) کتیا نے لپ لپ کرکے قلمی پیڑا کھا لیا ۔ (راشد الخیری)

کچر کچر کھانا ۔ کچے پھلوں کے کھانے کی آواز جیسے :۔

(۱) لونڈیاں باندیاں پیڑوں پر چڑھ گئیں اور کچے پھل کچر کچر کھا کر پھینکنے لگیں ۔ (بزم آخر)

علامہ راشد الخیری نے کچر کچر کے معنی بکواس کے بھی لئے ہیں، جیسے :۔ بچوں کی چیخم دھاڑ اور عورتوں کی کچر کچر اور بھی آفت ڈھا رہی تھی ۔ (صبح زندگی)

گمک ۔ طبلے ۔ بائیں یا پکھاوج کی آواز کے لئے مستعمل ہے جیسے

(۱) بائیں کی گمک ۔ زنبوروں کی کڑک ۔ طبلے کی گونج ۔ ترئی کی دھونتو اور نوبت کی جھنکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔ (پھول والوں کی سیر) امداد علی بحر نے بادلوں کی گمک بھی باندھا ہے جیسے

ع سنائی اپنی گمک بادلوں نے اے ساقی!

کھنکنا ۔ روپوں ۔ یا جام شراب کے بجنے کی آواز جیسے :۔

(۱) ساہوکاروں کے ہاں دن رات روپیہ کھنکتا رہتا ہے ۔ (ناصر نذیر فراق)

(۲) یہ جلترنگ کے نغمے یہ ساغروں کی کھنک
زمانہ تیرے لئے سازگار ہے ساقی! (ماہر القادری)

(۳) قمریاں چہکی ہیں پورب سے چلی ٹھنڈی ہوا
جام کھنکے اور مستانہ لگی آنے بہار (جوش ملیح آبادی)

کھڑکنا ۔ سوکھے پتوں کی آواز ۔ طبلہ بجنے یا دیگوں کے کھنکنانے کی آواز جیسے :۔

(۱) پتہ کھڑکا اور بندہ بھڑکا ۔ (کہاوت)

(۲) شاہی باورچی خانے گرم ہو گئے اور گھر گھر طبلہ کھڑکنے لگا ۔ (محمد حسین آزاد)

(۳) باغوں میں عجب بہار ہے ۔ کھانے پک رہے ہیں دیگیں کھڑک رہی ہیں (بزم آخر)

دیگوں کی آواز کے لئے ٹھنٹھنانا بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے رمضان کا مہینہ ہے ۔ بیسیوں لوہے کے چولہے گرم ہیں باورچی خانے میں الوان نعمت کی پتیلیاں ٹھنٹھنا رہی ہیں ۔ (بزم آخر)

تڑا تڑ یا پڑا پڑ ۔ جوتیاں مارنے یا بندوق چھوڑنے کی آواز جیسے (۱)

طمانچے بھی کئی مارے تڑا تڑ
لگائے سر پہ جوتے بھی پڑا پڑ (مثنوی سپاہی زادہ)

(۲) اٹلی میں مسولینی فوج کا معاینہ کر رہا تھا کہ اس پر کسی نے ریوالور سے تڑاتڑ گولیاں چلا دیں۔ (دین ودنیا دہلی)

گھوں گھوں:۔ لٹو پھرنے کی آواز جیسے:۔

(۱) کس زور سے چل رہا ہے لٹو
گھوں گھوں کرتا چل رہا ہے لٹو (بچوں کے گیت)

چرخ چوں:۔ چرخے یا کولھو کے چلنے کی آواز جیسے۔

(۱) کیسا اچھا چرخہ ہے رنگ رنگیلا چرخہ ہے
پریاں اس میں گاتی ہیں دیکھوں تو چھپ جاتی ہیں
چرخ چوں گھوں گھوں گھوں
چرخ چوں گھوں گھوں گھوں (حفیظ جالندھری)

ڈھوں ڈھوں پوں پوں - باجے کی آواز کو کہتے ہیں جیسے:۔
آدھے گھنٹے تک تو ڈھوں ڈھوں پوں پوں ہوتی رہی- اس کے بعد ناچ شروع ہوا - (نئی نویلی)

چھک چھک کرنا - انجن یا ریل گاڑی کا آواز کرنا جیسے۔
(۱) انجن چھک چھک کرتا ہوا ہچکولے کے ساتھ رکا - (محمد امین شرقپوری)
(۲) گاڑی پوری طاقت کے ساتھ چھک چھک کرتی چلی جاتی تھی - (ہلال کوکشی)

لخ لخ کرنا - بھوک یا فاقہ سے نڈھال ہونا جیسے:۔
قحط سالی میں جانور بھوک سے لخ لخ کرتے ہیں۔ (ناصر نذیر فراقی)

دُر دُر پھٹ پھٹ - جھگڑا فساد پھٹکار جیسے:۔
میری جان بڑے عذاب میں ہے کہ جب جب گھر میں آتا ہوں دُر دُر پھٹ پھٹ رہتی ہے - (راشد الخیری)

دغاد غاروڑے - یہ اسم مرکب آواز کی بنا پر ترتیب دیا گیا ہے ولایتی پٹھانوں کے لئے یہ نام بنایا گیا ہے جیسے:۔
دغاد غاروڑوں میں بھی کافی سے زیادہ زندہ دلی ہوتی ہے (کامیاب دہلی)

دن دن گھم گھم - توپ کی آواز کے لئے مستعمل ہے - کبھی دنادن بھی کہتے ہیں - جیسے:۔

(۱) توپوں کی آوازیں ہر دم بندوقوں کا چھٹنا کم کم
کیسا عالم ایسا عالم دن دن دن دن گھم گھم گھم گھم (نوح ناروی)

(۲) سالگرہ کے دن پادشاہ سلامت کے اعزاز کا اظہار توپوں کی دنادن سے کیا جاتا - (مولانا اشہری)

زوں - ٹوں - گمک - تڑاتڑ - ٹکور - چٹاخ پٹاخ - دوں دوں یہ تمام الفاظ باجوں کی آوازوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں مندرجہ ذیل جملے سے ہر ایک لفظ کا تعلق ظاہر ہے۔

بے تال سارنگی کی زوں ٹوں - طبلے کی گمک - مجیرے کی تال تالیوں کی چٹاخ پٹاخ - نوبت کی ٹکور - نقارے کی دوں اور تاشے کی تڑاتڑ سے شہر گونج اٹھا - (میٹھی چھری)

گھمر گھمر کرنا - چکی کی آواز کے لئے مستعمل ہے جیسے -
(۱) اندھیری رات کے سناٹے میں ندی چٹانوں اور سنگریزوں سے ٹکراتی ہوئی آواز پیدا کرتی تھی گویا چکیاں گھمر گھمر کرتی ہوں- (پریم چند)
(۲) کہتے ہیں کہ بیان و یزدانی بڑے نازک مزاج تھے کہتے تھے کہ چکی کی گھمر گھمر اور گھوڑے کی ٹاپ کی آواز میرے دماغ میں چوٹ لگاتی ہے - (رسالہ العصر لکھنؤ)

گھومر گھومر - دودھ بلونے کی آواز جیسے:۔
گھومر گھومر دودھ بلوئے
جاٹنی کا چھورا بیٹھا روئے (ہاجرہ بیگم)

ڈھلم ڈھیل - مجیرا بجنے کی آواز جیسے:۔
ڈھلم ڈھیل مجیرا باجے
ہاتھی چھوڑ کمک کو بھاگے (ہاجرہ بیگم)

بھق بھق - دھواں نکلنے کے لئے مستعمل ہے جیسے:۔
"وہ دیا سلائی جلا کے - منہ سے انجن کی طرح بھق بھق دھواں نکالے مارا مارا پھرتا ہے - (مولوی نذیر احمد)

گھما گھم - رتھ کی آواز جیسے:۔
بیگم صاحبہ رتھ میں سوار ہو کر گھم گھم کرتی چلی جاتی تھیں (ملونا اشہری)
گھما گھم - ڈولیوں میں سے سواریاں اترنے کی آواز - ڈولیوں میں سے گھما گھم سواریاں اتر رہی تھیں - مکان اور دالان میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی - (راشد الخیری)

چھد چھد کرنا - اکے یا چھکڑے کی چلنے کی آواز جیسے:۔
اکا چھد چھد کرتا ہوا چل پڑا - ٹاپ کھٹ سے قاضی کے سر میں لگا - (کن کٹا قاضی)

تھئی تھئی - ناچنے کی آواز - جیسے:۔
رات کو طبلے پر تھاپ پڑتی ہے اور تھئی تھئی ناچ ہوتا ہے - (بزم آخر)

تیں تیں - بطخ - سارس یا سورنی کی آواز جیسے:۔

راجہ چڑیوں کی چوں چوں اور بطخوں کی قیں قیں سے اُس کا ناک میں
دم تھا۔ (بچوں کی کتاب بچاب)
(۲) سارس قیں قیں کرتا ہے تو سارا جنگل جاگ اُٹھتا ہے۔ (ناصر
نذیر فراق)
(۳) اس نے ایک لٹھ سورنی کی کمر پر ٹکایا۔ اور وہ قیں قیں کرتی
بھاگی۔ (فضل حق قریشی)

کھوں کھوں۔ کھانسنے کی آواز جیسے
(۱) مٹر دکو کھانسی اٹھی وہ کھوں کھوں کرنے لگا۔ (محمد امین شرقپوری)
کھڑی کھانسی تیرے گلے میں پھانسی۔ ایک کلمہ ہے جو کھانستے
ہوئے بچے کے سامنے عورتیں کہا کرتی ہیں۔ (فرہنگ آصفیہ جلد سوم)

جم جم۔ عورتوں میں بطور دعا استعمال کیا جاتا ہے۔ آدمیوں
کو جم جم کہنا غلط ہے۔ جیسے
بیٹی جم جم جیو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو (راشد الخیری)

ٹھائیں ٹھائیں۔ جھگڑا۔ لڑائی فساد جیسے :۔
ارے بھئی لعنت بھیجو اس مردود پر۔ کون مفت خدا کی
ٹھائیں ٹھائیں اپنے سر لے۔ (منشی سجاد حسین)

پی پی۔ کوئل یا سیٹی کی آواز جیسے :۔
دیکھو یہ اصلی سیٹی ہے
کیسی پی پی بجتی ہے! (تاج گیت)

ڈبک ڈبک یا ڈبکوں ڈبکوں۔ پانی بھرتے یا پانی میں تیرنے کی
آواز۔ جیسے :۔
اس نے لوٹے سے رسی باندھی اور ڈبکوں ڈبکوں پانی نکالنا
شروع کیا۔ (میاں کوشش)

سڑ سڑ یا سڑا سڑ۔ کوڑے یا دُم پھٹکارنے کی آواز جیسے
(۱) کوتوال نے کوڑا سنبھالا اور قیدیوں کے سڑ سڑ لگانے
لگا۔ (کوثر چاندپوری)
(۲) بھینسیں مکھیوں کے مارے سڑا سڑ دُم ہلاتی ہیں (محمد اسمٰعیل)

جھپاک جھپاک۔ جلد جلد یا تیزی سے جیسے۔
(۱) لڑکی نے جھپاک جھپاک گلگلوں کا آٹا گوندھا۔ (مولوی نذیر احمد)

اڑا اڑا کر گرنا۔ مکان کے ایکدم آواز کرکے گرنے کو کہتے ہیں جیسے
(۱) پانی دھوتا ل گرا تھا۔ اوپر سے آیا ہوا کا جھکڑ۔ ساتھ ہی
علاقائی اڑا اڑا کر نیچے آ رہا۔ (صبح زندگی)
(۲) میں جو رونے کو تم ہجر میں کل بیٹھ گیا
اڑا اڑا کر وہیں گردوں کا محل بیٹھ گیا (تاسخ)

ہریا ہریا کرنا۔ پرندوں کو اُڑانے کی آواز جیسے :۔
ہریا ہریا ہریا کرکے
غلہ مارا چینک کے تڑسے (محمد اسمٰعیل)

چھائیں پھوئیں۔ یہ کلمات مستورات رفع بدشگونی کے لئے
زبان سے نکالتی ہیں جیسے :۔
تھو تھو چھائیں پھوئیں۔ خدا ایسے کی پرچھائیں سے بچائے۔ (بزم آخر)

غائیں بائیں کرنا۔ گنگ یا وحشیوں کی طرح باتیں کرنا۔ جس
کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے جیسے۔
جب اکبر نے گنگ محل کے بچوں کو نکالا تو وہ جانوروں کی طرح
غائیں بائیں کرنے لگے۔ (محمد حسین آزاد)

آئیں بائیں شائیں کرنا۔ رُک رُک کر باتیں کرنا۔ رفع اعتراض
کے لئے بولنے کی ہمت نہ ہونا۔ جیسے :۔
مہا بھائی اخبارات میں مسٹر جناح کے خلاف زہر اُگلا جاتا ہے
لیکن جب انہیں آمنے سامنے ہاتھوں لیا جاتا ہے تو آئیں بائیں شائیں کرنے
لگتے ہیں۔ (الامان دہلی)

اوں اوں اور سی سی کہنا جیسے :۔
بیمار آدمی اوں اوں کرتا ہے اور منہ میں مرچیں لگ جائیں تو
سی سی کرتا ہے۔ یہ حرکتیں دلالت طبیعیہ کہلاتی ہیں (تسہیل البلاغت)

کھِن کھِن کرنا۔ بچہ کا بیماری کی وجہ سے رونا۔ جیسے :۔
بچہ ذرا کھن کھن کرنے لگا کہ اسے گھُٹی گھُٹی دیدی (سید احمد دہلوی)

ٹھوں شاں۔ شان۔ دبدبہ۔ عزت جیسے :۔
آمنہ کی ٹھوں شاں اور ناز برداری صرف میکے ہی تک تھی۔
(راشد الخیری)

چھچھکا۔ نخرہ نخترہ یا پرہیزگاری کا اثر جیسے :۔
کیوں نہ ہو تم ایسی ہی تو چھتی چھتیا ہو اور ایسا ہی تمہارا
چھوچھکا ہے۔ (بزم آخر)

چھنن منن۔ مچھلیاں تلنے کی آواز جیسے :۔
پری نے کڑاہی چڑھائی چھنن منن مچھلیاں تلیں (بھوک کی کہانیاں)

گھُخر گھُخر۔ یہ لفظ کام کی سستی یا آہستگی کے لئے استعمال کیا
جاتا ہے جیسے :۔
اس قسم کے مرد اور مردوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو ایک ہی ٹھنک
سے گھُخر گھُخر کرتے زندگی کی گاڑی کو دھکیلتے رہتے ہیں (زبیدہ سلطان بی اے)

دھل دھل - پانی بہنے کی آواز کے لئے مستعمل ہے جیسے۔
ایک تیر ابن سعد کا مشکیزے پر آ لگا اور پانی دھل دھل بہنے لگا۔ (معرکہ کربلا)

سوں سوں کرنا۔ زکام کی وجہ سے بار بار سانس اوپر کھینچنا کہ ناک کا پانی گرنے نہ پائے۔ جیسے:۔
(۱) جاڑے کا موسم ہونے کی وجہ سے کوچوان بیٹھا سوں سوں کر رہا تھا۔ (راشد الخیری)
(۲) کہیں سوں سوں ہے کہیں سی سی ہے۔ کہیں سیٹی ہے۔ گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے۔ (محمد حسین آزاد)

ہواہوں۔ بچے کے رونے کی آواز کے لئے مستعمل ہے جیسے:۔
جب بچہ ہواہوں رونے لگا تو بادشاہ نے کہا یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ (ناصر نذیر فراق)

دھڑ دھڑ: کسی چیز کے جلنے کی آواز۔ یا کسی کام کے اشتداد کے لئے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے:۔
(۱) مندر کے بیچوں بیچ ایک جڑاؤ زنجیر لٹکتی تھی۔ اس میں ایک سونے کا چراغ دن رات دھڑ دھڑ جلتا تھا۔ (محمد حسین آزاد)
(۲) وہ اپنے خویشوں کو کھلے خزانے دھڑ دھڑ کوستی ہے (راشد الخیری)

دھڑا دھڑ:۔ یہ لفظ کئی معنوں میں عام طور پر مستعمل جیسے:۔
(۱) برسات سے مکانوں کا دھڑا دھڑ گرنا۔
(۲) دھڑا دھڑ چندہ دینا۔
(۳) کسی نایاب چیز پر دھڑا دھڑ گرنا۔
(۴) پرنالوں کا دھڑا دھڑ چلنا وغیرہ

سٹر سٹر - جوتیوں کی آواز جیسے:۔ بڑی بڑی سٹر سٹر کرتی آئیں اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ (راشد الخیری)

بھوںبھوں رونا = جیسے کوئی گدے سے نیچے گر پڑی۔ کسی کے کانٹا کسی کے کنکر چبھ گئی۔ بھوںبھوں بیٹھی رو رہی ہے۔ (بزم آخر)

جوتیاں چٹخانا جیسے۔ کلیم چلا جوتیاں چٹخاتا مگر اس تصور میں مست کہ فیل کوہ پیکر مع ہودج اس کی سواری کے لئے تیار ہے۔ ـــ " (مولوی نذیر احمد)

شوں شوں۔ پچکاری کی آواز جیسے ہولی میں ہندو بیگمات کے ساتھ دیگر بیگمات بھی حصہ لیتیں۔ زعفرانی رنگ گھولا جاتا۔ اور پچکاریوں کے شوں شوں شرانے نبدھ جاتے۔ (بزم آخر)

بعض اوقات چند کلمات جیسے یا غفور یا الا اللہ کہہ کر کام شروع کرتے ہیں۔ اس میں بھی علم صوت کی معجز نمائی کارفرما ہوتی ہے۔ جیسے۔

(۱) جب جام سرخ ہاتھ کسی چلے سے آ گیا
زاہد نے یا غفور کہا اور چڑھا گیا (فرحت)

(۲) اس نے الا اللہ کہہ کر چور کے اس زور سے لاٹھی ماری کہ وہ کھڑے سے گر گیا۔ (ناصر نذیر فراق)
(۳) چھوٹے بھائی نے چلّے سے تیر جوڑا اور اندھیرے میں چلا دیا (چہار درویش)
(۴) باقیماندہ سوئیوں کا نکلنا تھا کہ سحر زدہ آدمی الا اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھا۔ (سید امتیاز علی تاج)

حروف ندا اور حروف تعجب میں بھی علم صوت کی جلوہ گری پائی جاتی ہے جیسے ؎

صبر آزما وہ اس کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ اس کا اشارہ کہ ہائے ہائے (غالب)

اسی قبیل کے بیسوں عربی الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہیں جنہیں علم صوت کی سحر طرازی نے موزوں بنا دیا ہے جیسے۔

(صل علی سبحان اللہ) ؎ یہ کہے صل علی وہ کہے سبحان اللہ!
دیکھیں چہرہ پہ جو تیرے مہ و اختر سہر (ذوق)

(معاذ اللہ) ؎ تمہارا شکوہ اور میری زباں سے
معاذ اللہ کتنے بدگماں ہو؟ (میر مہدی مجروح)

(العظمۃ للہ) ؎ پھولوں کی وہ کثرت ہے کہ العظمۃ للہ
بستر میں ہے نسریں کہیں نسریں پہ ہے بستر (سجاد دہلوی)

(الحذر الاماں) ؎ لرزی زمیں کانپ اٹھا دہشت سے آسماں
شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں (انیس)

ذیل میں چند ایسے اشعار درج ہیں جن میں الفاظ الصوت کا نہایت خوبی سے استعمال کیا گیا ہے ؎ (امان علی سحر)

(۱) مینہ برستا ہے چھاچھم کبھی کھل جاتا ہے کبھی گھر آتی ہے بجلی کبھی پڑتی ہے پھوار
کوئلیں کوکتی ہیں بول رہے ہیں طاؤس جاتا ہے قمریوں کا شور فلک پر ہر بار
کبھی بیساختہ کرتا ہے پپیہا پی پی - چہچہے اپنے سناتی ہے کبھی بلبل زار

(۲) چکر اکے اک دم بیٹھ جا۔ چھم چھم چھاچھم بیٹھ جا
چھن چھن چھنا چھن رقص کر - مرمری ناگن رقص کر
چھاگل کے چھاچھا چھنک طبلہ کہے چن دن دن دھمک (یوسف ظفر)

(۳) کھڑک رہا تھا طبلہ تھے مردنگ دھکتے دھنا دھن
ٹھنک مجیروں کی یا ہر سے سن پڑتی تن تنک تن (احمد ندیم قاسمی)

جب سب طرف سے مایوسی ہو جائے

اور

تمام کوششیں بیکار ہو جائیں

تو مندرجہ ذیل نقش و تعویذ سے کام لیجئے یہ میرا وہ سرمایہ ہے جس کے حاصل کرنے میں میں نے ہزاروں روپیہ صرف کر دیا تھا اور برسوں محنت کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد راز ہائے سربستہ کو چھپا کر رکھنا فرض سمجھتا تھا مگر ضرورت مندوں نے مجھ کو مجبور کیا کہ کیوں نہ خلق خدا کو اس گوہر گرانمایہ اور کلام الٰہی کی برکت سے مالا مال کیا جائے اسلئے میں بصد خلوص آپکی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور خدا کو حاضر ناظر جانکر عرض کئے دیتا ہوں کہ مندرجہ ذیل نقش و تعویذ میں کبھی ناکامی نہ ہوگی میں چند پیسوں کی خاطر اپنے ایمان کو فروخت نہیں کروں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے ایماندارانہ قول کو سچا سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کامیابی کے بعد فقیر کے لئے دعائے خیر کریں گے نقش و تعویذ حسب ذیل ہیں جن کا ہدیہ بہت ہی قلیل ہے اور یہ تمام لفافہ کے اندر بذریعہ وی پی رجسٹری کر کے روانہ کئے جاتے ہیں۔ ہدیہ کے علاوہ رجسٹری لفافہ کا خرچ ۸؍ اور ہوتا ہے

نقش بشارت — یہ نقش ہر کام کی کامیابی اور ناکامی کی بشارت دیتا ہے رات کو اپنے سرہانے رکھکر سو جاؤ اور کام کا تصور دل میں کر کے سو جائیں تو بشارت ہو جائیگی بیاہ شادی مریض کی بیماری تجارت میں کامیابی ناکامی غرضیکہ اسکا موکل خواب میں جواب دیتا ہے ہدیہ

تعویذ دولت — مفلسی میں خدا ہی یاد آتا ہے خدا کسی کو مفلس نہ کرے۔ مفلسی دور ہونیکی جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئے یا روپیہ کی ترقی رک جائے تو اس متبرک تعویذ کی مدد سے آپ کی مفلسی دور ہو گی روپے پیسے میں ترقی ہو کر دولت کی زیادتی ہو گی اور تعجب انگیز طریقہ سے آمدنی کے ذرائع پیدا ہوں گے بس خدا کی قدرت نظر آنے لگی۔ ہدیہ ایک روپیہ چار آنے

محبت کی ڈوری — میرے بزرگ نے صرف مجھ کو اجازت دی تھی کہ یہ ایسے ضرورتمندوں کو دیجائے جو جائز طور پر طلب کریں اسلئے اس محبت کی ڈوری کو ضرورتمندوں کیلئے پیش کر رہا ہوں کہ اگر کسی کی اپنے شوہر سے لڑائی رہتی ہو یا شوہر کی طبیعت بیوی کی طرف سے ہٹی ہوئی ہو بیوی سے ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا تا پڑتا ہو تو یہ تعویذ آپس کی محبت بڑھوانے میں محبت کی زنجیر ثابت ہوگا چند ہی دن میں سارے جھگڑے ختم ہو کر شوہر بیوی کا غلام بن جائیگا۔ یہ خدا کے کلام اور اسکے مقرب بندوں کی برکت ہے کہ جائز محبت کے وقت اس تعویذ معظم کی برقی قوت اپنا اثر دکھاتی ہے اور ضرور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ہدیہ صرف ڈھائی روپے

اقرار نامہ — ضرورتمندوں کو یہ اقرار کرنا ہوگا کہ میں اپنے سوا کسی دوسرے کو اس نقش و تعویذ کے استعمال کی ترکیب بالکل نہ بتاؤں گا اور بتا دیا تو ہر...

ملنے کا پتہ:

نواب میاں شاہ صاحب چشتی حکیم آغا جان (ع۔ل) دہلی

مطلعِ امید

آواز دے رہی ہے نئی زندگی مجھے!

ازجناب اعجاز صدیقی اکبرآبادی مدیر "شاعر"

پیغامِ زیست ہے نفسِ آخری مجھے
آواز دے رہی ہے نئی زندگی مجھے

لو شمعِ آرزو کی بڑھانی پڑی مجھے
محسوس جب خلش میں ہوئی کچھ کمی مجھے

ہو جائے گی ابھی سے گراں زندگی مجھے
محرومِ التفات نہ کر تو ابھی مجھے

الزام دے رہا ہے غمِ عاشقی مجھے
کیوں بیکسی میں یاد تری آگئی مجھے

شکوہ سرا نہ پائیگا کوئی کبھی مجھے
راس آئے یا نہ آئے غمِ زندگی مجھے

اپنی خبر ہے اب نہ خبر آپ کی مجھے
لے آئی کس مقام پہ یہ بیخودی مجھے

اے آنکھ خونفشاں ہو تجھے ان کا واسطہ
کرنا ہے سرخ مطلعِ افسردگی مجھے

سب راستے میں رہ گئے کانٹے بھی پھول بھی
یہ کس طرف ہوائے جنوں لے چلی مجھے

صرف ایک آستاں ہے مرادِ جبینِ شوق
بندہ سہی، نہیں ہوسِ بندگی مجھے

طالب ہوں زندگی میں اک ایسی نگاہ کا
کر دے جو بے نیازِ غمِ زندگی مجھے

اک عمر سے ہیں طور پہ نظریں جمی ہوئی
آواز دے بھی لے ترا جلوہ کبھی مجھے

ہے دیکھنا تمہیں بھی گنہ، ماسوا تو کیا
اپنا بنا کے دیکھ تو لو تم کبھی مجھے

صیاد چھوڑ دے میں اسیرِ بہار ہوں
موجِ ہوائے گل نہ پھرے ڈھونڈتی مجھے

یہ وقت بھی عجیب ہے رازِ و نیاز کا
وہ خود کو دیکھتے ہیں کبھی اور کبھی مجھے

اعجاز کاش مطلعِ امید پھر بنے
وہ اک نظر سکھا جو گئی شاعری مجھے

امرت کے گھونٹ

رومانی افسانہ

از جناب مرزا عنبر، بھوپال

فطرت کی مالن اس کے لئے ذہن اور میرے لئے اُٹھاؤ کلیاں چُن چکی تھی۔ نہ معلوم وہ مختلف ہار پرونا چاہتی تھی یا دو لڑیوں کا ایک ہی ہار۔ شاید میں ابھی عمر کے اس دور میں نہیں آیا ۔۔۔ جس میں ایسی احساس کا آغاز ہوتا ہے نہ ہی اپنی تربیت اور سوسائٹی سے مجھے بس مقطع میں سخن گسترانہ بات یہ آ پڑی تھی کہ مجھے ۔۔۔ افسانوں سے بھی دلچسپی تھی۔ جنہوں نے شہرت پہنچنے دے کر بہت جلد طلسم بنگ میں اسیر کر لیا۔

اس کے عمتہ کو معمے حل کرنے سے بڑی دلچسپی تھی اور کم و بیش مجھے بھی۔ وہ السٹریٹیڈ ویکلی کے مستقل خریدار تھے۔ ہمارے ان کے مابین یہی دلچسپی تقریب بہرِ ملاقات بن گئی۔

ابتدا میں وہ آتی تو سہمی سمٹائی ہوئی، بیٹھتی تو ۔۔۔ لیکن جھینپ کر۔ مگر بہت جلد اس کی جھجک جاتی رہی۔ اب وہ آتی تو بڑے زور سے سلام علیکم رسید کرتی، میں پوچھتا "آپ کے مزاج اچھے ہیں؟" تو گردن ترچھی کر کے کہتی "اللہ کا فضل!" اور اس انداز سے جیسے اس نے کوئی غلطی کی ہو، مُسکرا دیتی ۔۔۔ اس کے شانوں کو چھونے والے بالوں میں جنبشِ اعتراف پیدا ہو جاتی۔

اب وہ کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔ ایک دن واپس ہونے کے ارادے سے اُٹھا تو دامن پکڑ کر کہنے لگی "ابھی نہیں جا سکتے آپ" ۔۔۔ اس کے بال گردن اور آنکھوں نے ایک ساتھ جنبش کی۔ میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ گیا۔ لیکن جب اُٹھا، ایک یاد رہ جانے والی مسرت دل میں لے کر اُٹھا۔

عید آئی۔ میں گیا۔ نجمہ کے عمو دوستوں سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ نجمہ کی امی نے بیٹھک کا کمرہ کھلوا دیا۔ میں بیٹھ گیا اور سوچ رہا تھا نجمہ آئے تو کیا مذاق (مزاح) چھیڑوں کہ نجمہ عطر، پان لئے سامنے کھڑی ہوئی "سلام علیکم شمیم صاحب!" ۔۔۔ میں نے آج پہلی مرتبہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ نجمہ اس وقت آنکھوں کے دل میں اُتر آئی۔

دو ایک مغرب ۔۔۔ وہ باپ کی بیٹی تھی۔ اسے ابھی پردے کا کیا ضرورت تھی! میں اکثر شام کی تفریح میں اسے ساتھ لے لیا کرتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ہاتھوں کو زور سے جھکولے دیتی ہوئی اس طرح چلتی جیسے لہروں میں کنول۔ کبھی اس زور سے جھٹکا دیتی کہ شانے میں درد ہونے لگتا "شریر کہیں کی!" میں مصنوعی غصے سے ڈانٹ دیتا، اور وہ فوراً جواب میں ایک نہایت صاف تھرا قہقہہ عرض کرتی۔ ہم ندی کے کنارے جا بیٹھتے اور پائنچے چڑھائے پانی میں پاؤں لٹکائے پانی سے کھیلا کرتے۔ ہماری ڈونگی آتی، دونوں اس میں بیٹھ جاتے۔ وہ فی البدیہہ کہتی "وہ سنائیے!" میں ڈانٹنے کے انداز میں کہتا "کیا؟" وہ کہتی "وہ نہ ہی غزل (نظم) ۔۔۔ ہم تمہیں نہیں بھولیں گے" میں ڈونگی کے بہاؤ کے ساتھ گاتا ہوا چلتا ؎

...."تمہیں ہم کس لئے بھولیں گے؟ کیوں تم سے جدا ہوں گے؟
ہماری ایک کشتی ہوگی، ہم ہی ناخدا ہوں گے
بہے گی اس طرح کشتی ہماری بحرِ فانی میں
کہ جیسے ابر کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں
محبت کی جوالا دونوں دلوں میں روشنی ہوگی
نہ ہوگا چاند پھر بھی چاند جیسی چاندنی ہوگی
ہم آئینِ چمن بندی بتائیں گے بہاروں کو
ہماری زندگی پر رشک آئیگا ستاروں کو
کریں گے اس طرح آراستہ باغِ محبت کو
فرشتے دیکھنے آئیں گے اس دنیا کی جنت کو...."

وہ بڑی خوش ہوتی، جیسے سب کچھ سمجھتی ہی تو تھی۔

اس نے چوتھے اور پانچویں درجہ کا ڈبل امتحان دیا تھا اور پاس بھی ہو گئی تھی، مگر اب اسے چھٹے کا امتحان دینا تھا۔ وہ حساب اور جغرافیہ میں کافی کمزور تھی۔ نجمہ کے عمو نے مجھے ایک دن چائے پر بلایا، اور عرضِ مدعا کے لئے تمہید اس طرح اٹھائی ہے۔

"بھئی شمیم! مجھے بہت افسوس ہے کہ تم کالج جائن نہ کر سکے اگر میرے ۔۔۔ کے جھگڑے نہ لگے ہوتے تو میں ہی تمہیں کم از کم

بی۔ اے تک پڑھاتا۔۔۔ تو پھر تمہارا کیا شغل ہے اب؟"
"جی! کچھ نہیں۔۔۔ شارٹ ہینڈ، اینڈ ٹائپ سیکھ رہا ہوں۔"
"ہاں! ہاں!! تم نے ایک مرتبہ اور کہا تھا۔۔۔ اور تم ٹیوشن کیوں نہیں کرتے؟"
"خود ہی اس طرف توجہ نہ کی ورنہ۔۔۔ مگر میرے پاس وقت کہاں؟"
"نہیں میاں اس کے لئے وقت ضرور نکالو! علم تازہ رہیگا اور کچھ مل بھی جایا کریگا۔ تمہیں یہ معلوم ہی ہے کہ نجمی (نجمہ کو۔ پیار سے ہم) نے چوتھے پانچویں کا ڈبل امتحان دیا تھا۔ وہ پاس تو ہو گئی ہے، مگر چھٹے سے نکلنا ذرا مشکل ہی سا نظر آرہا ہے، تم اس کے لئے ایک آدھ گھنٹہ نکال لو تو اچھا ہے!"

خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی، مگر فوراً ہی دل سرد پڑ گیا۔ وہ مجھ سے کتنی بے تکلف ہے! اسے شاگرد بننا پڑیگا اور مجھے استاد۔ ایک لمحہ میں ہزاروں تردیدیں ذہن میں آئیں، مگر زبان سے "بہت بہتر!" ہی نکلا۔

~~~

"کیوں، کتابیں نہیں لائیں نجمی؟"
"ہم آج آپ سے چھٹی لینے آئے ہیں۔"
"کیوں! کہیں جا رہی ہو؟"
"جی نہیں! آج طبیعت ٹھیک نہیں۔"
"اچھا تو نہ پڑھو!"
"آداب!"
"ارے! تم جا نہیں سکتیں۔۔۔ اچھا تم جا سکتی ہو، مگر اس شرط پر کہ کوئی اچھا سا لطیفہ سناؤ!"
"پہلے آپ سنائیے!"
"دو آدمی ایک گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گھوڑا تیز چلا تو وہ آدمی جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا، سرکتے سرکتے بالکل گھوڑے کی دم پر آگیا، وہ لگا چیخنے۔
"ارر! ارر!! روکنا!!! روکنا!!!!"
آگے جو بیٹھا تھا، اس نے پوچھا۔
"کیوں! کیا ہے؟"
اس نے جواب دیا۔
"ارے گھوڑا ختم ہو گیا!"
وہ بڑی زور سے ہنس پڑی "گھوڑا ختم۔۔۔" مگر رک گئی۔

وہ ابھی کہہ چکی تھی "طبیعت ٹھیک نہیں۔"
"اب تم سناؤ!"
"ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا۔ ابّا جان ہماری شادی کر دیجئے!"
"پھر تمہارے ابّا جان نے کیا کہا؟"
"جانے دیجئے، رہنے دیجئے! ہم نہیں سناتے۔"
"اے توبہ! ہم بھول گئے تھے نجمی۔۔۔ پھر اس بچے کے باپ نے کیا کہا؟"
اس نے کہا "کس کے ساتھ شادی کرو گے؟"
بچے نے کہا۔ "دادی اماں کے ساتھ۔"
اس کے ابا نے کہا۔ "ارے! وہ تو میری ماں ہیں۔"
بچے نے کہا۔ "آپ نے بھی تو ہماری امی جان سے شادی کی ہے۔"
"بہت خوب! بہت خوب!! تم نے بہت اچھا لطیفہ سنایا نجمی! تم جا سکتی ہو!"

~~~

جتنی دلچسپی سے میں نے اسے پڑھایا اس سے کہیں زیادہ وہ ذہین تھی۔

وہ امتحان دے رہی تھی۔ میں اسٹینوگرافی کی تعلیم کے لئے لکھنؤ جا رہا تھا۔ مجھے مستقل دو سال لکھنؤ میں رہنا پڑا۔ میں ڈپلوما لیکر کالج سے نکل رہا تھا کہ نجمہ کا خط ملا:۔

"شمیم صاحب! آداب!!
ہم آٹھویں سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگئے۔ ممو جان آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے، جیسے آپ ہی نے تو آٹھویں میں پڑھایا ہے۔ اور ہاں وہ آپ کے پاس ہونے پر بھی بہت خوش ہو رہے تھے، کہہ رہے تھے 'بڑے ہونہار لڑکے ہیں'۔۔۔ بعض لوگوں کو تعریفوں ہی میں بڑا مزا آتا ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے، لکھ دینا! ہمیں تمہارا بہت انتظار ہے۔"
نجمی صاحب سلام کہتے ہیں،

"۔۔۔ شریر کہیں کی! نجمی صاحب سلام کہتے ہیں۔۔۔ 'بڑے ہونہار لڑکے ہیں'۔۔۔ 'ہمیں تمہارا بہت انتظار ہے' یہ سب اسی کے جملے ہیں واقعی وہ میرے پاس ہونے پر اپنے پاس ہونے کی طرح خوش ہوگی۔ وہ میرے آنے کی منتظر ہے۔۔۔ اے کاش وہ ہمیشہ سامنے آسکتی!"

میں نے جلد جلد سامان درست کیا، اور یکہ میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ یکہ موٹر سے ٹکرایا۔ گھوڑا ختم ہو گیا۔

میں ہسپتال میں تھا۔
"میرا موٹر سے تصادم ہو گیا!"

"... مجھے خود یقین تھا، تمہیں میرا انتظار ہو گا! مگر نجمی میرا تصادم... ـــــ" مسہری کے عقبی حصے سے ہاتھ ٹکرا کر دکھ گیا، آنکھ کھل گئی۔

نرس مسکرائی: "کون انتظار کر رہا ہے آپ کا شمیم صاحب؟

بڑے خوش نصیب ہیں آپ ـــ مگر آپ ابھی ایک ڈیڑھ ہفتہ نہیں جا سکیں گے۔ ہاتھ کی پٹی تو پرسوں تک کھل جائیگی مگر سر کی پٹی کھلنے میں ابھی دیر لگے گی۔"

"ـــ ہاں مس فلورا! کسی کو میرا انتظار ہے۔ میں ایسے ہی پٹی باندھے نہیں جا سکتا؟"

اس نے رشک آگیں انداز میں ایک قہقہہ لگایا ـــ جیسے جام بلوریں چور چور ہونے سے پہلے ایک نامکمل نغمہ سنا جائے۔

میں تین مہینے کے بعد ہاسپٹل سے واپس ہو رہا تھا۔

"مس فلورا! مجھے یقین ہے، آپ میری بے اعتنائیوں کو معاف کر دیں گی۔ میں آپ کی اس غیر معمولی ہمدردی کا عرصہ تک شکر گذار رہوں گا"

ڈاکیہ نے دو خط لا کر دیئے ایک، ایک میرے دوست اشرف کا تھا اور دوسرا نجمہ کا۔ ایک میں اظہار افسوس، نہ آنے کے بہانے اور چند رسمی ہمدردانہ جملے۔ نجمہ کا خط کھول کر ایک مطمئن گہری سانس لی۔

"شمیم صاحب! آداب!!

آپ کے سر میں چوٹ تو "خفیف سی" آئی ہے۔ پھر اب تک ہاسپٹل میں کیوں پڑے ہوئے ہیں ـــ نہیں نہیں آپ کے سر میں زیادہ چوٹ آگئی ہے، آپ چھپا رہے ہیں۔ یہاں میرے خلاف کچھ سازشیں ہو رہی ہیں۔ جنہیں شاید آپ پسند نہ کریں ـــ ہاں! تو کچھ بتائیے آپ کب تک آ رہے ہیں!؟

وہی صاحب جنہیں آپ کا انتظار ہے، سلام کہتے ہیں۔ سازش ہو رہی ہے ـــ کیا لکھ رہی ہو نجمہ!؟

"یکہ والے! تیز چلاؤ یکہ!!"

"قلی: دیکھو یہ بستر، پٹاری اور سوٹ کیس انٹر کلاس میں پہنچا دو ـــ بہت جلد!!

بدقسمتی سے ایک شاعر صاحب بھی اسی درجہ میں تشریف فرما تھے۔

"حضرت السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام جناب!" میں نے سہم کر کہا۔

"حضرت! کہاں تشریف لے جا رہے ہیں آپ؟"

"جی! ـــ جی، میں بھوپال جا رہا ہوں"۔ میں دل میں سوچ رہا تھا یہ اپنی حضرت نواز لغویت ختم کریں تو نجمہ کا خط پڑھوں کہ صدا اٹھے برخاست۔

"حضرت! کچھ شعر و سخن سے بھی آپ کو دلچسپی ہے؟"

"نہیں صاحب! میں ایک کاروباری آدمی ہوں میرے تمامتر دوست یا تو تاجر ہیں یا مزدور، انتہا یہ ہے۔ مجھے اخبار سے بھی دلچسپی نہیں۔"

"بہرحال آپ ایک تعلیم یافتہ اور سنجیدہ شخص معلوم ہوتے ہیں۔"

"شکریہ!" کہکر میں خاموش ہو جانا چاہتا تھا کہ

"حضرت! اگر زحمت نہ ہو تو کچھ عرض کروں!"

"جی، ارشاد! ـــ مجھے کیا معلوم تھا کہ بزبان شاعری عرض فرما رہے ہیں!

"یہ دو چار اشعار غالب کے رنگ میں ہو گئے ہیں ـــ ایک پچاس ساٹھ اشعار کی غزل نکال کر، مطلع ملاحظہ ہو ؎

مزین ہوتی جاتی ہے، مشید ہوتی جاتی ہے
براتِ عاشقاں گنبد بہ گنبد ہوتی جاتی ہے

اس جہلیت کی کیا داد و فریاد ہو سکتی تھی! ـ میں خاموش تھا۔

"حضرت یہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن نہیں ہے، یہ شعر ہے شعر ـــ الہام!! میں صحیح عرض کرتا ہوں، بعض اوقات شاعر خود حیران رہ جاتا ہے کہ ایسا شعر میں نے کیسے کہہ لیا ـــ مگر آپ تو تاجر پیشہ اصحاب میں سے ہیں۔ اچھا سہل ممتنع کے چند شعر عرض کرتا ہوں ؎

اک فرق کا بال ہے، کمر کیا! شاعر کا خیال ہے، کمر کیا!!

بیساختہ میری زبان سے نکل گیا، لعنت!

"واللہ! آپ بہت بدمذاق ہیں، نہایت غیر سنجیدہ ہیں ـــ آپ سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں۔"

وہ برہم ہوتے ہوئے بہت دور ایک سیٹ پر جا بیٹھے اور میں سوٹ کیس سے "جاوید نامہ" نکال کر دیکھنے لگا۔ جب دیکھا کہ شاعر برہم کسی تازہ تصنیف میں مبتلا ہو گئے۔ تو میں نے نجمہ کا خط جیب سے نکالا۔

اکسپریس اسٹیشن بھوپال پر رکا۔ میں تانگہ میں بیٹھا، دیکھتا کیا ہوں

کہ شاعر برہم میرا خاموش تعاقب کر رہے ہیں یعنی ایکبار پھر سہم کر رہ گیا۔

"شاعر برہم" نے دفعتہً تانگہ رکوا کر ایک راہگیر سے دریافت کیا۔

"حضرت! کیا آپ مہربانی فرما کر مجسٹریٹ زیدی صاحب کے دولتخانہ کا پتہ بتلائیں گے۔ میں آپ کا بہت ممنو . . . ."

میرا تانگہ بہت دُور نکل چکا تھا۔

"مجسٹریٹ زیدی؟ یہ وہاں کیوں جانا چاہتا ہے؟ نجمہ — سازش — مجسٹریٹ زیدی!؟ کیا معمہ ہے؟

شام کو میں نجمہ کے پاس پہنچا۔ زیدی صاحب نے بڑھ کے سینے سے لگا لیا۔" بیٹا تم آگئے! بہت انتظار کرایا — اور ہاں! دیکھیں تمہارے چوٹ کہاں آگئی تھی؟ توبہ! توبہ!! اتنا بڑا زخم! ابھی تو نجمہ کہہ رہی تھی کہ شاید چوٹ زیادہ آگئی ہے، جو ابتک نہ آسکے۔ آؤ! تمہاری، ایک صاحب سے ملاقات کرائیں۔ وہ مجھے قریب کے ایک کمرے میں لے گئے۔ میری زبان سے بیساختہ نکلا" ارے شاعر برہم!" "نہیں بیٹے آپ ادہمی صاحب ہیں"۔ زیدی صاحب نے تعارف کرایا۔ ادہمی صاحب سر کھجاتے، عینک سنبھالتے کھڑے ہوگئے —" اور آپ شمیم صاحب، زیدی کے خاندان سے الگ زیدیوں کے خاندان کے ایک فرد" ادہمی صاحب نے "بڑی مسرت ہوئی" کہکر اس انداز سے ہاتھ ملایا، جیسے کہہ رہے ہوں" گنوار! — جس میں شعر سُننے کی بھی صلاحیت نہیں"۔

زیدی صاحب چلے گئے۔

ادہمی صاحب معذرت کر رہے تھے۔

نوکر آیا۔

"شمیم صاحب کو صاحب یاد کر رہے ہیں"

میں پہنچا۔

"نجمی! شمیم صاحب آگئے"

"شمیم صاحب! آداب!!" — میری آنکھوں سے اوجھل ہو کر وہ مجھ سے ہمکلام تھی۔

"میں نے سُنا ہے، تمہارے خلاف کچھ سازش ہو رہی ہے نجمہ!"

وہ ایک ہلکی سی چیخ روکتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئی۔

"شمیم! بیٹے میں نے تمہیں اس لئے بُلایا ہے کہ نجمی کے متعلق کئی خط اور کئی فوٹو آئے ہیں۔ الہ آباد میں میرے ایک دوست وکیل ہیں، انہوں نے اپنے بیٹے کو خود بھیجا ہے کہ میں انکی خوبیوں کا قریب سے مطالعہ کر لوں — وہ جن سے میں نے اس وقت ملاقات کرائی تھی — ادہمی صاحب۔ یہ خود بھی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہیں؛ اچھے خاندان سے ہیں؛ مگر ہیں عجیب مضطرب و متلون مزاج۔ میں تو انہیں تہذیب جدید کی ملمع کی ہوئی انگشتری سمجھتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ تم تو نجمی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ اس قسم آدمی کو شاید ہی پسند کرے!؟"

"قطعاً پسند نہ کریں گی"۔

اچھا تو میں کل ہی انکاری خط انکے والد کو لکھے دیتا ہوں — اور دیکھو یہ خطوط، یہ فوٹو۔

"میرے خیال میں یہ تصویریں نجمہ کی کسی سہیلی کو دلوا دیجئے وہ جس تصویر کو ترجیح دیں آپ [illegible] سے [illegible] لگوا دیں"۔

"واہ بیٹے واہ! کیا اچھی رائے ہے! — کتنی صائب!!"

وہ خطوط اور تصویریں میز پر رکھ کر اندر چلے گئے میں نے [illegible] سے اپنا فوٹو نکالا اور [illegible] تصویروں میں شامل کر دیا اور گھر چلا آیا۔

تیسرے روز نجمہ کا بیرنگ لفافہ ملا:۔

شمیم صاحب!

میں انتہائی ناراض ہوں آپ سے۔ آپ نے عمو میاں کے سامنے کہدیا کہ میرے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ توبہ! توبہ!! وہ کیا خیال کرتے ہونگے کہتے ہونگے اس نے لکھا ہوگا — اور تصویروں میں یہ آپ کا فوٹو کیسا؟ معاف کیجئے گا، میں نے آپ کا فوٹو پھاڑ کر پھینک دیا ہے — مجھے آپ سے ایسی اُمید نہ تھی!

(نجمی)

آج پہلی مرتبہ میرا آئینہ اشک آشنا ہوا۔ پہلی مرتبہ کمرے کی خاموشی نے بقول کسے ؎

سسکیوں کے ساز پر آہوں کے نغمے بکھرا۔

دیکھے — آہ! وہ سوز و گداز، جسے خود تڑپانے والی بھی نہیں جانتی، میری زندگی کے کتنے پُرخلوص لمحے تھے! آنسو تھے، دعائیں تھیں، تنہائیاں تھیں، اور میں — تین دن یونہی گذر گئے۔ چوتھے دن صبح زیدی صاحب کا نوکر آیا۔

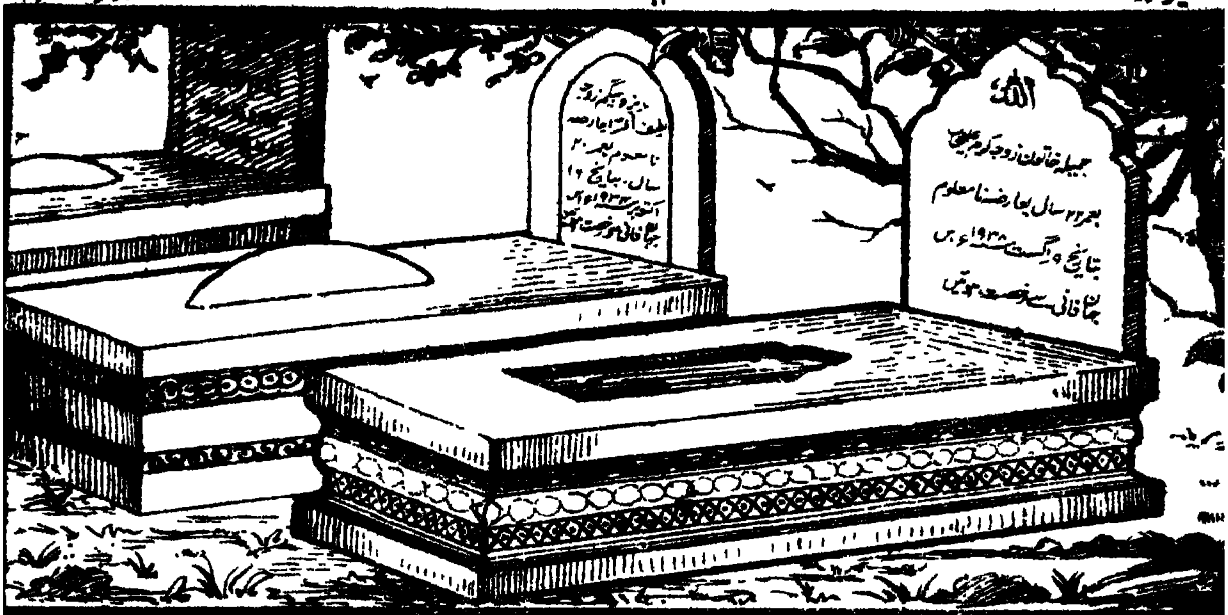
"صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں موٹر بھیجا ہے"

"اچھا، حامد تم موٹر پہ چلو، میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں"

"آؤ بیٹے! آؤ!! میں نے ارادہ کیا تھا کہ آج جائے تمہارے ساتھ پیونگا ہاں! تمہاری وہ اسکیم — وہ فوٹو والی اسکیم بڑی کامیاب رہی"۔

زیدی صاحب نے فوٹو میری طرف بڑھا دیا۔ "مبارک ہو شمیم!"

میں مسرت کے گھونٹ پی رہا تھا۔



نباتات و معدنیات کا دل

سائنٹفک مقالہ

سر جگدیش چندر بوس کے کارنامے

از جناب سید ارشاد حسین ازہری بی۔اے ایل ایل بی

"ابھی تک ہم لوگ پودوں اور درختوں کو دُنیا کی بے زبان مخلوق میں شامل کرتے ہوئے یہ خیال کرتے تھے کہ ان میں اور ہم میں کوئی مماثلت نہیں لیکن میں آپ پر واضح کرونگا کہ وہ اس قدر "ذی حس" ہیں کہ درحقیقت وہ ذیحیات ہیں حتیٰ کہ آپکے سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔ آپ واقف ہیں کہ "چھوئی موئی" کا پودا خفیف صدمہ سے سرنگوں ہو جاتا ہے ہم نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے اس پودے کا یہ جواب عقل و فہم میں آسکتا ہے۔

ہماری سماعت پیچ در پیچ گیارہ راستوں سے تکمیل پاتی ہے اور ہماری بصارت روشنی کے صرف ایک پردے سے تمیز حاصل کرتی ہے۔ سُرخ اور بنفشئی رنگوں کے درمیانہ رنگ کے علاوہ کوئی دُوسرا رنگ بصارت کی حدِ تمیز سے باہر ہے لیکن پودا حقیقتاً بالا بنفشئی رنگ کا درک کرتا ہے حتیٰ کہ وہ فضائی ناقابلِ امتیاز خفیف ذرات (ایتھر) کو بھی دیکھتا ہے جن کے ناقابلِ امتیاز تاروں پر ریڈیو کے نغمے ہمیں سُننے کو ملتے ہیں۔

یہ غیر ممکن نہیں ہے کہ پودوں کو ایک چھٹی حس حاصل ہو۔ میں اس قول کو باحتیاط تمام کہتا ہوں اس لئے کہ حقیقت کو مُبالغہ کے ساتھ نہ پیش کرنا چاہئے لیکن یہ حقیقت موجود ہے اور ہم اسے حاصل کر کے رہینگے۔ میں جس وقت پودوں کی "قلبی حرکت" کا جائزہ لے رہا تھا میں نے تجربات کرتے ہوئے آلات کے ذریعہ سے محسوس کیا کہ چند آدمیوں کے آجانے پر ان کے دل کی دھڑکن میں تغیر ہوا اور ان کے چلے جانے کے بعد وہ پھر اپنے دھڑکن کی معمولی تعداد پر آگئے۔ بالعموم ایک پودے نے بارہ منٹ میں اپنی اصلی قلبی حرکت دوبارہ حاصل کی ....."

(سر جگدیش بوس)

سر جگدیش بوس کے نام نامی سے کون ناواقف ہوگا۔ یہ ہندوستان کے اُن چند غیر معمولی اہل دماغ میں سے ہیں جن کا نام ہندوستان کے لئے بالخصوص اور ساری دُنیا کے لئے بالعموم باعثِ افتخار ہے۔ آسمان ادب کو چار چاند لگانے والوں کی فی زمانہ کم از کم اس بدنصیب ملک میں قدر ہی کیا ہے اس لئے ممکن ہے اہل ہند ڈاکٹر اقبال کو بھول جائیں، یہ بھی ممکن ہے کہ زمانہ کے انقلابات ڈاکٹر ٹیگور کو فراموش کر دیں لیکن سر جگدیش کے کارنامے رہتی دُنیا تک باقی رہ جانے والے ہیں۔ سائنس کی دُنیا غیر فانی دُنیا ہے اس لئے اس سائنسدان کی تحقیقات ساری دُنیا سے ہمیشہ ہمیشہ خراجِ تحسین وصول کرتی رہینگی۔ ہندوستان کی تنہا ہستی ہے جو تحقیقات سائنس میں "نوبل پرائز" پا سکی ہندوستان کی کروڑہا آبادی میں یہ "فنا فی السائنس" تنہا فرد ہے جو پسماندہ التجربہ میں پھنسا ہوا ہندوستان جیسے کورِ دہ میں آلات بھی ایجاد کرتا ہے اور ان آلات کے ذریعہ سے بیش بہا معلومات بھی

ہم تک پہنچاتا ہے۔ ابھی ہندوستان کے بہت سے افراد اپنے وطن کے اس سپوت سے ناواقف ہونگے لیکن دُنیا کے سائنسدان اس نام اور اس فرد کے کارناموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سر جگدیش کی آمدنی کا زیادہ حصہ بھی غیر ملکیوں کی جیبوں سے آتا ہے ورنہ اس غریب و نادار ملک میں ایسے اہم کام کون انجام دے سکتا ہے جہاں فکرِ معاش ملک کے بہتر سے بہتر دماغوں کو بیکار اور کھوکھلا کئے دیتی ہے۔ اس ملک کی پست ذہنیت کا یہ ثبوت ہے کہ ہندیوں کو یقین ہو گیا ہے کہ اس ملک میں دماغ پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ وہ غیر ملکی افراد کے حقیر سے حقیر مقولوں کو ناقابلِ تردید ثبوت قرار دے کر پیش کرنا اپنے علمی تبحر کا کمال سمجھتے ہیں اور ان کے جذبۂ وطن پرستی کو ذرا بھی ٹھیس نہیں لگتی ہر چند کہ وہ خود اس سے بہتر مقولے سپردِ قلم و زبان کر سکتے ہیں۔ لیکن کم از کم سر جگدیش بوس کا نام ہماری گردنوں کو بلند کر دیتا ہے اور ہندوستان کو مغرب کی ترقی یافتہ

سائنسداں اقوام کے ہم پلہ کر دیتا ہے۔

ماہرین سائنس کا اعتراف

عرصہ دراز تک اپنے دار التجربہ میں خاموش او تنہا موشگافیاں کرنے کے بعد سر جگدیش نے اپنی تحقیقات اور معلومات کو دُنیا کے سامنے پیش کیا اور دُنیا نے فوراً سر جگدیش کی دماغی رفعت کا اعتراف کرتے ہوئے اس سائنسداں کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ انہیں بار بار یورپ میں طلب کیا گیا تاکہ وہ اپنے تجربات اور تحقیقات کو اپنی زبان سے بیان کریں اور سر جگدیش نے ہر بار اہل یورپ سے خراج تحسین حاصل کیا ۱۹۱۹ء میں بوس کو دوبارہ لندن جاکر تقریریں کرنی پڑیں اور اس چھوٹے قد کے بنگالی نے دُنیائے سائنس میں ہلچل ڈال دی اخبارات نے دھوم مچا دی۔ گوشہ گوشہ سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ بوس نے اس نادر موقع سے یہ بھی فائدہ اُٹھایا کہ رائل انسٹی ٹیوشن کے دار التجربہ میں اپنی تحقیقات کو مزید کسوٹی پر کس لیا اور مسرور و شاد کام ہندوستان مراجعت فرمائی۔ اور پھر ہندوستان کی کروڑہا آبادی میں تنہا "رموز سائنس" کی گتھیاں سلجھانے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں پھر انگلستان تشریف لے گئے اور برٹش اسوسی ایشن آکسفورڈ میں جہاں ماہرین سائنس کا مجمع تھا تقریر کی۔ ہال کھچا کھچ ان افراد سے پُر تھا جنھوں نے بوس کی طرح اپنی تمام عمر اسی دُنیا میں صرف کی تھی۔ ہر طرف وہی لوگ تھے جو سائنس کے سر بستہ رموز کو افشا کرنے میں منہمک تھے اور ہر فرد اسی قدر مدعی نام و نمود تھا جس قدر سر جگدیش۔ تقریر ختم ہوئی۔ متحیر چہروں نے دیکھا۔ متانت، سنجیدگی، آہستگی اور خاموشی کے ساتھ اس زمانہ کا سب سے بڑا سائنسداں آئنسٹین (Einstein) آیا اور تجویز پیش کی کہ بوس کی خدمات کے صلہ میں ایک آف نیشنز (بین الاقوامی لیگ) کے مرکزی مقام پر بوس کا مجسمہ نصب کیا جائے۔

آپ جانتے ہیں سر جگدیش نے کیا ثابت کیا۔ اِس قابل فخر ہستی نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں روشن کر دیا کہ

"حیات ہر جگہ ہے حتیٰ کہ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ جمادات یہاں تک کہ فولاد بھی احساس رکھتے ہیں۔ پودوں کے جذبات ہوتے ہیں۔ ہر مخلوق زندہ رہتی ہے اور فنا ہوتی ہے"

پودوں کا دِل

سر جگدیش کا قول محض قول ہی نہ تھا یا محض ایک عقیدے کا اظہار نہ تھا بلکہ ریاضی کے حل کی طرح درجہ بدرجہ ثبوت پر مبنی تھا۔ ۱۸۷۹ء ہی میں ایک فرانسیسی ماہر سائنس نے لکھا تھا کہ نباتات کی حیات کم و بیش حیوانات سے مشابہ ہے مثلاً رات کے وقت سرسبز پودا آکسیجن کی سانس لیتا ہے اور کاربن ڈائیکسائیڈ سانس سے باہر نکال پھینکتا ہے بلکہ اسی طرح جیسے انسان یا حیوان کی حالت ہے، یعنی نباتات سانس لیتے ہیں۔ پودوں میں قوت ہاضمہ بھی موجود ہے جس کی وجہ سے پودوں کی غذا شکر کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کچھ دیگر کیمیائی چیز پیدا کرتی ہے اور پودے پھر ان کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا تھا کہ پودے جنبش کرتے ہیں حالانکہ ان کے رگ اور پٹھے نہیں ہوتے کلیاں اپنا چہرہ سورج کی طرف کر لیتی ہیں۔ بارش کے دوران میں پتیاں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ ٹہنیوں کی نرم و نازک نوکیں برابر جنبش میں رہتی ہیں۔ چھوئی موئی اور اسی قسم کے دُوسرے پودے مختلف طریقوں سے حرکت کرتے ہیں۔ چھوئی موئی کا پودا انسانی ہاتھ سے دُور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شرم و حیا کا یہ عالم ہے کہ مس ہو جانے پر کتاب کی طرح بند ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو مُردہ ثابت کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا لیکن یہ اسی صدی کا کارنامہ ہے کہ پودوں کے دل ہونا ثابت ہوا اور اس تحقیقات کا سہرا سر جگدیش بوس کے سر ہے۔

سر جگدیش کی تحقیقات اگر تفصیل سے بیان کی جائے تو چند دماغوں کو محض افسانہ معلوم ہو اور ہر دماغ حیرت زدہ ہو جائے خدا کی خدائی کا منکر وجود قادر مطلق کا قائل ہو جائے۔ ان کا تجربہ ہے کہ

"پودوں کے دل ہوتے ہیں۔ آلہ مقیاس الحرکت ایجاد کرنے سے بہت پیشتر مجھے یقین تھا کہ پودوں کے ننھے ننھے تنوں میں اس کا رس بالکل اسی طرح حرکت کرتا ہے جس طرح دل خون کو رگوں میں پھینکتا ہے یعنی اس کا بہاؤ مسلسل نہیں ہوتا بلکہ جھٹکے سے ہوتا ہے میرے آلہ نے بالتحقیق ثابت کر دیا کہ میرا یہ خیال بالکل درست تھا۔ سائیکلامن کے پودے میں نبض کی سی حرکت ایک سکنڈ میں ایک انچ کے دس لاکھویں حصہ کے برابر تھی"

حرکتِ قلب کی پیمائش

سر جگدیش نے مزید تجربہ کیا اور پودے کے تنے میں برقی لہر

دوبارہ ای اور اس طرح تجربہ کرکے وہ پھر اسی نتیجہ پر پہنچے آپ شک کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن اس تجربہ میں ان کو لاتعداد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کلکتہ کے سے مصروف شہر میں جہاں ہر شاہراہ پر موٹر کار اور لاریاں بڑے بڑے دوڑ رہی ہوں صحیح اندازہ کرنا دشوار تھا لہٰذا اولاً دار التجربہ کو بیرونی اثراتِ صوت وحرکت سے محفوظ اور مصئون کر دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سعی کی گئی کہ بجلی کی رو سے خود نازک تنا جنبش نہ کرنے پائے۔ اول اول برقی رو تنا پر اپنا اثر برابر کرتی رہی اور تنے کا ہلنا بند نہ ہو سکا طرح طرح کی لکڑیاں تلاش کی گئیں جو برقی اثر سے تنے کو محفوظ کر دیں لیکن تنے کا ہلنا بند نہ ہو سکا۔ اتفاقاً سر جگدیش کو عجائب خانہ سے واپس آتے ہوئے ساہی کا کانٹا مل گیا۔ سائنسدان دماغ نے اسے کارآمد سمجھ کر اٹھا لیا اب تنا اس کی مدد سے برقی رو کی زد میں غیر متحرک رہا اور اس طرح "حرکت قلب" پیمائش کی جا سکی۔ اس مزید مشاہدہ نے بھی سر جگدیش کی رائے کی تصدیق کی۔ سر جگدیش کے دماغ نے یہ بھی بتایا کہ پودے لاسلکی محرکات سے بھی اثر لیتے ہیں۔ چنانچہ چھوٹی موئی کے سے ذکی الحس پودے کو لیکر ایک شیشہ کے خانہ میں بند کرکے بیرونی اثرات سے محفوظ کر دیا۔ بظاہر پودا بڑھا اور موٹا بھی ہوا لیکن اس پودے کی حس اس پودے سے بہت کم تھی۔ جو باہر کھلی ہوا میں بڑھ رہا تھا۔ اب یہ پودا باہری پودے کی طرح انگلی مس ہونے سے بالکل مُردہ نہ ہوا۔

اِنسان اور نباتات

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پودے کی حیات انسانی زندگی سے کس قدر مشابہ ہے سر جگدیش نے نباتات کی نزعی کیفیتوں کا مشاہدہ کرنا چاہا۔ انہوں نے ایک پودے کو زہر دیا۔ پودے کے تنے کو برقائیا میں کھا اور اس کی قلبی کیفیت معلوم کرنے کے لئے آلہ معقیاس الحرکت لگا دیا تاکہ زہر کے اثرات سے اس کے قلبی جذبات وحیات کا اندازہ ہو سکے۔ آپ حیرت سے سنیں گے کہ آلہ نے صاف بتایا کہ پودے کا دل اسی طرح زیر و زبر ہو رہا ہے جس طرح انسانی نزع موت کے چنگل سے نجات پانے کے لئے تڑپتی اور پھڑپھڑاتی ہے۔ ہندوستانی کے طبیبوں نے ہزارہا سال پیشتر یہ تجربہ کیا تھا کہ اگر کوبرا سانپ کے زہر کی خفیف مقدار انسانی خون میں شامل کرکے رگوں میں دوڑا دی جائے تو مرتے ہوئے جسموں میں زندگی کی لہر دوڑا دی جائے گی چنانچہ مختلف نادر نسخوں سے اس امر کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ سر جگدیش نے یہی تجربہ پودوں پر کرنا چاہا۔ ایسا کرنے سے انہوں نے مشاہدہ کیا کہ نباتات اور انسان کی حالت کس قدر یکساں ہے۔ ایسا زہر پودوں کی بھی قلبی حرکت کو بڑھا دیتا ہے بڑی مدت سے زہر کو زہر سے مارنے کا اصول ہر طبیب۔ ہر وید اور ہر ڈاکٹر کے نزدیک کارگر اور مفید طریقہ علاج ہے۔ آجکل بھی مختلف دوائیں جو سوئیوں کے ذریعہ سے انسانی خون میں براہ راست پہنچائی جاتی ہیں اسی اصول کے زیر نظر تیار ہوتی ہیں اسپتالوں اور ڈاکٹری دواخانوں میں تقریباً جملہ مقویات اسی اصول کے ماتحت دی جاتی ہیں زہر ہلاہل کی خفیف مقدار قوت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ہیضہ اور چیچک کا علاج ٹیکے کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور ان امراض کے جراثیم اور انہی کا مادہ خود اس کی دوا بن گیا ہے۔ ہومیوپیتھک کا سارا اصول یہی ہے۔ ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہر مرض کی کیفیتوں پر غور کرکے وہی دوا تجویز کرتے ہیں جس کا ماخذ معدہ میں پہنچ کر بجنسہ وہی علامات پیدا کرے جو مریض میں موجود ہیں۔ چنانچہ سر جگدیش نے اس اصول کی بنیاد پر بھی تجربہ کیا تاکہ انسان اور نباتات کی روح اور زندگی کی مماثلت ومشابہت ثابت ہو جائے اور ان کے تجربہ نے دونوں میں فرق پایا۔

پودوں کی قوتِ احساس

انسانی حواس خمسہ میں سے کم از کم لامسہ، سامعہ اور باصرہ کے متعلق بھی قطعی تجربہ کیا جا چکا ہے جس طرح انسان کے حواس خمسہ ہر ملک اور ہر قبیلہ بلکہ ہر فرد میں یکساں اور مساوی الوزن موجود نہیں ہیں اسی طرح پودوں کا بھی حال ہے۔ مثلاً انسانی زبان برقی رو کو سب سے زیادہ محسوس کرتی ہے اور اس احساس میں ایک ہندوستانی کی زبان ایک یوروپین کی زبان سے بالعموم دوگنی ذکی الحس ہوتی ہے۔ کچھ لوگ چمگادڑ کا اونچے سُروں میں چیخنا سن سکتے ہیں اور کچھ نہیں سن سکتے۔ کچھ افراد عدم بارش کو بھی محسوس کرتے ہیں اور حواس باختہ و پریشان ہو جاتے ہیں لیکن دوسرے نہیں۔ بعض اشخاص کے سر میں برشگال کے زمانہ میں رعد و برق سے درد ہو جاتا ہے دوسروں کو نہیں معمولی انسان ان واقعات سے واقف ہو کر وجہ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ ماہرین سائنس نہ صرف اس کا سبب معلوم کرتے ہیں بلکہ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنی موشگافیاں کرتے ہیں۔ ایک چیونٹی بالا بنفشی شعاعوں کو محسوس کرتی ہے حالانکہ انسانی باصرہ اس کے درک سے معذور ہے۔

کچھ پرند ایسے ہیں جو مقناطیسی حس رکھتے ہیں جن کی وجہ سے وہ زمین سے نہایت بلند دُور دراز لمبے سفر پر پرواز کرتے رہتے ہیں اور واپس آجاتے ہیں۔ درختوں کی بھی حالت بالکل یوں ہی ہے اور مختلف قسم کے پودوں میں مختلف مدارج کے احساسات موجود ہیں مثلاً سر جگدیش نے مشاہدہ کیا کہ ایک درخت اپنے اور آفتاب کے درمیان بادلوں کی تگ و پو کو محسوس کرتا ہے۔ درمیان میں بادلوں کے آجانے سے اس کے پیا حیات میں لرزش ہونے لگتی ہے۔ لیکن برخلاف اس کے پودے اس حس میں کمزور ہیں۔ اسی طرح سر جگدیش نے ثابت کیا کہ پودے انسان کے مقابلہ میں برقی رَو سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ انسانات اور دوسرے حیوانات میں ایک عمل اور اس عمل سے اثر پذیر ہونے میں کافی عرصہ گذر جاتا ہے جو ہمیں کتنا ہی سریع کیوں نہ معلوم ہو لیکن سر جگدیش کے آلہ مقیاس الحرکت کی پیمائش میں ایک کافی عرصہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ یہ آلہ خفیف سے خفیف حرکت کو ہزارہا گنا بڑھا کر بتا سکتا ہے اگر یہ یہاں کا ایجاد کردہ آلہ سب سے خفیف حرکت کرنیوالے گھونگھے میں لگا دیا جائے تو اس کیڑے کی حرکت رفتار ایک گھنٹہ میں ۲ کروڑ فٹ کے برابر معلوم ہوگی۔ پودوں کے نمو کی رفتار اس کیڑے کی رفتار سے چھ ہزار گنا تیز تر ہوتی ہے۔ ایک پودا ایک سکنڈ میں اندازاً ایک دس لاکھویں حصہ کے برابر بڑھتا ہے یعنی دس لاکھ سکنڈ میں پودا عموماً ایک انچہ بڑھتا ہے لیکن ہر پودے کے نمو کی رفتار ایک نہیں ہوتی۔ مثلاً بانس کے کلّے جلد تر بڑھتے ہیں۔ یہ کلّے بالعموم چوبیس گھنٹے میں نو انچ سے لیکر بارہ انچ تک بڑھتے ہیں اس قوت نمو کی پیمائش کا آلہ بھی سر جگدیش کا ایجاد و تیار کردہ ہے آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ آلہ مقیاس الحرکت کس قدر لطیف و نازک ہوگا۔ اسی آلہ کے ذریعہ سے انہوں نے معلوم کیا کہ انسان و حیوان کی بہ نسبت پودے زیادہ دیر میں متاثر ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے تلوے میں کانٹا چبھ جائے تو مختلف خبر رساں رگوں کے ذریعہ سے اس تکلیف کی خبر دماغ جو مرکز احساس ہے حاصل کرتا ہے اور واپس آکر اسی مقام پر تکلیف محسوس کرتا ہے اور کس قدر جلد محسوس کرتا ہے لیکن دورانِ تجربہ کے کالا گیا اس احساس کو ناپ لیتے ہیں مینڈک پر ایسا ہی عمل کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ اس تکلیف کو $\frac{1}{100}$ سکنڈ میں محسوس کریگا لیکن پودوں کو اس تکلیف کا احساس اس سے پچاس یا پچھتر گنے وقت میں ہوگا لیکن محسوس وہ بھی کرتے ہیں۔ یہ احساس موسم سرما میں بہ نسبت موسم گرما کے کند تر رہتا ہے۔ یہ بھی تجربہ سے پایا گیا ہے کہ مسلسل ایک ہی طرح کی تکلیف یا تکان کی وجہ سے یہ احساس پودوں میں باقی نہیں رہ جاتا گویا پودے بزبان غالب اس شاعر کے تجزیۂ نفس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر بقول غالب ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

تو ڈاکٹر بوس نے ثابت کر دکھایا کہ رنج کا عادی ہو جانا پودوں پر بھی وہی اثر ڈال دیتا ہے اور احساس تکلیف غائب کر دیتا ہے چونکہ قوت احساس کا مرکز دماغ ہے اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ جس طرح رگوں کے ذریعہ سے انسانی دماغ محسوس کرتا ہے، اسی طرح پودے بھی رگیں رکھتے ہیں اور ان کے دماغ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ صرف ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ دماغ کس حصہ میں ہوتا ہے۔ ان تمام معلومات سے نہ صرف ذخیرۂ علم میں اضافہ ہوا بلکہ ان میں سے بعض معلومات کی وجہ سے چند بیش قیمت ادویہ کا اضافہ ہوا جو ڈوبتے ہوئے دلوں کو ابھارنے میں نہایت مفید ثابت ہو رہی ہیں۔

معدنیات کی رُوحانی قوت

پودوں کی یہ کیفیت تو قیاس میں آبھی سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز نتائج معدنیات پر عمل کرنے سے ظاہر ہوئے۔ سر جگدیش کے دار العمل میں یہ بات ثابت ہوئی کہ معدنیات میں بھی رُوحانی قوت موجود ہے۔ جسے آپ انسانی حیات کے الفاظ میں رُوح کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو دھات سے اشیاء تیار کرتے ہیں، اُن کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ معدنیات بھی تھک جاتے ہیں اور تھک کر اپنی قوت کو زائل کر دیتے ہیں۔ اس طرح مسلسل کام کرکے تھک جانے کے بعد وہ آرام کے خواہشمند ہوتے ہیں جس طرح بعینہٖ ایک انسان آرام حاصل کرکے اپنی کھوئی ہوئی قوت کو حاصل کرتا ہے۔ مثلاً لوگ بالعموم واقف ہیں کہ اُسترے کے ایک ہی پھل کو روزانہ استعمال کرنا اس کی تیزی کو زائل کر دیتا ہے، وہ تھک کر کند ہو جاتا ہے۔ پھر چاہے اس کو عارضی طور پر سلی یا سان یا کسی دوسرے طریقہ سے برابر تیز ہی کیوں نہ کیا جائے

لیکن وہ کارآمد نہیں ہوتا برخلاف اس کے اگر اسی پھل کو چند یوم استعمال نہ کیا جائے تو اس کی دھار خودبخود تیز ہوجاتی ہے اور وہ آرام حاصل کر کے از خود کارآمد ہوجاتا ہے۔ "ایکسرے" (Ex-ray) یعنی عکسی شعاع سے ثابت ہوچکا ہے کہ آرام (یا عدم استعمال) کی وجہ سے اس کے غیر مترتب اجزا مترتب پا جاتے ہیں اور اس کی قوت عمل عود کر آتی ہے۔

معدنیات کے احساسات

آلہ مقیاس التحریک برقیہ (Calvano moter) جس سے ہلکی سے ہلکی برقی رَو معلوم کی جاتی ہے ہمیں بتایا ہے کہ زمین کے ان ذخائر میں انسانی رگوں اور پٹھوں کی مشابہت اس معنی میں موجود ہے کہ ان کا احساس پے در پے برقی رو حاصل کرنے کے بعد کند ہوجاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سردی کا اثر ہمارے جسم میں کیا حالت پیدا کر دیتا ہے۔ زیادہ سردی میں ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھٹھر کر اس قدر قوتِ احساس کھو بیٹھتے ہیں کہ اگر اس حصہ جسم کو کاٹا بھی جائے تو درد محسوس نہ ہوگا حتیٰ کہ کچھ حیوانِ وحشی ایسا ہی کے موسم سرما میں موت سے مشابہ نیند سویا کرتے ہیں بالکل اسی طرح معدنیات پر بھی موسم کا اثر ہوتا ہے۔ اکثر معدنیات گرمی کے مخصوص درجہ حرارت کو حاصل کر کے زیادہ ذکی الحس ہوجاتے ہیں اور سردی میں ان کی حس کم ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ثابت ہوئی ہے کہ معدنیات دواؤں سے بھی اثر لیتے ہیں مثلاً برومائیڈ کی ایک تجویز کردہ خوراک انسان کے لئے خواب آور ثابت ہوتی ہے یعنی دماغی احساسات غائب ہوجاتے ہیں اسی طرح ٹین میں پوٹاس برومائیڈ لگا دینے سے اس کی حس غائب ہوجاتی ہے۔ انسان و معدنیات کا یہ ارتباط اس سے زیادہ دُور رس ہے افیون کی قلیل مقدار انسان کو قدرے زیادہ پھرتیلا اور چست بنا دیتی ہے لیکن اس کی زیادہ مقدار سارے قویٰ کو مضمحل کر کے احساس کو غائب کر دیتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت معدنیات کی بھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت فزا بات یہ ہے کہ انسانات اور حیوانات کی طرح معدنیات بھی زہر سے مُردہ ہوسکتے ہیں۔ ایک تندرست اور عمدہ لوہے کا ٹکڑا لیا گیا۔ "آلہ مقیاس التحریک برقیہ" کو اس سے مس کیا گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اس کی رُوح اپنی پوری قوت سے عمل کر رہی ہے اس کے بعد اس پر آکزالک ایسڈ جو ایک مُہلک زہر ہے ڈالا گیا تو آلہ مقیاس التحریک برقیہ نے لوہے میں ایک تڑپ محسوس کی یعنی لوہا نیم بسمل ہوکر تڑپنے لگا اس کے بعد اس آلہ نے بتایا کہ لوہے کی نبضیں چھوٹ رہی ہیں۔ لوہا کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ ٹکڑا بالکل بیجان ہوگیا اور اب رُوح غائب ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد ہی اس زہر کے اثر کو دُور کرنے والی دوا استعمال کی گئی اور اس لوہے میں دوبارہ جان آنے لگی اور آلہ مقیاس التحریک دوبارہ برقی رَو جو رُوح کی موجودگی کا ثبوت ہے محسوس کرنے لگا۔ اس ٹکڑے کو تھوڑی دیر آرام سے رکھا گیا تو وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا گویا اسے دوبارہ حیات ملی۔ اب ایک مرتبہ اُسے پھر زہر دیا گیا اب کی بار بہت دیر کے بعد دافع زہر دوا دی گئی لیکن اس مرتبہ لوہے پر کوئی اچھا اثر نہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ وہ لوہا بالکل مر چکا تھا اور دواؤں کے اثرات سے مستغنی ہوگیا تھا۔ یہی تجربہ بار بار کیا گیا اور ہر بار تجربہ نے یہی ثابت کیا کہ معدنیات پر بھی زہر اپنا اثر کرتا ہے جس طرح انسان و حیوان پر۔ ظاہر بظاہر ہم یہی سمجھتے ہیں کہ لوہے میں زنگ لگ گیا ہے لیکن یہی زنگ اُسے ایک دن بے رُوح کر دیتا ہے۔ اگر زنگ زیادہ اثر نہیں کر چکا تو زنگ خوردہ لوہے کو زندہ کر دینا ممکن ہے لیکن ایک مدت کے بعد جب زنگ کی بیماری لوہے کی رُوح کو زائل کر چکی ہو کوئی علاج سُود مند نہ ہوگا۔

کس قدر مشابہ !! . . حیرت فزا طریقہ سے کس قدر مشابہ حیوانات و نباتات و معدنیات کی زندگی ہے اور خدا ہی خوب واقف ہے کہ ہر زندگی میں کس قدر مشابہت، کس قدر مماثلت اور کس قدر ارتباط باہمی موجود ہے اور ہر ایک کے دُوسرے سے کیا باہمی تعلقات ہیں۔ عالم صغیر ہو یا عالم اکبر۔ مخلوق کی ساری دُنیا تدریجی ترقی کی ایک واحد مسلسل کڑی ہے۔ قدرت کے راز ہائے سربستہ ہم پر آئینہ کی طرح واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ہر ایک کی ماہیت بلکہ رُوحانیت اور تخلیق انسان سے اس طرح ملتی جلتی ثابت ہو رہی ہے کہ ابھی اگر انسانی تخیل پستی سے بلندی کی طرف مائل بہ تحقیق ہوجائے تو عجب نہ ہوگا اگر انسان اور

مافوق الانسان میں بھی ایسی ہی مماثلت ثابت ہو جائے۔ رُوح کی پرواز ہے جو ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر مدارج پر پہنچتی رہتی ہے۔ رُوح جس قدر اعلیٰ مدارج طے کر سکے اس کے پیکر کے لئے امتیازی شان ہے۔ معدنیات ہوں یا نباتات۔ حیوان ہوں یا انسان بشر ہو یا مافوق البشر۔ یہ سب رُوحانی ترقی کے مختلف منازل ہیں۔ پھر کیوں کوئی کہے کہ انسانی روح میں الوہیت کی شان نہیں پیدا ہو سکتی۔ رُوحانی ترقی کی وجہ سے انسان پرواز کر کے مقام قاب قوسین اَو ادنیٰ تک پہنچے تو اس میں کیا اشکال ہے اور کونسا مقام حیرت ہے۔ رُوحانی ترقی انسان کے قدموں پر فرشتوں سے سجدہ کرا سکتی ہے۔ چلتی ہوئی آندھی۔ بہتے ہوئے پانی کو روک سکتی ہے۔ دہکتی ہوئی آگ کو گلزار بنا سکتی ہے۔ درختوں کو جنبش دے سکتی ہے۔ جلوۂ طور دکھا سکتی ہے۔ مُردوں کو حیات کا لباس دے سکتی ہے۔ کنکریوں کو لعل و گہر کی شکل میں تبدیل کر سکتی ہے۔ صرف تزکیۂ نفس اور بلندی رُوحانیت درکار ہے۔



راز و نیاز

ماناکہ دل میں صبر کی ہمت نہیں رہی
نفرت نہیں رہی کہ محبت نہیں رہی
کیونکر کہوں کہ جور میں لذت نہیں رہی
دیوانہ کرکے مجھکو ستم کردیا کہ اب
مجھ سے وہ انتقام وفا لے لیا کہ پھر
اس کا نہ کر ملال کہ مدت سے اب تو میں
میں اور تری جفائے مسلسل زہے نصیب
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی منظر کہ جس کے بعد
اب مسکرا رہے ہیں مرے ذکر پر کہ جب
کیوں آج اہتمام کرم کر رہے ہو تم
ہر سمت منظروں سے نمایاں ہے انتشار
اے موت مسکرا کہ زمانہ سمجھ چکا
دل کو تری نظر سے ملی ہے وہ زندگی
یوں چھپ رہی ہیں لالہ و گل میں تجلیاں

میرے لئے نوید مسرت نہیں رہی

از حضرت راز یزدانی رامپوری

یہ شکر ہے کہ تجھکو شکایت نہیں رہی
کیا کیا نظر سے تیری بدولت نہیں رہی
یہ کفر ہوگیا یہ محبت نہیں رہی
پابندِ احتیاط محبت نہیں رہی
دنیا میں دل کی کوئی ضرورت نہیں رہی
روتا ہوں یوں کہ ہنسنے کی عادت نہیں رہی
بیشک مری وفا کی حقیقت نہیں رہی
میری نظر کو میری ضرورت نہیں رہی
توفیقِ انتظارِ مسرت نہیں رہی
کیا میری زندگی کی ضرورت نہیں رہی
جیسے کسی کو اُن سے محبت نہیں رہی
میرے لئے نویدِ مسرت نہیں رہی
جس میں قضا کی کوئی حقیقت نہیں رہی
جیسے مری نظر کی ضرورت نہیں رہی

اے راز شکر چاہیئے اس لطفِ خاص کا
اُن سے تجھے جفا کی شکایت نہیں رہی

عورت

چینی کہانی

نوشتہ:۔ سی۔ کے۔ چو

ترجمہ:۔ جناب علی احمد بی۔ اے

ظہورِ مسیح سے تین سو سال قبل چوانگ چاؤ نامی ایک شخص چاؤ کے شہر میں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں معزز خدمت انجام دیتا رہا۔ بعد ازاں وہ "لاؤزو" کی تعلیم سے بہت دلچسپی لینے لگا اور اُس کا بہت بڑا عالم بن گیا۔ پھر ایک رات اُس نے خواب میں دیکھا ــــ وہ ایک تتلی میں تحویل ہو گیا ہے اور خوش خوش ہوا میں اُڑتا پھرتا ہے۔ اُس روز سے اُسے یہ خیال پیدا ہوا کہ اسے ان آدمیوں کی بستی چھوڑ کر اپنے اُستاد اور دیگر عالموں کی صحبت میں جانا چاہئے جو ہمیشہ رہنے والوں کی بستی ہے۔ وہ یقیناً اس خیال کو عملی جامہ پہنا تا۔ اگر وہ اُس خوبصورت جوان عورت کو چھوڑ سکتا جس کے ساتھ اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُس سے اس کو اتنی محبت تھی کہ اُسے چھوڑ دینا چوانگ کے لئے ممکن نہ تھا۔

ایک روز جب وہ اپنے مکان کے قرب و جوار کی پہاڑیوں سے ہوتا ہوا گزر رہا تھا اُس نے پہاڑی رستے کی ایک جانب ایک عورت کو سیاہ لباس میں دیکھا وہ ایک تازہ بنی ہوئی قبر کے پاس بیٹھی تھی جس کی زمین ابھی پانی سے نم تھی اور وہ اُس پر ایک پنکھا جھل رہی تھی۔

چوانگ نے اُسے بڑی حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا "معزز عورت! اس قبر میں کون شخص دفن ہے اور تم اس پر پنکھا کیوں جھل رہی ہو؟"

عورت نے اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ اُس شخص کی قبر ہے جس سے میری شادی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت محبت تھی اور جب وہ مرنے لگا تو اُسے مجھے چھوڑتے ہوئے بہت تکلیف ہوئی۔ اس نے اپنی موت سے قبل کہا کہ جب تک قبر کی مٹی خشک نہ ہو جائے اُس وقت تک تم دوسری شادی نہ کرنا ـــ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین خود سے کبھی خشک نہ ہوگی اس لئے میں پنکھے سے اُسے خشک ہونے میں مدد دے رہی ہوں۔

چوانگ نے ہنستے ہوئے کہا "زمین کو خشک کرنا بہت آسان ہے لیکن یہ تم سے نہ ہو سکے گا اس لئے کہ تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں مجھے اجازت ہو تو میں یہ کام تمہاری خاطر کر دوں۔"

یہ سُنکر وہ عورت کھڑی ہو گئی اور پنکھا دیدیا۔ چوانگ نے پنکھا لیکر اپنی غیر معمولی طاقتوں سے زمین کو تھوڑے سے عرصہ میں خشک کر دیا۔

عورت نے یہ دیکھ کر ایک لطیف تبسم کے ساتھ کہا "آپ نے میری جو امداد فرمائی ہے میں اُس کے لئے بہت ہی شکر گزار ہوں۔ لیجئے میں بطور تحفہ یہ پنکھا آپ کی خدمت پیش کرتی ہوں۔"

یہ کہکر وہ خوش خوش چلی گئی۔

چوانگ کو اُس عورت کے طرزِ عمل سے نفرت سی ہوئی۔ وہ پنکھا لئے گھر واپس آیا۔ آج وہ بہت افسردہ تھا۔ چوانگ کی بیوی جو اس واقعہ سے بالکل بیخبر تھی اس سے مختلف سوالات کرنے لگی۔ کس نے اُسے وہ پنکھا دیا؟ آخر اس افسردگی کا سبب کیا ہے؟ ـــ

چوانگ نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ کیا سب بیان کیا اور تب کہا "یہ وہی پنکھا ہے جس سے وہ زمین خشک کر رہی تھی اور جو بعد میں بطور انعام مجھے دیا گیا۔"

چوانگ کی بیوی بھی اس واقعہ سے اتنی ہی متاثر نظر آئی جتنا کہ خود چوانگ تھا اور کہنے لگی یہ واقعہ سُنکر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ دُنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔

چوانگ جو اپنے خیالات کی رَو میں بہہ رہا تھا یہ اشعار پڑھنے لگا:

جبتک ہم جی رہے ہیں دوست بیان کرتے ہیں کہ انکی
محبت کتنی گہری ہے۔
کسی حیوان کی شبیہہ اُتارتے وقت صرف اُسکی کھال کو
ظاہر کیا جاتا ہے نہ کہ ہڈی کو۔
ہم کو انسانوں کے دل نظر نہیں آتے بلکہ صرف اُنکے چہرے

یہ سنکر چوانگ کی بیوی برہم ہوئی اور بگڑ کر بولی "آپکا یہ نظریہ غلط ہے۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ مختلف لوگوں کے نزدیک نیکی اور بدی کا تصور مختلف ہوتا ہے۔ آپ تو یوں کہہ رہے ہیں گویا تمام عورتیں ایک ہی طرح ہوتی ہیں یہ بالکل غلط ہے۔"

چوانگ نے کہا "میرا مقصد تمہیں چھیڑنا نہ تھا۔ لیکن اگر اتفاقاً موت مجھے تم سے چھین لے تو کیا تمہارے جیسے خوبصورت جسم اور نوجوان دل میں میری یاد زیادہ دن تک نہیں رہ سکتی۔"

عورت بولی "ایک پرانی مثل ہے۔ ایک سچا اور وفادار خادم دو حاکموں کی خدمت نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ایک وفادار بیوی کبھی دوسرا شوہر اپنے لئے انتخاب نہیں کرتی۔ اگر خدانخواستہ موت آپ کو مجھ سے چھین لے تو بھی میں تمام عمر آپ ہی کی رہونگی۔"

چوانگ اب بھی مطمئن نظر نہ آتا تھا اس لئے وہ کہتی گئی "آپ کیلئے یہ بات باعث شرم ہے کہ عورتوں کی ایک آدھ مثال سے یہ نظریہ قائم کرلیتا کہ دنیا کی تمام عورتیں انہی کی طرح ہیں۔ حالانکہ عورت کی محبت غیر مستقل اور اسکی پاکدامنی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ آپ کو اس طرح میرے طرز عمل اور میری محبت کو زخمی نہ کرنا چاہیئے" یہ کہکر اس نے اس کے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے زمین پر پھینکدیا۔

چوانگ نے اپنے الفاظ واپس لیتے ہوئے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم دوسری عورتوں سے مختلف ہو۔"

تین چار دن بعد چوانگ بیمار پڑا اور بہت جلد حالت خراب ہوگئی۔ چوانگ کی بیوی دن رات اسی کے بستر کے پاس رہتی۔ وہ نہایت غمگین اور افسردہ تھی۔

آخرکار ایک دن چوانگ نے کہا "مجھے اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت دور نہیں اور کچھ دیر میں میں تم سے جدا ہو جاؤنگا مجھے افسوس ہے کہ وہ پنکھا ٹوٹ گیا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اس وقت تمہارے کام آتا۔"

"میں تمہاری وفادار رہونگی" وہ بولی "میں نے اچھی تعلیم پائی ہے میں جانتی ہوں کیا چیز اچھی اور کیا بری ہے۔ میں دوسری شادی کبھی نہ کرونگی۔ اگر آپ اب بھی شک کریں تو میں اسی جگہ آپکی آنکھوں کے سامنے خود کو ختم کردونگی۔ تاکہ آپ کو معلوم ہوسکے میری محبت کتنی سچی ہے۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا "ایسا نہ کرنا۔ تمہارے الفاظ کافی ہیں۔ مجھے اب اچھی طرح یقین ہوگیا تم ایک اچھی عورت ہو۔"

ان الفاظ کے ساتھ اس کی سانس رک گئی اور وہ مرگیا۔

چوانگ کی بیوی بہت روئی اور مذہبی رسم و رواج کے مطابق اسکی لاش کے تابوت کو مکان کے سامنے والے کمرے میں رکھدیا اور سیاہ لباس پہن لیا۔ وہ تمام دن بہت غمگین رہتی۔ اس کا خیال آتے ہی اسکی آنکھیں نم ہوجاتیں۔ کھانے پینے سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔

چوانگ کے دوست بعض اوقات آتے اور اس سے اظہار ہمدردی کرکے چلے جاتے۔ احباب کی یہ ہمدردیاں بھی چوانگ کی بیوی کا غم دور نہ کرسکیں نہ دل نہ بہلا سکیں۔

یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا اور ساتویں دن ایک غیر معمولی خوبصورت نوجوان نہایت خوشنما کپڑے پہنے ایک ملازم کے ساتھ وہاں آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ چو کا شہزادہ ہے اور چوانگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آیا تھا اور اب جبکہ اسے اس کے انتقال کی خبر مل گئی ہے وہ اپنے قابل اور معزز استاد کے غم میں تین مہینے کا سوگ قائم رکھے گا۔

پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ اپنے خوش وضع کپڑے اتار دیئے اور چوانگ کے مردہ جسم کی تعظیم کے لئے سوگ کے معمولی کپڑے پہن لئے۔ تب اس نے کہا "اگر چوانگ کی بیوی اسے اپنی ملاقات کا شرف بخشتی تو وہ اس سے اظہار تاسف اور ہمدردی کے چند الفاظ کہتا۔"

چوانگ کی بیوی اس سے ملنے کے لئے باہر آئی اور اس کے دلکش خط و خال کو دیکھ کر بہت متعجب و متاثر ہوئی۔ نوجوان کی استدعا پر اس نے چوانگ کی "نان ہوا چنگ" اور لیوزو کی "تاؤتی چنگ" دو کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔

اس نے کہا وہ اس کے مکان کے قریب ایک کمرہ لینا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے استاد کے قریب رہکر اس سوگ منا سکے اور اس کی جملہ تصانیف کا مطالعہ کرسکے۔

چوانگ کی بیوی نے کہا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ چوانگ کے تابوت رکھے ہوئے کمرے سے ملحق جو کمرہ ہے وہ خالی ہے۔ اس میں وہ بخوشی قیام کرسکتا ہے۔

مرحوم چوانگ کے تابوت پر ہر روز مذہبی رسوم ادا کرنیکے بعد وہ شہزادے سے کچھ دیر باتیں کیا کرتی۔ وہ اس سے روز بروز زیادہ

دلچسپی لینے لگی اور دو تین ہفتہ کے بعد تو یہ دلچسپی شدید محبت میں تبدیل ہو گئی۔ حالانکہ شہزادہ اس قدر زیادہ متاثر نہ تھا۔

ایک دن چوانگ کی بیوی کو شہزادے کے نوکر سے گفتگو کرنیکا اتفاق ہوا اور اُس سے یہ پتہ چلا کہ ابھی شہزادے کی شادی نہ ہوئی تھی اور پھر بوڑھے مُلازم نے کہا "میں نے کچھ عرصہ قبل سُنا تھا۔ اُس کا خیال ہے کہ وہ اُس وقت تک شادی نہ کریگا جبتک اُسے اتنی حسین عورت نہ ملے جتنا خوبصورت وہ خود ہے۔ اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو میں کہہ سکتا ہوں اتنی حسین جتنی آپ ــــ"

"اگر ایسا ہی ہے تو" وہ خوش ہو کر بولی "کیا میری شادی اُس سے کرا دینے میں تم میری پوری پوری مدد کرو گے"

بوڑھے مُلازم نے کہا "شہزادے کے ذہن میں یہ خیال قبل ازیں پیدا ہوا تھا اور ممکن ہے وہ اس خیال کی تکمیل کے لئے آمادہ ہو جاتا جو آپ کے ذہن میں ہے ــــ اگر آپ دونوں کے درمیان اُستاد اور شاگرد کا رشتہ نہ ہوتا"

"لیکن اس سے موجودہ معاملہ کا کیا تعلق" عورت نے جلدی سے کہا "کیونکہ چوانگ حقیقی معنوں میں ابھی اس کا اُستاد نہ بنا تھا۔ علاوہ اس کے یہاں پہاڑی مقام پر زیادہ لوگ بھی نہیں جو اس بات کا چرچا کریں۔ اگر تم نے اس معاملہ کی تکمیل میں میری پوری مدد کی تو تمہیں کافی انعام دیا جائیگا"

بوڑھے مُلازم نے وعدہ کیا کہ وہ ممکنہ کوشش کرے گا لیکن دو تین روز بغیر کسی خبر کے گزر گئے۔ چوانگ کی بیوی دل ہی دل میں بہت مضطرب ہو رہی تھی۔

ایک دن اُس نے ملازم کو دیکھ پایا اور فوراً موقع پیدا کر کے اُس سے پوچھنے لگی۔

بوڑھے آدمی نے اُس سے کہا "میں نے شہزادے سے آپ کے خیالات کی پوری پوری ترجمانی کر دی ہے اگرچہ وہ اس سے بہت خوش ہوا لیکن اُس نے کہا ہنوز تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ مرحوم کا جسم سامنے ہی کے کمرے میں رکھا ہے اور یہ شگون شادی کے لئے اچھا نہیں۔ دُوسرے یہ کہ چوانگ ایک عالی خاندان اور معتبر شخص تھا اور شہزادے کو یہ خوف ہے کہ ممکن ہے آپ کا اعزاز اس کے مقابلہ میں شہزادے کو ایسا شرف بخشنا مناسب نہ سمجھے۔ تیسرے یہ کہ شہزادہ یہاں صرف اپنے اُستاد کو دیکھنے کی غرض سے آیا تھا اور چونکہ شادی کرنے کا پہلے سے کوئی خیال نہ تھا اس لئے اُس کے انتظامات فی الوقت نہیں کئے جا سکتے۔ ان باتوں کے مدِ نظر اس کا منظوری دینا مشکل ہے"

چوانگ کی بیوی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "ان سوالات کا حل بہت آسان ہے۔ اوّل یہ کہ مکان کے عقبی حصہ میں ایک چھوٹا پرانا مکان ہے جہاں لاش کو رکھوا دیا جا سکتا ہے۔ دُوسرے یہ کہ چوانگ خود کو علم و اعزاز کے بارے میں بہت حقیر سمجھتا تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کیوں وہ یہاں پہاڑیوں میں آ کر گمنامی کی زندگی بسر کرتا۔ ابھی کچھ ہی دن کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے اُس نے ایک عورت کو دیکھا جو اپنے مرے ہوئے شوہر کی قبر کو پنکھے سے خشک کر رہی تھی اور وہاں سے آ کر اُس نے میری محبت کے بارے میں بہت بُرے اور سخت الفاظ استعمال کئے۔ ان مثالوں سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ وہ کوئی قابل آدمی نہ تھا اور عمدہ اوصاف نہیں رکھتا تھا۔ تمہارا شہزادہ خوبصورت، جوان، محنتی اور ایک شاندار مستقبل رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے وہ شریف الخاندان ہے اور میں بھی چاہتی "کہ ایک معزز شخص کی بیٹی ہوں۔ تو ہماری شادی ہونے میں اب کونسی بات تشنہ رہ جاتی ہے۔ میرا سوال سب سے آسان ہے۔ میرے گھر میں ہر چیز مکمل اور تیار ہے۔ اپنے شہزادے سے کہو کہ آج کا دن بہت اچھا اور خوشگوار ہے۔ اسی خوشی کی تقریب کو آج ہی رات انجام پا جانا چاہیئے۔

بوڑھا مُلازم ان جوابوں کے ساتھ شہزادے کے پاس گیا اور اس نوید کے ساتھ واپس آیا۔ کہ اُس نے شہزادے سے منظوری حاصل کر لی ہے۔ عورت کا دل خوشی سے لہرانے لگا۔ اُس نے ایک بہترین جوڑا اپنے لئے منتخب کیا۔ بوڑھا مُلازم تابُوت کو مکان کے عقبی حصہ میں رکھ آیا۔ اور سارا گھر نہایت سلیقہ سے سجا دیا گیا۔

اُس رات وہ عورت اور شہزادہ دونوں مل کر سامنے والے بڑے کمرے میں آئے جو پھولوں سے بسا ہوا تھا اور موم بتیوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا یہاں کچھ مذہبی رسمیں ادا کی گئیں۔ تب وہ اندرونی کمرے میں پہنچے۔ جہاں اس نئے شادی شدہ جوڑے کیلئے دعوتی کھانا میز پر چنا ہوا تھا۔

یہ رسمیں ابھی جاری تھیں کہ شہزادہ پر اچانک بیماری کا دورہ ہوا اور کچھ دیر میں وہ دم توڑتا دکھائی دینے لگا۔ چوانگ کی بیوی بہت حیران ہوئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جائے۔

بوڑھے ملازم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا کہ شہزادہ کو کبھی کبھی اس عجیب غریب بیماری کا دورہ پڑ جاتا ہے اور اس پر

غالب آنے کا واحد علاج یہ ہے اسے انسان کا مغز گرم شراب کے ساتھ کھلایا جائے۔ عموماً یہ مغز اُس شخص سے حاصل کیا جاتا ہے جس کو کسی جرم میں پھانسی دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں پہاڑوں میں یہ کیسے دستیاب ہو سکتا ہے۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی "کیا کسی مرے ہوئے شخص کا بھیجا اس مقصد کے لئے کارآمد نہ ہوگا؟"

"ہاں اگر اس کو مرکر ۷ ہفتے نہ ہوئے ہوں"۔ یہ بوڑھے شخص کا جواب تھا۔

"تب ہم کیوں نہ چوانگ کے بھیجے کو کام میں لائیں؛ اُسے مرکر ابھی صرف چار ہی ہفتے تو ہوئے ہیں"۔ عورت کے دل سے نکلے ہوئے یہ الفاظ تھے۔

"مجھے یہ خوف تھا کہ آپ ہمیں ایسا نہ کرنے دیں گی"۔ وہ بولا "اس میں کوئی حرج کی بات نہیں — ایک مُردہ جسم کو جس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں۔ میرے شوہر کی جان بچانے کے لئے کام میں لانا کیا بُرا ہے"۔

عورت نے بوڑھے مُلازم کو شہزادے کے پاس رہنے کا حکم دیا اور خود قندیل اور ایک کلہاڑی لیکر اُس پُرانے چھوٹے مکان میں گئی جہاں چوانگ کی لاش کا تابوت رکھا تھا۔

قندیل کو تابوت کے پائینتی کی طرف رکھ کر وہ دوسرے کنارے پہ گئی اور کلہاڑی سے ٹھوکنے لگی۔ کچھ دیر بعد تابوت کھل گیا۔

وہ اب سر کے بالکل قریب آ بیٹھی لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ چوانگ ایک گہری سانس لیکر تابوت کے اندر اُٹھ بیٹھا۔ خوف سے کلہاڑی ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تب چوانگ کے مُنہ سے ایک نحیف آواز نکلی وہ تابوت سے نکلنے کے لئے مدد مانگ رہا تھا۔ اس کو اپنا ہاتھ دینا پڑا اور جب وہ باہر نکل کر چلنے لگا تو وہ قندیل لیکر اُس کے پیچھے اُس کمرے کی طرف چلی جہاں وہ شہزادہ اور مُلازم کو چھوڑ آئی تھی۔ لیکن وہ خلاف توقع جا چکے تھے۔ چوانگ کی بیوی نے فوراً موقع کے لحاظ سے ایک کہانی بنائی۔

"آپ کے مرنے کے دن سے آج تک میں تمہیں برابر یاد کرتی رہی آج تابوت سے کچھ آواز آتی معلوم ہوئی اور مجھے فوراً یہ توقع بندھ گئی کہ آپ زندہ ہیں اور اس دُنیا میں دوبارہ آرہے ہو۔ پُرانے زمانے میں ایسے واقعات ہُوا کرتے تھے — ہاں تو میں نے تنہائی کوشش کے بعد تابوت کھولا۔ اُف اس وقت آپ کو اپنے ساتھ پاکر مجھے کتنی خوشی ہورہی ہے"۔

چوانگ نے کہا "تمہاری اس مہربانی کا میں شکر گزار ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے آج رات اتنے اچھے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟"

"بات یہ ہے" عورت بولی "ازمنہ گزشتہ میں جب کوئی مرا ہوا انسان دوبارہ زندہ ہوکر آتا تھا تو لوگ ایسے مسرت کے موقع پہ اپنا بہترین لباس پہنا کرتے تھے"۔

"لیکن" چوانگ نے پھر پوچھا "تم نے میرا تابوت پرانے مکان میں کیوں رکھوا دیا تھا۔ کیا یہ بھی کوئی خوشی کی علامت ہے"؟

اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

میز پر عمدہ عمدہ کھانے چُنے دیکھ کر بھوکا چوانگ بیٹھ گیا اور کھانے لگا۔ چوانگ کی بیوی اس عرصے میں اپنے خوف کو آرام دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ چوانگ اچانک بولا۔

"دیکھو شہزادہ اپنے مُلازم کے ساتھ آرہا ہے!"

اُس نے دیکھا وہ دونوں کمرے میں داخل ہورہے تھے۔ اُس کا دل سینے میں شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھ میں کچھ دُھند آتا تھا پھر جب وہ پلٹی تو اُس نے دیکھا چوانگ غائب تھا۔ دوسرے لمحہ میں شہزادہ اور اُس کے مُلازم جا چکے تھے اور چوانگ دوبارہ کمرے میں موجود تھا۔

خوف اور ندامت نے اُسے بیمار کر دیا اور وہ صبح ہوتے ہی مر گئی۔ چوانگ کو اُس کے مرنے کا کوئی غم نہ ہوا۔ اُس نے پانی کا ایک برتن لیا اور اس کو چھوتے ہوئے یہ اشعار پڑھے:۔

محبت حسین لیکن جھوٹی ہے۔
اور اسطرح تبدیل ہوتی ہے جیسے جوانی پیری میں
پنکھے اور چاقو بہت جلد آئیں گے
اگرچہ تمہاری ہڈیاں ابھی سرد نہ ہوئی ہوں
زمین پر بسنے والوں کے یہ رواج ہیں
خواہ وہ معمولی انسان ہوں یا خدا ترس لوگ ہوں

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے گھر کو آگ لگا دی اور خود پہاڑوں میں چلا گیا۔ پھر کسی نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔

عورتوں کی لیکوریا کی بیماری کا صرف ایک ہی علاج ہے

روک

"دوا استعمال کرنیکے تیسرے دن پانی گرنا بند ہوجاتاہے
ہزارہا عورتوں پر تجربہ ہوا اور ہر عورت کو تندرست کردیا
اس دوا کا نام "روک" ہے۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپے"

اگر کوئی عورت لیکوریا یعنی سیلان الرحم کی بیمار ہے اور پانی گرتا ہے تو اس کے لئے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا مشورہ یہی ہوتاہے کہ دوا "روک" کی ایک شیشی استعمال کرے۔ مرض کی بنیاد ختم ہوجائے گی لیکوریا کا سو فیصدی علاج ثابت ہوا ہے۔ ایک عورت کے لئے ایک شیشی بالکل کافی ہوتی ہے۔ اس کی قیمت تین روپے ہے۔ مندرجہ ذیل پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی پی پارسل منگائیں۔ آپ کو گھر بیٹھے دوا پہونچ جائے گی۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگے گا۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ اے بی ۲۶ دہلی

تار کا پتہ: زنانہ دواخانہ دہلی — ٹیلیفون نمبر

تنقیدی مقالہ

شاد کا مرثیہ شباب

از جناب عطاء اللہ پالوی

اُن تمام نعمتوں میں سے جو ہم انسانوں کو عطا ہوئی ہیں میرے نزدیک سب سے گرانقدر اور بیش بہا نعمت برنائی، شباب یو جوانی ہے، جو ہر وقت، ہر ساعت اور ہر لمحہ یہی گنگنایا کرتی ہے کہ ؎

غوف فتوا ہے میری رنگیں شریعت میں حرام

غالب مرحوم نے کہا ہے کہ ؎

تنگدستی اگر نہ ہو غالبؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

میری کیا مجال اور کیا تاب وطاقت ہے جو یہ کہہ سکوں کہ یہ درست نہیں۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ جس کو "جوانی" کی سرمستیاں حاصل نہیں اُسے دولت کی فراوانی کون سے حظ لطفِ نفس مہیا کر سکتی ہے؟ جسکو "شباب" کی حشر انگیزیاں میسر نہیں اس کو صحت کی نعمت کونسے جسمانی لذائذ بہم پہنچا سکتی ہے؟ "صحت" ہو یا "دولت" دونوں کا لطف جب ہی ہے کہ شباب کی رعنائیاں اور جوانی کی قیامت زائیاں بھی ہمکنار ہوں۔ بلکہ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ ؎

نہ صحت، نہ دولت، نہ حشمت کی پروا
جوانی میسر ہو گر جاودانی

ایک نوجوان شاعر نے تو "لازوال جوانی" کی نعمت حاصل ہوجانے پر خلاقِ اعظم کو یہاں تک چیلنج دیدیا ہے کہ ؎

جوانی اگر جاوداں ہو تو یارب
تری سادہ دُنیا کو جنت بنادیں

واقعہ یہ ہے کہ دُنیا کو جنت بناڈالنے کے لئے نہ دولت کی ضرورت ہے نہ صحت کی بلکہ صرف جوانی کی۔ کیوں نہ ہو؟ چودھواں سال ختم ہوتے ہی "شباب" جس وقت اپنی حسین جاذبیتوں کے ساتھ مطلعِ آفتاب کی طرح اُفقِ حیات پر طلوع ہوتا ہے اُس وقت اسکی رنگین کرنیں گلستانِ شوق میں کیسی کیسی حسین بوقلمونیاں پیدا کردیتی ہیں؟ پھر جب پچیسویں برس کی ابتدا ہوتی ہے اور "جوانی" اپنی تمام وکمال رنگین اداؤں کے ساتھ عروسِ نیمروز کی طرح اپنا گھونگھٹ ہٹا کے بے حجاب ہوجاتی ہے، اس وقت محشرستانِ جذبات میں کیسی ہلچل پڑجاتی ہے! پڑنی ہی چاہئے۔ جوانی دراصل زندگی اور عُمر کے ایک خاص ساحرانہ اور قاہرانہ عظمت وشوکت رکھنے والے وقفے کا نام ہے بالفاظ دیگر جوانی ایک دریا ہے جسکی عظمت وشوکت اسی میں ہے کہ جس وقت وہ کف دردہاں ہو اُس وقت سارے بحر وبر کو ایک کردے۔

"جوانی" ایک سرشار بادل ہے جس کا حُسن صرف اسی میں ہے کہ وہ جس وقت جھوم کر اُٹھے، ساری دُنیا کو جل تھل کردے۔ یہ جوانی فی الحقیقت ایک طوفان ہے جس کی خوبی صرف یہی ہے کہ وہ جس وقت بپا ہو اُس وقت بحر و بر اور شجر وحجر کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ "جوانی" دراصل ماہِ منیر اور آفتابِ ہجیر ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ فلکِ حیات پر جلوہ گر ہوتے ہی کائناتِ زیست کو بقعۂ نور اور طبقِ زر بنادے۔ "جوانی" اگر سچ پوچھئے تو نام ہے اُس بے خطر ولولے کا جو ایک مستانہ مسحوریت اور ایک الہامی مسکوریت کیساتھ ہمیشہ یوں دھاڑا کرتا ہے ؎

نہ ڈر تنقیدِ عالم کا، نہ خوفِ حشر داور ہے
جوانی ڈھالتی ہے مجکو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں

"جوانی" خجالت وندامت کے سمندر میں اس طرح کبھی بھی غرق نہیں دیکھی گئی کہ ؎

ساعدِ سیمیں دونوں اُسکے ہاتھوں میں لاکر چھوڑ دئیے
بھولے اُس کے قول وقسم پر ہائے خیالِ خام کیا[1]

[1] میر بیچارے سے تو کسی لے دھوکہ دیکر اپنی کلائی چھڑالی تھی جس کی پشیمانی اس شعر کی صورت میں بقائے دوام حاصل کرگئی ہے۔ لیکن ایک صاحب ایسے بھی ہوئے ہیں جو کسی سے زبردستی ہاتھ چھوڑا کر خود بھاگتے تھے اور اسکی پاداش میں ان کا گریز یوں غیر فانی نقش کی حیثیت اختیار کرگیا ہے ؎

ہاتھ چھڑائے جات ہو سو نبل جان کے موسے
ہردے سے جاؤگے تو مرد بندگی تو سے

یعنی مجھے کمزور سمجھ کے اپنی ہاتھ چھڑاکر بھاگے تو جا سہے ہو مگر کیا میرے دل سے بھی بھاگ کر کہیں جاؤگے؟ وہاں سے بھاگو تب میں جانوں کہ تم مرد ہو۔

بلکہ اس کا پرکیف جاہ و جلال اور نشاط انگیز فضل و کمال ہمیشہ یہی راگ پڑھایا کیا ہے کہ ؎

ادیم شدہ است شیریں لب
آستینش بگیر و شمع بکش!

کیوں نہ ہو غور کرنے کی چیز ہے کہ اگر نور میں شرار اور ماہتاب سطح نیل پر ابھرے لیکن اس کی ضیا باریاں شجر و حجر کو کرۂ نور میں نہ تبدیل کر سکیں تو پھر اس کی جلوہ آرائیاں کس کام کی ہیں؟ اگر مہر فرخ و مخمور بادل خمخانۂ دھر سے نکل کر فضائے آسمانی میں جھومتا اور اٹھکھیلیاں کرتا ہوا پہنچے مگر وہ تپتے ہوئے صحرا اور جلتے ہوئے ریگستان کو غرق آب نہ کر سکے تو اس کی سرشاریاں کیا حقیقت رکھتی ہیں؟ اگر ایک مغنی محفل نشاط میں موجود ہو مگر اپنے الفاظ کے زیر و بم اور آواز کے مد و جزر سے مجلس کی مجلس کو مست و بیخود نہ بنا سکے تو اس کی نوا سنجیاں کیا عظمت رکھتی ہیں؟ اگر ایک شاعر افق ادب پر طلوع ہو کر اپنے سحر آگیں نغموں اور سحر آگیں ترانوں سے سننے والوں کے دلوں میں آگ نہ لگا سکے تو اس کی زمزمہ پردازیاں کیا وقعت رکھتی ہیں؟ اگر ایک بے مثال دوشیزہ ریاض حرم سے نکل کر اپنے جلال تمام حسن سے دنیا میں قیامت برپا نہیں کر سکتی تو اس کی کفر سامانیاں کیا پایہ رکھتی ہیں؟ پھر الغرض جوانی اور الغرض شباب جب اپنی عظمت و قوت کے جوہر نہیں دکھا سکتا تو اس کا غلغلہ اور ہمہمہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اسی لئے "جوانی" سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب بار ہا بڑے بڑوں نے دی ہے۔ سعدی ہی کو لیجئے۔ بوستاں کے گلزار صفحات پر کیسے پرشفقت انداز میں یہ نقش مرتسم کر گئے ہیں ؎

جوانا! رہ طاعت امروز گیر — کہ فردا جوانی نیاید ز پیر
فراغ دلت ہست و نیروئے تن — چو میداں فراخ است گوئے بزن
من آں روز را قدر نشناختم — بدانستم اکنوں کہ در باختم
قضا روزگارے ز من در ربود — کہ ہر روزے از وے شب قدر بود
چہ کوشش کند پیر خر زیر بار — تو میرو کہ بر باد پائی سوار
شکستہ قدح گر بہ بندد درست — نیاورد خواہد بہائے درست
کنوں کوفتادت بہ غفلت ز دست — طریقے ندارد بجز باز بست
بہ غفلت بدادم ز دست آب پاک — چہ چارہ کنوں جز تیمم بہ خاک

مگر آج تک شباب کی قدر کسی شاعر نے ... ایسی بے قدری بھی میری نظر سے ابتک نہیں گزری ؎

ازل میں موقع جو ہم کو ملتا تو اپنے خالق سے عرض کرتے
کہ حسرتوں کا ہے یہ زمانہ، شباب ہم لیکے کیا کرینگے

بالکل اسی طرح یادِ جوانی اور مرثیۂ شباب پر بہتیروں نے زور قلم صرف کیا ہے خود سعدی ہی کو دیکھئے۔ حکایتی انداز میں کیا کچھ کہہ گئے ہیں ؎

کہن سال آمد بہ نزدِ طبیب — ز نالیدنش تا بہ مردن قریب
کہ دستم بہ رگ بر نہ اے نیک رائے — کہ پایم ہمی بر نیاید ز جائے
بداں ماند ایں قامت چفتہ ام — کہ گوئی بہ گل در فرو رفتہ ام

یہ سنکر طبیب نے فوراً ہی کہا ؎

بدو گفت دست از جہاں بر گسل — کہ پایت قیامت بر آید ز گل
چو دوران عمر از چہل بر گزشت — مزن دست و پا کآبت از سر گزشت

طبیب کا یہ جواب سنکر بڈھے مریض کو سکتہ سا لگ گیا، دل بیٹھ گیا، آنکھ میں آنسو بھر آئے اور وہ تڑپ اٹھا ؎

دریغا کہ فصل جوانی گزشت — بہ لہو و لعب زندگانی گزشت
دریغا چناں روح پرور زماں — کہ بگزشت بر ما چو برق یماں[1]
نشاط از من رمیدن گرفت — کہ شامم سپیدہ دمیدن گرفت
بہ سبزی کجا تازہ گردد دلم — کہ سبزی بخواہد دمید از گلم
تفرج کناں در ہوا و ہوس — گزشتیم بر خاک بسیار کس
کسانیکہ دیگر بہ غیب اندر اند — بیایند و بر خاک ما بگزرند

سعدی کو چھوڑیئے، اردو میں بھی سینکڑوں نے اس موضوع پر آنسو بہائے ہیں مگر شاد کی سی حسرتناک اور دلگداز "یادِ جوانی" ابتک میری نظر سے نہیں گزری ایسا دردناک اور الم انگیز مرثیۂ شباب تادم تحریر میں نے کہیں نہ دیکھا۔ چند شعر سنئے ؎

ایک ایک ستم اور لاکھوں ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
اپنی ادا سے آپ جھجکنا اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا
چال میں لغزش منہ پہ حیائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
کالی گھٹائیں باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قابض آپ ستائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

~~~

ہجر میں اپنا اور ہی عالم، ابر بہاراں دیدۂ پرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے

---

[1] سیل یمانی تو بہت سنا تھا مگر "برق یمانی" صرف سعدی کے یہاں دیکھا ہے
~~~

جونہیں جاتا اس کی دُعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
تھا، نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈھ کے لائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

ان پہلے شعروں میں شاعر نے ان چند کفر سامانیوں کو ایک دلپذیر انداز اور پُر حلاوت الفاظ میں یاد کیا ہے جو سازِ شباب میں مضراب کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کا ادنیٰ سا مس اور لمس جسم میں ایک طوفان بدوش کھلبلی اور ایک محشر بکنار ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔

موسم گرما کی ایک معطر و معنبر رات، شراب و شعر میں ڈوبی اور بسی ہوئی اپنی رعنائیوں سے نوجوان شاعر کو دعوت سیر دیتی ہے۔ شاعر بھی کچھ گنگناتا ہوا بڑھتا ہے یکایک اسے ایک مرقعِ حسن لو مجسمۂ جمال دوشیزہ ترچھی نگاہ اور تنگ قبا کے آلات و اسلحہ سے مرصع و مسلح اس طرح محوِ خرام نظر آتی ہے کہ کبھی تو اپنی زاہد شکار اداؤں سے خود شرما اور لجا کر جھجک جھجک جاتی ہے اور کبھی خمارِ شباب اور کیف جوانی سے مسحور و مسکور ہو کر اتنی بے خبر ہو جاتی ہے کہ اپنے گلفشاں پیرہن کی ہوا اور زرافشاں کپڑے کی سرسراہٹ سے خود ہی چونک چونک کر ٹھٹک ٹھٹک جاتی ہے۔ آپ آپ ہی خود غور کیجئے کہ یہ سماں بھی بھلایا جا سکتا ہے؟

کالی گھٹا موتیوں کا تھال سر پہ لئے کھڑی ہے۔ رم جھم پانی برس رہا ہے۔ ایک پھلواری میں جھولا پڑا ہے۔ نورِ حسن میں تر بتر دوشیزائیں اس شان سے محوِ نشاط ہیں کہ رنگِ رخ جوانی کی شادابیوں سے نکھرا ہوا ہے گیسو ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ سر پہ دھانی دوپٹے پڑے ہوئے ہوا سے اٹھکیلیوں میں اس طرح مصروف ہیں کہ بار بار رازِ شباب آشکارا ہوا جاتا ہے۔ شاعر یہ رُت دیکھ کر یکایک چلا اُٹھتا ہے ؎

ارم سے کھنچ کے بہاریں زمیں پہ آئی ہیں — یہ کس کے ہاتھوں نے صناعیاں دکھائی ہیں
جمال بخشِ تماشائیاں فلک کی جنت ہے — نظر کی گود میں تھاں فلک کی جنت ہے
نظر نواز ہے تزئین بے خبر اس دم — شعاعِ گوہر و انجم ہے ہر نظر اس دم
فضا کی مست سہانے میں مے پرستی ہے — نشاط و عیش میں ڈوبی ہر ایک ہستی ہے

یکایک ان لوگوں کی بھی نظر ادھر اُدھر اٹھ جاتی ہے اور وہ دیکھ کر ایک نوجوان شاعر کی بیباک نظریں ان کی حریمِ ناز میں تاک جھانک کر رہی ہیں، جوشِ غیرت اور فرطِ حیا سے اپنی اپنی نظریں نیچی کر لیتی ہیں اور بہ مشکل تمام اسے دخل اندازی سے روک لیتی ہیں۔

اب آپ ہی سوچئے کہ اس طرح کا منظر اور رنگ راگ کبھی بھی دل محو ہونے کی چیز ہے؟ پھر ایک شاعر جوانی کی رعنائیاں کھو بیٹھنے کے بعد بھی ان کبھی نہ بھولنے والی باتوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہے؟ "خمارِ شباب" کو "تاریخِ شیب" دُور کر چکا ہے اب ایک ایک چیز اسے یاد آ رہی ہے اور تڑپا رہی ہے یہاں تک کہ اپنا بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ؎

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جاتا اسکی دُعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاعر بیتاب ہو جاتا ہے۔ تلملا اٹھتا ہے اور بڑی ہی حسرت و یاس سے چلا اٹھتا ہے کہ ؎

تجھ کو کہاں سے ڈھونڈھ کے لائیں
اُف ری جوانی، ہائے زمانے

اس میں جو درد و کسک، سوز و اضطراب اور حسرت و بیچارگی کروٹیں لے رہی ہے اس کی نشتریت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود اس وقت اسی دَور سے گزر رہے ہیں۔



ہائے ناکامیاں محبّت کی

حسرت انجام افسانہ

از جناب آسی رام نگری

"پدما!"
"کنول"
"گاؤ گی نہیں؟"
"گاؤں۔ اگر تمہارا حکم ہو"۔
"میرا حکم یا تمہاری مرضی ۔۔۔؟"
"دونوں ایک ہی صورتیں ہیں کنول!" پدما ہنس پڑی۔
"بولو کیا گاؤں؟"
"وہی جو اُس روز گا رہی تھیں"۔
پدما کوئل کی طرح کوک اُٹھی ۔۔۔۔
"پریم کی مُرلی مدھر بجی"۔
"نہیں" کنول نے سر ہلایا۔
"میرے آنگن میں آؤ ساجن؟"
"اوں ہوں"۔
"شیام کی بنسی کوک رہی؟"
"نہیں"۔
"پھول سجن تم میرو من؟"
"نہیں نہیں"۔ کنول نے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔
"یہ بھی نہیں۔ وہ بھی نہیں۔ تو پھر کیا گاؤں؟" پدما جھنجھلا اُٹھی
"وہ کیوں نہیں گاتیں۔ دیکھو اب مجھے یاد آ رہا ہے"!
"کون سا ۔۔۔؟" اس نے بڑا اشتیاق انداز سے پوچھا۔
"نیا کرو بیڑا پار میری" کنول نے گا کر سنایا۔
"اوہو تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میری اتنی محنت فضول ہی گئی"۔
"واہ ری محنت! بڑی نازک ہو پدما!"
"اور نہیں تو کیا گاما ہوں؟"
دونوں ہنس پڑے ۔۔۔ وائلن کے تاروں پر انگلیاں تیرنے لگیں ۔۔۔
"نیا کرو بیڑا پار میری
جگ جھوٹ کے ڈوب رہی ہے
بھو ساگر منجدھار میری"
کنول ذوق کیف سے جھومنے لگا۔ پدما کی موہنی صورت اور رسیلی آواز میں بلا کا جادو تھا۔
دفعتہً فون کی گھنٹی بجی۔ بے دلی سے وائلن رکھ کر پدما نے دوسرے کمرے میں جا کر ریسیور اُٹھایا ۔۔۔
"ہلو۔ کون؟ لیلا؟"
"ہاں ڈاکٹر سریندر آئے ہوئے ہیں"۔
"تو میں کیا کروں؟"
"وہ تمہیں بُلا رہے ہیں"۔
"مجھے بُلا رہے ہیں ۔۔۔؟"
"ہاں"۔
"کیوں ۔۔۔؟"
"میں کیا جانوں"۔
"پھر بھی"!
"کوئی ضروری کام ہو گا"۔
"لیکن میں اس وقت نہیں آسکتی"۔
"کیوں؟"
"کنول بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر بھلا ۔ ۔ ۔"
"میری اچھی پدما۔ صرف چند پل کے لئے آجاؤ"۔
"آؤں گی"۔
"کب ۔۔۔؟"
"جب فرصت ملے گی"۔
"کیا ابھی کچھ دیر کے لئے نہیں آسکتیں؟"
"نہیں ۔ ۔ ۔"
"دیکھو تمہاری سرد مہری سے ناراض ہو کر سریندر بابو جا رہے ہیں"۔
"اچھا آ رہی ہوں۔ انتظار کرو۔ نمستے"۔

جواب کا انتظار کئے بغیر پدما نے ریسیور رکھدیا اور جاکر وائلن اٹھالیا۔ لیکن اس کی انگلیوں میں پہلی بات نہ تھی۔ اسکے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ بڑی کشمکش میں مبتلا تھی۔ سوچ رہی تھی کس کا دل توڑے کس کا جوڑے ــــ؟ سریندر اور کنول، دونوں اسکی نگاہوں میں یکساں تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں کنول کی سادگی اور نیکدلی نے پدما کے دل پر ایک غیر فانی مہر ثبت کردی تھی، اور وہ دولتمند سریندر کے مقابلے میں مفلس کنول کے لئے اپنے دل میں زیادہ جگہ پاتی تھی۔

پدما کو افسردہ دیکھ کر کنول نے پوچھا ــ "کون تھا پدما؟"

"پتا جی۔ سریندر آئے ہیں۔"

"تو ــــ؟"

"مجھے بلا رہے ہیں۔"

"تو تمہیں جانا چاہئے۔"

"چلی جاؤں گی۔ ایسی جلدی کیا ہے؟" کہکر پدما وائلن بجانے لگی۔

کنول پھر عالم از خود رفتگی میں خود کو بھول گیا۔ وہ گا رہی تھی

دین کے رکھوار تمہیں ہو
نربل کے آدھار . . . .

دفعتہً "بابو۔ بابو" کی آواز سنکر کنول چونک اٹھا۔ دینو کو گھبرایا ہوا دیکھکر ایک لامعلوم خوف و ہراس سے اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ "دینو کیسے آیا ــــ؟"

"ماں جی کو خون کی قے ہوئی ہے۔"

"خون کی ــــ؟" کنول نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن اب طبیعت سنبھل گئی ہے میں ڈاکٹر کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

دینو چلا گیا۔ کنول اٹھنے لگا۔ پدما نے وائلن بند کرتے ہوئے پوچھا ــ "تو جا رہے ہو کنول؟"

"ہاں ماں کی حالت روز بروز گرتی ہی جا رہی ہے۔"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"پہاڑ پر لے جانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

"تو لے کیوں نہیں جاتے؟"

"پدما . . . . !" کنول نے بھاری آواز میں کہا ــ "کیسے لے جاؤں؟ تم تو میری مالی حالت سے واقف ہو۔"

"جانتی ہوں کنول۔ لیکن دنیا میں ماں سے بڑھکر اور کون بھی ہوتا ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہو پدما۔ میری دنیا تو ماں ہی تک محدود ہے۔ ماں کے بعد میرا اپنا کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا . . . .؟"

"کیا کہا ــ؟ کوئی بھی نہ ہوگا؟"

"ہاں ان کے علاوہ ہے ہی کون؟"

"کیوں کوس رہے ہو کنول؟"

"میں کسے کوسوں گا پدما؟ میری قسمت تو خود مجھ سے روٹھ رہی ہے۔"

"اور کسے کوسو گے۔ مجھے تو کوس رہے ہو۔"

"تمہیں ــــ؟"

"اور کسے؟"

"وہ کیسے ــــ؟"

"تمہیں تو کہہ رہے تھے کہ ماں کے بعد میرا اپنا کہنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تو کیا میں تمہاری نہیں ہوں ــــ؟"

"ہو۔ لیکن کب تک؟"

"کب تک سے کیا مطلب ــــ؟"

"شادی ہو جانے کے بعد تم بھی تو مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔"

"میں چھوڑ کر چلی جاؤں گی یا تم ــــ؟"

"میں کہاں جاؤں گا پدما؟" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"تو میں ہی کہاں جا رہی ہوں۔" پدما نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا ــ "میں آج قسم کھا کر کہتی ہوں" ــ وہ اب کچھ سنجیدہ ہو چلی تھی ــ "کہ اس زندگی میں ہمیں کوئی طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ سماج کے بندھن بھی ہمیں نہ باندھ سکیں گے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں پدما۔ سماج کی چکی میں ایک روز سبھی کو پسنا پڑتا ہے۔ اچھا تو رخصت . . . ."

"ہاں تو کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا ہوتا۔ اگر میں اپنی جان دے کر بھی ماں کو بچا سکتا تو اس سے ہرگز دریغ نہ کرتا۔ لیکن میری مالی حالت مجھے مجبور بنا رہی ہے۔ ماں کو مرتا ہوا دیکھ رہا ہوں لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔" ایک ٹھنڈی سانس لیکر کنول نے سر جھکا لیا۔

"اگر تم اب بھی چاہو تو ماں کو بچا سکتے ہو۔"

"وہ کیسے ——؟"

"ابھی بتاتی ہوں" کہکر پدما جلدی سے اندر چلی گئی۔ کنول حیران تھا۔ ماں کی خطرناک حالت پھر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ وہ کانپ اٹھا۔ اور کھڑا ہو گیا۔

"ٹھہرو کنول!" کہتے ہوئے پدما نے دو سو کے نوٹ میز پر رکھ دیئے

"یہ کیا پدما ——؟" کنول نے متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماں کی خدمت کے لئے میری یہ حقیر پیش کش ہے! انہیں لیکر فوراً پہاڑ چلے جاؤ"

"لیکن میں یہ روپے یوں نہ لے سکوں گا پدما!"

"تو کیسے لوگے ——؟"

"قرض کے طور پر"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کنول؟ میں تمہیں قرض دونگی؟ میں کوئی ساہوکار۔ زمیندار یا کسی بنک کی ایجنٹ ہوں؟"

"کچھ بھی ہو لیکن میں یوں روپے نہیں لے سکتا"

"تمہیں دے ہی کب رہی ہوں۔ کیا ماں کی خدمت کے مستحق تمہی ہو میں نہیں؟ بولو۔ جواب دو۔ اُف مجھے یقین نہ تھا کہ تم اتنے تنگ دل ہو۔ آج تمہارے اس برتاؤ سے میرے دل کو اذیت پہنچی ہے۔ اسے لفظوں میں نہیں بیان کر سکتی"

"پدما .....!" کنول نے قدرے شرمندہ ہو کر کہا۔

"کنول! میں تم میں اور اپنے میں کوئی غیریت نہیں محسوس کرتی۔ ہم ایک جان دو قالب سمجھتی ہوں۔ لیکن تم مجھے پرایا سمجھتے ہو مجھے معلوم نہ تھا"

"آخر کب تک شرمندہ کرو گی پدما؟ اس غلطی کی کوئی سزا بھی ہے؟"

"ہاں ہے۔ وہ یہی کہ ان روپوں سے ماں کی بے لوث خدمت کرو۔ بولو کب جاؤ گے؟"

"پرسوں ....." کنول نے کچھ سوچ کر کہا۔

"میں کل ماں سے ملنے آؤں گی"

"اچھا اب اجازت دو پدما" نوٹوں کے بنڈل اٹھاتے ہوئے کہا —— "میں کن لفظوں میں تمہارے اس احسان کا شکریہ ادا کروں؟ یہ ایسا بار ہے جس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا"

"اچھا جاؤ زیادہ باتیں نہ بناؤ"

پدما اور کنول دونوں ہنس پڑے ——

"نمستے"

"نمستے"

"ماں! ماں!!" کنول نے شانہ ہلا کر پکارا۔ مریضہ نے کروٹ بدلی۔

"کنول تو آ گیا؟"

"ہاں کیسی طبیعت ہے ماں؟"

"اچھی ہے۔ جی رہی ہوں ...."

"لو اٹھو دوا پی لو" ویمن کے ہاتھ سے دوا لیتے ہوئے کنول نے کہا۔

"دوا ——؟ کب تک پلائیگا کنول!"

"جب تک تمہیں اچھا نہ کر لوں گا"

"اچھا ——؟" مریضہ نے تعجب سے پوچھا، اور ایک افسردہ ہنسی اس کے لبوں پر کھیل گئی۔ وہ اٹھی اور غٹ غٹ کرکے دوا پی گئی۔ کنول نے اسے ویسے ہی پھر لٹا دیا۔

"کنول! میں اب اچھی نہ ہو سکونگی" مریضہ نے حسرت آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو ماں؟" کنول نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں تمہیں اچھا کر کے دم لوں گا۔ چاہے جان ہی کی بازی کیوں نہ لگانی پڑے۔ تمہارے سوا اس بھری دنیا میں میرا ہے ہی کون؟"

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں کی نازک حالت دیکھ دیکھ کر اس کا دل کئی دنوں سے بھاری ہو رہا تھا۔ رونے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی رو نہ سکا تھا۔ لیکن آج ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔

"رو نہ کنول رو نہ۔ میں تو ہنسی کر رہی تھی"

مریضہ نے اپنی آنکھوں کے آنسو آنکھوں ہی میں چھپا لئے ——

"ایسا کبھی خواب میں بھی نہ سوچنا ماں" کنول نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا —— "میرے لئے تمہیں جینا ہی پڑیگا۔ نہیں تو تمہارا پیارا کنول ...."

"چل ہٹ ....." مریضہ نے درمیان ہی میں روک کر کہا —— "ایسا نہیں کہا کرتے بیٹا۔ پرماتما کریں تو ہزار برس جئے"

"تم جینے دو جب نا"

ماں بیٹے دونوں مسکرا دیئے ——

"پرسوں ہم پہاڑ پر چلیں گے ماں" کنول نے پُراشتیاق

نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"پہاڑ؟ کیوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ڈاکٹر تمہیں آب ہوا تبدیل کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

"نہیں میں یہیں اچھی ہو جاؤنگی، ہمارے پاس اتنی دولت کہاں ہے جو وہاں کا خرچ برداشت کر سکیں گے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے روپوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ یہ دیکھو دو سو کے نوٹ ہیں!"

"دو سو کے نوٹ ۔۔۔؟" ماں نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں سے آئے؟ کیا قرض لیا ہے؟"

"تو کیا چوری کی ہے ۔۔۔؟"

"نہیں۔" وہ ہنس پڑا۔

"نہیں۔ نہیں" ماں جھلا اٹھی ۔۔۔ "تو بتاتا کیوں نہیں؟ کہاں سے آئے ۔ اپنا تو کوئی بیٹھا نہیں۔"

"پدما اپنی نہیں ہے ماں؟"

"اسی نے دیئے ہیں ۔۔۔؟"

"ہاں۔"

"مانگے ہوں گے ....؟"

"نہیں اس نے از خود تمہارے علاج کے لئے زبردستی دیئے ہیں، وہ تو ہماری حالت جانتی ہے۔"

"اس سے چھپا ہی کیا ہے۔" مریضہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی ۔۔۔ "سچ مچ پدما بڑی لائق اور فراخ دل لڑکی ہے۔ پرماتما نے اسے بچپن ہی میں ماں کے سایہ سے محروم کر دیا۔ کنول اگر پدما جیسی بہو مجھے ملتی۔ تو آج مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑنے کا دکھ مجھے نہ ہوتا۔"

"تم مجھے چھوڑ کر جا ہی کہاں رہی ہو؟"

"کہیں نہیں" مریضہ نے بات کا رخ بدل دیا ۔۔۔ "اگر آج پدما کی ماں جیتی ہوتی تو پدما یقیناً اس گھر کی زینت بنتی۔ لیکن ....." اس نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا ۔۔۔ "اب نردھن کے گھر کبھی بہو آ سکتی ہیں؟"

"پدما آ جائیں تو ۔۔۔؟"

"ایسی قسمت کہاں؟" مریضہ خاموش ہو گئی۔ اور خیالات کی گہرائی میں ڈوب گئی۔

ماں کے الفاظ کنول کے کانوں میں گونجنے لگے ۔۔۔ "کنول اگر پدما جیسی بہو مجھے ملتی۔ تو آج مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑنے کا دکھ مجھے نہ ہوتا۔" ماں کو پدما پر اتنا بھروسہ ہے۔ اس سے اتنی محبت ہے۔ سچ مچ کہیں پدما آ جائے تو ماں کتنی خوش ہوں؟ ان کی علالت آج ہی صحت میں تبدیل ہو جائے۔ تو کیا پدما آ سکتی ہے ۔۔۔؟ ضرور آئیگی۔ اسی نے تو کہا ہے میں قسم کھا کر کہتی ہوں اس زندگی میں کوئی ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتا، سماج کے بندھن بھی ہمیں نہ باندھ سکیں گے ....." کنول فردوسی راحت میں کھو گیا۔

"پدما آئیگی نہیں کنول؟" ماں نے کنول کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کل آنے کے لئے کہا ہے۔"

"ہوں" کہہ کر مریضہ نے دوسری طرف کروٹ بدلی۔ اور کنول پھر اپنے مستقبل کی خوش آیند تصویر بنانے لگا۔

کنول کو پہاڑ پر آئے ایک مہینہ ہو گیا۔ مریضہ کی حالت روز بروز اور بھی گرنے لگی صحت کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی ڈاکٹر ہوا تبدیل کرتے کرتے عاجز آ گئے۔ لیکن برائے نام بھی افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار ایک روز مریضہ کی حالت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے کنول کو الگ بلا کر کہا ۔۔۔ "میں اب تم سے زیادہ نہیں چھپا سکتا مسٹر کنول ....."

"کیا ۔۔۔؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"تمہاری ماں اب ایک یا دو دن کی مہمان ہیں ....."

"کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" کنول کا دل بیٹھ گیا۔

"کیا کروں مسٹر کنول، انسان مجبور ہے۔ میں نے تو کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔"

ڈاکٹر فیس لیکر چلا گیا۔ کنول یاس و حسرت بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ بیک وقت ماضی کی کتنی ہی حسین تصویریں اس کے سامنے پھر گئیں۔ خوفناک بھوت کی طرح تاریک مستقبل منہ کھولے کھڑا تھا۔

"کنول! کنول .....!" ماں نے پکارا۔

سہما کانپتا کنول اس کے سامنے آ گیا ۔۔۔

"ڈاکٹر صاحب گئے؟"

"ہاں"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔ دوا کی ترکیب استعمال سمجھا رہے تھے۔ آج کی

نئی دوائیں دی ہیں۔"

"میں اب کوئی دوا نہ پیوں گی۔"

"کیوں ــــ؟"

"اب مجھے زیادہ دیر تک نہیں جینا ہے۔" ماں نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"جینا پڑیگا۔ ضرور جینا پڑیگا ماں۔ بھگوان اتنے سنگدل نہیں ہیں گے جو تمہیں مجھ سے چھین لیں گے۔"

"ارے اب اخیر وقت میں مجھے دوا پلا کر کیا کریگا کنول؟"

"اچھی ماں اپنے لئے نہیں تو میرے ہی لئے ایک گھونٹ پی لو۔ ہاں مُنہ کھولو۔"

"فضول ضد نہ کر کنول۔" ماں نے بھنویں ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا۔

لیکن کنول نے دوا پلا ہی دی۔ مریضہ ایک طرف مُنہ پھیر کر لیٹ گئی۔ اس کام سے فرصت پا کر کنول پدما کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

"دشمن وفا پدما!

ایک نہیں ــ دو نہیں۔ اس مہینے میں مسلسل پانچ خطوط بھیج چکا ہوں۔ لیکن تم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ واہ ری تمہاری محبت۔ کیا اسی دل سے ایک، جان دو قالب ہونے کا دعویٰ کرتی تھیں؟ تم نے کہا تھا میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس زندگی میں ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ سماج کے بندھن بھی ہمیں نہ باندھ سکیں گے۔ بے مہر پدما! کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے فوری جوش میں آ کر کتنے عہد و پیمان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا نبھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پدما! تم میرے دل کی حالت کیا جانو۔ اس میں ہر وقت ایک طوفان ایک آندھی اٹھا کرتی ہے۔ مایوسیوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتا ترتا رہتا ہوں۔ پھر بھی زندگی کا ہر لمحہ تمہاری یاد تمہارے تصور میں گزرتا ہے۔ دل ہر وقت تمہارے خیال اور تمہاری باتوں میں اُلجھا رہتا ہے۔ اور پدما یقین جانو اگر کچھ دنوں اور یہی حال رہا تو پاگل ہو جاؤنگا لیکن تمہیں اس کی کیا پرواہ ہوگی۔ تمہارے پاس بے مہری و بے وفائی، سنگدلی و کج ادائی کے سوا ہے ہی کیا؟ میرا یہ آخری خط ہے۔ اگر اس کا بھی جواب نہ آیا تو کبھی خواب میں بھی تمہیں خط لکھنے کا گناہ نہ کروں گا۔ اُف تمہاری باتوں میں آ کر میں نے بڑی غلطی کی ہے لیکن اب اس کا ذکر ہی فضول ہے پدما!

ماں کی حالت روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ آج ڈاکٹر نے صاف جواب دے دیا۔ پدما مجھے، کہو ماں کے بعد دُنیا میں میرے رنج و راحت میں شریک ہونے والا۔ مایوسیوں میں تشفی دینے والا، مجھے محبت سے دیکھنے والا کون ہوگا....؟ میں اپنے دل کا درد کس سے کہونگا! آہ... اب نہیں لکھا جاتا.... میرا مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔ کیا تم اپنے پریم کے دیپ لیکر آ سکو گی پدما ــ؟ دو ہی دن کے لئے آجاؤ۔ تمہیں دیکھنے کے لئے ماں کا جی لگا ہوا ہے۔ آجاؤ گی تو اخیر وقت مجھے تمہیں سونپ کر شانتی مر سکینگی...."

تمہارا منتظر

تمہارا کنول

ڈاک میں خط ڈال کر کنول جلد ہی واپس آیا۔ ماں نے پکارا۔

"کنول.... کنول!"

"کیا ہے ماں ــ؟"

"پانی.... ایک گھونٹ پانی پلا دو۔"

کنول نے پانی پلا دیا۔

"ابھی تو یہاں نہیں تھا کنول؟"

"نہیں۔ خط ڈالنے گیا تھا۔"

"کسے لکھا ہے؟"

"پدما کو"

"کیوں ــ؟"

"بلایا ہے۔"

"کیا پدما آ سکے گی ــ؟"

"کیوں نہ آئیگی۔ اگر تم سے ذرا بھی محبت ہے تو ضرور آئیگی۔"

"اچھا ہے۔ آجائے تو میں بھی دیکھ لونگی۔"

مریضہ خاموش ہو گئی۔ کنول اس کے سرہانے بیٹھ کر سر پر تیل ملنے لگا۔ وہ یکایک چونک اُٹھی ــ "یہ کیا کنول ــ؟"

"کیا ہے ماں؟"

"تیرا بدن گرم کیوں ہے؟ کیا بخار ہو گیا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"نہیں تم جھوٹ بول رہا ہے، جا اچھی طرح کپڑے اوڑھ کر لیٹ جا۔"

"تم یوں ہی شک کر رہی ہو ماں، میں بالکل اچھا ہوں۔"

"اچھا تو نہیں جاتا تو لے میں ہی بیٹھ جاتی ہوں۔"

"اچھا اچھا" کہہ کر کنول اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

کنول کے جانے کے بعد پدما کھوئی کھوئی سی باولی سی رہنے لگی ہر وقت کنول کے خیال میں ڈوبی رہنے کے سوا اسے اور کوئی کام نہ تھا اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ ماں باپ سے اس کی یہ حالت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ کنول جیسے مفلس قلاش سے پدما جیسی کنواں بھری بیٹی کا دامن باندھنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کنول کی عدم موجودگی ہی میں ڈاکٹر سریندر سے پدما کی نسبت طے کر دی۔

یہ سن کر پدما کا دل بیٹھ گیا۔ وہ ایک ناقابل برداشت ذہنی اذیت سے کانپ اٹھی۔ اس کے پاس سکون کے لئے کوئی سہارا نہ تھا سماج کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا سنگین جرم، ناقابل معافی گناہ تھا۔ اپنی مرضی کا اظہار رضا اندازوں کے نام پر داغ لگانا تھا اس لئے صرف خاموش رہنے اور گھٹ گھٹ کر جینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

نسبت کے بعد کنول اور پدما کے خطوط کی سخت نگرانی ہونے لگی وہ ہر روز جواب کی راہ دیکھتی۔ لیکن اس کا انتظار انتظار رہ جاتا۔ اس کا خواب آرزو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔

ادھر گھر میں مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں بجائے خوش ہونے کے پدما کی افسردہ خاطری بڑھنے لگی اس کا دل اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ وہ سوچتی کنول کو کیسے چھوڑ سکوں گی؟ کنول اس کی رگ رگ میں سما گیا ہے۔ وہ اسے کیسے بھلا سکے گی؟ لیکن دفعتہ کنول کی کج ادائی اور سرد مہری کا خیال آتے ہی کانپ جاتی اور سوچنے لگتی۔ کیا مرد اتنے خود غرض ہوتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا عہد بھی نہیں نبھا سکتے —؟ کنول مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی کہ تم اتنی جلدی نگاہیں پھیر لو گے۔ اُف ایک خط کا بھی جواب نہ دے سکے؟ سنگدل ظالم! ارے محبت کی ماری عورت کے دل کو سمجھنے کی کچھ تو کوشش کی ہوتی ....

پھر فوراً ہی سوچتی۔ نہیں کنول ایسا سنگدل نہیں ہو سکتا۔

یقیناً ماں کی دیکھ بھال میں اسے موقع نہ ملتا ہوگا۔ کیا انکی حالت زیادہ .... کہیں چل نہ .... وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکتی اس کا دل کانپ جاتا۔ کنول کی میٹھی اور بھولی باتیں ایک ایک کرکے یاد آنے لگتیں۔ اور اس کے متعلق ساری بدگمانیاں کافور ہو جاتیں۔

کنول کے خط کا انتظار کرتے کرتے اب کہ آج پدما خود خط لکھنے بیٹھی۔ یہ خط کیا تھا۔ اس کا آخری پیغام تھا۔ جسے اپنے کنول تک پدما پہنچا چاہتی تھی۔ دل کے سارے جذبات نذر کر وہ خط لکھنے لگی۔

سنگدل کنول!

"میں خطوط لکھتے لکھتے تھک گئی۔ لیکن تم نے جواب میں ایک حرف بھی لکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ اُف اتنی سرد مہری؟ اتنی سنگدلی؟ بھلا ایسی ضبط شکن اور صبر آزما اذیت تمہاری پدما کیسے برداشت کر سکے گی؟ کنول! تم نے کبھی میرے دل کو سمجھنے کی کوشش نہ کی —؟ میں جانتی ہوں کہ ماں کی دیکھ بھال سے تمہیں فرصت نہ ملتی ہوگی۔ پھر بھی تم چاہتے تو عدیم الفرصت ہوتے ہوئے بھی خیریت اور تشفی کے دو کلمے لکھ سکتے تھے کنول! آج کے ٹھیک ساتویں روز تمہاری پدما دوسرے کی ہو جائیگی۔ ڈاکٹر سریندر تم سے تمہاری پدما کو چھین لے جائیں گے۔ پھر کیا تم کبھی اسے پا سکو گے .....؟ یاد رکھو کنول! تمہارے بغیر میری زندگی میرے لئے وبال ہو جائیگی اور ایک روز میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو جاؤں گی اس لئے کیا میں امید رکھوں کہ تم آ جاؤ گے —؟ سماج کی پروا نہ کرنا۔ میرے نزدیک۔ ایک گرفتار محبت کے نزدیک اس کے بندھن کوئی حقیقت نہیں رکھتے ...."

سماج کی دیوی پہ قربان ہونیوالی

تمہاری پدما

مکرر —

"کنول! میں آج تمہیں اپنا بلکہ زندگی کا آخری پیغام بھیج رہی ہوں۔ اسی پہ ہمارے مستقبل کا دارومدار ہے۔ تمہاری ماں تو بصحت ہو گئی۔ اب سے میرا دست بستہ پیام تمہیں۔"

پدما

کنول کے خطوط کی طرح پدما کا یہ خط بھی روک لیا گیا۔ یہ جواب کا انتظار ہی دیکھ رہی تھی کہ اس کی شادی کا ہولناک دن بھی آ گیا۔

ادھر کنول کی ماں چل بسی۔ اس کی دُنیا اُجڑ گئی۔ اب پدما سے اسے توقع نہ رہی۔ اُمید کی وہ افسردہ شمع بھی جھلملا کر بجھ گئی' وہ پاگل ہو گیا۔ دیوانگی کے عالم میں رہ رہ کر ماں کا بستر ٹٹولتا اور سوچتا ماں کچھ کہہ تو نہیں رہی ہے ــ وہ رات کے سناٹے میں پکار اُٹھتا ــ "کیا ماں؟ پانی دوں ــ؟ اُٹھو دوا پی لو" لیکن ماں کہاں تھی؟ وہ چُپ چاپ جا کر اپنے بستر پر لیٹ رہتا۔

اس کی ماں کے مرنے سے پہلے ہی اسے بخار رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے خوفناک صُورت اختیار کر لی۔ مکان اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا' ڈاکٹر نے اسے مکان واپس چلے جانے کی رائے دی۔ اس لئے دینو کو اپنے آنے کی اطلاع دے کر کنول مکان کے لئے روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن پر دینو موجود تھا۔ کنول نے گاڑی سے اُترتے ہی پکارا ــ "دینو! دینو! بابو" دینو دوڑ کر آیا۔

"یہ سامان مکان لے جاؤ میں پدما کے ہاں سے ہو کر آتا ہوں"

"آپ کہاں جائیں گے ــ؟"

"پدما کے ہاں"

"اُن کی تو شادی ہو گئی۔ آج وہ جا رہی ہیں"

"جا رہی ہیں ــ؟ کیا سچ کہتے ہو دینو؟"

"ہاں سچ کہہ رہا ہوں بابو"

"دینو! دینو! کیا سچ مچ پدما جا رہی ہے ــ؟"

کنول بھیڑ کو چیرتا روتا چیختا دوڑا ــ "پدما مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے" نحیف و نزار پاؤں جواب دے رہے تھے۔ پھر بھی گرتا پڑتا پدما کے مکان کی طرف چلا ہی جا رہا تھا۔ لوگ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اتنے میں ایک بھکاری نے گایا ــ

مورکھ تینوں لوک میں کوجانے پر پیر!

مورکھ تو کو جانے پر پیر؟

کنول اور بھی تیزی سے بھاگا ــ

پدما عورتوں کے ہجوم میں رُخصت ہو رہی تھی۔ دفعتہً کنول کی آواز اس کے کانوں میں آئی ــ "کیا سچ مچ پدما مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے . . . . ؟"

پدما چونک پڑی۔ اس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کنول!"

اس نے پھر وہی آواز سُنی۔ اب وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور بڑی تیزی سے اسی طرف بھاگی۔ عورتیں حیران تھیں۔

"کنول!"

"پدما..... پدما! کیا سچ مچ تم مجھے چھوڑ کر جارہی ہو.....؟"

"نہیں نہیں کنول! میں تمہیں ہرگز نہ چھوڑوں گی....."

کنول کے ناتواں پاؤں جواب دے چکے تھے وہ یکایک گر پڑا۔ پدما نے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

"پدما...." کنول نے نحیف آواز میں کہا "مجھے چھوڑ کر تو کہیں نہ جاؤ گی"۔

دفعتہً کنول کے کانوں میں پدما کے الفاظ گونج اُٹھے ——"میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس زندگی میں ہمیں کوئی جُدا نہیں کر سکتا سماج کے بندھن بھی ہمیں نہ باندھ سکیں گے"۔

کنول کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ دفعتہً وہ پھر چیخ اٹھا ——"کیا پدما جارہی ہے——؟"

"نہیں نہیں۔ کہیں نہیں"۔ پدما نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کنول کی طرف دیکھ کر کہا۔

لیکن کنول کی رُوح کا طائر سماج تو کیا دُنیا کے سارے بندھنوں کو توڑ کر پرواز کر چکا تھا۔

——— (ہندی سے ترجمہ)

قلوبطرہ کی ایک رات

فرانس کے ادیب لبیب
"گاشیئر"
کا بہار آفریں رومانی افسانہ

ترجمہ:-
عبدالرحیم شبلی - (بی، کام)

گاشیئر اُنیسویں صدی کے فرانس کا وہ سحر طراز ناول نویس اور شاعر ہے جو اسلوبِ نگارش، رفعتِ تخیل، خوبیٔ الفاظ اور زورِ بیان کے لحاظ سے دنیائے ادب میں امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ خوبصورت استعارے نئی نئی تشبیہیں۔ خوشنما ترکیبیں اور لفظوں کی عمدہ تراشیں اُس کے فانوسِ ادب میں بوجوہ تمام جلوہ گر ہیں۔ لیکن آپ اُس کی ذہانت و لطافتِ طبع سے متاثر ہونے کے ساتھ ہی محسوس کرینگے کہ یہ مصنف تاریخ کی گہرائیوں میں کھو جانے کے باوجود عالمِ تصور میں بھی پرواز کرتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ پر تخیل کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جن میں اس کا دل اور دل کے ساتھ قلم بھی اُڑتا چلا جاتا ہے۔

"قلوبطرہ کی ایک رات" گاشیئر کی ایک طویل رومانی کہانی ہے۔ جو منظر نگاری لطافتِ بیان۔ شاعرانہ کیفیات کی تصویر کشی اور احساسات و جذبات کی ترجمانی کے اعتبار سے خاص طور پر مؤثر اور وجد آفریں ہے۔ میں نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود پوری کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ اصل کی تمام تر خوبیاں برقرار رہیں اور مصنف کا کوئی اہم لفظ یا فقرہ بھی اُردو میں منتقل ہوئے بغیر نہ رہے۔

(شبلی)

پہلا باب (۱)

انیس سو برس گزرے، رودنیل کے بہاؤ پر ایک مرصع و مطلا بجرا اتنی تیزی سے جا رہا تھا جتنا اُسے پچاس چوڑے چکلے اور لمبے لمبے چپو لیجا سکتے تھے۔ اور دُور سے یہ چپو پانی کی لہروں میں یوں اُٹھتے اور گرتے دکھائی دیتے جیسے ہل چلی کھیتی میں ہزار پائے رینگ رہے ہوں۔

یہ بجرا لمبا اور پچا ہوا تھا۔ اس کے دونوں سرے ہلال کی طرح اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساخت میں نفاست اور تیز رفتاری کو خاص طور پر مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ بجرے کے "پیش" پر مینڈھے کی ایک گردن بنی ہوئی تھی۔ جس پر سونے کا خول چڑھا دیا گیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ کشتی شاہی خاندان کے کسی فرد کی ہے۔!

کشتی کے عین وسط میں ایک آراستہ و پیراستہ مسقف حجرہ تھا جس کی دیواروں پر ڈھلے ہوئے کھجور کے پتوں سے منبت کاری کی گئی تھی۔ اور جس میں روشنی کے لئے چار مربع دریچے تھے۔ اس کے علاوہ کشتی کے دونوں ہلال نما سروں پر ایک ایک کمرہ تھا جن کو ہیرا غلیفی طرز کے نقوش سے مزین کیا گیا تھا۔ ان میں سے بڑے کمرے پر ایک بالاخانہ بھی تھا جس کی اونچائی نچلے کمرے کی بہ نسبت کم تھی، اور جو اُن عجیب و غریب خلوت خانوں کی یاد تازہ کرتا تھا جو سولھویں صدی میں سب سے پہلے ڈیلا بیلا نے جہازوں میں جاگیرداروں کے تعیش کے لئے بنوائے تھے۔ چھوٹے کمرے کے رُوکار پر ایک مثلثی نشان نمایاں تھا اور اسی کمرے سے کشتی کو بھی چلایا جاتا تھا۔

بجرے کے عقب میں پتوار کی بجائے دو بڑے بڑے چپو جن پر بل دار لکیروں سے نقاشی کی گئی تھی بلّیوں کے سہارے نصب تھے اور راج ہنس کی جھلی دار ٹانگوں کی طرح دور تک پانی میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان عظیم الشان چپوؤں کے دستوں پر روایتی سینگ کی مختلف تصویریں کندہ تھیں اور ملاح اپنے کمرے میں کھڑا ہو کر ان کی مدد سے کشتی کو کھے رہا تھا۔

وہ ایک سیاہ فام آدمی تھا۔ جس کے کالے کلوٹے تنی کانسی کی طرح سانولے بدن پر، نیلگوں موجوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی ترچھی آنکھیں، سیاہ گھنے بال جو چھوٹی چھوٹی لٹوں میں بنے ہوئے تھے۔ موٹے موٹے ہونٹ اور کھوپڑی سے اونچے نکلے ہوئے بڑے بڑے کان صاف بتا رہے تھے کہ وہ خالص قبطی النسل ہے۔ ایک لنگوٹی پانچ چھ بلوری منکوں کی مالا اور ایک تعویذ، بس یہ تھا اُس کا مختصر سا لباس۔!

بجرے میں وہ تنہا ہی نظر آتا تھا، کیونکہ چپو کھینے والے، اپنے اپنے چپو پر جھکے ہوئے نگاہوں سے اوجھل تھے۔ اور اُن کی موجودگی کا احساس صرف ان چپوؤں کی باضابطہ حرکات سے ہوتا تھا جو بجرے کے دونوں طرف نصب تھے۔ اور پنکھے کے پروں کی طرح باری باری پھیلتے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پانی میں گرتے تھے۔ ہوا بالکل ساکت تھی۔ چنانچہ بجرے کے مثلث نما بادبان کو ریشمی ڈوری سے زیریں مستول کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ جس سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ اب ہوا کے چلنے کی قطعاً امید نہیں ہے۔

دوپہر کے روشن سورج نے اوپر سے شعاعوں کے تیر برسائے۔ ساحل دریا کی خاکستری کیچڑ پر آتشیں کرنوں کا انعکاس ہونے لگا۔ دہکتی ہوئی خیرہ کن روشنی کا ایک شعلہ زن سیلاب اُمنڈ آیا۔ آسمان کا نیلا رنگ شدتِ حرارت سے بھٹی میں پگھلی ہوئی دھات کی طرح پھیکا پڑ گیا۔ دُور افق پر غبار سا چھا گیا۔ ازل سے ماتم دیدہ اور غیر متغیر آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیل کا بے رونق اور سست پانی بہتے بہتے سو گیا ہے اور پگھلے ہوئے ٹین کی چادر کی طرح آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے۔ اتنی ہوا بھی موجود نہ تھی کہ دریا کی پیشانی شکن آلود ہو جائے۔ یا کنول کے اُن جام نما پھولوں میں سرسراہٹ پیدا ہو سکے جو بے حس و حرکت تراشیدہ سنگپاروں کی طرح سطحِ آب پر بکھرے ہوئے تھے۔ البتہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد کوئی مچھلی پانی میں سے اُبھر کر اپنے نرم و نازک سینے کی ایک جھلک دکھا جاتی لیکن بجرے

تکے جیسے چوڈوں کو دہی کی طرح جمے ہوئے سیاہی مائل نیلے پانی کے پردے کو چیرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

دریا کے کنارے سنسان اور غیر آباد تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ اور یہ علاقہ ایک ایسے قبرستان سے مشابہ تھا جس میں زندوں کا کام مُردوں کو دفنانے کے سوا کچھ نہ ہو۔ بھیانک خاموشی۔ جھانوے کی سی خشکی۔ نہ مسرت نہ غم۔ افق بادل سے معرّا۔ کوئی پوشیدہ چشمہ بھی نہ تھا۔ جس میں دھول سے اَٹے ہوئے پیروں کو ڈبو کر تسکین حاصل ہو سکے۔ ہر طرف ابوالہول کی سی خاموشی حکمراں تھی جو ابتدائے آفرینش سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صحرا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اور اُس سنگین پائے سے علیحدہ نہ ہو سکتا تھا جس پر وہ دو ہزار برس سے اپنے پنجے تیز کر رہا تھا۔

اتنا گہرا سکوت چھایا ہوا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا دنیا نطق سے محروم ہو چکی ہے۔ یا ہوا میں آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی صلاحیت نہیں رہی۔ صرف ان مگرمچھوں کی گھٹی ہوئی "سسکیاں" گاہے گاہے اس سکوت میں مخل ہوتی تھیں جو حرارتِ آفتاب سے کمزور ہو کر ساحل دریا کی دلدل میں اُگی ہوئی جھاڑیوں کے آس پاس لوٹ رہے تھے۔ یا کبھی کبھی ان لقلقوں کی آواز خاموشی کے پردے کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی تھی جو اپنے پروں میں گردن سموئے جب ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے اکتا جاتے تو اپنا فلسفیانہ انداز چھوڑ کر سفید بازوؤں کو پھڑپھڑاتے اور اُڑ کر قریب کے کسی مستطیل منار یا کھجور کی ٹہنی پر جا بیٹھتے تھے۔

بجرا تیر کی طرح پانی کی ہموار سطح پر اُڑتا اور اپنے پیچھے ایک سیمیں لکیر چھوڑتا چلا جا رہا تھا جو فوراً نقش برآب ہو جاتی تھی۔ اور اس کے بعد صرف جھاگ کے ننھے ننھے بلبلے پانی کی سطح سے اُبھرتے اور پھٹ جاتے تھے۔ جن سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس رستے سے بجرا گزرا ہے لیکن جب تک اس کا احساس ہوتا وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا ہوتا تھا۔

پانی اور آسمان کی نیلگوں وسعتوں کے درمیان مٹیلے رنگ کے کنارے پیپرس کے مخطوطات کی سطروں کی طرح کھلتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین کی وہ مہین سی زبان جو دریائے نیل اور آسمان کو جدا کرتی ہے ایک عظیم الشان جھیل پر پھیلی ہوئی سنگ بستہ روش ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ آیا نیل میں آسمان کا عکس پڑ رہا ہے یا آسمان پر نیل کا پرتو نظر آتا ہے۔

ساحلی منظر متواتر بدل رہا تھا۔ بڑے بڑے اہرام جن کی ڈھلوانی دیواروں کی عجیب و غریب تصویروں کا سایہ دریا کے پانی میں لرز رہا تھا۔ مصری معابد کے پھاٹک، جن کے چوڑے چوڑے کارنس آگے کو بڑھے ہوئے تھے، سیڑھیاں جن پر حفاظت کے لئے بیشمار بتوں کی دنبالہ دار کلاہ پہنے، اور اپنی چھاتیوں کے نیچے سنگ موسیٰ میں پنجے گاڑے بڑے بڑے ابوالہول بیٹھے تھے، عالیشان محلات، جن کے ستونوں کے بالائی حصے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، اور جن کے عّلاقی گروں کے پراسرار باز و شہباز کے پروں کی طرح فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے تھے۔ عظیم الہیئت مندر جن کے گنبد نما ستونوں پر ہیرالغیفی طرز کے سفید حروف کھُدے ہوئے تھے۔ الغرض دیو ہیکل طرز تعمیر کے تمام مہیب خدوخال انسان کی نگاہوں میں باری باری گھوم جاتے تھے لیکن اس کے بعد ہر طرف ویرانی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ تھا، اونچے اونچے ٹیلے جو اُن پتھروں کے ڈھیروں سے خود بخود بن گئے تھے جو آثار قدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہوئے۔ یا ان خراب و خستہ عمارتوں کے ٹکڑوں پر مشتمل تھے جو تیرہ سو برس سے حوادث دہر کا شکار ہو رہی تھیں۔ کبڑے کبڑے پہاڑ جن کی تمازت آفتاب نے گویا کھال ادھیڑ رکھی تھی اور جن پر کالی کالی لکیریں یوں نمایاں تھیں جیسے وہ آگ سے جھلس گئے ہوں۔ بگڑی ہوئی پہاڑیاں جو مقبروں کے گنبدوں کی طرح اُبھری ہوئی تھیں۔ سبزی مائل مٹی کی وسعتیں۔ آٹے کی طرح سفید کھرے پتھر، اور کبھی کبھی سنگ احمر کی چٹیل عمودی چٹانیں۔ جن کے درمیان پتھروں کی کانیں گویا مُنہ کھولے جماہیاں لے رہی تھیں الغرض جدھر نگاہ اٹھتی، ایک لق و دق بے آب و گیاہ میدان نظر آتا تھا۔ جس میں آنکھوں کی طراوت کے لئے ایک بھی نخلستان نہ تھا، ایسا معلوم ہوتا کہ قدرت ہریاول اور روئیدگی کے نام سے بھی ناآشنا ہے۔ البتہ کہیں کہیں افق میں سے سبزی کے کیکڑے کی طرح کھجور کا کوئی پودا نمودار ہو جاتا، یا خاردار انجیر کا کوئی درخت نظر آ جاتا جس کے پتے تانبے کی تلوار کی طرح تنے ہوئے معلوم ہوتے تھے، یا کسی ٹوٹے پھوٹے شکستہ ستون کے نیچے تھوڑی سی نمی کے زیر اثر ہلکی ہلکی دوب اُگی ہوئی مل جاتی تھی۔ ورنہ صحرا کی بے آب و گیاہ یکسانی کو دور کرنے کے لئے ایک بھی شے وہاں موجود نہ تھی۔

ارد گرد کے علاقہ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لینے کے بعد آیئے اب ہم پچاس ملاحوں والے بجرے کی طرف واپس چلیں۔ اور اگر ہو سکے تو جرأت کر کے بلا اطلاع مجلہ خصوصی میں جا گھسیں۔

خاص کمرے کی اندرونی دیواروں پر رنگا رنگ کی گل تراشی کی

ئی تھی۔ فرش پر شفاف سینٹھے کا قالین بچھا ہوا تھا۔ اور پرلے کونے ں ایک خیالی جانور (جس کے سر اور باز و عقاب کے سے اور باقی جسم ر کا سا تصوّر کیا جاتا ہے) کے پنجوں پر ایک صوفہ نصب تھا جس ایک پر تکلف سیج بچھی ہوئی تھی۔ بستر پر چلنے کے لئے صوفے کے ریب چار قد مچوں والا ایک پائیدان رکھا تھا اور سرہانے کی طرف ستو بر کا ایک نیم دائرہ نما تکیہ ایک ٹانگ پر اس انداز سے متوازن یا گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ٹیک لگانا چاہے تو اس کی گردن کا پچھلا حصّہ تکیئے میں پوری طرح سما سکے۔

اس عجیب وغریب تکیئے سے ایک حسین وجمیل سر نے ٹیک ا رکھی تھی۔ یہ سر ایک ایسی مہوش عورت کا تھا جس کے روئے ل کی ایک ہی جھلک نے ایک مرتبہ نصف دنیا کو آگ اور خون کے یا میں غوطے کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک قابل پرستش ملکوتی تھا۔ ایک ایسی مکمل عورت کا سر جس کی نظیر نہ مل سکتی تھی' ایک ی عورت کا سر جس میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی' ۔ ایسی عورت کا سر جس کے حسن وجمال میں شاعروں کا تخیل بھی) اضافہ نہ کر سکتا تھا۔ اور جس کا تصوّر خواب دیکھنے والے اپنے ہن کی گہرائیوں میں ہمیشہ محسوس کر سکتے ہیں ۔۔۔ یہ کہنے کی رت نہیں کہ یہ سر قلوبطرہ کا تھا۔

اس کے پہلو میں' اس کی منظور نظر کنیز شارمین کھڑی شتر مرغ کے ں کا ایک پنکھا ہلا رہی تھی۔ اور ایک نوجوان باندی دریچوں پر ئی خس کی ٹٹیوں پر گلاب کا عطر چھڑک رہی تھی۔ تاکہ ہوا معطر ںڈی ہو کر اندر آئے۔ سیج کے قریب ایک نازک سے خوبصورت ب گلدستے میں کنول کے پھول سجے ہوئے تھے۔ جن میں سے بعض اور بعض گلابی رنگ کے تھے۔ اور آئی سس دیوی کی حسین آنکھوں نرم و نازک معلوم ہوتے تھے۔

اس روز قلوبطرہ نے قصداً یا نزاکت کے خیال سے اپنا یونانی زیب تن نہ کیا تھا۔ وہ مصری لباس پہن کر یونانی طرز کی ایک دعا میں شامل ہونے گئی تھی۔ اور اب فراغت پا کر اپنے ل واپس جا رہی تھی۔

شاید ہمارے قارئین میں سے بعض لوگ یہ جاننے کے لئے مضطر جب ملکہ قلوبطرہ ہرمان تھیس کے مندر سے واپس آ رہی تھی باس کیسا تھا۔ خوش قسمتی سے ہم اس ضمن میں تفصیلات مہیا سکے اضطراب کو دور کر سکتے ہیں۔

ملکہ قلوبطرہ نے اپنے سر پر مقدس تیتر کے جسم اور پروں سے مشابہ ایک ہلکا سا خود پہنا ہوا تھا جس کو کوٹے ہوئے سونے سے تیار کیا گیا تھا۔ اس خود کے پر نیچے کی طرف پنکھے کی طرح پھیل کر کنپٹیوں کو ڈھانپتے ہوئے قریباً گردن تک پہنچ جاتے تھے اور درمیان میں دونوں طرف صرف اتنا سوراخ باقی رہ جاتا تھا کہ اس میں سے قلوبطرہ کے گلاب آسا کان نظر آ سکتے۔ جو اس صدف سے بھی زیادہ خمدار تھے جس میں سے زہرہ دیوی برآمد ہوئی۔ اور جس کو مصریوں نے آتھور کا نام دیا۔ پرندے کی دُم گُدّی تک جا پہنچتی تھی۔ جہاں ہمارے زمانے کی عورتیں اپنا جوڑا باندھتی ہیں۔ پرندے کا جسم جس پر سفالی ترتیب سے پر لگے ہوئے تھے اور جس پر طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کی گئی تھیں سر کے اوپری حصّے کو ڈھانپتا تھا۔ اور پرندے کی گردن عجیب نوع سے پیچ و تاب کھاتی ہوئی پہننے والی کی پیشانی پر جھومر کی طرح لٹک رہی تھی۔ طلائی خود پر ایک کلغی بھی لگی ہوئی تھی جس نے سر کے لباس میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس تاج میں سے کالی رات کی طرح سیاہ زلفیں نکل کر اس کے گداز مرمریں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ بدن پر قلوبطرہ نے ململ کی ایک عبا پہنی ہوئی تھی۔ جو اتنی شفاف تھی کہ اس میں سے جسم کے خطوط صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ نصف آستینوں والی عبا کاندھوں پر کھنچی ہوتی تھی۔ لیکن کہنیوں تک پہنچتے پہنچتے کافی فراخ ہو گئی تھی جس میں سے ہاتھوں اور سڈول بازوؤں کی جلوہ نمائیوں کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ چھ کنگن اس کے بازوؤں کی زینت تھے اور انگلیوں میں اس نے ایک انگشتری پہنی ہوئی تھی جس پر "مقدس بھونرے" کا نشان بنا ہوا تھا۔

اس چوغے کو کمر پر ایک پیٹی سے باندھا گیا تھا جس کے دونوں گرہ دار سرے سامنے کی طرف لٹکے ہوئے تھے۔ اس عبا پر قلوبطرہ نے ایک فرغل پہنا ہوا تھا جس کے کناروں کا گوٹا سونے سے تیار کیا گیا تھا۔ پاؤں میں قلوبطرہ نے ایک نازک سی اونچی ایڑیوں والی چپل پہنی ہوئی تھی جس کے اوپر کا حصہ فیتے سے کسا ہوا تھا۔

لیکن قلوبطرہ اس روز پرجمال اور خوش پوش عورتوں کی طرح مطمئن نظر نہ آتی تھی۔ وہ اپنے جھولے سے بستر پر بیقرار و بےچین تھی اور کروٹیں بدلتے وقت بعض اوقات اس کے سینہ پر سے ریشمی عبا کھسک جاتی جس کو شارمین پنکھا ہلاتے ہلاتے نہایت احتیاط کے ساتھ دوبارہ ٹھیک کر دیتی تھی۔

"اس کمرہ میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے" قلوبطرہ نے کہا۔

"آگ کی دیوی تھاہ بھی اگر اس جگہ اپنی دھونکنی لے آئے تو وہ اس کمرے کی حرارت میں اضافہ نہ کر سکے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگیٹھی گرم گرم سانس چھوڑ رہی ہے"۔ اور اس نے اپنی باریک زبان کی نوک سے اپنے لبوں کو تر کیا۔ اس کے بعد اپنا ہاتھ اس طرح بڑھادیا جیسے مریض نامعلوم جام کی تمنا میں اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔

شارمین نے جو ہمیشہ مستعد رہتی تھی فوراً تالی بجائی اور ایک سیاہ فام حبشی لڑکا جس نے اپنے کاندھوں پر چیتے کی کھال پھینکی ہوئی اور کمر کے گرد البانوی گھگھرے کی طرح ایک چھوٹا سا لنگا لپیٹا ہوا تھا تصور کی سی سرعت کے ساتھ اندر آیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک طشتری تھی جس میں بہت سے جام اور تربوز کی قاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور دائیں ہاتھ میں وہ ایک لمبی گردن والا مینا اٹھائے ہوئے تھا۔ جس کی ٹونٹی آج کل کی چائے دانی کے مشابہ تھی۔ غلام نے مینا کو کافی بلند کر کے کمال مہارت کے ساتھ ایک پیالے میں رنگین عرق انڈیلا اور اپنی مالکہ کے سامنے رکھ دیا۔ قلوبطرہ نے جام اٹھایا اور محض لبوں سے چھو کر اپنے قریب رکھ لیا ۔۔۔ اس کے بعد اپنی نشہ بار سیاہ آنکھوں سے جن میں جذبات کی تنویر موجزن تھی اپنی محبوب کنیز کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"شارمین! میں اکتا گئی ہوں"۔

دوسرا باب (۲)

شارمین نے فوراً یہ بھانپتے ہوئے کہ اس کی مالکہ کی باتوں میں خود اعتمادی کی جھلک ہے اپنی صورت ہمدردانہ بنالی ۔۔ اور کھسک کر اس کے قریب آگئی۔

"میں بیحد اکتا چکی ہوں"۔ قلوبطرہ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اور اپنے بازوؤں کو ایک مایوس انسان کی طرح سیج پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ مصر میری جان لے کر، مجھے تباہ کر کے چھوڑے گا۔ یہ سنگدل آسمان اپنی تمامتر نیلاہٹوں کے باوجود آیرلس کی شب دیجور کی طرح غمناک اور افسردہ نظر آتا ہے۔ نہ کوئی بادل ہے نہ کوئی سایہ بس یہ سرخ سرخ آفتاب یونان کے کانڑے دیو کی طرح اپنی آتشیں نگاہوں سے ہمیں گھور رہا ہے۔ شارمین! میں بارش کے ایک ایک قطرے کے لئے ایک ایک موتی لٹانے کو تیار ہوں۔ اس کانسی کے آسمان کی شعلہ بار آنکھ نے اس ویران سرزمین پر ایک آنسو بھی تو نہیں بہایا۔ یہ فلک! یہ تو محض ایک گنبد ہے، گورستان کا گنبد۔! یہ ان حنوط شدہ لاشوں سے بھی زیادہ مردہ اور خشک ہے جن پر یہ سایہ فگن ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے نازک شانوں پر بھاری بھرکم چادر ڈال دی ہو۔ مجھے اس کی صورت سے ہول آتا ہے اگر میں سیدھی کھڑی ہو جاؤں تو مجھے اندیشہ ہے کہ میرا سر اس سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائے۔ پھر یہ ہمارا ملک بھی کتنا خطرناک ہے وحشت انگیز، یاس افزا، تاریک، ناقابل فہم! انسانی تصور نے یہاں ہیبتناک خیالی پیکروں کے سوا کچھ بھی تعمیر نہیں کیا۔ یہ مہیب گارمیں اور یہ دیو پیکر فن تعمیر دیکھ کر سراروان رواں کانپ اٹھتا ہے۔ یہ بڑے بڑے دیوتا جو بھسکڑا مار کر سنگین کرسیوں پر بیٹھے ہیں، میں ان کی احمقانہ ہیبت دیکھ کر افسردہ ہو جاتی ہوں۔ یہ سب چیزیں میرے لئے نظر سوز اور جذبات کش ہیں۔ جانے وہ دیو کب آئیگا جو ان کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھائے گا۔ اور ان کو اس قید سے نجات دلائیگا۔ آخر یہ پتھر بھی تو ایک جگہ پڑے پڑے اکتا جاتے ہونگے! پھر نہ جانے وہ کس آقا کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ جس کی تعظیم کے لئے وہ اپنی کوہ وقار نشستوں پر سے اٹھ کھڑے ہونگے۔ اور یہ ابوالہول جو کتوں کی طرح نگرانی کر رہے ہیں اور جھپٹ لینے کے لئے اپنے پنجوں کو تیز کئے بیٹھے ہیں خدا جانے یہ کس مٹی سے بنے ہیں کہ برابر بیس صدیوں سے صحرا کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں لیکن ابھی تک وہ اپنے فریضہ سے تغافل نہیں ہوئے۔ یہ ازل و ابد پر اپنی سنگین نظریں گاڑے کیوں بیٹھے ہیں؟ وہ کون سا سربستہ راز ہے جو ان کے خاموش لبوں نے ان کے سینوں میں دفن کر رکھا ہے؟ دائیں بائیں جدھر بھی نگاہ اٹھاؤ بس یہ ہولناک درندے نظر آتے ہیں کتے، جن کے سر انسانوں کے سے ہیں۔ انسان جن کے سر کتوں کے سے ہیں۔ بھوت جن کی نفرت انگیز پیدائش بھول بھلیوں کے کسی تاریک گوشے میں حرامکاری کی مرہون منت ہے! دوزخ کے فرشتے جنگلی

…قاب جن کی زرد زرد متجسسانہ نگاہیں انسانی جسم کے آر پار ہو جاتی …اور عقب و عقبیٰ کی ایسی ایسی چیزیں بھی دیکھ سکتی ہیں جن کا ہم …ور بھی نہیں کر سکتے۔ درندوں اور دیوتاؤں کی اولاد۔ جن کے …رو نیکے، جو پنجیں مڑی ہوئی اور پنجے نوکیلے ہیں۔ گویا ہر وقت اس …ص کو دبوچ کر ہڑپ کر جانے کے لئے تیار ہیں جو معبد کی چوکھٹ پر قدم …نے کی جرأت کرے یا نقاب اٹھانے کی کوشش کرے۔

"دیواروں پر۔ ستونوں پر۔ چھتوں پر۔ فرشوں پر۔ محلوں اور …دت گاہوں پر۔ گورستان کی لمبی لمبی اور گہری قبروں میں بلکہ زمین …اندر جہاں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں جاتی۔ اور جہاں شمع بھی …انہ ہونے کی وجہ سے گل ہو جاتی ہے غرضکہ ہر جگہ اور ہر طرف ہیروغلیفی …کے لاتعداد حروف ابھرے ہوئے ہیں جو پیچیدہ اور الجھی ہوئی …رت میں ایسی چیزوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو آج دنیا میں موجود …ں ہیں اور ماضی کی ایک ایسی مخلوق سے متعلق ہیں جو صفحۂ ہستی سے …ید ہو چکی ہے۔ —— بڑی بڑی مدفون تصنیفات جن میں صرف …لوح مزار کے لئے قوم کی قوم کو قربان کر دیا گیا ہے! اسرار اور تحیر —— بس یہی مصر ہے! فی الواقع یہ سرزمین ایک جوان عورت اور …ن ملکہ کی بود و باش کے لئے بہترین جگہ ہے۔!

"دہشت اور تجہیز و تکفین سے متعلق نشانات کے سوا یہاں کچھ بھی …ر نہیں آتا —— علامتی کرتے، بل کھائے ہوئے سانپ اور ترازو …ن میں روحوں کو تولا جاتا ہے —— عدم، نیستی، فنا —— روئیدگی کی بجائے پرلو …ناظ، اشجار کی بجائے سنگین مناروں کی قطاریں۔ زراعتی زمین …بجائے پتھر کا فرش جس کی ایک ایک سل کے لئے ایک ایک پہاڑ …ا رہا ہے۔ آسمان کی بجائے پتھر کی چھت —— گویا ابدیت کو عالم …وسات میں لایا گیا ہے —— سیڑھیاں جو صرف دیو پیکروں کے …ستعمال کے لئے تیار کی گئی ہیں اور جن پر انسان زینہ کے بغیر اپنا قدم …ں رکھ سکتا، ستون جن کے گرد سیکڑوں بازو بھی گھیرا نہیں ڈال …تے۔ بھول بھلیاں، جن میں انسان برسوں بھٹکنے کے باوجود رستہ …ش نہیں کر سکتا۔ عظمت و شوکت کا چکر، ہیبت و دہشت کا نشہ …اندھا دھند سامی کا مغرورانہ نتیجہ، جو انسان کو جریدۂ عالم پہ …انی نقوش ثبت کرانے کے لئے مجبور کر رہی تھیں۔

"اور اس کے علاوہ، شارمین! ایک دہشت انگیز خیال بار …میرے دل میں آتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں لاشوں کو جلا دیا جاتا …اور ان کی راکھ فوراً مٹی میں مل جاتی ہے لیکن یہاں زندوں کا کام مُردوں کی حفاظت کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں لاشوں کو مسالوں کے ذریعے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے روح خواہ پرواز کر جائے لیکن جسم لازوال رہتا ہے۔ آج کل مصر میں جو قوم آباد ہے اس کے پاؤں کے نیچے بیسوں قومیں مدفون ہیں۔ آج کل ہر شہر کے نیچے تہہ در تہہ بیسوں قبرستان ہیں۔ یہاں کی ہر نسل تباہ ہونے کے بعد اپنے پیچھے حنوط شدہ لاشوں کے روحانی شہر کی آبادی چھوڑ جاتی ہے۔ سب باپ کے زیر قدم تمہیں مطلّا و مرصّع صندوقوں میں دادا پردادا ملیں گے، اور اگر تم کھدائی جاری رکھو تو ان کے بعد کی نسلیں بھی برآمد ہوں گی جب میں ان کروڑوں لوگوں کا خیال کرتی ہوں جو رنگدار دھجیوں میں لپٹے ہوئے دو ہزار برس سے قبروں کے تاریک گوشوں میں ساکت و صامت لیٹے ہوئے ہیں۔ اور جب میں سوچتی ہوں کہ آج سے دو ہزار برس بعد یہ لوگ اپنے مگرمچھوں، بلیوں اور لقلقوں کے ہمراہ دوبارہ زندہ ہو جائیں گے تو خوف و دہشت کی ایک لہر میرے سراپا میں رینگنے لگ جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے لیٹ کر آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں؟ کیونکہ آخر ان کے ہونٹ تو موجود ہیں اور ہر شخص کی روح بھی اپنے صحیح و سالم جسم میں اگر واپس آنا چاہے تو بہ آسانی آ سکتی ہے۔

"آہ! واقعی مصر جیسا توہم پرست ملک میری جیسی ہنس مکھ اور خوش باش عورت کے مناسب حال نہیں ہے۔ یہاں کی ہر چیز ایک حنوط شدہ لاش ہے۔ ہزاروں چکر کھانے کے بعد بھی انسان کا یہی انجام ہے۔ اُف! اہرامات کے اندر بھی سنگین تابوت ہیں یہ کیا بیہودگی اور جنون ہے! تم خواہ آسمان کی چھت کو بڑی بڑی سنگین مثلثوں سے چھید ڈالو لیکن تمہاری لاش کی لمبائی میں ایک انچ بھی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسے ملک میں انسان خوش کیسے رہ سکتا ہے جہاں سونگھنے کے لئے اُس نفت اور رال کی بدبو کے سوا کچھ نہ ہو جو حنوط کا مسالہ تیار کرنے والوں کی کڑاہیوں میں ہر وقت اُبلتا رہتا ہے؟ جہاں کمروں کا فرش بھی کھوکھلا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ تمہاری آرامگاہ کے نیچے لاش گھر کا تہہ خانہ یا زینہ ہو! محفوظ لاشوں کی ملکہ ہونا، اور تن کر کھڑے ہوئے مجسموں سے باتیں کرنا واقعی خوش قسمتی کی علامت ہے! کاش اس افسردگی اور بیزاری کو دور کرنے کے لئے میں اپنے جذبات کو تسکین دے سکتی۔ میں کسی سے محبت کر کے اپنی زندگی کا حقیقی لطف اٹھا سکتی۔ کاش کوئی دوسرا شخص ہی مجھ سے محبت کا اظہار کرتا۔ لیکن افسوس! ایسا نہیں ہے۔!

"شارمین! یہی وجہ ہے کہ میں زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ اگر محبت ہوتی تو یہی ویران اور بے ہول مصر میرے لئے یونان سے بھی بہتر تھا۔ جہاں کے ہاتھی دانت سے بنے ہوئے دیوتا، سنگ مرمر کی عبادت گاہیں۔ لارل کے درختوں کے جھنڈ اور زمین سے ابلتے ہوئے تازہ پانی کے چشمے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اگر محبت ہوتی تو مجھے ان خوفناک دیوتاؤں کے چہروں اور زیر زمین مقبروں ـــــ سے بھی دہشت نہ ہوتی!"

شارمین مسکرائی گویا اسے قلوبطرہ کی باتوں پر اعتبار نہیں آیا۔

"ملکہ عالم! آپ کو ان باتوں کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ آپ کی ہر نگاہ ایروس دیوتا کے طلائی تیر کی طرح جگر میں تراز و ہو جاتی ہے۔"

"ایک ملکہ" قلوبطرہ نے جواباً کہا۔ "یہ کیسے جان سکتی ہے کہ لوگ اس کے چہرے پر فدا ہیں یا اس کے تاج پر؟ کیونکہ آخر تاج کی لمعہ فشانیاں بھی تو آنکھوں اور دلوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہیں۔ کاش میں اپنے تخت کی بلندیوں پر سے نیچے اُتر سکتی۔ کاش مجھے اتنی چاہت بھی نصیب ہو سکتی جتنی یونان کی دوشیزاؤں بلقیس یا آرچیانا سا کو حاصل ہوئی تھی۔ ملکہ ایک ایسی چیز ہے جسے مردوں سے بہت دور، بے انتہا بلند اور بہت الگ تھلگ سمجھا جاتا ہے! وہ محض عورت نہیں بلکہ ایک ایسی مقدس اور ہیبتناک ہستی تصور کی جاتی ہے جس کا شمار کسی صنف میں بھی نہیں ہو سکتا۔ آخر برف نما بازوؤں والی ہیرا پر کون عاشق تھا؟ یا سبز چشم پالاز کو کس نے چاہا تھا؟ یا تھیٹس کے سیمیں پاؤں اور ارورا کی گلاب آسا انگلیوں کو کس نے بوسہ دینے کی جرأت کی؟ دراصل ہمارے حضور میں خوف اور وقار لوگوں کے دلوں کو سُن کر دیتا ہے۔ ہم جیسی ہستیوں کو محبت حاصل کرنے کے لئے ان قبرستانوں میں چلے جانا چاہیئے جن کا میں ابھی ذکر کر رہی تھی۔"

اگرچہ اس نے قلوبطرہ کے خیالات پر اعتراض نہ کیا تھا۔ لیکن یونانی باندی کے لبوں کی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ وہ اپنی ملکہ کے وثوق کو ناقابل تردید خیال نہیں کرتی۔

"آہ! اے کاش!" قلوبطرہ کہتی گئی۔ "کاش میری زندگی میں کوئی انقلاب آئے۔ کاش مجھے کسی غیر متوقع حادثہ سے دوچار ہونا پڑے۔ شاعروں کی نغمہ سنجیاں، شامی غلاموں کے رقص، ساری ساری رات کی پر تکلف دعوتیں۔ سبینہ دوڑیں۔ صغیر انقامت کتے۔ پالتو شیر۔ گبرو جیشیوں والے لونڈے۔ لاثانیوں کی اخوت۔ دنگل اور مقابلے۔ نئے ملبوسات۔ زرق برق پوشاک۔ زر وجواہر۔ ایشیا کی خوشبوئیں۔ تعیش کا سامان۔ شوکت وحشمت ـــ ان سب چیزوں سے اب مجھے نفرت ہو چکی ہے۔ میرے من کو ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں بھاتی۔"

"معلوم ہوتا ہے۔" شارمین نے دل ہی دل میں سوچا "کہ ملکہ کو ایک ماہ سے کوئی ایسا عاشق نہیں ملا جسے وہ موت کے گھاٹ اُتار سکے۔"

اتنی طویل طنز آمیز تقریر کے بعد قلوبطرہ نے تھکان محسوس کی۔ اور اس نے اپنے نزدیک پڑے ہوئے جام کو دوبارہ اُٹھا کر لبوں کو تر کیا اور اپنے بازو سے فاختہ کی طرح سر کو چھپاتے ہوئے پہلو بدلا اور سونے کی تیاری کرنے لگی۔ شارمین نے اس کی چپل کے تسمے کھولے اور مور کے پروں سے آہستہ آہستہ اس کے تلوے سہلانے لگی۔ تھوڑی دیر ہی میں دختر بطلیموس کی حسین آنکھوں پر نیند کی دیوی نے اپنا سنہرا سفوف چھڑک دیا۔

جب تک قلوبطرہ خواب راحت کے مزے لے رہی ہے۔ آیئے ہم بجرے کے عرشہ پر جا کر غروب شمس کے حسین منظر سے لطف اندوز ہوں۔ مغرب کی جانب فلک کے زیریں حصے میں افق پر ارغوانی رنگ کا ایک چوڑا چکلا حاشیہ ہے جسے سرخ رنگ کے چھینٹوں نے گہرا بنا دیا ہے۔ جس جگہ یہ شفق اوپر کے نیلے آسمان سے ہمکنار ہے وہاں اودی اودی پرچھائیاں بنفشئی اور اس کے بعد نیم گلابی ہوتی ہوئی آسمان کی ناپیدا کنار نیلی وسعتوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ اس سے پرے ولکن (آگ اور آہنگری کا دیوتا) کی انگیٹھی سے گرے ہوئے ـــ دہکتے انگارے کی طرح سورج اپنا آتشیں عکس ڈال رہا ہے جس کی رخشاں شعاعیں ترچھی ہونے کے بعد فیروزے کی طرح دمک رہی ہیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی ترچھی کرنیں جب دریا کی ہلکی ہلکی موجوں پر منعکس ہوتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا آئینے کے سیمابی پہلو سے نور کی مدھم مدھم شعاعیں پھوٹ رہی ہیں یا دھات پر سونے چاندی کی پچی کاری کی جا رہی ہے۔ ساحل دریا کے پیچ وخم، سرکنڈوں اور آس پاس کی جملہ اشیا پر اس نور پاشی سے گویا سکون طاری ہو رہا ہے۔ اس جھٹپٹے میں کچھ فاصلے پر ایک ننھا سا دھبہ نظر آ رہا ہے جو پارے کی سطح پر چھٹی کے متحرک ہوئے ذرے کی طرح تمتاتی ہوئی لہروں کی جھلملیوں میں کانپ رہا ہے۔ کیا یہ تین گلگوں ڈبکیاں لگا رہی ہے؟ یا کوئی چھوٹا

کاہلانہ انداز میں پانی کی رَو میں بہتا آرہا ہے؟ یا کوئی مگرمچھ اپنی مخروطی تھوتھنی نکالے شام کی تازہ ہوا میں سانس لے رہا ہے؟ یا کسی دریائی گھوڑے کا جسم دریا کی لہروں میں چمک رہا ہے؟ یا شاید کوئی چٹان اس جگہ اٹک کر رہ گئی ہے؟ یا رَبُّ الْمَاء، (اوسی رِس) اپنا خالی کشکول لے کر کوہستانِ ماہتاب سے بارش کی بھیک مانگنے گیا ہے؟

لیکن ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک انسان ہے جو پانی پر چلتا ہوا یا پھسلتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اے لو! اب تو وہ نازک سی شہتولی کشتی بھی جس پر وہ سوار ہے نظر آرہی ہے۔ کشتی کیا ہے؟ اخروٹ کا ایک چھلکا ہے۔ یا کوئی کھوکھلی پھلی ہے۔ بس لکڑی کے تین تختوں کو جوڑ کر رسی سے باندھ دیا گیا ہے۔ کشتی کا سوار اپنی دونوں ٹانگوں کو ان کمزور سے تختوں پر پھیلائے سیدھا کھڑا ہے اور ایک ہی چپّو سے اسے کھے رہا ہے۔ یہی چپّو "پتوار" کا کام بھی دیتا ہے۔ اور اگرچہ شاہی بجرے کو پچاس ملّاح نہایت تیزی سے چلا رہے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ شہتولی کشتی اسے ابھی آلے گی۔!

قلوبطرہ چاہتی تھی کہ اس کی زندگی میں کوئی انقلاب آئے، وہ کسی غیر متوقع حادثہ سے دوچار ہو۔ یہ چھوٹی سی شہتولی کشتی جو پراسرار طریقے سے بڑھی چلی آرہی ہے شاید اسی انقلاب یا حادثے کا پیش خیمہ ہو! شاید اسی کشتی میں ہمارے افسانے کا ہیرو ہو لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

بہرحال وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ اس کی عمر بیس برس تھی اس کے بال اتنے کالے تھے کہ ان میں نیلے رنگ کی جھلک تھی۔ اس کا بدن سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے اعضا اتنے متناسب تھے، کہ اس پر لائیسی کپس کے برنجی مجسمے کا گمان ہو سکتا تھا۔ اگرچہ بہت دیر سے کشتی چلا رہا تھا۔ تاہم اسکے چہرے سے تھکان کے آثار ہویدا نہ تھے اور اس کی پیشانی پر پسینہ کا ایک قطرہ بھی نمودار نہ تھا۔

نصف سورج افق کی اوٹ میں روپوش ہو چکا تھا۔ اور اس کی شکستہ قرص کے پس منظر میں ایک دور افتادہ شہر کا دھندلا سا خاکہ نظر آرہا تھا۔ جس کو اتفاقی روشنی کے بغیر شاید پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا۔

تھوڑی دیر کے بعد سورج کی آخری شعاع بھی ناپید ہو گئی، اور ستارے ——— رات کی رانی کے پھول ——— نیلگوں پنہائیوں میں عشائے ربّانی کے جام شراب لنڈھانے لگے۔ شاہی بجرا (جس کے تعاقب میں شہتولی کشتی بھی آرہی تھی) مرمریں زینے کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ اس زینہ کے ہر قدمچے پر ابوالہول کا وہ مجسمہ ایستادہ تھا جس کو قلوبطرہ ہمیشہ نفرت آلود نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ یہ گرمائی محل کا "دریائی مستقر" تھا۔

تمارمین کے کاندھوں کا سہارا لیئے قلوبطرہ بجرے میں سے اُتری اور مشعل بردار غلاموں کی قطاروں میں سے خواب کے نظارے کی سی سُرعت کے ساتھ اندر چلی گئی ———!

نوجوان نے اپنی شہتولی کشتی میں سے شیر کی کھال نکالی ——— اپنے کاندھوں پر ڈالی، کشتی کو کھینچ کر ساحل سے باندھا اور محل کا رستہ لیا ———!

تیسرا باب (۳)

یہ نوجوان کون تھا؟ جو اپنی ناؤ پر ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا، اور جس نے شاہی بجرے کے تعاقب کی جرأت کر کے کشتیوں کی دوڑ میں سرزمین کُش کے پچاس شہ زور، کمر تک برہنہ، ملّاحوں کو جنہوں نے اپنے بدن پر زیتون کا تیل لگا رکھا تھا۔ نیچا دکھایا؟ اسے کس پراسرار جذبے نے اس برق پا مسابقہ میں شریک ہونے کی دعوت دے رکھی تھی؟ یہ ان بے شمار سوالوں میں سے ایک ہے جو قدرتی طور پر ہمارے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اس کے جواب کی فکر ہونی چاہیئے۔

لیکن یہ معلوم کرنا آسان بات نہیں ہے کہ سرزمین کُش کے اس نوجوان کے دماغ میں اس وقت کیا تھا جب وہ دو ہزار برس قبل ہرمان تھیس کے ناسپی سے واپس آتے وقت آیورگیلس کی دیبی اور ملکہ قلوبطرہ کے بجرے کے تعاقب میں مصروف تھا۔ تاہم اس کے خیالات کا اندازہ لگانے کی ہم ذیل میں کوشش کرتے ہیں۔

مندوشولیس کا بیٹا میامون ایک عجیب وغریب چال چلن کا نوجوان تھا - وہ ان باتوں سے قطعاً متاثر نہ ہوتا جن سے معمولی طبقوں میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی تھی - ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی برتر نسل کا فرد ہے ــــ شاید کسی دیوتا کا بیٹا - اس کی نظروں میں تنکرے کی آنکھوں کی سی چمک اور تیزی تھی - اس کے ابرو سے مرمریں بُت کی سی سنجیدگی ٹپک رہی تھی - ... ... وقار اس کے بالائی لبوں کو خمیدہ بنائے اور اس ... کو وحشی گھوڑے کے نتھنوں کی طرح پھلائے رکھتا تھا -

اگرچہ اُس کے جسم میں دوشیزاؤں کی سی نزاکت ولطافت پائی جاتی تھی اور اس کا سینہ دیانی سس دیبی کے سینے سے کسی طرح کم گداز اور ابھرا ہوا نہ تھا لیکن اس حریری بدن کے پردے میں آہنی اعصاب کی قوت اور ہرکولیس کی سی طاقت پنہاں تھی اور یہ خوبی صرف عہدِ قدیم کی بعض ہستیوں میں پائی جاتی ہے کہ نسائی حسن و جمال کے دوش بدوش انسان مردانہ اوصاف سے بھی متصف ہو -!

باقی رہا رنگ، تو ہمیں یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں کہ وہ نارنجی یا تمی کانسی کی طرح تھا - اس میں شک نہیں کہ یہ رنگ آج کل کے معیارِ حسن پر پورا نہیں اُترتا - لیکن اس زمانہ میں مردوں کا یہی رنگ بہترین تصور کیا جاتا تھا - اور وہ اس رنگ روپ میں کم جاذبِ نظر بھی نہ تھا - یہی وجہ تھی ہر قسم کی ــــ پیلی، لال، سیاہ سنہری اور سفید رنگ کی یونانی عورتیں بھی اس پر جان چھڑکتی تھیں لیکن اس سے یہ خیال نہ کیجیئے کہ اس کی قسمت ہر لحاظ سے قابلِ رشک تھی - بوڑھے پریام کی راکھ یا ہیولائی لش کی برف بھی اتنی سرد مہر اور بیحس نہ ہوگی - آئی سس کی نوایان، سفید پوش دوشیزائیں بھی اتنی پاک دامن نہ ہونگی - وہ نوجوان لڑکی بھی جس کے جذبات ماں کے سائے میں دم گھٹ کر رہ جائیں اتنی شرمیلی اور باحیا نہ ہوگی جتنا یہ نوجوان میامون تھا -

قدرتی طور پر اس قسم کے نوجوان کی تفریحات بھی انوکھی تھیں، علی الصبح وہ اپنی ننھی سی ڈھال، یا دریائی گھوڑے کی کھال، خمیدہ تلوار، خشت نما کمان اور نوکیلے تیروں سے اٹے ہوئے سانپ کی کھال کا ترکش لے کر باہر نکلتا - اور جنگل میں اپنی پتلی دبلی چھوٹے سر والی سدھائی ہوئی گھوڑی کو صحرا میں دور تک سرپٹ دوڑا دیتا - حتیٰ کہ وہ کسی شیر کا کھوج نکالنے میں کامیاب ہو جاتا - وہ شیرنیوں کے سینوں سے چمٹے ہوئے شیر کے بچوں کو علیحدہ کرنے میں خاص لذت محسوس کرتا تھا - اسے خطرناک یا ناقابلِ حصول مہموں میں کود پڑنے کا خاص شوق تھا - وہ ایسی جگہ گامزن ہونے کو ترجیح دیتا جہاں کم سے کم ایک انسان کو قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی - وہ حشر خیز سیلابوں میں کود پڑتا، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس نے رود نیل میں غسل کے لیئے آبشاروں کے قریب ایک مقام منتخب کیا تھا -!

دراصل قعرِ دریا اُسے پکار رہا تھا ــــ !!

یہ تھا میامون ابن مندوشولیس ــــ !!

لیکن کچھ عرصہ سے اس کی قلبی کیفیت پہلے سے بھی زیادہ وحشیانہ ہو رہی تھی - وہ مہینوں بانو کے سمندر میں غرق رہتا - اور کافی مدت کے بعد گھر واپس آتا - اس کی ماں جو اپنے بچے کے لیئے ہر وقت بیقرار رہتی - سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنی منتظر نظریں بیکار اُس سڑک پر گاڑ دیتی جو ریگزار کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی تھی - اور میامون کی راہ دیکھتی رہتی - آخر جب اس کی نگہ انتظار تھک تھک کر گر پڑتی تو دور افق کے پاس ایک بگولہ سا اڑتا دکھائی دیتا - اور تھوڑی دیر کے بعد دھول میں اَٹا ہوا میامون آتا دکھائی دیتا - اور اس کی گھوڑی کی یہ حالت ہوتی کہ بھیڑیئے کی طرح وحشتناک، پہلوؤں پر لاتعداد زخموں کے نشانات، جو رکاب کی ٹھوکر سے تو یقیناً نہ آئے ہوتے - نتھنے کانپتے ہوئے اور آنکھوں سے شرارے نکل رہے ہوتے تھے! میامون اپنے کمرے میں شیر یا چرخ کی کھال لٹکا دیتا، اور دوبارہ اپنی مہم پر روانہ ہو جاتا تھا -

اس کے باوجود میامون سے زیادہ کوئی شخص مسرور نہ ہوگا - اقاموتھس پادری کی بیٹی نفتے اس پر فدا تھی - میامون جیسا جوہر ناشناس ہی یہ دیکھنے سے قاصر رہتا کہ نفتے کی آنکھیں نیم باز اور خمار آلودہ تھیں، اس کے عنابی ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی، اس کے دانت موتیوں کو شرماتے تھے - اس کے بازوؤں کی گولائی ناقابلِ تشریح تھی - اس کے نازک نازک پاؤں گویا سنگِ لیشپ کے سانچے میں ڈھالے گئے ہوں - اس کی زلفوں کے مقابلہ میں مصر کی کوئی دراز یا کوتاہ زلف پیش نہ کی جا سکتی تھی ــــ نفتے کی شمع جمال بلاشبہ قلوپطرہ کے آفتابِ حسن کے آگے کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی لیکن قلوپطرہ سے اظہارِ تعشق کی کسے جرأت ہو سکتی تھی؟ ایگزوڈن نے جونو کی محبت میں محض ایک ابر پارے کو اپنی چھاتی سے لگایا لیکن اس کی پاداش میں وہ اَبد تک آتشِ جہنم میں جھلس رہی ہے!

یہ قلوپطرہ تھی، جس کے عشق میں میامون گرفتار تھا -!

پہلے اس نے اپنے جذبۂ شوق کو دبانا چاہا۔ وہ اپنی خواہشات سے مدّت تک جنگ آزما رہا لیکن شیر کا گلا گھونٹنا آسان ہے۔ جذبات کا گلا گھونٹنا آسان نہیں۔ اور بسا اوقات اس قوت آزما معرکہ میں شہ زور پہلوانوں کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ دیوتائے عشق کا تیر اس کے دل و جگر میں ترازو ہو چکا تھا اور وہ داغ الفت کو سینے میں نمایاں کئے ہر جگہ پھرتا تھا۔ قلوبطرہ، ـــــ اس کے جگمگاتے ہوئے شاہانہ تاج اور زرنگار قبا کا تصوّر ہر روز اس کے خوابوں کو منوّر کرتا اور دن کو بھی ہر وقت اس کے سامنے رہتا تھا۔ جس طرح کوئی ناعاقبت اندیش انسان سورج کی طرف دیکھنے کی جسارت کرے اور اس کے بعد اس کی نگاہوں میں ایک دھندلا سا داغ تیرتا رہے اسی طرح میامون کی نظروں میں بھی ہر وقت قلوبطرہ آباد رہتی تھی۔ ممکن ہے شہباز سورج کی جانب دیکھے اور اس کی نظروں میں چکاچوند پیدا نہ ہو۔ لیکن الماس کی وہ کون سی آنکھ ہے جو ایک حسین عورت ایک مہ وش ملکہ کے ضو فشاں چہرے پر گستاخ نگاہیں ڈالنے کی جراٴت کرے؟

آخر اس نے اپنی زندگی شاہی محل کے آس پاس آوارہ خرامی میں گزارنا شروع کی تاکہ وہ اسی ہوا میں سانس لے سکے جس میں قلوبطرہ سانس لیتی ہے اور اگر ہو سکے تو ریت پر اس کے نقوش پا کو بوسہ دے۔ (لیکن افسوس یہ خوش نصیبی اسے شاذ ہی میسر آتی تھی!) وہ اجتماعی دعاؤں میں اس امید پر شامل ہوتا کہ شاید وہ اپنی محبوبہ کی ایک جھلک، ایک ہلکی سی تجلی سے اپنی آنکھوں میں نور پیدا کر سکے۔ بعض اوقات وہ اپنی مجنونانہ زندگی سے تنگ آکر سیر و شکار میں زیادہ وقت صرف کرنا شروع کر دیتا۔ تاکہ شاید اس طرح اس کے خون کی پیاس بجھ سکے، اور وہ اپنے جذبات کو تسکین دے سکے۔!

وہ ملکہ کے دیدار کے لئے ہر آن تھیس کی اجتماعی دعا میں بھی شریک ہونے کے لئے گیا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، لہٰذا اس نے سورج کی تیکھی اور چبھتی ہوئی شعاعوں کے باوجود شاہی بجرے کا تعاقب کیا۔ اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے بدن "گرمائی محل" کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ فیصلہ کن مرحلہ قریب ہے کیونکہ وہ اپنے سینے میں محبت کے راز کو زیادہ دیر تک چھپا کر موت سے ہمکنار نہ ہونا چاہتا تھا۔

ملکہ سے اظہار تعشق بھی کتنی عجیب چیز ہے؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ ایک ستارے سے محبت کر رہے ہیں۔ تاہم ستارہ تو ہر رات اپنے مستقر پر آکر دیدار عام دیتا ہے۔ اور اگر آپ اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھیں تو وہ خشمگین نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا اس غریب، گمنام اور مفلوک الحال نوجوان کی بیکسی و بے بسی کا اندازہ کیجئے جو زینے کے عین نیچے کسی مہ پارہ، مہ وش اور حسین عورت کی محبت میں دل گرفتہ بیٹھا ہو۔ ایک ایسی عورت کی محبت میں جس کا ادنیٰ سا ادنیٰ غلام بھی اسے سرزنش کر سکتا ہو۔ ایک ایسی عورت کی محبت میں جو منظر عام پر نہ آتی ہو۔ ایک ایسی عورت کی محبت میں جس کے نزدیک اس کے عاشق کی قدر و قیمت انسانیت کے سمندر میں اس موج جتنی بھی نہ ہو جو سطح آب پر سیکڑوں مرتبہ آپ کے سامنے ابھر لیکن آپ اسے دوسری موجوں کے درمیان متمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک ایسی عورت کی محبت میں جو عاشق کو عرض حال کے لئے بھی اپنے حضور میں حاضر ہونے کی اجازت نہ دے۔ ایک ایسی عورت کی محبت میں جس کی شان و شوکت، عظمت و حشمت، رعب و دبدبہ اور حسن و جمال کے معاوضہ میں وہ محبت اور جوانی کے تحفہ کے سوا کچھ بھی پیش نہ کر سکتا ہو ـــــ!!

یہ تھے وہ خیالات جو میامون کے دماغ میں بار بار گھوم رہے تھے! وہ اپنی ٹھوڑی کو ہاتھ کی ہتھیلی سے سہارا دیکر ریت پر اوندھا لیٹ گیا اور اپنے آپ کو لامتناہی خیالات و تصورات کی تیز و تند رَو میں بہنے کی اجازت دے دی۔ اس نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ہزاروں تجویزیں سوچیں لیکن اس کی ہر تجویز پہلے سے زیادہ جنوں خیز و وحشت انگیز ہوتی تھی! اسے یقین ہو گیا کہ وہ ناقابل حصول چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن اسے اپنا ارادہ ملتوی کر دینے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر ایک پُر فریب اُمید نے اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے سبز باغ دکھائے۔

"آفتاب ـــ باعظمت دیوتا!" وہ گہری آواز میں بڑبڑایا "آخر میں نے تمہارا کیا گناہ کیا ہے کہ مجھے ان مصائب میں مبتلا ہونا پڑا؟ کیا تیری آتش انتقام اس لئے بھڑک اٹھی ہے کہ میں آفاموسکس پادری کی بیٹی نفتے سے نفرت کرتا ہوں؟ کیا یہ سزا مجھے اس لئے دی جا رہی ہے کہ میں نے لیمیہ یا فلورا کی محبت کو ٹھکرا دیا؟ کیا میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں حسن و جمال کے لحاظ سے تیری حریف قلوبطرہ کو دل دے بیٹھا ہوں؟ آخر تو نے میرے دل کو زہر میں بجھے ہوئے عشق کے تیروں سے کیوں چھید ڈالا؟ تو مجھ سے کون سی قربانی کا مطالبہ کرتی ہے؟ کیا میں تیرے لئے سیّن کے گلا! سرمر کا ایک مجسمہ

تیار کی جائے۔ جس کے ستونوں پر طلاکاری کی گئی ہو اور جس کی چھت پتھر کی ایک ہی سل سے تیار کی جائے اور اس پر تھیبس اور ممفس کے بہترین کاریگر ہیرا غلیفی حروف میں نقاشی کریں؟ جواب دو۔ دیبی!"

لیکن آتھور دیبی نے دوسرے دیوی دیوتاؤں کی طرح اس کی عرضداشت کا جواب ایک گہرے سکوت سے دیا۔ چنانچہ میامون نے ایک خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔!

قلوبطرہ نے بھی اسی طرح آتھور دیبی سے استدعا کی۔ اس نے دعا مانگی کہ اے دیبی! مجھے ایک نئی مسرت، ایک نئی سنسنی عطا کر۔!

صوفے پر آرام سے لیٹے ہوئے اس نے خیال کیا کہ انسان کے احساسات محدود ہیں۔ اس لئے بہترین جذبہ بھی تسکین کے بعد ناکارہ ہو جاتا ہے۔ لہذا ایک ملکہ کے لئے ہر لمحہ کسی نہ کسی نئے کام میں مصروف رہنا آسان نہیں ہے۔ غلاموں پر نئی نئی قسم کی زہریلی چیزوں کا تجربہ

شیروں سے آدمیوں کا دنگل، مگرمچھوں کی لڑائی، موتیوں کو شربت میں گھول کر پینا۔ ملک کی دولت کو پانی کی طرح بہانا۔۔ یہ سب چیزیں میرے لئے عام اور غیر دلچسپ ہو چکی ہیں۔!!

شارمین حیران تھی کہ وہ اپنی ملکہ کا دل بہلانے کے لئے کیا کرے؟

اچانک ایک سیٹی کی آواز سنائی دی۔ اور ایک سنسناتا ہوا تیر آکر دیوار کے صندلی حاشیے میں اٹک گیا۔!

قلوبطرہ خوفزدہ ہو کر قریباً بیہوش ہو گئی۔ شارمین نے بھاگ کر کھڑکی میں سے دیکھا تو دریا میں اڑتی ہوئی جھاگ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ تیر کے گرد پیپرس کا ایک پارچہ لپٹا ہوا تھا۔ جس پر خوشنما طرز نگارش میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔!"

چوتھا باب (۴)

"میں تم سے محبت کرتا ہوں!" قلوبطرہ نے سانپ کی طرح لہراتے ہوئے پیپرس کے پرزے کو اپنی گوری گوری نازک انگلیوں سے مسلتے ہوئے دہرایا۔ "یہی تو وہ الفاظ ہیں جن کی میں مدت سے پیاسی تھی۔ آخر کس ذہین روح نے، کس نادیدنی فطانت نے میری خواہش کا اتنا صحیح اندازہ لگا لیا؟" اور وہ اپنی سستی ترک کر کے اس بلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنے بستر پر سے اٹھی جس نے چوہے کی بو سونگھ لی ہو۔ اس نے اپنے مرمریں پاؤں جواہر نگار چپل میں داخل کئے۔ ریشمیں چغہ اپنے کاندھوں پر ڈالا۔ اور اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی جس میں سے شارمین اب بھی باہر جھانک رہی تھی۔

رات پرسکون تھی۔ مطلع صاف تھا۔ چاند محل کی بھاری بھرکم فصیل پر ضیا ریز تھا اور عمارتوں کے لمبے لمبے سائے سطح آب پر لرز رہے تھے۔ ماہتاب کی سیمیں کرنیں دریا کی لہروں سے کھیل رہی تھیں۔ سرکنڈوں میں ہلکی ہلکی ہوا سرسرا رہی تھی۔ جس پر خوابیدہ ابوالہولوں کی سانس کا گمان ہوتا تھا۔ کنول کے گھنٹی نما پھول مستی میں جھوم رہے تھے۔ نیل کے کنارے بندھے ہوئے جہازوں کے لنگر آہستہ آہستہ جھنجھنا رہے تھے۔ اور موج زر کی لہریں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر اس طرح آہ و زاری کر رہی تھیں جیسے ایک فاختہ اپنے ساتھی کے لئے بیقرار ہو۔ ہریاول کی مبہم خوشبو کمرے میں آوارہ پھر رہی تھی اور اس عود و عنبر سے بھی بڑھ کر بھلی معلوم ہو رہی تھی جو ایزیس کے پادری معبدوں میں سلگاتے ہیں۔۔ الغرض یہ مشرق کی حسین ترین رات تھی۔۔!

"وہ دیکھو! عین منجدھار میں ایک آدمی کا سر تیرتا جا رہا ہے وہ دیکھو! اب وہ روشنی کو عبور کر کے تاریکی میں چلا گیا ہے۔ ایلو! اب وہ نظروں سے بالکل غایب ہو چکا ہے!" اور شارمین کے کاندھوں کا سہارا لئے وہ کھڑکی میں اتنی جھک گئی کہ اس کے نازک بدن کا نصف حصہ دہلیز سے باہر ہو گیا۔ وہ اس پر اسرار پیراک کی ایک اور جھلک دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ببول اور کھجور کے ایک جھنڈ کے سائے میں بھگوڑا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور قلوبطرہ اسے نہ دیکھ سکی۔ آہ! اگر میامون ایک دفعہ بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتا تو اسے قلوبطرہ۔۔ مصر کی ملکہ۔۔ کی ایک نظر افروز تجلی دیکھنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن افسوس! گمنام مصری! بیچارا شیروں کا شکاری!!!

"شارمین! شارمین!! ملاحوں کے سردار فری ہیپ بھور کو فوڑا بھیجو کہ وہ دو کشتیاں لیکر ابھی اُس کا پیچھا کریں" قلوبطرہ جسے اُس معاملہ سے دلچسپی ہو چکی تھی بے اختیار چلا اٹھی۔

فری ہیپ بھور نباسی قبیلہ کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے اور بازو مضبوط تھے۔ وہ ایک سُرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ جس کی شکل فراعین کے خود کی طرح تھی۔ اس نے اپنے کالے کلوٹے بدن پر صرف ایک پاجامہ لپیٹ رکھا تھا جس پر سفید اور نیلی ترچھی دھاریاں تھیں۔ سنگ موسیٰ کے کتبے کی طرح اس کا دھڑ چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے ملکہ کا حکم سنا اور فوڑا اس کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ اگلے ہی لمحہ دو لمبی اور تنگ کشتیاں جو اتنی ہلکی پھلکی تھیں کہ اگر توازن کی طرف سے ذرا بھی غفلت برتی جاتی تو فوڑا الٹ جاتیں، پچاس ملاحوں کی قوت سے دریائے نیل کو چیرتی ہوئی روانہ ہو گئیں لیکن یہ تعاقب بیسود تھا، فری ہیپ بھور نے دریا کے ساحل کا کونا کونا چھان مارا۔ سرکنڈے کے ایک ایک جھنڈ میں تلاش کیا۔ لیکن بجز اس کے کچھ حاصل نہ ہوا کہ "دُکتے" ایک ٹانگ پر کھڑے، اونگھتے ہوئے چند بگلے ڈر کر بھاگے۔ یا کسی مگرمچھ کی مچگالی میں فرق آیا اور وہ دوڑ نکلا۔ چنانچہ ہیپ بھور خالی ہاتھ محل میں واپس آ گیا۔

جب قلوبطرہ نے اپنے منصوبے کو خاک میں ملتے دیکھا تو وہ تش زیرپا ہو گئی اور قریب تھا کہ وہ ہیپ بھور کو مردود قرار دیکر بھوکے درندوں کے آگے پھنکوا دیتی یا قید بامشقت کا حکم صادر کرتی لیکن خوش قسمتی سے شارمین نے اس بیچارے کی سفارش کر کے سے بچا لیا۔ قلوبطرہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی ایک خواہش فوڑا نہ پوری ہو سکی تھی۔ اس لئے وہ قدرتی طور پر بےچین ہو گئی۔

وہ —— قلوبطرہ —— بطلیموس کی بہن اور بیوی —— وہ ہ ایورگیٹیس کی دیبی کا خطاب ملا تھا، جو بالائے زمین اور زیرِ زمین کی فرماں روا تھی۔ جو آنکھوں کا نور تھی، جو سورج دیوتا کی چہیتی (جیسا کہ مندروں کے کارنس پر اب بھی اَن مٹ حروف میں لکھا موجود ہے) اس کے رستہ میں رکاوٹ حائل ہو؟ وہ ایک خواہش کرے اور اسے نہ مل سکے؟ وہ ایک لفظ زبان سے نکالے اس پر عمل نہ کیا جائے؟ گویا وہ ملکہ نہ ہوئی کسی جنوبی، کسی نخلستان والے کسی شوریدہ سار بدقسمت کی بیوی ہوئی۔ یہ سراسر بے ادبی بیہودگی ہے! اور شاید کوئی ضرورت سے زیادہ نرم مزاج، حلیم الطبع ملکہ ہوتی جو اُس پاجی فری ہیپ بھور کی کھڑے کھڑے گردن نہ اُڑا دیتی۔!!

تمہاری اپنی ہی تمنا تو تھی کہ تمہاری زندگی میں کوئی انقلاب آئے۔ تمھیں کسی غیر متوقع حادثہ سے دوچار ہونا پڑے۔ اب تمہاری خواہش پوری ہو گئی۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا کہ تمہاری سلطنت اتنی مردہ نہیں، جتنی تم خیال کرتی تھیں۔ وہ تیر کسی تُھڑکے بازو نے نہیں مارا۔ وہ دو لفظ جو تم پر بھی اثر کئے بغیر نہ رہے۔ کسی حنوط شدہ لاش کے دل سے نہیں نکلے۔ ہاں تم پر جو ستم خوردہ غلاموں کو سنگین دیواروں سے سر پٹختے اور سنگِ سماق کے پچرنگے فرش پر نزع کی تکلیف سے بیتاب ہو کر ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں، ہاں —— !تم پر، جو شیر ببر کو شکست خوردہ تیغ زن کی کھال میں دانت گاڑتے ہوئے دیکھ کر "آفرین" کہہ اٹھتی تھیں!! تم جس چیز کی خواہش بھی کرو، تمھیں مل سکتی ہے —— چاندی کے رتھ جن پر زبرجد کے ستارے جڑے ہوئے ہوں، تین دفعہ رنگے ہوئے ارغوانی چوغے، پگھلے ہوئے فولاد کے اتنے شفاف آئینے کہ ان میں تمہارے حسن کی تمامتر دلکشیاں منعکس ہو سکیں۔ سرزمین سیریکا کے اتنے لطیف اور مہین ملبوسات کہ اگر ان کو تہہ کیا جائے تو تمہاری انگوٹھی کے حلقے میں سے گزر سکیں۔ مشرق کے زنگار رنگ ہیرے، مائی رآن یا لالیسی لیس کے ساختہ جام، ہندوستان کے کم دُمے طوطے جو شاعروں کی طرح نواسنجیاں کر سکتے ہیں —— اسی طرح تم جو مانگو تمھیں مل سکتا ہے۔ حتیٰ کہ تم زہرہ کے بُندے اور آئیسس کی چپل بھی طلب کرو تو تمہاری خواہش پوری ہو جائیگی۔ لیکن تم آج کی رات اس آدمی کو گرفتار نہیں کر سکتیں جس نے وہ تیر پھینکا ہے جواب بھی تمہارے کمرے کے صندلی حاشیے میں اٹکا ہوا کپکپا رہا ہے ——!!

کل تمہاری پوشاک تبدیل کرنے والی خادماؤں کی خیر نہیں، وہ تمہارے گھونسوں سے اَدھ موئی ہو جائینگی۔ تم اپنی اناڑی کنیز کی چھاتی میں "بال آلپن" چبھو چبھو کر اسے "پن گدی" بنا کر چھوڑو گی اور بہت ممکن ہے کہ تم اپنی مشاطہ کو چھت سے اُلٹا لٹکا دو۔

"آخر یہ کس مردود کو جرأت ہوئی کہ وہ ایک تیر کے ساتھ یہ محبت نامہ لکھ کر مجھے بھیجے؟ کیا یہ نوبارک عمون سے تو نہیں جو اپنے آپ کو یونانیوں کے اپالو (سرپا دیوتا) سے بھی حسین خیال کرتا ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے شارمین؟ یا شاید چپا لیسرو ہے جو ہر وقت کیا

کاکمانڈر ہے۔ اور سرزمین کُش کی فتوحات پر بہت نازاں ہے؟ یا ممکن ہے وہ بدمعاش سیکسٹس ہو جو اپنے چہرے پر غازہ لگاتا ہے باتیں کرتے وقت ہکلاتا ہے اور پیرسیوں کی طرح عجیب وغریب قسم کی آستینیں پہنتا ہے؟"

"ملکہ! ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ اگرچہ آپ دنیا کی حسین ترین خاتون ہیں۔ لیکن یہ سب مرد آپ کی چاپلوسی کرتے ہیں آپ سے محبت نہیں کرتے۔ لومارک عمون رع نے تو ایک ایسا بُت منتخب کر لیا ہے۔ جس کا وہ ہمیشہ وفادار غلام رہے گا۔ اور یہ بُت اس کا اپنا نفس ہے۔ تیغ زن چیاسیرو کو اپنی فتوحات کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہے۔ باقی رہا سیکسٹس تو وہ ایک نئی قسم کے خوشبودار مصالحہ کی ایجاد میں اس درجہ منہمک ہے کہ وہ کسی اور چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اس نے حال ہی میں بعض ریشمی قبائیں خرید کی ہیں جن پر سونے کے تاروں سے کشیدہ کاری کی گئی ہے۔ پھر اُس کے پاس بعض ایشیائی لڑکے ہیں جن کے درمیان اس کا سارا وقت گزرتا ہے۔ بہرحال ان میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے۔ جو اپنا سر اوکھلی میں دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ یہ لوگ اتنا خطرہ مول لے کر آپ سے اظہارِ تعشق کی جرأت نہیں کر سکتے۔

"کل بجرے میں آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ مرد آپ کے چہرے پر نگاہیں ڈالنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اور یہ کہ آپ کی موجودگی میں ان کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ وہ آپ کے قدموں میں گر کر رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔ اس لئے آپ کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ آپ محبت کے لئے کسی حنوط شدہ فرعون کو اپنے طلائی صندوقچے میں سے بیدار کریں۔ لیکن اب ملکۂ عالم! آپ کے سامنے ایک نوجوان اور محبت بھرا دل ہے۔ دیکھئے! آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں؟"

اُس رات قلوپطرہ کو نیند نہ آئی۔ وہ اپنے صوفے پر بار بار پہلو بدلتی اور دیوتائے موت کے بھائی مارفیس کو پکارتی رہی لیکن نیند کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس نے نہایت دردناک لہجے میں شارمین کو بتایا کہ میں دنیا کی بدبخت ترین ملکہ ہوں۔ ہر شخص مجھے تنگ کرنا چاہتا ہے۔ اور میری زندگی اذیت ناک ہو چکی ہے۔ شارمین نے بظاہر اُسے دلاسا دیا لیکن دراصل اس کے دل پر ملکہ کی ماتم سرائیوں کا مطلق اثر نہ تھا۔

اب ہم کچھ عرصہ کے لئے قلوپطرہ کو نیند کی تلاش میں اور محل کے عمائدین کو باری باری اپنے شکوک وشبہات کا مرکز بناتے ہوئے چھوڑتے ہیں۔ اور اپنی توجہ میاموّن کی جانب مبذول کرتے ہیں اور چونکہ ہم ملاحوں کے سردار فری ہیف بھور کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ دانشمند ہیں اس لئے ہمیں اس کی تلاش میں یقیناً کوئی دقت نہ ہوگی۔!

میاموّن نے اپنے ہی جرأت آزما اقدام سے خوفزدہ ہو کر دریائے نیل میں چھلانگ لگا دی اور ابھی فری ہیف بھور نے اپنی کشتیاں بھی نہ سنبھالی تھیں کہ وہ کھجوروں کے لمبے لمبے سنے کی اوٹ میں تیرتا ہوا دریائے نیل کے دوسرے کنارے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب اس کے دَم میں دَم آیا تو اُس نے اپنے لمبے لمبے گیسو جھٹک کر کانوں کے پیچھے پھینکے اور اب وہ اپنے دل میں قدرے راحت وسکون محسوس کرنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کہ قلوپطرہ کے پاس میری کم سے کم ایک چیز فرد ایسی ہے جو آئندہ مخاطبت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ قلوپطرہ اس وقت میرا ہی خیال کر رہی ہوگی۔ اظہارِ ناراضی کے طور پر ہی سہی لیکن بہرحال میں اس کے تصورات کی دنیا میں بس چکا ہوں۔ میں نے اُسے اپنی موجودگی کا احساس تو دلا دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے تیر پر اپنا نام کندہ کرنا یاد نہ رہا۔ لیکن اس سے کیا ہو سکتا ہے؟ اُسے کیا معلوم میاموّن کون ہے؟ اس کی نگاہوں میں آقا و غلام برابر ہیں۔ ایک دیوی جب اپنے لئے عاشق کا انتخاب کرتی ہے۔ تو جتنا بادشاہ کے قدموں میں جھکتی ہے اتنا ہی اسے کسان کے قدموں میں جھکنا پڑتا ہے۔ غیر فانی دیویاں جب بلندیوں پر سے کسی شخص کا انتخاب کرتی ہیں تو ان کے مدنظر بجز محبت کے کچھ نہیں ہوتا۔ آخر خیالات کا وہ بوجھ اُتر گیا جو کسی مجسمے کے بھاری بھرکم گھٹنے کی طرح میرے سینے پر پڑا تھا۔ اب میرے جذبات بادر ہوا ہو چکے ہیں۔ بلکہ ملکہ کے کانوں تک پہنچ چکے ہیں ——— ہاں! ملکہ! ——— مقدس شلّث کی منتہا، ناقابل حصول چوٹی! میرے خیالات نے ایک سنگدل کے دل میں کھلبلی ضرور مچا دی ہوگی، اور یہ بلاشبہ کامیابی کی دلیل ہے!

درحقیقت میاموّن کے وہم میں بھی نہ تھا کہ اُسے اتنی قابلِ رشک کامیابی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دل میں راحت

سکون محسوس کر رہا تھا اور اس نے تمام دیوتاؤں کی قسم کھائی تھی کہ وہ قلوبطرہ کی محبت حاصل کر کے رہے گا۔ خواہ اس تگ و دو میں اُسے جان ہی سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ اور خواہ یہ محبت صرف ایک رات یا ایک ساعت ہی کے لئے ہو۔!

اگر ہم یہ تشریح کرنے لگیں کہ وہ ایک ایسی عورت کے دام محبت میں کیونکر گرفتار ہو گیا تھا۔ جس کی ایک جھلک اس نے بہت دور سے دیکھی تھی۔ جس کے سامنے وہ آنکھ بھی اُٹھانے کی جراُت نہیں کر سکتا تھا۔ (حالانکہ وہ نڈر ہو کر شیروں کی زرد زرد آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا تھا) یا اگر ہم یہ بتانے کی کوشش کریں کہ محبت کا ننھا سا بیج کس طرح اس کے دل میں پنپنے لگا تھا اور نخل محبت کی جڑیں اس لمحہ بھر میں اس درجہ مضبوط کیونکر ہو چکی تھیں تو یہ بیسود ہو گا کیونکہ ان سوالوں کے جواب میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سربستہ راز ہے۔

ہم میامون کے بارے میں پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ قعرِ دریا اُسے پکار رہا تھا ——!!

جب اسے یقین ہو گیا کہ فری ہیبت بھور ناکامی کا منہ دیکھ کر اپنے ملاحوں کے ہمراہ واپس جا چکا ہے تو اس نے دوبارہ دریا کی لہروں میں چھلانگ لگائی اور ایک مرتبہ پھر تیرتا ہوا قلوبطرہ کے محل کے قریب جا پہنچا جس کے چراغ اب بھی کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے رنگین ستاروں کی مانند جھلملا رہے تھے۔ لینڈر بھی ہسپانس کے برج کی طرف اتنی جراُت و ہمت کے ساتھ تیر کر نہ گیا ہو گا لیکن کوئی ہیرو میامون کا انتظار نہ کر رہی تھی۔ جو اس کے بالوں میں تیل ڈالتی تاکہ سمندر کے کھاری پانی کی بدبو اور جھکڑ کے تھپیڑوں کی تھکان دور ہو سکے ——!!

اگر اسے کسی بات کا اندیشہ تھا تو یہ کہ قلوپطرہ کے محل کا کوئی چوکیدار اُس کی پیٹھ میں نیزے کی اَنی نہ بھونک دے۔ لیکن اُسے ان موہوم خطرات کی پروا نہ تھی۔!

وہ محل کی دیواروں کے ساتھ ساتھ جن کی مرمریں بنیادیں دریا کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں برابر تیرتا رہا اور آخر اس آب دوز محراب کے پاس پہنچ گیا جس میں دریا کا پانی گرداب بناتا ہوا داخل ہو رہا تھا۔ دو تین مرتبہ اس نے بھنور میں کودنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر خوش قسمتی سے اسے رستہ مل گیا اور وہ اندر داخل ہو کر غائب ہو گیا ——

یہ محراب اس سُرنگ کی تھی جس کے ذریعے سے دریائے نیل کا پانی قلوبطرہ کے حمام کے لئے جاتا تھا ——!!

پانچواں باب (۵)

قلوپطرہ کو صبح تک، جب آوارہ خواب "درعاج" میں واپس چلے جاتے ہیں، چین نہ آیا۔ اس نے متوقع نیند کے دھندلکوں میں ہر قسم کے عاشقوں کو دریاؤں میں تیرتے اور دیواروں کو پھاند کر اپنے پاس آتے دیکھا، اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے تصورات کے پردے میں بیشمار ایسے تیر اٹکے ہوئے ہیں جن پر "پیغام محبت" درج ہے۔ بعض اوقات وہ اچانک چونک اٹھتی۔ اور اس کے پاؤں غیر شعوری طور پر دھم سے شارمین کے سینہ میں جا لگتے جو اس کی پائنتی سرہانہ بن کر لیٹی ہوئی تھی۔

جب وہ بیدار ہوئی تو سورج کی ایک شوخ کرن کھڑکی کے پردے میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی، اپنے مانوس بستر پر کھیلنے لگی۔ اس کے بعد سنہری تتلی کی طرح اچک کر قلوبطرہ کے مرمریں شانوں پر جا بیٹھی۔ اور آہستہ سے اس کا ایک بوسہ تاباں لیا۔ آہ! کتنی خوش قسمت تھی وہ ——! دیوتاؤں کو بھی اس پر رشک آتا ہو گا۔

ایک بیمار بچے کی طرح، نحیف و نزار آواز میں قلوبطرہ نے کہا۔ "مجھے اٹھاؤ۔" دو خادماؤں نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا کر فرش پر بچھی ہوئی شیر کی کھال پر لٹا دیا۔ اس شیر قالین کی آنکھیں یاقوت اور پنجے سونے کے بنے تھے۔ شارمین نے اپنی مالکہ کو دودھ سے زیادہ سفید ململ کا لبادہ اوڑھا دیا۔ اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوار کر مینڈھیاں بنائیں، اور پاؤں میں کاگ کے ہلکے سلیپر پہنائے، جن کے تلوؤں پر، بطور اظہار نفرت و حقارت، نہایت

اور تموتیاہل کے زنجیروں میں جکڑے ہوئے، دو افراد کی مضحک تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں "قوموں کو روندنے والی ملکہ" کہلا سکے۔

اب غسل کا وقت تھا ——— قلوپطرہ اپنی خادماؤں کے ہمراہ حمام کی جانب گئی۔

قلوپطرہ کا حمام ایک عالیشان باغ میں بنایا گیا تھا جس میں آلوبے، چکوترے وغیرہ کے علاوہ ایرانی سیب کے بے شمار درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اور جن کی تروتازگی دیکھ کر انسان ادگرد کی خشکی و ویرانی کو چند لمحوں کے لئے بھول جاتا تھا۔ اس باغ میں سنگ احمر کی فلک شکوہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جن کے سہارے پھولدار بیلیں اوپر چڑھتی ہوئی آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ زینے کے ہر قدمچے پر چینی قلبکی مرمر کے گملے رکھے ہوئے تھے جو اتنے خوبصورت تھے کہ بالکل سوسن کے نوشگفتہ پھول نظر آتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں اُگے ہوئے پودے "بقچۂ گل" ہیں۔ گویا کسی یونانی سنگتراش نے "خوابوں" کو "حقیقت" میں ڈھال کر رکھ دیا ہے۔ گل ریز سبزہ زار پر چھوٹے چھوٹے ابوالہول جن کے چہروں سے سنجیدگی اور انداز سے تلوّن کا اظہار ہوتا تھا، یوں پاؤں پسارے بیٹھے تھے جیسے قالین پر سفید براق خرگوش بیٹھے ہوں۔ ان حسین ترین مجسموں میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ ان کے نقشے تراشیدہ۔ ابرو ملائم، دہن غنچہ نما، بازو چاہ زنخداں کی طرح گول اور جسم سڈول تھے۔ انھوں نے کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اُن کی پشت یا تو اُن نبات البحر کی دوشاخی دُموں کی طرح تھی جن کا ذکر ہومر نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ یا ان پرندوں کی طرح جن کے بازو پھیلے ہوئے ہوں، یا شیر کے کولھوں کی طرح، یا مروڑے ہوئے پتوں کے مرغولوں کی طرح ——— الغرض سنگتراشوں نے اپنی انتہائی قوت فکر سے کام لے کر ہر ابوالہول کی پشت ماحول اور انداز تعمیر کے مطابق تیار کی تھی۔ یہ خوشنما درندے محل سے حمام تک ایک روش پر دورویہ ایستادہ تھے۔ روش کے خاتمہ پر ایک گہرا تالاب تھا جس تک پہنچنے کے لئے زمین دوز سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہیرے کی طرح دمکتے ہوئے شفاف پانی کی سطح پر سیڑھیوں کا سایہ لرز رہا تھا۔ یہ سیڑھیاں تالاب کی تہ تک جا پہنچتی تھیں، جہاں ریت کی بجائے سونے کا سفوف بچھا دیا گیا تھا۔ یہاں یونانی کریاتائیڈ کی طرح حسین عورتوں کے مجسمے نصب تھے۔ جن کی چھاتیوں میں سے معطر آب زلال کی پتلی پتلی دھاریں چھوٹتی تھیں جو سیمیں شبنم کی طرح تالاب میں گرتیں اور بلوریں پانی میں ہلکی ہلکی لرزشیں پیدا کر دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان نسائی مجسموں کے سر پر سمندر کی دیوی دیوتاؤں کی مختلف تصویریں کندہ تھیں اور اس میں برنجی چھلے لگائے گئے تھے تاکہ پردوں کی ڈوریاں باندھنے میں آسانی ہو۔ غلام گردش سے ایک وسیع و عریض اور سرسبز و شاداب چمنستان نظر آتا تھا۔ جس کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا گویا وادئ ٹمپ کا ایک قطعہ مصر میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ سمیرامیس کے مشہور باغات بھی اس چمن سے لگا نہ کھا سکتے تھے۔

ہم یہاں ان سات یا آٹھ ہال کمروں کی تفصیل نہ درج کریں گے۔ جن میں ہر قسم کے تیل عطر اور سامان آرائش و زیبائش رکھا ہوا تھا۔

یہ تھی وہ جگہ ——— جہاں قلوپطرہ اپنے ایک ہاتھ سے تیمارتین کے کاندھوں کا سہارا لیکر آئی۔ اس نے بنفس نفیس صرف تین قدم اٹھائے تھے۔ اس کے باوجود وہ تھکان محسوس کر رہی تھی۔ اُف! کس درجہ زحمت اٹھائی تھی اس نے! اُس کے شیشے کی طرح شفاف رخساروں میں گلابیاں چھلک رہی تھیں۔ اس کی گوری گوری، کہربائی کنپٹیوں میں نیلگوں رگوں کا ایک جال پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی مرمریں، پرانی وضع کی پیشانی تنگ ہونے کے باوجود دلکش تھی۔ اس کی ناک جیسے سانچے میں ڈھال کر بنائی گئی ہو۔ اس کے گلابی نتھنے ذرا سی تحریک پر بھی عشق باز شیرنی کے نتھنوں کی طرح کپکپانے لگ جاتے تھے۔ اس کے چھوٹے سے گول منہ کے لبوں میں جو ناک سے قدرے فاصلے پر تھے ایک حقارت آمیز جھکاؤ تھا لیکن اس کے نچلے ہونٹ کی سرخیوں میں بے لگام شہوانیت اور ناقابل تشریح حیوانی جذبہ کی چمک تھی۔ اس کی آنکھوں پر ہموار پپوٹوں کا سایہ تھا اور اس کے ابرو ہلال کی طرح خمدار تھے۔ ہم اس کی آنکھوں کی تابانیوں پر قلم آرائی کرنے سے عاجز ہیں، بس یوں سمجھئے کہ ایک کیف تھا، ایک نشہ تھا، ایک خمار تھا جو سنگ سنگ ... اقوبس دیوتا پر بھی مدہوشی طاری کر دیتا۔ اس کی ہر نگاہ میں ایک شاعری انگڑائیاں لے رہی تھی، جس کا مقابلہ ہومر اور مینڈرس بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور اس کے شاہی چاہ ذقن میں قوت و طاقت کا ایک طوفان موجزن تھا۔

وہ تالاب کی پہلی سیڑھی پر اپنے تمامتر تفاخر و تجمل کے ساتھ

کھڑی تھی، اس کا جسم پیچھے کی طرف جھکا ہوا اور ایک قدم اوپر کو اُٹھا ہوا تھا —— اس دیوی کی طرح جو اپنے شہ نشین سے اُٹھ کر جانے والی ہو لیکن ابھی اس کی نظریں آسمان کی نیلاہٹوں میں آوارہ خرام ہوں! اس کا لبادہ نفیس ترین تہوں میں پستان کی گولائیوں سے پاؤں کی ایڑیوں تک لٹک رہا تھا۔ اگر کلیمونتس اس کا ہمعصر ہوتا اور اسے اس انداز میں کھڑے ہوئے دیکھ پاتا تو وہ یقیناً مایوسی کے عالم میں زہرہ کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔

پانی میں داخل ہونے سے پہلے قلوپطرہ نے کسی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر شارمین کو حکم دیا کہ میری مینڈھیاں کھول ڈالو۔ کیونکہ میں بنت البحر کی طرح سرکنڈے اور کنول کے پھول اپنے بالوں میں لگانا چاہتی ہوں۔ شارمین نے حکم کی تعمیل کی، اور اس کی سیاہ کالی زلفیں آزاد ہو کر اس کے مرمریں شانوں پر بکھر گئیں جن کے درمیان اس کے نرم گال پکے ہوئے انگور کے گچھے ... نظر آتے تھے۔

اس کے بعد ململ کا وہ لبادہ بھی جو ایک سنہرے کسوئے کے ساتھ اٹکا ہوا تھا، اس کے مرمریں بدن پر سے کھسکنے لگا اور سفید ریلے کی طرح اس کے پاؤں میں آگرا۔ جیسے لیڈا کے قدموں میں ہنس راج ——!

اور میامون؟ وہ کہاں تھا؟

آہ! انتہائی بدبختی یہ تھی کہ بعض بے جان اشیا پر ایسی نوازشوں کی بارش ہو رہی تھی، جو ایک عاشق نا شاد میں نئی زندگی کی روح پھونکنے پر قادر ہو سکتی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں کو مشکبو زلفوں سے کھیلنے اور ... کو چومنے کا موقع مل رہا تھا۔ حالانکہ وہ اسکی ... ایک انتہا درجے کے حسین جسم کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ لیکن وہ اس کی مسرت سے کیا واقف؟ آئینہ میں ایک ... کی تجلیاں منعکس ہو رہی تھیں لیکن اسے کیا خبر؟ ... دیوی کے پاؤں کو اپنی گرفت میں لیے تھا لیکن وہ اس ... کیا سمجھے؟

قلوپطرہ نے اپنی گلاب آسا ایڑیوں کو پانی میں ڈبویا، اور چند قدم نیچے اتری۔ کانپتے ہوئے آب رواں نے اس کی کمر کے گرد ایک سیمیں ہالہ بنا لیا۔ بازوؤں پر سیمابی کنگن پہنا دیئے، اور اس کے سینے اور شانوں پر اس طرح لرزنے لگا جیسے ٹوٹے ہوئے ہار کے موتی ہوں۔ اس کی بکھری ہوئی زلفوں کو پانی کی موجوں نے اپنے دوش پر یوں اُٹھا لیا جیسے شاہی لبادہ ہو۔ وہ غسل کے وقت بھی ملکہ تھی۔ کبھی وہ تیرتی، کبھی ڈبکیاں لگاتی، اور کبھی تہ میں سے ... خوف اٹھا کر مذاقاً اپنی خادماؤں کے منہ پر دے مارتی

کبھی تالاب کے کنہرے کے ساتھ ٹیک کر اپنے گنجینۂ حسن کو نمایاں یا پنہاں کرتی۔ کبھی وہ اپنی بلوریں پشت کی ایک جھلک دکھاتی اور کبھی زہرہ کی طرح اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ باہر آجاتی تھی۔

اچانک اُس نے ایک باریک چیخ ماری —— ڈیانا کی طرح جو ایکٹین کو دیکھ کر بھوچکا رہ گیا تھا۔ اس نے قریب کے پتوں میں ایک چمکتی ہوئی آنکھ دیکھی تھی —— شیر یا مگرمچھ کی آنکھ کی طرح —— فاسفری یا پیلی ——!!

یہ میامون تھا جو پتوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گیہوں کے کھیت میں بیٹھی ہوئی مرغی کی طرح کانپ رہا تھا۔ ملکہ کو غسل میں مصروف دیکھ کر اس پر سرمستی کا عالم طاری تھا۔ قلوپطرہ اگرچہ دلیر و بیباک تھی لیکن چیخ اس کے اپنے دل کو نشتر کی طرح پھاڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ ایڑی سے چوٹی تک موت کے پسینے سے تر بتر ہو گئی۔ اس کی کنپٹیوں کی رگوں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ خوف و دہشت نے اس کا گویا گلا گھونٹ دیا۔

خواجہ سرا بھالے ہاتھ میں لے کر دوڑے۔ قلوپطرہ نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں میامون کے چھپنے کی جگہ بتائی۔ دفاع بے سود تھا۔ اور اس نے مقابلہ کی کوشش بھی نہ کی۔ چنانچہ اسے پکڑ لیا گیا۔ خواجہ سراؤں نے اسے بے رحمی سے کچل دینا چاہا لیکن قلوپطرہ نے جو اس وقت تک لبادہ اوڑھ چکی تھی ان کو روک دیا اور ملزم کو اپنے حضور میں پیش کرنے کا حکم جاری کیا۔

میامون بجز اس کے کیا کر سکتا تھا کہ اس کے پاؤں پڑتا اور اس سے رحم کی بھیک مانگتا ——!!

"کیا تم روم کے رشوت خور قاتل ہو۔ کہ ایک ایسے مقدس مقام میں درانہ گھس آئے ہو، جہاں مردوں کو نزدیک بھی پھٹکنے کی اجازت نہیں ہے؟" قلوپطرہ نے شاہانہ انداز میں استفسار کیا۔

"اے ملکہ! اگر میری نیت خراب ہو تو میری روح کا وزن اتنی کے میزان میں کم نکلے، اور دختر آفتاب تھی مجھ پر پھٹکار کرے۔" میامون نے اس کے قدموں میں گرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے سے خلوص و وفا کے جذبات اتنی وضاحت سے مترشح تھے کہ قلوپطرہ کے تمام شکوک و شبہات دھواں بن کر اُڑ گئے اور اس نے مصری نوجوان کو نسبتہً کم قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے علاوہ ایک ہی نظر میں اس نے بھانپ لیا کہ وہ ایک خوبصورت نوجوان ہے ——!

"تو پھر تم کس جذبہ کے ماتحت ایک ایسے مقام میں چلے آئے جہاں موت تمھارا استقبال کریگی ہے"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں" میاتھون نے دھیمی لیکن صاف آواز میں ٹھہرتے ہوئے کہا۔ اب اس کی جرأت عود کر آئی تھی۔ کیونکہ وہ یہ کھیل جانا چاہتا تھا۔

"آہ!" قلوبطرہ نے اس کی طرف جھکتے ہوئے اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "تو کیا وہ تم تھے جس نے پیرس کے ساتھ ایک تیر میرے کمرے میں پھینکا تھا۔ سگِ جہنم اور مِس کی قسم تم بھی بدبخت انسان ہو۔ اب میں نے تمھیں پہچانا۔ میں تمھیں ایک سائے کی طرح اپنی اقامت گاہ کے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ تم نا ہی تمھیں معبد میں آئی سس کے جلوس میں بھی شامل ہوئے تھے۔ تم نے شاہی بجرے کا تعاقب کیا۔ آہ! کیا واقعی تمھیں ایک ملکہ کی ضرورت ہے۔ تمھاری خواہش ادنیٰ درجے کی نہیں ہے۔ بلا شبہ تمھیں محبت کرنا چاہیئے —— میں یقیناً تم سے محبت کرونگی —— آخر کیوں نہ کروں؟"

"ملکہ!" میاتھون نے مایوسی کے لہجہ میں کہا۔ "طنز آمیز گفتگو نہ کرو۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ میں موت کا مستحق ہوں، یہ بھی صحیح ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔ ان کو حکم دو کہ مجھے مار ڈالیں۔"

"نہیں —— آج میں رحمدل ہونا چاہتی ہوں، میں نے تمھاری جان بخشی کی۔"

"میں زندگی لیکر کیا کروں؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"تو پھر تمھاری خواہش کو پورا کیا جائیگا۔ لیکن تمھیں مرنا ہوگا۔" قلوبطرہ نے جواب دیا۔ "تم بڑے بڑے خواب دیکھتے رہے۔ تصور میں تمھارے عزائم ناقابلِ عبور آستانے تک پہنچ گئے۔ تم نے اپنے آپ کو قیصرِ روم یا مارک انطونی سمجھا۔ تم نے ایک ملکہ سے محبت کی۔ تم نے اپنے کسی جنون میں خیال کر لیا کہ شاید قلوبطرہ بھی کسی روز تم سے محبت کرنے لگے۔ حالانکہ ایسا اتفاق ہزاروں برس کے بعد صرف ایک مرتبہ ہو سکتا ہے تاہم جس بات کو تم نے "ناممکن" خیال کیا۔ اب "ممکن" ہونے والی ہے۔ میں تمھارے خواب کو عمل و حقیقت کا جامہ پہناؤں گی۔ میں تم پر شاہانہ فیوض و برکات کا خزانہ کھول دونگی۔ میں تمھاری قسمت کو آتش و بناؤنگی کہ لوگوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جائے۔ تم پیر جھوک کے نیچے بیٹھے تھے۔ میں تم کو آسمان پر بٹھاؤنگی۔ یک لحظہ، یک لمحہ بلا روک ٹوک —— میں تمھیں عدم سے نکال کر دیوتا بناؤں گی، اور اس کے بعد پھر نیستی میں پھینک دونگی۔ بس اس سے زیادہ ناممکن ہے! لیکن اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں ظالم ہوں، نہ ہی رحم کی بھیک مانگنے کی کوشش کرو۔ بس ثابت قدم رہو! میں تم سے اچھا سلوک کرونگی! میں تمھاری حماقت کے بدلے میں اپنا جسم مستعار دینے کے لئے تیار رہوں، میں تمھیں فوراً موت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم دے سکتی تھی۔ لیکن تم کہتے ہو کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ لہذا اب میں اپنا حکم کل صادر کرونگی، تمھاری زندگی ایک رات کے لئے میری ہے۔ میں فیاض ہوں۔ میں تم سے تمھاری زندگی خرید لوں گی۔ حالانکہ میں اسے زبردستی بھی چھین سکتی تھی! —— لیکن تم میرے قدموں میں پڑے کیا کر رہے ہو؟ اٹھو ——! اور میرا بازو تھام لو —— تاکہ ہم دونوں —— محل میں واپس چلیں ——!!"

چھٹا باب (۶)

دنیائے قدیم کے مقابلہ میں ہماری آج کل کی دنیا بہت حقیر ہے ہمدمی امرا اور رائیسلئے قدیم کی شاندار اور مکلف دعوتوں کے مقابلے میں ہماری دعوتیں بے وقعت و بے حیثیت ہیں۔ ان کے معمولی سے ناشتے کو آج کل اسراف اور فضول خرچی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دوستوں کے اعزاز میں لکولس کی معمولی سی دعوت کے بچے کھچے ٹکڑوں پر آج کل کے شہر آٹھ روز تک گزارا کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی تنگ نظری کے باعث یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس زمانے کے لوگ کتنی شہنشاہانہ اور تحیر زا زندگی بسر کرتے تھے۔ آج کل کے محل اس زمانہ کے اصطبلوں سے زیادہ وسیع نہیں ہوتے۔ جن میں کیلیگولا اپنے گھوڑے رکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ ہمارے امیر سے امیر دستوری بادشاہ کے نوکر جاکر روم کے معمولی صوبیدار و حاکم کے خدم و حشم کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ خوش قسمتی کا وہ سورج اب

ہمیشہ کے لئے غروب ہو چکا ہے۔ جو کسی زمانہ میں کُرۂ ارض پر ضوفشاں تھا۔ اب وہ دیو پیکر کہاں، جنھوں نے ہوتمر کے گھوڑے کی طرح دنیا کو تین ہی قدم میں روند ڈالا۔ اب وہ نیلاآں کے آسمان رفعت گنبد، بابل کے فلک شگاف منار، اور پر شکوہ معبد پیوند زمین ہو چکے ہیں جو پہاڑوں کو کاٹ کر تعمیر کئے گئے تھے۔ اب وہ شہنشاہانہ سیڑھیاں بھی نہیں رہیں۔ جن کے ایک ایک قدمچہ کی تعمیر کے لئے نسلیں درکار رہیں اور جن کی چوٹی پر کھڑے ہو کر انسان دنیا کو ایک نقشے کی طرح اپنے سامنے کھلا پاتا تھا۔ اب وہ وسیع و عریض شہر بھی موجود نہیں رہے جن کی جناتی عمارتیں گویا ایک دوسرے پر تھوپ دی گئی تھیں۔ جن کے چوراہوں میں دن رات غلغلہ برپا رہتا تھا۔ جن کے بڑے بڑے تالابوں میں ایک پورا سمندر سما سکتا تھا جن کی سیڑھیاں ایک دوسرے سے لپٹی پڑتی تھیں۔ جن کے گنبدوں کی چوٹیاں پہاڑوں سے ٹکراتی تھیں اور جن کے سایہ دار گورستان، آبی شاہراہوں اور نہروں کا مقابلہ آج تک نہیں ہو سکا۔ افسوس! اب یہ تمام مکانات اور عمارتیں شطرنج کی بساط پر پلستر کے خانۂ زنبور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں — !

باوجودیکہ چند "نفوس قدسی" نے اپنی ذاتی راحت و آسائش کے لئے دولت و امارت کو اس بیدردی کے ساتھ سمیٹ لیا تھا، یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بیکسوں اور مجبوروں نے ان کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند نہ کیا۔ نہ ہی ملک کو ایک ایسے انقلاب سے گزرنا پڑا جس کو "خونیں" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ستموں اور سرمایہ دار مافوق الفطرت اور برتر انسان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور ان کی شوکت و حشمت دیکھ کر عوام کی نہ صرف آنکھیں چندھیا گئیں بلکہ ان کی ذہنیتیں بھی تبدیل ہو گئیں۔ چنانچہ وہ شہنشاہانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی بجائے اس کی پرستش کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیاصرِ روم اور فراعنۂ مصر کو اپنی رعایا پر رعب و دبدبہ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔

تاہم ہمارا فرض ہے کہ ہم اس بدمستی و خرمستی کا منظر کھینچیں جس کا مظاہرہ اُس رات قلوپطرہ کے محل میں کیا گیا۔ یہ دعوت اتنی خیرہ کن اور شاندار تھی کہ اس کے سامنے بیلشزار کی ضیافتیں بھی پھیکی نظر آتی ہیں۔ لیکن ہم اپنی زبان میں ——— جو اتنی پاکیزہ، اتنی شریفانہ اور اتنی احتیاط پسندانہ ہے ——— اُس نفسانیت و اخلاق کشی اور عیاشی و بد اخلاقی کی تصویر کیونکر کھینچیں جس میں شراب و خون کو

اس درجہ یکجا کر دیا گیا تھا کہ تاریخ انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔

معہودات کو قدرتی طور پر خیرہ کن ہونا چاہئے تھا کیونکہ اس رات انسانی مسرتوں اور تفریحوں کو چند لمحات میں مقید کرنا مقصود تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میاموں کے لئے ایک ایسا شیریں پیالہ جام تیار کیا جائے جو اس پر آبِ حیات کا کام کر دے۔ قلوپطرہ اپنے "شکار" کو مسحور و متحیر کرنا چاہتی تھی۔ اُسے سرگرانِ لذائذ کے گرداب میں پھنسا دینا چاہتی تھی۔ اسے شراب پلا کر بے انتہا مست کر دینا چاہتی تھی۔ تاکہ موت جو اس نے بالقصد قبول کی تھی اگر آئے تو بےخبری کے عالم میں اور نادیدنی آئے۔

اب ہم قارئین کو اس کمرۂ طعام میں لے چلتے ہیں جس میں دعوت نا و نوش ہو رہی تھی۔

تعمیرات کا موجودہ تصور ان فلک پیما عمارات کی تشریح سے قاصر ہے جن کے آثارِ قدیمہ کھنڈروں کی بجائے شکستہ پہاڑ نظر آتے ہیں۔ اگر ہم کہیں کہ اس زمانہ کے ہال اتنے بلند و بالا ہوتے تھے کہ ان پر آسمان کے سوا کسی چیز کو چھت قرار دینا ناممکن تھا تو بہت ممکن ہے کہ آپ اسے انتہائی مبالغہ اور غلو خیال کریں۔ لیکن آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دعوت کا کمرہ بابلی ناپ اور حجم کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ انسانی نظر اس کے عمق تک پہنچنے سے قاصر تھی ——— عظیم الہیئت ستون ——— چھوٹے موٹے اور ٹھوس ——— جن کے جوڑے جوڑے پیل پایوں پر بڑے بڑے شہتیر رکھے گئے تھے اور جن کی محرابوں پر سنگیں برآمدے بنائے گئے تھے۔ ہر صف اس طرح بلند ہوتی تھی گویا سیڑھیوں کو الٹ دیا گیا ہو۔ ہر دو پیل پایوں کے درمیان با دامی آتش انگیز پتھر کا ایک ایک ابوالہول ایستادہ تھا۔ جو ہال کمرے کو اپنی پُر اسرار نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے برآمدے کے پیل پائے پہلے سے قدرے ہٹ کر اور نسبتاً نفاست سے تعمیر کئے گئے تھے۔ اُن کے بالائی حصے پر کارنس کی بجائے نسائی چہروں کے چار ستر نصب تھے جنھوں نے دنبالہ دار ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں ——— ابوالہولوں کی بجائے یہاں شکلیں چبوتروں پر بیلوں کے سر والے بت بیٹھے گویا میزبان کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس ہال کی ایک تیسری منزل بھی تھی۔ جس کا طرزِ تعمیر مختلف تھا۔ یہاں پر بھی ہاتھیوں کی سونڈوں سے عظمت کی دھار بہہ رہی تھی۔ سب سے اوپر نیلا آسمان نیلگوں جھیل کی طرح چھایا

جڑے رہا تھا۔ اور مختلف النوع ستارے ہال کمرے کے کنگروں پر گویا جھکے ہوئے تھے۔

ہر قدم پر سنگ احمر کی فلک شکوہ سیڑھیاں تھیں جو بکھری ہوئی عمارتوں کے انبار کو یکجا کرتی تھیں اور جو اتنی صاف و شفاف تھیں کہ ان میں سے آئینہ کی طرح انسان کا عکس نظر آسکتا تھا۔

ہم یہاں ان آسمان رفعت عمارات کا ہلکا سا نمائہ ہی پیش کر سکتے ہیں تاکہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ ... کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں ان کی جسامت کیا تھی۔ ورنہ تفصیلات بتانے کے لئے مشہور مصوّر مارٹن کے موقلم کی ضرورت ہے۔ تاہم تخیل ہماری کمی پوری کر سکتا ہے اگرچہ ہم مصوّر یا موسیقی دان نہیں ہیں لیکن ہم حقائق و تصورات کو ایک رنگ میں علیٰحدہ علیٰحدہ پیش کر سکتے ہیں۔ اب تک ہم نے صرف ہال کمرے کا ذکر کیا ہے اور مہمانوں کی جانب اشارا نہیں کیا۔ قلوبطرہ اور میامون ہمارا انتظار دیکھ رہے ہونگے۔ اے لو! وہ قریب آ رہے ہیں۔!

میامون نے ململ کا ایک کُرتہ، جس پر کشیدہ کاری سے ستارے بنے ہوئے تھے، اور ایک ارغوانی چوغہ اوڑھ رکھا تھا اور اس کے مخمل مشرقی شہزادیوں کی طرح فیتے سے بندے ہوئے تھے۔ قلوبطرہ کے جسم پر دونوں طرف سے کھلا اور مکھی کی شکل کے بکسوئے سے جکڑا ہوا ایک ہلکے رنگ کا سبز لبادہ تھا۔ اس کی کلائیوں پر جڑاؤ کنگن جگمگا رہے تھے اور اس کے سر پر ایک سنہرا تاج جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ اس کے لبوں پر اگرچہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن اس کی پیشانی پر آزردگی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً اُس کے ہونٹ سکڑ جاتے تھے، جیسے وہ بیمار ہو۔ آخر ملکۂ عالم کو کیا تکلیف تھی؟ اس کے مقابلے میں میامون کے چہرے پر کیف سا چھایا ہوا تھا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ اس کی کنپٹیاں تمتما رہی تھیں، اور اُس کے سر کے گرد اولمپس کے بارہ دیوتاؤں کی طرح ایک سنہرا ہالہ سا بنا ہوا تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے مسرت بے پایاں پھوٹ رہی تھی وہ اپنے خواب کی تعبیر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ خواہ وہ نسطور یا پریام کی عمر پا لیتا۔ یا تھون کے پجاری کی طرح اس کے بال سفید ہو جاتے۔ لیکن اس کی مسرت میں کوئی نیا اضافہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی جنون انگیز تمنائیں پوری ہو چکی تھیں، اس لئے اب اسے زندہ رہنے کی چنداں خواہش نہ تھی ــــ!

قلوبطرہ نے اسے ایک تخت پر بٹھایا جس کے دونوں طرف بُردار شیر ایستادہ تھے۔ اور اپنے نازک نازک ہاتھوں سے تالی بجائی۔ اچانک شعلوں کی قطاریں نمودار ہوئیں۔ عمارتوں کے تمام آگے کو بڑھے ہوئے حصے روشن ہو گئے۔ ابوالہولوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بیل کے سر والے بت نور اُگلنے لگے۔ برنجی ہاتھیوں کی سونڈوں میں سے عطر کی بجائے آتشیں فوّارے بہ پڑے اور کانسی کے ہاتھوں نے آگے بڑھ کر اپنی اپنی شمعوں سے کنول کی سنگین دیوں میں چراغ روشن کر دیئے۔ تانبے کی تپائیوں سے نیلگوں شعلے اُٹھ اُٹھ کر جھلملانے لگے۔ بلوریں فانوس بھی روشن ہو گئے۔ الغرض ہر چیز اور ہر شے درخشاں، تاباں اور منور نظر آنے لگی۔ کئی پہل ساغروں کے پہلو اور مر مر و یشب کی میناؤں کے زاویئے سب کے سب بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جگمگ جگمگ کرنے لگے۔ نور کے جھرنے سیڑھیوں پر بھی بہنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگل کی آگ کا سایہ کسی وسیع و عریض دریا کی سطح پر کانپ رہا ہے۔ اگر ملکہ بلقیس بھی ہوتی تو اس سیلاب نور و ضیا پر اسے پانی کا دھوکہ ہوتا۔ اور وہ اپنی قبا پنڈلیوں تک اوپر اٹھا لیتی۔ اس آتشیں دھندلکے میں سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ ابوالہول شیروں، اور ہیرا غلیفی حروف میں جان پڑ گئی ہے۔ سیاہ پتھر کے مینڈھے طنزیہ ممیار ہے ہیں، اور اپنے سنہرے سینگوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں، اور بتوں کی ناک سے شعلے برس رہے ہیں۔

میخواری و شراب نوشی اب اپنی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔ تیتروں کی زبانیں، مچھلیوں کے جگر، بام مچھلی جس کو انسانی گوشت کھلا کھلا کر فربہ کیا گیا تھا۔ اور کھاری پانی میں پکایا گیا تھا، طاؤس کا مغز، اور اس قسم کے وہ تمام لذیذ کھانے جو دنیائے قدیم میں میسر آ سکتے تھے، طشتریوں میں تین بڑے بڑے میزوں پر سجائے گئے تھے۔ ایشیائی غلمان جن کے لمبے لمبے گیسوؤں سے ہاتھ پونچھے جاتے تھے۔ کریٹ، سیکس اور فلیرکس کی گلاب کے پھولوں میں کشید کی ہوئی سے گلگوں بلوریں ساغروں میں انڈھیل کر مہمانوں کو پیش کر رہے تھے۔ مطرب و مغنی اپنی ترنم باریوں سے محفل پر کیف و سرمستی کا عالم طاری کر رہے تھے۔ اگر رعد و برق کا دھماکا بھی ہوتا، تو اس جگہ سنائی نہ دیتا۔

میامون نے اپنا سر قلوبطرہ کے گداز شانوں سے لگا رکھا تھا، اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ عقل و ہوش سے بیگانہ ہو رہا ہے

دعوت کا کمرہ اس کی نگاہوں میں بھنور کی طرح گردش کر رہا تھا ——
"مرگران درخشانیوں" میں سے اس نے لاتناہی مناظر اور ستونوں کی مسلسل قطاروں کو پھیلتے دیکھا۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اصل عمارت کے اوپر غلام گردشوں کے نئے منطقے تعمیر ہو رہے ہیں، اور ان کی چوٹیاں ردائے فلک کو چیرتی ہوئی گزر گئی ہیں۔ اگر اُسے قلوبطرہ کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں محسوس نہ ہوتا تو وہ طلسم ہوشربا کے کسی نئے عالم میں پہنچ جاتا۔ جیسے اس پر بھساتی یا ایران کے کسی مجوسی نے افسوں پڑھ دیا ہو۔

ضیافت کے اختتام پر کوزہ پشت بالشتیوں کا بے ہنگم ناچ شروع ہوا۔ پھر مصری اور یونانی دوشیزاؤں نے جو دن اور رات کی نمائندگی کرتی تھیں۔ ابوتیا کے طرز کا جذبات انگیز رقص دکھایا، اس کے بعد قلوبطرہ خود اٹھی، اپنا شاہی لبادہ اتار پھینکا۔ سُنہرے تاج کے بجائے پھولوں کا گجرا پہن لیا اور میاموں کے سامنے جو مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا ناچنے لگی۔ اس نے اپنی مرمریں انگلیوں میں مجیرے تھام لئے جن کی جھنجھناہٹ آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ وہ اپنی گلاب آسا ایڑیوں پر گھوم کر میاموں کے قریب آئی، اور اُس کی پیشانی کا بوسہ لے کر اپنی نگاہیں اس کی نگاہوں میں ڈال دیں۔ اس کے بعد اس کے اردگرد تھرکنے لگی۔ کبھی وہ سر پیچھے ڈال کر خمیدہ ہو جاتی۔ کبھی بازو ڈھیلے چھوڑ دیتی اور بال بکھرائے نیم نگاہی سے میاموں کی طرف دیکھتی۔ کبھی ہوشیار ہو جاتی۔ قہقہے لگاتی۔ شہد کی مکھی کی طرح بھنبھناتی اور کولھے مٹکاتی ہوئی فرش پر ناگن کی طرح لہرانے لگ جاتی تھی۔ شدید محبت، انتہائی عشق، عمیق ترین جذبات، حُسن، شباب، جوانی، —— اُس نے سب کا اظہار کیا ——!!

ستارے شرما گئے، اُن کی سیمیں آنکھیں اس نظارے کی تاب نہ لا سکیں۔ خود آسمان بھی مٹ گیا اور اس کی جگہ ہال پر ایک آتشیں شبنم کا گنبد سایہ افگن ہو گیا۔ قلوبطرہ ایک مرتبہ پھر میاموں کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ رات بھیگ گئی اور پَو پھٹنے کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بالائی غلام گردش میں پھیکی نیلگوں روشنی پھیل گئی۔

میاموں نے سیاہ فام حبشی لڑکے کے ہاتھ سے سینگ نما ساغر لے لیا۔ جس میں اتنا تیز و تند زہر تھا کہ اگر کوئی اور برتن ہوتا تو یقیناً پھٹ جاتا۔ میاموں نے ملکہ پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ جس میں اس کی ساری زندگی کروٹیں لے رہی تھی۔ اور وہ مہلک جام اُٹھا کر منہ سے لگا لیا جس میں سُم آمیز عرق سنسنا رہا تھا ——!

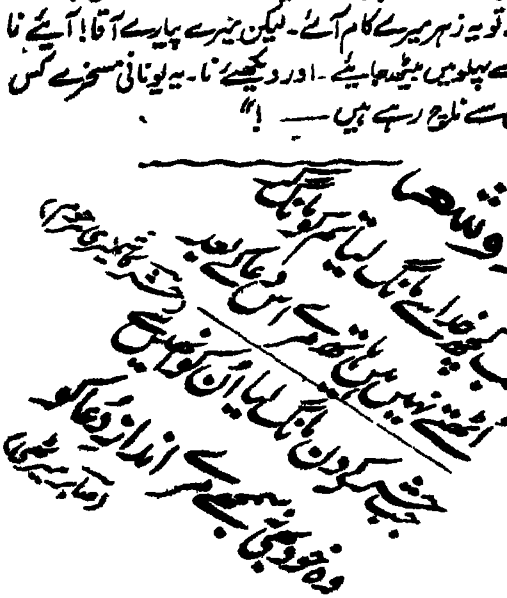
قلوبطرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ میاموں کے بازو پر رکھا۔ گویا وہ چاہتی ہے کہ زہر اپنا کام نہ کرے۔ وہ اُس کی جرأت و شجاعت سے متاثر ہو چکی تھی۔ اور وہ کہنے ہی والی تھی "مجھ سے محبت کرنے کے لئے ابھی کچھ دیر اور زندہ رہو۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔" کہ اچانک نقاروں کی آواز سنائی دی۔ اور چار شاہی نقیب ضیافت خانے میں داخل ہوئے۔ وہ مارک انطونی کے افسر تھے۔ اور اپنے سپہ سالار سے چند قدم آگے آگے آ رہے تھے۔

قلوبطرہ نے آہستہ سے میاموں کے بازو پر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"دیکھو! وقت آن پہنچا۔ سحر ہو چکی، اب مسرت آگیں خوابوں کی پرواز کا وقت ہے۔" میاموں نے کہا۔ پھر اس نے جام میں سے زہر کے آخری قطرے بھی پی لئے۔ اور اس کے بعد جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ قلوبطرہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ اور ایک گرم گرم آنسو —— غالباً اس کی زندگی میں پہلا —— پیالے میں ٹپک کر پگھلے ہوئے ہیرے میں مل گیا۔

"ہرکولیس کی قسم! میری حسین ملکہ! میں بیسود دوڑتا آیا۔ غالباً مجھے دیر ہو گئی ہے۔" مارک انطونی ہال کمرے میں داخل ہوتے ہی پکار اٹھا۔ "دعوت ختم ہو چکی؟ لیکن فرش پر یہ لاش کیسی ہے؟"

"اوہ! یہ کچھ نہیں" قلوبطرہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یونہی! ذرا ایک زہر کا امتحان لیا تھا۔ تاکہ اگر آغسطس مجھے گرفتار کر لے تو یہ زہر میرے کام آئے۔ لیکن میرے پیارے آقا! آئیے نا میرے پہلو میں بیٹھ جائیے۔ اور دیکھئے نا۔ یہ یونانی مسخرے کس عمدگی سے ناچ رہے ہیں —— !"



رات

از :-
جناب ضیاؔ نثار احمد ضیاؔ جالندھری

اُف یہ مہکی ہوئی مدہوش سی رات
شرمگیں کلیوں کو نیند آئی ہوئی
نرم رَو لہروں کا خاموش سا رقص
بیخودی چاروں طرف چھائی ہوئی

چاند کی کرنوں سے پُرنور درخت
ہاتھ پھیلائے ہوئے محوِ دعا
لوریاں دیتی ہوئی غنچوں کو
مشکبو، میکدہ بردوش ہوا

سینۂ آب پہ لہرائی ہوئی
روئے مہتاب کی لرزاں تصویر
مخملیں گھاس کے ہر صفحے پر
سایۂ برگ و شجر کی تحریر

شاخِ گل جھکتی ہوئی یوں لبِ آب
جس طرح دیکھے عروس آئینہ
موجیں یوں اٹھتی ہوئی تھم تھم کر
چڑھتی ہوں جیسے ہوا کا زینہ

شب کی مغموم نگہ کے آنسو
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے چراغ
خندۂ نور کے پیراہن میں
مسکراتے ہوئے پھولوں کے ایاغ

کیف و مستی کے یہ سیمیں منظر
میرے احساس کو اکساتے ہیں،
آگ سی دل میں بھڑک اُٹھتی ہے
لمحے گزرے ہوئے یاد آتے ہیں

بن کے مضرابِ الم ہر منظر
چھیڑ دیتا ہے مرا سازِ خیال
پھرنے لگتا ہے مری نظروں میں
اپنی اُمیدوں کا غمناک مآل

دیکھکر پھولوں پہ شبنم کے گہر
اشکِ غم آنکھوں میں لہراتے ہیں
سُن کے پُرکیف ہوا کا نغمہ
نالے ہونٹوں پہ مچل جاتے ہیں

اُف یہ ماضی کی سلگتی ہوئی یاد
دل کی بے نام خلش آہ نہ پوچھ
یہ دہکتا ہوا احساسِ بہار
سرد راتوں کی تپش آہ نہ پوچھ

پاگل کی کہانی

ایک داستان جو شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی

از جناب ایس۔ آر۔ یاصر

۱۔ تمہاری ہنستی ہوئی نظروں نے کچھ کہا۔ مگر میں سمجھ نہ سکا۔
تمہاری مسکراہٹ نے ایک پیغام دیا۔ مگر میں اسکی زبان معلوم نہ کر سکا۔

۲۔ تم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے دل کے اندر جھانک کر دیکھا۔ مجھ میں زندگی پیدا ہو گئی۔ مجھ کو بھولے ہوئے شعر یاد آ گئے۔

۳۔ ابھی اس دن میں نے کسی سے کہا تھا ؎

اس روگ سے ہم تو دور رہے
یہ روگ کبھی ہم کو نہ لگا

مگر آج ایک میٹھا سا درد محسوس کر رہا ہوں۔

۴۔ آخر میں نے ہار مان لی۔
میں نے اپنا آپ تمہارے سپرد کر دیا۔ کیا میں بھی تمہیں اپنا بنا سکوں گا؟
زندگی میں پہلی بار دل کی بازی لگا رہا ہوں۔
ہار جیت قسمت کے اختیار میں ہے:
اب جو قدم آگے رکھ چکا ہوں پیچھے نہ ہٹے گا

۵۔ آخر اس مذاق سے تمہارا مطلب! میرے دل کے ساتھ کیوں کھیل رہی ہو؟ میں نے یہ کھیل آج تک نہیں کھیلا۔ میں دوسروں کی طرح نہیں ہوں کہ دل ہتھیلی پہ لئے سودا کرتا پھروں!

۶۔ میں نے اپنا دل تمہارے قدموں پر رکھ دیا۔ میں اپنی اس غلطی پر کبھی نہ پچھتاؤں گا۔ لیکن اگر تم کو میری اس غلطی کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ تو اس کے لئے ہزار بار معافی چاہتا ہوں۔ معاف کرو۔۔۔۔۔"

۷۔ جانتا ہوں۔ محبت بھیک میں نہیں مانگا کرتے۔ ہاں پریم کے سودے نہیں کئے جاتے۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔

۸۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ جو آگ تم نے میرے دل میں بھڑکا دی ہے۔ اس کی ایک چنگاری تمہارے سینے میں سلگتی نظر آئے۔ صرف ایک چنگاری!

۹۔ خوش ہو کہ تمہارا جادو کامیاب رہا۔ تم نے میری نیندیں حرام کر دیں۔ مجھے ناکارہ بنا دیا۔
میں نے تمہیں چاہا، جرم کیا!

۱۰۔ مجھے مغرور نہ کہو، سندری!
میرے غرور کو صدمہ پہنچتا ہے!
اس غرور کو جس کو تمہاری نظروں نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا ہے۔

۱۱۔ میرے خدا
میں نے تجھے نہیں پکارا۔
کیا یہ اسی غلطی کی سزا ہے کہ میں ایک عورت کو خدا سمجھ کر اس کے قدموں پر سر رکھ چکا۔
میرے خدا!

۱۲۔ لوگ پتھر سے سر پھوڑتے ہیں!
میں پتھر سے دل لگا بیٹھا ہوں!
کتنا نادان ہوں!

۱۳۔ ابھی ہماری چاہت کے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو میری آس تمہاری جادو بھری نظروں کی طرف دیکھ رہی ہے، ہاں ان نظروں کی طرف، جن کا ہر تیر اسی جگہ ہے جہاں پہلے کبھی دل تھا۔ اور اب کچھ بھی نہیں ہے!

۱۴۔ خدا کا شکر ہے کہ مذاق اتنی جلدی ختم ہو گیا۔ تم نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ کہ مجھے جتا دیا۔ کہ میرا دل اتنی قیمت بھی نہیں رکھتا۔ کہ تم اسے اپنے نازک پاؤں کے تلے کچل سکو!

۱۵۔ تم نے میرے دل پہ ہاتھ ڈالا۔ پھر اس آگ کو ہوا دے دی۔ جس کو میں کہیں دور جا کر ٹھنڈا کر دینا چاہتا تھا! اتنی مہربانی کر دو کہ مجھے اپنی مسکراتی ہوئی نظروں کی زبان سمجھا دو تا کہ میں ان کا غلط مطلب نہ سمجھ لوں!

۱۶۔ تم پتھر ہو۔
کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری خیالی تصویر بھی میرے سامنے پتھر بن کر رہے؟

۱۷۔ آج!

میں نے تمہاری جھکی جھکی نظروں میں اپنی قسمت کا فیصلہ پڑھ لیا۔
ہاں میں اسی قابل تھا کہ ٹھکرا دیا جاؤں!
تم نے بہت اچھا کیا، تمہارا شکریہ

۱۸- تم نے مجھے بھی دوسروں کی طرح آوارہ سمجھا!
مجھے افسوس ہے۔ کہ تمہیں میرے متعلق ایسا خیال پیدا ہوا۔
میں دوسروں سے بالکل مختلف ہوں!

۱۹- میں نے کوشش کی۔ کہ بہت دور چلا جاؤں اتنی دور کہ تمہارا خیال تک وہاں نہ پہنچ سکے!
لیکن تمہاری دل میں چبھ جانے والی نظروں کی کسک نے مجھے قدم نہ اٹھانے دیا۔ دور رہ کر بھی تمہیں بھول نہ سکا۔
میرے دل میں کتنی کمزوری آگئی ہے۔ مگر سنو میرے دل کی کمزوری سے فایدہ نہ اٹھاؤ۔
یہ صرف تمہیں دیکھتے ہی، تمہارا خیال آتے ہی۔ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے!

۲۰- یونہی بہلاوے دیئے جاؤ! یونہی مجھے فریب نظر میں مبتلا رکھو
میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ نظر کہیں اور دل کہیں!

۲۱- آج چوروں کی طرح چھپ کر، دل کی بھڑکتی ہوئی آتش بجھانے کے لئے تمہارے قدموں تک پہنچا۔ مگر جب واپس ہوا، تو یہ آگ جوالا مکھی بن چکی تھی! جی چاہتا ہے اس آگ میں سب کچھ جلا ڈالوں ۔۔ ایک چیز کو بھسم کر دوں!

۲۲- تمہاری زبان سے اپنی قسمت کا فیصلہ سننا چاہا تم نے مذاق میں اڑا دیا!
تمہیں اپنے قریب دیکھ کر میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ اور بہت کچھ کہنے کی خواہش لیکر واپس آگیا!
مگر اب میری زبان بند رہے گی ہمیشہ کے لئے بند۔

۲۳- مجھے معاف کر دو۔ دوست میں تمہاری خوشی میں شریک نہیں ہو سکتا!
میں ماتم میں ہوں۔ میرا ایک بہترین رفیق مجھ سے جدا ہو گیا ہے کیا اس کی موت کا تمہیں علم نہیں۔ میں سمجھا تھا ساری دنیا جانتی ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے غم میں سوگوار ہے!
آہ! میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں!
اور تم کہہ رہے ہو۔ کہ اس کی موت کی تمہیں خبر نہیں ہوئی!
مذاق نہ کرو۔ یہ ہنسی کا وقت نہیں!
میں ماتم میں ہوں۔ میرا دل مر گیا ہے۔ آہ میرا دل!
میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دم توڑتے ہوئے دیکھا ہے

۲۴- ندیم یہ نہ پوچھ، کہ میں کیوں چپ رہتا ہوں!
میرے چپ رہنے ہی میں سلامتی ہے!
میں بول اٹھا تو قیامت آجائیگی، دل آتش فشاں کیطرح پھٹ پڑیگا۔

۲۵- میں وہ بد نصیب ہوں۔ جس نے زندگی میں پہلی بار اپنا دل ایک عورت کے قدموں پر رکھا مگر بے رحمی سے ٹھکرا دیا گیا ۔۔۔ !

زندگی کے سات نغمے

نظم

افصح الفصحا علامہ حضرت شفق رضوی مینائی

(۱)

دے رہا ہے یہ سبق ہر انقلابِ زندگی
خود ورق تیرا الٹ دیگی کتابِ زندگی

روشناسِ خلق ہو کر زندہ رہنا ہے تو رہ
خضر بن کر کیوں ہے روپوشِ نقابِ زندگی

مرنے والے اپنے جینے کی حقیقت کچھ نہ پوچھ
خود سوالِ زندگی دے گا جوابِ زندگی

جتنی سانسیں چل رہی ہیں جیتے جی کرنے شمار
عمرِ رفتہ کیا بتلائے گی حسابِ زندگی

روح پرور ہے ترا ہر نغمۂ سازِ حیات
رشتۂ جاں کو سمجھ تارِ ربابِ زندگی

جتنے پانی میں ہے تو وہ موت کو معلوم ہے
دے رہا ہے موج کا دھوکا سرابِ زندگی

دھوپ کیسی سایۂ عمرِ رواں تک ڈھل چکا
اب شفق آیا لبِ بامِ آفتابِ زندگی

(۲)

ہو گئے نذرِ فنا نقش و نگارِ زندگی
لٹ گئے خود لوٹنے والے بہارِ زندگی

نام جس کا ہے لباسِ مستعارِ زندگی
ایک خاکی پیرہن ہے پردہ دارِ زندگی

صبح سے تا شام مرنے کی نہ جینے کی خبر
کٹتے جاتے ہیں یونہیں لیل و نہارِ زندگی

ہے اجل بھی ہمرکابِ توسنِ عمرِ رواں
گرم جولاں تا کجا اے شہسوارِ زندگی

بن بڑھا دن گھٹ گئے گن گن کے گزرتے ہیں دور
دفعتہً آخر ہوا پورا شمارِ زندگی

عمر بھر کا میہماں دم بھر میں رخصت ہو گیا
تھا وہ طولِ زندگی، یہ اختصارِ زندگی

آدمی بھی کس قدر مجبورِ ہستی کا ہے نام
زندہ رہ کر بھی شفق بے اختیارِ زندگی

(۳)

زندہ دل تھا کون چھیڑا کس نے سازِ زندگی
کس کے نغموں سے کھلا سربستہ رازِ زندگی

نکلے ہر تارِ نفس سے نغمہ ہائے جانفزا
بن گئی دل کی تڑپ مضرابِ سازِ زندگی

پردے پڑتے ہیں نگاہوں پر تو اٹھتا ہی حجاب
بند آنکھیں ہوتے ہی کھلتا ہے رازِ زندگی

سبب ہے جینے سے زیادہ مجھکو مرنے کی ہوس
کیا اٹھاؤں ناز تیرے اے نیازِ زندگی

آدمی کو جتنی مشکل موت کی پہچان ہے
اُس سے بھی بڑھ کر ہے مشکل امتیازِ زندگی

سجدے کر لے پھر جنازہ ہوگا محتاجِ نماز
جب قضا ہو جائے گی تیری نمازِ زندگی

سر بسجدہ اس کے در پر مر کے جی اُٹھے شفق
بندگی سے جو ہو بندہ سرفرازِ زندگی

(۴)

ایک دل پر دے گئی کس کس کا داغِ زندگی
موت نے گل کر دیئے کیا کیا چراغِ زندگی

نکہتِ گل بن کے نکلی روح قالب سے مرے
میں تھا نازک مجھ سے نازک تھا دماغِ زندگی

خاک میں مل جائیگا جب مر کے خاکی پیرہن
تب کہیں دامن سے چھوٹیگا یہ داغِ زندگی

جب بہار آئی خزاں بھی ساتھ تھی بن کر اجل
جب پھلا پھولا ہوا پامال باغِ زندگی

سانس کی اک آس پر روشن ہے ہر شمعِ حیات
ہے ہوا کے دم سے روشن ہر چراغِ زندگی

موت ان کو ڈھونڈ کر لاتی ہے اپنی راہ پر
جو بھٹکتے ہیں لگانے کو سراغِ زندگی

جیتے جی مرنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی شفق
موت کے دم سے ہوا حاصل فراغِ زندگی

(۵)

موت کے آئینے میں تو دیکھ حالِ زندگی
ورنہ ہو جائیگا مستقبل وبالِ زندگی

جتنے زندہ رہنے والے ہیں گزر جائیں گے سب
کہہ رہے ہیں یہ گزر کر ماہ و سالِ زندگی

نیند کہتے ہیں جسے وہ موت کی ہی اک مثال
خواب کہتے ہیں جسے ہے وہ خیالِ زندگی

خاک ایسی زندگی پر مر کے کیا سمجھے گا خاک
رہ کے زندہ جو نہیں سمجھا مآلِ زندگی

ہیں یہ دونوں ایک ہی عمرِ دو روزہ کے لئے
موت کا غم، جان کا کھٹکا، ملالِ زندگی

روشناسِ خلق ہوتے خضر تو دیتے جواب
مرنے والوں سے کریں کیا ہم سوالِ زندگی

مر کے بھی زندہ رہیگی داستاں میری شفق
میں ہوں اک عنوانِ بستانِ خیالِ زندگی

(۶)

کیوں نہ آتا ہوش میں مدہوش جامِ زندگی
چشمِ ساقی کا اشارا تھا پیامِ زندگی

پھر اک منزل ہے جس کی ہے وہ راہِ آخرت
موت اک زینہ ہے جس کا ہے وہ بامِ زندگی

باغِ عالم میں قفس ہے آشیاں تیرے لئے
اے اسیرِ حلقۂ ہستی و دامِ زندگی

جس کو پیری کہتے ہیں جس کا جوانی نام ہے
ایک صبحِ زندگی ہے ایک شامِ زندگی

نظمِ ہستی بھی ہے رفتارِ زمانہ پر یونہی
انتظامِ نبض پر جیسے نظامِ زندگی

اپنے کو زندہ سمجھ مر کر اگر زندہ رہا — موت ہی ہو جائیگی قائم مقامِ زندگی
لائی صبحِ زندگی آئینۂ پیری شفقؔ — جب ہوئی روپوش شب تصویرِ شامِ زندگی

(۷)

مختصر ہے اے اجل میرا بیانِ زندگی — ختم ہے دو حرفِ غم پر داستانِ زندگی
مل گئی اس کو حیاتِ جاودانی کی سند — ہو گیا جو کامیابِ امتحانِ زندگی
تین فقروں میں ہے گویا عشق کا دفتر تمام — دردِ دل، افسانۂ غم، داستانِ زندگی
جس کو کہتا ہے زمانہ فصلِ پیری و شباب — اک بہارِ زندگی ہے اک خزانِ زندگی
روح اک طائر، قفس ہے جسم، اس پر یہ ستم — ہے قلم ہونے کو شاخِ آشیانِ زندگی
ہر بشر کو ہے جہاں میں اپنے مرنے کا یقیں — پھر بھی ہے گم گشتۂ وہم و گمانِ زندگی

موت سے پہلے الٹ دینے کو ہستی کا ورق
اے شفقؔ تہ کر کے رکھ اب داستانِ زندگی

طرزِ عاصمانہ

جو بدل گئیں نگاہیں تو بدل گیا زمانہ

از جناب عاصمؔ جے پوری

مرے عہدِ آرزو کا ہے یہ مختصر فسانہ — کہ ہے اب مری زباں پر یہی ہائے وہ زمانہ
تمہیں دیکھ کر ہوئی تھی جو نشاطِ نغمہ طاری — مرے دل میں بن گئی اب وہی روح کا ترانہ
مری آرزو کی دنیا کو بسا بسا کے لوٹا — یہ نگاہِ بے محابا یہ حجابِ شاہدانہ
نہ مرے اگر کسی پر تو جیئے وہ ہائے کیونکر — جسے اپنی زندگی کے لئے ہو یہی بہانہ
جو ملیں تو اور کچھ تھا غمِ آرزو کا عالم — جو بدل گئیں نگاہیں تو بدل گیا زمانہ

غمِ ہجر کی شکایت نہیں اہلِ دل کی آہیں
کہ سرودِ آرزو کی ہے یہ طرزِ عاصمانہ

منصور حلّاج تحقیق کی روشنی میں

از مولانا محمد اسمٰعیل ناصح ایڈیٹر اخبار آئینہ

کچھ بات نہ تھی نعرۂ منصور میں لیکن
دنیا جسے چاہے اسے افسانہ بنا دے

کائنات عالم میں جتنی مخلوقات بھی نظر آتی ہیں۔ ان کا وجود یا تو یکسر پیکر خوبی و سعادت ہے۔ یا یک قلم مجسمۂ زشتی و برائی۔ اگر وہ ان دو تہائی اوصاف سے متصف نہیں تو پھر ان دونوں کا ایسا مجموعہ ہوں گی جس میں گونہ اعتدال کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً جانوروں میں گھوڑے۔ اونٹ گائے وغیرہ پہلی قسم میں شیر، بھیڑیا، سانپ اور دوسرے درندے دوسری مثال ہیں اور کتا، بلی ہاتھی پالتو جانور تیسرے زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں جو بیک وقت نیکی و بدی اور سعادت و شقاوت کا مجموعہ قرار پاسکیں۔ منصور حلاج جس کے سوانح حیات پر میں ذیل میں بحث کرنے والا ہوں اسی نوع کی عجائب المخلوقات میں محسوب ہونے کے قابل ہے۔ ایک طرف تو محققین و متشرعین کی جماعت ہے جو اس شخص کی تصویر نفرت انگیز مرقع میں پیش کرتی ہے۔ اور دوسری طرف خوش اعتقاد حضرات کا گروہ ہے جو اس کی نسبت بزرگوں اور زاہدوں میں سے ہونے کا حسن ظن رکھتا ہے ؎

تجھ کو کس مذہب و ملت میں گنیں ہم اے شیخ
ہم کہیں گبر مگر گبر مسلماں تجھ کو

منصور حلاج کے متعلق ابتک جو حالات عام طور پر کتابوں اور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں وہ غیر محققانہ ہیں۔ اور صرف حسن ظن کے مرہون منت ہیں۔ اس بنا پر میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس شخص کی زندگی کے ایسے حالات قلمبند کروں جو مستند تاریخوں میں مندرج ہیں لیکن ساتھ ہی ایک بے لاگ مؤرخ اور بے لوث تنقید نگار کی طرح اس کی نسبت علیحدہ علیحدہ دونوں پہلوؤں کو پیش کردوں۔ البتہ رطب ویابس باتوں کو جو صرف بازاری و غیر مستند تصنیفات میں نظر آتی ہیں نظر انداز کردینے کی کوشش کروں گا۔ میری اس تمام تحریر کا ماخذ خطیب بغدادی۔ ابن خلکان ابوریحان البیرونی۔ ابن حوقل۔ ابن ندیم۔ ابن سعد قرطبی۔ ابن اثیر۔ علامہ جلال الدین سیوطی وغیرہم کی تصنیفات و مؤلفات ہوں گی۔

ابتدائی حالات

منصور کا اصلی نام حسین ہے۔ منصور اس کے باپ کا نام ہے مگر اب یہ خود اسی نام سے موسوم ہے۔ اس کا دادا جس کا نام محمی ہے مجوسی تھا۔ سب سے پہلے اس کا باپ اسلام لایا تھا۔ تاریخ ولادت محقق نہیں جائے پیدائش فارس کے شہر بیضا کا ایک نواحی قریہ طور ہے۔ اس کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب حلاج تھا۔ جو عام مؤرخین کی تحقیق کے مطابق اس کا خاندانی پیشہ یا آج کل کی اصطلاح میں اس کی ذات تھی۔ مگر اسی کے ساتھ اس کے اس خاص لفظ سے منسوب کئے جانے کے متعلق اور اقوال و توجیہات بھی ہیں مشہور بازاری روایت تو یہ ہے کہ حسین بن منصور نے ایک دن کسی نداف کی دکان پر پہنچ کر اسے کسی دوسرے کام پر مامور کیا۔ نداف مذکور جب تھوڑی دیر میں وہ کام انجام دے کر واپس آیا تو اس نے روئی کے پورے ڈھیر کو خلاف توقع بالکل دھنا ہوا پایا۔ اس روز سے اس کا لقب حلاج پڑ گیا۔ لیکن اس کے اپنے لڑکے نیز ایک اور راوی ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین السلمی کا بیان ہے کہ چونکہ وہ اکثر لوگوں کے راز ہائے درون سینہ کا انکشاف کرتا تھا۔ اسلئے خوزستان میں حلاج الاسرار کے نام سے ملقب ہوا۔ جو رفتہ رفتہ مخفف ہو کر صرف حلاج رہ گیا۔ اور اس کے نام کا ایک جزو بن گیا۔

حسین بن منصور کے کچھ اور القاب بھی تھے جو باب قطعاً غیر معروف ہو گئے ہیں۔ اس کے اسی لڑکے کا بیان ہے کہ وہ مختلف اجزائے عالم میں مختلف القاب سے پکارا جاتا تھا چنانچہ ہندوستان میں اسے مُغیث (فریادرس) ترکستان و بلاد چین میں مقیت (روزی رساں) خراسان میں ممیز (ممتاز) بصرہ میں محیر (حیرت انگیز) بغداد میں مصطلم (ملا دینے والا) اور فارس میں الزاہد (عبادت گزار) کہا جاتا تھا۔

حلاج کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور نشوونما زیادہ تر شہر واسط میں ہوا جو بصرہ و کوفہ کے مابین واقع ہے اور کچھ تستر میں ہوئی۔ یہاں اس نے اس عہد کے مشہور اہل دل بزرگ سہل بن عبداللہ تستری سے تعلیم حاصل کی پھر وہاں سے وہ ۱۸ سال کی عمر میں بصرہ اور پھر بغداد میں وارد ہوا۔ بغداد میں حضرت عمرو بن عثمان المکی ابو الحسن نوریؒ اور حضرت ابو القاسم جنید بن محمدؒ کی حلقہ نشینی اختیار کی خصوصاً اول الذکر بزرگ کی صحبت میں تو تقریباً ۱۸ ماہ تک رہا لیکن موخر الذکر سے بعد میں کچھ کشیدگی ہو گئی تھی۔ بات یہ ہوئی تھی کہ اس نے ایک دفعہ حضرت جنیدؒ سے کچھ استفسار کیا مگر اس کا انداز طالب علمانہ نہیں بلکہ مدعیانہ تھا۔ شیخ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس سے اس کے دل میں خلجان پیدا ہوا اور اپنے اہل و عیال سمیت تستر چلا گیا۔

عبادت وریاضت

حسین بن منصور حلاج اپنے ابتدائی ایام میں زاہد مرتاض تھا اور ریاضت شاقہ سے کام لیتا تھا۔ مکہ میں حرم کعبہ کے صحن میں ایک سال تک معتکف رہا۔ صرف طہارت و طواف کے لئے اپنی جائے نشست سے ملتا تھا خواہ پانی برستا یا دھوپ ہوتی۔ وہ ہر وقت اور ہر حال میں وہاں اس جائے بیٹھا رہتا۔ کھاتا بھی بہت کم کھاتا۔ دن بھر روزے رکھتا اور شام کو چند لقمے روٹی کے اور دو گھونٹ پانی پی لیتا تھا۔ اس نے کوہ ابو قبیس پر بھی دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں بیٹھ کر ریاضت کی ہے ابو عبداللہ مغربی شیخ عمرو بن عثمان سے اس کی اس ریاضت کا حال سن کر جب بالا پر گئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ دوپہر کی کڑی دھوپ میں ایک گرم چٹان پر وہ بیٹھا ہوا ہے۔ اور حال یہ ہے کہ گھڑوں پسینا اس کے بدن سے بہہ رہا ہے۔ انہوں نے بطور اظہار ناپسندیدگی کے فرمایا ذرا اسد تعالیٰ نے اسے ایک ایسے ابتلا میں ڈال دیا ہے جو اس کی استطاعت سے باہر ہے اور وہ اپنی بے وقوفی سے صبر سے کام لینے میں خدا عزوجل کا مقابلہ کر رہا ہے۔ دیکھا چاہئے اللہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے جس زمانہ میں وہ گرفتار ہو کر بغداد میں مقید ہوا تھا اس وقت بھی اس کی عبادت و ریاضت شاقہ کا یہی حال تھا۔ ابن ندیم الفہرست میں لکھتا ہے

کان یاکل الیسیر ویصلی الکثیر ویصوم الدھر

وہ کم کھاتا، بہت نمازیں پڑھتا اور صائم الدہر رہتا تھا۔

عقائد ومسلک

حلاج کے مسلک کے متعلق بہت اختلاف ہے سب سے بڑا اختلاف تو اس کے اظہار عقائد کے متعلق ہے چونکہ اس کی صحبت اس عہد کے اکابر دین کے ساتھ رہی ہے اس لئے اس کا دعوئے تصوف ایک قدرتی بات ہے لیکن چونکہ وہ عجمی الاصل ہے اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس کا رجحان شیعیت کی طرف زیادہ ہو چنانچہ اس کا ائمہ سادات کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اسی اصل کا قدرتی اقتضا تھا۔ بایں ہمہ اس کا اپنا بیان اہلسنت کے مسلک پر چلنے کا ہے چنانچہ قاضی ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ کہ جس وقت قاضی ابو عمرو اور دیگر فقہاء مجلس اس کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ لکھ رہے تھے۔ تو حلاج اپنی موافقت میں برابر کہتا جاتا تھا کہ

ظھری حمی ودمی حرام وما یحل لکم ان تتقولوا علی وانا اعتقادی الاسلام ومذھبی السنۃ وتفضیل الائمۃ الاربعۃ الخلفاء الراشدین وبقیۃ العشرۃ من الصحابۃ رضوان اللہ علیھم اجمعین ولی کتب من السنۃ فاللہ اللہ فی دمی۔

میری پشت ممنوع ہے اور میرا خون حرام ہے اور مجھ پر بہتان باندھنا تم کو روا نہیں۔ میں مسلمان ہوں اور میرا مذہب سنت والجماعت ہے میں خلفاء راشدین اور عشرہ مبشرہ کی افضلیت کا قائل ہوں سنت پر میری تصنیفات بھی موجود ہیں۔ لہٰذا میرے خون کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔

لیکن کسی نے اس کی چیخ پکار پر توجہ نہ دی اور اس کے کہنے کا اعتبار نہ کیا۔ بلکہ محضر قتل تیار ہو چکنے کے بعد ہی مجلس برخواست ہوئی اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اس سے پہلے وہ مختلف عقائد و مذاہب کا دعوے کر چکا تھا جیسا کہ عریب ابن سعد قرطبی نے تاریخ صلۂ طبری میں تصریح کی ہے کہ

ویری قوما انہ یدعوا الی الرضا من آل محمد ویظھر انہ سنی لمن کان من اھل السنۃ وشیعی لمن کان مذھبہ التشیع ومعتزلی لمن کان مذھبہ الاعتزال۔

وہ حلاج بعض سے یہ ظاہر کرتا کہ وہ اہل بیت میں سے امام رضا کی طرف دعوت دیتا ہے اور سنیوں میں سنی شیعوں میں شیعہ اور معتزلیوں میں معتزلی بن جاتا تھا۔

ابن ندیم اور البیرونی کے بیانات سے بھی اس کے اس ہرجائی پن کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ ابن ندیم نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جب وہ گرفتار ہو کر دار الخلافہ میں آیا اور محبوس ہوا تو وہاں بھی اپنا سنی پن ہی ظاہر کرتے

دوسرے جانا شروع کر دیا تھا۔ فجعل یتقرب بالسنة الیہم فظنوا انما یقول حق (الفہرست)

لیکن منصور حلاج کے عقائد کا سب سے خطرناک جزو اس کا دعوی تصوف اور اس سلسلے میں اعلائے الوہیت ہے اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حالت جذب میں نعرہ انا الحق لگایا کرتا یا لیس فی جبتی الا الحق جیسے مرموز فقرات منہ سے نکالا کرتا تھا چنانچہ امام ابو حامد الغزالی نے کتاب مشکوٰۃ الانوار میں اس کے ان اقوال کی مسئلہ وحدت الوجود کی بنا پر تاویل کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حلاج کو مسئلہ وحدۃ الوجود سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ بلکہ جیسا کہ تمام مورخوں نے تصریح کی ہے وہ حلول[1] کا قائل تھا جو کوئی اسلامی عقیدہ نہیں بلکہ بت پرستوں اور مشرکوں کا مسلک رہا ہے ابن سعد کا بیان ہے کہ

ثم ادعی الربوبیة وقال بالحلول فعظم افتراءہ علی اللہ عز وجل۔ بعد وہ خدائی کا مدعی ہوا، اور حلول کا قائل ہو اور خدا تعالیٰ کی نسبت بڑی بڑی زبان درازیاں کرنے لگا۔

ابن ندیم کے ذیل کے قول سے بھی اس کے قائل بحلول ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

ویدعی عند اصحابہ الالوهیة ویقول بالحلول ویظہر مذاهب الشیعة للملوک و مذاهب الصوفیة للعامة وفی تضاعیف ذالک یدعی ان الالهیة قد حلت فیہ وانه هو هو تعالی اللہ جل وتقدس عما یقولون هؤلاء علوا کبیرا (اور وہ اپنے ساتھیوں کے پاس خدائی کا دعویٰ اور عقیدہ حلول کا اظہار کرتا وہ بادشاہوں سے شیعیت اور عوام سے صوفیت جتلاتا اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتا جاتا کہ اس میں الہیت حلول کر گئی ہے اور وہ وہی (خدا) بن گیا ہے۔

البیرونی نے آثار الباقیہ باب ہشتم صلا۲ میں منصور حلاج کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے ادعائے الوہیت سے پہلے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور مشہور کیا تھا۔ کہ وہ گروہ طالقان واقع دیلم سے نازل ہوا ہے۔ پھر جب اس نے یہ اعلان کیا کہ روح القدس اس میں حلول کر گئی ہے۔ اس نے کھلے لفظوں میں اپنے آپ کو خدا کے نام سے موسوم کر دیا اور جب وہ اپنے متبعین کے نام خطوط لکھتا تو اس نسبت سے اکثر اس عنوان سے شروع کرتا۔

من الهو هو الازلی الاول النور الساطع اللامع والاصل الاصلی وحجة الحجج ورب الارباب و منشی السحاب ومشکوة النور ورب الطور المتصور فی کل صورة الی عبدہ فلان

اس کی جانب سے جو قدیم ازلی، بلند جگمگاہٹ والی روشنی، اصل الاصل، حجتوں کی حجت، رب الارباب، بادل پیدا کرنے والا، شمعدان نور، خدائے طور ہر شکل و شمائل میں مظہر بنام بندۂ فلاں۔

اور جب معتقدین و مریدین لکھتے تو وہ مصرعۂ ذیل آداب و القاب سے شروع کرتے۔

فسبحان یا ذات الذات ومنتهی غایت الذاد یا عظیم یا کبیر اشهد انک البارئ القدیر

---

[1] مسئلہ وحدت الوجود اور عقیدہ حلول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر تصوف کا ایک فلسفیانہ نظریہ ہے اور موخر الذکر دیانت کا گمراہانہ اور مشرکانہ عقیدہ ہے۔ وحدۃ الوجود صاحب غیاث اللغات کے الفاظ میں "باصطلاح متصوفین موجودات را ہمہ یک وجود حق سبحانہ تعالیٰ دانستن و وجود ماسوا را محض اعتبارات شمردن چنانچہ موج و حباب و گرداب و قطرہ و ژالہ ہمہ را یک آب پنداشتن" ہے بخلاف اس کے مذہب حلول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے کے رنگ و پیکر میں اس طرح پیوست ہو جاتا ہے کہ اسے ذات الٰہی سے کوئی جدا شے قرار دینا ممکن نہیں اس لئے اگر خود اس پر خدا کا اطلاق کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اقرب الموارد فی فصح العربیة والشوارد مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء میں فرقہ حلولیہ کے بیان میں مذکور ہے فرقة من المتصوفة یقولون ان اللہ حال فی کل شئ و فی کل جزء منه ومتحد به حتی یجوز ان یطلق علی کل شئ انه اللہ یعنی صوفیوں کا ایک فرقہ ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے جزو جزو میں اس طرح گھل مل کر سمایا ہوا ہے۔ کہ اگر اس شے ہی کو بجائے خود اللہ قرار دیدیا جائے تو صحیح ہوگا مگر واضح ہو کہ عقیدہ حلول کو رئیس المتصوفین شیخ الشیوخ حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی نے باطل قرار دیتے ہوئے اس سے اپنی کراہت و بیزاری کا اظہار کیا ہے چنانچہ فرقہ سالمیہ کے گمراہ کن عقائد کو گناتے ہوئے اپنی مشہور کتاب غنیة الطالبین میں فرماتے ہیں:۔ ومن قولہم ان اللہ تعالیٰ یقرأ علی لسان کل قارئ وانہم اذا سمعوا القرآن من قارئ فانما یسمعونه من اللہ وهذا القول یفضی الی الحلول نعوذ باللہ من ذالک اسی جماعت کا ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قاری کی زبان سے پڑھتا ہے لہٰذا جب لوگ کسی قاری کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتے ہیں تو وہ دراصل اللہ ہی کی زبان سے سنتے ہیں اور یہ قول حلول کی طرف لے جاتا ہے خدا اس سے پناہ میں رکھے۔

المنير المتصور فی کل زمان وفی زماننا فی صورۃ الحسین بن منصور عبدک ومسکینک و فقیرک والمستجیر بک والمنیب الیک الراجی رحمتک یا علام الغیوب یقول لکن اوکن ا

پاک ہے اے شخصیتوں کی شخصیت اور انتہائی لازوں کی آخری حد، اے عظیم، اے کبیر میں گواہی دیتا ہوں کہ تو بار ہی قدیم ہے اور زمانوں میں تو متصور روشنی والا ہے۔ مگر ہمارے زمانہ میں حسین بن منصور کی شکل میں جلوہ گر ہے تیرا بندہ، مسکین، فقیر، تیرا پناہ خواہ، تیری طرف رجوع کرنے والا تیری رحمت کا طلبگار، اے غیبوں کا جاننے والا باتیں عرص پر رہتا ہے۔

حلاج اپنے دعوی الوہیت کے لئے ایک خاص فلسفہ رکھتا تھا اور اسی خودساختہ اصول پر اپنی خدائی کے دعا کو منطبق کرتا تھا وہ مدعی تھا کہ تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب اور کثرت عبادات سے انسان بشریت سے منزہ ہو جاتا ہے اور اس میں ایک خاص استعداد و صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس وقت روح الہی اس میں حلول کر جاتی ہے اور وہ انسان بالکل خدا بن بیٹھتا ہے اس کے اس خودساختہ اصول خدا سازی کو ابن خلکان ان الفاظ میں تصریح کرتا ہے۔

الحسین بن منصور الحلاج من اهل البیضاء وکان حلاجا ینتحل النسك والتصوف فما زال یرتقی به طبقا عن طبق حتی انتهی به الحال الی ان زعم ان من هذب فی الطاعة جسمه وشغل بالاعمال الصالحة قلبه وصبر علی مفارقة اللذات و ملك نفسه بمنعها عن الشهوات ارتقی الی مقام المقربین ومنازل الملائکة الکرام الکاتبین ثم لا یزال یتردد فی درجة المصافات حتی یصفو عن البشریة طبعه فاذا لم یبق فیه من البشریة نصیب حل فیه روح الله الذی کان منه کعیسی بن مریم فیصیر مطاعا لا یرید شیئا الا کان من جمیع ما کان ینفذ فیه امر الله تعالی وان جمیع افعاله حینئذ فعل الله تعالی وامره وکان یتعاطی هذا ویدعو الی نفسه بتحقیق ذالك کله۔

حسین بن منصور حلاج بیضا کا باشندہ تھا اور زہد و تصوف اختیار کر رکھا تھا پھر ترقی کرتے کرتے نوبت یہاں جا پہنچی کہ وہ کہنے لگا۔ کہ جو شخص اپنے بدن کو عبادت میں تربیت دیتا ہے اور اپنے قلب کو اعمال صالحہ میں لگا دیتا ہے۔ ترک لذات پر جم جاتا ہے اور خواہشات نفسانی پر قدرت پالیتا ہے۔ وہ مقربان بارگاہ اور فرشتگان کرام کے درجہ و مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ تصفیہ میں بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتا ہے۔ کہ اس کی طبیعت بشریت سے منزہ ہو جاتی ہے۔ پس جب اس میں بشریت کا شائبہ باقی نہیں رہتا۔ تو عیسٰی بن مریم کی طرح اس میں بھی اللہ کی روح حلول کر جاتی ہے اس طرح وہ مطاع بن جاتا ہے۔ جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے جن جن باتوں میں اللہ کا حکم نافذ ہو سکتا ہے۔ اس کا بھی حکم چلنے لگتا ہے۔ اور اس وقت سے اس کا سارا کام اللہ تعالیٰ کا فعل و امر ہو جاتا ہے۔ وہ اس پر عمل کرتا تھا اور دعوی کرتا تھا۔ کہ یہ تمام باتیں اس کو حاصل ہو گئی ہیں۔

جذبۂ عشق بحد یست میان من و تو
کہ رقیب آمد و نشنید بیان من و تو

مبلغ علم

حلاج کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا حال میں اوپر درج کر آیا ہوں۔ اور یہ بھی بالتفصیل بتا چکا ہوں کہ اس نے کن کن بزرگان دین سے استفادہ کیا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس کا مبلغ علم بہت معمولی سا تھا۔ خطیب بغدادی نے اگرچہ اسے شیریں مقال خطیب اور خوش فکر ادیب قرار دیا ہے۔ اور صوفی شاعر بھی بتایا ہے۔ لیکن اور مورخوں نے اس کے تمام علوم دینی حتی کہ عربی ادب سے بھی کورے ہونے کی تصریح کی ہے گرفتاری کے بعد دارالخلافہ میں جب اس سے مناظرہ کیا گیا تو اس کے مبلغ علم کی قلعی کھل گئی ابن ندیم کا بیان ہے

ویدعی کل علم وکان صفرا من ذالك

اور وہ ہر علم کا دعوی کرتا تھا۔ بحالیکہ سب سے کورا تھا۔

علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں۔

ونوظر فلم یوجد عنده شیٔ من القرآن ولا الحدیث ولا الفقه

اور جب اس سے مباحثہ کیا گیا۔ تو پتہ چلا کہ وہ قرآن، حدیث اور فقہ سب سے بے بہرہ ہے۔

باینہمہ اس نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں ابن ندیم نے الفہرست میں تقریباً ۴۴ رسالوں کے نام گنائے ہیں مثلاً کتاب

طاسین، رسالۃ الازل والجواہر الاکبر والشجرۃ الزیتونیۃ النوریہ، کتاب سر العالم کتاب کید الشیطان، کتاب العدل والتوحید، کتاب السیاسۃ والخلفاء والامراء، کتاب نور النور، کتاب التجلیات اور کتاب ہو ہو۔ البیرونی نے بھی اس کی تصانیف کثیر کا اعتراف کیا ہے۔ اور مشتے نمونہ از خروارے کتاب نور الاصل، کتاب جم الاکبر اور کتاب جم الاصغر کا نام لیا ہے۔ ابو ہلال صابئی نے اس کی ایک، اور تصنیف رسالہ آداب الوزارت نامی کا ذکر کیا ہے۔

اس کی ان کتابوں میں جس قسم کے مزخرفات مندرج ہوں گے وہ اس جیسے کم علم و گمراہ شخص کی ذات سے نہ تو خلاف توقع ہیں نہ تعجب انگیز۔ چنانچہ ان میں سے بعض کتابوں میں اس نے اپنے دعوے خدائی کی مناسبت سے مجذوبانہ بڑ ہانکی ہے۔ چنانچہ تاریخ طبری میں ہے۔

وجدت له كتب فيها حماقات وكلام مقلوب وكفر عظيم وكان في بعض كتبه انى المغرق لقوم نوح والمهلك لعاد وثمود وكان يقول لاصحابه انت نوح وانت موسى و انت محمد قد اعدت ارواحها الى اجسامهم

اور اس کی کتابیں پائی گئیں جن میں احمقانہ، الٹی پلٹی اور نہایت کفریہ باتیں مندرج تھیں چنانچہ اس کی بعض کتابوں میں لکھا ہوا تھا کہ میں ہی نوح کی قوم کا ڈبونے والا اور عاد و ثمود کو ہلاک کرنے والا ہوں۔ نیز وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا تم نوح ہو، تم موسیٰ ہو تم محمد ہو میں نے ان سب کی روحیں تمہارے بدن میں پلٹا دی ہیں۔

اسی قسم کی ایک تصنیف میں حلاج نے گھر بیٹھے فریضہ حج کی ادائگی کا سہل نسخہ درج کیا تھا۔ جو بظاہر اس کے قتل کا سبب قرار پایا۔ اس میں اس نے بتایا تھا کہ اگر کوئی شخص بیت اللہ جا کر حج نہ کر سکے تو یہ ترکیب کرے کہ ایک صاف ستھری کوٹھڑی کو لیپ پوت کر تیار کرے اور مثل خانہ کعبہ کے تمام ارکان و مناسک اس کے آگے انجام دے بعدہ تین یتیم بچوں کو اس میں بٹھا کر لذیذ کھانوں سے انکی تواضع کرے پھر عمدہ عمدہ پوشاکیں پہنا کر اور سات سات درہم نقد دے کر انہیں رخصت کر دے اسے ایک حج کا ثواب مل جائے گا۔ جب قاضی القضاۃ ابو عمر نے اس فتویٰ کی سند صداقت کی تو اس نے امام حسن بصری کی کسی کتاب (کتاب السنۃ خواہ کتاب الاخلاص) کا حوالہ دیا قاضی صاحب موصوف اس افترا پردازی کو سن کر نہایت برہم ہوئے اور جھڑک کر بولے: "او گردن زدنی! ہم اس کتاب کو مکہ میں سن چکے ہیں اس میں یہ کہاں مندرج ہے۔"

چال چلن

حلاج کی زندگی سے متعلق اصل سوال یہی ہے کہ آیا وہ اپنے دعاوی میں مخلص اور صادق تھا یا مکار و حیلہ ساز، مورخین کی عام تحقیق اور اس بنا پر ان کا عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ مکار، زمانہ ساز اور منصوبہ باز تھا جس کی وجہ سے وہ ہر وقت گرگٹ کی طرح رنگ بدلا کرتا تھا وہ کبھی ایک بات پر قائم نہیں رہتا تھا۔ وہ زہد و ریاضت جس قدر بھی کرتا تھا محض ریاءً للناس اور ان کو بہلانے فریب کرنے کا نسخہ کے لئے کرتا تھا۔ ابن ندیم کہتا ہے۔

الحلاج كان رجلا محتالا مشعبذا يتعاطى مذاهب الصوفية يتحلى الفاظهم ويدعي كل علم وكان صفرا من ذالك وكان يعلم شيئا من صناعة الكيميا وكان جاهلا مقداما متهورا جسورا على السلاطين مرتكبا للعظائم يروم اقلاب الدول و يدعي عند اصحابه الالهية ويقول بالحلول ويظهر مذاهب الشيعة للملوك و مذاهب الصوفية للعامة

حلاج فریبی و شعبدہ باز آدمی تھا صوفیوں کے مسلک پر چلتا انہی کے الفاظ زبان پر لاتا اور ہر علم و فن کا دعویٰ کرتا تھا۔ حالانکہ اس سے محض کورا تھا۔ البتہ کچھ کیمیا کا کام جانتا تھا۔ وہ جاہل، بیباک، زمانہ ساز، بادشاہوں کے خلاف منصوبہ گانٹھنے والا۔ امور مہمہ میں ہاتھ ڈالنے والا اور سلطنتوں کے تختے الٹنے کا عزم رکھنے والا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے روبرو خدائی کا دعوے کرتا تھا حلول کا قائل تھا بادشاہوں کے پاس شیعیت اور عوام میں صوفیت کا اظہار کیا کرتا تھا۔

ابن سعد کا بیان بھی اس سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ لکھتا ہے

كان الحلاج هذا رجلا غريبا خبيثا ينتقل في البلدان ويموه على الجهال ويري قوما انه يدعو الى الرضا من آل محمد ويظهر انه سني لمن كان من اهل السنة وشيعي لمن كان منهم

التشیع ومعتزلی لمن کان مذہبہ الاعتزال

یہ حلاج گمراہ اور شریر آدمی تھا شہروں میں گشت لگاتا پھرتا تھا اور جاہلوں پر جادو کے رکھتا تھا نیز لوگوں پر ظاہر کرتا تھا کہ اہل بیت میں سے امام رضا کا داعی ہے اہل سنت میں سنی شیعی مذہب والوں میں شیعہ اور معتزلہ میں اپنا معتزلہ ہونا بیان کرتا تھا۔

معشوق ما بشیوہ ہر کس برابر است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

ابوریحان البیرونی نے بھی منصور حلاج کو ابن مقنع کے زمرہ میں شمار کرنے کے بعد لکھا ہے۔ کہ وہ ایرانی النسل تھا۔ اولاً دعویٰ مہدویت کیا پھر خدا بن بیٹھا وہ دراصل ایک شعبدہ باز اور فریبی تھا۔ اپنے کو ہر مذہب وملت والے کے روبرو ویسا ہی ظاہر کرتا ع

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

اس کے معاصرین بھی اس کے متعلق اسی قسم کا سوء ظن رکھتے تھے چنانچہ ابوبکر بن سعدان حسین بن منصور کو زمانہ ساز اور شعبدہ باز سمجھا کرتے تھے شیخ عمرو بن عثمان مکی جن سے حلاج نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اس پر لعنت بھیجتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر میرا بس چلتا تو اسے اپنے ہاتھ سے ہلاک کرتا ایک دفعہ میں نے کوئی آیت تلاوت کی تو جھٹ بول اٹھا لو اشاء لقلت مثل ذالک اگر میں بھی چاہوں تو ایسا کہہ سکتا ہوں۔ ابراہیم بن شیبان نے جو اپنے شیخ کے ہمراہ کوہ ابوقبیس پر حلاج سے مل چکے تھے حلاج کے متعلق لوگوں کے استفسار پر کہا کہ جو شخص ادعاء باطل کے ثمرات ونتائج معلوم کرنا چاہے وہ حلاج کے انجام سے عبرت حاصل کرے۔

لیکن اس جرح وقدح کے ساتھ ساتھ بعض اکابر دین سے تعدیل وتوثیق بھی مروی ہے چنانچہ حضرت ابوالعباس بن سریج سے جب حلاج کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا۔

هذا رجل خفی عنی حاله فما اقول فیه شیئاً

اس شخص کی حقیقت مجھے معلوم نہیں لہٰذا میں اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

یعنی نہ تعدیل کرسکتا نہ جرح وقدح۔ اگرچہ محدثین کے اصول پر یہ بیان بھی قدح ہی پر محمول کیا جائے گا کہ اس صورت میں حلاج مجہول الحال قرار پاتا ہے۔ تاہم حضرت ابوالعباس جیسے اصحاب حال کے منہ سے اس کی اتنی سعادت بھی غنیمت ہے۔ البتہ حضرت ابوبکر شبلیؒ کے بارے میں منصور بن عبداللہ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ

گو ہم اور حسین دونوں ایک ہی شے ہیں فرق اتنا ہے کہ اس نے راز حقیقت کو فاش کر دیا اور ہم اس بار امانت کے ہنوز متحمل ہیں۔

کرامات وخرق عادات

حلاج سے بہت سے خرق عادات منسوب ہیں مثلاً وہ ہوا پر بغیر کسی ظاہری اسباب کے پرواز کرتا تھا۔ قسم قسم کے پھل اور میوے خود بخود حاضر کر دیتا تھا۔ دست غیب سے جب چاہتا۔ روپے منگوا لیتا تھا۔ اور غائب ومعدوم کو حاضر وموجود کر دیتا تھا حتیٰ کہ وہ مردوں کو زندہ کر دینے کی قوت بھی رکھتا تھا اور کتنوں کو زندہ بھی کر چکا تھا متبعین کی جماعت ان باتوں کو حلاج کی کرامات ومعجزات پر محمول کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ جن اس کے تابع فرمان تھے لیکن مؤرخین ومحققین کا گروہ ان عجائب نمائیوں کو اس کی شعبدہ بازی وبازیگری پر محمول کرتا ہے چنانچہ ابن سعد قرطبی نے صلۂ تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ

ومع ذالک خفیف الحرکات شعوذیا قد حاول الطب وجرب الکیمیا فلم یزل یستعمل المخاریق حتی استهوی بها من لا تحصیل عنده

اور ساتھ ہی چالاک دست شعبدہ گر تھا۔ طب کی آزمائش کی تھی اور کیمیا سازی میں تجربہ رکھتا تھا چنانچہ وہ برابر خرق عادات سے کام لیتا رہا جس سے نادان لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔

ابن ندیم نے بھی اسے رجلا محتالا مشعبذا (حیلہ ساز وشعبدہ باز) کا لقب اپنی بارگاہ تحقیق سے عطا کیا ہے علامہ ابوریحان البیرونی نے بھی حلاج کے خرق عادات کو ایسے ہتھکنڈوں اور فریب کاریوں ہی سے تعبیر کیا ہے۔ ابن طقطقی نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وہ جا بجا اشیاء خوردنی اور دوسری چیزیں زمین میں پہلے سے گاڑ دیتا اور بعد میں اپنے معتقدین کو اس طرف لے جا کر ان کو برآمد کر کے اپنی کرامات کی نمائش کرتا۔ یہ عجائب نمائیاں محض شعبدہ ہوا کرتی تھیں جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کسی نے ان تماشوں کو دیکھ کر فرمائش کی کہ بجائے رائج الوقت سکوں کے جن پر خلفاء کا نام کندہ ہوتا ہے تم خود اپنے نام کا کوئی سکہ تو دکھا دو مگر یہ مدعی کرامات اس کی تعمیل سے عاجز رہا۔

مؤرخین اپنے دعوے پر ایک اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ حلاج نے ہندوستان جا کر وہاں کے مشہور شعبدوں کو بڑی کوشش سے سیکھا تھا۔ ابن ندیم نے لکھا ہے۔ کہ اس نے ہندوستان میں رسی پر چڑھ کر

غائب ہوجانے کا ہتھکنڈہ ایک عورت سے سیکھا تھا خطیب بغدادی نے حلاج کی سیاحت ہند کے دو ہمسفر اشخاص مزین اور راحی الحاسب کے بیانات اپنی تاریخ میں درج کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کے اثنا گفتگو میں پوچھ پات کرنے پر اس نے بتایا کہ ہندوستان میں سحر کی تعلیم حاصل کرکے اس کے مدد سے خلق اللہ کو دعوت الی الحق دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد مؤخرالذکر کا بیان ہے کہ ہندوستان پہنچے پر جب ہم لوگ ساحل سے آگئے اور اسباب جہاز سے اتر چکا تو حلاج کنارے کی ایک جھونپڑی میں گیا جس میں ایک ضعیف العمر آدمی سکونت پذیر تھا اس سے سو[ال] متعلق گفتگو کی۔ بوڑھا جو خود بھی اس فن سے مس رکھتا تھا اس نے سوت کا ایک گچھا اٹھالایا اور اس کا ایک سرا حلاج کے ہاتھ میں پکڑا کر اسے اوپر کو اچھالا۔ تو وہ یکا یک ڈور سا بن گیا۔ بڈھا ڈور کے سہارے فضا میں قائم ہوگیا اور پھر کچھ دیر بعد اتر آیا۔ یہ تماشا دکھا کر اس نے پوچھا۔ کیا اسی قسم کا سحر سیکھنے کی خواہش ہے؟

کرامات کی شہرت کا ایک اور سبب عامۃ الناس کی غلط فہمی بلکہ خوش اعتقادی بھی ہے خود حلاج کے قول کے مطابق لوگ اس کی نسبت بے جا خوش اعتقادیوں سے کام لیتے اور اس کی کرامات کے متعلق مبالغہ آمیز باتیں مشہور کرتے رہتے تھے۔ قاضی ابوالحسن محمد بن عمر کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ اپنے ماموں کے ہمراہ حلاج سے ملنے گیا۔ وہ ان دنوں بصرہ کی جامع مسجد میں قیام فرما تھا۔ اور زہد وریاضت میں مصروف رہتا تھا لیکن یہ وہ وقت تھا کہ گو اس کی شہرت پھیل چکی تھی مگر ابھی تک اس نے اپنے جابلانہ دعاوی یا طلہ سے بلاد وامصار میں غلغلہ نہیں ڈالا تھا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے ماموں صاحب سے کہا کہ میں بصرہ سے نکل جانے کا عزم رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ لوگ میری نسبت خوش اعتقادی سے عجیب وغریب باتیں مشہور کئے ہوئے ہیں جنہیں میں برداشت نہیں کرسکتا۔ میں اس قسم کی باتوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میرے ماموں صاحب کے دریافت کرنے پر اس نے اس اجمال کی یہ تشریح کی کہ لوگ مجھے کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو جھٹ اپنی ایک خاص رائے قائم کرلیتے ہیں اور پھر انتہائی سادگی اور خوش اعتقادی سے یہ مشہور کرتے پھرتے ہیں کہ حلاج تو مستجاب الدعوات ہے، درگاہ الٰہی میں اس کی فریاد مقبول ہوتی ہے اس کے توسل سے انوار والطاف کا نزول ہوتا ہے وغیرہم من الخرافات۔ حالانکہ من آنم کہ من دانم مثلاً ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک شخص مجھے چون[د] اور فقیروں میں تقسیم کرنے کے لئے کچھ نقد دے گیا تو میں نے مستحقین کا انتظار کرنے کے بعد مسجد کے ایک پایہ کے قریب ایک چٹائی کے نیچے اس رقم کو چھپا دیا۔ دوسرے دن جب گھر سے لوٹ کر مذکورہ پایہ کے پاس نماز پڑھ رہا تھا۔ تو کچھ فقرا پہنچ آئے میں نے جھٹ نماز توڑ دی۔ اور چٹائی کے تلے سے وہ اشرفیاں نکال کر ان کے سپرد کردیں۔ اس معمولی سے واقعہ کی شہرت اس رنگ میں ہوئی کہ میں نے زمین پر ہاتھ مارا تو درہم ہاتھ آگئے[۱]

شادی واولاد

حلاج کے اس زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت پر فریفتہ ہو کر ابو یعقوب اقطع نے اپنی لڑکی اس کے حبالۂ نکاح میں دے دی تھی۔ اس ازدواج کو عمرو بن عثمان مکی نے پسند نہ کیا جس سے عمرو اور اقطع کے مابین کشیدگی بھی پیدا ہوگئی۔ لیکن بعد میں جب خود اقطع حلاج کے چال چلن کے متعلق اصلی حالت کا انکشاف ہوا تو اس شادی پر افسوس کرنے اور کہنے لگے کہ میں اس کی زہد و ریاضت شاقہ ومجاہدہ کو دیکھ کر دھوکہ میں آگیا اور اپنی [لڑکی] کے ساتھ شادی کردی مگر یہ تو پکا ساحر، حیلہ ساز، خبیث بلکہ کافر نکلا۔

حلاج اپنے مشن کی تبلیغ کے سلسلے میں جہاں کہیں جا[تا] بیوی کو بھی اکثر ساتھ رکھتا۔ اس کے بطن سے اس کے تین لڑ[کے] پیدا ہوئے تھے۔ سب سے بڑا عبداللہ تھا۔ دوسرا حسین ا[ور]

---

[۱] یہ جو منصور نے عوام کالانعام کی بے جا خوش اعتقادیوں کی شکایت کی ہے بالکل صحیح ہے حقیقتاً عوام کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے کہ وہ اپنی زود اعتقادیوں سے معاملہ کی اصلیت کو مسخ کردیتے اور کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں یہ معاملہ تنہا اسی کے ساتھ پیش نہیں آیا ہے۔ دوسروں کے ساتھ بھی اسی طرح وقوع میں آتا رہا ہے مثلاً بانی فرقہ قرامطہ خوزستانی قرمطی کی خفیہ تحریکات وعوام فریبیوں کا حا[ل] سن کر جب ابراہیم والی عراق نے اسے گرفتار کرکے ایک حجرہ میں بند کردیا تا[کہ] دوسرے دن اسے موت کے گھاٹ اتار دے تو رات کو اس کی آہ وزاری پر ایک لونڈی نے ترس کھا کر ابراہیم کی خوابگاہ سے اس کی کنجیوں کے گچھے کو چرا لیا اور حجرہ کھول کر اسے بھگا دیا۔ یہ واقعہ خوزستانی کی کرامت کی شہرت کا اچھا خاصہ ذریعہ بن گیا اور زبان زد عوام ہوگیا۔ کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس پر دسترس حاصل کرسکے کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

یہی مؤخرالذکر وہ لڑکا ہے جس سے منصور حلاج کے متعلق کچھ
تیں اوپر درج کی گئی ہیں

گرفتاری

حسین بن منصور حلاج کی گرفتاری سنہ ۳۰۱ھ میں بمقام سوس عراق عمل میں آئی تھی۔ یہ گرفتاری ایک اتفاقی انکشاف کا نتیجہ تھی ۲۹۹ھ کے اواخر میں محکمہ خبر رسانی کا ایک اعلیٰ افسر جسے اس زمانہ میں صاحب بریلہ کہتے تھے۔ اور آج کل کی اصطلاح میں سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر جنرل کہنا چاہیے۔ شہر سوس کے ایک کوچہ سے کہیں جا رہا تھا کہ ایک بڑھیا سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ جو خود بخود کچھ بڑبڑاتی ہوئی جا رہی تھی۔ افسر موصوف نے شبہ کی بنا پر اسے گرفتار کر لیا۔ دریافت کرنے پر بہت تگ و دو کے بعد اس نے بتایا کہ میرے پڑوس میں حلاج نام کا ایک شخص آ کر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے پاس لوگ لگاتار آتے جاتے اور رازدارانہ گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ افسر نے سپاہی بھیج کر اس کو اس کے رفقا سمیت گرفتار کر لیا۔ پہلے تو وہ اپنے نام ہی سے مکر گیا مگر پہچاننے والوں نے شناخت کی کہ یہی حلاج ہے اس کی تلاشی لی گئی تو بہت سے خطوط اور کاغذات برآمد ہوئے۔ ان کی اطلاع دارالخلافت میں کی گئی اور وہاں سے طلب کئے جانے پر بغداد روانہ کیا گیا۔ جہاں تشہیر کے بعد نظر بند کر دیا۔ صولی کا بیان ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ قید سے نکل بھاگا تھا لیکن دوسرے مورخوں نے یہ تصریح نہیں کی ہے۔

اس سلسلے میں حلاج کی گرفتاری و قتل کے حقیقی اسباب پر غور کرنا اور تمام متعلقہ باتوں پر نظر ڈال لینا بھی ضروری ہے۔ اس تاریخی دور کے تمام حالات پر اگر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہو گا کہ حلاج کی گرفتاری بلکہ قتل بھی سیاسی اسباب کی بنا پر عمل میں آیا تھا۔ اس عہد میں خلافت عباسیہ پر ضعف و اضمحلال کی کیفیت طاری ہو جانے سے ان فتنوں نے جن کی نشو و نما ابتدائے قیام خلافت بنو عباس بلکہ ایک حد تک بنو امیہ کے آخری دور ہی سے شروع ہو گیا تھا نئی نئی اور عجیب عجیب ہولناک شکلوں میں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ مقتدر کے عہد میں تو وہ سب بالکل غالب ہو رہے تھے۔ ان فتنوں کا سرچشمہ دعوت امامت، ادعا مہدویت اور آخر میں دعویٰ نبوت و الوہیت ہوا کرتا تھا۔ یہ جو مثل ہے۔ عوام کالانعام تو اس دور کے عامۃ الناس اس کے پورے مصداق تھے۔ ان کے دل و دماغ پر ہر منصوبہ باز ان حربوں سے وار کرتا۔ اور کامیابی حاصل کر لیتا تھا۔

جماعت شیعیان اہل بیت جس میں فرقہ باطنیہ بھی شامل ہے۔ کی تحریکات تو یکسر تمام دعوت امامت و ادعاء مہدویت ہی پر مبنی تھیں۔ قرامطہ نے بھی اسی عام حربہ حدید سے کام لیا اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پھر فتنہ جیشان کے ۲۵۵ھ میں سر اٹھانے سے چھ سات سال پیشتر جب اس کے سرغنہ نے جو بحرین کا ایک مجہول النسب شخص تھا اپنی تحریک شروع کی تو اول اول اس نے دعوت امامت ہی سے شروع کی تھی۔ اس نے اپنی نسبت امام زید کی اولاد میں سے ہونے کا دعویٰ کیا۔ عوام کی سادہ لوحی کا یہ حال تھا کہ بمجرد استماع دعویٰ کے بلا تحقیق حال اس پر ایمان لے آئے اور بیعت کے لئے پروانہ وار ٹوٹ پڑے۔ نیز تن من دھن سے اس کی اعانت کرنے کو اپنی سعادت سمجھنے لگے۔[1] فرقہ باطنیہ کا بانی عبداللہ بن میمون بن قداح بھی ایک شعبدہ باز تھا۔ اور اس کے بل پر نبوت کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شخص کبوتروں کے ذریعہ دور دراز کے دیار و امصار سے خبریں منگواتا تھا۔ اور ان کو مشتہر کر کے اپنی غیب دانی کا سکہ قلوب عوام پر بٹھاتا تھا جس کو عوام و خواص دونوں حیرت و عقیدت کے کانوں سے سنتے تھے۔

علاوہ بریں دعوت و ادعا کے اس دو دھارے حربے کو تیز و کارگر بنانے کے لئے زہد ریائی کا صیقل چڑھایا جاتا تھا۔ خوزستانی نے جب شروع شروع میں قرمطی تحریک کی تبلیغ شروع کی تھی۔ تو اپنے زہد ریائی ہی سے عوام کے قلوب پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ فتنہ جیشان

---

[1] یہ حال عوام ہی کا نہ تھا بلکہ خواص بھی اپنی زود اعتقادی کی بنا پر بہت جلد ان فریبوں کے شکار ہو جاتے تھے۔ مثلاً اسی خلیفہ مقتدر کو جس کے حکم سے حلاج کا قتل عمل میں آیا تھا ایک شخص دانیال نامی نے اس طرح دھوکہ دیا کہ ایک کتاب آئندہ واقعات پر مشتمل لکھ کر اسے زمین میں گاڑ دیا۔ اور جب وہ کافی بوسیدہ ہو چکی تو اسے نکال کر مفلح اسود کے پاس لے گیا جو مقتدر کا خاص حبشی غلام تھا۔ اس میں بعض واقعات آئندہ ایک ایسے وزیر کا حال درج تھا جس کے عہد وزارت میں خزانہ مالامال اور مملکت خوشحال ہو جائے گی۔ اور جو حلیہ درج تھا وہ دانیال کے سرپرست رئیس حسین بن قاسم سے مشابہ تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب خلیفہ کے پاس پہنچائی گئی تو اس نے ازراہ عقیدت اپنے سابق وزیر ابوالقاسم کلواذی کو معزول کر کے قلمدان وزارت اسی کو تفویض کیا لیکن پیشین گوئی پوری نہ ہوئی اور اسے اس کی نااہلیوں کی بنا پر جلد ہی معزول کرنا پڑا۔

کے سونے نے جب ... میں اپنی دعوت کا اعلان کیا تو اسی زہد و ورع کا جامہ سالوس پہن کر عوام کے سامنے نمودار ہوا تھا۔ اس سے بھی بہت پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد سعادت سے لے کر بنو امیہ کے پورے دور تک خوارج نے جو فتنے کھڑے کئے تھے وہ بھی عوام فریبی کے لئے زہد و تقویٰ ہی کے ہتھیار سے مسلح تھے غرض عبادت و ریاضت ظاہری حقیقی زہد و ورع کی علامت نہیں ؎

یہ وہ حسیں ہیں کہ چھپ چھپ کے عشق کرتے ہیں
نہ جائیے کسی پردہ نشیں کے پردہ پر

حسین بن منصور حلاج کے تمام طریقے اور جملہ حرکات و سکنات اس عہد کے مدعیان باطل اور داعیان فتن سے یک قلم مشابہ تھے وہ انہی کی طرح عبادت و ریاضت میں مبالغہ کرتا شہر بہ شہر اور قریہ بقریہ پھر پھر کر لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دیتا اور اس سلسلے میں کبھی اہل بیت کے کسی ممتاز فرد کا نام لے لیتا اور کبھی اپنے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرتا اور جب اس میں تھوڑی بہت کامیابی دیکھتا تو ایک قدم اور آگے بڑھا کر خدائی کا ادعاء باطل کر بیٹھتا لیکن جب سرکاری طور پر اس سے بازپرس ہوتی تو نہ صرف اپنے دعاوی فاسدہ سے انکار کر جاتا بلکہ خود اپنی ذات سے بھی مکر جاتا۔ اپنی ذات سے مکر جانے کا واقعہ تو اوپر بضمن حالات گرفتاری درج کیا جا چکا ہے اب دوسرا حال انکار عقیدہ کے متعلق یہ ہے کہ ابو علی بن مسکویہ کے بیان کے مطابق جو اس نے اپنی مشہور تاریخ میں جواب طبری کے حاشیہ پر مصر میں چھپ چکی ہے۔ درج کیا ہے۔ کہ حلاج کے چند خاص مرید گرفتار کر کے لائے گئے تو انہوں نے شہادت دی کہ ہم لوگوں کا عقیدہ حلاج کی نسبت اس کی خدائی اور قدرت احیاء موتیٰ کا ہے لیکن حلاج نے اس کی تصدیق نہ کی اور سب کو جھٹلایا۔

اصل یہ ہے کہ حلاج یہ سارا ڈھونگ تصوف و الوہیت کا خوزستانی قرمطی عبداللہ بن میمون، بانی فتنہ حبشان وغیرہ کی طرح سیاسی فوائد حاصل کرنے اور کسی سلطنت کی بنا ڈالنے کے لئے کر رہا تھا چنانچہ ابن ندیم نے الفہرست میں اس کی سیرت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے کہ

وکان جاھلا مقدما متھورا جسورا علی السلاطین مرتکبا للعظائم ویروم اقلاب الدول

وہ جاہل بے باک، نڈر اور سلاطین و بادشاہوں کے خلاف منصوبے گانٹھنے والا امور عظیم میں ہاتھ ڈالنے والا اور سلطنتوں کے تختے الٹنا چاہتا تھا

روحانی حقائق پر دال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کا رخ موقع و وقت کے مناسب ہمیشہ بدلتا رہتا تھا۔ اس کا سیاسی مشن تھا جس کی وجہ سے اہل بیت نبوی کی طرف ابتداءً لوگوں کو دعوت دیتا رہا اور پھر ایک ایرانی رئیس پر یہ کہہ کر سازش کے ڈورے ڈالنے شروع کئے کہ وہ ایک مذہب کا امام ہے اور اس کے پیروؤں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے جو اس کی وجہ سے رئیس کے زیر اقتدار آجائیں گے تاکہ حلاج اپنے دیرینہ منصوبہ کو حاصل کر سکے۔

ابن ندیم کا بیان ہے۔

انہ فی اول امرہ کان یدعوا الی الرضا من آل محمد فسعی بہ واخذ بالجبل فضرب بالسوط وتعلا دعا ابا سھل النوبختی فقال الرسول انا راس مذھب وخلفی الوف من الناس یتبعونہ باتباعی

وہ پہلے تو اہل بیت میں سے امام رضا کی طرف دعوت دینے لگا پھر اس پر تہمت لگی اور کوہستان میں گرفتار ہو، انکو کوڑے سے پیٹا گیا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے ابو سہل نوبختی کو دعوت دی پھر اس کے ایلچی سے کہا کہ میں ایک مذہب کا سردار ہوں اور میرے پیچھے لاکھوں آدمی ہیں جو میرے تابع ہونے کے باعث اس کے ماتحت ہو جائیں گے۔

حلاج کی دعوتیں باطنیوں کی طرح مخفی ہوتی تھیں۔ اور اس کی تمام تحریریں اور تقریریں رمز و کنایہ میں ہوا کرتی تھیں جس سے اس کی حیثیت مشتبہ ہو گئی تھی اور اسے اس عہد کے سب سے پرشور فتنہ قرامطہ کا داعی تصور کیا جانے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ گرفتار کر کے ... میں بغداد لایا گیا۔ تو اس کی تشہیر کرائی گئی۔ اور اس کے قرامطہ داعی ہونے کا اعلان کیا گیا۔ علامہ ابن جوزی ناقل ہیں۔

واخذت لہ کتب ورقاع فیھا اشیاء مرموزۃ ثم حمل فادخل الی دار السلام علی جمل ومعہ غلام لہ علی جمل آخر مشھرین ونودی علیہ ھذا احد دعاۃ القرامطۃ فاعرفوہ

اور اس کی کچھ ایسی تحریریں اور خطوط ہاتھ آئے جن میں باتیں رمز و کنایہ میں تھیں پھر اسے اونٹ پر سوار کر کے دارالخلافہ میں لایا گیا اس کا لڑکا یا غلام بھی دوسرے اونٹ پر سوار تھا۔ ان کی تشہیر کی گئی۔ اور پکار پکار کر کہا جاتا تھا کہ یہ قرامطہ کا ایک داعی ہے۔ اس کو پہچان لو۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی تاریخ الخلفاء میں لفظ بلفظ اس بیان کی تائید

قتل

حسین بن منصور حلاج ایام اسیری میں بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ
یا اور اس نے وہاں بھی اپنا تبلیغی مشن جاری رکھا۔ اس نے اپنی مخفی
ازشی چالوں سے کام لیکر شاہی خاندان کی عورتوں اور اکثر عہدہ داروں
ی کر نصر قشوری حاجب بلکہ خود خلیفہ مقتدر پر بھی اپنے ہتھکنڈے تعویذ
ر شعبدوں سے ڈورے ڈالنے شروع کئے اور سب کو اپنا معتقد بنا
یا البتہ وزیر حامد بن عباس پر جس کا دور وزارت ۳۰۶ھ سے لے کر
۳۱۱ھ تک رہا اس کا داؤں نہ چل سکا۔ وزیر موصوف اس کی ان
طرناک حرکتوں سے خائف ہو کر اس کے وجود سے عالم اسلامی کو
ک کر دینے کے لئے کوشاں تھا۔ ابن ندیم الفہرست میں لکھتا ہے

والذی عمد لقتلہ وقام فی ذالک حامد بن
العباس وقد کاد السلطان ان یطلقہ فلانہ طمس
علیہ وعلی من فی دارہ من الخدم والنساء
بالدعاء والعوذ والرقی وکان یاکل الیسیر
ویصلی الکثیر ویصوم الدھر فاستغواھم
بسترھم وکان نصر القشوری یسمیہ
الشیخ الصالح واذا غلط وحامد قد یقرہ
قد رمی ببعض الامر

اور جو اس کے قتل میں کوشاں ہوا۔ وہ حامد بن العباس تھا اور قریب
تھا کہ بادشاہ اس کو رہا کر دے۔ کیونکہ اس نے دعا اور گنڈے تعویذ
سے خود اس کو اور اس کے گھر کے تمام نوکر چاکر اور عورتوں کو موہ لیا
تھا وہ کم کھاتا۔ کثرت سے نماز پڑھتا اور ہمیشہ روزے سے رہتا تھا
اور اس طرح اس نے سب کو اپنا عقیدتمند بنا لیا تھا چنانچہ نصر القشوری
سے شیخ نیکوکار ہی کے نام سے موسوم کرتا تھا۔ مگر وہ غلطی کرتا تھا اور
حامد اس پر بعض باتوں کا الزام لگاتا اور ان کو ثابت کرتا تھا۔

حامد بن عباس نے حلاج کے قتل کا تہیہ اسوقت کیا جب اس کے
پروپگنڈا کی پوری شہادت فراہم ہولی اور یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ اگر
زیادہ دنوں تک زندہ رہا تو کہیں اپنی سازشی چالوں سے انقلاب
برپا نہ کر دے۔ ابن حوقل بغدادی کا بیان ہے:—

اخذ واعتقل وما زال فی دار السلطان ببغداد
الی ان خیف من قبلہ ان یستغوی کثیرا من
اہل دار الخلافۃ من الحجاب والحرم وغیرہم

وہ پکڑا گیا اور نظر بند کیا گیا اور برابر دار الخلافہ بغداد ہی میں رہا
تا آنکہ اس کی طرف سے یہ ڈر پیدا نہ ہو لیا۔ کہ دار الخلافہ کے حاجبوں
اور حرم سرا میں سے بہت سے لوگوں کو بہکائے گا۔

چنانچہ اس کے قتل کے اسباب میں سے ایک فوری سبب تو
وہ تھا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے اور جس کی طرف مسعودی نے
کتاب التنبیہ میں لمقالات حکیت عنہ فی الدیانات
(ان باتوں کے سبب سے جو دین میں اس سے منقول ہیں) کہہ کر مجمل سا
اشارہ کیا ہے۔ مگر جس چیز نے حامد کو خاص کر اس کے قتل پر ابھارا۔
وہ ان گمراہ کن اور خطرناک عقائد کی شہرت تھی جن کی آڑ میں اس
قسم کے سیاسی منصوبہ باز لوگ شکار کھیلا کرتے ہیں۔ اور وہ ابن اثیر
کے الفاظ میں یہ ہیں۔

وا ما سبب قتلہ فانہ نقل عنہ عند عودہ الی
بغداد الی الوزیر حامد بن العباس انہ احیا جماعۃ
وانہ یحیی الموتی وان الجن یخدمونہ وانہ
یحضرون عندہ ما یشتہی وانہ قد موہ علی
جماعۃ من حواشی الخلیفۃ وان نصر الحاجب
مال الیہ وغیرہ فالتمس حامد الوزیر من
المقتدر ان یسلم الیہ الحلاج واصحابہ
فدفع عنہ نصر الحاجب فالح الوزیر فامر
المقتدر بتسلیمہ الیہ

اور اس کے قتل کا سبب یہ ہے کہ اس کے بغداد لوٹنے پر اس
کے متعلق وزیر حامد بن عباس سے یہ بیان کیا گیا کہ اس نے ایک جماعت
کو زندہ کر دیا ہے۔ اور وہ مردوں کو جلاتا رہتا ہے۔ جن اس کے زیر
فرمان ہیں چنانچہ وہ جو چاہتا ہے اس کے پاس لا کر حاضر کر دیتے ہیں
اس نے خلیفہ کے مصاحبین کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ نصر حاجب اور
دیگر اشخاص اس سے عقیدت رکھتے ہیں۔ لہذا حامد وزیر نے مقتدر سے
حلاج اور اس کے ساتھیوں کو اس کے سپرد کر دئے جانے کی استدعا کی
نصر حاجب نے اس کی حمایت کی۔ وزیر نے زور لگایا تو مقتدر کو انہیں
اس کے حوالے کرتے ہی بنا۔

میرے خیال میں جو مستند حالات اوپر مذکور ہوئے ان کے پیش نظر
صحیح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ کاروائیاں بروئے عمل نہ
لائی گئی ہوتیں تو حلاج کی یہ تحریک پھر ایک بار لا کر مستقبل قریب میں ویسی
ہی عالم آشوبی کا موجب ہوتی جیسی غلو سے لیکر باطنیہ و قرامطہ تک کر

تحریکات ہوتی رہی ہیں۔ اور اس طرح اسلامی اقتدار کی جڑ پر ایک اور کاری ضرب لگانے کا سبب اور دین و ملت کے اندر ایک اور فتنہ و اختلاف برپا ہوئے کا ذریعہ بنتی۔

ع اچھا ہوا کہ دل کا یہ کانٹا نکل گیا

بہرحال حسین بن منصور حلاج کو قاضی ابو عمر اور دیگر علماء و فقہاء وقت کے فتویٰ کی بنا پر دریائے فرات کے کنارے ایک مجمع غفیر کے روبرو انواع عقوبت و گوناگوں عذاب کے ساتھ ۳۰۹ھ و بقول بعض ۳۱۰ھ میں قتل کر دیا گیا۔ بعدہ اس کی لاش کو تیل چھڑک کر نذر آتش کر دیا گیا اور خاک دریائے دجلہ میں پھینک دی گئی۔ اس قساوت میں وزیر کے ساتھ خود خلیفہ مقتدر کا دامن بھی ملوث ہے۔ قاضی ابن خلکان کا بیان ہے

وکتب الوزیر الی المقتدر یخبرہ بما جری فی المجلس فاجاب المقتدر بانہ اذا کان قد افتی القضاۃ بقتلہ فیسلم الی صاحب الشرطۃ ولیتقدم الیہ بضربہ الف سوط فان مات من الضرب والا ضرب الف سوط اخری ثم یضرب عنقہ فسلمہ الوزیر الی الشرطی وقال لہ ما رسم بہ المقتدر وقال ان لم یتلف فتقطع یدہ ثم رجلہ ثم تحز رقبتہ وتحرق جثتہ وان خدعک وقال لک انا اجری الفرات ودجلۃ ذہبا وفضۃ فلا تقبل ذلک منہ ولا ترفع العقوبۃ عنہ

اور وزیر نے مقتدر کو مجلس کے تمام حالات سے مطلع کیا۔ اس کا جواب مقتدر نے یہ دیا کہ جب قاضیوں نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا ہے۔ تو اسے پولیس کے حوالہ کر دیا جائے۔ وہ اسے پہلے ہزار کوڑے لگائے اگر اس سے مر جائے تو خیر ورنہ ایک ہزار کوڑے اور لگائے جائیں بعدہٗ اس کی گردن مار دی جائے چنانچہ وزیر نے اسے پولیس کے افسر کے حوالہ کرتے ہوئے اسے مقتدر کے احکام سے آگاہ کیا اور ہدایت کی کہ اگر اس پر بھی اس کی جان نہ نکلے تو پہلے ہاتھ پھر پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور اس کے بعد گردن اڑا دی جائے اور اس کی لاش کو جلا دیا جائے لیکن دیکھنا اگر وہ تم کو ٹھگنا چاہے اور کہے کہ میں سونے چاندی کا دجلہ و فرات بہا سکتا ہوں۔ تو اس کی بات میں نہ آنا اور عقوبت سے دست بردار نہ ہونا۔

البیرونی کا بیان ہے کہ اتنی تو ہولناک عقوبت ہوئی مگر حلاج خاموشی و استقلال سے سب کو برداشت کرتا رہا اور اُف تک نہ کی گویا وہ زبان حال سے نعرہ لگا رہا تھا ؎

وہ کون ہے جو مجھ پہ تأسف نہیں کرتا ۔ پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا

دار و رسن کا افسانہ

اخیر میں ایک بات اور یہ عرض کرنی ہے کہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ منصور کو سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا گیا تھا مگر مجھے کسی مستند تاریخ میں اس کی تصریح نہیں ملی۔ محولہ بالا تمام مؤرخین نے بھی جن کی ثقاہت و استناد کا پایہ بہت بلند ہے خصوصاً جب وہ کسی مسئلے میں اتفاق کریں یا کثرت رائے سے کچھ کہیں صرف قتل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو عام طور پر کسی اسلحہ سے ہلاک کرنے کے مفہوم میں بولا جاتا ہے میرے خیال میں اس کا ماخذ حافظ، فردوسی، سنائی، رومی وغیرہ قدیم صوفی شاعروں کے وہ شاعرانہ کنایات ہیں جو ان کی غزلیات کے بعض اشعار میں پائے جاتے ہیں مثلاً ؎

کشد نقشے انا الحق بر زمیں خوں ۔ چو منصور ار کشی بر دارم امشب

شود منصور از کیج و دار منصور از کجی ۔ خود زدی بانگ انا الحق بر سر دار آمدی

اور بعضوں نے تو "دار" کے ساتھ "رسن" کی تشریح بھی کر دی ہے ؎

عمر بیست کہ افسانۂ منصور کہن شد ۔ من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

منصور حلاج کے وجود سے دنیا ہمیشہ کیلئے خالی ہو گئی مگر اس کے نام لیوا معتقدین و متبعین کی باضابطہ جماعت ایک خاص فرقہ کی صورت میں مدت دراز تک باقی رہی ابو ریحان البیرونی المتوفی ۴۴۰ھ کا بیان ہے کہ منصور حلاج کے مذہب کے پیرو آج تک موجود ہیں جن کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ مہدی بنکر ملک لعادن سے دوبارہ نمودار ہوگا اسیطرح مشہور مؤرخ خطیب بغدادی المتوفی ۴۶۳ھ نے اپنی تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں بھی منصور حلاج کے تبعین کی جماعت موجود ہے جو اس سے حسن ظن کے اظہار میں نہایت غلو کرتی ہے۔

خود ہمارے زمانہ میں متصوفین اور کم علموں کا ایک بڑا حلقہ ہے جو اپنی بیخبری و نافہمی کی بنا پر حلاج کو اہل اللہ کے مقدس گروہ میں شمار کرتا ہے اور اس کے خرافات و دعاوی کی لطیف پیرایہ میں تاویل کرتا ہے حالانکہ اگلے صوفیائے کرام میں اس کی حقیقت کے متعلق سخت اختلاف تھا خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ کثیر و بیشتر صوفیائے کرام نے حلاج کے حضرت جنید بغدادی، ابو الحسن نوری، شیخ عمرو مکی وغیرہ اکابر مشائخ سے فیض یاب ہونے کی روایت کو تسلیم نہیں کیا ہے اور وہ اس کے صوفیوں کی جماعت میں شامل ہونے تک کے منکر ہیں علاوہ ازیں یہ بھی ہے کہ جو مستند حالات اوپر مذکور ہو چکے ہیں انکے پیش نظر حلاج کو اہل تصوف میں شامل کرنا تصوف کو ہدف اعتراض بنانا ہے۔

نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

از مسیح الکلام حضرت زیبا ناروی

عیاں ہو تو کیونکر بیاں ہو تو کیونکر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا
جو گذری ہے مجھ پر وہ گذری ہے مجھ پر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

مری بیخودی نے دیئے مجھکو جھانسے سرِ انجمن کہہ گیا جو زباں سے
بیاں ہو گئی رودادِ دل کیا مکرر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

مرا ماجرا اور بارِ سماعت تمھاری خطا کیا خدا کی ہے قدرت
تمھیں ہے تکلف تو میں بھی ہوں ہٹ پر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

بیاں آرزو کیا ہو وقتِ تصور تمھیں ہے تکبر مجھے ہے تحیّر
چلو ہو گئے آج دونوں برابر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

نہ کہنے کا موقع نہ سننے کی مہلت نہ میں مطمئن ہوں نہ تم کو ہے فرصت
بیاں حسرتِ دل اگر ہو تو کیونکر؟ نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

محبت کی روداد یوں ہی رہیگی زباں میری محفل میں کیونکر کھلے گی
نہ کہنے کی جرأت نہ سننے کے تیور نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

گئی گذری باتیں ہیں اب ساری باتیں وہ آفت کے دن اور زحمت کی راتیں
جو صدمے گذرتے رہے مجھ پہ اکثر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

رموزِ محبت پہ تقریر کیسی رہے گی نہاں دل میں ہر بات دل کی
کسی روز بن جائیگی یوں ہی دم پر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

مناسب یہی ہے یہی بات موزوں وہ پوچھیں بھی زیباؔ تو ان سے یہ کہدو
عجب ماجرا ہے قصۂ قلبِ مضطر نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا

آسیب زدہ مکان

جس مکان میں یہ تحیرزا واقعہ پیش آیا ہے اس کا نام اور پتہ درج کرنے سے میں قصداً اجتناب کر رہا ہوں، کیونکہ کسی جائداد کی شہرت کو نقصان پہنچانا قانوناً جرم قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں جب میں مکان زیر بحث کو خیرباد کہنے لگا تو گھر کے مالک نے مجھے سختی سے متنبہ کر دیا تھا کہ اگر ان رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات کی تفصیل لکھتے وقت، جو اس گھر میں پیش آئے میں نے مکان کا پتہ شامل کیا تو قانونی چارہ جوئی کر کے مجھے نقصان کی تلافی کرنے پر مجبور کیا جائیگا۔

چونکہ مجھے یقین ہے کہ اس دھمکی کی حرف بحرف تعمیل کی جائے گی۔ اس لئے میں مجبوراً اس سڑک کا نام تک درج نہیں کر سکتا جس میں وہ مکان واقع ہے۔ لیکن اس امر کی شہادت کے لئے کہ یہ واقعہ "سو فیصدی سچا ہے" میں نے ہربرٹ جنکنس لمیٹڈ کے پاس مفصل "ثبوت" جمع کر دیئے ہیں، تاکہ اگر آپ چاہیں تو جا کر یہ دیکھ سکیں کہ جو کچھ میں نے اس کہانی میں بیان کیا ہے اس کا حرف حرف درست ہے۔

چند سال گزرے تمام دنیا کا چکر کاٹ چکنے کے بعد میں نے لندن میں اقامت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا: تاکہ کم سے کم کچھ عرصہ زندگی اس شاندار دارالسلطنت میں چین سے گزر سکے۔

لیکن رہنے کے لئے ایک مناسب مکان کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مکان لندن کی سرگرم زندگی کے مرکز میں ہو۔ اور اس میں باغیچہ و اشجار بھی ہوں۔ ظاہر ہے ان "اجتماعات" کا ایک ساتھ مل جانا آسان کام نہ تھا۔

ایک شام جب میں کسی ضرورت سے باہر گیا تھا میری

کیبرو کا ایک دہشتناک افسانہ

ترجمہ: جناب جمیل احمد کند ہانپوری ایم۔ اے

نظر ایک ایسے مکان پر پڑی جس میں یہ خصوصیات موجود تھیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا۔

یہ ایک قدیم وضع کا مکان تھا اور بڑی شاہراہ سے کچھ ہٹ کر واقع تھا۔ سامنے ایک بڑا سا باغیچہ تھا۔ جس کے اونچے اونچے درختوں نے اس کو آنے جانے والوں کی نظروں سے روپوش کر دیا تھا۔

اس مکان کی بابت کسی ایجنٹ نے میرے سامنے کبھی ذکر نہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس پر "کرایہ کے لئے خالی ہے" یا "فروخت کے لئے" کی قسم کا کوئی اشتہار بھی چسپاں نہ تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اس مکان میں اقامت اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ـــ ایک ہی نظر میں اس مکان نے مجھے اپنا مداح بنا لیا تھا۔

اپنی زندگی میں چونکہ میں اپنے وجدان (INTUITION) کی پیروی کی ہے۔ اس لئے میں نے اسی وقت اس گھر کے متعلق ضروری باتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔

آخر چھان بین کرنے میں کوئی ہرج تو ہے نہیں! ـــ یہ سوچتا ہوا میں اس کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑھا۔

سامنے شاہ بلوط کا ایک پرانی وضع کا مضبوط دروازہ تھا ـــ میں نے ہاتھ سے دھکیل کر کواڑ کھول دیئے اور آن واحد میں خود کو ایک نئی دنیا میں پایا۔

باہر سڑک پر دیوقامت موٹر لاریوں اور آنے جانے والوں کا شور و شغب تھا، اور یہاں اس بلند چہار دیواری کے اندر چین اور سکون کا عجیب سا احساس ہوتا تھا۔

ویران سے باغ کے وسط میں قدیم وضع کا ایک فوارہ

---

[1] یہ کہانی دنیا کے مشہور ترین پامسٹ کیبرو کی شہرۂ آفاق کتاب TRUE GHOST STORIES کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر ہربرٹ جنکنس HERBERT JENKINS نے شائع کی ہے۔

…ا جن سے پانی کے چھینٹے کچھ اس طرح نکل رہے تھے، جیسے اس … لئے وقت کا اب کوئی وجود ہی باقی نہیں! اس کے دوسری … ب تاریک اور بادامی رنگ کے پھولوں کے غبار آلود پودے … اگے ہوئے تھے۔ اور ان سے کچھ دور بہت کریکڑی کی بنی ہوئی … بیٹھنے کی جگہ تھی۔ مگر امتداد زمانہ کے باعث اس کی حالت اب … ناگفتہ بہ تھی۔

اس گھر کے دریچے بہت نیچے نیچے تھے اور عمارت بالکل … اداس اور بے رونق سی معلوم ہوتی تھی —— لیکن ان باتوں کے … باوجود بھی اس میں کچھ ایسی سحر انگیز کشش تھی جس نے مجھے … اس قدر متاثر کیا کہ بغیر کسی پس و پیش کے میں برساتی کے اندر … گیا اور بھاری بھرکم لوہے کی گھنٹی کی زنجیر کھینچ لی۔

مجھے توقع تھی کہ اندر سے کوئی ملازم جواب دیگا۔ مگر میری … توقع کے خلاف ایک شریف سن رسیدہ آدمی نے آکر دروازہ … کھولا —— اسے دیکھ کر چند سیکنڈ کے لئے میں بالکل مبہوت … ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہاں آنے کی اس سے کون سی وجہ … بیان کروں۔

"میں نے سنا ہے آپ اس مکان کو کرایہ پر لگانا چاہتے ہیں؟" … میں نے جلدی سے سوچ کر کہہ دیا۔

وہ معمر آدمی کچھ اونچا سنتا تھا۔ مگر نہایت خلیق تھا۔ اس نے … نہایت نرمی سے جواب دیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ اب میں … واپس جانے کے لئے مڑ ہی رہا تھا کہ اس کی شریک حیات … کمرہ سے نکل کر وہاں آگئی۔

"تم نے سنا!" اس نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔ … "یہ صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارا مکان کرایہ کے لئے خالی … ہے؟"

میں نے بیجا مداخلت کے لئے پھر معافی مانگنے کی کوشش کی۔ … عورت نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "مجھے تعجب ہے آپ کو … یہ بات معلوم کس طرح ہوئی! میں نے تو کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ … ہاں یہ درست ہے کہ میں اس گھر کو کسی نہ کسی ایجنٹ کے سپرد … کرنا چاہتی ہوں —— تکلیف نہ ہو تو آپ اندر تشریف … لے آئیں۔"

ہم پرانی وضع کی ایک مستطیل نشست گاہ میں داخل ہوئے … جس کے شہتیر اور شاہ تیر کے تختے اپنی کہن سالی کے باعث

سیاہ ہو گئے تھے۔ عورت نے کسی قدر پس و پیش کے ساتھ چند پردے کھینچ لئے اور میری نظر ایک چھوٹے سے خانہ گرجا پر پڑی، جس کے سامنے کے دریچے میں سفید شیشے جڑے ہوئے تھے۔

"بڑی دلکش جگہ ہے! —— حد درجہ پُرسکون!" میں بیخود ہو کر بول اُٹھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ اسے پسند کرتے ہیں" اس نے کہا "خانہ گرجا کو ہم استعمال نہیں کرتے۔ اس لئے اس کے سامنے پردہ ڈال دیا ہے!"

اتنا کہہ کر وہ مجھے دوسرے کمروں کی سیر کرانے لگی۔ اور میں نے اپنے دل میں اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ اگر شرائط ذرا بھی موزوں ہوئیں تو اس گھر کو لے لوں گا۔

"مگر آپ اس گھر کو چھوڑنا کیوں چاہتی ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

یہ سن کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی ——

"بات یہ ہے" وہ کہنے لگی "کہ کوئی ملازم یہاں ٹھہرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ خواہ اُسے کتنی ہی تنخواہ کیوں نہ دی جائے۔ میں آپ کو دھوکا دینا نہیں چاہتی —— ملازموں کے کمرے عقبی حصے میں ہیں۔ اور چونکہ وہ عجیب عجیب تحیر زا آوازیں سنتے ہیں۔ اور کبھی کبھی انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ان کے سامنے سے گزر گیا۔ اس لئے اب وہ یہاں کسی طرح بھی ٹھہرنے پر رضامند نہیں ہوتے —— اب یہ آوازیں" دوسرے کمروں میں بھی شروع ہو گئی ہیں۔ میرے شوہر چونکہ بہرے ہیں اس لئے وہ کچھ نہیں سنتے، مگر میری تو جان پر آ بنی ہے۔ اگر کوئی کرایہ پر لینے کیلئے رضامند ہو جائے تو میں نہایت خوشی سے اس مکان کو چھوڑ دوں گی۔"

قدرے توقف کے بعد اس نے پھر کہا "یہاں اقامت اختیار کئے ہمیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میرے شوہر ابھی پچھلے سال یہاں اپنے چچا کے مرنے کے بعد آئے ہیں۔ وہ نہایت سنکی قسم کے آدمی تھے۔ اور اس مکان کے اگلے حصہ میں اپنے پرانے خانساماں کے ساتھ کافی عرصہ تک تنہا رہے۔ عقب والے کمروں میں وہ کسی کو بھی جانے نہ دیتے تھے۔"

قصہ مختصر آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اندر ہم دونوں نے

باتیں طے کرلیں، اور معاہدہ یہ ہوا کہ ہفتہ عشرہ تک مکان سے تمام چیزیں ہٹالی جائیں گی، اور اس کے بعد یہ میرے سپرد کردیا جائیگا۔

آخر وہ دن بھی آپہنچا جب یہ مکان میرے سپرد کیا جانے والا تھا۔ میں اس دن ایسا ہی مسرور تھا جیسا کہ ایک بچہ کوئی نیا کھلونا پانے پر ہوتا ہے۔ اس گھر میں نہ جانے کونسی ایسی کشش تھی جس کے باعث میں اس کی طرف حیرت انگیز طور پر مائل ہوتا جاتا تھا۔ غبار آلود کمروں کو میں نے ٹہل ٹہل کر دیکھا اور آرائش کرنے والوں کو بتا دیا کہ کس کمرے سے کونسا مصرف لیا جائیگا۔ شاہ بلوط کی لکڑیوں پر کس قسم کی پالش چڑھائی جائے گی۔ اور دریچوں کے قیمتی شیشے کس طرح صاف کئے جائیں گے کیونکہ سالہاسال سے ان کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔

لیکن ایک کمرہ ایسا تھا جس کو ہاتھ لگانا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ یہ مکان کی زیریں منزل میں زینہ سے کچھ ہٹ کر واقع تھا۔ اس کمرے میں کون سی ایسی بات تھی، یہ میں بیان کرنے سے قاصر تھا:

آخر وہ دن آگیا جب میں نے اسباب بھجوانا شروع کیا۔ اور جلد جلد دو کمرے ساز وسامان کے ساتھ آراستہ کرلئے — ایک اپنے لئے اور دوسرا سیکرٹری کے لئے جو عمر میں چند سال مجھ سے بڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گھر میں رہ کر میں آرائش کرنے والوں سے جلد مخلصی پا سکوں گا۔ ورنہ یوں ہر روز ان کا کام دیکھنے کے لئے یہاں آنا پڑے گا۔

اس وقت مجھے ملازموں کے لئے بھی کسی طرح کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ہم کھانا باہر کسی ہوٹل میں کھا کر یہاں صرف سو سکتے تھے۔

لیکن سونا! — یہ تو تقریباً مشکل سا تھا۔ کیونکہ پہلی ہی رات سے یہ ہمارے لئے قطعی ناممکن ہوگیا۔ پہلی رات میں اپنے سیکرٹری کے ساتھ تقریباً دس بجے وہاں پہنچا۔ ہم نے "غلام گردش" سے ہوکر گئے اور بغور دیکھ لیا کہ تمام دروازے اور دریچے اچھی طرح بند ہیں۔ اندھیرے میں راہ ٹٹول کر ہم آرائش کرنے والوں کی سیڑھی کے بیچ سے گزرے اور ہال اور نمانہ گرجا سے ہوتے ہوئے ہم اپنے کمرہ میں پہنچے۔

جگہ اس قدر خاموش اور پُرسکون تھی جیسے ہم کسی گاؤں کے وسط میں تھے۔ دور سڑک پر سے آنے جانے والوں کی مدھم آواز آرہی تھی اور اس وقت ہمیں یہ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے ساحل کی موجوں کا پُرترنم شور!

میرے سرہانے کے پاس بجلی کا لیمپ تھا۔ اس لئے کچھ دیر تک تو میں پڑھتا رہا۔ پھر بٹن دبا کر سونے کے لئے بستر پر دراز ہوگیا۔

اس گھر میں آجانے کے خیال سے مجھے بہت خوشی محسوس ہورہی تھی۔ آرائش کرنے والے اپنا کام جلد جلد ختم کر رہے تھے اور میں لیٹا لیٹا سوچ رہا تھا کہ جب آرائش پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو گھر کس قدر خوبصورت معلوم ہوگا۔

میں خیالات کے سمندر میں بہا جارہا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر لیٹا تھا مگر دفعتاً مکان کی نچلی منزل سے ایک عجیب سی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا — ایک ہی لمحہ بعد کسی کمرے کا دروازہ خود بخود کھلا اور پھر فوراً بند ہوگیا۔

اس وقت سب سے پہلے میرا خیال ان دروازوں اور دریچوں کی طرف چلا گیا جنہیں ہم نے بند کیا تھا — میں سوچنے لگا، یقیناً یہ ہوا کا نتیجہ ہوگا۔ لیکن فوراً ہی مجھے یاد آگیا کہ رات حد درجہ پُرسکون تھی اور باغ سے گزرتے وقت میں نے اچھی طرح دیکھا کہ درخت کا کوئی پتہ بھی جنبش نہیں کر رہا ہے —

پھر ایک مرتبہ ایک تحیر زا آواز میرے کانوں میں آئی، اور میں گوش برآواز ہوکر بیٹھ گیا۔

اب جو کچھ میں سن رہا تھا، اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کی گنجائش نہ تھی — نیچے سے جو زینہ ہال تک گیا ہے۔ اس پر بھاری بھاری قدموں سے کوئی چل رہا تھا۔

ہر طرف کامل تاریکی مسلط تھی اور میں مسہری پر بیٹھا ہوا، اُن پُراسرار آوازوں کو سن رہا تھا۔

بھاری قدموں کی آواز ہال کمرے کی طرف سے آرہی تھی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ آواز قریب ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور آخر ہمارے کمروں کے قریب پہنچ گئی۔

میرا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بٹن دبا کر روشنی جلا دوں مگر میری ہمت نہ ہوتی تھی کیونکہ

دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا۔ کہ اگر میں نے بٹن دبایا تو میرے کمرے کے دروازے تک روشنی پھیل جائے گی۔ اور اس کی مدد سے اس پُر اسرار ہستی کے قدم سیدھے میرے کمرے میں پہنچ جائیں گے۔

زینہ سے چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ مجھے فوراً یاد آ گیا کہ زینہ کی ایک پٹری کچھ ڈھیلی ہو گئی تھی اور یہ اس جگہ تھی جہاں سے زینہ میرے کمرے کی طرف مُڑتا تھا ـــــ وہ پُر اسرار قدم نہایت آہستہ آہستہ میرے کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چلنے والا، خواہ وہ کوئی ہو کسی خاص عجلت میں نہیں!

اس کے قدم "ڈھیلی پٹری" پر پہنچ گئے ـــــ اس سے بجنسہٖ وہی آواز پیدا ہوئی، جیسی اس وقت نکلی تھی جب میں اس پر سے ہو کر اپنے کمرے میں آ رہا تھا۔ چند قدم اور چلنے کے بعد "قدم" عین میرے دروازے کے پاس آ کر رک گئے۔

اضطراب و بے چینی کے وقت انسان کا دماغ کس قدر عجیب و غریب طور پر کام کرتا ہے ـــــ میں جانتا تھا کہ پیتل کی بھاری چٹخنی میں نے اندر سے چڑھا دی ہے۔ اور مجھے اس کا یقین تھا کہ اگر وقت آیا تو دباؤ اور زور کو بھی کسی حد تک روک سکے گی۔ اس وقت میں حیرت سے سوچ رہا تھا۔ کہ شاید اس شخص کے شانے بہت چوڑے ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ چہرے پر نقاب لگائے ہوئے ہو ـــــ اور اس قسم کے سیکڑوں خیال میرے دماغ میں چکر لگانے لگے ـــــ لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال میرے دماغ میں نہ آیا کہ ممکن ہے وہ شخص جو اس وقت دروازے کے باہر کھڑا تھا "انسان" نہ ہو!!

میں اس وقت بمشکل سانس لے رہا تھا۔ جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آتشدان سے لوہے کا ایک وزنی آتش کرید ایک ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرا ہاتھ بجلی کے بٹن پر رکھ کر کواڑ کھلنے کا انتظار دیکھنے لگا۔

لیکن اس وقت ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے میرے رہے سہے اوسان بھی ختم کر دیئے۔ دفعتاً میرے کمرے کے کواڑ پر کھٹ، کھٹ، کھٹ!.... کھٹ، کھٹ، کھٹ!! کی آواز ہونے لگی، جیسے کوئی اپنی انگلیوں کے جوڑ کی ہڈی سے ضرب لگاتا ہو۔

خوف و دہشت سے میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔

اب "انسان" کا خوف دل سے محو ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ کسی فوق الفطرت اور پُر اسرار ہستی کا خوف مسلط ہو گیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر وہی رگوں کا خون سرد کر دینے والی آواز پیدا ہوئی ـــــ کھٹ۔ کھٹ، کھٹ!!.... کھٹ، کھٹ، کھٹ!!! ـــــ میں نے بٹن دبا کر روشنی کی اور دروازہ کے پاس جا کر چٹخنی کھینچ لی۔ جب آن واحد میں دونوں کواڑ کھل گئے تو میں نے اپنے سامنے کیا دیکھا ـــــ؟ رات کی پُر ہَول تاریکی اور بس!

اب میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ ایک ہی لمحہ بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری رگوں کا تمام خون برف کی طرح سرد کر دیا۔ میں دروازہ کے پاس کھڑا تھا۔ برقی لیمپ کی تیز روشنی سے سارا کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا ـــــ لیکن میرے سر کے پاس ہی صرف تین چار انچ کے فاصلہ پر پھر کھٹ کھٹ کھٹ!!.... کھٹ، کھٹ، کھٹ کی آواز ہونے لگی۔ اس مرتبہ یہ خوفناک آواز پہلے سے بھی صاف اور واضح تھی۔

بس چھلانگ لگا کر میں کمرے میں آیا اور اس زور سے کواڑ بند کئے کہ اس کی آواز زینہ کی چھت میں بھی گونجی۔ پیتل کی چٹخنی میں نے فوراً چڑھا دی اور خوف و ہراس سے لرزتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا ـــــ کس کا انتظار؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

آخر صبح ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ مجھ میں ہمت بھی عود کر آئی۔ صبح کی اولیں شعاعیں جیسے ہی دریچوں سے اندر آئیں میں نے چٹخنی چڑھا دی۔ سارے لندن میں زندگی کی لہر دوڑ پڑی تھی۔ کرایہ کی بگھیاں جن کی گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ سواری کی تلاش میں قریب سے گزر رہی تھیں۔ سڑک پر موٹریں اور لاریاں اب نظر آنے لگی تھیں۔ اور ہر شخص اپنے اپنے کام پر روانہ ہو رہا تھا ـــــ زندگی کی لہر رفتہ رفتہ زیادہ تیزی سے بہنے لگی۔

اس وقت یہ فضا کچھ نہایت خوشگوار معلوم ہو رہی تھی بالخصوص رات کے خوف و وحشت کے مقابلے میں جس کو وقوع پذیر ہوئے ابھی صرف چند ہی گھنٹے گزرے تھے۔

ہاں! دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ مجھ میں از سرِ نو ہمت

بھی عود کر آئی۔ میں نے اپنے کپڑے پہنے اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکلا اور چبوترے پر چلا گیا۔

اس وقت تمام چیزیں، تمام ماحول نہایت شگفتہ معلوم ہو رہا تھا۔ صبح کی دھوپ دریچوں سے اندر آ رہی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زینہ میرا خیر مقدم کر رہا ہے۔ ڈھیلی پٹری پر میری نظر پڑی۔ اور رات کے وقت قدموں کی جو آوازیں میں نے سنی تھیں، ان کی یاد سے میں ایک لمحہ کے لئے لرز سا گیا۔ مگر یہ خوف عارضی تھا، بہت عارضی۔ کیونکہ چند سیکنڈ بعد میں اپنے آپ پر ہنس رہا تھا، اپنی کمزوری اور واہمہ پر!

میں نے اس وقت اپنے دل کو ملامت کی، نہایت پر زور ملامت، کہ میں نے کیوں پچھلی رات خواہ مخواہ وہم کا شکار ہو کر یہ سمجھ لیا کہ کسی کے قدم زینے پر سے گزر رہے ہیں اور یہ کہ کوئی دروازے پر اپنی انگلی کی ہڈی سے کھٹ کھٹ، کھٹ کر رہا ہے ——— سچ مچ میں اوّل درجہ کا احمق تھا! اس قسم کی کمزوریوں کا شکار ہونے والا واقعی اس لائق ہے کہ اسے پاگل خانہ میں بھیج دیا جائے۔ اس کے سوا ایسے احمق کے علاج کی دوسری صورت نہیں ———!

عین اسی وقت میرا سیکرٹری اپنے کمرے سے باہر نکل آیا ———

"کیوں پرکنس! رات اچھی طرح تو سوئے؟" میں نے استفسار کیا۔

"کیا آپ سو سکے تھے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"میں خواہ مخواہ توہمات کا شکار ہو گیا تھا" میں نے ہنس کر جواب دیا "مجھے یہ وہم پریشان کرنے لگا تھا کہ کوئی زینہ پر سے گزر رہا ہے ——— اور میرے کمرے کے کواڑ پر اپنی انگلیوں سے دستک دے رہا ہے۔ تمام رات اس خوف سے بستر پر کانپتا رہا اور مطلق سو نہ سکا۔ سچ سچ واہمہ انسان کو بعض اوقات کس قدر پریشان بنا دیتا ہے ——— ہے نا؟"

"اس وقت دن کے اجالے میں ہنسنا آسان ہے جناب!" پرکنس نے کہا "لیکن اگر میں یہاں ایک رات بھی اور رہا تو میرا دم نکل جائے گا ——— میں اب ہرگز اس مکان میں نہیں ٹھہر سکتا!"

"کیوں؟ کیا تم نے بھی آوازیں سنی تھیں؟ ——— اگر یہ سچ ہے تو تم اسی وقت میرے کمرے میں کیوں نہ چلے آئے؟"

اس وقت رات کے تمام واقعات مجھے یاد ہو گئے تھے۔ اور اب میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ بہت ممکن ہے وہ واہمہ کا نتیجہ نہ ہوں ———!

میرے سامنے اس وقت، ایک سلیم الطبع آدمی کھڑا تھا۔ عمر میں بیس سال مجھ سے متقدم ——— جس نے میری طرح تمام پُر اسرار آوازیں سنی تھیں، اور جس نے نہایت بیباکی سے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ رات کے وقت فرطِ خوف سے اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

"خیر، میرے دوست" میں نے کہا "اب بتاؤ تو سہی ہمیں کرنا کیا چاہئے؟"

"مکان چھوڑ دینے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے ——— قفل لگا کر کنجیاں گھر کے مالک کے سپرد کر دیجئے اور ان سے صاف کہہ دیجئے کہ جتنے روپے اب تک ہم نے اس مکان پر صرف کئے ہیں، وہ ہمیں واپس کر دیں ——— اگر وہ آسانی سے اس پر رضامند نہ ہوں تو قانونی چارہ جوئی کیجئے ——— میں یقین دلاتا ہوں، عدالت کا فیصلہ ضرور آپ کے حق میں ہوگا!"

"لیکن شاید تم یہ بھول رہے ہو" میں نے پرکنس سے کہا "کہ عورت نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کے گھر میں کوئی ملازم بھی رہنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ گھر آسیب زدہ ہے، اور وہ خود طرح طرح کی پُر اسرار آوازیں سن چکی ہے ——— میں نے تو سب کچھ جانتے ہوئے اپنی ذمہ داری پر یہ گھر لیا ہے۔ اب بتاؤ ایسی حالت میں عدالت کے دروازے کس طرح کھٹکھٹائے جا سکتے ہیں؟"

"تو پھر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں اسی گھر میں جما رہوں گا، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو" میں نے جواب دیا "اور ساتھ ہی تم کو بھی ہرگز جانے نہ دوں گا، سمجھے؟"

اس رات ہم تقریباً دس بجے واپس آئے ——— اپنے کمرے میں میں نے آگ روشن کی، اس کے سامنے دو آرام کرسیاں رکھیں اور ہم دونوں نے خوب تلخ قہوہ نوش کیا اور اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ طلوعِ سحر تک بیدار رہ کر تمام واقعات کا اچھی طرح جائزہ لیں گے۔

پہلے چند گھنٹے تو نہایت سکون اور اطمینان سے گزرے مگر تقریباً ایک بجے جب اپنی اپنی کرسی پر ہمیں غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی، پھر وہی حیرت انگیز آواز سنائی دی اور ہم چونک کر اٹھ بیٹھے۔ اس وقت جو آواز ہمارے کانوں میں آ رہی تھی اس کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی ——— یہ کسی کے قدموں کی آواز تھی جو قریب سے قریب تر ہوتی ہوئی دروازہ کے پاس رُک گئی۔ لیکن یہ قلیل ترین وقفہ بھی ہمارے لئے "دوام" سے کم نہ تھا ——— ایک ہی لمحہ بعد پُر اسرار ہستی نے کواڑ پر اپنی انگلیوں سے دستک دی، کھٹ، کھٹ، کھٹ!!... کھٹ، کھٹ، کھٹ....!!!

ہم دونوں اس وقت دم بخود کھڑے تھے اور لاچار بچوں کی طرح حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

خالی چبوترے سے ایک تیز "ٹک" کی آواز پیدا ہوئی — بجلی کا بلب خود بخود روشن ہو گیا تھا۔

"میرے معبود! یہ بھوت ہرگز نہیں ہو سکتا"، پرکنس نے کہا۔

ہم دونوں نے آتشدان سے ایک ایک لوہے کا مضبوط آتش کاوا اٹھا لیا، اور پچھلی رات کی طرح پھر آج بھی میں نے چٹخنی کھینچ لی اور دروازہ کھول دیا۔

چبوترے پر اسی طرح روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

آتش کاوا کو خوب مضبوطی سے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہم اتر کر زینہ پر چلے گئے ——— سکوت، موت کا سا پُر اسرار سکوت، ہر ہر چیز پر حکمران تھا۔

غیر ارادی طور پر میں نے جھانک کر زینہ کے کٹہرے میں سے دیکھا ———

"پرکنس" میں نے سرگوشیوں میں کہا "ہال کا بلب کس نے روشن کر دیا ہے؟ اس طرح اسے چھوڑ دینا ٹھیک نہیں۔ ہمیں جا کر روشنی گل کر دینی چاہئے"۔

ہم دونوں ایک ساتھ قدم بہ قدم وہاں گئے، مگر نہایت آہستہ آہستہ ——— جیسے ہمارے پاؤں سیسہ کے ہو گئے ہوں! ہال سے ہمیں کس "چیز" کو پانے کی توقع تھی؟ یہ میں نہیں جانتا ———!

"اس قدر روشنی میں یہ پُر اسرار ہستی بھوت نہیں ہو سکتی!" پرکنس نے کہا۔ وہ اس بات پر اس لئے بار بار اصرار کر رہا تھا کہ اس کی ہمت برقرار رہے۔

ہم زینہ کی بالکل آخری پیڑی پر کھڑے تھے ——— اور ہمارے سامنے ہال میں سیلاب نور اُمڈا ہوا تھا ——— ہر بلب روشن تھا!!

ہمارے بائیں جانب کھانے کا کمرہ تھا جس کی دروازے کھلے ہوئے تھے ——— تمام کمرے پر سیاہ تاریکی مسلط تھی۔ ہم نے دیکھا کہ کمرے کے اندر پیتل کے برقی بٹن اندھیرے میں خوب چمک رہے ہیں، مگر ہماری آنکھوں کے سامنے ہی خود بخود دبیر کھٹ، کھٹ، کھٹ، کی آواز پیدا ہوئی۔ اور یکے بعد دیگرے تمام بٹن دبے اور آن واحد میں کمرے کے چپہ چپہ میں روشنی پھیل گئی۔

پھر اسی روشن کمرے میں، ہاں، اسی کمرے کی پُر سکوت روشنی میں ایک عجیب خوفناک قسم کے شیطانی قہقہے کی آواز گونجی ——— ایسا ہیبت ناک قہقہہ جس کی آواز سُن کر ہمارے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ آواز بتدریج قریب سے قریب ہوتی گئی، یہاں تک کہ جب ہم اسے اپنے سے اور بھی قریب محسوس کرنے لگے۔ تو مزید توقف کے بغیر ایک جست کے ساتھ ہم چبوترہ پر پہنچ گئے، اور اپنے کمرے میں گھس کر نہایت تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔

جب آرائش کرنے والے صبح کے وقت اپنے کام پر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ نچلی منزل کے تمام کمروں کے بلب روشن ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ ہماری بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ اور ہم نے بھی اُن کے اس خیال کی تردید کرنی مناسب نہ سمجھی۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ انہیں وحشت ہوتی۔

اب ہم اپنے اپنے کمرہ میں جا کر سو رہے ——— ہمیں نہایت گہری نیند آئی، ایسی گہری کہ اس سے پیشتر کبھی نہ آئی تھی۔

پھر رات ہوئی ——— ہم اچھی طرح کھا پی کر ہوٹل سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔

"اچھا، پرکنس! ذرا بتاتا نا تو، آج کے لئے تم نے کیا تدبیر سوچی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ جو راہ مناسب سمجھیں اختیار کریں، میں تیار ہوں"

اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "ہاں آج میں نے ایک خونخوار کتا منگوا لیا ہے اور اگر وہ پر اسرار ہستی "انسان ہوئی" تو میں کہے دیتا ہوں، اس کی خیر نہیں"۔

"مگر تمہارا یہ کتا ہے کس نسل کا؟" میں نے ہنسکر پوچھا۔

"یہ ایک مخلوط النسل اسکاچ ٹیریر ہے جو یارکشائر میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا۔"

"خوب" میں نے کہا "مگر فرض کرو، اگر یہ بھوت نکلا تو ——؟"

"میں نے تو کہیں نہیں سنا کہ بھوت کبھی اس طرح روشنی میں نمودار ہوتے ہیں" پرکنس نے کہا "میرا تو یہی خیال ہے کہ کسی نہ کسی انسان ہی نے بجلی کے ان بٹنوں کو دبایا تھا۔ مگر آپ اور میں ناحق اس قدر خوفزدہ ہو گئے۔"

"مگر اُن قدموں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو بڑھتے بڑھتے بالکل زینہ کے پاس آ گئے تھے؟"

"ہاں مگر قدموں کی آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ ہرگز کسی بھوت کی ہو ہی نہیں سکتی" اس نے کہا "کیا آپ نے بچپن ہی میں اپنے والدین سے یہ نہیں سنا تھا کہ بھوتوں کے کوئی "ہیولیٰ" نہیں ہوتا —— یہ تو بالکل "غیر محسوس" ہوتے ہیں۔ اور صرف فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ مجھے تو پورا پورا یقین ہو کہ یہ بھوت نہیں "انسان" ہی ہے، اور کوئی پرلے درجے کا بدمعاش جو کسی نہ کسی سبب ہمیں اس گھر سے ہٹانا چاہتا ہے، میں چاہتا ہوں، اب پولیس انسپکٹر کو ان واقعات کی اطلاع دے دی جائے تاکہ یہ شہدا جلد سے جلد اس کے ہاتھوں گرفتار ہو سکے۔"

"تو گویا اسے پکڑنے کے لئے تم وہ مخلوط النسل اسکاچ ٹیریر لائے ہو" میں نے ہنسکر کہا "تمہاری ترکیب یہ ہے کہ آج کی رات جب وہ شہدا یہاں آئے تو تمہارا کتا اس کے پاؤں کو اپنے خونخوار جبڑوں میں تھام لے اور اس درمیان میں تم پولیس انسپکٹر کو اس کی گرفتاری کے لئے لے آؤ —— یہی ہے نا تمہاری ترکیب؟"

پرکنس نے اثبات میں سر ہلایا —— وہ اپنی تدبیر پر بیحد مسرور تھا۔ مگر مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ مجھے اس کی رائے کے صائب ہونے پر یقین نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے باغ کے پھاٹک کو بند کر کے خالی مکان کے تاریک دریچوں پر نظر ڈالی، تو میں نے ایک نامعلوم خوف سا محسوس کیا۔

جب ہم مکان کے اندر داخل ہوئے تو کتا فرط مسرت سے ہمارے پاؤں پر لوٹنے لگا۔ وہ پانچ چھ گھنٹوں سے تنہا تھا، اور مقید —— اسی وجہ سے اس وقت یہ ہمیں دیکھ کر بہت مسرور ہو رہا تھا۔

پہلے تو ہم نے کھانے کی وہ چیزیں کتے کے سامنے بڑھا دیں جو ہم اس کے لئے لائے تھے اور جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکا، تو ہم اسے ساتھ لیا۔ یہ دیکھنے کے لئے نچلی منزل میں گئے کہ دروازے اور دریچے اچھی طرح بند ہیں یا نہیں!

ہمارے شیر دل کتے کو جیسے کسی چیز سے خوف محسوس ہوتا ہی نہ تھا۔ ہر ہر کمرہ میں وہ ناک سکیڑ کر خوب زور زور سے بھونکتا۔ اس کی ناک میں یقیناً بلیوں اور چوہوں کی مہک پہنچی مگر وہ اس قدر تیز اور چالاک تھا کہ ان کا تعاقب نہ کیا۔

لیکن ایک جگہ ہمارے شیر دل کتے نے ایسی شکست کھائی کہ پرکنس کو بھی متعجب ہونا پڑا —— پہلے ہم صحن میں یہ دیکھنے چلے گئے کہ باغیچہ میں داخل ہونے کا عقبی دروازہ اچھی طرح بند ہے یا نہیں۔ اس کے بعد گزرگاہ میں واپس آ کر ہم نے اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ اور ہر ہر گوشے دریچے کا اچھی طرح جائزہ لیکر ہم اب اس چھوٹے کمرے کی چوکھٹ کے پاس پہنچے، جس کو رنگ سازوں نے جوں کا توں چھوڑ دیا تھا اور چھوا تک نہ تھا۔

کتے کو پیچھے پیچھے آنے کی تاکید کرتے ہوئے پرکنس نے ایک دیا سلائی جلائی۔ مکان میں صرف یہی ایک ایسا کمرہ تھا جس میں بجلی کی روشنی کا انتظام نہ تھا۔ پرکنس نے کتے کو ایک مرتبہ پھر پکارا مگر وہ دہلیز کے پاس رک کر کھڑا ہو گیا —— اور اس سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ تھی کہ وہ سر تا پا کانپ رہا تھا۔ اور اس کے تمام بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے

دیا سلائی بجھ گئی —— چاند کی پھیکی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ کتے کی آنکھیں معمول سے بڑی ہو گئی ہیں، جیسے

ماتھے سے نکلی پڑتی تھیں۔

ہم دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے اور ہمارے پیچھے پیچھے کتا بھی آیا۔ وہ اب تک کانپ رہا تھا۔ میں نے آتشدان کے قریب ہی ایک تکیہ اس کی طرف پھینک دیا اور جب میں نے پیار سے اس کے سر کو تھپکی دی۔ تو وہ میرے ہاتھ کو چاٹنے لگا۔ جیسے وہ میرے احسان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

"اس کتے کے متعلق اب تمہارا کیا خیال ہے، پرکنس؟" میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ خاموش رہا' اور تھرماس سے ایک پیالی قہوہ انڈیل کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں اس خاموشی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ لہذا اس موضوع کے متعلق کچھ اور پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

تھوڑی دیر تک ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے —— سڑکوں کا شور و شغب اب بند ہو گیا تھا۔ دور گھڑیال سے ٹن ٹن کی آواز آئی۔ بارہ بج رہے تھے۔ گھر کے چپے چپے پر خاموشی مسلط تھی۔ کتا بھی ہمارے قدموں پر پڑا پڑا اب سو گیا تھا۔ اور میں بھی اب سوچ رہا تھا کہ جا کر سو رہوں، مگر عین اسی وقت پرکنس نے دفعتاً میرا شانہ تھام لیا۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" اس نے سرگوشیوں میں پوچھا "آپ نے سُنا؟"

مگر میں نے کچھ نہیں سنا تھا —— میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ کتا بھی نہ جانے کیوں اٹھ کر سیدھا بیٹھ گیا تھا۔ اور اس کے کان تن گئے تھے۔ شاید اسے وہ "خوف و دہشت" یاد آ گئی تھی، جس سے چند گھنٹے بیشتر وہ دوچار ہو چکا تھا ——

اس وقت میرے دماغ میں اب یہ خیال آ رہا تھا کہ شاید دل میں سب کے دلیوں ہی تھا۔ مگر زیریں منزل سے کسی کے قدموں کی خوفناک آواز آئی۔

میں نے اچھی طرح سُنا کہ "قدم" پہلے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھے پھر ہال کی جانب —— زینہ کے پاس آ کر "قدم" چند لمحوں کے لئے رک گئے، پھر اوپر کی سمت بڑھنے لگے۔

میں اور پرکنس نے فوراً لوہے کے آتش کاوے اٹھائے ہمارے درمیان کھڑا تھا، اور اپنی ناک سکیڑے، سر بڑھائے تھا۔

یکایک دروازہ پر کسی نے زور سے ٹھوکر ماری، مگر خدا کا شکر ہے، اس مرتبہ یہ ٹھوکر انسانی آواز کے ساتھ ساتھ تھی، نہایت کریہہ اور بھدی آواز —— "اس گھر میں یہ کیا ہنگامہ ہو رہا ہے؟"

کتا دروازے کے پاس جا کر غضب ناک انداز میں بھونک رہا تھا۔ بظاہر اسے کسی ایسی ہستی کا مطلق خوف نہ تھا جو اتنی صاف انگریزی بول سکتا ہو۔ پرکنس نے کتے کا "پٹا" پکڑ لیا۔ باہر سے کسی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے زور سے دھکا دیا، جس سے دروازہ پتے کی طرح لرزنے لگا، پھر چٹخنی ٹوٹ کر گر گئی اور کواڑ کھل گئے —— ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لندن بابی کھڑا تھا۔

اس وقت یہ شخص مجھے خاص طور پر بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی دیوتا آتا۔ جب بھی میں اس کا خیر مقدم اس سے زیادہ گرمجوشی سے نہ کرتا۔ لیکن بابی کا مزاج اس وقت سخت برہم ہو رہا تھا۔

"اس گھر میں آخر کیا ہو رہا ہے؟ —— میں جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے خشمگین لہجہ میں پوچھا۔

ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں —— اس نے پھر کہا ——

"ابھی پانچ ہی منٹ گزرے ہیں کہ تم لوگوں میں سے کسی نے عقبی دروازہ بند کر کے آگل چڑھا دیا۔ پہلے "چکر" میں ادھر سے گزرتے وقت میں نے دیکھا تھا کہ تم میں سے کسی نے چٹخنی کھینچ کر اس دروازے کو کھولا۔ اور جب میں صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ "گزرگاہ" کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور تمام بلب روشن ہیں —— اس وقت اس خالی گھر میں تم دونوں صرف ایک کتے کے ساتھ بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ —— آخر ماجرا کیا ہے؟ یہ میں جاننا چاہتا ہوں؟"

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اس وقت رات کے اس پہر میں اس خشمگیں پولیس کے آدمی کے سامنے "روحانی کرشموں" کا ذکر کرنا فضول ہے۔ اس لئے میں نے نہایت عاجزی سے کہا کہ ——

"میں یا میرے دوست نے ہرگز غفلت یا بے پروائی سے عقبی دروازہ کھلا نہیں چھوڑا۔ یہاں آنے سے پیشتر ہم نے نہایت احتیاط سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی

تھی۔ اب یہ کس طرح کھل گیا۔ یہ بات خود ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"خیر ہمیں اسی وقت گھر کے چپّہ چپّہ کا جائزہ لینا ہوگا۔" اس نے کہا: "ضرور اس مکان کے کسی نہ کسی گوشہ میں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ تم ہمارے ساتھ چلو اور کتے کو بھی ہمراہ لے لو۔"

ہم نے چھت سے تہ خانوں تک کو بغور دیکھا۔ پولیس والے نے اپنی تیز نگاہ ہر ہر چیز پر ڈالی۔ کتا تمام ہمارے ساتھ گیا، لیکن اس چھوٹے کمرے میں جس میں وہ اس سے پیشتر خوفزدہ ہو چکا تھا، اسے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے اس کے اندر قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔ کئی مرتبہ ہم نے اسے اندر جانے کی ترغیب بھی دی، مگر وہ دہلیز پر لیٹ جاتا اور اس کا سارا جسم کانپنے لگتا۔

"بابی" نے چند باتیں اپنی نوٹ بک میں درج کرلیں۔ کیونکہ تھانہ میں اسے اس واقعہ کے متعلق رپورٹ کرنی ضروری تھی۔ جب وہ جانے لگا تو ہم سڑک تک اسے پہنچانے گئے۔ پھر واپس آکر چٹخنی چڑھا دی اور اپنے کمرے میں داخل ہوگئے۔ اس رات پھر کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ جب صبح ہوگئی تو پرکنس کتے کے ساتھ باہر چلا گیا اور میں بستر پر دراز ہو کر سو رہا۔

اب نہ جانے یہ بابی' کے معائنہ کا نتیجہ تھا یا کتے کی موجودگی کا، مگر اس رات کے بعد کئی ہفتوں تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا اور ہم نہایت آرام و اطمینان سے رہے۔

ایک شام مشہور ڈراما نگار ہنری ہیملٹن مجھ سے ملنے کے لئے یہاں تشریف لائے۔

"مجھے تمہاری قسمت پر سچ مچ رشک آتا ہے کیرو!" انھوں نے کہا "لندن کے بیچوں بیچ تمہیں اس قدر آرام دہ مکان مل گیا۔ لیکن بتاؤ تو سہی جب سے تم یہاں آئے ہو، تمہیں کوئی غیر معمولی واقعہ تو پیش نہیں آیا۔"

"کس قسم کا واقعہ؟" میں نے استفسار کیا۔

"بات یہ ہے" انھوں نے کہا "کہ چند سال پیشتر میرے کئی احباب یہاں آکر رہے تھے۔ اور انھوں نے عجیب پُر اسرار آوازیں سنی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد خوفزدہ ہو کر انھوں نے مکان چھوڑ دیا۔ میں ایک "روحانی پیغام" لکھ کر لفافہ میں بند کر کے یہاں چھوڑے جاتا ہوں۔ یہ پیغام اسی کمرے میں دستکوں کے ذریعہ سے مجھے پہنچایا گیا ہے۔ تم اسے میز کی دراز میں بند کر دینا اور اس وقت تک نہ کھولنا جب تک کہ پھر کوئی پیغام دستکوں کے ذریعہ نہ پہنچے۔ ہاں! جب ایسا ہو تو دونوں کو ملا کر دیکھنا اور مجھے اس کی اطلاع دینا کہ دونوں ایک سے ہیں یا نہیں؟"

میں نے وعدہ کیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ مگر جب چند ہفتے گزر گئے اور اس عرصہ میں دستک یا کسی اور دوسری قسم کی آواز سنائی نہ دی تو میں اس لفافہ کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ یہاں تک کہ ایک رات حیرت انگیز طور پر میری توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔

جب مجھے اس گھر میں اقامت اختیار کئے تقریباً دو ماہ گزر گئے تو ایک رات میں نے اپنے چند احباب کو کھانے پر مدعو کیا۔ جب کھانے سے سب لوگوں کو فراغت ہوگئی تو ہم سب کے سب آتشدان کے گرد بیٹھ کر قہوہ اور سگریٹ پینے لگے مگر عین اسی وقت نہ جانے کیوں کر اس بلوریں پیالے سے کھٹ کھٹ کی آواز نکلنے لگی، جسے میں نے چھوٹے سے خانہ گرجا کے آخری کنارے پر بُدھ کے بُت کے سامنے پھول بھر کر رکھ چھوڑا تھا۔

آواز سن کر میرے ایک دوست نے بطور مشورہ کہا کہ ہمیں ایک میز کے گرد بیٹھ کر بھوت سے اپنے نام کے ہجے کرنے کی درخواست کرنی چاہیے۔

میں نے ایک سادہ کاغذ اور ایک پنسل ہاتھ میں لی اور جس گوشہ سے آواز آئی تھی۔ اس طرف جا کر میں نے پُر زور آواز میں کہا ——

"میں الف سے یے تک تمام حروف پڑھتا ہوں۔ از راہ کرم آپ جس حرف پر ٹھہرنا چاہیں دستک دے دیں، مثلاً اگر نام کا پہلا حرف "ب" ہو تو دوسرے حرف پر دستک دے دیں۔ آخر میں میں تمام الفاظ پڑھ کر سناؤں گا۔ اگر یہ بالکل درست ہوں تو تین بار کھٹ کھٹ کر دیجئے، اور اگر غلط ہوں تو صرف ایک بار!"

وہ پیغام جو اس طرح نہایت صاف اور واضح طور پر پہنچایا گیا تھا ——

"میرا نام کارل کلنٹ ہے۔ تقریباً ایک سو بیس سال گزرے میں یہاں رہتا تھا۔ اگر تم زیریں منزل کے خالی کمرے

میں گئے تو تمہیں اور باتیں معلوم ہوں گی۔"

اپنی اپنی کرسی لیکر ہم زیریں منزل کے خالی کمرے میں چلے گئے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس کی دہلیز کے اُس پار جانے سے پرنس کے کتے نے انکار کر دیا تھا اور اس پر رعشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

چونکہ اس کمرے میں بجلی کی روشنی کا انتظام نہ تھا۔ اس لئے ہم نے ایک موم بتی روشن کر کے مینٹل پیس پر رکھ دی اور ایک چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھ گئے جسے ہم اپنے ہمراہ اس کمرے میں لے گئے تھے۔

ہم اپنی اپنی جگہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز شروع ہو گئی۔ مگر اس مرتبہ آواز پہلے سے بھی زیادہ شدید تھی اور اس دیوار کے وسط سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس کے سامنے موم بتی جل رہی تھی۔

اس مرتبہ جو پیغام پہنچا، وہ یہ تھا ———

"میں ہوں کارل کلنٹ ——— ایک زمانہ میں میں اس گھر کا مالک تھا۔ اسی کمرے میں میں نے لینڈل کو قتل کیا اور یہیں زمین میں دفن کر دیا۔"

"لینڈل کون؟" میں نے پوچھا۔

"آرتھر لینڈل"

"کیا میں اس سلسلہ میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

"نہیں! تمہارے امکان میں کچھ بھی نہیں۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے لئے دعا کی جائے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" ——— نہایت زوردار آواز آئی۔

"کیا ہم کسی طرح آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟"

"ہاں، میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے میرے مکان میں تنہا چھوڑ دو ——— تم لوگ یہاں سے دور کیوں نہیں رہتے؟"

اس کے بعد فوراً ہی دروازے کو زور سے دھکا لگا۔ اور اسی وقت موم بتی خود بخود بجھ گئی۔ تاریکی میں ہم بصد دقت گرتے پڑتے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔

میں نے لوہے کی تجوری میں سے سربمہر لفافہ نکالا اور کھول لیا۔ اس میں حرف بحرف وہی کچھ درج تھا جو ہم نے اس وقت سُنا تھا۔

دوسرے دن میں نے سرکاری محافظ خانہ جا کر اس مکان سے متعلق تمام ضروری کاغذات دیکھے۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان اس گھر کا قدیمی حصہ ایک قسم کی مزروعہ اراضی تھی جس کا مالک کارل کلنٹ نامی ایک جرمن تھا۔ آرتھر لینڈل آخری مرتبہ اس شخص کے ساتھ تھا مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی روپوشی میں اس کا ہاتھ بھی کارفرما ہے۔ چند سال بعد کارل کلنٹ کے تمام نشانات اس صفحۂ ہستی سے محو ہو گئے۔ مزروعہ زمین میں سڑکیں بن گئیں اور اس کے بعد بھی اس جگہ نے کئی مرتبہ کتنے چولے بدلے مگر کاغذات سے اس سے زیادہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

چند ہفتے نہایت اطمینان سے گزرے اور گھر میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایسا بھی آیا جب میں نے اس "خالی کمرے" کا مصرف لینے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کمرے میں بجلی کے تار جڑوا دیئے۔ مگر اسی رات میری خوابگاہ کے دروازے پر نہایت پُرزور دستکیں ہوئیں اور کئی مرتبہ اٹھ اٹھ کر مجھے بیٹھ جانا پڑا۔ گھر کے بعض ملازمین نے بھی یہ آوازیں سنیں اور فوراً مجھے اس کی اطلاع دی۔

دوسرے دن میں نے اپنے احباب کو ٹیلیفون کیا اور رات کے نو بجے اپنے یہاں حاضر ہونے کی درخواست کی۔ میں اپنے دل میں یہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ جس طرح بھی ہو اس راز کو حل کر کے رہوں گا۔ کیونکہ موجودہ حالات میں اس پُراسرار مکان کے اندر زندگی گزارنا مشکل ہی نہیں، بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔

مشہور گورچشم معمول (MEDIUM)[1] نبیل ہسک سے میں بخوبی متعارف تھا۔ اور اس کی کئی ایسی مجلسوں[2] میں شریک ہو چکا تھا جن میں رُوحوں کو ان کی اصلی شکل میں بلایا گیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ آج رات اس شخص کو بھی اپنے یہاں بلاؤں گا، تاکہ ممکن ہے دستکوں کی مدد سے پیغام دینے کے علاوہ اس کی وساطت سے کوئی اور بات بھی معلوم ہو۔ میں پہلے کئی مرتبہ ایسی مجلسوں میں شریک ہو چکا تھا جن میں یہ شخص معمول تھا اور شکلیں اُبھر آتی تھیں، اور ایسی رُوحیں مجھ سے ہمکلام ہوتی تھیں۔

---

[1] یہ شخص رُوحوں کو بلانے پر قدرت رکھتا ہے انگریزی میں اسے میڈیم کہتے ہیں۔
[2] اس مجلس میں رُوحوں کو بلایا جاتا ہے۔

جن سے میں واقف تھا۔

میں نے سوچا شاید اس ذریعہ سے اس "رُوح" کو جو اس مکان میں موجود ہے، یہ بتانے کا موقع مل جائے کہ وہ مجھ سے چاہتی کیا ہے۔

میں اس جگہ یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس عجیب و غریب[1] زندگی کی وجہ سے جو میں اتنے دنوں سے بسر کر رہا ہوں اور ان سیکڑوں اعترافات کے باعث جو مختلف مردوں اور عورتوں نے میرے سامنے کئے، میں کبھی بیجا مخالفت یا طرفداری کی تعصب میں مبتلا نہیں ہوتا، اور میں کبھی کسی ایسے شخص پر بھی ملامت آمیز نظریں نہیں ڈالتا جس نے سیکڑوں سنگین جرموں سے اپنے ہاتھ رنگے ہوں —

میرے لئے گنہگار اور پاکباز دونوں یکساں ہو گئے ہیں۔ دونوں میں بدی بھی ہے اور نیکی بھی۔ ممکن ہے اچھے مواقع ملنے پر گنہگار بھی پاکباز بن جاتا اور ہو سکتا ہے کہ پاکباز بھی گناہ کی راہ پر گامزن ہو جاتا، اگر اس کے سامنے بھی ترغیب و تحریص کی وہی ساری چیزیں ہوتیں —

اسی وجہ سے میں قاتل کارل کلنٹ کی رُوح کی مدد بھی اسی مسرت سے کرنا چاہتا تھا، جتنی خوشی سے کہ میں کسی مرحوم پادری کی رُوح کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتا —!

آخر رات کے نو بجے — میرے احباب نہایت پابندی سے ٹھیک وقت پر پہنچ گئے اور اسی وقت میں نے دیکھا کہ "معمول" بھی باغ کی روش سے ہوتا ہوا اندر آ رہا ہے۔ میں اس کے خیر مقدم کو آگے بڑھا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کے کمرے میں لے گیا، جہاں گول میز کے گرد کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔

"معمول" کو میں نے جماعت کے بیچ میں بٹھایا، کمرے کی تمام روشنیاں بجھا دیں، صرف ایک چھوٹے سے لیمپ کو روشن چھوڑ دیا۔ جس پر سرخ شیشہ پڑا ہوا تھا اور کمرے کے دوسرے کونے میں جل رہا تھا۔

میں "معمول" کے سامنے آ کر اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ [illegible] ظہور شروع ہو گیا اور کوئی پُراسرار ہستی اپنی انگلیوں سے شیشے کے جھاڑ اور دیوار سے ملحق آئینہ پر کھٹ کھٹ کرنے لگی۔ قدموں کی آواز بھی صاف طور پر سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی "چھوٹے کمرے" سے یہ آواز آ رہی ہے۔ قدم دروازے کے پاس آ کر رُک گئے اور کمرے کے اندر پھیکی قسم کا ابر سا بننے لگا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے میں اس جگہ پہنچ گئی جہاں میں بیٹھا تھا۔ پھر اس میں سے رفتہ رفتہ سر اور شانے اُبھرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ اور ایک سیکنڈ بعد میں اپنے سامنے کارل کلنٹ کو کھڑا دیکھ رہا تھا۔

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ کارل کلنٹ ہے۔ اس کی آنکھیں غم زدہ تھیں اور چہرہ آسیب زدہ اور افسردہ!! یہ کیفیات اس کی دلی پریشانی کی ترجمانی کر رہی تھیں، اور اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ قاتل تھا، مگر میرے دل کے گوشہ گوشہ میں اس کے لئے ترس اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔

ہر شخص اس شکل کو دیکھ رہا تھا۔ جو میرے سامنے اس وقت موجود تھی۔ یہ بلاشبہ ایک جرمن قسم کا سر تھا اور جیسے ماہیئت زیادہ صاف ہونے لگی تو اس کی منڈی ہوئی ڈاڑھی اور بالوں کا سُرخ رنگ بھی نظر آنے لگا۔

بظاہر چہرہ ایک ایسے آدمی کا معلوم ہوتا تھا جس کی عمر پینتالیس سے پچاس سال کے درمیان ہے۔ وہ کاشتکار معلوم ہوتا تھا، مگر اس کی شکل سے ذہانت مترشح ہوتی تھی۔

شاید اس وجہ سے کہ میری آنکھوں میں ہمدردی کے انداز تھے، اس کا چہرہ چند لمحوں میں اور بھی زیادہ صاف ہو گیا۔ ہم اچھی طرح دیکھ رہے تھے کہ اس کے لب کچھ بولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ وہ کھلے مگر آواز نہ نکل سکی۔ آخر چند لمحوں کے بعد آواز نکلی — کس طرح؟ اس کی تشریح و توضیح میرے بس سے باہر ہے۔ پہلے یہ صرف سرگوشیوں جیسی تھی — ہم نے ہمہ تن گوش بن کر اس کی آواز کو سننے کی کوشش کی۔ پہلے چند ملتے جلتے الفاظ نکلے، پھر کچھ اور زیادہ — یہاں تک کہ مندرجہ ذیل گفتگو کمرے میں بیٹھے ہوئے ہر شخص نے نہایت صاف اور واضح طور پر سنی:—

"یہ لوگ میرے گھر میں کیوں جمع ہیں؟"

---

[1] یہ سچی کہانی دنیا کے مشہور پامسٹ اور نجومی کیرو نے لکھی ہے جس کی زندگی میں اس قسم کے سیکڑوں حیرت انگیز واقعات پیش آ چکے ہیں۔

"یہ میرے احباب ہیں" میں نے جواب دیا "کیا آپ مجھے اپنے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"میں کارل کلنٹ ہوں" اس کے لبوں سے یہ الفاظ نکلے "بہت دن گزر رہے، شاید ایک سو بیس سال پہلے یہاں رہتا تھا۔ مگر اب وقت کی رفتار میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ——— تغیر و تبدل دنیا والوں میں ہوتا ہے ——— تم اس گھر میں کیوں آئے؟"

"چونکہ مجھے آپ کا گھر پسند تھا ——— شاید یہاں رہ کر میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں" میں نے جلدی ہی جواب دیا۔

"کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا!" نہایت مغموم لہجہ میں آواز آئی "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگ مجھے یہاں چین اور سکون سے رہنے دو"

"مگر آپ کو تو چین نصیب نہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو آپ اس طرح ہرگز راتوں کو ہمیں ڈرایا نہ کرتے"

"میں مجبور ہوں ——— بھاگ کر جا نہیں سکتا۔ جس رات سے میں مرا ہوں ہمیشہ ہر وقت اسی جگہ رہتا ہوں"

"آپ نے ہمیں کہا تھا کہ آپ نے لینڈل کو قتل کیا ہے۔ ایسے مہیب جرم کا ارتکاب آپ نے کیوں کیا؟"

"لینڈل میری محبوبہ پر بری نگاہ رکھتا تھا۔ مجھے چارلٹ سے محبت تھی، اتنی بے پایاں محبت کہ تم کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لینڈل ہمیشہ یہاں آتا تھا۔ اور اُسے اپنے روپوں کے سبز باغ دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک رات وہ اپنی حد سے تجاوز کر گیا۔ اور میں نے اسی وقت اسے موت کے گھاٹ اتار دیا، بالکل اسی طرح، جس طرح میں ایک پاگل کتے کو بیباکی کے ساتھ نشانۂ پستول بنا سکتا تھا ——— لوگ میرے اس فعل کو "قتل" سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن یاد رکھو، لینڈل اور میں اگر پھر زندہ ہو جائیں تو میں پھر نہایت بے رحمی سے اسے قتل کرنے میں پس و پیش نہ کروں ——— زیریں منزل کے "چھوٹے کمرے" کی زمین میں میں نے ایک گڑھا کھودا اور اسے چونا سے بھر کر لاش کو اسی کے اندر ڈال دیا اور اس کی ہڈیاں اب بھی اسی جگہ مدفون ہوں گی ——— بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتا"

"لیکن چارلٹ کا کیا حشر ہوا؟" میں نے استفسار کیا۔

"وہ چند سال بعد مر گئی ——— لاش کو چھپانے میں اس نے میری مدد ضرور کی۔ مگر راز کے طشت از بام ہو جانے اور میری گرفتاری کی فکر اسے برابر ستاتی رہی۔ یہاں تک کہ اس "پریشانی" نے اس کی جان لیکر چھوڑی۔ اس کی لاش اس قبرستان میں دفن ہے جو یہاں سے قریب ہی دائیں جانب واقع ہے"

"اور آپ کا انجام کیا ہوا؟"

"جب وہ مر گئی تو میں جرمنی واپس چلا گیا ——— چارلٹ کے مر جانے کے بعد مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی مسرت نصیب نہیں ہوئی، زندگی میرے لئے مستقل عذاب بن گئی اور میں نے آخر خودکشی کر لی"

"پھر ——— میں نہیں بتا سکتا کہ کس طرح، مگر ایک روز مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زیریں منزل والے چھوٹے کمرے میں میں جاگ پڑا ہوں، اور اس کے بعد سے اب تک میں یہیں ہوں"

"مگر کیا آپ کو یہ پسند نہیں کہ آپ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں؟"

"کیوں؟ میں کیوں جاؤں؟ یہی تو ایک ایسی جگہ ہے جسے میں زندگی میں اپنا گھر سمجھتا تھا۔ یہیں تو میں نے اس عورت کے ساتھ جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی حقیقی مسرت کے ساتھ خوشی کے لمحات گزارے ہیں زندگی میں بس یہی تو ایک مسرت تھی جس سے میں لطف اندوز ہوا، پھر میں کیوں یہاں سے جاؤں؟ میرے لئے دنیا میں کہیں اور جگہ نہیں ہے"

"لیکن چارلٹ؟" میں جلدی سے بول اٹھا۔

"چارلٹ یہیں میرے ساتھ ہے ہم باہم وہی خوشی کے سابقہ دن گزارتے رہتے ہیں ——— گزارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ لینڈل آ جاتا ہے، اور میں پھر اسے قتل کر دیتا ہوں"

"کیا کوئی ایسی خدمت ہے جو میں آپ کے لئے انجام دے سکوں؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں ایک کام تم کر سکتے" روح نے جواب دیا "اور وہ یہ کہ نچلی منزل والے "چھوٹے کمرے" کو جوں کا توں چھوڑ دو۔ دو کرسیاں اور ایک میز وہاں رکھوا دو اور شام کے بعد کسی کو بھی اس کے اندر نہ جانے دو ——— اگر تم نے ایسا کیا تو یقیناً تم اطمینان سے اپنے مصرف میں لا سکتے ہو اور میں تمہیں کبھی پریشان نہ کروں گا"

"میں نے اسی وقت اس سے پختہ وعدہ کر لیا کہ اپنی طرف سے

...یاتی معاہدہ" کا پورا پورا احترام کروں گا۔ اسی رات میں نے اس چھوٹے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیاں رکھوا دیں۔ پھر دروازہ میں باہر سے قفل لگا کر کنجی احتیاط سے لوہے کی تجوری میں بند کر دی اور اس کے بعد سے میں نے پھر کسی قسم کی کوئی آواز نہیں سنی۔

اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے۔ آخر وہ دن آ گیا جب میں اس مکان کو چھوڑ کر لندن کے دوسرے علاقہ میں زندگی گزارنے کے لئے جا رہا تھا۔

روانگی سے چند روز پہلے میں نے سوچا، مجھے پھر ایک مرتبہ مجلس "منعقد کر کے اس "روح" سے مل لینا چاہیے، اس روح نے اپنے معاہدہ کا احترام کیا اور کبھی پریشان نہ کیا۔

اس مرتبہ مجھے زیادہ دیر تک انتظار کی صعوبتیں نہیں برداشت کرنا پڑیں — کارل کلنٹ کی روح نمودار ہو گئی۔

"کارل!" میں نے کہا "میں دوسری جگہ جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا جانے سے پیشتر اس بات کے لئے آپ کا شکریہ ادا کر لوں کہ آپ نے اپنی بات کا پاس کیا — آخری مرتبہ میں یہ پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے قبل کہ دوسرے لوگ اس مکان میں آ کر رہیں۔ میں آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟"

میری توقع کے خلاف جواب نہایت صاف اور غیر مبہم انداز میں آیا —

"میں بھی تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ مرنے کے بعد صرف تم ہی ایک ایسے شخص ملے جس کے دل میں میرے لئے ہمدردی اور ترس تھا۔ میرے "چھوٹے کمرے" کے تختوں کے عقب میں تمہیں چارلٹ کی ایک تصویر ملے گی، جو میں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھی۔ جب وہ مر گئی تو میں نے تصویر اس جگہ رکھ دی تھی۔ اور اس وقت سے وہ اس جگہ چھپی رکھی ہے۔ اسے نکال کر اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اور اپنے نئے مکان میں کسی جگہ دیوار سے آویزاں کر دو — اور اس وقت کہ جب تم بھی اس سرزمین آب و گل سے نکل کر "سیالوں کی دنیا" میں آ جاؤ گے تو تم دیکھنا کہ کم سے کم دو وفا شعار اور مخلص دوست تمہارے خیر مقدم کو وہاں موجود رہیں گے۔"

میں نے دیکھا چارلٹ کی تصویر سچ مچ تختوں کے عقب میں موجود تھی۔ اب یہ تصویر میرے کمرے میں میز کے سامنے دیوار پر آویزاں

ایک رنگین شام

نظم

از جناب محمد عتیق الکریم صدیقی ساقی

روح پرور شام کا منظر نہایت جانفزا
غرب میں چھپتے ہوئے خورشید کی پیلی ردا

ہلکی ہلکی دھوپ تھی گویا مریضِ نیم جاں
زرد چہرہ ہو رہا تھا لے رہی تھی ہچکیاں

چل رہے تھے جھومتے جھونکے ہوا کے کیف بار
دے رہے تھے ہر کس و ناکس کو پیغامِ بہار

طائرانِ خوش گلو تھے ہر طرف نغمہ سرا
پتہ پتہ دے رہا تھا شادمانی کی صدا

چھا رہی تھی وجد کی سی کیفیت ہر چیز پر
آ رہی تھی جھومتی اُس شام کو ہر شے نظر

سیرِ گلشن کیلئے میں گھر سے اپنے چل پڑا
بیخودی میں جا رہا تھا جھومتا گاتا ہُوا

جونہی پہنچا باغ میں دیکھا روش پر ناز سے
چل رہی تھی اک حسینہ کچھ عجب انداز سے

ساری فیروزی تھی اسکی اور کناری نیلگوں
ہو رہی تھی جس پہ قرباں دولتِ صبر و سکوں

سانس جب لیتی تھی بڑھ جاتا تھا سینہ کا اُبھار
جس پہ بھونرے خود کو کر دیتے بصد ارماں نثار

ڈالتی تھی جب گلِ رعنا پہ اک ترچھی نظر
فرطِ خجلت سے معاً اپنا جھکا لیتا تھا سر

چھا رہا تھا عالمِ گلشن پہ کچھ ایسا سکوت
دے رہا تھا جو چمن کے مُردہ ہونے کا ثبوت

دل میں لی جذبات نے چٹکی تو دیکھا سامنے
جب ملیں مجھ سے نگاہیں تیر گویا چل گئے

فرطِ حیرت سے رہی تھی پھر نہ کچھ اپنی خبر
بیخودی سی چھا رہی تھی میری روحِ زار پر

ہوش میں آیا تو دیکھا وہ پری مستور تھی
میں سمجھتا ہوں کہ جنت کی وہ کوئی حور تھی

میرے حق میں صبحِ محشر بن گئی رنگین شام
زندگی بھی ہو گئی اُس روز سے گویا حرام

میر معصوم قندہاری

عہدِ اکبری کی ایک باکمال شخصیت

از جناب خانصاحب حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی

شہنشاہِ اکبر کا عہدِ حکومت تاریخ کے اوراق میں عہدِ زریں کے عنوان سے مزین نظر آتا ہے۔ اکبر کی نظرِ انتخاب نے بے مثل، باکمال افراد کو دُور دُور سے منتخب کر کے اپنے دربار کی زیب و زینت بنایا تھا۔

سلاطینِ اسلام میں خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے بعد جن فرمانرواؤں کو قابل ترین وزرا اور اعیانِ مملکت میسر آئے ان میں اکبر اعظم کا نام بھی قابلِ شمار ہے۔ گویا اکبر اعظم کے دورِ ہمایونی میں ہر فن کی کامل و اکمل ہستیاں موجود تھیں۔ انتظام و انصرام مملکت، تدبر، الغرض ملک گیری و حکمرانی کے جملہ لوازم اس دور میں جس درجہ مکمل نظر آتے ہیں وہ عہدِ مغلیہ کے کسی دور میں بھی نہیں پائے جاتے۔ ماہرینِ فنونِ لطیفہ خطاط، مصور، نقاش، سنگتراش اور باکمال معمار جو اپنی نظیر آپ تھے اور جن کے کمالات کے زندہ نمونے فتح پور سیکری (اکبرآباد) کی عمارات اور قلعۂ معلےٰ آگرہ آج تک موجود ہیں۔ ان باکمال ہستیوں کا فرداً فرداً تذکرہ ناظرینِ "عالمگیر" کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ چنانچہ میر معصوم قندہاری (بھکری) کا شمار بھی کملائے دربارِ اکبری میں ہوتا ہے۔ یہ اکبری دور کے مشہور خطاط تھے۔

میر معصوم قندہاری ترمذی سید تھے ان کے آباؤ اجداد قندہار میں بابا شیر قلندرؒ کے مزار کے متولی تھے۔ ان کے والد کا نام سید صفائی تھا جو بخارا میں رہ پڑے اور سلطان ... سے مراحم خسروانہ سے فائز ہوئے۔ میر معصوم کے استاد ... تھے۔ نظام الدین احمد مصنف طبقات ... نے خاص ... سنہ جلوس میں اکبر نے میر صاحب کو منصب یک ہزاری عطا کیا اور سنہ ... ھ میں شاہ عباس صفوی (شاہ ایران) کے ... سفیر بنا کر بھیجا۔

صاحب ریاض الشعرا نے لکھا ہے کہ اس سفارت سفرِ ایران میں ان کے ہمراہ ممتاز اور مشہور سنگتراش بھی تھے۔ ایران سے اصفہان اور تبریز تک بہت سی مشہور اور خاص عمارات کو اپنے قلمی کتبوں سے مزین کیا گویا میر معصوم نے ایران میں اپنی خطاطی کی پختہ یادگار قائم کی۔

فتح پور سیکری (متصل آگرہ) کی اکثر عمارات پر ان کے قلمی کتبے کندہ کئے گئے ہیں۔ آگرہ کے قلعہ معلیٰ اور قلعہ مانڈو میں بھی انہی کے لکھے ہوئے کتبے کندہ کئے گئے ہیں۔

شاہنشاہ اکبر ان سے بہت مانوس اور خوش تھے۔ انکی شاعری اور تاریخ دانی کے مداح تھے۔

میر صاحب نامی تخلص کرتے تھے۔ ان کی تصانیف میں ایک دیوان اور ایک مثنوی کے علاوہ معدن الافکار یا تاریخ سندھ، مفردات معصومی (طب) خمسہ اور مثنوی حسن و ناز (بجواب یوسف زلیخا) اور پری صورت (بجواب لیلےٰ مجنوں) ہیں۔ اور دو مثنویاں بجواب ہفت پیکر و سکندر نامہ بھی لکھی تھیں مگر ان کا تذکرہ خاص تاریخ میں موجود ہے۔

میر صاحب کی منکسر المزاجی اور فیاضی مشہور ہے۔ فن عمارت اور تاریخ سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔

۱۰۱۵ھ میں بادشاہ جہانگیر نے ان کو بھکر میں امین بنا کر بھیجا تھا ... ان کا انتقال ہو گیا۔

میر صاحب کے فرزند میر بزرگ عہد جہانگیری میں قندھار کے بخشی تھے اور ۱۰۴۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شیریں فرہاد

مشہور قصہ نئے رنگ میں!

از جناب قاضی امداد انصاری (علیگ)

دنیا میں شاید ہی کوئی دوسری کتاب ہو جس کے اتنے ترجمے ہو چکے ہوں جتنے قصہ "شیریں فرہاد" کے ہوئے ہیں۔ اور شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس نے کسی نہ کسی طریقے سے اس واقعہ کو نہ سنا ہو، تھیٹروں، سینماؤں، تماشوں، کتب، جنتوں اور دوسرے بہت سے طریقوں سے یہ افسانہ دنیا میں ہر جگہ پھیل چکا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس معاشقہ کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت سے واقف ہیں۔ میں نے اس مضمون کی ترتیب میں حتی الامکان جملہ ذرائع معلومات سے امداد لی ہے اور جتنے حوالجات حاصل کر سکا ہوں پیش کئے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی سے متعلقہ اشعار۔ مولانا نظامی کی مثنوی، مولانا عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں اور حشر کاشمیری کے ڈراموں سے میں نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے لیکن واقعات کچھ اس قسم کی الجھی ہوئی شکل میں ملتے ہیں کہ کسی قطعی فیصلے پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ بہر حال شروع میں جو اختلاف تھا ہے وہ ایک خاص نقطہ پر جا کر دور ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف قدیم و جدید تحقیقات کی بنا پر ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مولانا نظامی گنجوی کے بیان کردہ واقعات بہت حد تک مستند ہیں کیونکہ تمام عجمی نژاد مصنفوں نے اپنی قومی روایات کے مطابق تاریخ عجم کو فردوسی کے شاہنامے سے متعلق کیا ہے۔ دوسری تحقیق مصری ادیبہ زینب بنت علی خانم نے اپنی مشہور کتاب "الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور" میں پیش کی ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کی بنا قدیم عربی تصنیفات پر رکھی ہے۔ ایک انگریزی مصنف نے بھی اپنی کتاب Historical Romances یعنی "تاریخی رومان" میں مصری مصنفہ سے اتفاق کیا ہے۔ ذیل میں پہلے مصری ادیبہ کی تحقیق پیش جاتی ہے۔ اس کے بعد اصل واقعات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ (ا۔ و)

زینب بنت علی خانم لکھتی ہیں:۔

شیریں ایک شہزادی تھی۔ وہ ساسانی خاندان خسروی کی ایک یادگار اور نوشیروان عادل کے نسل سے تھی۔ نوشیرواں نے اسے پرورش کے لئے ایک معزز ایرانی رئیس کے سپرد کر دیا تھا۔ (یہ ظاہر نہیں کہ شیریں کن حالات میں آغوش مادر و پدر سے محروم ہوئی۔ وہ کون تھے۔ اور کیا ہوئے) اس زمانہ میں نوشیرواں کا لڑکا خسرو پرویز جو شیریں کا ہم عمر تھا اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بچپن میں ولیعہد اور مزدور کے درمیان قدرتی طور پر امتیاز نہیں کیا جاتا۔ ساتھ کھیلنے اور ہمہ وقت کی رفاقت نے ان معصوم دلوں میں محبت کا ایک ایسا لطیف جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے بے چین رہنے لگے۔ پرویز کو شیریں اتنی عزیز تھی کہ وہ اس کے پاس معمولی کپڑوں میں آتا اور اپنی شہنشاہانہ عظمت کی قطعاً پروانہ کرتا۔ اس نے شیریں کو اپنی بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی تحفہ کے طور پر دیدی۔ جب شیریں کے بے درد سرپرست نے اس کے ہاتھ میں جواہر نگار انگوٹھی دیکھی تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے شیریں سے پوچھا کہ "یہ انگوٹھی تمہیں کہاں سے ملی؟" معصوم شیریں نے صاف کہہ دیا کہ "مجھے شہزادہ پرویز نے نشانی کے طور پر دی ہے" اور اسی وقت سے اس کا مربی اور پرورش کرنے والا رئیس اسے اپنی اور اپنے خاندان کی سلامتی کے لئے خطرناک سنپولا تصور کرنے لگا۔ ایک دن چپکے سے اس نے اپنے نوکر کو ہدایات دیکر شیریں کو جنگل میں بھجوایا کہ اس نہیں کی گا نٹھ کو کسی جھیل میں ڈبو آئے۔ شیریں کو گھنے جنگل میں لیجا کر غلام ایک تالاب کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اور شیریں سے کہنے لگا کہ میں تمہیں غرق کرنے آیا ہوں شیریں نے بکمال معصومیت و بیکسی

ہونا شروع کر دیا - وہ بچپن ہی سے خداداد حسن صورت اور عقل کے زیور سے آراستہ تھی - اس نے بلک بلک کر غلام سے درخواست کی کہ وہ اپنی قسم کو اس طرح پورا کرلے کہ شیریں کو گھٹنے گھٹنے پانی میں چھوڑ کر چلا جائے - ایک غریب اور یتیم بچی کی معصوم جان لیکر اسے بجز عذاب کے کیا ملے گا - شیریں نے کچھ ایسی گریہ وزاری کے ساتھ حسرت انگیز پیرایہ میں غلام کی خوشامد کی کہ وہ ازراہ رحم وجان بخشی اسے ایک پایاب تالاب میں چھوڑ کر چلا گیا - تھوڑی دیر تک پانی میں پڑے رہنے کے بعد شیریں وہاں سے نکلی اور قریب کے گاؤں میں جاکر ایک گرجے میں گھس گئی - ایسی خوبصورت بچی کو پناہ اور رحم کی درخواست کرتے دیکھ کر خانقاہ کے راہبوں اور راہبات کا دل بھر آیا اور راہبوں نے شیریں کو گرجا ہی میں جگہ دیدی - اب شیریں عیسائیت کی آغوش میں پلنے لگی - اس نے وہیں بچپن سے شباب کی منزل میں قدم رکھا - اور راہبہ عورتوں کی صحبت میں وہ ایک راہبہ بن گئی - اس رہبانیت اور ریاضت وعبادت کے باوجود شیریں کی انگلیوں میں ایک سنہری انگوٹھی ہمیشہ دکھائی دیتی تھی - یہ خسرو کی سچی محبت کی نشانی تھی - جسے شیریں ساری دنیا کی چیزوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھی -

اسی زمانے میں قیصر روم کا ایک سفیر بڑے کروفر سے ساسانی دربار میں آیا - ادھر شیریں اپنی ریاضت وعبادت میں مشغول تھی اور اُدھر اس کا حاصل ریاضت پرویز ساسانی تاج وتخت کو اپنی حوصلہ مندیوں اور بھرپور شباب کے ساتھ رونق دے رہا تھا - اتفاق سے قیصر کے سفیر کا خیمہ اس خانقاہ کے قریب نصب کیا گیا جس میں شیریں رہتی تھی، جب شیریں کو معلوم ہوا کہ یہ سفیر خسرو کے دربار میں جائے گا تو وہ ہم مذہب ہونے کی حیثیت میں اسے ملنے گئی اور اس سے کہا کہ "اے معزز سفیر! کیا آپ میرا بھی تھوڑا سا کام کریں گے ؟" اور اس کی طرف سے اثبات میں جواب سن کر اس نے اپنی انگوٹھی اسے دی اور کہا کہ "بادشاہ عجم کے دربار میں پیش کرنا - وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہونگے اور تمہاری قدر کریں گے - سفیر نے وعدہ کیا اور چلا گیا - دربار عجم میں پہنچنے کے بعد ایک دن موقع پاکر سفیر نے خلوت میں خسرو پرویز کو شیریں کی انگوٹھی پیش کر دی - اس نے پہلے تو سرسری طور سے دیکھ کر رکھ لی - لیکن بعد میں غور سے دیکھنے پر اسے ایکدم یاد آگیا اور گذشتہ محبت کی شیریں یاد نے خسرو کے دل کو تڑپا دیا - بچپن کی یاد سے آنکھوں میں آنسو آگئے - اس نے درباری سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر بڑے اضطراب اور تیزی میں سفیر سے پوچھا "آہ یہ انگوٹھی تمہیں کہاں سے ملی؟" سفیر نے سارا واقعہ من وعن بیان کر دیا - پرویز بے تابانہ پرواز کرنے لگا - اس نے فوراً چند معتبر آدمیوں کو بھیج کر سفیر کے بتائے ہوئے پتہ پر خانقاہ سے شیریں کو بلایا اور بڑے تزک واحتشام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ اپنے محل میں داخل کر لیا -

شیریں اب وہ شیریں نہ تھی جو خانقاہ کی محدود فضا میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک راہبہ بن کر رہتی تھی - بلکہ وہ شاہی ٹھاٹ سے رہنے والی ایک نازک اندام حسینہ بن چکی تھی جس کی ہر ہر ادا خسرو کے دل میں نشتر بن کر اترتی تھی - چند ہی دنوں میں خسرو اس کا بے دام غلام بن گیا - اور اس کے نظر فریب حسن کا اس قدر والہ وشیدا ہوا کہ دنیا ومافیہا کی کچھ خبر نہ رہی بلکہ سلطنت کے کاروبار سے بھی دست بردار ہو گیا - اور حکومت کی باگ خود شیریں کے ہاتھ میں دے کر شیریں اور اس کی محبت کے سوا ساری دنیا سے بے نیاز ہو گیا -

شیریں اب سیاہ وسفید کی مالک تھی اور جو چاہتی کرتی تھی - چند روز بعد شیریں نے مدائن سے کچھ فاصلے پر کریان شاہان کے قریب پر فضا وادی میں ایک عالیشان محل بنوایا جس کے کھنڈر آج بھی ملتے ہیں اور "قصر شیریں" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں -

یہاں تک واقعات مختلف ہیں چنانچہ شیریں کی ابتدائی زندگی کے متعلق مولانا نظامی نے لکھا ہے کہ وہ ارمن اور گرجستان کی شہزادی تھی - جہاں کے حسن وجمال کی ساری دنیا میں شہرت ہے - اس زمانہ میں گرجستان کی فرمانروا ایک خاتون تھی جس کا نام مہین بانو تھا - اور شیریں اس کی حقیقی بھانجی تھی - اور بچپن ہی سے تخت گرجستان کی ولیعہد مقرر کی گئی تھی - شیریں کو دنیا ومافیہا کی کوئی خبر نہ تھی - اس نے اپنا عہد طفولیت انتہائی ناز ونعم میں گزارا تھا - اور عیش وعشرت کے سوا اسے کسی چیز کا احساس نہ تھا - روز صبح اٹھ کر وہ اپنی مہ جبیں ہمجولیوں کے ساتھ باغوں اور محلوں میں کھیلنے لگتی اور سارا دن اسی طرح لہو ولعب میں گزار دیتی تھی - جھولا جھولنا، کھیل کود اور سیر وتفریح کے علاوہ دنیا کی کسی فکر سے اُسے دور کا واسطہ بھی نہ تھا - ارمنی باغوں کے پاس سے جب کوئی مسافر گذرتا تو ان دوشیزاؤں کے رقص وسرود کے جلسوں اور چھیڑ چھاڑ کو دیکھ کر اسے شبہ ہوتا کہ کیا سماوی حوریں زمین پر اتر آئی ہیں - اسی طرح دنیا کے ہر حصے میں لوگوں نے اس کے حسن وجمال کی شہرت پھیلا دی - سفیر جاتے اور اپنے بادشاہوں کے سامنے ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے - آخر آہستہ آہستہ یہ خبر خسرو پرویز کے کانوں تک بھی پہنچی -

جو اس زمانے کے تمام فرمانرواؤں میں سب سے زیادہ جواں سال جواں بخت اور مردانہ حسن کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ شیریں کی تعریفیں سُن سُن کر وہ بیتاب ہوگیا اور اپنے حسین خواب کی تعبیر ڈھونڈنے کے لیے بڑا بے چین ہوا۔ آخر اس نے اپنے ایک مصاحب شاپور نامی کو گرجستان جانے اور کسی نہ کسی طرح شیریں جیسی پری جمال و ماہ طلعت کو کوہ قاف سے شہر مدائن میں لانے پر مجبور کیا۔ شاپور ایک عقلمند حکیم اور چابکدست مصور تھا۔ اس نے خسرو کی کئی خوبصورت تصویریں بنائیں اور گرجستان روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچکر اس نے ایک تصویر اس وادی میں ایک درخت سے لٹکا دی جس میں شیریں اپنی سہیلیوں سمیت کھیلنے آتی تھی۔ شیریں کی سہیلیوں نے جب پرویز کی تصویر دیکھی تو انگشت بدنداں رہ گئیں۔ وہ دوڑ کر شیریں کو بُلا لائیں۔ اُس کا بھی یہی حال ہوا۔ بے اختیار ہوکر تصویر میں کھو گئی۔ اس کے دل میں بے پناہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ تصویر کسی زندہ ہستی کی ہو۔ شباب کی رعنائیاں اس کی ذات کو جنس مخالف سے وابستہ کرنے پر اکسا رہی تھیں۔ جب سہیلیوں نے یہ حال دیکھا تو شیریں کو گھر لے گئیں اور دوسرے دن اس وادی میں نہ گئیں۔ بلکہ کسی دوسری وادی میں چلی گئیں۔ شاپور نے وہاں بھی پہلے سے ایک تصویر لٹکا دی۔ پھر اسی تصویر کو دیکھ کر شیریں اور اس کی سہیلیوں کی حیرت اور بڑھی۔ تیسرے دن جب انھوں نے وہاں بھی پرویز کا حسین مرقع دیکھا تو وہ خود مجسم تصویر اور پیکر حسرت بن کر رہ گئیں اور انھوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ اس راز کا پتہ لگانا چاہیے۔ چنانچہ ہر وادی کے رستہ پر ایک ایک سہیلی کھڑی ہوگئی تاکہ جو شخص بھی اس طرف آئے اس سے حال دریافت کیا جائے۔ اب شاپور نے موقع مناسب خیال کیا اور نہایت بے پروائی اور استغنا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ لڑکیوں نے جلدی سے آگھیرا اور تصویر کے متعلق استفسار کیا۔ شاپور نے بڑی خود اعتمادی سے کہا۔ یہی بات یہ ہے کہ یہ معمولی راز نہیں، اول تو میں تم کو بتا نہیں سکتا کہ تم محض ناتجربہ کار بچیاں ہو اور تم سے اس کا تعلق بھی نہیں اور اگر بتاؤں بھی تو کسی ذمہ دار شخص کو بتانا چاہیے۔ شیریں کی سہیلیاں بھاگی ہوئی گئیں اور سب حال اُسے سنایا۔ وہ خود اس قدر مشتاق تھی کہ فوراً بھاگی چلی آئی اور شاپور سے پوچھنے لگی۔ شاپور نے بڑے ادب سے کہا کہ وہ اس راز کو شیریں کی سہیلیوں کے سامنے نہیں بتا سکتا چنانچہ تنہائی میں اُس نے کہا کہ یہ تصویر دولت ساسانی کے نوجوان ولیعہد خسرو پرویز کی ہے۔ وہ مملکت عجم کا ہمہ صفت بہادر فرمانروا ہے۔ شیریں نے اس قدر بیتابی سے نام اور پتہ دریافت کیا کہ شاپور نے اور بھی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ اور جب شیریں نے یہاں تک کہدیا کہ وہ خسرو کو اپنا دل اور جان سب کچھ سونپ چکی ہے اور اس کے فراق میں روتی ہے تو شاپور نے نہایت تدبر سے یہ واضح کردیا کہ وہ خود خسرو کا بھیجا ہوا سفیر ہے۔ اور خسرو بھی اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔

جب شیریں نے یہ سُنا تو وہ سب کچھ بھول گئی اور خسرو کے عشق پر اپنے ہر عیش و آرام کو قربان کرنے پر راضی ہوگئی۔ مگر اس کے دماغ میں کوئی ترکیب نہ آتی تھی۔ آخر اس نے شاپور ہی سے پوچھا کہ کیا کرے شاپور نے نہایت ہی اطمینان سے شیریں کو سمجھایا کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرے۔ مہین بانو کے پاس ایک مشہور اور تیز گام گھوڑا تھا۔ جس کا نام شبدیز تھا اور جو رفتار کے لحاظ سے براق کی ہمسری کرتا تھا۔ شاپور نے شیریں سے کہا کہ وہ شبدیز پر سوار ہوکر شکار کے بہانے سے نکلے اور ایڑ لگا کر سیدھی شہر مدائن پہنچے خسرو اس کی شکل دیکھتے ہی اپنی قسمت پر ناز کرے گا اور بڑے تزک و احتشام سے اپنی ملکہ بنا کر رکھے گا۔ شیریں نے شاپور کی رائے سے اتفاق کیا اور ایک روز موقع پاکر شبدیز پر سوار ہوکر سیدھا مدائن کا رُخ کیا۔

جب شاپور مدائن سے گرجستان گیا تو حالات بالکل معمولی تھے۔ لیکن اس کی روانگی کے بعد شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک عجمی سپہ سالار بہرام چوبینہ کو ہوس ملک رانی نے آگھیرا اور اس نے خسرو کو اپنے رستہ سے ہٹانے کے لئے ملک میں خسرو کے نام کا سکہ چلا کر اسے باپ کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی اور مشہور کردیا کہ خسرو خود بادشاہ بننا چاہتا ہے اور چپکے چپکے اپنا سکہ چلا کر سازش کررہا ہے۔ پرویز کے بوڑھے باپ ناعاقبت اندیش شہریار عجم ہرمز نے اس افواہ پر یقین کرلیا اور فوراً خسرو کی گرفتاری کے احکام صادر کردیئے مگر خیر خواہوں نے پہلے سے خسرو کو خبر دیدی اور وہ چوری چھپے جان بچا کر چلا گیا۔ مگر چلتے وقت محل میں کہتا گیا کہ اگر کوئی شہزادی شیریں نام کی آئے۔ تو اسے بڑی خاطر تواضع سے محل میں رکھنا اور میرا انتظار کرنے کو کہنا۔ خادماؤں کو سمجھا کر وہ سیدھا گرجستان کی طرف گیا۔ ادھر شیریں مدائن آرہی تھی۔ رستے میں ایک چشمے کے کنارے دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں

متاثر ہوئے لیکن چونکہ پہچانتے نہ تھے اس لئے اپنی اپنی راہ پر چل دیئے اور دلوں میں خیال کیا کہ جس کی تلاش میں ہم جا رہے ہیں وہ اس سے زیادہ حسین ہے۔ جب شیریں فارس پہنچی اور اسے معلوم ہوا کہ خسرو جا چکا ہے تو وہ بے حد مایوس اور رنجیدہ ہوئی۔ محل کی فضا اسے نہ بھائی اور وہ بے دلی سے رہنے لگی۔ آخر خود حکم دے کر "سامنے" کوہ بیستون پہ علیحدہ محل بنوا کر خسرو کے انتظار میں رہنے لگی۔

ادھر جب خسرو گرجستان پہنچا اور شیریں کے متعلق اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی تلاش میں جا چکی ہے تو بڑا پریشان ہوا۔ مہین بانو نے اس کی ہزار شاہانہ مدارات سے آؤ بھگت کی مگر خسرو کو اپنے مقصد اعلیٰ کے فوت ہو جانے سے بڑی الجھن اور فکر تھی۔ انہی ایام سے اس کی شاپور سے ملاقات ہوئی۔ اس نے فوراً شاپور کو ایران بھیجا تاکہ شیریں کو لے آئے۔ شاپور ایران گیا اور شیریں کو بہلا پھسلا کر گرجستان چلنے کی ترغیب دی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح شیریں پھر گرجستان واپس آ گئی۔

اسی دوران میں سپہ سالار بہرام چوبینہ نے سازش کر کے بادشاہ ہرمز کی آنکھیں نکلوا دیں۔ تب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا خسرو بالکل بے گناہ تھا۔ اس نے فوراً آدمی دوڑائے تاکہ وہ خسرو کو گرجستان سے واپس لا کر تخت پر بٹھائیں۔ ورنہ حکومت کی باگ ڈور دشمنوں کے ہاتھ میں چلی جائیگی۔ چنانچہ چند معتبر لوگ گرجستان گئے اور خسرو کو مدائن واپس لا کر ساسانی تخت پر بٹھا دیا۔ اس بھاگ دوڑ میں خسرو شیریں سے نہ مل سکا اور وہ گرجستان چلی آئی۔ ابھی خسرو کو تخت پر بیٹھے چند ہی روز گزرے تھے کہ بہرام چوبینہ نے پھر خواہ مخواہ اڑائی کہ خسرو اپنے باپ کی آنکھیں نکلوا کر تاج و تخت کا مالک بن بیٹھا ہے۔ یہ بدگمانی اور افواہ اس قدر پھیلی کہ اہل حکومت اور رعایا دونوں خسرو کے خلاف ہو گئے۔ ادھر خسرو کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ شیریں واپس اپنے وطن جا چکی ہے جب اس نے حالات کا رخ بدلا ہوا دیکھا تو وہ تاج و تخت سے دست بردار ہو کر جان بچانے کے لئے بھاگا اور گرجستان پہنچ کر اپنی محبوبہ شیریں سے جا ملا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کو خوشی ہوئی وہ احاطہ بیان سے باہر ہے۔ ہر وقت صحبت عیش و طرب برپا رہتی اور شب و روز محبت کی رنگین ملاقاتیں ہوتیں۔

خسرو اور شیریں کی بڑھتی ہوئی یکجائی دیکھ کر مہین بانو کو خیال پیدا ہوا کہ یہ تعلقات شیریں کے مستقبل کے لئے خوشگوار نہیں ہو سکتے چنانچہ اس نے شیریں کو علیحدہ بلا کر سمجھایا اور کہا۔ "دیکھو شیریں اب اگر تم خسرو سے محبت کرتی ہو اور وہ بھی تم پر جان چھڑکتا ہے لیکن ناتجربہ کاری کی بنا پر کہیں تم اپنا گوہر عصمت نہ کھو بیٹھنا ورنہ تمہاری حیثیت ایک ایرانی خادمہ سے زیادہ نہ رہے گی۔ خیریت اسی میں ہے کہ اپنے پنڈے کو ہاتھ نہ لگانے دے۔ اس کے علاوہ تو کوئی لونڈی باندی بھی تو نہیں کہ ایک شہزادے کے ہاتھ کا کھلونا بن رہی ہو۔ اگر وہ ایک سلطنت کا ولیعہد ہے تو تو بھی گرجستان اور ارمن کی واحد ولیعہد ہے۔ اگر ایک بار خسرو اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے بعد وہ تجھے کبھی نہ پوچھے گا۔ اور تیری محبت کا یہ نشہ ایک لمحہ میں ہرن ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی تو سوچ کہ آج کل خسرو کی کیا حالت ہے؟ اپنے وطن سے جلا وطن ہو کر وہ تیرے ملک میں پناہ گزیں ہے۔ میری نصیحت کو مان، اور اگر تجھے اس بات کا امتحان ہی لینا ہے تو پہلے اس سے شادی کر لے اور اس کے بعد جو جی میں آئے کر۔"

شیریں کے دل کو یہ بات لگ گئی۔ اور دوسری بار جب وہ خسرو کی محفل طرب میں گئی اور نغمہ و شراب کے زیر اثر جب خسرو نے شیریں کو اپنی آغوش میں لینا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا، اور کہا میں کوئی فاحشہ عورت نہیں ہوں جو آپ میری آبرو کے درپے ہیں۔ پہلے اپنی حالت کو دیکھیے اور ملک حاصل کر کے باقاعدہ مجھ سے عقد کیجیے۔ تب میں آپ کی ہوں۔ خسرو نے پھر اشتیاق وصل ظاہر کیا لیکن شیریں نے پھر وہی جواب دیا۔ جس پر خسرو ناراض ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ اسے فارس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی کیونکہ وہاں بہرام چوبینہ کی حکومت تھی۔ اس لئے وہ سیدھا قسطنطنیہ گیا اور قیصر سے ملا۔ قیصر نے اس سے اپنے حقیقی بیٹے کی طرح سلوک کیا اور اپنی لڑکی مریم سے اس کی شادی کا انتظام کیا۔ اس کے بعد اسے ایک بہت بڑی فوج دی تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا ملک واپس لے سکے۔ اتنی بڑی فوج کے رعب اور اصل تاجدار کی محبت سے رعایا بہرام کے خلاف ہو گئی اور وہ شکست کھا کر ترکستان کی طرف بھاگ گیا اور تاج ساسان ایک دفعہ پھر خسرو کے سر پر چمکنے لگا لیکن اس کی خانگی اور نجی زندگی ایک پابندی کے ماتحت آ گئی تھی۔ اس پر مریم کا قبضہ تھا اور وہ کچھ اس قسم کی حاسد عورت تھی کہ کسی حرم اور کنیز کو پرویز کے نزدیک تک نہ جانے دیتی۔ الغرض خسرو ہر طرح سے پابند تھا تاہم فراغت کے دن تھے۔ اس لئے ہر وقت شیریں کا خیال رہتا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں شیریں کی محبت

گھر کر چکی تھی۔ ہر وقت اسی کی موہنی صورت دکھائی دیتی اور اسی کے تصور اور فراق میں پڑا پڑا افسردہ رہتا اور کہتا کیوں نہ میں نے شادی کرکے شیریں کو اپنا بنا لیا۔ ادھر شیریں کا بھی یہی حال تھا۔ دن رات خسرو کی جدائی میں تڑپتی اور کف افسوس مل کر کہتی "ہائے میں نے خواہ مخواہ انھیں ناراض کیا"۔ اور اپنی لگائی ہوئی آگ کے انگاروں پر خود ہی لوٹتی۔ اور آتش فراق میں جلا کرتی۔ اسی دوران میں مہین بانو کا انتقال ہو گیا۔

آخر ایک بار پھر شاپور گرجستان گیا اور شیریں سے ملا۔ شیریں نے اپنے دل کا حال شاپور سے کہا۔ اور بولی۔ "اے شاپور! تمہی نے یہ آگ میرے دل میں لگائی تھی، اب تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ"۔ شاپور نے کہا۔ "ملکۂ عالم آپ سے زیادہ ہمارے بادشاہ کا برا حال ہے ہر وقت آپ کی یاد میں تڑپتے رہتے ہیں۔ اگرچہ مجبوراً انھوں نے مریم سے شادی کر لی ہے لیکن اصل تڑپ تو انھیں آپ ہی کی ہے میرا خیال ہے آپ اپنی حکومت کسی معتبر شخص کے ہاتھ میں دیکر ایران چلی جائیں اور کوہ بے ستون پر اپنے محل میں قیام کریں۔ آپ کی موجودگی سے شہنشاہ پر مریم کا اثر کم ہو جائے گا۔ اور وہ اس کی چنداں پروا نہ کریں گے"۔

شیریں نے شاپور کے کہنے کے مطابق عنان سلطنت ایک معتبر غلام کے ہاتھ میں دے کر اسے "مدار المہام" بنا دیا اور سیاہ و سفید مالک قرار دیکر خود کثیر رقم اور زر و جواہر ہمراہ لے کر شبدیز پر سوار ہو سیدھی ایران پہنچی، اور "کوہ بیستون" پر اپنے محل میں مقیم ہو گئی مریم نے خسرو پر اس قدر کڑی نگرانی اور سخت پابندی لگا رکھی تھی کہ باوجود شیریں کے ایک عرصہ سے مدائن میں قیام پذیر ہونے کے وہ اسے دیکھ تک نہ سکا۔ نہایت خفیہ طور سے شاپور کی وساطت سے دونوں میں نامہ و پیام قائم تھا۔ مگر مریم کوئی ایسا موقع نہ آنے دیتی تھی جس سے خسرو پرویز اور شیریں کی ملاقات ہو سکتی۔ آخر اس قید و بند کی زندگی سے تنگ آکر ایک دن خسرو نے نہایت لجاجت کے لہجہ میں مریم سے درخواست کی کہ وہ شیریں کو محل میں لاکر رکھنے کی اجازت دیدے کیونکہ شیریں کسی طرح خسرو اور مریم کی ازدواجی زندگی میں حائل نہ ہو گی۔

یہ سن کر مریم کو طیش آگیا۔ اس نے خسرو کو خوب ڈانٹا اور کہا، میں ایسی بھولی نہیں جو سوکن کو سینہ پر بٹھا لوں اور خود اپنے ہاتھ سے اپنے پیر پر کلہاڑی مار لوں۔ اگر شیریں نے میرے محل میں قدم رکھا تو گلے میں پھانسی ڈال لونگی اور میری موت کا جو کچھ بدلہ میرا باپ لے گا اس کے انجام کو تم سوچ رکھو۔ یہ سن کر خسرو گھبرا گیا اور ایسی پابندی اور احتیاط سے رہنے لگا کہ مریم کے سامنے شیریں کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ پھر بھی دل کی آگ کہیں چھپائے چھپتی ہے، فراق شیریں میں جب بیتابی اور بیقراری حد سے بڑھ گئی تو اس نے شاپور سے وصال محبوب کی کوئی تدبیر دریافت کی۔ شاپور چونکہ شیریں کو پھسلا کر لے آیا تھا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ اگر آپ وہاں نہیں جا سکتے تو میں شیریں کو چوری چھپے محل میں لے آؤنگا۔ اور اس طرح آپ محفل عیش گرم کر سکتے ہیں اور اپنی دلی مراد پا سکتے ہیں۔ شاپور شیریں کے پاس گیا اور اس سے کہا "بادشاہ بڑی پابندی میں ہیں اور آپ کی فرقت میں تڑپتے ہیں۔ آپ کو اگر مریم نے ستایا ہے تو آپ بھی اپنی سوکن کا اس طرح بدلہ لیجئے کہ چپکے سے محل میں جاکر خسرو سے ملئے اور لذت وصل سے شادکام ہوجئے" یہ سن کر شیریں کو ایکدم غصہ آگیا اور اس نے شاپور کو بری طرح پھٹکارا اور کہا۔ "تم نے اور تمہارے بادشاہ نے سمجھ کیا رکھا ہے، میں کوئی آوارہ ہوں جو اس طرح تم میری آبرو کے پیچھے پڑے ہو، جاؤ یہاں سے چلے جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہدو کہ مجھے اس کی دولت اور سلطنت کی ذرہ برابر پروا نہیں، اس کا مال و زر اسے مبارک ہو اور وہ مریم کو۔ میں بھی ایک سرسبز و شاداب ملک کی ناز پروردہ ملکہ ہوں۔ آہ! میں نے فضول اپنی جوانی تباہ کی۔ میں محبت کی بھوکی ہوں کہ اس طرح اپنے تاج و تخت کو چھوڑے ہوئے یہاں اس انتظار میں پڑی ہوں کہ مریم مرے۔ خبردار جو آئندہ اس طرف کا رخ کیا۔ اور اپنے بادشاہ کو بھی تاکید کر دینا کہ اس طرف نہ آئیں ورنہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ اگر وہ مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے باقاعدہ نکاح کریں پھر اپنی معزز محبوبہ بنا کر حرم میں داخل کریں۔ ان سے کہہ دینا میں نے پہلے ہی صاف صاف تمام شرائط بیان کر دی تھیں جس پر وہ ناراض ہو کر گرجستان سے آگئے۔ اور جلن میں مریم سے شادی کر لی۔ اب ان کے ایسے ناپاک ارادے معلوم کر کے میری طبیعت پھر گئی ہے۔ اگر انہوں نے ادھر رخ کیا تو قصر بیستون کے دروازے ان پر بند ہونگے"۔

شیریں کو ناراض دیکھ کر شاپور حواس کھو بیٹھا اور اس کی آشفتہ مزاجی کا حال خسرو سے بیان کیا۔ خسرو یہ سب سن کر بہت مایوس ہوا اور رنج و غم میں سر دھن لیا۔

اس اَن بن کے بعد شیریں اور خسرو علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے کے فراق میں جلنے لگے۔ ہجر کی راتیں رو رو کر کٹنے لگیں۔ شیریں غم ہجر کی کٹھن منزلیں جھیلتے جھیلتے لاغر و کمزور ہو چکی تھی۔ اور دودھ کے سوا اس کی کوئی غذا نہ تھی۔ قصر شیریں کوہ بیستون کی ایک ایسی چٹان پر بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف گہری کھائیاں اور پرپیچ وادیاں تھیں۔ شیریں کی خادمائیں دور شہر سے دودھ لاتی تھیں۔ جس سے انھیں بڑی تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ اس پر بھی وہاں تک تازہ دودھ نہ پہنچ پاتا تھا۔ اس تکلیف سے شیریں بڑی پریشان تھی۔ چنانچہ اس نے شاپور کو کہلا بھیجا کہ جس طرح ہو سکے کم سے کم اس تکلیف کو رفع کرنے کا بندوبست کرے۔ شاپور نے کہا۔ میرا ایک دوست فرہاد نامی ایک عدیم المثال مہندس، سکہ دست نقاش اور نہایت عمدہ کوہکن دھارہ ہے۔ وہ چاہے تو اس قسم کی ایک نہر بنا سکتا ہے جو منٹوں میں دودھ یہاں لے آئے گی۔ شیریں نے فرہاد کو بلایا اور چلمن میں بیٹھ کر اس نے اپنی تکلیف اور تجویز بیان کی۔ شیریں بلحاظ آواز اسم بامسمٰی تھی۔ اس کی نسوانی آواز میں اس قدر غنائیت اور جاذبیت تھی کہ سننے والے کو خواہ مخواہ دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ نوجوان فرہاد شیریں کی آواز سنتے ہی اپنا دل کھو بیٹھا اور شیریں کے تعمیل حکم کی خاطر تیشہ لے کر کوہ بیستون پر قصر شیریں سے چراگاہ تک ایک سیدھا خط قائم کیا اور بکمال فن اس قسم کی ڈھلوان نہر کاٹی کہ اگر چراگاہ سے دودھ والیاں دودھ ڈالتیں تو تھوڑے عرصہ میں سیدھا قصر شیریں میں سنگ رخام کے حوض میں جمع ہو جاتا نہر کو اس قدر صاف اور آراستہ بنایا کہ ساری دنیا عش عش کرنے لگی۔ اسے ہر تیشہ کی چوٹ سے شیریں کی آواز نکلتی معلوم ہوتی اور وہ ہر سانس میں شیریں شیریں پکارتا جس سے گرد و نواح میں اس کے عشق کی داستان زباں زد عام ہو گئی۔ جب شیریں نے جوئے شیر ملاحظہ کی تو وہ بڑی خوش ہوئی اور فرہاد کو بلایا۔ سامنے چلمن میں بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ فرہاد کو طلب انعام سے زیادہ شوق دیدار اور اشتیاق گفتگو ہے۔ حسن میں عشق کی ناز برداریوں اور بیتابیوں سے اور زیادہ کشش پیدا ہوتی ہے۔ شیریں نے اور بھی شماس اور نرمی سے گفتگو کی اور اپنی آواز میں نغمہ کے زیر و بم پیدا کر کے فرہاد کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اپنے کانوں کی بالیوں میں سے چند لعل و گہر نکال کر فرہاد کو بطور انعام دیئے۔ فرہاد نے لے تو لئے لیکن فوراً ہی شیریں کے قدموں میں جھک کر نچھاور کر دیئے اور جنگل کو چل دیا۔

عشق کی جنونی حالت میں وہ دشت و صحرا کی خاک چھانتا پھرا۔ شیریں کا نام اس کی زبان پر تھا۔ جب خسرو کو اس کا علم ہوا تو اس نے سوچا کہ جب ساری دنیا کا دل نرم ہو چکا ہے تو فرہاد کے فلک شگاف نالوں کو سن کر شیریں کے سنگین دل میں لکیر کیوں نہ پڑے گی۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ فرہاد کو قتل کرا دیا جائے لیکن اس کے مصاحبوں نے رائے دی کہ اگر فرہاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو ساری دنیا میں خسرو بدنام ہو جائے گا۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اسے کسی ایسے کام میں لگا دیا جائے جس سے وہ زندہ بچ ہی نہ سکے۔ چنانچہ خسرو نے فرہاد کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ لیکن فرہاد نے بادشاہ کے ایلچیوں سے کہا۔ "میں کسی جہاندار وہاندار کو نہیں جانتا۔ میں تو بس شیریں کو جانتا ہوں۔" چالاک وزیروں نے کہا۔ "ارے تم عجیب آدمی ہو۔ اسی لئے تو بلایا ہے کہ وہ تمھاری حالت پر رحم کھا کر تم کو شیریں سے ملانا چاہتے ہیں۔" یہ سن کر فرہاد فوراً ساتھ ہو لیا۔ اور بادشاہ کے سامنے ہر بات کا نہایت مناسب جواب دیا۔ خسرو نے رقیب کے جنون کو دیکھ کر دل میں کہا اسے کسی نہ کسی طرح اپنے رستہ سے ہٹانا چاہیئے چنانچہ وزیروں کی رائے سے خسرو نے کہا۔ "فرہاد تم ایک اعلیٰ مہندس اور مشقت آزما کوہکن ہو۔ مشرقی ممالک میں جانے سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ کوہ بیستون کا یہ سلسلہ جو میرے رستے کو روکتا ہے تم کاٹ دو۔" فرہاد نے نہایت بے باکی سے کہا۔ "اگر تم وعدہ کرو کہ شیریں کے عشق سے دست بردار ہو جاؤ گے تو میں ایسا کر سکتا ہوں۔"

خسرو کو یہ سن کر غصہ تو بڑا آیا لیکن مصلحت وقت کے باعث خاموش ہو رہا اور وعدہ کر لیا۔

فرہاد نے اپنا تیشہ لے کر سنگ سخت کی اونچی نیچی پہاڑیوں کو لگاتار کاٹنا شروع کر دیا۔ اور کوہ بیستون کے ناہموار سلسلوں میں سے ایک صاف اور ہموار سڑک بنانے لگا۔ اور ساتھ ہی چٹانوں پر ایسے ایسے رنگین مرقعے اور شیریں کی ایسی ایسی تخیلی تصویریں تیار کیں کہ لوگ دیکھ کر عش عش کر اٹھے۔ عشق کی دھن میں وہ ایسے ایسے سخت پتھروں کو کاٹتا چلا جاتا تھا کہ لوگ اس کے جوش کو دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔

جہاں خلوص ہوتا ہے۔ وہاں دونوں طرف سے لگن پیدا

ہو جاتی ہے۔ شیریں نے جب یہ سنا تو وہ بھی گھوڑے پر سوار ہوکر فرہاد کے فنی کمالات دیکھنے گئی۔ اور اس سے دریافت کیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ فرہاد نے سارا واقعہ من و عن بیان کر دیا اور اپنی جان تصدق کرنے لگا۔ فرہاد کے پھٹے پرانے کپڑے اور عجیب و غریب ہیئت کذائی دیکھ کر گھوڑا بدک گیا اور قریب تھا کہ شیریں مع گھوڑے کے ایک کھڈ میں گر کر ختم ہو جائے کہ فرہاد نے دوڑ کر گھوڑے کی باگ تھام لی اور اسے روک کر قصر بیستون تک پہنچا آیا۔ اس واقعہ سے شیریں بہت متاثر ہوئی اور عاشق جنون نواز کی حالت دیکھ کر اسے رونا آ گیا۔

فرہاد کی بڑھتی ہوئی دیوانگی اور جوش عمل کو دیکھ کر خسرو کو اندیشہ ہونے لگا کہ چند روز میں کوہ بیستون کی سنگلاخ چٹانیں صاف ہو جائیں گی اور اسے شیریں کو فرہاد کے حوالے کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے پھر وزرا کی مجلس طلب کی۔ اور اس معاملے میں مناسب رائے مانگی۔ چالاک اور عیار وزیروں نے ایک ایسی چال چلی جس سے واقعی خسرو اپنی دلی مُراد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے چند آدمیوں کو سکھا کر فرہاد کے پاس بھیجا۔ فرہاد اپنی دھن میں پتھروں پر تیشہ سے کام لے رہا تھا کہ خسرو کے آدمیوں نے اس کے برابر جا کر کہا "غریب کس قدر محنت سے کام کر رہا ہے" اور فرہاد سے پوچھا "کیوں بھائی یہ پہاڑ تم کیوں کاٹ رہے ہو اور یہ حال کیسا بنا رکھا ہے؟" فرہاد نے ایک ہی جواب دیا۔ "شیریں کی خاطر" ——— مکار مصاحب افسوس کے لہجہ میں کہنے لگے۔ "اوہو غریب جس کے لئے محنت کر رہا ہے، وہ سب رائگاں جا رہا ہے" فرہاد نے ہاتھ سے تیشہ رکھ کر کہا۔ "کیوں کیا شیریں کو میرا خیال نہیں؟" مصاحب بولے۔ "نہیں خیال تو اسے بہت تھا مگر وہ اچانک اس دنیا سے چل بسی" فرہاد کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی اور اس نے یہ سوچ کر کہ جب وہی نہ رہی جس کے لئے وہ زندہ ہے اور یہ سب کچھ کر رہا ہے تو اس کا زندہ رہنا بھی بیکار ہے چنانچہ سر میں وہی تیشہ مار کر جان دیدی۔

شیریں نے جب عاشق ناشاد کی موت کی خبر سنی تو رنج و الم سے بیتاب ہو گئی۔ اور خون کے آنسو بہانے لگی۔ ماتمی لباس پہن کر "قصر بیستون" سے نکل کھڑی ہوئی اور کوہ بیستون پر جا کر بہ نفس نفیس فرہاد کی شاہانہ تجہیز و تکفین کرائی۔ اور ایک نہایت شاندار مقبرہ بنوایا۔ خسرو کو جب ان حالات کا علم ہوا تو وہ بہت کڑھا اور ایک طنزیہ خط لکھا جس میں شیریں کو فرہاد کی محبت اور دیوانگی کا طعنہ دیا اور لکھا کہ اگر فرہاد مر گیا تو کیا ہوا۔ اور عاشق جو موجود ہیں تمھاری ہرجائی فطرت سلامت رہے۔"

اتفاقاً اسی زمانہ میں مریم مر گئی۔[۱] اور حکومت کی روایات کے مُطابق خسرو نے ماتمی لباس پہن کر رنج و الم اور حکومت سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اب شیریں کو موقع مل گیا اور اس نے خسرو کو خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ اگر مریم مر گئی تو کیا ہوا۔ آپ کے محل میں اور بھی ہزاروں حسینان جہاں بھری پڑی ہیں۔" خسرو نے اپنی تشنیع کا جواب صحیح مان لیا اور شیریں کے لئے پھر بیقرار ہو گیا۔ اس نے شیریں سے درخواست کی کہ وہ اس کے محل میں آ جائے۔ لیکن شیریں نے پھر وہی شرط رکھی کہ آئین ساسانی کے مطابق شادی کر کے مجھے اپنی ملکہ اور بانوئے عجم بنا لو۔ لیکن خسرو نے پھر اس سے پس و پیش کیا۔[۲] اور جب کسی طرح شیریں پر قبضہ نہ ہوا تو اس نے کوئی اور محبوبہ ڈھونڈ نکالنے پر غور کیا۔ ان دنوں ایرانی حکومت روز افزوں ترقی پر تھی اور حکومت عجم کا قسطنطنیہ تک ڈنکا بجا ہوا تھا۔ چنانچہ وزرا نے اطلاع دی کہ اصفہان میں ایک حسینہ ہے جو اپنے حسن کا ثانی نہیں رکھتی لیکن اس میں ایک نقص ہے کہ ہر شخص سے خاطر مدارات سے پیش آتی ہے۔ مریم کی موت کے ایک سال بعد تک تو خسرو خاموش رہا لیکن اس کے بعد ایک روز وہ معمولی لباس زیب تن کر کے حسینہ کو دیکھنے کے لئے اصفہان گیا۔ اس کا نام شکر تھا حسب معمول وہ نہایت خاطر سے پیش

له قدیم تاریخ عجم میں اس واقعہ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ شیریں واپس جانے لگی تو گھوڑا بدک گیا اور قریب تھا کہ مع سوار کے ایک گہرے کھڈ میں جا گرے مگر فرہاد نے بڑی پھرتی سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور جوش عشق میں اس نے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا کہ شیریں کو مع گھوڑے کے اٹھا کر قصر بیستون میں جا رکھا۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں البتہ جدید تحقیقات کی روشنی میں مندرجہ بالا واقعہ قرین قیاس ہے۔

له مریم کی موت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شیریں نے سوت سے تنگ آ کر اسے زہر دلوا دیا تھا۔ تاریخ عجم صفحہ ۱۸۷

ته اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خسرو وزرائے سلطنت اور اعیان حکومت سے ڈرتا تھا کہ وہ کسی بیرونی عورت کو ملکۂ عجم بنائے۔

آئی اور خسرو کو مے گلگوں کے کئی جام پلائے۔ صبح اٹھ کر خسرو نے شکر سے اس کے حالات دریافت کئے اور کہا افسوس تم جیسی حسینہ اپنی دولت حسن یوں لٹاتی پھرے۔ شکر نے کہا۔ آج تک کسی نے مجھ سے یہ سوال نہ کیا تھا۔ آج تم نے دریافت کیا ہے تو سنو۔ میں بالکل باعصمت ہوں اور جیسی عفیفہ پیدا ہوئی تھی اب تک ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ میں دن کو لوگوں سے ملتی ہوں لیکن رات کو میں اپنی حسین خادماؤں کے ذریعہ سے لوگوں کے اخلاقی معیار کا امتحان لیتی ہوں۔ آج تک کسی نے میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگایا۔

یہ سن کر خسرو ایران چلا گیا اور حاکم اصفہان کے نام حکم جاری کیا کہ شکر کو ہمارے محل میں پیش کیا جائے اور اس کے حالات سے بھی ہمیں آگاہ کیا جائے۔"

حاکم اصفہان نے شاہی کرّوفر کے ساتھ شکر کو مدائن بھیجا اور ساتھ ہی اس امر کی تصدیق کی کہ شکر بالکل باعصمت، پاکدامن اور ایک اعلیٰ خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ خسرو نے شکر کو بڑی عزت سے محل میں داخل کیا۔ اور عیش و طرب میں اپنی زندگی گزارنے لگا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا دل بھر گیا اور نازآفریں شیریں کی یاد اسے پھر تڑپانے لگی۔ شیریں الگ اپنی قسمت کو روتی تھی اور کہتی میں نے خواہ مخواہ اپنی جوانی برباد کی۔ اور خسرو کی خاطر اپنا مستقبل تاریک بنا لیا۔ اب اگر میری جوانی ڈھل گئی تو میرا کیا ہوگا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ خسرو سے معافی مانگ لے اور عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ لیکن مہین بانو کی شبیہ اس کے سامنے آکر اپنا وعدہ یاد دلاتی۔ شیریں کا دل پھر جلتا اور وہ اپنے عہد پر مضبوطی سے قائم ہو جاتی۔ خسرو بھی تنگ آچکا تھا۔ چنانچہ وہ شیریں کو محل میں لانے کے لئے اپنے محافظوں اور امرا کے ساتھ قصر بے ستون میں گیا۔ شیریں کو پہلے ہی خبر ہو چکی تھی اس نے قصر بے ستون کے تمام دروازے مضبوطی سے بند کر لئے اور خود بناؤ سنگھار کر کے بالاخانے پر دریچہ میں پرتکلف زرنگار پردے ڈال کر بیٹھ گئی اور خسرو کا انتظار کرنے لگی۔ خسرو نے بہت کوشش کی کہ دروازہ کھل جائے مگر ناکام رہا چنانچہ سب کو پیچھے چھوڑ کر وہ محل کی فصیل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اور شیریں کی خوشامد کرتے ہوئے مہمان نوازی کا مطالبہ کیا۔ اور کہا کہ تم ایک بہت بڑے تاجدار کی توہین کر رہی ہو۔ شیریں نے دریچے سے جواب دیا کہ اسی غرور نے تو آج تک ہمارے درمیان ایک دیوار حائل کر رکھی ہے۔ اس کے بعد گلے شکوے ہوئے۔ خسرو نے فرہاد کے متعلق اور شیریں نے مریم اور شکر کے متعلق خوب خوب طعنے دیئے۔ آخر پرویز نے ہار کر اپنا تاج سر سے اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ شیریں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ تاج تو تاج والے کے سر پر ہی زیب دیتا ہے۔ میں تو خادمہ ہوں میری خاطر اتنی انکساری کی ضرورت نہیں ہے۔ محض نکاح کر کے مجھے ساسانی روایات کے مطابق اپنی کنیز بنائیے۔ اگر یہ شرط منظور نہ ہو تو میں مجبور ہوں۔

خسرو کے لئے چونکہ یہ ممکن نہ تھا اس لئے وہ ناکام واپس چلا آیا اور شاپور سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ناکامی کو شراب میں غرق کرنا شروع کر دیا۔ جنگل میں خیمے گاڑ دیئے گئے۔ اور شراب کا دَور چلنے لگا۔ خسرو کے علاوہ اس کے امرا بھی رات دن نشہ میں چور رہنے لگے۔ رات کو محفل طرب برپا کی جاتی۔ بادشاہ حسین غلاموں اور مغنیوں کے گانے سن کر شیریں کی یاد کو بھلانے کی کوشش کرتا۔ ایک روز رات کے وقت شیریں لباس بدل کر بادشاہ کے خیموں میں گئی اور شاپور سے مل کر اپنے دل کا حال بیان کیا اور کہا اب زیادہ صبر کی تاب نہیں۔ میں صرف پرویز کی شکل دیکھ کر اپنے دل کی آگ بجھانا چاہتی ہوں۔ شاپور نے نہایت ادب سے کہا کہ بادشاہ خود اپنی ضد پر نادم ہے۔ تم سے ملتے ہی تمہارے قدموں پر گر پڑیں گے۔ شیریں نے کہا۔ یہ بات نہیں۔ میں چاہتی ہوں پرویز کی موہنی صورت سے بھی اپنی آنکھوں کو سرشار کروں اور خفیہ طور سے تمہاری بات کی تصدیق بھی کروں کہ آیا بادشاہ کو میرا خیال بھی ہے یا نہیں۔ شاپور نے کہا کہ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ جب محفل طرب منعقد ہو گی تو میں تمہیں غلاموں کی صف سے پیچھے چھپا کر بٹھا دوں گا تمہیں کوئی نہ دیکھ سکے گا اور تم محفل کا پورا پورا لطف اٹھا کر بادشاہ کی بےقراری کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ شیریں نے اس تجویز کو پسند کیا اور کہا میرے برابر ایک اچھا سا گویا بٹھا دینا تاکہ میں اسے بتا بتا کر اپنی مرضی کے مطابق گانے کے ذریعے سے جذبات کا اظہار کر سکوں۔ شاپور نے وعدہ کر لیا آخر جب محفل رقص و سرود منعقد ہوئی تو سازندوں کے عقب میں ایک پرتکلف ایرانی قالین پر شیریں کو اس طرح بٹھا دیا گیا کہ اہل مجلس کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ بادشاہ اس وقت خواب استراحت کے مزے لے رہا تھا لیکن اسے جگایا گیا۔ وہ محفل میں آیا اور تخت پر بیٹھتے ہی بولا۔ شاپور! تم نے ہمیں ایک سہانے خواب سے چونکا دیا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ایک بےحد خوشنما باغ میں ہم اور شیریں ایک جگہ بیٹھے محبت [illegible] کر رہے ہیں

اور اپنی اپنی پچھلی شکایتوں اور بے وفائیوں پر نادم ہیں۔" شاپور نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "حضور یہ خواب بالکل سچا ہے۔ واقعی ملکہ جہاں شیریں آپ کے فراق میں بیتاب ہیں اور اپنے کئے پر پشیمان ہیں۔ آپ کی گزشتہ باتوں نے انھیں کسی قدر نا راض کر دیا لیکن اب وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" خسرو نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "شاپور! ہماری ایسی قسمت کہاں جو شیریں ایسی خوددار اور سنگدل حسینہ کے دل میں جگہ حاصل کر سکیں۔ اب ہم سے زیادہ ضبط نہیں ہوتا۔ لاؤ شیریں کی یاد میں ناچ گانا شروع کریں۔" شاپور نے کہا ناگوارِ خاطر نہ ہو تو نغمہ سرائی اس طرح کرائی جائے کہ ایک ایک مغنیہ آپ کی اور شیریں کی نمائندہ بن کر بیت بازی کرے۔ یہ تجویز خسرو نے بھی پسند کی اور ایک طرف نکیسا اور دوسری طرف باربد اپنے اپنے ساز لے کر بیٹھ گئے۔ نکیسا نے شیریں کے بتلائے ہوئے مضمون پر نغمہ سرائی شروع کی اور باربد نے اپنے رباب پر ایک ایسا نغمہ چھیڑا جو اس کا جواب تھا اور خسرو کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ شیریں نے پھر نکیسا کے پیچھے سے اسے گانے کے لئے مضمون بتایا اور ہجر و فراق اور شکوہ و شکایت کا سماں باندھ دیا۔ جس کا باربد نے جواب دیا۔ الغرض محفل گرم ہونے لگی اور اہلِ محفل دنگ رہ گئے۔

حسن اور عشق کے سوال اور جواب سے شیریں اور پرویز کے جذبات برانگیختہ ہو رہے تھے کہ یکایک بادشاہ تخت سے اتر آیا اور باربد سے کہا۔ "باربد! اب ضبط نہیں ہوتا۔ نکیسا نے تو تمام واقعات اس طرح بیان کر دیئے ہیں گویا شیریں خود کہہ رہی ہو۔ میں ہارا اور وہ جیتی، تو یہی کہہ دے۔" ادھر باربد نے نغمہ چھیڑا ادھر شیریں ایک دلدوز چیخ کے ساتھ نکیسا کے پیچھے سے نکل آئی۔ خسرو تعجب سے بول اٹھا: "یہ تو میری شیریں کی آواز معلوم ہوتی ہے۔" اور دوسرے لمحہ شیریں خسرو کے قدموں میں پڑی تھی اور آنسو بہا کر اپنی گزشتہ کج ادائیوں اور ناقابلِ قبول شرطوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ خسرو نے کمالِ محبت سے شیریں کو اٹھایا اور اپنا تاج شیریں کے قدموں میں رکھ کر بولا۔ "اے ملکۂ حسن تو فاتح ہے اور میں مفتوح۔ مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں، میری گزشتہ خطاؤں کو معاف کر دے یہ میری محبت کا اثر تھا کہ تم جیسی عفت مآب ملکہ نے میرے معصیت خانے کو رونق بخشی۔"

شیریں نے مسکرا کر آنسو پونچھتے ہوئے تاج کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر خسرو کے سر پر رکھ دیا۔ اور بولی۔ "تاج اپنی جگہ پر اچھا لگتا ہے

میں تو ہمیشہ اسی صورت کی متوالی رہی ہوں۔ میں نے ساری زندگی اسی کی پرستش کی ہے اور اب بھی اسی کی باندی رہوں گی۔ میں ہاتھ جوڑ کر اپنی پچھلی بداعتدالیوں اور ستم کاریوں کی معافی چاہتی ہوں۔" خسرو نے محبوبۂ ناز آفریں کا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر موافق حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور جذبات سے مغلوب ہو کر شیریں کو اپنے آغوش میں لینا چاہا۔ لیکن شیریں پھر ہوش میں آگئی اور کہا باوجودیکہ میں آپ کی کنیز ہوں لیکن عصمت کو محبت پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ آپ میری جان، دل اور روح کے مالک ضرور ہیں۔ لیکن آپ میری آبرو کو برباد نہیں کر سکتے۔ پہلے مجھ سے عقد کیجئے۔ پھر ملکہ بنا کر اپنے حرم میں داخل کیجئے۔" خسرو نے ایک بار قطعی فیصلہ کر لیا کہ شیریں کی مرضی کے مطابق مذہبی طریقے سے نکاح و شادی کے مراحل طے کرے گا۔ چنانچہ آٹھ روز تک اسی جنگل میں شیریں اور خسرو نے علیحدہ علیحدہ خیموں میں رہ کر جشنِ شادی منایا۔ اس کے بعد شیریں "قصرِ بیستون" میں چلی گئی اور خسرو نے مدائن پہنچکر پہلے عمائدِ سلطنت کو رضامند کیا۔ پھر بہایت تزک و احتشام کے ساتھ شادی رچائی اور شیریں کو اپنی ملکہ بنا کر "قصرِ شہریار ساسان" میں لے آیا۔ اور انتہائی اطمینان و مسرت کی زندگی گزارنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ سلطنت اور حکومت کے کاموں سے بھی بے پروا ہو گیا اور شیریں سیاہ و سفید کی مالکہ ہو گئی۔

چند سال اس طرح گزارنے کے بعد خسرو پر بڑھاپا سوار ہونے لگا۔ جوانی کی بداعتدالیاں رنگ لانے لگیں اور بال سفید ہو گئے۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی کے گناہوں سے تائب ہونے کے لئے مجوسی رہبروں کی امداد لی اور تلافیِ مافات کے طور پر نیک کاموں میں منہمک رہنے لگا۔ اس نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا اور بزرگ امید سے اپنے شکوک و شبہات کا ازالہ کرایا۔ اسی دوران میں شیریں نے بھی کلیلہ دمنہ کے چالیس قصے سنے۔

انہی ایام میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کا آفتاب نصف النہار پر آیا۔ اور اپنی تابناکیوں سے عرب کے ریگستانوں کو منور کرتا ہوا سرزمینِ ایران میں چمکا۔ جب نعرۂ رسالت ارضِ عجم میں گونجا تو خسرو نے بزرگ امید سے حضورِ اکرم کے متعلق دریافت کیا کہ "یہ عربی نژاد ہادی و مدعیِ نبوت کہاں تک قابلِ اعتبار و لائقِ تقلید ہے؟" بزرگ امید نے کہا "میں ان کی بابت مقدس بارگاہ میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ عالمِ ملکوت کی جن بلندیوں پر وہ جلوہ گر ہیں

وہاں تک میرا فلسفہ نہیں پہنچ سکتا۔ آپ خود ان سے نامہ و پیام کر کے اپنے دل کی تشفی کیجئے۔"

خسرو پر اس نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ نہ صرف اسلام سے متنفر ہو گیا بلکہ اس نے آنحضرت صلعم کی بعثت کو اپنے اقتدار کے لئے خوفناک تصور کیا۔ چنانچہ چند روز بعد جب حضور رسالتمآب صلعم کا پیغام حق خسرو کے دربار میں پہنچا۔ تو اس نے غصہ میں آ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور نامہ بر کو اپنے دربار سے نکال دیا۔ جب حضور کا پیغامبر مکہ معظمہ واپس پہنچا تو تمام حالات رسول اکرمؐ کی خدمت میں عرض کئے حضور کو خسرو کی بدبختی پر افسوس ہوا اور فرمایا فَمَلَكَ كِسْرىٰ وَلَا كِسْرىٰ بَعْدَهٗ یعنی اگر اس نے میرے پیغام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں تو اس کے بھی کسی دن ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہو گا۔ چنانچہ بعد کے حالات سے اس پیشگوئی کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی۔

شیریں کے بطن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ مگر مریم کے پیٹ سے خسرو کا ایک لڑکا تھا جو شیریں کی شادی کے وقت دس سال کا تھا لیکن شاہانہ پرورش اور آزاد فضا میں پلنے کی وجہ سے اس قدر تنومند تھا کہ ۲۰ برس کا خوبرو نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ بچپن میں اُس کی تربیت اس قدر خراب ہوئی تھی کہ وہ پرلے درجے کا اوباش اور عاشق مزاج بن گیا۔ اس نے شیریں پر بھی ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ خسرو کو اس کی جرأت آزما بدتمیزی کا علم تھا۔ چنانچہ اس نے بزرگ امید سے اس کے متعلق رائے لی۔ مگر بزرگ نے بھی یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی بچہ ہے بڑا ہو کر خود ہی سنبھل جائے گا۔ لیکن خسرو کے لڑکے شیرویہ کی بدمعاشیاں اور ریشہ دوانیاں اس قدر بڑھیں کہ رعایا بے چین ہو گئی۔ جہاں جاتا لوگ اسے گالیاں دیتے اور عورتیں اپنی آبرو کو خطرے میں محسوس کرتیں۔ لیکن بہت سے مفسد اس کے ساتھی بن گئے۔ وہ برابر شیریں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور باپ کی ذرہ برابر بھی عزت نہ کرتا تھا۔ خسرو اب بالکل عزلت گزین اور گوشہ گیر ہو چکا تھا۔ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو گیا اور اپنا وقت زیادہ تر آتشکدے میں گزارتا تھا اس طرح شیرویہ کو موقع مل گیا اور چند سرداروں کی مدد سے اس نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ایک رات جب شیریں اور خسرو اپنے خاص آتشکدے میں موجود تھے شیرویہ کے آدمیوں نے دونوں کو سنہری زنجیروں میں جکڑ کر قید میں ڈال دیا۔ ایسی حالت میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ سارے درباری اور عمائد سلطنت خسرو کے خلاف ہو گئے اور کوئی بھی اس کے نزدیک نہ پھٹکتا تھا۔ ایسے وقت میں اگر کوئی ہستی اس کی حقیقی غمگسار تھی تو وہ شیریں تھی جس نے اپنے شوہر کی دلجوئی کی اور اس کے غم و فکر میں برابر کی شریک رہی۔

ایک رات جب خسرو کو شیریں مزے مزے کی باتیں سنا کر سو گئی تو آدھی رات کے وقت ایک آدمی کھڑکی کے رستہ قید کی کوٹھری میں داخل ہوا اور خسرو کے بازو اور سینہ کو ایک خنجر سے زخمی کر کے فوراً اسی کھڑکی کی راہ سے باہر نکل گیا۔ جب درد و کرب سے بیتاب ہو کر خسرو نے آنکھ کھولی تو سینے سے خون کا ایک فوارہ جاری پایا۔ وہ اپنے انجام پر آنسو بہا کر خاموش ہو رہا۔ شدت تشنگی سے مجبور ہو کر چاہا کہ شیریں کو جگائے لیکن محبوبۂ دلنواز کی تکلیف کے خیال سے چپ رہا اور دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ شیریں کو تکلیف نہیں دیگا۔ چنانچہ اسی طرح پڑے پڑے جان دیدی۔ شیریں کو خسرو نے اگرچہ نہ جگایا لیکن اس کے خون کی گرم گرم چھینٹوں نے اسے جگا دیا۔ اس نے شوہر کو اس حالت میں دیکھ کر سر پیٹ لیا اور زار و قطار رونے لگی۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ شیریں نے پہلے خسرو کو گلاب کے عطر سے غسل کرایا۔ پھر شاہانہ تابوت میں رکھ کر خود زمانہ شباب کی طرح بناؤ سنگھار کر کے بیٹھ گئی۔ جب یہ خبر شیرویہ کو پہنچی تو وہ بڑا خوش ہوا اور سوچا کہ شیریں اس سے ملنے کے لئے ایسے بناؤ سنگھار کئے بیٹھی ہے اس لئے اس نے چند معتبر آدمیوں کو پیغام دے کر شیریں کے پاس بھیجا کہ بادشاہ سلامت آپ کے انتظار میں ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ بخوشی ان کا تحفۂ محبت قبول کریں۔ اور وہ وعدہ کرتے ہیں کہ پہلے سے زیادہ شان کے ساتھ آپ کو ملکہ بنا کر رکھیں گے۔ شیریں کو یہ سن کر غصہ تو بہت آیا مگر کسی خیال سے خاموش ہو گئی اور کہا مجھے تو خود انتظار تھا، بادشاہ سلامت سے کہنا کہ پہلے میری چند شرطیں منظور کر لیں پھر شوق سے مجھے اپنے محل میں داخل کر لیں۔ میری شرطیں یہ ہیں کہ اول تو وہ قصر شہریار جس میں خسرو پرویز رہتے تھے بالکل مسمار کر دیا جائے۔ دوم خسرو کو قتل کرنے والے اور اس کے قتل کی سازش کرنے والے سب میرے سپرد کر دیئے جائیں اور سوم یہ کہ قصر شہریار کا جملہ مال و متاع غربا میں تقسیم کر دیا جائے۔

شیریں کے عشق میں اندھا ہو کر شیرویہ نے تمام شرائط کو خوشی

منظور کرلیا محوبان کو محل ماہر پہنایا۔ وہ قصر پرویز جس میں شیریں نے عیش وطرب کی بہت سی راتیں اور دن گزارے تھے چشم زدن میں زمین کے برابر ہموار کردیا گیا تاکہ کسی اور کو اس میں عیش وعشرت کرنے کا موقع نہ مل سکے اور اس کا قیمتی ساز وسامان غربا میں تقسیم کرکے خسرو کی روح کو ثواب پہنچایا گیا۔ اسی طرح خسرو کے قاتل بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ اس کے بعد شیریں خوب بناؤ سنگھار کیے روتی دھوتی خسرو کے جنازے میں شامل ہوئی۔ شیرویہ خوش تھا کہ شیریں نے یہ سب سوانگ اس لئے بھر رکھا ہے کہ دنیا اس پر انگلیاں نہ اٹھائے۔ حقیقت میں وہ بہت خوش ہے اور مجھ سے ملنے کی خوشی میں ٹھاٹ باٹ سے جا رہی ہے۔ جب یہ ماتمی جلوس ایران کے شاہی مقبرے میں پہنچا تو سب لوگ باہر کھڑے ہوگئے اور اندر صرف مجوسی معتمد داخل ہوئے۔ اس ہجوم میں شیریں بھی ایک موبد کے پیچھے چھپی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ سب کی نظر بچا کر مجوسیوں کے ساتھ ہی اندر چلی گئی۔ جب سب لوگ رسوم سے فارغ ہوکر باہر نکل آئے تو شیریں نے اندر سے زنجیر لگائی اور مطمئن ہوکر ایک زہر میں بجھا ہوا خنجر آبدار نکالا۔ پھر خسرو کی لاش کو تابوت سے نکال کر پہلے اس کے سینے سے کپڑا ہٹا کر زخم کو اچھی طرح دیکھا۔ اس کے بعد اس کے قریب لیٹ کر اپنے سینہ پر اتنا ہی بڑا زخم بنایا اور اس طرح سینہ سے سینہ ملالیا کہ اس کے جسم کا سارا خون زخم کے رستے خسرو کے بدن میں اتر گیا۔ اسی حالت میں وہ موت سے ہمکنار ہوگئی۔

اور اس طرح دنیا کا یہ مشہور ترین رومان اختتام پذیر ہوا ــــــ!

ملی ہے دختر رز لڑ جھگڑ کے قاضی سے
گرہ سے کچھ نہیں جاتا ہے پی بھی لے واعظ
جو سیکشی سی ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو

جہاد کرکے جو عورت ملے حرام نہیں
ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں
امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں

منہ مانگی مُراد مل سکتی ہے

ناامید ہونا گناہ عظیم ہے اور مایوس ہونا مردوں کا شیوہ نہیں بصرف ہمت اور کوشش کریں جس طرح مقدمہ میں کسی لائق وکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور بیماری میں حکیم کی شفا و فتح خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پس اگر آپ کسی بھی مشکل و مصیبت میں مبتلا ہیں اور اس کے حل کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی تو مشہور و معروف عامل حکیم کریم الدین کو لکھئے ان کے عملیات روحانی سے مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔ بیماری میں شفا ہوتی ہے۔ مقدمہ میں فتح ہوتی ہے۔ عورت مرد کے ناخوشگوار تعلقات ہوں تو محبت میں بدل جاتے ہیں۔ امتحان میں یقیناً کامیابی ہوتی ہے۔ بشرطیکہ آپ روحانی امداد لیویں۔ ہزارہا بندگان خدا کامیاب ہو چکے ہیں اور علم و عمل کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ مشورہ کی فیس معاف۔ لیکن خط و کتابت جوابی بھیجکر مشورہ لیں۔

دیکھئے دنیا کہتی ہے

کہ عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی۔ انار کلی لاہور۔ اپنے علم و عمل میں ماہر ہیں جناب محمد باقر صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور سابق امرتسر۔ جناب مرزا ظفر علی خاں صاحب جج ہائیکورٹ لاہور۔ جناب میاں جگدیش سنگھ صاحب درجہ اول مجسٹریٹ دہلی۔ جناب شیر چشتی پیر سکند ریاست بہاولپور۔ جناب خان بہادر خاں محمد خاں صاحب ریٹائرڈ سب رجسٹرار آنریری مجسٹریٹ راولپنڈی۔ جناب آغا جعفر ایس ڈی او راولپنڈی حال لاہور پنشنر۔ جناب ملک محمد صاحب پنشنر آئی او ایم کنڈاں ضلع شاہ پور۔ جناب فیض الحق صاحب پیشکار و سپیشل مجسٹریٹ جیوڑ ضلع بلند شہر

علاوہ ازیں لاکھوں افسران و شرفا تحریر فرماتے ہیں کہ عامل حکیم کریم الدین کے علم و عمل کی آزمائش کی آپ اپنے فن میں ماہر ہیں۔ ازحد شریف اور ملنسار ہیں۔ آپ بھی ایک مرتبہ آزمائش کر کے حکیم صاحب کی تعریف کرینگے۔

مینیجر دفتر عامل حکیم کریم الدین۔ انار کلی۔ لاہور

فلمی اطلاعات

از:- فلم بین

پردۂ سیمیں پر

پھر ملیں گے

منروا موویٹون کی تازہ فلم "پھر ملیں گے" جسے مسٹر سہراب مودی ایک شاہکار کی حیثیت دینا چاہتے ہیں آج کل شوٹنگ کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ اداکاروں میں سردار اختر۔ مینا، صادق علی، شکر، ایرچ، تاراپور اور بابو بکر کے نام قابل ذکر ہیں۔

پٹولا

ماڈرن پکچرز کا اولین کارنامہ "پٹولا" زیر تکمیل ہے۔ اس کی ڈائرکشن مسٹر ایل یعقوب اور مسٹر منور ایچ قاسم سرانجام دے رہے ہیں۔ اداکاروں میں خورشید بانو کے علاوہ اردن۔ غوری۔ ارشد گجراتی۔ امیر بانو۔ منور قاسم۔ موہنی۔ چنچل کماری۔ رفیق عربی۔ گجندر گلزار۔ بقل لیطورا۔ ایم فریدا اور گل بیگ وغیرہ کام کر رہے ہیں، سینر یو منور قاسم اور مکالمے لال یعقوب کے ذہن رسا کا نتیجہ ہیں، گانے مسٹر تنویر نقوی اور ارشد گجراتی نے لکھے ہیں بالغرض پٹولا پنجابی زبان کی ایک بے مثل یادگار ہوگی۔

نکھٹو

ڈائریکٹر حیدر شاہ نے اپنی پہلی پنجابی فلم "نکھٹو" نصف کے قریب مکمل کر لی ہے۔ ڈائریکٹر حیدر شاہ کا دعوٰی ہے کہ یہ فلم پنجابی فلموں میں امتیازی شان کی مستحق ہوگی۔ اس فلم میں راج رانی۔ ظہور شاہ۔ فضل شاہ وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ آج کل شاہ صاحب اپنے سٹاف کے ہمراہ سانڈہ کلاں (ضلع لاہور) میں شوٹنگ کر رہے ہیں اس کے بعد سٹوڈیو کا کام شروع ہوگا۔

پردہ نشین

"پردہ نشین" گنگا ٹاکیز لاہور میں دکھائی جا رہی ہے۔ یہ تصویر ہندوستان فلم کارپوریشن کی اولین پیشکش ہے اس کے حقوق تقسیم سکینہ اینڈ کمپنی نے حاصل کر لئے ہیں۔ "پردہ نشین" میں پردہ اور اس کے متعلقہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اداکاروں میں حسینہ۔ کنیز۔ شیدا۔ مترا اور نرگس نے لاجواب کام کیا ہے۔

فضلی برادرز

ڈائریکٹر حسنین کا تازہ ترین شاہکار "چورنگی" کمرۂ تدوین سے باہر آکر نمائش کا منتظر ہے۔ "چورنگی" بیک وقت اردو اور بنگلہ زبانوں میں تیار ہوا ہے۔ اداکاروں میں آہو چشم مہتاب بلبل خوشنوا انیس خاتون۔ فنکار بے نظیر نعیر کاشمیری اور امجد جیسے درخشندہ ستارے موجود ہیں۔ فضلی برادرز کے جدت طراز پبلسٹی آفیسر خواجہ حمید اللہ نے چورنگی کی پبلسٹی شروع کر دی ہے ڈائریکٹر حسنین کی آئندہ فلم بمبئی میں تیار ہوگی۔

راجہ رانی

اترے پکچرز کا دوسرا فلمی شاہکار "راجہ رانی" پربھات سینما لاہور میں عنقریب ریلیز ہونے والا ہے۔ اس فلم نے دوسرے شہروں میں بزنس کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ "راجہ رانی" کا افسانہ مرہٹی کے مشہور فسانہ نگار رپنسپل پی کے اترے نے لکھا ہے اداکاروں میں ومالا۔ مظہر خاں "لیڈنگ رول" لے رہے ہیں۔ گانے نجم الحسن نقوی نے مرتب کئے ہیں یہ فلم واڈیا پیراموونٹ پکچرز کی معرفت ریلیز ہوگی۔

ایک رات

شالیمار پکچرز کی وہ پیشکش جس کا مدت سے انتظار ہو رہا تھا آخر کراچی میں ریلیز ہوگئی۔ اس فلم میں مسٹر ابن نینا کا پارٹ علی الخصوص [illegible] ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نینا اداکاری کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور اس کی نگاہیں کیمرہ کی ہر حرکت کو

نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ "ایک رات" افسانہ محض اوربے جوڑ واقعات کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ سوسائٹی میں رات دن پیش آنے والے حادثات کی ایک جھلک ہے۔ اس کہانی کو مسٹر ڈائریکٹر ضیا احمد نے نرالے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ مکالمے عام فہم اور زبان پاکیزہ ہے۔ شہزادہ ایاز اس تصویر کی کشش انگیز پبلسٹی میں مصروف ہیں۔

سچا سپنا

سیمون آرٹ پروڈکشنز کا اولین فلم "سچا سپنا" تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اس فلمی افسانے میں دیہاتی زندگی کے دلاویز مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ ڈائرکشن مسٹر مادھو کالے کی مرہون منت ہے۔ اداکاروں میں مادھو کالے، آشالتا اور راجکماری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ فلم میسرز پیرس پکچرز بمبئی کی معرفت ریلیز ہو رہا ہے۔

آواز

سرسوتی سینے ٹون کا تازہ ترین معاشرتی شاہکار "آواز" ۲۷ مئی سے بمبئی میں ریلیز ہو چکا ہے۔ اس فلم کو ڈاکٹر ڈی نورانی نے اپنی زیر نگرانی تیار کیا ہے۔ اداکاروں میں مایا بینرجی اور رداسلی کے نام قابل ذکر ہیں۔

جوانی لیکے آیا ہوں

از:-
جناب محمد شرف الدین سلیم علوی

عدم والو نئی اک زندگانی لے کے آیا ہوں
فنا ہو کر حیاتِ جاودانی لیکے آیا ہوں

جو آنسو رات دن آنکھوں سے بہتے ہیں نہیں آنسو
لگی دل کی بجھانے کو میں پانی لیکے آیا ہوں

دلِ مجبور کا ہر داغ چمکے حشر میں یارب
محبت کی یہی ہیں اک نشانی لیکے آیا ہوں

شبِ وعدہ یہ مژدہ لیکے میرا نامہ بر آیا،
وہ آتے ہیں یہ پیغام زبانی لیکے آیا ہوں

خیالِ ہجر مجھ سے کہہ رہا ہے وہ نہ آئینگے
فرشتہ بن کے مرگِ ناگہانی لیکے آیا ہوں

خبر دیتا ہے دنیا کو شباب اٹھتا ہوا اُن کا
مبارک ہو بہارِ نوجوانی لیکے آیا ہوں

[illegible] بھری آنکھوں کا یہ انداز کہتا ہے
سُرور افزا شرابِ ارغوانی لیکے آیا ہوں

فرشتو داورِ محشر کے آگے لے چلو مجھکو
جبیں پر بندگی کی ہیں نشانی لیکے آیا ہوں

شہیدِ ناز ہونا ہے مجھے مرنے سے کیا مطلب
ہمیشہ کیلئے میں زندگانی لیکے آیا ہوں

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۸ فہرست مندرجات ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۲ء نمبر ۲

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱	ملاحظات	ادارہ	۱۰
۲	اخبار و افکار	پروفیسر محمد حسن الاعظمی	۱۱
۳	حقایق و معارف	مولینا شبیر احمد عثمانی	۱۴
۴	تحقیق و تصحیح	پیر غلام دستگیر صاحب نامی	۱۹
۵	نقد و نظر	ادارہ	۸۳
	علمی و ادبی مضامین		
۶	احکام عالمگیری	جناب خالد حسن قادری	۲۷
۷	حافظ ابن قیم الجوزیہ	جناب زاہد الرضوی قصیر	۳۷
۸	عرب کا پہلا نیچرل شاعر	جناب امداد علی مضطر	۵۵
	افسانے اور رومان		
۹	برگد کا بوڑھا درخت	جناب اشتیاق حسین نیوتنوی	۲۲
۱۰	لعل کی چوری	جناب مولوی نور احمد خاں	۳۲
۱۱	ڈاکٹر شوکت	جناب ظفر واسطی شاہ آبادی	۴۳
۱۲	اقرار گناہ	جناب شکیل احمد کندھاپوری	۶۱
	منظومات		
۱۳	شراب طہور	حضرت فصاحت جنگ جلیل	۱۳
۱۴	چاندنی رات	جناب جگر قریشی لودیانوی	۱۸
۱۵	جبر و اختیار	حضرت ماہر القادری	۲۱
۱۶	ہم	جناب تسکین بریلوی	۲۶
۱۷	راز و نیاز	حضرت راز یزدانی رامپوری	۳۱
۱۸	کمال بنا دیا	جناب محمد صابر ضبط	۳۶
۱۹	آجاؤ	جناب حاجی عزیز بنگلوری	۴۰
۲۰	کل رات کو	حضرت حمد رابیہ بنکوی	۴۱
۲۱	باقیات سحر	جناب منشی سراج الدین سحر	۵۲
۲۲	شاخ نبات	حضرت جگر کاظمی	۵۳
۲۳	دل کی آواز	جناب ظفر واسطی	۵۴
۲۴	شہزادی زیب النساء کا مزار کہاں ہے؟	حضرت سیماب اکبرآبادی	۵۸
۲۵	اعزازات	جناب محمد البلیس شفق	۷۰
۲۶	شکوۂ التفات	حضرت عاصم جے پوری	۷۴

۲۷ - اعتبارات .... حضرت دل شاہجہانپوری ۷۸

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا

مُلاحظات

خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ "سالانہ نمبر" ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر مقبول ہوا۔ کاغذ اور سامانِ طباعت کی گرانی کے باوجود "سالانہ نمبر" کو ہر جہت سے بلند پایہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ الحمد للہ کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ ہم اُن حضرات کے تہہ دل سے ممنون ہیں جنھوں نے خطوط کے ذریعہ سے "سالانہ نمبر" پر حوصلہ افزا تبصرے کئے اور ہماری ہمت بڑھائی۔ تعریفی خطوط کا اس وقت بھی دفتر میں تانتا بندھا ہوا ہے۔ اگر ہم اُن کا خلاصہ بھی پیش کرنا چاہیں تو عالمگیر کے متعدد صفحات درکار ہیں۔ ہم اپنے کرمفرماؤں کو یقین دلاتے ہیں کہ موجودہ مشکلات کے باوجود عالمگیر کی اٹھارہ سالہ روایات کو ہر ممکن طریقے سے برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائیگا۔

زیرِ نظر اشاعت میں "اخبار و افکار" کے تحت پروفیسر محمد حسن الاعظمی نے جامعۂ پنجاب کے اربابِ بست و کشاد کی توجہ ایک اہم امر کی جانب مبذول کی ہے۔ کالجوں، سکولوں اور یونیورسٹیوں میں عربی سے جس تغافل و بے پروائی کا ثبوت دیا جا رہا ہے وہ محتاجِ تصریح نہیں۔ لہٰذا ہمیں امید ہے کہ اعظمی صاحب کی آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمی جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل ہیں اور تعلیم و تدریس کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ہندوستان کے مسائلِ تعلیم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا آپ کی رائے کے صائب اور وقیع ہونے میں شبہ کی گنجایش نہیں۔ "حقائق و معارف" میں مولینا شبیر احمد عثمانی دیوبندی کا ایک عالمانہ مقالہ درج کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ نے قرآن و احادیث کی روشنی میں بتایا ہے کہ رُوح کیا چیز ہے اور اس کی ماہیت و حقیقت کیا ہے؟ مولینا کے تبحرِ علمی کے متعلق کچھ کہنا دوپہر کے سورج کو ٹمٹماتا ہوا چراغ دکھانے کے مرادف ہے۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ

زیرِ نظر اشاعت

از ——— ادارہ

اہلِ علم اس مقالہ سے مستفید ہوں گے۔ جناب خالد حسن قادری نے "احکامِ عالمگیری" کے بعض دلچسپ اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب فارسی میں تو نایاب ہے۔ البتہ ۱۹۱۲ء میں سر جادو ناتھ سرکار نے اسے انگریزی کا لباس پہنایا تھا۔ چنانچہ خالد صاحب اُسی ترجمہ کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ ترجمہ در ترجمہ سے بعض اوقات مفہوم خبط ہو جاتا ہے۔ لیکن خالد صاحب اپنے ترجمہ میں حتی الوسع احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔ لہٰذا اُن کی مساعی لائقِ داد ہیں۔ جناب زاہد الرضوی قیصر نے علم و تحقیق کی روشنی میں کتاب "التقدیر" کے فاضل مصنف حافظ ابن قیم الجوزیہ کی زندگی کا جائزہ لیا ہے اور ان کی گرانقدر تصانیف پر محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ جناب امداد علی مضطر نے عرب کے بذلہ سنج شاعر ابو دلالہ کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات پیش کئے ہیں۔

افسانوں میں جناب انتصار حسین نیوتنوی کا افسانہ "برگد کا بوڑھا درخت" اپنی دلگداز کیفیات کے باعث امتیازی شان کا مالک ہے۔ ماحول نگاری، نفسیاتی اشاروں اور کردار نویسی کے اعتبار سے یہ افسانہ خاص طور پر جاذبِ توجہ ہے۔ جناب مولوی نور احمد خاں عام طور پر محققانہ تاریخی مقالات کے لئے شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن اس مرتبہ آپ نے ایک تاریخی افسانہ لکھکر اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیا ہے۔ افسانہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ "ڈاکٹر شوکت" جناب ظفر واسطی کا ایک دلکش اور رومان پرور افسانہ ہے جو "سالانہ نمبر" کے لئے موصول ہوا تھا۔ لیکن افسوس! قلتِ گنجایش کے باعث اُس میں درج نہ ہو سکا۔ "ڈاکٹر شوکت" جذبات و احساسات اور نفسی کوائف کی تصویر کشی کے اعتبار سے ایک بلند پایہ افسانہ ہے۔ جناب جمیل احمد کندہ پانچوی نے ای۔ ایف بنسن کے ایک پُراسرار افسانے کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ جناب جمیل احمد کی مترجمانہ صلاحیت کے متعلق کچھ کہنا بیسود ہے۔ کیونکہ آپ سینکڑوں معرکہ آرا افسانے انگریزی سے اُردو میں منتقل کر کے باذوق حلقوں میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

حصۂ نظم قدیم و جدید اسالیب کا آئینہ دار ہے۔

اخبار و افکار

ہماری یونیورسٹیاں اور عربی

از جناب پروفیسر محمد حسن الاعظمی عالم ازہر یونیورسٹی

اکثر دیکھا گیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اور ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے طلبہ مولوی فاضل اور ایم اے (عربی) پاس کر لینے کے بعد بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ عربی کے چند جملے بول سکیں یا کم از کم لکھ ہی سکیں ان کی زبوں حالی پر بہت افسوس ہوتا ہے ان کی عمر کا بہترین حصہ اس تعلیم کے حصول میں صرف ہو گیا لیکن صحیح معنوں میں انھیں تعلیم حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ ان کے والدین کا جس قدر مالی نقصان ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

ان کی جہالت کا سب سے بڑا سبب یونیورسٹی کی بے اعتنائی ہے۔ جو نصاب یونیورسٹی نے رائج کر رکھے ہیں وہ از حد غیر مفید بلکہ مضر ہیں طلبہ کے علم میں ان سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ موجودہ عربی علوم سے یونیورسٹی کے نصاب قطعاً مبرا ہیں۔ عربی علوم نے جس قدر ترقی گزشتہ نصف صدی میں کی ہے اس سے طلبہ بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ کیونکہ انہیں موجودہ دور کی کوئی کتاب پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ مثال کے طور پر ایم اے (عربی) کا ایم اے (انگریزی) سے مقابلہ کیجئے اور دیکھئے کہ دونوں جماعتوں کے نصاب میں کس قدر فرق ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو طلبہ عربی ایم اے میں اوّل درجہ حاصل کرتے ہیں وہ عموماً اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے سے ناکام رہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں تعلیم و تدریس کا طریقہ بالکل غلط ہے طلبہ کو چند جملوں سے بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ لیکن انہیں صرف نحو پڑھائی جانے لگتی ہے۔ پھر صرف نحو کی جو کتب یہاں رائج ہیں یا تو وہ ہندوستانیوں کی لکھی ہوئی ہیں یا ایرانیوں کی جنھیں صحیح طور پر عربی داں نہیں کہا جا سکتا۔ جب اہل زبان کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہوں تو ہندوستانی یا ایرانی علما کی ناتمام کوششوں کو معیار بنا لینا انصاف سے بعید ہے۔

پھر ادب کی موجودہ کتب پر غور فرمائیں "حماسہ" و "مقامات حریری" وغیرہ اگرچہ ادب عربی کے زندہ جاوید شاہکار ہیں۔ لیکن ان کا درجہ موجودہ زمانہ میں ایسا ہی ہے جیسا کہ انگریزی ادب میں قدیم کلاسکس کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو زبان شیکسپیئر اور اس کے معاصرین کے استعمال میں تھی وہ آج کل کی مروّجہ زبان سے بالکل بالکل مختلف ہے۔ یہاں یہ کتب (حماسہ و مقامات حریری) صرف ان لوگوں کے لئے مفید ہیں جو زبان سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہوں۔ اور عربی ادب کے گہرے مطالعہ کے خواہشمند ہوں۔ یہی حال طرماح اور طفیل کے دیوانوں کا ہے۔ جن میں بہت سی متروک ترکیبیں اور الفاظ ہیں نصاب کمیٹی کو لازم ہے کہ اگر قدیم عربی ادب کو رکھے تو موجودہ عربی ادب کو نظر انداز نہ کرے تاکہ طلبہ کو معلوم ہو جائے کہ آج کل ادب میں کیا کیا روشیں ہیں۔ اور شاعری کا کیا معیار ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں نے عربی کو تباہ کرنے کے لئے یہ نصاب رکھا ہوا ہے۔ عربی کوئی مُردہ زبان نہیں بلکہ اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ممالک کی مروّجہ زبان ہے اور عالم اسلامی کی مذہبی، سیاسی اور ثقافتی (کلچرل) زبان یہی ہے اور یہی رہے گی۔ اس کے ساتھ یہ سلوک نہایت ہی ناخوشگوار اور غیر منصفانہ ہے۔

مولوی فاضل میں منطق، فلسفہ اور بلاغة کی چند فضول کتابیں رائج کی گئی ہیں۔ حالانکہ عالم عربی میں ایسی کتب کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ ادب جو سب سے زیادہ اہم ہے نصاب کا تیسرا حصہ ہے لیکن منطق و فلسفہ جو آج سے چار ہزار سال پہلے یونانیوں نے پیش کیا تھا۔ یہاں کے طلبہ کے نصاب کا اہم حصہ ہے۔ یہ یونانی نظریات آج کل آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ مہذب دنیا میں ان نظریات کا کوئی عملی فائدہ نہیں اور ان کو بالکل ترک کر دینا یقیناً نقصان دہ نہیں ہے۔ اگر ان کا پڑھانا ہی ضروری ہو تو موجودہ زمانہ کی لکھی کوئی قدیم فلسفہ و منطق کی تاریخ ان کی جگہ پڑھائی جائے ایسی کتابیں قاہرہ میں کم نہیں ہیں یا ان کا اردو ترجمہ پیش کیا جائے اگر انہی کی جگہ موجودہ دور کی سائنس اور فلسفہ کی کتب رکھی جائیں (جن کی تعداد کم نہیں) تو کیا ہی اچھا ہو۔ قاہرہ جاتے ہوئے میرے ہمراہ اتفاق سے یہاں کی ایک فلسفہ و منطق کی کتاب چلی گئی میں نے وہ کتاب مصر کے ادبا کے سامنے پیش کی وہ کہنے لگے کہ ان کے الفاظ تو عربی ہیں۔ لیکن ہم ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

فلسفۂ منطق اور قدیم معانی و بلاغت پر کتب جو قطعاً موجودہ دور میں لایعنی ہیں۔ ان کے بجائے تاریخ، ثقافت، اخلاق اور موجودہ عربی پر کتب مقرر کی جائیں تاکہ طلبہ اسلامیات اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے پوری طرح آگاہ رہیں اور اسلامی تبلیغ و اشاعت میں حصہ لے سکیں۔ بعض لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ نصاب اس لئے رائج ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ یورپ والوں نے کیا ہے۔ لہذا اساتذہ کو ان کے پڑھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اس سے ظاہر ہے عربی سے ہماری یونیورسٹیوں کو کوئی دلچسپی نہیں بلکہ یورپ کی تقلید کو فخر سمجھا جاتا ہے۔

اس ناقص نظام کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ یہاں کے اساتذہ بھی عربی سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ باوجود عربی دانی کے دعوےٰ کے ہندوستانی علما نے گزشتہ پچاس برس میں عربی زبان میں ایک کتاب بھی ایسی پیش نہیں کی جس کو عالم عربی میں کوئی وقعت حاصل ہو۔ یہی مولوی فاضل اور ایم اے عربی کے طلبہ جو عربی کے دو چار جملے بھی لکھ بول نہیں سکتے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد استاد بن جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے علم ہی کے مطابق پڑھا سکیں گے اور جو چیزیں وہ پڑھتے ہیں وہی پڑھا دیتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں نہ بہ خود سمجھتے ہیں۔ نہ وہ اپنے طلبہ کو سمجھا سکتے ہیں۔ اگر نظام کو تبدیل کر دیا جائے تو ایسے اساتذہ کو ضرور رنج ہوگا۔ کیونکہ انہیں نئی نئی کتب پڑھانی پڑیں گی جو انہوں نے خود بھی نہیں پڑھیں اور ان کے سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں نصاب تعلیم تبدیل ہوتا نظر نہیں آتا اور یہ حضرات تبدیلی کے نام سے کانپ اٹھتے ہیں۔

مصر کی یونیورسٹیوں مثلاً جامع ازہر، جامعہ مصریہ اور دار العلوم العلیا میں مدتوں کے تجربہ کے بعد نظام تعلیم موجودہ طریقہ پر لایا گیا ہے۔ وہاں ہر سال کوئی نہ کوئی اہم تبدیلی عمل میں لائی جاتی ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ ان یونیورسٹیوں سے پورا استفادہ کریں لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان کتب کو پڑھائے کون؟ کیونکہ ان کے ترجمے انگریزی یا اردو میں شائع نہیں ہوئے۔

بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارا اصلی مقصد عربی ادب سیکھنا نہیں بلکہ ہمارا مقصد تو صرف دین کو سمجھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات برسرِ حق نہیں۔ اگر فی الواقعہ ان کا یہی مقصد ہے تو پھر مقامات حریری، دیوان طرماح، طفیل اور حماسہ پڑھانے کی یا پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کتب تو عربی کے ادب قدیم کی ہیں اور ان سے نہ ہی ادب و زبان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی ان میں اصول فقہ یا کلام ربانی کی تفسیر ہے۔ لہذا یہ کوئی دلیل نہیں اور محض ایک بیجا اعتراض ہے۔

بعض حضرات اساتذہ کی قابلیت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کے فرائض ان کی استطاعت سے زیادہ ہوتے ہیں یا وہ ایسے مضامین پڑھانے پر مامور کئے جاتے ہیں جو ان کے لئے دلچسپ نہیں ہوتے۔ بظاہر وہ لوگ اپنا فرض تو ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن جب تک استاد اپنے موضوع میں دلچسپی نہ لیتا ہو شاگرد کس طرح دلچسپی لے سکتے ہیں یہ ایک نہایت معیوب بات ہے۔ ہر استاد صرف وہی مضامین پڑھانے پر مامور کیا جائے جن کا وہ اہل ہو۔ نیز ہماری گزارش ہے کہ بعض اساتذہ سے کام کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے اور انہیں اپنے مضامین میں ریسرچ اور مطالعہ کا کامل موقعہ دیا جائے۔

اگر صحیح معنوں میں عربی کی تعلیم دینا مقصود ہے تو ہماری یونیورسٹی کو چاہئے کہ اعلیٰ جماعتوں کے لئے ذریعہ تعلیم و تدریس (Medium) بھی عربی ہی میں ہو۔ جس طرح سنسکرت ہندو لوگ صرف سنسکرت ہی میں پڑھاتے ہیں۔ لہذا یونیورسٹی کو چاہئے کہ ایسے ماہر استاد مقرر کرے جو عربی میں تعلیم دے سکیں۔ تعجب ہے کہ قاہرہ میں تو انگریزی، فرنچ وغیرہ بذریعہ عربی پڑھائی جائیں اور ہم عربی بذریعہ انگریزی پڑھیں!

اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء میں میں نے چند کتابوں کی طرف اپنے عربی مضمون میں اشارہ کیا ہے اگر یونیورسٹی چاہے تو ان سے فائدہ اٹھائے اور بعض درسی کتب ہم تصنیف بھی کر رہے ہیں۔ ان کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ اگر یونیورسٹی کا ارادہ کوئی عملی اقدام کرنے کا ہے تو بہت سی مفید اصلاحات پیش کی جا سکتی ہیں۔

عالمگیر ماہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں

شائع ہونے والے مضامین کی ایک مختصر فہرست

اسی اشاعت کے صفحہ ۷۵ پر ملاحظہ کیجئے

شرابِ طہور

وہ آ گئے تو مجھے کیا کسی کو ہوش نہ تھا

از فصاحت جنگ حضرت جلیل مد ظلہ

فغاں کا شور نہ تھا اشکِ غم کا جوش نہ تھا — وہ آ گئے تو مجھے کیا کسی کو ہوش نہ تھا

بڑھا سرور تو دیکھا یہ بزمِ صہبا میں — سبو تھا جام تھا مینا تھا بادہ نوش نہ تھا

نثار میں تری نیرنگیٔ تغافل کے — جفا تو یاد تھی لیکن وفا کا ہوش نہ تھا

نہ پوچھئے دمِ نظّارہ ہم پہ کیا گزری — مثالِ آئینہ آنکھیں کھلی تھیں ہوش نہ تھا

ملا جہاں میں شرابِ طہور کا ساغر — ہر ایک کو بجز اس کے جو بادہ نوش نہ تھا

دکانِ مے پہ پہنچ کر کھلی حقیقتِ حال — حیات بیچ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

بڑے مزے سے اسیروں نے کی بسر صیّاد — چمن کی یاد تھی دامِ قفس کا ہوش نہ تھا

مآلِ جامہ دری کیا کہوں کہ صحرا میں — بجز غبار کوئی اور پردہ پوش نہ تھا

کیا جلیل کو یاروں نے مفت میں بدنام
وہ اپنے حال میں تھا مست بادہ نوش نہ تھا

شفیق قادری

حقائق و معارف

وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ (پ ۱۵ ع ۱۰) اور سوال کرتے ہیں تجھ سے رُوح کی نسبت۔ یعنی رُوح انسانی کیا چیز ہے۔ اس کی ماہیت و حقیقت کیا ہے؟ یہ سوال صحیحین کی روایت کے مطابق یہود مدینہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزمانے کو کیا تھا۔ اور سیر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں قریش نے یہود کے مشورہ سے یہ سوال کیا تھا۔ اسی لئے آیت کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ نزول متعدد ہوا ہو۔ واللہ اعلم۔ یہاں اس سوال کو درج کرنے سے غالباً یہ مقصود ہوگا کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی ان لوگوں کو ضرورت ہے۔ اُدھر سے تو اعراض کرتے ہیں اور غیر ضروری مسائل میں ازراہ تعنت و عناد جھگڑتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ وحی قرآنی کی روسے باطنی زندگی حاصل کرتے اور اس نسخہ شفا سے فائدہ اٹھاتے۔ مگر انہیں دور از کار معاندانہ بحثوں سے فرصت کہاں؟

رُوح کیا چیز ہے؟ جوہر ہے یا عرض۔ مادّی ہے یا مجرد، بسیط ہے یا مرکب اس قسم کے غامض اور بے ضرورت مسائل سمجھنے پر نہ نجات موقوف ہے۔ نہ یہ چیزیں انبیاء کے فرائض تبلیغ میں داخل ہیں۔ بڑے بڑے حکما اور فلاسفر آج تک خود مادہ کی حقیقت سے مطلع نہ ہو سکے۔ رُوح جو بہرحال مادہ سے کہیں زیادہ لطیف و خفی ہے۔ اس کی ماہیت و کنہ تک پہنچنے کی پھر کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔ مشرکین مکہ کی جہالت اور یہود مدینہ کی اسرائیلیات کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ جو قوم موٹی موٹی باتوں اور واضح حقائق کو نہیں سمجھ سکتی رُوح کی حقائق پر دسترس پانے کی کیا خاک استعداد و اہلیت رکھتی ہوگی ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی ؛ کہ با آسمان نیز پرداختی

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (کہدے رُوح میرے رب کے حکم سے ہے)

موضح القرآن میں ہے کہ حضرت کے آزمانے کو یہود نے پوچھا۔ سو اللہ تعالیٰ نے (کھول کر) نہ بتایا۔ کیونکہ ان کو سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ آگے پیغمبروں نے بھی خلق سے اتنی باریک باتیں نہیں کہیں۔ اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی۔ وہ جی اُٹھا جب نکل گئی۔ وہ مر گیا۔

الرُّوحُ فی القرآن

از حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی دیوبندی

حق تعالےٰ کا کلام اپنے اندر عجیب و غریب اعجاز رکھتا ہے رُوح کے متعلق یہاں جو کچھ فرمایا۔ اس کا سطحی مضمون عوام اور قاصر الفہم یا کجرو معاندین کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس سطح کے نیچے، انہی مختصر الفاظ کی تہ میں رُوح کے متعلق وہ بصیرت افروز حقائق مستور ہیں جو بڑے سے بڑے عالی دماغ نکتہ رس فلسفی اور ایک عارف کامل کی راہ طلب و تحقیق میں چراغ ہدایت کا کام دیتی ہے۔ رُوح کے متعلق عہد قدیم سے جو سلسلہ تحقیقات کا جاری ہے۔ آج تک ختم نہیں ہوا۔ اور نہ شاید ہو سکے۔ رُوح کی اصلی کنہ و حقیقت تک پہنچنے کا دعویٰ تو بہت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ ابھی تک کتنی ہی محسوسات ہیں۔ جن کی کنہ و حقیقت معلوم کرنے سے عاجز رہے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک آیات قرآنیہ سے رُوح کے متعلق چند نظریات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔

(۱) انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ کوئی اور چیز موجود ہے جسے رُوح کہتے ہیں۔ وہ عالم امر کی چیز ہے اور خدا کے حکم سے فائز ہوتی ہے۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (بنی اسرائیل) خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران) ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (المومنون)

(۲) رُوح کی صفات علم و شعور وغیرہ بتدریج کمال کو پہنچتی ہیں اور ارواح میں حصول کمال کے اعتبار سے بے حد تفاوت اور فرق مراتب ہے۔ حتیٰ کہ خدا تعالےٰ کی تربیت سے ایک رُوح ایسے بلند و اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں دوسری ارواح کی قطعاً رسائی نہ ہو سکے جیسے رُوح محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہمارا اعتقاد ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ میں امر کی اضافت رب کی طرف اور رب کی یا متکلم کی طرف جس سے مراد

نبی کریم صلعم ہیں۔ اسی طرف مشیر ہے۔ کیونکہ امام راغبؒ کی تصریح کے مطابق رب اسی ہستی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو بتدریج حدِ کمال تک پہنچائے جہاں تک پہنچنے کی اس میں استعداد پائی جاتی ہو۔ چنانچہ دیکھو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ و اکمل استعداد کے مطابق اللہ تعالٰے نے آپ کو حسی و معنوی ہر حیثیت سے کس قدر بلند مقام پر پہنچایا۔ آپ کو علوم و معارف سے بھری ہوئی وہ کتاب مرحمت فرمائی جس کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں:-

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ الخ

اور حسی طور پر آپ کو شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ سے بھی اوپر لے گئے۔ جہاں تک کسی نبی یا فرشتہ کو عروج میسر نہ ہوا تھا۔

(۳) مگر روح کے یہ کمالات ذاتی نہیں وہاب حقیقی کے عطا کئے ہوئے اور محدود ہیں۔ چنانچہ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا سے معلوم ہوا کہ علم کسی اور کا دیا ہوا ہے اور جو علم تم کو دیا گیا وہ سب دینے والے کے علم کے سامنے نہایت قلیل و محدود ہے قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (الکہف) وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ (لقمان) اسی طرح آگے مشرکین کے قول لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا الخ کے جواب میں قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا فرمانا اس کی دلیل ہے۔ کہ علم کی طرح بشر کی قدرت بھی بہرحال محدود و مستعار ہے۔

(۴) روحِ انسانی خواہ علم و قدرت وغیرہ صفات میں کتنی ہی ترقی کر جائے حتیٰ کہ اپنے تمام ہم جنسوں سے گوئے سبقت لے جائے۔ پھر بھی اس کی صفات محدود رہتی ہیں۔ صفاتِ باری کی طرح لامحدود نہیں ہو جاتیں اور یہی بڑی دلیل اس کی ہے کہ روح خدا سے علیحدہ کوئی قدیم غیر مخلوق ہستی نہیں ہو سکتی۔ ورنہ تحدید کہاں سے آئی۔

(۵) کتنی ہی بڑی کامل روح ہو۔ حق تعالٰے کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس وقت چاہے۔ اس سے کمالات سلب کر لے۔ گو اس کے فضل و رحمت سے کبھی ایسا کرنے کی نوبت نہ آئے۔ یدل علیہ قولہ تعالٰے

وَلَئِن شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا۔

یہ چند اصول جو ہم نے بیان کئے اہلِ فہم کو آیات میں تامل کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ صرف عالمِ امر کا لفظ ہے جس کی مناسب تشریح ضروری ہے اور جس کے سمجھنے سے امید ہے کہ روح کی معرفت حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

لفظ امر قرآن میں بیسیوں جگہ وارد ہوا ہے۔ اور اس کے معنی میں علما نے کافی کلام کیا ہے۔ لیکن ہماری غرض سورۂ اعراف کی آیت أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ جہاں امر کو خلق کے مقابل رکھا ہے۔ جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خدا کے یہاں دو مد بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک امر اور دوسرا خلق۔

دونوں میں کیا فرق ہے۔ اس کو ہم سیاقِ آیات سے بسہولت سمجھ سکتے ہیں۔ پہلے فرمایا إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ یہ تو خلق ہوا۔ درمیان میں اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ کا ذکر کر کے جو شانِ حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے۔ فرمایا يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ یعنی ان مخلوقات کو ایک معین نظام پر چلاتے رہنا۔ جسے تدبیر و تصریف کہہ سکتے ہیں۔ یہ امر ہوا۔ اسی طرح سورۂ طلاق میں ارشاد ہے اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ۔

گویا دنیا کی مثال ایک بڑے کارخانہ کی سمجھو۔ جس میں مختلف قسم کی مشینیں لگی ہوں۔ کوئی کپڑا بن رہی ہے۔ کوئی آٹا پیستی ہے۔ کوئی کتابیں چھاپتی ہے۔ کوئی شہر میں روشنی پہنچا رہی ہے۔ کسی سے پنکھے چل رہے ہیں۔ وغیرہ ذالک۔

ہر ایک مشین میں بہت سے پرزے ہیں۔ جو مشین کی غرض و غایت کا لحاظ کر کے ایک معین اندازے سے ڈھالے جاتے اور لگائے جاتے ہیں۔ پھر سب پرزے جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جاتا ہے۔ جب تمام مشینیں فٹ ہو کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تب الیکٹرک (بجلی) کے خزانہ سے ہر مشین کی طرف جدا جدا راستہ سے کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آن واحد میں ساکن و خاموش مشینیں اپنی اپنی ساخت کے مطابق گھومنے اور کام کرنے لگ جاتی ہیں۔ بجلی ہر مشین اور ہر پرزہ کو اس کی مخصوص ساخت اور غرض کے مطابق گھماتی ہے۔ حتیٰ کہ جو قلیل و کثیر کہربا روشنی کے لیمپوں اور قمقموں میں پہنچتی ہے۔ وہاں پہنچ کر انہی قمقموں کی ہیئت اور رنگت اختیار کر لیتی ہے۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ مشین کا ڈھانچہ

تیار کرنا۔ اس کے پرزوں کا ٹھیک انداز پر رکھنا۔ پھر فٹ کرنا ایک سلسلہ کے کام ہیں۔ جن کی تکمیل کے بعد مشین کو چالو کرنے کے لئے ایک دوسری چیز بجلی یا اسٹیم اس کے خزانہ سے لانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالےٰ نے اوّل آسمان و زمین کی مشینیں بنائیں جس کو خلق کہتے ہیں۔ پھر چھوٹا بڑا پرزہ ٹھیک اندازہ کے مطابق تیار کیا۔ جس کو تقدیر کہا گیا ہے "قدّرہٗ تقدیراً" پھر سب کل پرزوں کو جوڑ کر مشین کو فٹ کیا۔ جسے تصویر و تسویہ کہتے ہیں۔ خلقکم ثمّ صوّرکم اور فاذا سوّیتہٗ و نفخت فیہ۔ یہ سب افعال خلق کے مد میں تھے۔

اب ضرورت تھی کہ بن مشین کو جس کام میں لگانا ہے لگایا جائے مشین کو چالو کرنے کے لئے امر الٰہی کی بجلی چھوڑ دی گئی۔ شاید امر کا تعلق اسم باری سے ہے الخالق البارئ المصوّر و فی الحدیث خلق الجنۃ و برأ النسمۃ و فی صورۃ الحدید من قبل ان نبرأھا الی النفوس کما ھو مروی عن ابن عباس و قتادہ و الحسن۔

غرض اُدھر سے حکم ہوا "چل" فوراً چلنے لگی۔ اسی امر الٰہی کو فرمایا انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون (یٰس) دوسری جگہ نہایت وضاحت کے ساتھ "امر کن" کو خلق جسد پر مترتب کرتے ہوئے ارشاد ہوا خلقہٗ من تراب ثم قال لہٗ کن فیکون (آل عمران) بلکہ تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں کن فیکون کا مضمون جتنے مواضع میں آیا عموماً خلق و ابداع کے ذکر کے بعد آیا ہے جس سے خیال گزرتا ہے کہ کلمہ کن کا خطاب خلق کے بعد تدبیر و تصریف وغیرہ کے لئے ہوتا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امر کے معنی یہاں حکم کے ہیں۔ اور وہ حکم یہی ہے۔ جسے لفظ کن سے تعبیر کیا گیا اور کن جنس کلام سے ہے۔ جو حق تعالےٰ کی صفت قدیمہ ہے۔ جس طرح ہم اس کی تمام صفات (مثلاً حیات، سمع، بصر وغیرہ) کو بلا کیف تسلیم کرتے ہیں۔ کلام اللہ و کلمۃ اللہ کے متعلق بھی یہی مسلک رکھنا چاہئیے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ رُوح کے ساتھ اکثر جگہ قرآن میں امر کا لفظ استعمال ہوا ہے قل الرّوح من امر ربّی و کذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا۔ یلقی الرّوح من امرہٖ علیٰ من یشاء من عبادہٖ۔ اور پہلے گزر چکا کہ امر عبارت ہے کلمہ کن سے یعنی وہ کلام انشائی جس سے مخلوقات کی تدبیر و تصریف اس طریقہ پر کی جائے۔ جس پر غرض ایجاد و تکوین مرتب ہو۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ رُوح کا مبدا

حق تعالےٰ کی صفت قدیم کلام ہے۔ جو صفت علم و حیات کے ماتحت ہے۔ شاید اسی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے نفخت فیہ من روحی میں اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ کیونکہ کلام اور امر کی نسبت متکلم و امر سے صادر و مصدر کی ہوتی ہے۔ مخلوق و خالق کی نہیں ہوتی۔ اسی لئے الا لہ الخلق والامر میں امر کو خلق کے مقابل رکھا۔ ہاں یہ امر کن باری تعالےٰ شانہ سے صادر ہو کر ممکن ہے۔ کہ جوہر مجرد کے لباس میں یا ایک مَلَک اکبر اور روح اعظم کی صورت میں ظہور پکڑے۔ جس کا ذکر بعض آثار میں ہوا ہے۔ اور جسے کہر بلیہ روحیہ کا خزانہ کہہ سکتے ہیں۔ گویا یہیں سے روح حیات کی لہریں دنیا کی ذوی الارواح پر تقسیم کی جاتی ہیں اور الارواح جنود مجندۃ انہی کے بے شمار تاروں کا یہی کنکشن ہوتا ہے۔

اب جو کرنٹ چھوٹی بڑی مشینوں کی طرف چھوڑا جاتا ہے۔ وہ ہر مشین سے اس کی بناوٹ اور استعداد کے مطابق کام لیتا اور اس کی ساخت کے مناسب حرکت دیتا ہے۔ بلکہ بن لیمپوں اور قمقموں میں یہ بجلی پہنچتی ہے۔ انہی کے مناسب رنگ و ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔

رہی یہ بات کہ کن (یعنی امر) کا حکم جو قسم کلام سے ہے، جوہر مجرد یا جسم نورانی لطیف کی شکل کیونکر اختیار کر سکتا ہے۔ اسے یوں سمجھ لو۔ کہ تمام عقلا اس پر متفق ہیں کہ ہم خواب میں جو اشکال و صور دیکھتے ہیں بعض اوقات وہ محض ہمارے خیالات ہوتے ہیں۔ جو دریا، پہاڑ، شیر، چیتے وغیرہ کی شکلوں میں نظر آتے ہیں۔

اب غور کرنے کا مقام ہے کہ خیالات جو اعراض ہیں۔ اور دماغ کے ساتھ قائم ہیں۔ وہ جواہر و اجسام کیوں کر بن گئے۔ اور کس طرح ان میں اجسام کے لوازم و خواص پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ خواب دیکھنے والے سے بیدار ہونے کے بعد بھی یہ آثار و لوازم جدا نہیں ہوتے۔

فی الحقیقت خدا تعالےٰ نے ہر انسان کو خواب کے ذریعہ سے بہت بڑی ہدایت کی ہے کہ جب ایک آدمی کی قوت مصوّرہ اس نے اس قدر طاقت رکھی ہے۔ کہ وہ اپنی بساط کے مطابق غیر مجسّم خیالات کو جسمی سانچہ میں ڈھال لے۔ اور ان میں وہی خواص و آثار باذن اللہ پیدا کر لے۔ جو عالم بیداری میں اجسام سے وابستہ تھے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ وہ خیالات خواب دیکھنے والے کے دماغ سے ایک منٹ کے لئے بھی علیحدہ نہیں ہوتے۔ ان کا ذہنی وجود بدستور قائم ہے۔ تو کیا اس حقیر نمونہ کو دیکھ کر ہم اتنا نہیں سمجھ

سکتے۔ کہ ممکن ہے قادر مطلق اور مصور برحق جل وعلا کا امر بے کیف وکم یا وجود منفرد قائمہ بذاتہ تعالیٰ ہونے کے کسی ایک یا متعدد صورتوں میں جلوہ گر ہوجائے۔ ان صورتوں کو ہم ارواح یا فرشتے یا کسی اور نام سے پکاریں۔

وہ ارواح و ملائکہ وغیرہ سب حادث ہوں۔ اور امر الٰہی بحالہ قائم رہے۔ امکان و حدوث کے احکام و آثار ارواح وغیرہ تک محدود رہیں۔ اور امر الٰہی ان سے پاک و برتر ہو۔ جیسے جو صورت خیالیہ بحالت خواب مثلاً آگ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس صورت ناریہ میں احراق، سوزش، گرمی وغیرہ سب آثار ہم محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ اس آگ کا تصور سالہا سال بھی دماغوں میں رہے تو ہمیں ایک لمحہ کے لئے یہ آثار محسوس نہیں ہوتے۔

پس کوئی شبہ نہیں کہ روح انسانی خواہ جوہر مجرد ہو یا جسم لطیف نورانی امر ربی کا مظہر ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ مظہر کے تمام احکام و آثار ظاہر پر جاری ہوں۔ کما ہو الظاہر۔

واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے لکھا اور جو مثالیں پیش کیں۔ ان سے مقصود محض تسہیل و تقریب الی الفہم ہے ورنہ ایسی کوئی مثال دستیاب نہیں ہوسکتی۔ جو ان حقائق غیبیہ پر پوری طرح منطبق ہو سکے

اے برون از وہم و قیل و قال من ٭ خاک بر فرق من و تمثیل من

رہا یہ مسئلہ کہ روح جوہر مجرد ہے۔ جیسا کہ اکثر حکمائے قدیم اور صوفیہ کا مذہب ہے۔ یا جسم نورانی لطیف جیسا کہ جمہور اہل حدیث کی رائے ہے۔ اس میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب اطال اللہ بقاءہ نے فرمایا۔ کہ بالفاظ عارف جامی یہاں تین چیزیں ہیں

۱۔ وہ جواہر جن میں مادہ اور کمیت دونوں ہوں۔ جیسے ہمارے ابدان مادیہ۔

۲۔ وہ جواہر جن میں مادہ نہیں صرف کمیت ہے جنہیں صوفیہ اجسام مثالیہ کہتے ہیں۔

۳۔ وہ جواہر جو مادہ کمیت دونوں سے خالی ہوں۔ جنہیں صوفیہ ارواح یا حکما جواہر مجردہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

پس جمہور اہل شرع جس کو روح کہتے ہیں۔ وہ صوفیہ کے نزدیک بدن مثالی سے موسوم ہے جو بدن مادی میں حلول کرتا ہے اور بدن مادی کی طرح آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ اعضا رکھتا ہے۔

یہ روح بدن مادی سے کبھی جدا ہوجاتی ہے۔ اور اس جدائی کی حالت میں بھی ایک طرح کا مجہول الکیفیت علاقہ بدن کے ساتھ قائم رکھتی ہے۔ جس سے بدن پر حالت موت طاری نہیں ہونے پاتی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کے مطابق جو بغوی نے اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اس وقت روح علیحدہ رہتی ہے۔ مگر اس کی شعاع جسد میں پہنچ کر بقاء حیات کا سبب بنتی ہے۔ جیسے آفتاب لاکھوں شعاعوں کے ذریعہ زمین گرم رکھتا ہے یا جیسا کہ ایک مرتبہ فرانس کے محکمہ پرواز نے ہوابازوں کے بغیر طیارے چلا کر خفیہ تجربے کئے۔ اور عجب انگیز نتائج رونما ہوئے۔ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ ایک خاص بم پھینکنے والا طیارہ بھیجا گیا۔ جس میں کوئی شخص سوار نہ تھا لیکن لاسلکی کے ذریعہ سے وہ منزل مقصود پر پہنچایا گیا۔ اس طیارہ میں بم بھر کر وہاں گرائے گئے۔ اور پھر واپس لایا گیا۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ لاسلکی کے ذریعہ سے ہوائی جہاز نے خود بخود جو کام کیا وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہوا باز کی امداد سے عمل میں آتا۔

آج کل یورپ میں جو سوسائٹیاں روح کی تحقیقات کر رہی ہیں انہوں نے بعض ایسے مشاہدات بیان کئے ہیں۔ جن میں روح جسم سے علیحدہ تھی اور روح کی ٹانگ پر حملہ کرنے کا اثر جسم مادی کی ٹانگ پر ظاہر ہوا۔

بہر حال اہل شرع جو روح ثابت کرتے ہیں صوفیہ کو اس کا انکار نہیں۔ بلکہ وہ اس کے اوپر ایک اور روح مجرد مانتے ہیں۔ جس میں کوئی استحالہ نہیں بلکہ اس روح مجرد کی بھی اگر کوئی اور روح ہو اور آخر میں کثرت کا سارا سلسلہ سمٹ کر امر ربی کی وحدت پر منتہی ہوجائے تو انکار کی ضرورت نہیں۔

شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے منطق الطیر میں کیا خوب فرمایا ؎

ہم زجملہ بیش و ہم پیش از ہمہ
جملہ از خود دیدہ و خویش از ہمہ

جان نہان در جسم او در جان نہان
اے نہان اندر نہان اے جان جان

مذکورہ بالا تقریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر چیز میں جو کُن کی مخاطب ہوئی رُوح حیات پائی جاتی ہے۔ بے شک میں یہی سمجھتا ہُوں کہ مخلوق کی ہر نوع کو اس کی استعداد کے مطابق قوی یا ضعیف زندگی ملی ہے یعنی جس کام کے لئے وہ چیز پیدا کی گئی۔ اُسے تیار کرکے اس کو حکم دینا "کُن" اس کام میں لگ جا) بس یہی اس کی روح حیات ہے۔ جب تک اور جس حد تک یہ اپنی غرض ایجاد کو پورا کرے گی۔ اسی حد تک زندہ سمجھی جائے گی اور جس قدر اس سے بعید ہو کر معطل ہوتی جائے گی۔ اسی قدر موت سے نزدیک یا مردہ کہلائے گی۔

یہ مضمون بہت طویل اور محتاج بسط و تفصیل ہے۔ ہم نے اہل علم و فہم کے لئے اپنی بساط کے مطابق کچھ اشارے کردیئے ہیں۔ شاید قرآن پر نکتہ چینی کرنے والے اصحاب اتنا سمجھ لیں کہ رُوح کے متعلق بھی قرآن حکیم میں وہ رموز و حقائق بیان ہوئے ہیں جن کا عشر عشیر دوسری آسمانی کتابوں میں بیان نہیں ہوا۔

واللہ سبحانہٗ وتعالےٰ اعلم وھو الملھم للصواب

چاندنی رات

جناب جگر قریشی لودیانوی

چاندنی رات میں اک خاص اثر پاتا ہوں
حدِ تخئیل سے بھی دُور نکل جاتا ہوں

آپکی پہلی نظر جب مجھے یاد آتی ہے
کشمکش ہائے خیالات میں کھو جاتا ہوں

کبھی امروز کی ویرانی پہ دل جلتا ہے
کبھی بیتے ہوئے افسانوں کو دہراتا ہوں

جسکے شعلوں میں ہے خورشید قیامت کا اثر
دل میں وہ آگ محبّت کی دبی پاتا ہوں

سوچتا ہوں کبھی بیچارگیٔ دل کا مآل
اور کبھی خود کو غمِ زیست سے گرماتا ہوں

کبھی تخئیل کی پرواز میں ہوں گرمِ سفر
کبھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جاتا ہوں

چاندنی رات نہیں ساتھ لئے آتی ہے
قصّۂ شوق کی تکمیل ہوئی جاتی ہے

تحقیق و تصحیح

اصلاح تلفظ

از :- پیر غلام دستگیر صاحب نامی

اعتراض :- "عالمگیر" بابت ماہ مئی میں زیر عنوان "اصلاح تلفظ، زلیخا، عجلت، فضلہ، قرأت، نخوت کو بفتح اول فصیح و صحیح لکھا ہوا دیکھ کر خاکسار کو تعجب ہوا۔ کیونکہ غیاث اللغات میں ان الفاظ کا تلفظ اس طرح مرقوم ہے :-

زلیخا ۔ بضم اول و بفتح لام بروزن سُویدا۔ از بہار عجم و مزیل و مدار و برہان باید انکہ زلیخا بضم اول و فتح لام۔ تصغیر زلخا کہ صیغہ صفت مشبہ باشد مونث ازلخ ماخوذ از لخ کہ بالفتح بمعنی جائے لغزیدن پاست کمافی الصراح والمنتخب ۔ چوں زن معلومہ بحسن وجمال محل لغزیدن پائے عقل بینندگان بود لہٰذا بدیں اسم موسوم شد...... وانچہ لفظ زلیخا' در مردم بفتح اول و کسر لام شہرت دارد غلط است۔ زیرا کہ ہیچ وزنے از اوزان علم تصریف مؤید صحتش نمیشود۔ بعضے گویند کہ زلیخا بفتح اول و کسر لام ہم درست باشد الخ

عِجلت ۔ بالکسر شتابی۔ از مدار و منتخب۔

فُضلہ ۔ بالضم، پس ماندہ خوردنیہا' و شاخہائے کہ بعد از چیدن میوہ قابل ثمر نباشد۔

قِراءت ۔ بکسر اول بروزن ہدایت بمعنی خواندن و باصطلاح، نام علم تجوید و از مخارج برآوردن حروف و ایں لفظ بروزن حکمت نیز آمدہ۔

نِخوت ۔ بالکسر و خائے معجمہ' بزرگی و تکبر۔ از منتخب و مدار۔

امید کہ صاحب مضمون اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

(آثم ۔ تریا قوری)

جواب :- ماہ مئی میں جو مقالہ میں نے تذکرہ کیا تھا اس میں درج شدہ چند الفاظ کو آثم صاحب تشنۂ تکمیل بتلاتے ہیں۔ لہٰذا عرض ہے۔

زَلیخا ۔ "اصلاح تلفظ" میں غیاث کی تحقیق کو قاموس اور بیضاوی کی رُو سے غلط بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ بفتح زا ہی صحیح ہے اور اس تلفظ کا اعتراف خود صاحب غیاث بھی ہے کہ "بعضی گویند کہ زلیخا بفتح اول و کسر لام ہم درست باشد"

عَجلت ۔ صاحب منتخب نے عین کو بکسر اور بفتح بھی درست بتایا ہے (ص ۳۹۲) مگر صاحب اصلاح تلفظ کی تحقیق کے مطابق بہر سہ حرف مفتوح اصح ہے۔

نَخوت ۔ فیروز اللغات میں بفتح نون بھی درست اور اصلاح تلفظ میں بکسرۂ نون غلط بتایا گیا ہے۔

قرأت ۔ بفتح قاف سہواً لکھا گیا تھا۔ بتانا یہ مطلوب تھا کہ ہمزہ ساکن نہیں۔

فَضلہ ۔ کو اصلاح تلفظ میں بضم فا غلط بتایا گیا ہے اور بفتح فا صحیح۔

آثم صاحب کو مزید تسلی کے لئے مولانا ابو الخیر الصدیقی۔ مکتبہ شرقیہ شہر سیالکوٹ سے استصواب کرنا چاہئے۔

ماہ مئی کے عالمگیر میں چند ایسے الفاظ پیش کئے گئے تھے جن کا حرف اوّل مفتوح ہے۔ اب مکسور الاوّل الفاظ درج کئے جاتے ہیں

اِخوان ۔ جمع اَخ بمعنی برادران،

اِزدحام ۔ (بھیڑ) اژدحام یا اذدہام لکھنا غلط ہے۔

اِستعفا ۔ معافی چاہنا۔ مراد ملازمت چھوڑنے کی عرضی دینا۔ استیفا غلط ہے۔

اِقلیم ۔ ملک۔ ولایت۔ الف کی فتح سے غلط ہے۔

اِنکسار ۔ خاکساری۔ آخر میں ی لکھنا غلط ہے۔

بِشارت ۔ بضمہ اول بھی درست ہے۔ (خوشخبری)

بِضاعت ۔ (پونجی) بفتح با غلط ہے۔

پِچھواڑہ ۔ (مکان کا عقبی حصہ)

پِشوے ہارا ۔ (اپنا دُوپہ رونا)

پِنڈوا ۔ (گلا۔ حلقوم)

جبلّت - خلقت - طبیعت - گروہ - ہر چیز کی بہتات
آفریدگان - جَبلت بمعنی رو - عیب - قوت -
جدّوجہد - کوشش
جراحت - زخم - بالفتح جیم غلط ہے -
جزیہ - ٹیکس -
چنگیز - نام بادشاہ -
چھپکلی - مشہور جانور -
چیخ پکار - درمیان میں و لانا غلط ہے -
حلیہ - خلقت - صورت - صفت چیزے اور زیور - آخری معنوں میں بضمہ حا بھی آتا ہے -
خزانہ - خزینہ - نقدی کا مالگودام
درنگ - دیر - وقفہ
دُرّہ - بمعنی چابک - کوڑا - دال کی پیش سے - بڑا موتی -
دریغ - افسوس -
دہش - بخشش -
ذمہ دار - (دال سے) جوابدہ - ضامن - کفیل -
زراعت - کاشتکاری،
سپرد - کسی کے قبضے میں ہونا یا دینا -
سپہر - آسمان -
سجدہ - فروتنی - سر زمین پر رکھنا - منتخب میں لکھا ہے، بفتح سین - نیز گفتہ اند - قرآن کی سورۂ سجدہ س کی زیر سے ہے
سرشت - خلقت - طبیعت -
سرشک - آنسو - قطرہ - بعض نے س کی فتح سے بھی جائز رکھا ہے -
سفارش - کسی کے واسطے کلمۂ خیر کہنا - بعض نے س کی پیش سے بھی جائز لکھا ہے -
سلوٹ - بل - شکن -
سنداں - آہرن
عصمت - پاکدامنی - ع کی زبر سے غلط ہے -
عطر - مشہور خوشبو -
علاوہ - ماسوا،
عیال - بیوی بچے - وہ رشتہ دار جن کا خرچ کسی کے ذمہ ہو
فرستادہ - قاصد -

فرشتہ - مَلک -
فروخت - بیچنا -
فریب - دھوکا - عشوہ - ادا - اُردو میں فتح فا بھی جائز سمجھتے ہیں -
فغاں - فریاد - نالہ - ہسٹری آف پرشین لٹریچر میں کسرۂ فا سے پڑھکر تحقیق کیا تو ثابت ہوا کہ یہ بضم فا سے زیادہ فصیح ہے
فہرست - انڈکس - اس کا معرب فہرس ہے -
قبطی - مصر کا اصلی باشندہ -
قصص - قصے کی جمع - قصص کے معنی ہیں قصہ بیان کرنا
کشنیز - دھنیا - غیاث میں کشنیز لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عرف میں بکاف مفتوح ہے -
مدحت سرا - مدح کرنے والا - مدح تعریف میں مدحت کی جمع - ا
مساحت - زمین کی پیمائش
منطقہ - پٹکا - کمر بند - دائرہ محیط -
مہار - اونٹ کی نکیل - میم کی فتح سے بھی جائز ہے مگر ضمہ سے غلط -
نچلا - خاموش - ساکت - نچلاً غلط ہے -
نشتر - فصد کھولنے کا آلہ - فیروز اللغات میں بضم نون بھی صحیح بتایا ہے -
نشیب - نچان - ہندوستان میں بفتح نون معروف ہے -
نفرین - بددعا - لعنت - ملامت - یہ بھی ہند میں زبانوں پر نون کے زبر سے رواں ہے -
نکات - نکتہ کی جمع - باریک باتیں -
نگراں - گاف کی زبر سے - نگرانی کرنے والا -
ہراول - فوج کا وہ حصہ جو سب سے آگے ہوتا ہے -

[illegible]

جبر و اختیار

اب آپ دردِ دل کی تسکین کو نہ آئیں

از حضرت ماہر القادری

میں عام طور پر دوسرے شعرا کی مشہور غزلوں پر غزلیں کہنے کا عادی نہیں ہوں مگر کسی کی حسین فرمائش نے مجھے مجبور کر دیا شعر کہنے کو بیٹھا تو یہ جبر کیف انگیز اختیار بن گیا۔ اور ۔۔۔۔۔ ؟ ——— ؟ ماہر القادری

پیماں شکن بتوں کی اللہ رے ادائیں — لفظوں کو یاد رکھ کر مفہوم بھول جائیں

میخوار سرکشی سے کس طرح باز آئیں — ساقی کی مست نظریں کرتی ہیں التجائیں

ڈرتا ہوں رفتہ رفتہ فریاد بن نہ جائیں — ٹوٹی ہوئی امیدیں بھٹکی ہوئی دعائیں

میں نے ہی کچھ نہ سمجھا میری ہی تھیں خطائیں — وہ دل کی دھڑکنوں سے دیتے رہے صدائیں

درد و الم سکوں کی حد سے گزر چکے ہیں — اب آپ دردِ دل کی تسکین کو نہ آئیں

میرا سیاہ خانہ آج اس طرح ہو روشن — کچھ شمع جگمگائے کچھ آپ مسکرائیں

وہ نیند سے اٹھے ہیں انگڑائی کے سہارے — ڈوبے ہوئے ستارے پھر سے ابھر نہ آئیں

اک عمر کٹ گئی ہے اس کشمکش میں ماہر
کب تک قبول ہوں گی آخر مری دعائیں؟

برگد کا بوڑھا درخت

دلگداز افسانہ

از جناب انتصار حسین نیوتنوی

رمیلا کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں ——!

آج ہی کے دن پورا ایک سال ہوا، جب کیچن کی لاش اس بوڑھے برگد کی چھاؤں میں لاکر رکھی گئی تھی۔ یہی وقت تھا جب گاؤں والوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر کہا تھا کہ کیچن بابو گذر گئے اور اس وقت اس بوڑھے برگد کی تمام پتیاں جھڑ کر کونپلیں نکلنی شروع ہوگئی تھیں آج ہی کے دن گاؤں کے تمام لوگ اسی درخت کے نیچے کیچن کی ارتھی کے ارد گرد جمع ہوئے تھے اور کسی کو یہ یقین نہ ہوتا تھا کہ کیچن بابو جو آج صبح اسی برگد کے نیچے سے ہوکر اپنی سائیکل پر شہر گئے تھے، اس طرح اچانک چل بسے۔

مگر ہوا یہی تھا اور بالکل یہی ——!

برگد کا یہ بوڑھا درخت، خدا جانے اس کی عمر کیا ہے؟ گاؤں کے سر ہلتے بوڑھے اپنے بچپن سے اس کو اسی طرح دیکھ رہے ہیں۔ اس درخت نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے۔ بڑی بڑی لڑائیاں دیکھیں۔ بیشمار باراتیں اس کے نیچے سے گزر گئیں۔ ہزاروں لاشیں اس کے نیچے رکھی گئیں۔ لوگوں نے اس کے سائے تلے بیٹھ کر پریم کے گیت گائے۔ اپنے دکھ بھرے قصے لوگوں کو سنائے۔ اس کی بدولت رام ڈول اور تعزیہ کے سلسلہ میں مذہبی جھگڑا ہوا۔ اس کے تنوں میں ہزاروں منوتیاں رکھ کر لوگوں نے اسے پوجا۔ اور یہ اب تک ٹھونٹھ ایسا کھڑا ہے۔ آخر یہ ہے کس مرض کی دوا؟ رمیلا اسے رات دن میں کئی مرتبہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی اور کچھ نہ سمجھ سکتی۔

کیچن بابو روز صبح اپنی سائیکل پر سوار ہوکر اسی برگد کے نیچے سے شہر جاتے تھے۔ یہ شہر گاؤں سے ملا ہوا تھا اور یہاں کسی ریل میں کیچن بابو پچاس روپیہ ماہوار کے ملازم تھے۔ گاؤں کا رہن سہن اس پر پچاس روپیہ مہینہ کی آمدنی، تھوڑے دنوں میں گھر میں کیچن برسنے لگا۔ اور تب ہی سے گاؤں والے انھیں کیچن بابو کہہ کر پکارنے لگے —— پورا ایک سال ہوا جب یہی برگد کا درخت رمیلا کی مد نظر تھا۔ جاتے وقت جب کیچن بابو اس کے نیچے سے گذر جاتے تو رمیلا کی نگاہ جواب دے جاتی۔ اور آتے وقت جب وہ اس کے قریب پہنچتے تو رمیلا انھیں پہچان جاتی، وہ اب بھی اس درخت کو صبح سے شام تک کئی بار دیکھتی ہے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔ اکثر خیالوں کی ادھیڑبن میں وہ سب کچھ بھول جاتی ہے اور سچ مچ کیچن بابو کا رستہ دیکھنے لگتی ہے۔ درخت کے نیچے سے گزرنے والے مختلف راستوں پر مڑ جاتے ہیں اور کوئی اس کے گھر کی طرف آتا ہوا نہیں دکھائی دیتا۔ پھر اچانک اسے سب کچھ یاد آجاتا ہے اور وہ درخت کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔

برگد کا یہ درخت ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے لگا ہوا ہے۔ جہاں سے ایک پگڈنڈی تالاب کے کنارے کنارے رمیلا کے گھر تک چلی آئی ہے۔ وہ دن بھر میں سیکڑوں مرتبہ اپنا دروازہ کھول کر اس درخت کو دیکھتی ہے۔ جیسے برگد کی دور تک پھیلی ہوئی جڑیں اس کی قسمت کی لکیریں ہوں۔ رمیلا کو اس درخت کے ساتھ عقیدت سی ہوگئی ہے۔ اس کے نزدیک اس کی دنیا وہیں سے شروع ہوئی اور وہیں پر ختم ہوگئی۔ اور جیسے وہ خود بھی اسی مقام پر دم توڑ دینا چاہتی ہو۔ کبھی کبھی وہ راکھو کو اپنی گود میں بٹھا کر اس درخت کو دیکھا کرتی ہے اور کیچن کی کہانی راکھو سے دہرایا کرتی ہے۔

"سنتے ہو راکھو! آج پورا ایک سال بیتا۔ جب تمھارے پاپا اسی درخت کے نیچے سے آرہے تھے۔ درخت کے نیچے ایک کتا سو رہا تھا۔ تمھارے پاپا کو اندھیرے میں سوجھا نہیں انھوں نے سائیکل اس کے اوپر چڑھا دی۔ کتے نے غل مچایا اور پھر گاؤں بھر کے کتوں نے آکر تمھارے پاپا کو گھیر لیا۔ پھر میں ایک لالٹین اور بڑی سی لاٹھی لے کر پہنچی اور چراغ کی روشنی میں انھیں گھر تک لے آئی۔ اس دن تمھارے پاپا شہر سے بہت سا سامان لائے تھے

اچھے اچھے کھلونے، کپڑے، مٹھائیاں ——!"

"پاپا کہاں چلے گئے؟"

"آکاش پر، اب وہ وہیں رہتے ہیں۔" رمیلا نے دیکھا راکھو سو رہا تھا۔

"نہیں نہیں راکھو! تم سمجھے نہیں۔ تمھارے پاپا روز آکاش سے دھرتی پر آتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے ساری دھرتی پر پھیل جاتے ہیں۔ وہ دیکھو چندا ماما برگد کی آڑ سے نکل رہے ہیں۔ یہی تو ہیں تمھارے پاپا ——!"

"چھپ گئے ماما اول، ہمالے پاپا!" راکھو غور سے برگد کے درخت کی طرف دیکھنے لگا۔ چاند دھیرے دھیرے برگد کی جڑوں کے پاس سے بڑھتا گیا اور اونچا ہوتا گیا۔

"پاپا اوپل جالہے ہیں۔" بچہ نے ماں سے پوچھا۔

"ہاں راکھو اوپر جا کر دھرتی پر پھیل جائینگے۔ سب کے گھروں میں روشنی ہو جائیگی۔ اب اس روشنی میں سب بچے کھیلیں گے تم بھی کھیلنا۔"

راکھو تالیاں بجاتا رمیلا کی گود سے اُٹھ کر کسی اور طرف چلا گیا رمیلا نے پھر برگد کی جڑوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ کتنی ڈراؤنی ہیں یہ جڑیں۔ چڑیل کی طرح بڑے بڑے دانت نکالے ہر وقت جھانکا کرتی ہیں۔ یہ ایک دن سارے گاؤں کو کھا جائیں گی۔ رمیلا کو ایسا جان پڑا جیسے اس کے دل پر کسی نے گھونسا مار دیا ہو۔ مجھے کھا لیں مگر میرے راکھو کو نہ کھائیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ دوڑی ہوئی گئی اور راکھو کو سینہ سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

رمیلا اس درخت سے اتنا ہی ڈرتی ہے جتنا لوگ اُس کے تنے میں رکھی ہوئی کالی مائی کی مورت سے ڈرتے ہونگے۔ ایک دن اس نے دیکھا پرتاب سنگھ گاؤں کے زمیندار کا بڑا لڑکا اس درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہوا۔ رمیلا نے راکھو سے کہا۔ وہ دیکھو تمھارے پرتاب چاچا کھڑے ہیں۔ پرنام کرو۔

راکھو نے زور سے پکار کر کہا۔ "لام لام تاتا۔"

تالاب کے پانی میں آواز گونجتی ہوئی بہت دور تک نکل گئی

پرتاب نے وہیں سے جواب دیا۔ "خوش رہو۔" اور اس کے بعد پرتاب کے قدم رمیلا کے گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔ رمیلا نے جلدی جلدی چارپائی لا کر بچھائی اس پر صاف بستر لگایا۔ پھر جھانک کر دیکھا۔ پرتاب تالاب کے کنارے کنارے پگڈنڈی پر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ پھر اس نے راکھو کو سکھایا جب چاچا آجائیں تو چپ چاپ بیٹھنا۔ اتنے میں پرتاب نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ رمیلا نے گھونگھٹ کو سر کے اوپر سے اور کھینچ لیا۔ پرتاب چارپائی پر بیٹھ کر راکھو کو کھلانے لگا۔ پھر بیٹھے بیٹھے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جیسے پرتاب کو گھر میں دیکھ کر اچانک کیشن کا خیال آگیا ہو۔

"بھابھی! اکیلے میں طبیعت تو بہت گھبراتی ہوگی؟ کل تمھیں باپو پوچھ رہے تھے۔"

"میرا پرنام کہہ دینا اُن سے۔"

"یہ پرنام اور آشیرباد کا تکلف تو ٹھیک نہیں، میرے یہاں چل کر رہو۔ یہاں اکیلے گھر میں پڑی پڑی کیا کرتی ہو؟"

"اکیلا تو بھگوان ہی نے کر دیا۔" اتنا کہہ کر رمیلا کی آواز بھرّا گئی ——!

"ہاں بھگوان جو چاہیں کریں مگر پھر بھی تمھیں اکیلے گھر میں نہ رہنا چاہیئے۔"

رمیلا نے ذرا تکلف سے گلا صاف کر کے کہا۔ "بات یہ ہے پرتاب! وہ میرا کسی کے گھر آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اب نہیں ہیں مگر میں ان کی آگیا کا پالن مرتے دم تک کرونگی۔"

"ارے ان کی بات تو ان کے ساتھ گئی زندگی رہی تو تمھیں بلنا ہے۔ پھر ہر بات میں جو آگیا کا خیال کروگی تو کیسے کام چلیگا۔"

"جیسے بھی چلے ایشور مالک ہے۔ تم سے اگر کوئی مدد مانگوں تو مت دینا۔"

"میں تو دل و جان سے تمھاری سیوا کروں مگر تم میری بات تو مانو ——!"

"ایشور کے لئے پرانے قصوں کو نہ دہراؤ پرتاب! تمھیں معلوم نہیں، میرا دل ٹوٹا ہوا ہے۔"

دونوں کی بات چیت یہیں پر ختم ہو گئی۔ پرتاب اُٹھا اور راکھو کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلنے لگا۔ اس کے قدم پھر برگد کی طرف بڑھنے لگے۔ دھیمے دھیمے پاپی کے قدموں کی طرح۔ اسے اپنے کئے پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے بیکار رمیلا کا دل ٹٹولا۔ وہ ضرور کیشن کی یاد کا پالن کریگی۔ وہ مرتے دم تک اسے نہیں بھول سکتی، وہ اب بھی میری نہیں ہے۔ پورا ایک سال بیت گیا اور وہ کیشن کے غم کو نہ بھلا سکی۔ میرا کوئی لبھاوا کام نہیں کرتا۔ باپو سے کہہ کر

میں نے پوت معاف کرادی۔ پچھلے لگان کا ایک پیسہ میں نے نہیں لیا۔ مگر سب بیکار، سب فضول، اب سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلے گا۔ مجھے اپنا طرزِ عمل بدل دینا چاہیے۔ اور پرتاب یہی سوچتے سوچتے برگد کے درخت کے نیچے پہنچا۔ کسی موٹی جڑ کی ٹھوکر پاؤں میں لگی اور وہ گر پڑا۔ راکھو نے کھڑے کھڑے تالیاں بجائیں۔ "بگل پلے تاتا گل پلے"

رمیلا جو شروع ہی سے درخت کی جڑوں میں نظریں گاڑے بیٹھی تھی دل میں بولی۔ ضرور کوئی بے ادبی ہوئی ہے پرتاب سے اور پرتاب جلدی سے کھڑا ہو کر کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ راکھو اب تک کھڑا تالیاں بجا رہا تھا اور رمیلا اسی طرح آنکھیں گڑائے بہت دور پر کچھ دیکھ رہی تھی۔

رمیلا کے اس گاؤں میں آتے ہی پرتاب نے اس بوڑھے برگد کے ارد گرد چکر کاٹنا شروع کر دیئے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے کنچن سے دوستی بڑھائی تھی۔ اور رمیلا کے گھر میں آنے جانے لگا تھا۔ اور اسی وقت سے گاؤں کے لوگ پرتاب اور رمیلا کے تعلقات کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کنچن کو خود پرتاب کا آنا جانا ناپسند نہ تھا اور یہ ساری باتیں رمیلا کو بھی معلوم تھیں اور پرتاب کو بھی!

شروع شروع پرتاب نے اس برگد کے نیچے نوٹنکیاں کرائیں، ڈومنیوں کو نچوایا۔ بندر بندریا کے ناچ کرائے۔ اور یہ سب کچھ رمیلا اپنے گھر سے دیکھا کرتی۔ پھر جب کنچن کی لاش اس بوڑھے برگد کی چھاؤں میں رکھی گئی تو پرتاب نے اناتھ بچوں کو پیسے بانٹے، اندھے اور محتاجوں کو بٹھا کے بھوجن کھلوایا۔ مگر اس کے یہ سارے حربے بیکار گئے۔ آخرکار ایک صورت نکل آئی۔ رمیلا کے دل میں جو چور تھا وہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔

بوڑھے برگد سے جو اسے خوف تھا وہ پورا ہو گیا اس کا راکھو بیمار پڑ گیا۔ وہ اب بھی خوفزدہ نگاہوں سے برگد کو دیکھا کرتی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا کہ درخت کی جڑیں کالے ناگوں کی طرح زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ضرور گاؤں بھر کو ڈس لینگی۔ اس کا شک یقین سے بدلتا چلا گیا۔ برگد کا بوڑھا درخت اس خوفناک طریقے سے اس پر حاوی تھا کہ وہ خدا کو بھی بھول بیٹھی اور اس کے نزدیک گاؤں کا پالن ہار یہی درخت تھا جس کو چاہے چھوڑ دے اور جس کو چاہے بھسم کر دے۔

راکھو کی حالت جتنی بگڑتی گئی درخت کی طرف سے اتنا ہی اعتقاد رمیلا کا بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے ویدجی نے جواب دے دیا اور اب صرف یہی ایک صورت تھی کہ شہر لے جا کر راکھو کا علاج کیا جائے۔ مگر شہر کے علاج کے لئے روپیہ کہاں سے آتا۔ کنچن بابو کو مرے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ گھر کی ساری پونجی ختم ہو چکی تھی اور ساتھ ہی گاؤں والوں کی ساری ہمدردیاں بھی کنچن بابو کے ساتھ دفن ہو چکی تھیں۔ عزیزوں میں پہلے ہی سے کوئی اپنا نہ تھا جس کے آگے جا کر رمیلا ہاتھ پھیلاتی۔ البتہ پرتاب کا دم باقی تھا۔ وہ اب بھی رمیلا پر جان نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ اگر وہ زبان ہلا دے تو پرتاب سیکڑوں روپے کا انتظام کر دے۔ مگر اس کے ساتھ پرتاب کی وہ انوکھی شرط تھی۔ رمیلا نے پھر درخت کی جڑوں میں آنکھیں گاڑ کر سوچنا شروع کیا۔ کیا سچ مچ میں پرتاب کی شکتی کے آگے سر جھکا دوں؟ سنتی ہوں شہر میں بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ اچھی اچھی دوائیں ملتی ہیں۔ وہاں ضرور میرا راکھو بچ جائیگا۔ بوڑھے درخت کی پتیاں ہوا سے جھوم جھوم کر سر ہلانے لگیں۔ آخرکار اس کے دل نے فیصلہ کر لیا۔ اس میں تھوڑی سی طاقت آگئی۔ وہ اٹھی اور راکھو کے پاس بیٹھ کر اسے غور سے دیکھنے لگی، بچہ کا سارا جسم سوکھ کر پنجر ہو چکا تھا۔ سفید سفید آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی تھیں۔ راکھو نے آہٹ پاکر ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"شہر چلوگے راکھو؟"

بچہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

راکھو کو سوکھے کا مرض ہو گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس مرض سے بہت ڈرتے تھے۔ سب نے مل کر ایکا کیا تھا کہ جب تک راکھو زندہ ہے رمیلا کے گھر نہ جائیں گے۔ گھر کے آس پاس کسی بچہ کی شکل تک نہ دکھائی دیتی تھی۔ سب نے اپنے بچوں کو گھروں میں بٹھا لیا تھا۔ پت جھاڑ کا موسم تھا اور برگد کا بوڑھا درخت ٹنڈ منڈ ہو کر پھر سے اپنا نیا لباس بدلنے والا تھا۔ رات آئی تو بچہ کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لینے لگا۔

رمیلا کی نظروں میں گھر تاریک ہو گیا۔ وہ زمین پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر بھاگی ہوئی دروازے پر گئی اور بوڑھے برگد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر دعائیں مانگنے لگی۔ اس نے کھڑے کھڑے بچہ کی زندگی کے لئے ہزاروں منتیں مرادیں مان ڈالیں۔ پھر بھاگ کر راکھو کے

پاس آئی۔ اب بچہ کی حالت کچھ سُدھر گئی تھی۔ دل میں تھوڑی سی طاقت آگئی۔ راکھو کو شہر لیجا کر علاج کرنے کا خیال پھر دل میں آکر چٹکیاں لینے لگا۔ وہ ایک سپنا سا دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا راکھو بڑا ہو گیا ہے۔ اور اب روز کیشن بابو کی طرح سائیکل پر سوار ہو کر شہر جاتا ہے۔ مہینہ ختم ہونے پر بہت سے روپے میرے آنچل میں ڈال کر کہتا ہے "ماتا جی اسے قبول کرو"۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ شہر سے بہو بیاہ کر لائی ہے۔ اس بوڑھے برگد کے نیچے بہت سے لوگ جمع ہیں اور راکھو دولھا بنا گھوڑے پر سوار ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اک دم سے چونک پڑی۔ پرتاب کے چوپال سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ اسے یہ سپن دیکھتے دیکھتے رات کے بارہ بج گئے۔ رمیلا نے پرتاب کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ اس نے پھر ایک مرتبہ راکھو کو غور سے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے اسی طرح پڑا تھا۔ وہ دبے پاؤں دروازے تک آئی۔ دروازہ کھولتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اندھیری رات میں گاؤں کا سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ برگد کے بوڑھے درخت پر جگنو ادھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ بڑی بڑی شاخیں اپنی گود پھیلائے ہوئے اُسے بلا رہی تھیں۔ رمیلا نے قدم گھر سے باہر نکالا۔ پھر جیسے زمین نے اس کے قدم پکڑ لئے۔ ایک بوڑھے کتے نے اسے دیکھ کر خوں خوں کیا اور پھر پہچان کر خاموش ہو گیا۔ رمیلا تالاب کے کنارے کنارے دو چار قدم اور آگے بڑھی۔ کنارے سے کوئی مینڈک اُچک کر تالاب میں کود پڑا اور وہ چونک پڑی۔ پھر اس نے قدموں کی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے پہنچ کر اس کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سوکھے ہوئے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ اور زیادہ ڈری۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ درخت کے نیچے آکر کھڑی ہو گئی۔ اگلی پچھلی ساری باتوں کا خیال آنے لگا۔ اسی درخت کے نیچے سے روز کیشن بابو شہر جایا کرتے تھے، میں ان کی ارتھی رکھی گئی تھی۔ اسی درخت نے انھیں کھا لیا۔ اب شاید راکھو کو بھی ——— ۔ اس خیال کے آتے ہی اسے وحشت ہونے لگی۔ میں اسے لیکر شہر میں بھاگ جاؤنگی۔ یہاں سے بہت دور۔ پھر اسے اپنے گناہ کا خیال آگیا۔ قدم جو اب تک کسی خاص قصد کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے آہستہ آہستہ پیچھے مڑنے لگے۔

ہرگز اتنا بڑا پاپ نہ کروں گی۔ کیشن بابو کی آتما شرما جائیگی۔ وہ ناک والے تھے۔ گاؤں میں ان کا بڑا نام تھا۔ مگر میں ان کی ناک کا کہاں تک خیال کروں؟ ان کی بات کہاں تک بتاؤں۔ خود تو مرگئے اور مجھے آفت میں پھنسا گئے۔ پچاس روپیہ مہینہ کماتے تھے اور مرے تو کوڑی کفن کو نہ چھوڑ گئے۔ بڑی ناک والے۔ اسے کیشن بابو پر غصہ آنے لگا ——— وہ پھر تیز تیز قدموں سے پرتاب کے گھر کی طرف چلی۔ راستہ میں اُسے راکھو کا خیال آیا۔ کہیں ڈر کر مجھے پکار نہ رہا ہو اور پھر اس نے سوچا صبح ہوتے ہوتے گاؤں بھر میں میرے چرچے ہونگے۔ لوگ اپنے خیال کے مطابق کہیں گے کہ میں کیشن بابو کی زندگی میں بھی پرتاب ہی کی تھی۔ خود پرتاب دوسروں میں بیٹھ کر میرا مذاق اُڑائے گا۔ سماج بُرا بھلا کہے گا۔ میرا یہ بلیدان جرم قرار دے دیا جائے گا۔ مگر میرا راکھو تو بچ جائے گا۔ میں اسے لیکر شہر میں نکل جاؤنگی پھر کوئی کچھ کہا کرے۔ چھوٹے گاؤں سے کون ناتا۔ اور انھیں خیالوں میں بہتی ہوئی وہ پرتاب کی چوپال میں پہنچ گئی۔

پرتاب ٹانگیں پھیلائے سو رہا تھا۔ اس کے سرہانے بڑی سی لاٹھی رکھی تھی۔ رمیلا نے جاتے ہی پرتاب کے ایک ٹھوکر ماری وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور فوراً ایک ہاتھ سے لاٹھی پکڑ کر پوچھنے لگا۔ "کون؟"

"میں ہوں" رمیلا نے آہستہ سے کہا۔

"کون! رمیلا؟"

"ہاں ——!"

پرتاب گھبرا سا گیا۔ خلاف امید رمیلا کا آنا اس کی بالکل سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے جلدی جلدی آنکھیں ملیں اور پھر غور سے رمیلا کی صورت دیکھنے لگا۔

"تم روز بلاتے تھے، میں آج خود سے چلی آئی"

"راکھو کیسا ہے؟" پرتاب نے کھڑے ہو کر پوچھا۔

"کون جانے کیسا ہے۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کر تمھارے پاس آئی ہوں۔ گاؤں کے وید جی نے جواب دے دیا ہے۔ اب میں اسے شہر لیکر جاؤنگی۔ مجھے روپے کی ضرورت ہے۔ تم سے بھیک نہیں مانگتی۔ اپنی قیمت مانگتی ہوں"

"اچھا گھر کے اندر چلو" پرتاب نے خوش ہو کر کہا۔ اور دونوں اندر چلے گئے۔ صبح صبح ہوتے ہوتے رمیلا کی دونوں مٹھیاں روپیوں سے بھر دی گئیں۔ وہ پھر جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف پلٹی۔ اس نے دور سے دیکھا بوڑھے برگد کے نیچے کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ اور قریب آئی تو اسے لوگوں کے بیچ میں اپنے گھر کا کھٹولا دکھائی دیا۔ پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھا جس کے لئے وہ اپنا سب کچھ لٹا دینے کو تیار تھی۔ لوگوں نے

میں راکھو کی ارتھی اس بوڑھے برگد کے نیچے رکھی ہوئی تھی - جو ہونا تھا وہ سب کچھ ہو چکا - رمیلا مٹھیوں میں روپے دبائے راکھو کی لاش پر گر پڑی - بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا -

"جھوٹ موٹ کا رونا تو دیکھو - خود ہی بیمار بچے کو گھر میں ڈال کر چلدی - اب روتی ہے"

دوسرا بولا - "ارے سکھیاں کرم کرنے گئی تھی"

تیسرے نے کہا "کلنکی کہیں کی - ابھاگن، یہ مرجاتی تو گاؤں پاک ہوجاتا"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایکدم سے زمین ہلنے لگی - برگد کے بوڑھے درخت نے جڑیں چھوڑ دیں اور ایکدم سے بھڑ بھڑا کر گر پڑا - پھر گاؤں بھر کے سارے درخت اور مکان باری باری سے گرتے رہے - ہر طرف سے خدائی قہر نازل ہونے لگا - لوگ اپنی جانیں لیکر ادھر ادھر بھاگنے لگے - شدید زلزلہ کے باعث تھوڑی دیر میں گاؤں کا نام و نشان تک نہ رہا برگد کا بوڑھا درخت سب کو کھا گیا - جو لوگ اس وبا سے بچ گئے وہ اس بوڑھے برگد اور رمیلا کا قصہ بہت دکھ بھرے انداز میں بیان کرتے ہیں جس طرح آپ نے میری زبان سے سنا ——!

ہم

از جناب تسکین بریلوی

تیری ناکامی کا پھر دُہرائیں کیا افسانہ ہم
کامیابِ آرزو ہیں اے دلِ دیوانہ ہم

دیکھتے ہیں ہر طرف کیفیتِ مستانہ ہم
آج کس دنیا میں ہیں اے ساقیِ میخانہ ہم

بن گئے اُن کی نظر میں مجرمِ جُرمِ وفا
چھیڑ کر افسانۂ خوش کامیِ پروانہ ہم

بے نیازی مانعِ شرحِ حقیقت بن گئی
کھول دیتے سب فریبِ کعبہ و بتخانہ ہم

پھر نہ آئیگا کہاں تک گردشِ پیہم سے دل
تا بکے روکیں گے طوفاں خیزیِ پیمانہ ہم

کس قدر ہے درہم و برہم نظامِ زندگی
دل مقیمِ گلستاں ہے ساکنِ ویرانہ ہم

ہو چکی تکمیلِ تحریرِ مقدر ہو چکی
کر چکے ایمان نذرِ ساقیِ میخانہ ہم

داستاں عبرت کی شاید پھر مکمل ہو سکے
کس مپرسی کو بھی کرلیں شاملِ افسانہ ہم

ایک مدت ہو گئی ہے گفتگو سنتے ہوئے
آج تک سمجھے نہ رازِ شیشہ و پیمانہ ہم

جانتے تھے ہم جسے خود حاصلِ دار و رسن
کہہ اُٹھے وہ راز اُن سے آج بیتابانہ ہم

ایک رازِ زندگی ہی یوں بتا سکتے نہیں
جا رہے ہیں کس طرف تسکین بیتابانہ ہم

احکام عالمگیری

تاریخی مقالہ

از :- جناب خالد حسن قادری ایم اے

حضرت عالمگیر علیہ الرحمہ کے واقعات زندگی کا ایک مجموعہ "احکام عالمگیری" کے نام سے حمیدالدین خاں نیمچۂ عالمگیری نے فارسی میں لکھا تھا جو عرصہ سے نایاب تھا۔ اس کو پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے سنہ ۱۹۱۲ء میں مع اورنگزیب کی سوانحعمری اور "احکام عالمگیری" کے انگریزی ترجمہ کے شایع کیا ہے۔

کل ۷۲ مختلف واقعات ہیں جن سے حضرت عالمگیرؒ کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان چند اشخاص میں سے تھے جو روشن دماغ اور روشن دل لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو واقعی ظل اللہ ہوتے ہیں۔ ان واقعات کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف زبردست سیاستدان، بیمثال حکمران، بینظیر فاتح اور لاجواب مدبر تھے بلکہ ایک سچے مسلمان اور ایسے شہنشاہ تھے جو تدبر، رحمدلی، بندہ پروری میں لاثانی اور اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

وہ مورخ جن کی آنکھوں پر تعصب کے تاریک پردے پڑے ہوئے ہیں جن کو بجز اس کے کچھ خبر نہیں۔ ع

"کہ عالمگیر ہند وکش تھا ظالم تھا ستمگر تھا!"

اور اگر کچھ معلوم ہے تو اس نور عالمگیری کو اپنے دل کی سیاہی میں چھپائے رکھتے ہیں لیکن اس انوار کی کرنیں کہیں نہ کہیں سے باہر نکلنے کا رستہ ڈھونڈ لیتی ہیں، اور بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے کہ "اورنگ زیب بہترین سیاستدان تھا"

پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے حضرت عالمگیرؒ کے کردار کے سمجھنے میں تنگ نظری سے کام لیا ہے لیکن چونکہ "احکام عالمگیری" اور ان کے علاوہ وہ دوسرے صدہا احکام جن پر حضرت عالمگیرؒ کی مہر موجود ہے اور جن کی رُو سے ہزاروں ہندوؤں کیلئے جاگیریں اور مندروں کیلئے جاگیریں وقف کی گئی ہیں موجود ہیں اس لئے دل کھول کر تو شرح تمام بیان نہ کر سکے لیکن آزادی کے اصول کو مدنظر رکھ کر تعریف کی ہے اور ہر سطر میں ایسی ایسی چٹکیاں لی ہیں جن کو دل والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ اس طریقہ سے اورنگ زیب، عالمگیر شاہ نے اپنی زندگی بسر کی اور انتقال کیا۔ باوجود اپنے مذہبی تعصب، تنگ نظری اور نقدان فراخدلی و سیاستدانی کے وہ چند ایسی خصوصیات کا حامل تھا جو زندگی کی شاہراہ میں اس کو بجز ایک بہترین فرمانروا ہونے کے ہر نمایاں مرتبہ دے سکتی ہیں ۔۔۔"

(ترجمہ انگریزی صفحہ ۲۸ اورنگزیب کا کردار)

مصنّف احکام عالمگیری

مصنف احکام عالمگیری حمیدالدین خاں نیمچۂ عالمگیری کی مختصر سوانحعمری "مآثر الامراء" سے لکھی جاتی ہے۔

"۔۔۔ حمیدالدین خاں بہادر عالمگیر شاہی کے والد کا نام سردار خان کوتوال تھا۔ اور دادا باقی خاں چیلہ قلماق شاہجہانی تھا۔ امداد روزگار اور یاوری طالع سے خلد مکان کے آخری عہد حکومت میں انتظام سلطنت اس کے سپرد کیا گیا اور دوسرے کاموں کے نظم و نسق بھی اس کو تفویض کئے گئے۔ قلعوں کی حفاظت اور دشمنوں کی گوشمالی کے لئے اسے دور دراز کے سفر پر روانہ کیا گیا۔ اور جہاں کہیں وہ گیا دشمن کے دست و پا کو معزول کر کے صحیح و سلامت واپس آ گیا۔ اور بہت انعام و اکرام اور شہرت پائی۔ نیمچۂ عالمگیری کے لقب سے عوام میں مشہور ہو گیا۔ سنہ ۔۔ھ میں قید خانہ کا داروغہ بنایا گیا۔ سنہ ۔۔ھ میں فیل خانہ کا داروغہ بنا اور پیش گاہ خلافت میں منظور نظر ہو گیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۳۳ھ میں خانی و کامرانی کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

حضرت عالمگیر کی وفات کے بعد خان مذکور نے درویشی اختیار کر لی اور دلی خدمت پیر و مرشد کے مزار کی جاروب کشی کی خدمت اختیار کر لی۔ جب مرزا اعظم احمد نگر سے اورنگ آباد پدر گرامی قدر (عالمگیرؒ) کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گیا تو حمیدالدین خاں کو بھی ساتھ لے آیا۔ اس کی بہت دلجوئی کی اور انعام و اکرام اور خطابات سے عطا کئے ۔۔۔"

(مختصر ترجمہ فارسی مآثر الامراء صفحہ ۶۰۵ تا ۶۱۱)

"احکامِ عالمگیری" کے تمام واقعات نہایت دلچسپ ہیں اور اس قابل ہیں کہ اردو میں منتقل کیے جائیں۔ ابھی تک اردو میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ میں نے کتاب کا کچھ حصہ ترجمہ کر لیا ہے اس میں سے چند دلچسپ واقعات لکھتا ہوں۔

عالمگیر کی دور اندیشی

شہزادہ داراشکوہ کے لئے آگرہ میں ایک نیا محل تیار ہوا اعلیٰحضرت (شاہجہانؒ) کی تینوں شہزادوں سمیت (شہزادہ شجاع، شہزادہ مراد اور شہزادہ اورنگ زیب) کی ضیافت کا اہتمام کیا — گرمی کا موسم تھا۔ دریا کے کنارے سرد خانہ بنایا گیا تھا۔ اس میں دریا کی جانب قدِ آدم آئینے آویزاں کیے گئے تھے۔ شہزادہ داراشکوہ اعلیٰحضرت کو مع اپنے تینوں بھائیوں کے اس سرد خانے میں لے گئے اورنگ زیب اس دروازے کے سامنے جس سے آمد و رفت ہوتی تھی بیٹھ گئے۔ داراشکوہ نے یہ دیکھ کر اعلیٰحضرت کی توجہ باشارۂ چشم اس طرف مبذول کرائی کہ دیکھیے کہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "فرزندم! ہمیں معلوم ہے کہ تم عالم اور درویش صفت ہو لیکن حفظِ مراتب بھی ضروری ہے۔ ع گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی! کیا ضرورت ہے کہ لوگوں کے راستے میں بیٹھو اور اپنے چھوٹے بھائی سے نیچے اور پس پشت رہو۔"

انھوں نے جواب دیا۔ "اس جگہ بیٹھنے کا سبب بعد میں عرض کروں گا۔" تھوڑی دیر بعد نمازِ ظہر جماعت سے ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے بغیر اجازت شاہی محل واپس چلے گئے۔

جب اعلیٰحضرت کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بطورِ سزا دربار سے سات ماہ تک غیر حاضر رہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ سات ماہ کیلئے مجرا بند ہو گیا۔ سات ماہ کے بعد بیگم صاحبہ سے فرمایا کہ تم اس کے پاس جا کر اس روز بلا اجازت آنے اور پس پشت بیٹھنے کا سبب دریافت کرو۔ بیگم صاحبہ کے تشریف لے جانے اور سوال کرنے پر جواب دیا۔ "جس روز داراشکوہ نے دعوت کی تھی اور وہ اعلیٰحضرت کو مع تینوں بھائیوں کے ایک دروازے والے تہ خانے میں چھوڑ کر خود دعوت کا سامان کرنے کے بہانے باہر چلے گئے تھے تو مجھے شک ہوا کہ اگر انھوں نے دروازہ بند کر دیا تو ہم سب کا کام تمام ہو جائے گا۔ اور اگر محض سہواً ایسا ہو گیا تھا تو میں نے خیال کیا کہ جب تک وہ اندر رہیں میں دروازے کی حفاظت کروں لیکن اعلیٰحضرت کا شاہانہ وقار اس میں مانع تھا اس لئے میں استغفار کرتا ہوا چلا آیا۔"

جب اعلیٰحضرت نے یہ بات سنی تو اسی وقت اپنے سامنے طلب کیا اور مہربانی و عنایت سے پیش آئے۔

انھوں نے (اورنگ زیبؒ نے) سعد اللہ خاں وزیرِ اعظم سے کہا کہ کسی طرح مجھے دربار سے باہر بھیجو کیونکہ یہاں میں بےخواب اور بےچین ہوں۔ چنانچہ اعلیٰحضرت نے انھیں لاہور سے دکن کی صوبہ داری پر متعین کر دیا۔

شہزادہ اورنگزیب کا سلوک امراء کے ساتھ

داراشکوہ نے بعض امراء سے از راہِ عداوت اور بعض سے بےپروائی کے سبب برا سلوک کیا۔ مثلاً علی مردان خاں، سعد اللہ خاں اور سید میران بارہہ کہ جو منصب پنجہزاری رکھتے تھے اور اعلیٰحضرت کے خاص مصاحب تھے۔ حضرت عالمگیر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ خاص تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ علی مردان خاں کو جنھیں دربار سے "یارِ وفادار" کا خطاب ملا تھا "مشفق نیکو کردار" کے لقب سے خطوط میں مخاطب کرتے تھے اور سعد اللہ خاں کو جنھیں "عصائے پیری" اور "وزیرِ باتدبیر" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا چونکہ ان سے درس لیا تھا اور اپنے آپ کو ان کا شاگرد سمجھتے تھے اس لئے "وزیرِ باتدبیر" اور "سرِ تلامذۂ صغیر" کے الفاظ لکھتے تھے۔ اور سید میران بارہہ کو جو دربار میں "سید السادات" کے خطاب سے مخاطب کیے جاتے تھے "خلاصۂ اولادِ سید کائنات" لکھتے تھے۔

ان تینوں امراء نے اور ان کے علاوہ مثلاً افضل خاں، ملا علاء الملک نے اورنگ زیب سے کمالِ محبت کے سبب اس کی رازداری کے واسطے ہر امکانی خدمت جو لازمۂ دوستی ہے ادا کی۔

اعلیٰحضرت خلد مرتبت کو آثارِ ادبار شہزادہ داراشکوہ کی پیشانی میں دیکھ کر اور ترقی کی نشانیاں شاہزادہ اورنگزیب کے طالع میں دیکھ کر افسوس ہوا اور داراشکوہ کو اقوال و افعالِ قبیح سے منع فرمایا لیکن یہ دیکھ کر کہ داراشکوہ نے نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھایا ؎

گلیمِ بختِ کسے را کہ بافتند سیاہ
بآبِ زمزم و کوثر سفید نتواں کرد

ان کی خواہش ہوئی کہ اورنگزیب امراء کے ساتھ اپنے سلوک میں فرق کرے تاکہ وہ اس کی رازداری سے دست بردار ہو جائیں

ایک خط اپنے دست مبارک سے لکھ کر روانہ کیا۔

"بابا! سلاطین اور ان کے فرزندان کو بلند ہمت رہنا چاہیئے اور فطرت اعلیٰ کو کام میں لانا چاہیئے۔ سنا ہے کہ تم ہر ایک نوکر سے نہایت عاجزی اور انکساری سے پیش آتے ہو۔ اگر یہ عاقبت بینی اور دوراندیشی کے سبب سے ہے تو یاد رکھو کہ تمام کام قضا و قدر پر مبنی ہیں اور اس پست فطرتی سے سوائے ذلت کے اور کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔"

انہوں نے جواب دیا!

"جو کچھ جہاں پناہ نے از راہ فضل و کرم اس حقیر و عاجز غلام کے بارے میں اپنے قلم عنایت رقم سے لکھا ہے۔ وہ میرے واسطے کالوحی من السماء (وحی آسمانی کی طرح) ہے۔ پیر و مرشد برحق سلامت تعز من تشاء و تذل من تشاء (عزت بھی وہی دیتا ہے اور ذلت بھی وہی دیتا ہے) صرف خالق ارض و بلاد اور مالک بندگان کی رضا پر ہے۔ یہ خاکسار صرف اس حدیث پر جو حضرت انس بن مالکؓ کی طرف منسوب ہے عمل کرتا ہے۔ رضی اللہ عنہ من اذل نفسہ اعزاللہ (جو اپنے آپ کو خاکسار سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر انعام نازل فرماتا ہے) میں دوسروں کے قلوب کو اذیت دینا سب سے بڑا جرم اور گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں۔ جو کچھ عالی جاہ نے فرمایا ہے آپ سے انکار نہیں کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ من شر الوسواس من الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس کے عرض کرنے پر مرقوم فرمایا ہے۔

زبان عرض ندارم بغیر عذر گناہ
بہ بخش جرم من روسیاہ و نامہ سیاہ

شاہجہاں کا اندیشہ

اعلیٰحضرت شاہجہاں فرماتے تھے کہ مجھ کو بعض اوقات یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ولی عہد نیک اور وفادار آدمیوں کے دشمن واقع ہوئے ہیں۔ مراد بخش شراب نوشی سے دلبستگی رکھتا ہے اور محمد شجاع میں سوائے سیر چشمی کے دوسری صفت نہیں ہے مگر اورنگزیب کا عزم و شعور اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اس عظیم الشان کام (شہنشاہی) کا متحمل ہوگا۔ لیکن اس کی طبیعت میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔ ع

تا دوست کرا خواہد و میلش بکہ باشد

حضرت اورنگزیبؒ کی وصیتیں

الحمد للہ والصلوٰۃ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ و رضا۔ چند وصیتیں کرتا ہوں۔

اوّل یہ کہ اس عاصی غرق معاصی کو تربت مطہرہ مقدسہ حسینیہ علیہ السلام کے غلاف کی چادر میں لپیٹیں کیونکہ بحر عصیان کے غرق شدہ کو سوا اس درگاہ عالی کے کہیں پناہ نہیں ہے۔ اور اس سعادت عظمیٰ کا سامان فرزند عالیجاہ بادشاہزادہ عالی جاہ کے پاس ہے ان سے لے لیں۔

دوم — یہ کہ چار روپے ٹوپیاں سینے کی مزدوری کے آئے محلدار کے پاس ہیں اس سے لیلیں اور اس عاجز کے کفن دفن میں خرچ کریں۔ تین سو پانچ روپے قرآن مجید کی کتابت کے پیسے پاس ہیں وہ فقراء کو دیدیں کیونکہ قرآن شریف کی کتابت کے روپیہ کی حرمت میں فرقہ شیعہ کو شبہ ہے اس لئے اس کو کفن دفن میں خرچ نہ کریں۔

سوم — یہ کہ باقی سامان بادشاہزادۂ عالیجاہ سے لے لیں کیونکہ میری اولاد میں سب سے بڑے ہیں اور حلت و حرمت ان کے ذمہ ہے۔ مجھ بیچارہ سے کوئی باز پرس نہ ہوگی کیونکہ — مردہ بدست زندہ!

چہارم — یہ کہ اس سرگشتہ وادئ گمراہی کو سر برہنہ دفن کریں کیونکہ وہ گنہگار تباہ کار جو سر برہنہ عظیم الشان بادشاہ کے سامنے جائے گا قابل رحم ہوگا۔

پنجم — یہ کہ تابوت کے اوپر سفید کپڑا جس کو گزی کہتے ہیں ڈالیں اور شامیانہ، قوالی اور برسی کی بدعات سے پرہیز کریں۔

ششم — یہ کہ والی ملک پر واجب ہے کہ وہ ان خانہ زادوں کے ساتھ جو اس عاصی کے ہمراہ دشت و صحرا میں پھرتے ہیں اچھا سلوک کریں اور ان سے اگر کوئی قصور بھی سرزد ہو جائے تو کمال مہربانی سے معاف فرمادیں۔

ہفتم — یہ کہ ایرانیوں سے بہتر متصدی گری (کلرکی) میں دوسرا نہیں ہے اور جنگ میں بھی حضرت جنت آشیانی کے زمانہ سے اس فقیر کے وقت تک پیٹھ نہیں موڑی ہے اور ان کے پائے استقامت کو بھی لغزش نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے کبھی انہوں نے خودسری اور نمک حرامی نہیں کی ہے۔ لیکن

چونکہ وہ بہت زیادہ عزت و مرتبہ چاہتے ہیں جو عطا کرنا بہت مشکل ہے بہرحال وہ عطا کرنا چاہئے اور "کجدار و مریز" (ٹیڑھا رکھو اور نہ گرے) کے مصداق ہو۔

ہشتم ـــــ یہ کہ تورانی سپاہی مقرر ہیں وہ جنگ میں تاراج اور قید کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ عین جنگ میں واپس آنے سے جس کے معنی تیر بازکشی سمجھنا چاہیئے شرمندہ نہیں ہونے اور جہل مرکب ہنا۔ وستانیوں سے جو "سر برود لیکن جاں نرود" پر عمل کرتے ہیں ہزار درجہ بہتر ہیں۔ بہرصورت اس جماعت کے ساتھ بہت رعایت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ اکثر ایسی جگہ کام آتے ہیں جہاں دوسرے کام نہیں آتے۔

نہم ـــــ یہ کہ سادات بارہہ کے ساتھ بموجب آیہ وات ذی القربیٰ حقہٗ عمل کرنا چاہیئے۔ احترام و احتشام اور رعایت میں کسی قسم کی کمی نہ کرنی چاہیئے کیونکہ آیہ کریمہ "قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ" کے مطابق اس جماعت سے محبت کا بدلہ اجر نبوت ہے۔ اس میں کمی نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس کا ثمر دنیا و عقبیٰ میں ملے گا۔

لیکن سادات بارہہ کے ساتھ کمال احتیاط برتنی چاہیئے۔ ان کے ساتھ قلبی محبت میں کمی نہ آنی چاہیئے لیکن ان کا مرتبہ بہت زیادہ بلند نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ملک کا شریک غالب پھر ملک کا طالب ہو جاتا ہے۔ اگر تم نے عنان ملک ذرا سی بھی ان کے ہاتھ میں دیدی تو ندامت و خجالت اٹھانی پڑے گی۔

دہم ـــــ یہ کہ والی ملک کو دورہ کرنے میں کمی نہ کرنی چاہیئے اور ایک جگہ قیام پذیر ہونے سے بچنا چاہیئے۔ بظاہر اس میں آرام ہے لیکن یہ ہزاروں مصائب و تکالیف کا پیش خیمہ ہے۔

یازدہم ـــــ یہ کہ اپنے لڑکوں پر کبھی اعتماد نہ کرنا چاہیئے اور تاحیات ان کو بطور مصاحب کے نہ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر اعلیحضرت دارا شکوہ کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتے تو معاملہ یہاں تک نہ بڑھتا۔ کلمۃ الملک عقیمہ ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیئے۔

دوازدہم ـــــ یہ حکومت کا مضبوط ترین ستون سلطنت کی تمام خبروں سے باخبر رہنا ہے۔ اس سے ایک لمحہ کی غفلت ہزاروں سال کی ندامت کا باعث ہوتی ہے۔ شیواجی کے گرفتار کرنے میں ذرا سی غفلت ہو گئی اور پھر عمر بھر اس کی پریشانی باقی رہی۔

اثنا عشر ایک مبارک ہندسہ ہے اور میں نے بھی بارہ ہی وصیتیں کی ہیں۔

اگر دریافتی بر دانشت بوس
دگر غافل شدی افسوس افسوس

عدل عالمگیری ما بین شہزادہ اعظم و رعایا

بادشاہزادہ محمد اعظم شاہ نے عنایت اللہ خاں کو لکھا کہ میری درخواست بادشاہ تک پہنچا دی جائے۔

"سید لعل شاہ جو سہ پشت سے دربار مغلیہ میں منصبدار رہے میری جاگیر واقع مندسور میں آ کر مینوشی اور دوسری بدعات کرتا ہے حکم شاہی سے اس کی جاگیر چھین کر میرے نام منتقل کر دی جائے تاکہ اس فتنہ کا سدباب ہو جائے"

اس عرضی کی پشت پر شاہی دستخط کے ساتھ حکم صادر ہوا "محتسب کی خدمت اپنے ذمہ لینا اور دوسرے کی جاگیر کے تغیر کی درخواست دینا مضحکہ انگیز ہے۔ یک پشتی جاگیر کا تغیر محال ہے چہ جائیکہ سہ پشتی۔ میرے واسطے یہ فرزند (شہزادہ محمد اعظم) اور سید لال دونوں برابر ہیں بلکہ دوسری طرف سید لعل اپنی سیادت کے سبب ہزار درجہ زیادہ ہے۔ صدر الصدور اس جگہ کے محتسب کو لکھے تاکہ وہ اس امر کی تحقیق کر کے ہمیں مفصل حال لکھے الحمد للہ میں نے اعلیحضرت کی طرح اولاد کو اتنا زیادہ سر پر نہیں چڑھایا کہ بعد میں شرمندگی اور افسوس ہو"

ان چند احکام ہی سے حضرت عالمگیر کی سیرت، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے نظیر شہنشاہ جس کو تعصب کے پردوں میں چھپا رکھا ہے ایک بے تعصب شہنشاہ اور عادل انسان تھا۔

انجم تاباں

ازجناب تاباں ابن خیر سیماب

کہ عشق میں بے وفاؤں نے مارا
نگاہوں نے لوٹا اداؤں نے مارا
دہائی حقیقی خدا کی دہائی
مجھے ان مجازی خداؤں نے مارا

راز و نیاز

دل میں بس جاتے ہیں آنکھوں میں سمانے والے

از حضرت راز یزدانی رامپوری

کہیں ایسا نہ ہو منہ پھیر کے جانے والے — کہ تغافل سے کھٹک جائیں زمانے والے

وجہِ وحشت بھی تو سوچیں گے زمانے والے — احتیاطاً مجھے دیوانہ بنانے والے

دامنِ صبر بھی ہاتوں سے اگر چھوٹ گیا؟ — او مرے ہاتھ سے دامن کو چھڑانے والے

یں تری زحمتِ بیداد کے لائق تو نہ تھا — تیرے قربان مرے دل کو جلانے والے

ں ابھی یاد ہے احسانِ تجلّی مجھکو — ہاں ابھی ہوش میں ہوں ہوش اڑانے والے

طف تو جب ہے کہ خاکسترِ دل بھی نہ رہے — بجلیاں اپنے تبسّم سے گرانے والے

اسے کفر سمجھ لو کہ محبّت کہہ دو — دل میں بس جاتے ہیں آنکھوں میں سمانے والے

ب پر اک نام نہ لانے کا اگر ہوش رہے — تو کسے عذر ہے دیوانہ بنانے والے

تراف اور محبّت کا کسے کہتے ہیں — او فقط مجھ سے نگاہوں کو بچانے والے

دل کی ہستی ہی محبّت میں عجب راز ہے اے راز

جس کو سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے زمانے والے

لعل کی چوری

تاریخی افسانہ

از جناب مولوی نور احمد خاں فریدی فاضل السنہ شرقیہ

آج سے پانچسو سال قبل جب اعظم السلاطین سکندر لودھی گوالیا کے فلک بوس اور عجوبۂ روزگار قلعہ کو مسخر کرلینے کے بعد اس کے ضبط ونسق میں مصروف تھے۔ اس قلعہ کے نشیب میں مزدوری پیشہ لوگوں کی ایک بستی آباد تھی جس میں شامو اور پہاڑی دو بھائی رہتے تھے۔

پہاڑی شامو سے پانچ برس چھوٹا تھا۔ دونوں سگے بھائی تھے اور آپس میں خوب بنھ رہی تھی۔ دونوں صبح کا ناشتہ کرکے ہمسایوں کے ساتھ پہاڑ کی چکردار سڑک کو طے کرتے ہوئے شہر میں پہنچتے اور دن بھر محنت مزدوری کرکے شام کو اپنا نصیبہ لے گھر کو لوٹ آتے۔

محرم سنہ ۹۱۳ھ دفعتہ سلطان کے قشون قاہرہ کے کوچ کا اعلان ہوا اور لشکری اپنے اپنے ہتھیاروں کو درست کرنے لگے۔ بازاروں میں اچھی خاصی رونق ہوگئی۔ جہاں کہیں دو چار آدمی جمع ہوتے یہی چرچا شروع ہوجاتا۔

پہاڑی ایک تنومند نوجوان تھا۔ اور بستی میں چلبلے پن کی وجہ سے مشہور تھا۔ اکھاڑے کی اس کے دم سے رونق تھی۔ وہ فطرتاً دلیر واقع ہوا تھا۔ سپاہیوں کی زبانی جب وہ جنگ وجدل اور لوٹ مار کے قصے سنتا تو اسکی شریانوں میں بہادری کا خون کھول اٹھتا اور وہ دل ہی دل میں اپنے اس ذلیل پیشے سے نفرت کرنے لگتا۔ گھر آتا۔ تو کہتا۔ "بھیا روز روز کی یہ مزدوری ہم سے نہیں کی جاسکتی۔ ہم تو جنگ پر جائینگے۔"

شامو کہتا۔ "نہ بھائی۔ لڑائی پر جانا ہمارا کام نہیں۔ ہم تم تو پتھر ڈھونے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اگر جنگ پر چند پیسوں کے ملنے کی امید ہے تو قدم قدم پر جان کا خطرہ بھی ساتھ ہے لیکن پہاڑی پر جو نشہ چڑھ چکا تھا شامو کے سمجھانے بجھانے سے نہ اُترا اور وہ اپنے ارادے پر نہایت مستقل مزاجی سے ڈٹا رہا۔

---

۱۵ محرم کو جب شامو اور پہاڑی دوپہر کا کھانا کپڑے میں باندھے پہاڑ کی چڑھائی کاٹ رہے تھے اچانک قلعہ کے نوبت خانے سے نفیریوں اور قرناؤں کے بجنے کی آواز آئی۔ اور توپوں کی دنادن سے قلعہ کی فضا گونج اٹھی۔ دونوں بھائی چلتے چلتے رک گئے اور غور سے قلعہ کی طرف دیکھنے لگے۔

قلعہ کا فلک رفعت دروازہ بعد شان وشکوہ اتنے بُعد کے باوجود اس قدر صاف نظر آرہا تھا گویا اس کے قدموں میں کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ شہنائیوں اور دماموں کی آواز مسلسل آرہی تھی اور جنگی سازوں نے وہ سماں باندھ رکھا تھا کہ جوش اور بہادری کا لہو دلوں میں کھولنے لگتا۔ اس ہنگامہ کے ساتھ ساتھ قلعہ کا دروازہ کھلا اور ایک کوہ پیکر ہاتھی نکلا جس پر اژدہا کی شکل کا شاہی نشان ہوا میں فراٹے لے رہا تھا۔ اس کے پیچھے اور ہاتھی نمودار ہوئے ان پر لودھی سلاطین کے مخصوص طبل وعلم اور سلطنت ہند کا ماہی مراتب آفتاب کی سنہری کرنوں میں اپنے انعکاسی عمل سے عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ پیچھے چند اور ہاتھی آئے ان پر برجی اور فولادی نقارے اور دمامے لدے تھے اور نقارچی فاتحانہ دھریت بجا رہے تھے۔ شامو نے حیران ہوکر پہاڑی کو دیکھا اور کہا۔ "پہاڑی! کبھی پہلے بھی تمھاری نگاہوں نے اتنا سامان دیکھا ہے۔"

"ہاں بھیا! سکندر کا لشکر ہے۔ کوئی مذاق نہیں!"

اتنے میں فوج کے ہاتھی ان کے پاس سے گزرنے لگے۔ جب نوبت خانے کے ہاتھی گزر چکے تو ان کے بعد کئی ہزار ہاتھی ہودج او عماری سے آراستہ سونڈوں میں فولادی زنجیریں لئے۔ گلے میں ہیکلیں، پیشانیاں شام شفق کی طرح رنگین ایک آن بان اور شان و شوکت سے ان کے آگے سے گزرنے شروع ہوئے۔

ہاتھیوں کے بعد سلطان کی سواری نہایت تزک و احتشام سے سلطان بگو کے سفید ہاتھی پر عجب تمکنت سے سوار تھا اور پیچھے وزیر اعظم اور دیگر اراکین دربار کے ہاتھی جھومتے جھامتے چلے آ

تھے۔ عقب میں ہزاروں سوار اپنے گھوڑوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیادوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جن کا شمار انسانی فکر و خیال سے بھی باہر تھا۔ پہاڑی کا دل قابو میں نہ رہا۔ اور بولا بھیا میں تو جاتا ہوں۔ خدا معلوم شامو کو کیا سوجھی کہ وہ بھی جنگ پر چلنے کو آمادہ ہو گیا۔ دونوں دوڑے دوڑے گھر پہنچے اور معمولی زاد راہ ہمراہ لیکر پیادوں کے ساتھ چل دیئے۔

سکندری اقبال سے پہاڑ بھی ذرّے بن کر اُڑ گئے۔ ہنونت گڑھ کے سنگین دیواروں کی کیا حقیقت تھی۔ سکندری جانبازوں نے تلواریں نیام سے نکال، جان کی بازی لگا، قلعے پر ہلّہ بول دیا اور جو مہم مجاہد خاں کی بددیانتی سے چھ ماہ کے طویل عرصہ میں سر نہ ہو سکی تھی شہنشاہ کے قشون قاہرہ نے ایک ہی حملہ میں جیت لی اور ہنونت گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بج دی گئی۔ لیکن اس وقت جب افواج سلطانی شہر کے تاخت و تاراج میں مصروف تھیں شامو اور پہاڑی نے بھی دار و گیر کے اس ہنگامہ میں ایک سیٹھ کے مکان پر چھاپہ مارا اور چوہوں کی طرح دبے پاؤں اشرفیوں کی چند تھیلیاں اور چند ریشمی پارچات اڑا آنکھ بچا کر باہر نکل آئے اور چپکے چپکے شہر کے باہر ویرانے میں جا کر اطمینان کا سانس لیا۔

پہاڑی نے کہا۔ لو بھائی بیٹھ کر ان کو آپس میں بانٹ لیں شامو نے تھیلیوں کو الٹ دیا۔ اشرفیوں کی جگمگاہٹ سے کھنڈر بھی چمک اٹھا اور دو لعل بے بہا جگمگ جگمگ کرتے ہوئے نکل آئے جس سے دونوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ شامو نے فوراً ان کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ دیا۔ سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری قسمت جاگ اٹھی دونوں لعل ہیں ان کو چھپا لو۔ رات کا وقت ہے۔ دیکھا ہوا ہماری طرح کوئی اور شخص بھی اس کھنڈر میں موجود ہو۔"

چنانچہ دونوں بھائیوں نے جلدی جلدی برابر اشرفیوں کو بانٹ لیا اور یہ لعل بھی الگ الگ اپنی اپنی تھیلیوں میں ڈال لئے۔

"لو بھائی، ہماری زندگی کے لئے اتنا کچھ کافی ہے۔ چلو اب وطن کو لوٹ چلیں اور بقیہ زندگی عیش و آرام سے بسر کریں۔" پہاڑی نے نہایت رازدارانہ طور پر کہا۔

"بس اسی لئے مجھے تنگ کرتے تھے۔ اب اگر آ چکے ہو تو چندے اور فوج میں رہ کر اپنی بہادری کے جوہر دکھاؤ۔ کیا عجب کہ سلطان کی نگاہ پڑ جائے اور تمھیں کسی اچھے عہدے پر لگا دے۔"

"نہ بھائی۔ مجھے اتنا کافی ہے۔ زیادہ حرص آدمی کو خراب کرتی ہے میں تو اب گھر جاؤں گا۔ گوالیار کا قلعہ، حسین پہاڑ، لالو اور نندو کی دوستی، اور سب سے بڑھ کر اپنا وہ پیارا پیارا نمبر پترا، کیا یہ بھلانے کی چیزیں ہیں۔"

جس وقت شامو نے دیکھا کہ پہاڑی واپس جانے پر مصر ہے تو اس نے اور اصرار مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنا مال بھی اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ "یہ چیزیں میرے گھر میں دے دینا۔" دونوں بھائی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ملے۔ شامو نے بال بچوں کی خبرگیری اور گھر کی نگرانی وغیرہ کی ہدایت کر کے پہاڑی کو رخصت کر دیا۔

شامو دو برس تک اورنگ شاہ کے ساتھ ساتھ لکھنوتی کے اطراف میں پھرتا رہا۔ لیکن چونکہ راجے مہاراجے سلطان کی اطاعت قبول کر لیتے تھے۔ لہٰذا کسی جگہ بھی لوٹ مار کی اجازت نہ ملی اس لئے معمولی سامان کے ساتھ گوالیار کو واپس ہوا اور آتے ہی بیوی سے اپنی امانت کا مطالبہ کیا۔

"بنیا" شامو کی نیک بخت بیوی تھی۔ اس غریب نے اتنا عرصہ نہایت کفایت شعاری سے گذارا تھا۔ اس نے تفصیل سے کہا۔ کہ اتنے روپے بال بچوں پر خرچ ہوئے۔ اتنے کے ہم نے کپڑے خریدے باقی یہ اشرفیاں جوں کی توں رکھی ہیں۔"

شامو نے فکرمند ہو کر کہا۔ "اچھا خیر، یہ تو درست ہوا۔ مگر وہ لعل کہاں ہے؟"

"لعل کون سا؟ میں تو لعل وال کچھ نہیں دیکھا؟" بنیا نے گھبرا کر جواب دیا۔

شامو کی آنکھیں غصہ سے لال پیلی ہو گئیں۔ وہ چمک کر بولا "کیا میرے بھائی نے تم کو لعل نہیں دیا۔"

"بالکل نہیں ——!"

شامو گھبرا کر اٹھا۔ آواز دیکر بھائی کو بلایا۔ "پہاڑی بھیا! پہاڑی بھیا!"

پہاڑی چھری سے رسی کاٹ رہا تھا۔ چھری وہیں پھینک آہستہ آہستہ شامو کے پاس آیا۔

"میرا لعل کہاں ہے؟" شامو نے پریشانی کے عالم میں چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"لعل؟ وہ تو آتے ہی میں نے بھاوجہ کے حوالے کر دیا تھا۔"

یہ سن کر بنیا باہر نکل آئی اور سراسیمگی کی حالت میں بولی "بہاڑی بھیا! کیا کہہ رہے ہو؟ لعل اور مجھے؟"

"اس وقت تو خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی اور ہر جگہ اچھالتی پھرتی تھی۔ اب کہتی ہے کیسا لعل؟ گویا جانتی کچھ نہیں"

"ہائے میرے بھگوان! اب میں کیا کروں" شدت غم سے بنیا ٹھہر نہ سکی اور روتی ہوئی کوٹھری میں چلی گئی۔

شامو بیچارہ تذبذب میں تھا کہ بہاڑی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "عورت ذات سے خدا بچائے۔ کس طرح منہ پر جھٹ مکر گئی ہے؟ شامو بھائی! سیدھے ہاتھ کام نہ چلے گا۔ ذرا آنکھیں دکھاؤ۔ لعل گھر ہی میں ہے۔ کہاں جا سکتا ہے؟" یہ کہہ پھر چھری اٹھا اپنے کام میں لگ گیا۔

بنیا کمرے میں چارپائی پر پڑی سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی، شامو نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا۔ "یہ بھو کی ماں ہزاروں لاکھوں کی چیز ہے تمھارے رونے دھونے سے وہ ہضم نہیں ہو سکتی بہتر ہے کہ واپس کر دو۔ ورنہ میں بری طرح پیش آؤنگا"

بنیا نے جب شوہر کے تیور بدلے دیکھے اور کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آئی تو عورت ذات ہو کر مردانہ وار جواب دیا کہ رات کی مہلت دیدو صبح کو لعل حاضر کر دونگی۔ اس پر معاملہ صبح پر ملتوی ہو گیا۔

اس رات بنیا کو فکروں سے ایک لحظہ بھی نیند نہ آئی۔ سوچتے سوچتے صبح کر دی اور بڑے سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیئے۔ چنانچہ صبح سویرے ہاتھ منہ دھو، صاف ستھرا لباس پہن شہر کو روانہ ہو گئی۔

اور ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا کہ بنیا "میر عدل" (چیف جسٹس) کی عدالت گاہ میں جا پہنچی۔ سردی کا موسم۔ کہر چھائی ہوئی تھی۔ بدن ٹھٹھر رہا تھا۔ اکثر لوگ صبح کی نماز پڑھکر گھروں کو لوٹ رہے تھے یہ برآمدے کے ایک کونے میں دبکی کھڑی تھی۔ ایک شریف آدمی پاس سے گذرا۔ بنیا نے گلوگیر آواز میں پوچھا "میر عدل کب آئینگے؟"

"پہر دن کو ــــ!"

"میں نے ان سے ضروری ملنا تھا"

"ان کے ہاں گھر میں چلی جاؤ۔ وہ بہت نیک آدمی ہیں۔ ہر شخص سے باخلاق پیش آتے ہیں"

"میں نے ان کا گھر دیکھا ہوتا تو یہاں کیوں آتی؟"

"وہ، چوک کے دائیں طرف جو بڑا محل نظر آتا ہے۔ یہی گوالیار کے میر عدل میاں بھورہ صاحب کا مکان ہے"

یہ بیچاری ادھر کو روانہ ہوئی۔ اگرچہ دربانوں نے ٹوکا کہ یہ میاں صاحب کے اوراد و وظائف کا وقت ہے مگر وہ تیر کی طرح اندر چلی گئی۔ میاں بھورہ صاحب، سفید ریش، پچاس برس کی عمر، مصلے پر بیٹھے اوراد و اذکار میں مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فرمایا ہو نند ــــ؟ یعنی حال بیان کر؟"

ستم رسیدہ بنیا نے سارا واقعہ من وعن بیان کیا۔ میاں صاحب نے وظائف سے فارغ ہو کر فوراً اپنا پیادہ دوڑایا کہ اس کے شوہر اور دیور کو بلا کر عدالت میں حاضر کریں۔ بنیا کو تسلی دی اور گھر میں اس کے کھانے کا حکم دیکر عدالت کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

پہر دن چڑھے عدالت گاہ میں بنیا کی طلبی ہوئی۔ اس اثنا میں شامو اور بہاڑی بھی آ گئے تھے۔ میاں بھورہ نے فرداً فرداً بنیا، اور اس کے شوہر کے بیانات قلمبند کئے اور پھر بہاڑی سے سوالات کرنے شروع کئے۔ اس نے ہر طرح سے عدالت کو تسلی دلائی کہ وہ لعل اپنی بھاوجہ کو دے چکا ہے۔

میاں بھورہ نے پوچھا۔ "اس واقعہ کے گواہ ہیں؟"

"جی ہاں ــــ"

"کتنے ــــ؟"

"دو برہمن۔"

"حاضر کرو"

بہاڑی لپک کر قمار خانے میں پہنچا اور دو قمار باز برہمنوں کو کچھ دے دلا کر اپنی منشا کے مطابق گواہی دینے پر رضامند کر لیا چنانچہ وہ دونوں عدالت میں آئے اور گواہی دی کہ بہاڑی نے ہماری موجودگی ہی میں بنیا کو لعل دیا تھا۔

میاں بھورہ نے بنیا کی طرف مخاطب ہو کر کہا "افسوس کہ عدالت تمھیں بے قصور ثابت نہیں کر سکتی۔ شامو سے فرمایا کہ تم اپنی بیوی سے لعل حاصل کر سکتے ہو"

حیرت سے بنیا کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ اور دنیا اسے اندھیر معلوم ہونے لگی۔ ایک دلدوز آہ کھینچی اور مرتعش آواز سے کہا۔ کیا آپ کا انصاف یہی ہے ــــ؟" اور یہ کہہ کر دم بخود کمرے سے باہر نکل آئی۔

لوگوں نے جو اس موقع پر عدالت گاہ کے باہر جمع ہو گئے تھے بینا کو مشورہ دیا کہ خوش قسمتی سے سلطان آج کل یہیں ہے اس کی بارگاہ میں جا کر فریاد کرے۔ یقیناً انصاف ہوگا۔

"ہاں میں اپنے دکھ کی فریاد شہنشاہ کے پاس لے کر جاؤں گی" یہ کہکر قلعے کا رخ کیا اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر رقت بھری آواز سے کہا۔ "اے آسمان کے بادشاہ تو دیکھ رہا ہے، میں سلطان ہند کے دربار میں دادخواہی کے لئے جا رہی ہوں اگر شہنشاہ نے میرا انصاف نہ کیا تو اس کا بدلہ تجھے لینا ہوگا۔"

بینا بے دھڑک بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دیوان عام کا داخلی دروازہ آگیا۔

اعظم السلاطین سکندر ثانی شہنشاہ ہند شاہانہ شوکت و اجلال سے تخت پر بیٹھا ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا کہ چوبدار نے داخل ہو کر عرض کی۔ "عالم پناہ! ایک ہندو دیوی دروازے پر کھڑی ہے اور باریابی کی اجازت چاہتی ہے۔"

"اسے ہمارے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ہے۔" سلطان نے نظر اٹھا کر چوبدار سے خطاب کیا۔

چوبدار کورنش بجا لا کر باہر نکل گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیا دربار میں داخل ہوئی۔ شرم و حیا سے نگاہیں زمین پر جم رہی تھیں اور رعب شاہی سے قدم سو سو من کے ہو رہے تھے۔

سلطان نے بڑی نرمی سے فرمایا۔ "بہن! کہو میں تمھاری کیا امداد کر سکتا ہوں؟"

"جہاں پناہ! میری زندگی خطرے میں ہے۔ میں ظل اللہ کی حمایت میں اپنی جان بچانے آئی ہوں ــ سنا ہے کہ بادشاہ رعایا کے محافظ ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر بینا زار زار رونے لگی۔

سلطان نے دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ کہا۔ "مابدولت تمھاری درد بھری کہانی کو تفصیل کے ساتھ سننا پسند کرینگے۔"

بینا نے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ جواب دیا۔ "عالم پناہ دو سال کا عرصہ گذرا۔ میرے شوہر نے سفر سے میرے دیور کے ہاتھ لعل بھیجا کہ میرے گھر میں دیدینا لیکن اس نے بددیانتی کی اور لعل کا یہاں ذکر تک نہ کیا۔" بینا کے غم کی شدت سے آنسو گرنے لگے۔ مرتعش آواز میں بولی۔ "اب وہ مجھے چوری کا الزام دیتے ہیں۔ سلطان تیرے راج میں میں مفت میں ماری جا رہی ہوں۔"

سلطان نے کہا۔ "اچھا تو ہمارے میر عدل میاں بھورا کے حضور میں کیوں پیش نہیں ہوئی؟"

"میں گئی تھی مگر وہاں مناسب تحقیقات اور پرسش نہیں ہوئی" بینا نے جواب دیا۔

سلطان نے اسی وقت حکم دیا کہ ہمارے میر عدل اور مظلومہ کے شوہر اور دیور کو دربار میں حاضر کیا جائے۔

ہرکارے دوڑے دوڑے گئے اور چشم زدن میں میر عدل شامو اور بہاڑی کو گواہان سمیت دربار میں لا کر پیش کیا۔

میاں بھورا کو تو بادشاہ نے تخت کے قریب جگہ دی، اور افراد مقدمہ کے بارے میں حکم فرمایا کہ باری باری طلبی پر حاضر ہوں۔

سب سے پہلے شامو طلب کیا گیا اور تھوڑی سی موم اس کے ہاتھ میں دیکر فرمایا کہ لعل کی ہیئت تیار کر دو۔ شامو نے تھوڑی سی دیر میں لعل کی ہیئت تیار کر دی۔ پھر بہاڑی حاضر ہوا۔ اس نے بھی اشارہ پاکر لعل کی شکل و صورت میں موم کو ڈھال کر پیش کیا۔ ان کے بعد دونوں برہمن طلب ہوئے انھوں نے سکندری فرمان پر بس تو بنائے مگر بے ڈھنگے شکلیں آپس میں ملتی نہ تھیں۔ بادشاہ نے ان کو بھی چھپا کر رکھ دیا۔ پھر بینا پیش ہوئی اور سلطان نے اسے بھی لعل بنانے کا حکم دیا۔ بینا نے دست بستہ عرض کی کہ "لونڈی نے جس چیز کو آنکھوں سے نہیں دیکھا اس کی شکل کیسے تیار کر سکتی ہے؟"

"اچھا تو لعل کی ہیئت تیار نہیں کر سکتی۔" سلطان نے یہ کہکر حکم دیا کہ گواہ پیش ہوں۔

دونوں جواری ڈرتے ڈرتے پیش ہوئے۔ سلطان نے غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا کہ دیکھو تم اپنے بادشاہ کے حضور میں پیش ہو جو خدا کی طرف سے تمھاری جان اور مال کا محافظ ہے اگر سچ بولو گے تو جان بچ جائیگی۔ ورنہ ذلت سے مارے جاؤ گے۔"

برہمنوں پر رعب شاہی سے لرزہ طاری ہو گیا زبان نے یارا نہ کیا اور دائیں بائیں بغلیں جھانکنے لگے۔

سلطان کی گرج سے دیوان عام گونج اٹھا۔ قہر و غضب سے آنکھیں شعلہ جوالہ بن گئیں اور فرمایا۔ "قوم اور ملک کے غدارو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ابھی تک بادشاہ پر تمھاری سیاہ کاری کا راز فاش نہیں ہوا؟" یہ کہہ کر سلطان نے لعل کی تمام ہیئتیں تخت کے روبرو رکھدیں اور اہل دربار سے خطاب کرکے فرمایا۔

"حضرات! دیکھئے یہ ہیئتیں شامو اور بہاڑی کی بنائی ہوئی

ہیں-آپس میں کس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔ درحقیقت یہ لعل کی اصلی ہیئت ہے۔" پھر گواہوں کی شکلیں پیش کر کے فرمایا" اب گواہوں کی بنائی ہوئی شکلیں ملاحظہ فرمایئے۔ یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ لعل کس شکل وصورت کا ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں جھوٹے گواہ ہیں اور بہاڑی نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیۓ انھیں پیش کیا ہے۔"

اس پر سلطان نے پھر آتش بار نظروں سے بہاڑی اور اس کے گواہوں کو دیکھا-جس پر خوف سے ان پر سکتہ کی حالت طاری ہوگئی اور موت کا نقشہ ان کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔ تینوں ملزم تخت کے سامنے جھک گئے اور اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کے طالب ہوئے مگر ان کی اس عاجزانہ استدعا نے بادشاہ کے دل پر اثر کرنے کی بجائے اس کے "رخش غضب" پر "مہمیز" کا کام کیا۔ اور چلا کر بولا "تم لوگوں کو معافی دیدوں؟ جن کی وجہ سے ایک بیوی کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اگر خدانخواستہ یہ مظلومہ ہمارے دربار تک نہ پہنچ سکتی تو خدا معلوم اس کا ظالم شوہر اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔"

فرمان ہوا کہ بہاڑی سے لعل حاصل کر کے شامو کو دلایا جائے اور اس بددیانتی کے جرم میں اسے دو سال قید بامشقت اور گواہوں کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی جائے۔ پولیس نے اسی وقت مجرموں کو اپنی حراست میں لے لیا اور سلطان نے بینا کو محض اس خیال سے کہ میری سلطنت میں اسے مفت کی تکلیف ہوئی قیمتی مال مرحمت کر کے ہمدردی و دلسوزی سے رخصت کیا۔ اور میاں بھورہ کو ہدایت فرمائی کہ آئندہ مقدمہ کی کُنہ تک پہنچنے کے لئے کافی تدبر اور تفکر سے کام لیا کریں۔

کامل بنادیا

خلوت میں اسکی یاد نے کامل بنا دیا

از جناب محمد صابر ضبط ایم-اے

آزارِ حسن نے مجھے کامل بنا دیا
سوز و گداز عشق ہی کو دل بنا دیا

موجوں نے جب کیا مجھے غرقابِ بحرِ عشق
تو میں نے بحرِ عشق کو ساحل بنا دیا

جلوت میں بھی نہ بھول کے چھوڑا خیالِ دوست
خلوت میں اس کی یاد نے کامل بنا دیا

صد شکر تیری بزم میں جلتا ہوں مثلِ شمع
سوز ... دل نے زینتِ محفل بنا دیا

آشوبِ روزگار تھی کیا وہ نگاہِ ناز
ہر ذرّۂ حیات کو بھی دل بنا دیا

بخشا وفورِ درد نے مجھ کو سکونِ دل
میں موجِ بے پناہ تھا ساحل بنا دیا

کرتے نہیں وہ اب نگہِ قہر بھی اِدھر
کیوں غم نے مجھکو رحم کے قابل بنا دیا

کس نے دیا ہے دردِ فراوانِ آرزو
ظالم تجھی نے دل کو مرے دل بنا دیا

اے آفتابِ حسن یہ ذرّہ نوازیاں
داغِ جگر کو نور کا حامل بنا دیا

واماندگیٔ راہِ محبت کو کیا کہوں
مجھکو اسی نے ذرّہ منزل بنا دیا

اے ضبطِ ضبطِ آہ سے شہرت ہوئی کچھ اور
رکھنا بھی رازِ حسن کا مشکل بنا دیا

حافظ ابن قیم الجوزیہ رح

کتاب التقدیر کے مصنف پر ایک نظر

از :۔ جناب زاہد الرضوی قیصر (فاضل دیوبند)

مسلمانوں کی سیاسی اور علمی و عملی ترقی کا آفتاب پانچویں صدی ہجری سے ڈھلنا شروع ہوگیا تھا۔ اس کے بعد جتنے لوگ پیدا ہوئے وہ صرف اسلاف کے خوشہ چین تھے۔ لیکن خوشہ چینوں کی اس جماعت سے اگر علامہ ابن قیم کا استثنا نہ کیا جائے تو یہ سخت ناانصافی اور ظلم ہوگا۔ جن کا زمانہ اگرچہ اسلامی علوم و فنون کے تنزل و انحطاط کا زمانہ ہے مگر وہ اپنے گوناگوں علمی کمالات کی بنا پر متاخرین علمائے اسلام میں مرجع ورتبہ کش کے اس بلند مقام پر فائز ہیں جس میں بہت ہی کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

محمد نام ابو عبداللہ کنیت، شمس الدین لقب اور عرف ابن قیم الجوزیہ ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد بن حریز الزرعی ثم الدمشقی۔ ۷ صفر ۶۹۱ھ کو دمشق میں ۔۔ نام کا صدر مقام ہے پیدا ہوئے۔ علامہ کے والد ابو بکر بن ایوب ۔۔ت بڑے اور جید عالم تھے۔ دمشق کے سب سے بڑے دار الحدیث مدرستہ الجوزیہ کے مہتمم تھے[۱]۔ ان کو علم فرائض میں ایسا ملکہ حاصل تھا وہ اس فن کے موجد سمجھے جاتے تھے۔ اپنے زمانہ میں ان سے ۔۔تر اس علم کا کوئی عالم نہ تھا۔ علامہ نے فرائض کا علم اپنے والد ہی سے حاصل کیا تھا۔

علامہ نے عربی ادب مجد تونسی اور ابن ابی الفتح بعلبکی سے پڑھا۔ فقہ شیخ الفخر محمد حرانی اور اپنے والد ابو بکر بن ایوب سے حاصل کیا۔ اصول فقہ اور اصول حدیث میں صفی الہندی اور ابن تیمیہ ان کے استاد ہیں۔ قاضی تقی الدین سلیمان، ابو بکر بن عبدالدائم ابو نصر بن الشیرازی، اور عیسی المطعم وغیرہ حدیث کے استاد ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے حضرات ہیں جن میں شہاب نابلسی، اسماعیل بن مکتوم، فاطمہ بنت جوہر زیادہ قابل ذکر ہیں۔

علامہ کو تمام علوم متداولہ میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ آپ ایک ہی وقت میں محدث۔ فقیہ۔ متکلم۔ مفسر اور ادیب تھے لیکن تفسیر، اصول فقہ اور تصوف میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا اور ان علوم پر مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام متداولہ علوم و فنون میں بھی ان کے زمانہ میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب سے بھی پوری پوری واقفیت رکھتے تھے۔ اور ان کے ہر ایک جزو کے متعلق بہت کافی معلومات حاصل تھیں۔ الغرض ہر علم اور ہر مذہب کے کلی و جزئی مسائل

۔ زرع کی طرف نسبت ہے جو حوران کے مضافات میں ہے اور اب ۔۔کا نام ازرع ہے[۲]۔ علامہ کی عرفیت ابن قیم الجوزیہ کی وجہ کر ۔۔دل کو شبہ ہوا ہے کہ ان کے اجداد میں کوئی قیم نامی شخص گذرا ہے ۔۔ کی طرف علامہ منسوب ہیں جیسا کہ عربی نسبتوں میں کثرت سے ہوتا ۔۔ مثلاً ابن خلدون کہ اصلی نام عبدالرحمن ہے اور خلدون جد امجد ۔۔ ہے جو دسویں پشت میں ہے۔ چنانچہ خیر الکلام (جو علامہ ابن ۔۔ کی کتاب جلاء الافہام کا ترجمہ ہے) میں مترجم نے مصنف کے مختصر ۔۔ات لکھے ہیں اس میں یہی غلطی ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں: "مورث ۔۔سے منسوب ہونے کے باعث ابن القیم مشہور ہیں۔" لیکن یہ صحیح ۔۔ ہے۔ ابن قیم کے اجداد میں کوئی شخص قیم نامی نہیں ملتا[۳]

۔۔ جس کی بنا پر یہ اس عرفیت سے مشہور ہوں۔ اصل یہ ہے کہ ابن قیم کے والد ابو بکر بن ایوب "مدرستہ الجوزیہ" کے مہتمم تھے اور عربی زبان میں مہتمم کو قیم بھی کہتے ہیں اس وجہ سے عام و خاص میں صاحبزادہ ابن قیم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ایسے ہی "جوزیہ" کی وجہ سے لوگوں میں اشتباہ ہوا ہے کہ یہ کسی شہر وغیرہ کی نسبت ہے حالانکہ یہ بھی غلط ہے کیونکہ یہ نسبت بھی اسی مدرسہ کی طرف ہے جس کے مہتمم ان کے والد تھے۔ اور جو مشہور محدث ابن جوزی کا قائم کردہ ہے۔ اور یہ ایسی ہی نسبت ہے جیسے "مہتمم دار العلوم" تو "ابن قیم الجوزیہ" کا مطلب یہ ہوا کہ "مدرستہ الجوزیہ کے مہتمم کے صاحبزادہ"۔

کے متعلق علامہ کو جزئی معلومات حاصل تھیں۔ وہ طبعًا نہایت بیخوف بیباک اور نڈر تھے ہر مسئلہ پر آزادانہ گفتگو کرتے تھے اور مختلف فیہ مسائل میں بلا کسی پس وپیش کے اپنی رائے بیان کرتے تھے۔ علامہ نے مدرسہ صدریہ میں ایک مدت تک درس بھی دیا ہے جس کی وجہ سے ہزارہا انسانوں نے ان سے علمی فیض حاصل کیا۔ اسی علم وفضل کی وجہ سے والد کی وفات کے بعد آپ کو "مدرسۃ الجوزیہ" کا سرپرست بنایا گیا۔ جس کے مہتمم ان کے والد رہ چکے تھے۔ علامہ بہترین مقرر تھے۔ ان کی خوش بیانی بہت مشہور تھی۔ تقریر معلومات سے لبریز ہوتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا علم کا ایک دریا ہے جس میں طغیانی آرہی ہے۔ ہزارہا مخلوق اس سے فیضیاب ہوتی تھی۔ اہل ذوق اپنی علمی تشنگی فرو کرنے کے لئے طول طویل سفر اختیار کرکے حاضر ہوتے تھے، اسی علم وفضل اور فیض کا نتیجہ تھا کہ علامہ مجدد ومجتہد جیسے بلند و برتر مقامات پر فائز ہوئے لیکن جہاں ان کو اجتہاد کا درجہ ملا اسی کے ساتھ ساتھ لوگوں نے ان پر سخت تنقیدیں بھی کیں۔ چنانچہ علامہ کو صرف حنابلہ سے خارج ہی کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ غیر مقلد اور اسلام سے خارج بھی بتایا گیا۔

علامہ ابن قیم نہایت عابد وزاہد اور تہجد گزار تھے۔ ذکر و تلاوت اکثر سرًا کرتے تھے لیکن جب کبھی جہر کے ساتھ فرماتے تو ایک عجیب سماں ہوتا تھا۔ آواز میں درد ہونے کی وجہ سے قلوب پر بہت اثر پڑتا تھا۔ متعدد حج کئے اور خاص مکہ معظمہ میں لوگوں کو بے انتہا علمی فیض پہنچا۔ کتب رجال میں علامہ کی عبادت وغیرہ کے جو تذکرے ملتے ہیں وہ بہت تعجب خیز ہیں اور آسانی سے ان پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن علامہ کی زندگی پر نظر کرنے سے تعجب واشتباہ کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور سمجھ میں آتا ہے کہ حقیقت حال ہے۔ علامہ کثرت سے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے تھے چنانچہ صبح کی نماز کے بعد سے جو مراقب ہو کر بیٹھتے تھے تو جب تک سورج کافی بلند نہ ہوجاتا ذکر ہی میں مصروف رہتے۔

اسی دینداری اور روحانیت کا نتیجہ تھا کہ علامہ میں اخلاق فاضلہ پیدا ہوئے۔ نہ وہ کسی سے بغض وحسد کرتے اور نہ ان کے دل میں کینہ تھا۔ وہ خوددار ضرور تھے لیکن غرور وتکبر سے ناآشنا اور نہایت منکسر المزاج، نہایت خوش اخلاق اور منس مکھ انسان تھے۔ غرضکہ ایک کامل ومکمل انسان میں جن اخلاق فاضلہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب علامہ کی ذات میں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر تھے

اس علم وفضل کے ہوتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس قدر مخلوق ان سے فیضیاب ہوئی ہوگی۔ اور خصوصًا جب کہ علامہ نے مدرسہ صدریہ میں باقاعدہ درس کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ ہزارہا لوگوں کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ جن میں علامہ کے دو صاحبزادے ابراہیم وعبداللہ ابن رجب حنبلی۔ محمد بن عبدالقادر نابلسی، محمد بن یعقوب (صاحب قاموس) وغیرہ جلیل القدر حضرات بھی داخل ہیں۔

اساتذہ کی اس طویل فہرست میں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں جو خصوصیت حافظ ابن تیمیہ[1] کو حاصل ہے اس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔ علامہ کو حافظ ابن تیمیہ سے والہانہ تعلق تھا۔ ان پر شیخ کا رنگ یہاں تک غالب تھا کہ کسی مسئلہ میں ان سے اختلاف کرنا پسند نہ کرتے۔ ہر مسئلہ میں ان کا اتباع فرض سمجھتے تھے۔ ہر جزئیہ اور ہر قول میں ان کے ہمزبان تھے۔ اور اس کے دلائل و توجیہات بیان کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ علامہ نے اپنی تمام عمر حافظ ابن تیمیہ کے علوم نشر کرنے میں صرف کردی اگرچہ اس کی وجہ سے ان کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ کے مشہور فتویٰ کہ "مسجد ابراہیم (علیہ السلام) کے لئے مستقل طور پر سفر کرنا ناجائز ہے" کی بنا پر ابن تیمیہ سے لوگوں نے جھگڑنا شروع کیا۔ علامہ نے اس کے دلائل وشواہد بیان کئے کہ "کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بجز تین مسجدوں کے کسی مسجد کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے" مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی ؟ اس پر ایک عام شورش پیدا ہوئی۔ حکومت نے دونوں استاد و شاگرد کو گرفتار کرکے نظر بند کردیا۔ ایک اور مرتبہ ابن تیمیہ کے فتاویٰ کی وجہ سے علامہ گرفتار ہوئے۔ الغرض شیخ کی حمایت میں کبھی مناظرے کئے کبھی گالیاں کھائیں لیکن علامہ شیخ کا دامن اس مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے کہ حوادث کا بڑے سے بڑا تھپیڑا بھی اس کو نہ چھڑا سکا۔ علامہ کا علم وفضل اور تقلید شیخ ایسی چیزیں ہیں جو حافظ ابن تیمیہ کے لئے بجائے خود قابل فخر ہیں اور علامہ کے لئے باعث شہادت۔ اسی بنا پر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "اگر ابن تیمیہ کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی اور ان کا کوئی کارنامہ

---

[1] تقی الدین ابوالعباس احمد بن تیمیہ۔ ولادت ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ وفات ۲۱ ذیقعدہ ۷۲۸ھ

ہمارے سامنے نہ ہوتا تو محض علامہ ابن قیم کا تعلق ہی ان کی عظمت اور اولوالعزمی کے لئے کافی تھا۔ علامہ کو اگرچہ حافظ ابن تیمیہ کے ساتھ تعلیمی زمانہ ہی سے خصوصی تعلق تھا اور اکثر اُنہی کی صحبت میں رہتے تھے لیکن جب حافظ ابن تیمیہ ۷۱۲ھ میں مصر سے واپس ہوئے تو اس وقت سے وفات ۷۲۸ھ تک برابر آٹھ برس ساتھ رہے اور علم کا بہت سا حصہ اس مدت میں حاصل کیا۔

علامہ کا علم اور قوت بیان یہ دو ایسی زبردست چیزیں تھیں کہ لوگ خواہ مخواہ آپ کی عزت و احترام پر مجبور ہوتے تھے۔ اور پھر علامہ کی غیر معمولی قید وبند نے آپ کا مرتبہ سوسائٹی میں بہت بلند کر دیا تھا۔ اور عوام کی خاص ہمدردیاں آپ کے ساتھ تھیں۔ یہی اسباب تھے کہ علامہ کا ربط وضبط امرائے سلطنت سے بھی بہت کافی تھا، اور آپ کا شمار عمائدین شہر میں ہوتا تھا۔

علامہ نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ انھیں شعر کا بہت اچھا ذوق تھا چنانچہ خود بھی اکثر شعر کہتے اور دوسروں کے اشعار بھی پڑھتے تھے۔ کلام میں جو سلاست، روانی اور برجستگی ہے وہ قابل ستائش ہے نمونہ کے طور پر دو شعر درج ذیل ہیں:-

وضم الالٰہ اسم النبی الی اسمہ
اذا قال فی الخمس المؤذن اشہد

"اللہ نے اپنے نام کے ساتھ رسول اللہ کا نام لینا بھی ضروری قرار دیا ہے جس کی سب سے بڑی شہادت اذان ہے۔"

وشق لہ من اسمہ لیجلہ،
فذوالعرش محمود و ہذا محمد

"اور آپ کی عظمت وفضیلت کے اظہار کے لئے اپنے ہی جیسا نام رکھا کیونکہ اللہ کا نام 'محمود' ہے اور آپ کا 'محمد'۔"

حافظ ابن قیم نے علم اور دین کی جو خدمات انجام دی ہیں اور جیسے جیسے علمی شاہکار پیش کئے ہیں۔ وہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ چونکہ یہ تمام تصانیف عربی میں ہیں اور اُردو داں طبقہ کیلئے ان تک رسائی از بس دشوار ہے اس لئے علامہ کی صرف ان تصانیف کا تذکرہ مناسب ہے جن کے اُردو میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ علامہ کی تصانیف تعداد میں ۴۵ سے اوپر ہیں۔ ان میں اکثر کتب نہایت ضخیم وطویل ہیں۔

۱- تہذیب الایمان ترجمہ اغاثۃ اللہفان۔ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی نے ترجمہ کی ہے۔ ۱۲۸۳ھ میں مطبع صدیقی بریلی سے شایع ہوئی۔ بڑی تقطیع کے ۴۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ حاشیہ پر اصل کتاب چڑھی ہوئی ہے۔ ترجمہ کی عبارت نہایت سلیس ہے۔ کہیں کہیں مترجم نے ضروری اضافے کئے ہیں۔ یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے لیکن تیرھواں باب بہت طویل اور اہم ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے حوالے شاہ ولی اللہ جیسے محدث نے اپنی بعض تصانیف میں دیئے ہیں۔ یہ کتاب اب غالباً نادر و کمیاب ہو چکی ہے۔

۲- خیر الکلام ترجمہ جلاء الافہام ۱۹۳۰ء میں مدینہ پریس بجنور سے شایع ہوئی ہے۔ "درود" کے متعلقہ مسائل پر نہایت عالمانہ طریقہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے اگرچہ ہر باب افادہ کے لحاظ سے خوب ہے مگر تیسرا باب بہت اہم اور زیادہ سود مند ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف اور شستہ ہے۔

۳- دلائل المحققین ترجمہ اعلام الموقعین۔ ابن قیم کی معرکۃ الآرا اور مشہور زمانہ کتاب کا ترجمہ ہے جو اہلحدیث حضرات کے لئے قابل قدر چیز ہے۔ عام طور پر ملتی ہے۔ چار حصوں میں شایع ہوئی ہے اس کتاب کی سب سے پہلی اشاعت کا سہرا ہندوستان کے سر ہے۔

۴۔ اسوۂ حسنہ ترجمہ ہدی الرسول مختصر زاد المعاد۔ فن سیرت پر مستند اور بینظیر کتاب ہے۔ اسوہ حسنہ اس کا ملخص ترجمہ ہے۔ یہ بھی عام طور پر ملتی ہے۔

۵۔ سبیل النجات ترجمہ کتاب الصلوٰۃ۔ یہ کتاب نماز کے متعلق ہے اور اس میں پوری جامعیت کے ساتھ احکام نماز کی تفصیل و تفسیر بیان کی گئی ہے۔

۶۔ کتاب التقدیر ترجمہ شفاء العلیل۔ تقدیر جیسے لاینحل مسئلہ پر قرآن و حدیث سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ الحاد و دہریت اور لادینی کے اس زمانہ میں اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قضا و قدر کے مسائل جس دقیق بحث و نظر کے محتاج ہیں۔ وہ ظاہر ہے۔ یہ مصنف کا کمال ہے کہ انھوں نے قضا و قدر کے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کو پانی بنا دیا ہے۔ ترجمہ بھی قابل تعریف ہے۔ مزید معلومات کے لئے "مکتبۂ عالمگیر" سے خط کتابت کی جائے۔

۱۳ رجب ۷۵۱ھ کو عشا کے وقت انتقال فرمایا۔ ازدحام کا یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ گلیوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی نماز جنازہ متعدد مرتبہ پڑھی گئی۔ سب سے پہلے جامع اموی (دمشق) میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر جامع جراح میں۔ اسی طرح اور مختلف جگہوں میں نماز پڑھی گئی۔ وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے علامہ کو خواب میں دیکھا۔ حال دریافت کرنے پر فرمایا کہ "خدا نے بخشدیا"۔ خود علامہ نے اپنی وفات سے ایک عرصہ پہلے حافظ ابن تیمیہ کو خواب میں دیکھا تھا۔ علامہ نے سوال کیا۔ مرنے کے بعد میری کیا حالت ہوگی اور میں کس طرح اس کٹھن منزل سے گذرونگا"۔ حافظ ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ تمھیں دل برداشتہ نہ ہونا چاہیئے تم بہت جلد ہمارے پاس پہنچوگے اور تمھارا مرتبہ بعض اکابر سے بھی بہت بلند ہے"۔

اس کے کچھ عرصہ بعد علامہ کا انتقال ہوگیا۔

علامہ کی زندگی پر تبصرہ کے لئے ہمیں جس تفصیل سے کام لینا چاہیئے تھا افسوس وہ اس مضمون میں ممکن نہیں ہے تاہم علامہ ابن قیم نے قوم و ملت کی بہت جلیل القدر اور مہتم بالشان خدمات انجام دی ہیں۔ اور ایسے خطرناک وقت میں قوم کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جب اسے ختم کرنے کے لئے غیروں نے نہیں بلکہ اپنوں نے عزم صمیم کرلیا تھا۔ بدعت اور لادینی نے اسلام کو برباد کرنا شروع کردیا تھا جب حکومت بھی مذہب سے برسر پیکار تھی۔ اور علما سو بھی ایک نئے مذہب کے خواہشمند تھے۔ جب کعبہ کی جگہ قبروں کے طواف ہوتے تھے اس وقت جس نے اسلام کی حمایت میں قلم اٹھایا جس نے اپنے ننگ و ناموس کو خطرے میں ڈالا۔ جس نے اپنا سینہ مشق ستم کے لئے پیش کیا وہ صرف علامہ ابن قیم ہی کی ذات تھی۔ لیکن دنیا نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس احیاء ملت اور جانفروشی کے صلہ میں قوم نے ان کو کیا انعام دیا؟ ان کے تذکرہ میں یہ ایک لرزہ خیز عنوان ہے اور اس کا کتمان بیان سے بہتر ہے۔ انھوں نے جس طرح اپنی عمر کے ساٹھ سال ہمیشہ رہنے والے قانون کی حفاظت میں صرف کئے اور جو تن من دھن کی حیرت انگیز قربانی پیش کی اور جس استقلال و پامردی کے ساتھ "بدعت" کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا وہ لائق صدستائش ہے۔

نوٹ:۔ اس مضمون کا ماخذ مندرجہ ذیل کتب ہیں۔
دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔ طبقات ابن رجب۔ بغیۃ الوعاۃ تذکرۃ الحفاظ۔ روضۃ المحبین۔ درر کامنہ۔

آجاؤ

(از جناب ابوالضیا صاحب [illegible])

نہیں ہے تاب غم انتظار آجاؤ
اٹھاؤ پردۂ لیل و نہار آجاؤ

جفا پہ اپنی نہ ہو شرمسار آجاؤ
مری وفا پہ کرو اعتبار آجاؤ

نمود گل کو ضرورت ہے اک تبسم کی
شگفتگی کی ہے طالب بہار آجاؤ

نسیم کو ہے غرور خرام مستانہ
بڑا مزہ ہو جو مستانہ وار آجاؤ

نظام ضبط محبت بدل نہ جائے کہیں
نفس نفس میں ہے اک انتشار آجاؤ

خدا کرے کہ مرے جذبۂ محبت سے
وہ دن بھی آئے کہ بے اختیار آجاؤ

کل رات کو

ہو رہا تھا جذبِ دل کا امتحاں کل رات کو

از حضرت خمار بارہ بنکوی

رُوح تھی مسرور، دل تھا شادماں کل رات کو
مجھ سے ملنے آئی تھی عمرِ رواں کل رات کو

پھٹ پڑی تھیں حُسن کی رنگینیاں کل رات کو
میری ٹھوکر میں تھی فردوسِ جہاں کل رات کو

ہو گئے تھے جذب ذرّہ ذرّہ میں حُسن و شباب
تھی حسیں ہر چیز، ہر شے تھی جواں کل رات کو

بج رہا تھا میٹھے میٹھے سُر میں سازِ زندگی
حُسن تھا اُلفت کی دھن میں نغمہ خواں کل رات کو

وہ مرے پہلو میں بیٹھے تھے نقاب اُلٹے ہوئے
اُڑ رہا تھا چاند کے رُخ پر دھواں کل رات کو

وہ بھی چپ تھے میں بھی چپ تھا چپ تھی ساری کائنات
ہو رہا تھا جذبِ دل کا امتحاں کل رات کو

تھا مرے آغوش کی زینت وہ جسمِ نازنیں
یا زمیں کی گود میں تھا آسماں کل رات کو

اُن کا آنچل ڈالنا شرما کے سر پر بار بار
کوندتی تھیں بجلیوں پر بجلیاں کل رات کو

میری نظریں اُنکا چہرہ اُنکی نظریں میرا دل
مل گئے تھے رازدار و رازداں کل رات کو

ہو کے بیتاب محبّت کھیلتی تھیں بار بار
میرے بالوں سے وہ رنگیں اُنگلیاں کل رات کو

آ رہی تھیں نیند کی باعث اُنہیں انگڑائیاں
زلزلے میں تھے زمین و آسماں کل رات کو

جا چکے تھے رُوٹھ کر مجھ سے وہ لیکن اے خمار
آ رہی تھیں کس مزے کی ہچکیاں کل رات کو

جنوری سنہ ۱۹۳۴ء کی بات :-

جب میں باپ نہیں تھا

(ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی)

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں. لیکن بہت عرصہ تک ...... میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں شادی کیوں ہوتی ہے اور پھر اسکے بعد کیا ہوتا ہے. میرے دوست جب اپنی بیوی کے قصے مجھے سنایا کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے. اور اسکی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھدی ہے. بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا. اُس نے پوچھا.

"کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے." میں نے کہا نہیں لیکن پھر اس نے کہا. کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے. میں نے کہا. ہاں. پھر اس نے خاص بات پوچھی. میں نے کہا میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ کیا ہوتا ہے لیکن آج تک ...."

میرا یہ جواب سنکر وہ چونک اٹھا. اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی. اگر اسی زمانے میں بتا دیتے، جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا. چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت زنانہ دواخانہ کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی ایک شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی اور مجھے استعمال کے لئے دی. میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا. میری حیرت کی انتہا نہ رہی. جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنے کے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ رطوبت خارج ہونی بند ہو گئی اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات محسوس ہوئی. دوا ابھی پوری ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک روز .... بیوی

جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے

اپنے دوست کی مہربانی کی بدولت اب میں اس جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش و خرم نوجوان کی طرح ہوں، جیسے کہ مجھ جیسی عمر کے انسان کو ہونا چاہیئے. میری بیوی ایک بچہ کی ماں ہے. اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے اور بچہ ہمک ہمک کر ماں کی طرف دوڑتا ہے اور ماں کے سر کے بال نوچتا ہے تو مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ اس بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے. کیونکہ "جوہر اعظم" دوا سے ہی میری جریان کی بیماری دور ہوئی. اور میری خفیہ طاقت پھر مجھے مل گئی. کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے، کہ اس دنیا میں جریان کی اگر کوئی بہترین دوا ہو سکتی ہے تو وہ "جوہر اعظم" ہے. ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ہے. اس دوا پر عام فائدہ کے خیال سے محصول ڈاک معاف ہے.

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں. اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوتِ مردمی پانی کی طرح بہہ جاتی ہو یا رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت شرمندگی ہوتی ہو تو انہیں چاہیئے کہ

مینیجر زنانہ دواخانہ اے. بی ۲۴ دہلی

کو خط لکھکر "جوہر اعظم" دوا کی شیشی بذریعہ وی. پی پارسل منگالیں صرف ایک ہی شیشی تندرست بنا دے گی.

جوہر اعظم وہی مشہور دوا ہے جسے سنہ ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا کا مریڈ سوسائٹی نے کافی تجربہ کرکے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" دوا جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے. اور تمام ملک سے پرزور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیئے. کیونکہ آل انڈیا کامریڈ سوسائٹی نے جوہر اعظم کا کافی تجربہ کرایا ہے. اور ہر جگہ ہر مریض کو اس دوا نے تندرست کر دیا. چنانچہ سنہ ۱۹۲۵ء سے آجتک انجمن مذکور کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے اور کسی خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا. صرف دوا کی قیمت لی جاتی ہے.

ڈاکٹر شوکت

افسانہ

از جناب ظفر واسطی شاہ آبادی

گو ڈاکٹر شوکت کی طبیعت پریشان تھی اور کسی کام میں اُس کا جی نہ لگتا تھا۔ پھر بھی صبح سویرے اُٹھتے ہی اُس نے اپنے روز کے معمول کے مطابق کام شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے چائے پیتے ہی وہ اُن بیماروں کو دیکھنے گیا جو اُس کے اسپتال میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور ہر روز کی طرح اُس نے اُن کی دلجوئی کی اور ہمت بندھائی لیکن خود اُسے بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بے ربط فقرے زبان سے نکل رہے ہیں اور مسکراتے ہوئے تو خاص طور پر تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی۔ دو نرسیں ساتھ تھیں، جنہیں وہ ہر مریض کے متعلق ضروری ہدایتیں دے رہا تھا۔ ہدایتیں دیتے ہوئے البتہ وہ بہت احتیاط سے کام لیتا تاکہ اسٹاف کے کسی آدمی پر اُس کی دلی پریشانی ظاہر نہ ہو سکے۔ ان مریضوں سے فراغت پائی ہی تھی کہ اسسٹنٹ ڈاکٹر آیا اور اس نے بتایا کہ ایک بہت غریب آدمی کا اپریشن کرنا ہے۔ شوکت مسکراتا ہوا اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اپریشن بہت سخت اور بہت نازک تھا۔ اُس میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ وہاں سے نکلا تو دیکھا کہ بیماروں اور بیماروں کے رشتہ داروں کی بھیڑ لگ رہی ہے اور سب اُس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ مسکراتا ہوا جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور حال پوچھ پوچھ کر دوائیں تجویز کرنے لگا۔ کسی نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب رات کو نیند بالکل نہیں آتی۔ کسی نے کہا مریضہ کا بخار تو اُتر گیا لیکن صبح سے اُسے غوطے پڑ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بیہوش ہو جاتی ہے اور جسم ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے۔ وہ اُن کا حال سُن سُن کر نسخے لکھتا رہا یا پہلے نسخوں میں مناسب ترمیم تنسیخ کرتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب جب باہر کی بھیڑ کم ہوئی تو ایک بوڑھا آدمی اپنے نوجوان مگر کمزور لڑکے کو لیکر آگے بڑھا اور سلام کر کے بولا "ڈاکٹر صاحب! اسے خبر نہیں کیا ہو گیا روز بروز سوکھتا جاتا ہے۔ ہزار علاج کرائے مگر اسکی حالت میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔ آپ کا نام سُن کر بڑی دور سے آیا ہوں۔ ساری عمر کی بس ایک ہی کمائی ہے۔ اگر یہ ماتمانہ کرے اسے کچھ ہو گیا ـــ" فرطِ غم سے اُس کی آواز حلق ہی میں رُک گئی۔

ڈاکٹر نے نوجوان کو اپنے قریب بُلایا۔ پہلے نبض دیکھی پھر آنکھوں کے پپوٹے دیکھے اور پھر آلے سے اُس کے دل اور پھیپھڑوں کا معائنہ کیا۔ ایک پھیپھڑا کچھ اثر لئے ہوئے تھا اور نبض بھی کچھ تیز تھی لیکن اُس نے اُنہیں یہ بات نہ بتائی۔ بلکہ کہا "بڑے صاحب بظاہر تو آپ کے لڑکے کو کوئی تکلیف معلوم نہیں ہوتی۔" بوڑھا بولا "سب یہی کہتے ہیں لیکن یہ آخر روز بروز سوکھتا کیوں جاتا ہے؟"

شوکت نے کہا اس کے متعلق مَیں اس سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بوڑھا بولا "تو مَیں ذرا دیر کو ایک طرف چلا جاتا ہوں۔" لیکن شوکت نے جواب دیا "نہیں آپ بیٹھے رہیئے۔ یہاں ہمیں تنہائی میسر نہیں آ سکتی مَیں اسے اپنے کمرے میں لے جاتا ہوں۔"

اُس کا خیال صحیح نکلا۔ لڑکے نے کچھ پس و پیش کے بعد اپنے دل کے روگ کے متعلق بتا ہی دیا۔ اُسے کالج کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ پھر کسی طرح لڑکی کے ماں باپ کو ان کی محبت کی خبر ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں اُنہوں نے اُسے اس کالج سے اُٹھا کر دوسرے کالج میں داخل کرا دیا۔ دو تین مہینوں کے بعد یہ بھی جا کر اُسی کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن وہاں داخل ہو کر اسے پتہ چلا کہ وہ کسی اور لڑکے سے محبت کرنے لگی ہے۔ وہ لڑکا کسی بہت امیر آدمی کا بیٹا تھا۔ کار میں کالج آتا۔ کوئی گھنٹہ خالی ہوتا تو گھر چلا جاتا۔ کار تو ہر وقت کھڑی ہی رہتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کی بھی فرصت ملی تو کار میں بیٹھا اور چل دیا۔ نسرا بھی اکثر اُس کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ قصہ مختصر اس نے بڑی مشکل سے وہ سال پورا کیا اور اس کے بعد پھر آ کر اپنے پہلے کالج میں داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر نے اُس کی داستانِ محبت سُنی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طبیعت تو پہلے ہی پریشان تھی۔ کوشش کرنے پر بھی ضبط نہ کر سکا اور لڑکے نے دیکھا کہ آنسو اُس کی آنکھوں سے ڈھلک کر رُخساروں پر آ گئے۔ اُس کے آنسو دیکھ کر لڑکے کو محسوس ہوا کہ غم آدھا رہ گیا ہے اور وہ ڈاکٹر کو بہت ہی نرم دل اور بہت ہی نیک باطن سمجھنے لگا۔ اُس کا نام اور شہرت تو پہلے بھی سُنی تھی مگر وہ اُسے

تاسنانیک دل، اتنا صاحب درد کبھی نہ سمجھا تھا۔

ڈاکٹر نے پوچھا "آجکل آپ کیا کرتے ہیں یعنی آپ کا شغل کیا ہے؟"

"کچھ نہیں تقریباً بیکار ہی رہتا ہوں۔ کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا" ہر وقت سرلا یاد آتی رہتی ہے۔ اور اُس کی یاد سے دل پر آرے سے چلنے لگتے ہیں اور میں بیقرار ہو جاتا ہوں۔ اسکی بے وفائی یاد کرکے میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے"۔

ڈاکٹر نے تشفی کے انداز میں کہا "دیکھئے سرلا نے آپ سے کوئی بے وفائی نہیں کی۔ آپ کی محبت ابھی خام تھی۔ یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ اپنی محبت کو اتنا پختہ نہ کر سکے۔ یہ نہ سمجھئے کہ اُس نے امیر لڑکے کو صرف امیر ہونے کی وجہ سے آپ پر ترجیح دی۔ عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے تو وہ امیر غریب کو نہیں دیکھتی اور ایک مرتبہ جب اُسے کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت اسکی محبت کا رُخ دوسری طرف نہیں پھیر سکتی۔ خیر ان باتوں کو چھوڑیئے۔ اب تو آپ یہ سمجھئے کہ محبوب کو حاصل کرنا ہی محبت کی غایت نہ ہونا چاہیئے۔ کیا آپ اُس سے جب کہ وہ کسی اور کی بن چکی ہے محبت نہیں کر سکتے؟ اگر کر سکتے ہیں تو اُس سے محبت کئے جایئے اور یہ سمجھتے رہیئے کہ اس دُنیا سے بہتر دُنیا میں آپ اُس سے مل جائیں گے اور بیکار ہرگز نہ رہیئے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہیئے۔ کسی نہ کسی کام لگے رہیئے۔ اپنے دل میں سرلا کی محبت کو اتنا عروج دے لیجئے کہ ہر آدمی میں آپ کو سرلا کا حُسن دکھائی دے اور پھر خلق خدا کی خدمت کیجئے۔ ایسا کرنے سے بنی نوع انسان کی خدمت کرنے سے آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ آپ سرلا کی خدمت کر رہے ہیں"۔

ڈاکٹر کی باتیں سُنکر نوجوان کی آنکھیں سی کھل گئیں۔ اُسے ایک روشنی، ایک نہایت دلکش اور دلفریب روشنی دکھائی دینے لگی، ایسی روشنی جس نے اُس کی زندگی کے تاریک ترین حصے کو بھی منور کر دیا، پھر اُس نے دیکھا کہ وہ روشنی دراصل سرلا کی پُرنور پیشانی سے نکل رہی تھی۔ جب وہ اور ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلے تو وہ مطمئن تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہے لیکن ڈاکٹر ۔۔۔ ڈاکٹر کی طبیعت پہلے سے بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ چلتے ہوئے اُس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ تاہم اُس نے نوجوان کے باپ کو تسلی دی کہ اب آپ کا لڑکا بالکل تندرست ہو جائے گا۔ اور ایک نسخہ بھی لکھ دیا اور کہا کہ یہ دوا کم سے کم ایک ہفتے تک اسے تین خوراکیں ہر روز دودھ سے دیا کرنا۔ اور دودھ اور تازہ مکھن اسے خوب کھلاؤ اور کبھی خالی نہ بیٹھنے دو۔

اُن کے جانے کے بعد شوکت نے اسسٹنٹ ڈاکٹر کو بلایا اور کہا کہ میرے لئے ایک "ڈوز" بنا لاؤ۔ اسسٹنٹ جانتا تھا کہ مہینے میں ایک آدھ دفعہ ڈاکٹر کو دل کا دورہ پڑ جاتا ہے اُس نے بڑی احتیاط سے دوا تیار کی اور لا کر اُسے پلا دی۔ دوا پی کر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ گھر جا کر اُس نے ملازم کو ہدایت کی کہ آج ہماری طبیعت خراب ہے ہمیں چار بجے سے پہلے نہ بلانا۔ باورچی کھانے کے متعلق دریافت کرنے آیا تو انکار کر دیا۔

آرام کمرے میں ملازم نے اُس کے کپڑے بدلوائے۔ کپڑے بدل کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور کمبل اوڑھ لیا۔ تنہائی اور فرصت ان دو چیزوں سے وہ ہمیشہ کتراتا تھا۔ لیکن جب دل کی تکلیف ہو جاتی تو انہی دو چیزوں سے اُسے آرام پہنچتا۔ فرصت اور تنہائی گویا دو دوائیں تھیں جن سے اُس کی بیماری دُور ہو جاتی یا کم از کم اُس کی شدت بہت کم ہو جاتی تھی لیکن نہیں ۔ فرصت اور تنہائی سے اُس کے دُکھ میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی تھی بلکہ اسمیں اور اضافہ ہو جاتا کہ اُس کی ساری زندگی درد بن کر رہ جاتی لیکن یہ درد بڑا خوشگوار ہوتا اور اس کی خوشگواری ہی میں وہ اپنی تکلیف بھول جاتا۔ فرصت اور تنہائی میں اُسے اختر کا خیال آتا۔ یوں تو ہر وقت ہی اختر اُس کے خیالوں میں بسی رہتی لیکن تنہائی اور فرصت میں یہ خیال اور زیادہ تیز، اور زیادہ متشکل ہو جاتا اور اُس کے جسم کا رواں رواں اختر اختر پکارنے لگتا لیکن اختر ۔۔۔ اختر اُس کی نہ ہو سکتی تھی۔ تاہم اختر نے اُسے وہ سب کچھ بنا دیا تھا جو کچھ وہ تھا ۔۔۔ ایک ہر دلعزیز ڈاکٹر جس نے فرشتہ بن کر خلقِ خدا کی خدمت کی اور سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں آدمیوں کو خوفناک اور جان لیوا بیماریوں سے نجات دلائی۔ اور پھر کبھی کسی سے حقِ خدمت طلب نہیں کیا۔ جو کچھ کسی نے دیا بخوشی لے لیا اور وہ بھی اس لئے کہ یہ کام، یہ خدمت کا ادارہ چلتا رہے اور زیادہ سے زیادہ غریب آدمیوں کی خدمت کی جا سکے۔

گرد و نواح کے لوگ اُس کے نام پر اپنی جانیں چھڑکتے تھے لیکن وہ خود اپنی جان سے، اپنی زندگی سے آزردہ تھا اور یہ آزردگی، یہ بیزاری اختر سے وابستہ تھی۔ اگر شوکت کو غریبوں کی تکلیفوں کا اتنا خیال نہ ہوتا تو اُس نے اپنی زندگی کبھی کی ختم کر لی

ہوتی۔ اور اسی لئے وہ اُن غریبوں اور محتاجوں کا اتنا خیال کرتا کہ بعض دفعہ اُسے سارا سارا دن کھانا کھانے کی فرصت تک نہ ملتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کھانا کھانے بیٹھتا اور قریب کے گاؤں سے آدمی کسی نازک حالت والے بیمار کو لے آتے تو کھانا چھوڑ چھاڑ کر اُسے دیکھنے لگ جاتا اور جو کچھ ممکن ہوتا اُس کے لئے کرتا۔ اور پھر اپنے اسسٹنٹ اور نرسوں وغیرہ کو بے وقت تکلیف نہ دیتا۔ اُن کے فرائض بھی خود ہی انجام دے لیتا۔ لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے اُس کا اپنا دُکھ اُس کی اپنی بیماری بڑھتی گئی۔ جو دوا اُس نے اپنے لئے تجویز کی تھی اُس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ حالانکہ دُوسروں کو اگر وہ خاک کی چٹکی بھی دے دیتا تھا تو خدا اُنہیں اُس خاک کی چٹکی ہی سے اچھا کر دیتا اور جتنا زیادہ وہ مصروف رہتا اُتنا ہی زیادہ اُسے محسوس ہوتا کہ اختر اُس کی مصروفیت کا مضحکہ اُڑا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ شوکت تم مجھے نہیں بھول سکتے۔ اپنی اس ناکامی پر اپنی اس شکست پر شوکت کا دل بھر آتا اور وہ اور زیادہ عزم کے ساتھ اختر کو بھولنے کی ترکیبیں سوچنے لگتا۔

اختر اُس کی زندگی میں خود ہی آئی تھی اور خود ہی چلی گئی تھی لیکن جاتے ہوتے وہ اُس کے دل میں ایک ایسا ناسور چھوڑ گئی تھی جو کسی صورت بھی مندمل ہونے میں نہ آتا تھا۔ میڈیکل کالج سے مہارت تامہ لیکر وہ کالج کے متعلقہ ہسپتال میں ایک سال کے لئے ہاؤس سرجن مقرر ہو چکا تھا۔ ایک شام یہ اپنے ایک دوست کے یہاں چائے پر مدعو تھا۔ یہ، دوست اور دوست کی بہن بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اختر آئی۔ دوست کی بہن نے کھڑی ہو کر اس کا استقبال کیا اور اپنے برابر بٹھاتے ہوئے شوکت سے اس کا تعارف کرا دیا۔ یونہی رسمی تعارف۔ آپ ڈاکٹر شوکت ہیں ہسپتال کے ہاؤس سرجن۔ آپ مس اختر ہیں، میری سہیلی، اس سال بی اے کا امتحان دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر شوکت اپنی کرسی سے تعظیماً اُٹھا، کچھ آگے جھکا اور بیٹھ گیا۔ اختر بڑی چنچل تھی۔ بولی "میں رسمی قیود کی پابند تو ہوں نہیں کہ کہوں "مجھے آپ سے مل کر مسرت خوشی ہوئی" بہرحال مجھے آپ سے ایک کام ضرور لینا ہے۔ کچھ دنوں سے مجھے آنکھوں میں کچھ تکلیف محسوس ہوتی ہے تو۔۔

اور شوکت نے کہا۔ "تو آپ مجھے آنکھیں دکھائیں گی؟"

اس بات پر وہ ہنس پڑے۔

اور دوسرے دن اختر شوکت کے پاس ہسپتال پہنچ گئی۔ وہ نہایت اچھی طرح پیش آیا۔ آنکھوں کے اسپیشلسٹ سے اُسکی آنکھوں کا معائنہ کرایا اور جو دوا اُس نے تجویز کی وہ خود جا کر ہسپتال کے اسٹور سے لا دی۔ اس کے بعد کئی دفعہ وہ اپنی آنکھیں دکھانے آئی اور کئی دفعہ شوکت کو اُس سے ملنے کا اتفاق ہوا اور کئی دفعہ اُس کے لئے چھوٹے چھوٹے کام کر کے شوکت کو محسوس ہوا کہ اختر نے اُس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ اس انکشاف پر اُسے سخت تعجب ہوا۔ وہ اپنے دل کو "عشق پروف" سمجھتا تھا کیونکہ ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں سے وہ کبھی متاثر نہ ہو سکا حالانکہ دُوسرے طالب علم اُن کے پیچھے مارے مارے پھرتے۔ کئی دفعہ ملنے کے بعد وہ اُس سے کافی بے تکلف ہو گیا۔ اور ایک روز اُس نے اختر کو سینما چلنے کی دعوت دے ہی دی۔ چائے تو وہ اُسے تین چار مرتبہ پہلے ہی پلا چکا تھا جب وہ دُوسری دفعہ آنکھیں دکھانے آئی تو معائنہ کے بعد یہ اُسے اپنے کوارٹر میں لے گیا اور وہاں آناً فاناً میں اس کے نوکر نے چائے تیار کر دی۔ نوکر کی پھرتی پر اُس روز پہلی بار اِسے افسوس ہوا ورنہ یہ ہمیشہ اُس کی اس خوبی سے خوش ہوتا تھا اُس روز یہ چاہتا تھا کہ نوکر بہت ہی سست ہو جاتے اور یہ اختر سے باتوں کے دوران میں نوکر کی سستی پر آہستہ آہستہ اُسے لعنت ملامت کرتا رہے لیکن اُس نے اتنی جلدی چائے تیار کر دی کہ شوکت کو اختر سے زیادہ باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس کے بعد جو وہ آئی تو شوکت نے ہسپتال جاتے ہوتے نوکر کو ایک لمبے کام پر بھیج دیا تھا۔ اُس دن اُس نے خود اختر کے لئے چائے بنائی اور اسمیں کافی سے زیادہ دیر لگ گئی۔ اختر کہتی بھی رہی کہ لائیے میں بنا لیتی ہوں۔ یہ کام تو عورتیں ہی اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں لیکن شوکت نے اُسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔ اُس نے زیادہ اصرار کیا تو کہہ دیا کہ آپ کو چونکہ تکلیف ہے اس لئے آپ کی آنکھوں کو آگ کی آنچ یا دُھواں نہ پہنچنا چاہیئے۔

رفتہ رفتہ وہ ایک دُوسرے کے زیادہ گرویدہ ہو گئے اور تقریباً ہر روز ملاقاتیں ہونے لگیں۔ شوکت کو اختر میں خُوبیاں ہی خُوبیاں نظر آئیں اور اختر بھی شوکت کو بہت اچھی طرح نظروں سے دیکھتی۔ پھر ایک دن اختر نے بتایا کہ اُن کا ایک رشتہ دار ولایت سے آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دے کر آ رہا ہے اِس لئے شاید دو چار دن ملاقات نہ ہو سکے۔ یہ سُن کر ایکدم شوکت کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے یکلخت کئی سوال کر ڈالے۔ اختر نے ہنس ہنس کر جواب دیئے اور چلی گئی۔ یہ اُن کی آخری مُلاقات تھی۔ اس کے بعد اختر کہیں نظر نہ آئی۔ اُس کی مُلاقات کو جتنے دن گذر جاتے تھے یہ اُتنا ہی زیادہ بے چین

ہوتا جاتا تھا۔ لیکن پھر اُس کی ایک جھلک بھی نظر نہ آسکی۔ آخر تنگ آکر اس نے اُسے ایک خط لکھا جس میں اپنی محبت کا۔ اُن عہد و پیمان کا واسطہ دیا جو وہ آپس میں باندھ چکے تھے اور صرف ایک بار ملنے کی درخواست کی لیکن خط کا بھی جواب نہ آیا۔ اسے حیرت تھی کہ اختر اتنی جلدی کیسے بدل گئی۔ وہ اختر جس نے خود اپنی بے پناہ محبت کا اعتراف کیا تھا۔ وہ اختر جس نے کہا تھا کہ مَیں سخت ترین مخالف حالات میں بھی تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ وہ اختر کیسے بدل گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے تلخی محسوس ہوئی اور اپنی مجبوری کا صحیح معنوں میں احساس بھی پہلی ہی مرتبہ ہوا۔ پھر اُس نے سوچ سوچ کر اپنے اُس دوست سے اختر کو چائے پر بُلانے کے لئے کہا جن کے یہاں کہ اختر سے پہلی مُلاقات ہوئی تھی لیکن یہ لوگ بیٹھے اُس کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آئی۔ آخر دوست کی بہن کو اُسے لینے کے لئے بھیجا۔ وہ اُس کے ساتھ بھی نہ آئی لیکن شوکت کے نام اُس نے ایک مختصر سا خط ضرور بھیج دیا "مجھے بھول جائیے۔ میں نے جب آپ سے عہد و پیمان کئے تھے تو مَیں بھی بھول گئی تھی کہ مجھ پر ماں باپ کے بھی حقوق ہیں۔ اُن حقوق نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ مَیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جاؤں۔ خدا کے لئے آپ میرے صبر و سکون پر جو بہ مجبوری اختیار کئے گئے ہیں بجلی گرانے کی کوشش نہ کیجئے۔"

کچھ عرصے کے بعد جب ہاؤس سرجنی کی مدّت ختم ہو گئی تو اس نے ایک ایسے اخبار میں جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ اختر ضرور پڑھتی ہے اپنی موت کی خبر نکلوا دی اور خود لاہور سے بہت دُور ایک چھوٹے سے قصبہ میں اپنی پسند کا ایک اسپتال بنوایا اور غریبوں، محتاجوں اور بیکسوں کی خدمت کرنے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں اُس کا اسپتال اور وہ خود دُور دُور مشہور ہو گئے۔ گورنمنٹ نے اُس کی خدمت سے خوش ہو کر اُس کے اسپتال کے لئے کچھ امداد پیش کی جو اس نے بخوشی منظور کر لی اور اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے لگا۔

آرام کمرے کے پلنگ پر لیٹا ڈاکٹر شوکت یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے اُس کا دل کم سے کم اپنے ان کاموں سے مطمئن ضرور ہو جاتا تھا لیکن اُس دن اُسے یہ اطمینان بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اُس نے سوچا کہ مجھے یہ سب بکھیڑے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر اختر کی یاد میں زندگی گذار دینی چاہئے تھی۔ اختر کی یاد کے ساتھ اُسے اُس نوجوان کی یاد بھی آ گئی جسے اُس نے نصیحت کی تھی "اپنے دل میں سرلا کی محبت کو اتنا عروج دے لیجئے کہ ہر آدمی میں آپ کو سرلا کا حُسن دکھائی دینے لگے۔"

وہ نوجوان اُس کی نصیحت سے کتنا مسرور ہو گیا تھا لیکن جب وہ اس پر عمل کریگا تو اُسے حقیقت معلوم ہو گی کہ اس طریقہ علاج سے تو مرض کم ہونے کی بجائے اور زیادہ بڑھ گیا۔

یکایک شوکت کو کسی عورت کی آواز سُنائی دی۔ جو باہر ملازم سے جھگڑ رہی تھی، وہ ایک دم اُٹھا، لمبا سفید کوٹ پہنا اور باہر چلا گیا۔ باہر پہنچتے پہنچتے اس نے سُنا عورت کہہ رہی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا ہے، ایک آدمی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ نوکر کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب آرام کر رہے ہیں چار بجے سے پہلے نہیں اُٹھ سکتے۔ عورت نے کہا۔ وہ پھر بھی آرام کر سکتے ہیں۔ نوکر نے جواب دیا لیکن آج اُن کی طبیعت خراب ہے۔ عورت کی آواز ڈاکٹر شوکت کو پہلے سُنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ باہر آیا تو سامنے خیالوں کی ملکہ کھڑی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ دل کی حرکت ایک دم تیز ہو گئی۔ اختر نے بھی اُسے سخت حیرت اور تعجب سے دیکھا لیکن وہ اُسے پہچان نہ سکی۔ اُس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ اُس کی موٹر سائیکل ایک موڑ پر اُلٹ گئی اور وہ اُسی جگہ فوراً ہی مر گیا۔ کچھ اُس کی ڈاڑھی نے پردہ پوشی کی۔ شوکت نے اپنے مرنے کی خبر اخبار میں نکلوانے کے بعد ڈاڑھی رکھ لی تھی اور بالکل ناک کی سیدھ میں مانگ نکالنے لگا تھا۔ ورنہ ہاؤس سرجنی کے زمانے میں ڈاڑھی اور مونچھیں صفاچٹ تھیں اور سر کے بال بغیر مانگ نکالے پیچھے کی طرف اُلٹے رکھتا تھا۔ اس نے انگریزی میں پوچھا "مَیں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" اور بولتے ہوئے اُس نے اپنا لب و لہجہ کافی بدل لیا تاکہ اختر آواز سے بھی نہ پہچان سکے۔

اختر نے کہا "میرا شوہر اور مَیں کار میں اس طرف سے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے کار پوری رفتار پر چھوڑ رکھی تھی سامنے سے ایک نوجوان سائیکل پر آ رہا تھا۔ اُنہوں نے بہتیرا بچانا چاہا لیکن نوجوان آگے آ ہی گیا۔ اُنہوں نے ایک دم کار موڑی اور کار جا کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ مَیں پچھلی سیٹ پر تھی۔ اس لئے بچ گئی لیکن اُن کے سخت چوٹ آئی۔ حیران تھی کہ کیا کروں۔ سائیکل والا بھاگ گیا تھا۔ کہ خدا نے ایک تانگہ بھیج دیا۔ اس میں انہیں ڈال کر لائی ہوں۔ جلدی دیکھئے!"

وہ سخت پریشان ہو رہی تھی۔ شوکت نے اُس کے شوہر کا معائنہ کیا اور نوکروں کو بھیج کر نرسوں اور اسسٹنٹ ڈاکٹر کو بُلا لیا اور اختر کو تسلی دی کہ اطمینان رکھئے بچ جائیں گے گو چوٹ سخت

گئی ہے لیکن نا اُمید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

اختر بضد تھی کہ اپریشن کے وقت وہ بھی اپریشن رُوم میں رہے لیکن شوکت نے کہا کہ اپریشن سخت ہے اس لئے آپ نہ دیکھ سکیں گی۔ اس کے علاوہ آپ کے دل کو پہلے ہی صدمہ پہنچا ہُوا ہے۔ لہذا اختر کو اُس نے اپنے یہاں بھیج دیا اور نوکر کو تاکید کر دی کہ اُن کے غسل کیلئے گرم پانی کر دے اور چائے بنا دے۔

نرسیں اپریشن کے آلات وغیرہ تیار کر رہی تھیں۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر نے کمپاؤنڈر کی امداد سے مریض کو میز پر لٹا دیا تھا۔ ہر طرف ایک یاس انگیز سکوت طاری تھا۔ ڈاکٹر شوکت ایک کونے میں متفکر کھڑا تھا۔ اُس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اُس کا رقیب نیم مُردہ حالت میں میز پر پڑا تھا اور اُسے اپریشن کرنا تھا۔ اپریشن کرتے وقت قینچی یا چاقو ضرورت سے زیادہ چلانے میں رقیب کا کانٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل سکتا ہے اور مجھ پر کسی کو شُبہ تک بھی نہ ہوگا۔ یا اپریشن کئے بغیر ہی اپریشن میں اگر ایک گھنٹہ کی دیر اور کر دی جائے تو بھی یہ روڑا راستہ میں سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ پھر میرے اور اختر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہوگی۔ جب تک یہ ولایت سے نہ آیا تھا اختر میری تھی اس نے آتے ہی میری دُنیا بدل کر رکھ دی۔ اس نے مجھ سے میری زندگی کی عزیز ترین چیز چھین لی تھی۔ اب میری باری ہے جب اس نے میری پروا نہ کی تو مَیں کیوں اس کی پروا کروں — لیکن اسے تو میری خبر نہ تھی۔ اسے کیا معلوم کہ اختر کسی اور سے عہد و پیمان کر چکی ہے۔ یہ اختر کی غلطی ہے اُسے بتا دینا چاہئے تھا۔ اُس نے نہیں بتایا تو اُسے اس کی سزا ملنی چاہئے اور اسکی سزا یہی ہے کہ اُس کے شوہر کو مرجانے دیا جائے۔ خدا نے شاید میری تنہائی اور خوشی سے خالی زندگی پر رحم کھا کر یہ دن دکھایا ہے۔ خدا نے اُس سکھ کو فرشتہ بنا کر بھیجا تھا کہ وہ اُن کی کار کے آگے آئے اور پھر کار جا کر درخت سے ٹکرا جائے۔

وہ سوچتا رہا۔ کسی کو مجھ پر شُبہ تک نہ ہوگا۔ اختر اسکی موت کا رنج تو ضرور کرے گی لیکن آہستہ آہستہ وہ اسے بھول جائے گی اور پھر اس کے دل میں اپنے بھولے ہوئے افتخار کی محبت عود کر آئے گی۔ اختر کے ملنے کے خیال سے وہ بیخود سا ہو گیا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ اگر اختر اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرنے لگی ہو اور کوئی وجہ نہیں کہ اُسے اس سے والہانہ محبت نہ ہو گئی ہو تو اُس کے دل پر اُس کی موت سے کیا گذرے گی۔ وہ جو اُس کی چوٹ ہی سے اُس کی موت کے خیال ہی سے کانپ رہی ہے جب درحقیقت اسکی موت واقع ہو جائے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ مجھے تو اُس نے پہلے ہی مرا ہُوا سمجھ رکھا ہے۔ اور اگر مَیں نے اپنے آپ کو ظاہر بھی کر دیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ مان لیا کہ قانون میرا کچھ نہ کر سکے گا لیکن اختر کی نظروں میں مَیں اپنی بریت کیسے ثابت کرونگا اور پھر اُس کی نفرت آمیز ملامت ریز نگاہیں برداشت کرنے کی طاقت کس میں ہوگی۔ مَیں جو آج تک خلق خدا کی خدمت کرتا رہا آج اُس خدمت سے میرے قدم متزلزل کیوں ہیں۔ اگر میری ذرا سی کوشش سے اختر کے — میری محبوب کے پیارے شوہر کی جان بچتی ہے تو مَیں اس میں تجاہل سے کام کیوں لوں۔ اور اس کے علاوہ جان بُوجھ کر کسی کی جان لینا ایک ایسا ذلیل کام ہے جسے خود میرا ضمیر بھی شاید کبھی معاف نہ کر سکے اور وہ زندگی کس کام کی جس میں ضمیر ہمیشہ لعنت ملامت کرتا رہے۔ پھر وہ زندگی کاہے کو ہوگی۔ وہ تو جلتے ہوئے انگاروں پر لوٹنا ہوگا۔

اُس نے خدا کا نام لیکر اپریشن شروع کیا اور بڑی احتیاط سے کام کرنے لگا۔ اب اُس کے دل میں ایک آہنی عزم نے جگہ پکڑ لی تھی۔ اب وہ پوری توجہ سے اپنے کام میں منہمک تھا۔ دل کے دَورے کی تکلیف خود بخود جاتی رہی تھی۔ اور خدا خدا کر کے جب اُس نے اپریشن ختم کیا تو اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے اُسے سرخرو رکھا۔ اپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے پٹی باندھی، اطمینان کا سانس لیا اور اسسٹنٹ کو اُس کے متعلق ضروری ہدایتیں دے کر اپنے ہاتھ دھوئے اور گھر چلا گیا۔

اختر اُسے باہر کے دروازے میں کھڑی ہوئی ملی۔ اسے دیکھتے ہی اشتیاق سے پوچھنے لگی "اب کیا حال ہے ڈاکٹر صاحب؟ کوئی سخت چوٹ تو نہیں آئی میرا مطلب ہے کہ اُن کی زندگی خطرے میں تو نہیں"

شوکت مُسکرایا اور بولا "خدا کا شکر ہے کہ اپریشن کامیاب رہا۔ اب انشاءاللہ انہیں کل صبح تک ہوش آجائیگا۔ چوٹ تو

سخت آئی تھی لیکن وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

اختر نے اُس کی بات سُن کر اُسے ایسی تشکر آمیز نظروں سے دیکھا کہ اُس کی ساری محنت وصول ہو گئی اور صرف اپریشن ہی کی محنت نہیں بلکہ زندگی کی تمام محنت وصول ہو گئی۔

پھر شوکت نے پوچھا "آپ نے غسل کر لیا؟"

"جی نہیں" اُس نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے پھر ہلکے سے کہا "اگر آپ غسل کر لیتیں تو سفر کی تکان دُور ہو جاتی، اور چائے بھی نہیں پی؟"

"نہیں"

"آیئے چائے تو پی لیجئے، پھر اُن کے کمرے میں چلی جایئے۔ میں ضروری ہدایات دے آیا ہوں۔ نرس اُن کے پاس بیٹھی رہے گی۔"

چائے پیتے ہوئے اُنہوں نے کوئی خاص بات نہ کی۔ شوکت نے بتایا کہ کم سے کم پندرہ دن میں تصدق صاحب اس قابل ہو جائیں گے کہ اُنہیں کہیں لے جایا جا سکے۔ پھر بھی اختر نے اُس کے مشورے سے اپنے اور تصدق کے رشتہ داروں کو تار دیدیئے۔

اختر کے آنے سے شوکت میں ایک نئی زندگی سی آ گئی تھی۔ وہ شاداں و فرحاں پھر رہا تھا اور اُس کے چہرے پر خود بخود ایک تبسم، ایک خوشی برس رہی تھی۔ سارے ملازم کیا نرسیں، کیا کمپاؤنڈر اور کیا ڈاکٹر سب حیران تھے کہ آج ڈاکٹر شوکت اتنا خوش کیوں ہے۔ خود اختر حیران تھی کہ ڈاکٹر اُس میں اور اُسکے شوہر میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ اُسے اُس کی چال ڈھال میں، اُس کی گفتگو میں ہو بہو وہی افتخار نظر آ رہا تھا لیکن افتخار اب اس دُنیا میں کہاں تھا۔ افتخار کا خیال آنے سے اُس کا دل ایک دم پژمردہ سا ہو گیا۔ اُسے اپنی بے وفائی پر افسوس ہُوا گو وہ اُس وقت اپنے اس فعل کو بے وفائی نہ سمجھتی تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اُس کے دل میں یہ خیال بیٹھتا گیا کہ اُسے اپنے وعدوں کا احترام کرنا چاہیئے تھا اور تصدق کے ہاتھوں اپنے آپ کو اور اپنی خود داری کو یوں نہ بیچ دینا تھا۔ تصدق کے دل اور دماغ میں حکومت کرنے کی بو بہت زیادہ تھی۔ شروع شروع میں وہ تصدق کے حکومت کرنے کی اس بو سے مرعوب ہو گئی تھی لیکن شادی ہونے کے کچھ عرصے بعد اُس کی خودی، اُس کا دل، اُس کا دماغ اور اُس کے جسم کا رواں رواں تصدق کے حاکمانہ رویہ کے خلاف بغاوت بغاوت پکارنے لگا۔ لیکن ان سب کی آواز کو وہ اپنی نسوانی کمزوری سے دباتی رہتی۔ اور پھر وہ سوچتی کہ اب اس بغاوت سے کیا فائدہ۔ افتخار تو ہے نہیں جو میری قدر کریگا۔ اس کے علاوہ تصدق میں اور خوبیاں بھی تو تھیں جن سے وہ محبت کرتی تھی اور بہت محبت کرتی تھی۔

رات کا کھانا ڈاکٹر شوکت نے اُس کے پاس اُن کے کمرے ہی میں بھیج دیا۔ پھر دس بجے تو وہ خود مسز تصدق کو دیکھنے آیا۔ اُس کے ہاتھ میں شیشے کے ایک چھوٹے سے گلاس میں دوا کی خوراک بھی تھی۔ اُس نے آتے ہی کہا "مسز تصدق اسکے پینے سے آپ کی ساری کوفت دُور ہو جائے گی۔"

اختر نے شکریئے کے ساتھ دوا پی لی اور ڈاکٹر تصدق کی نبض دیکھ کر واپس چلا گیا۔

بارہ بجے تو پھر ڈاکٹر اُن کے کمرے میں جا پہنچا۔ نرس تصدق کے پلنگ کے قریب بے تحاشہ پڑی سو رہی تھی۔ نرس شوکت کو دیکھ کر ذرا بھی متعجب نہ ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر نازک حالت کے مریضوں کو رات کے وقت کئی کئی دفعہ دیکھنے آتا ہے لیکن جب شوکت تصدق کی نبض دیکھ کر اور تھرمامیٹر سے درجۂ حرارت لیکر بھی نہ گیا بلکہ دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گیا تو البتہ اُسے حیرت ہوئی۔ اُس نے ہمت کر کے ڈاکٹر کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ اختر کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ نرس نے دبے الفاظ میں پوچھا "کیا مریض کی حالت کچھ زیادہ خراب ہو گئی ہے؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

نرس خاموش ہو گئی اور ڈاکٹر پھر اختر کے دلفریب چہرے کی طرف شوق کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ نرس نے پھر پہلے کی طرح ذرا سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "آپ اجازت دیں تو میں چلی جاؤں؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے ایک دم چونک کر کہا جیسے کوئی خواب سے بیدار ہُوا ہو "نہیں ۔۔۔ کیوں؟ تمہیں جانے کا خیال کیوں آیا؟"

نرس نے کچھ جواب نہ دیا۔ نظر اُٹھائی اور اختر کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ نرس ہمیشہ ڈاکٹر شوکت سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن ڈاکٹر نے کبھی اُس کی ہمت افزائی نہ کی اور اُس کی شوخیوں پر کبھی اُسے نکالنے پر بھی آمادہ نہ ہُوا بلکہ ہمیشہ معاف کر دیتا۔ اس دفعہ بھی اس نے اُس کی بات سے

کوئی زیادہ اثر نہیں لیا۔ دراصل اختر کو اپنے اتنے قریب سوتا دیکھ کر اس کے جی میں بے اختیار خواہش پیدا ہو گئی تھی، کاش وہ ان رخساروں کو چوم سکتا جو اتنی مدت گذرنے کے بعد بھی تر و تازہ گلاب کے پھول کے مانند تھے۔ یا کم از کم اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے آہستہ آہستہ انہیں مس کر سکتا۔ بیماری کے عالم میں حسن کتنا زیادہ دلکش ہو جاتا ہے اس بات کا اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اندازہ ہوا۔ اگر نرس نہ بولتی تو نہ معلوم وہ کب تک وہاں بیٹھا اختر کو تکتا رہتا۔

ڈاکٹر نے نرس کے انتباہ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ایک ایک گھنٹہ کے بعد تھرمامیٹر لگا کر دیکھتی رہنا اور اگر ٹمپریچر تیز ہو جائے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

دوسرے دن تصدق کے اور اختر کے کئی رشتہ دار آ گئے۔ ان کے آنے سے پہلے اسے ذرا دیر کے لئے ہوش آ گیا تھا مگر نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد غش پڑنے لگا۔ شوکت نے رشتہ داروں کو اس کے پاس بہت کم دیر ٹھہرنے دیا اور الگ لیجا کر سمجھا دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اپریشن خدا کے فضل سے کامیاب ہو گیا ہے۔ ان کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنے سے ان کی طبیعت پر برا اثر پڑیگا۔ رشتہ دار ایک دن ٹھہر کر تصدق سے اس کا حال پوچھ پوچھ کر چلے گئے۔ صرف اختر کی ماں رہ گئی اور ایک نوکر۔ لیکن شوکت نے ایک دن بھی ان کے نوکر کو کھانا پکانے نہ دیا۔ دونوں وقت اپنے یہاں سے بھجواتا رہا اور چائے بھی۔ اس پر مستزاد ایسی تندہی سے تصدق کا علاج کیا اور ایسی خدمت کی کہ تصدق بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اختر اور اختر کی ماں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

دن گذرتے گئے اور دنوں کے ساتھ ساتھ تصدق کی صحت اور طاقت واپس آتی رہی۔ اختر بھی کمزور رہتی تھی اس نے بھی ڈاکٹر سے اپنے لئے دوا تجویز کرا لی تھی اور وہ بھی دوا کے استعمال سے اپنے بدن میں ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگی تھی۔ یوں بھی وہ دونوں ماں بیٹی اسپتال میں اور ڈاکٹر شوکت میں بہت دلچسپی لیتیں۔ اور وہ بھی جہاں تک ممکن اور مناسب ہوتا ان کے ساتھ وقت گذارنے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔

ایک دن جب اختر اور اس کی ماں ڈاکٹر کے یہاں بیٹھی تھیں کہ اختر کی ماں نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب اکیلے کیوں رہتے ہیں۔ اتنی محنت کرنے کے بعد تو ضروری ہے کہ آپ کو آ کر پورا پورا آرام ملے۔ آپ نے شادی کی ہی نہیں یا بیوی آجکل یہاں نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا "میرے جیسے مشغول آدمی کو شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔"

اختر بولی "الٹی بات آپ جیسے مشغول آدمی کو تو فوراً شادی کر لینی چاہئے۔"

اختر کی بات شوکت کے دل میں تیر بن کر لگی۔ ابھی اس نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ اختر کی ماں بولیں "ہاں بیوی کے بغیر آدمی کو آرام نہیں مل سکتا۔"

ڈاکٹر نے پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لیکن آپ یہ تو بتائیے کہ شادی کے بعد میں خلق خدا کی خدمت کے لئے اتنا وقت کہاں سے لاؤں گا؟"

اختر فوراً بولی۔ شادی کے بعد تو آپ کا یہ بوجھ آدھا رہ جائیگا۔"

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "بوجھ آدھا کرنے والی بیوی ـــ" لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا فقرہ نامکمل چھوڑ دیا اور کچھ توقف کے بعد بولا "مسز تصدق اب تو مسٹر تصدق پانچ چھ دن میں جانے کے قابل ہو جائیں گے۔"

وہ اسے مسز تصدق کے نام ہی سے مخاطب کرتا تھا۔ ایسا کرنے میں اسے کافی سے زیادہ احتیاط کرنی پڑتی۔ گو اسے تصدق اختر نام بتایا گیا تھا لیکن اس کی زبان پر جب بھی آتا اختر ہی آتا اور اختر کہنے سے وہ جان بوجھ کر گریز کرتا کیونکہ اختر کہنے سے اسے پہلی باتیں یاد آ جاتیں اور پہلی باتوں کی یاد سے اس کے دل پر چھریاں سی چلنے لگتیں۔

ہاں تو اس نے کمال چالاکی سے اپنی شادی کا ذکر بدل دیا۔ اور ماں بیٹی کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا یا انہوں نے مصلحتاً دوبارہ ذکر نہ چھیڑا۔ پھر وہ دونوں بھی تصدق ہی کی باتیں کرنے لگیں۔

جس روز انہیں جانا تھا اس سے ایک دن پہلے اختر نے ایسا وقت نکالا کہ ڈاکٹر شوکت سے کچھ باتیں تنہائی میں کر سکے۔ وہ دوپہر کو اپنے کمرے میں لیٹا تھا اسے پھر دل کا دورہ پڑ گیا تھا کہ اختر اس کی طبیعت کا حال پوچھنے آ گئی۔ شوکت اختر کو دیکھتے ہی برائے تعظیم کھڑا ہو گیا، لیکن پھر فوراً ہی معافی مانگ کر لیٹ گیا۔ اختر آ کر اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے دل پر رکھ دیا۔ شوکت نے ایک دم دوسری طرف کروٹ بدل لی اور بولا "مسز تصدق آپ

کرسی پر تشریف رکھیں تو زیادہ اچھا ہے"
اختر اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ شوکت نے پھر بے تابی سے کروٹ بدلی اور پوچھا۔
"آپ مسٹر تصدق بالکل تندرست ہیں نا؟"
"وہ تو تندرست ہیں لیکن آپ کا کیا حال ہے؟"
"میرا حال؟ اچھا ہے! شکریہ! مسز تصدق شکریہ!!"
"یہ تکلیف کیا آپ کو اکثر ہو جاتی ہے؟"
شوکت نے جلدی جلدی کئی کروٹیں بدلیں۔ اختر پھر بولی آپ دورے کی شدت کے وقت کیا کوئی دوا نہیں پیتے۔ اگر پیتے ہیں تو مجھے بتایئے کہ کہاں رکھی ہے میں آپ کو ایک خوراک پلا دوں"
ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مہربانی۔ دوا تو میں پی چکا اور میری حالت سے آپ پریشان نہ ہوں میں ذراسی دیر میں بالکل تندرست ہو جاتا ہوں اور ذراسی دیر میں بہت زیادہ بیمار"
اختر نے متاثر ہو کر کہا "یہ تو بہت بُرا ہے۔ آپ اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟"
"علاج؟ — اس کا علاج؟" اُس نے ایک اور کروٹ بدلی اور بولا "مسز تصدق کیا آپ مجھے معاف کر دینگی اگر میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ جایئے اس تکلیف میں تنہائی کی سخت ضرورت ہوتی ہے"
اختر نے ہمدردی کے لہجہ میں جواب دیا "خیر معافی کی تو اس میں کیا بات ہے لیکن اگر میں خاموش بیٹھی رہوں"
ڈاکٹر نے اس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور خاموش لیٹا ہوا چھت کو تکتا رہا۔ اختر کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے ہیں۔ اختر بھی خاموش بیٹھی اُسے تکتی رہی۔ اُس کے دل میں ڈاکٹر کے لئے ہمدردی اور مہربانی کے جذبات پیدا ہوتے رہے۔ اُسے ڈاکٹر کی تنہائی اور بے کسی پر رحم آ رہا تھا۔ وہ سوچتی رہی کہ اتنا بڑا ڈاکٹر اور پھر لوگوں کی بے لوث خدمت کرنے والا جب اسے خود تکلیف ہوتی ہے تو کوئی ایسی ہستی اس کے پاس نہیں ہوتی جو اس کے درد کو اپنا درد اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے یا جو اس کی دلجوئی کر سکے۔ جس کے قرب سے اسے ڈھارس بندھے اور یہ اس طرح بے چینی سے پہلو نہ بدلے۔ اختر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ڈاکٹر کی زندگی کے اس خلا کو پورا کر سکتی لیکن وہ تو کسی اور کی ہے۔ وہ ڈاکٹر کی نہیں بن سکتی۔ اُس پر تو تصدق کی ملکیت کا لیبل لگ رہا ہے۔ پھر اُسے ہاؤس سرجن افتخار کی یاد آئی



وہ دونوں مل کر ایک بہت بڑا اسپتال ہی تو کھولنا چاہتے تھے۔ ایسا اسپتال جس میں غریب سے غریب اور امیر سے امیر کا یکساں علاج، یکساں سلوک کیا جا سکے اور جس میں امیر لوگ روپے کے بدلے ڈاکٹر کو نہ خرید سکیں ڈاکٹر شوکت کا اسپتال ایسا ہی تو ہے۔ اس کے کام میں مدد کر کے گویا وہ آفتاب کی رُوح کو بھی خوش کر سکتی ہے اور خلقِ خدا کی خدمت بھی بڑے اچھے طریقہ اور پیمانہ پر ہو سکتی ہے۔ اُس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ڈاکٹر شوکت کے ساتھ رہنے لگے اور اُس کا ہاتھ بٹانے لگے۔ اُس کے اسپتال میں عورتوں کا ایک الگ سیکشن کھولدے اور اُس کی نگرانی خود کرے۔ شوکت کے اسپتال میں اگر اُسے اگر کوئی کمی نظر آئی تھی تو یہی کہ عورتوں کے لئے الگ اِنتظام نہ تھا جیسا کہ زنانہ اسپتالوں میں عورتوں کے لئے ہوتا ہے یا جیسا کہ ہونا چاہئے۔ لیکن تصدق اُسے اس بات کی اجازت ہی کب دیگا۔ وہ اسے کسی کام کے قابل ہی کب سمجھتا ہے۔ وہ تو حکم دینا جانتا ہے۔ اختر یہ کر دو اختر وہ کر دو۔ اختر فلاں کام اس طرح سے ہو جائے اور فلاں کام اس طرح سے ور اس کے یہ معنی ہوئے کہ تصدق کی نظروں میں اُس کی حیثیت ایک خادمہ کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یاد آیا کہ ایک معاملہ میں اس نے تصدق سے سفارش کی تھی۔ اس کی ایک سہیلی کے شوہر کی ترقی کا سوال تھا اور تصدق اُسے ترقی دینا نہ چاہتا تھا تو اس نے نہایت خشکی سے کہدیا تھا کہ اختر تم میری بیوی تو ضرور ہو لیکن میرے سرکاری کاموں کی مشیر کار ہرگز نہیں۔ جو بات میں بہتر یا انصاف مبنی سمجھونگا کرونگا۔ وہ شوکت کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھی یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ اُس کی ماں اور تصدق بھی ڈاکٹر کی مزاج پرسی کو آ گئے۔ یہ انہیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر انہیں ساتھ لیکر مت جلد واپس چلی گئی۔

اگلے دن جب یہ رخصت ہونے لگے تو شوکت نے بڑے تپاک اور خلوص سے انہیں کار میں بٹھایا۔ تصدق صبح سے بل کا تقاضہ کر رہا تھا مگر ڈاکٹر ٹال دیتا تھا۔ آخر کسی اور طریقہ سے اسپتال کی مدد کرنے کی بابت سوچ کر تصدق چُپ ہو گیا تھا۔ جب کار روانہ ہوئی تو شوکت کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اسے محسوس ہوا کہ دُوسرے کی چیز اس طرح دُوسرے کی چیز ہوتی ہے۔ جس اختر کی آمد سے اُس کے اسپتال کا چپہ چپہ حسین ہو گیا تھا جس اختر کی آمد سے اُس کے دل کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا تھا، جس اختر کی آمد سے اس کی مسرتوں سے خالی زندگی مسرتوں سے بھرپور ہو گئی تھی، اُس

اختر کو وہاں اُس اختر کو تصدق "مسز تصدق" کا لیبل لگائے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اور شوکت بے بس کھڑا یہ منظر، یہ دردناک اور رُوح فرسا منظر دیکھ رہا تھا۔ اُن کے جانیکے بعد اُس نے اسسٹنٹ ڈاکٹر سے مریضوں کو دیکھنے کے لئے کہا اور خود گھر چلا گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے یکایک اُس کی آنکھوں کے ذریعہ سے اُس کے جسم کی ساری طاقت کھینچ لی۔ ٹانگوں میں تو خاص طور پر بالکل سکت نہ رہی تھی۔ گھر پہنچا ہی تھا کہ نوکر نے ایک لفافہ دیا اور بتایا کہ چھوٹی بیوی جی دے گئی تھیں۔ شوکت نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ اندر سے ہزار روپے کا ایک چیک نکلا۔ چیک دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ اختر نے اُس کی تمام محنت، ہمدردی، خدمت اور خلوص کی قیمت ایک ہزار روپے لگائی تھی اور اُس کے نزدیک ان چیزوں کی قیمت روپے سے ادا ہو ہی نہ سکتی تھی۔ ایک ہزار کیا اگر وہ ایک لاکھ روپے کا چیک بھی دے جاتی تو بھی شوکت کو اتنا ہی رنج ہوتا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور فوراً آرام کمرے میں چلا گیا اور وہاں جاتے ہی ایکدم چارپائی پر گر پڑا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اُس نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ چُپ چاپ

لیٹا رہا اور روتا رہا۔ آج اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا غم اُسکی برداشت سے کتنا زیادہ ہے۔

آنسو بہا لینے سے غم کی تیزی میں قدرتی طور پر کمی آجاتی ہے۔ شوکت بھی جب خوب رو چکا تو اُسے تسکین سی محسوس ہونے لگی اور دل کا بوجھ بھی ہلکا سا ہو گیا لیکن وہ اپنے کمرے میں اُسی طرح لیٹا رہا نہ کسی ملازم کو بُلایا اور نہ خود ہی باہر گیا۔ شام ہوئی تو اُٹھا اور چیک کو دُوسرے لفافہ میں بند کر کے مسز تصدق کے نام واپس کر دیا۔

اختر کے چلے جانے پر شوکت کا خیال تھا کہ اب وہ اسپتال نہ چلا سکے گا اور نہ اُس مستعدی ہی سے کام کر سکے گا لہٰذا سوچا کہ سب کچھ اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کر کے خود کہیں چلا جائے اور خدا کی یاد میں باقی زندگی گذار دے، اُس خدا کی یاد میں زندگی گذار دے جس نے دُنیا میں اختر جیسی حسین عورت پیدا کی تھی۔ لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے اُس کی حالت اپنی پہلی حالت پر آتی گئی اور کچھ ہی دنوں میں وہ اپنے پہلے معمول کے مطابق کام کرنے لگا۔ جیسے اختر آئی ہی نہ تھی، جیسے اختر کو اُس نے دوبارہ دیکھا ہی نہ تھا لیکن اِس بات کو زیادہ دن گذرے تھے کہ ایک دن اُسے اختر کا تار ملا لکھا تھا فوراً پہنچئے تصدق سخت بیمار ہیں۔ تار کے لفافہ پر اُس کا نام ڈاکٹر افتخار شوکت لکھا تھا، اُسے سخت حیرت ہوئی کہ اختر نے افتخار کیسے لکھ دیا۔ کیا وہ مجھے پہچان گئی تھی یا بعد میں اُس نے تحقیق کر لیا یا اپنی اُس سہیلی سے معلوم کر لیا جن کے یہاں چائے پر اُس سے پہلی مُلاقات ہوئی تھی۔ بہرحال وہ پہلی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ مگر اس کے پہنچتے پہنچتے تصدق کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اِن لوگوں نے شوکت کو اطلاع ہی اُس وقت دی تھی جب وہاں کے سول سرجن اور دُوسرے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ پھر بھی اس نے انتہائی کوشش کی کہ تصدق کی زندگی کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑ دے۔ مگر مشیت کے آگے کون دم مار سکتا ہے۔ دُو دن رات یہ اُس کے پلنگ کے قریب بیٹھا تعجب اور افسوس کرتا رہا کہ دوائیں اُلٹا اثر کیوں کر رہی ہیں۔ آخر جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ تصدق چل بسا اور اختر کو ڈاکٹر شوکت کے اسپتال اپنے حسب منشا عورتوں کا سیکشن بھر لینے کے لئے آزاد چھوڑ گیا۔

باقیاتِ سحرؔ

ازجناب منشی سراج میر خاں سحرؔ مرحوم

ٹکڑے کر دیتا ہیں اب تک نالۂ شب گیر سے
کام لیتا ہے مگر کچھ دورِ چرخِ پیر سے

ہے ہمارے صیدِ گم گشتہ کی کچھ بار و خبر
تام ہے دل اور زخمی ہے کسی تیر سے

پہلے تجھ کو چرخ کب تھا یہ سلیقہ ظلم کا
شوخیاں سیکھی ہیں چشمِ جادوئے بے پیر سے

پھانس لو زلفِ مسلسل میں دلِ وارفتہ کو
وحشی رم خوردہ ہی باندھا ہے زنجیر سے

جنبشِ ابرو سے ظالم قتل کر جاں باز کو
ہاتھ چھوٹا ہوگا بارے قبضۂ شمشیر سے

مانتا ہوں یار میں بھی سحرؔ ہے جادو بیاں
یار کو لایا منا کے آج کس تدبیر سے

شاخِ نبات

ہاروں دلے من موسیٰ دلے من

از:۔ حضرت جگر کاظمی عسکری

مخزوں دلے من، تنہا دلے من | مفتوں دلے من شیدا دلے من

در وادیٔ زلف از دست رفتہ | مجنوں دلے من لیلا دلے من

دیدہ نہ ہرگز جز قامتِ تو | موزوں دلے من رعنا دلے من

از کیفِ چشمش گشتہ سراسر | میگوں دلے من صہبا دلے من

با کُنہ میکش یک جُرعہ ساقی | جیحوں دلے من دجلا دلے من

از کاکلش خورد آخر بغفلت | شبخوں دلے من تنہا دلے من

خوردہ ہزیمت از سحرِ چشمش | ہاروں دلے من موسیٰ دلے من

از سنگ جورش شد اے جگر وائے

پرخوں دلے من مینا دلے من

عرب کا بذلہ سنج شاعر

ابودُلامہ

از جناب امداد علی مضطر میرٹھی

ابودلامہ کا اصلی نام زند اور اس کے والد کا نام جون تھا جو فقعس نامی بنی اسد کے ایک عربی نژاد شریف کا حبشی غلام تھا کسی وجہ سے انہوں نے جون کو آزاد کر دیا جون نے آزاد ہو کر کوفہ کی سکونت اختیار کی اور وہیں زند پیدا ہوا۔ زند اگرچہ سیاہ فام اور بھونڈی شکل کا بہت ہی کریہہ المنظر شخص تھا مگر بچپن ہی سے اس کی طبع رسا مذاق سلیم اور سنجیدگی کا ہر شخص معترف تھا۔ قدرت نے اسے اس درجہ ذہین فہیم اور پاکیزہ مزاج بنایا تھا کہ اس کی حیات میں عرب کا کوئی شاعر اس کے ہم پلہ نہ تھا اس نے اپنی تعلیم کا بیشتر وقت لہو ولعب میں گنوا دیا۔ اس وجہ سے وہ تعلیمی اعتبار سے نہایت پست تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کوفہ ادیبوں اور سخن سنجان عرب کی صحبتوں کا مرکز اور عربیت کی بہترین درسگاہ قرار پا گیا تھا۔ اور انہی علما فصحا اور ادبا کی آغوش میں زند نے پرورش پائی تھی۔

زند نے بنی امیہ کا آخری دور اپنی کم عمری کے زمانہ میں دیکھا اور بنی عباس کے عہد میں شعر وسخن میں اس قدر ترقی کر لی کہ پہلے تین عباسی خلیفوں ابو العباس سفاح۔ ابو جعفر منصور اور مہدی کے درباروں میں اس کی خاص قدر ومنزلت تھی۔ ان کے مزاجوں میں اسے اس قدر دخل تھا کہ اپنی گوہر افشانیوں سے بات بات پر انعام پاتا تھا۔

زند ابو دلامہ کے نام سے کیوں مشہور ہوا۔ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ان دنوں عرب کا یہ دستور تھا کہ کسی ذی عزت اور شریف آدمی کا اصلی نام نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ ہر قابل احترام اور بھلے شخص کی ایک کنیت ہوتی تھی جس سے اس کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ زند چونکہ ایک ادنیٰ درجے کا موالی زادہ تھا۔ اس لئے اس کی کوئی کنیت نہ تھی بلکہ اسے اس کے اصلی نام سے پکارا جاتا تھا جب تک زند ایک معمولی آدمی رہا تب تک اسے اس امر کا احساس نہ ہوا لیکن جلد ہی جب اس کے شعر وسخن اور نازک خیالیوں نے اسے شعرائے عرب کی صف اول میں لا کھڑا کیا۔ اور عوام وخواص نے اس کے کلام کی قدر کرنا شروع کی تو اس کا دماغ قدرتاً اس طرف متوجہ ہوا۔ اور وہ اپنے نام سے مخاطبت پر اپنی ہتک محسوس کرنے لگا۔

اب اسے اپنی کنیت تجویز کرنے کی فکر ہوئی۔ بہت کچھ غور کرنے کے بعد بھی وہ کوئی موزوں کنیت تجویز نہ کر سکا۔ مکہ معظمہ میں آبادی کے بہت ہی قریب ایک چھوٹا سا پہاڑ تھا جس کے دامن میں اہل قریش جاہلیت کے زمانہ میں اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر آتے تھے اس پہاڑ کا نام ابودلامہ تھا۔ ایک شام زند ٹہلتا ہوا ابو دلامہ کی ایک بلند چوٹی پر جا بیٹھا۔ پہاڑ کی خوشگوار ہوا اور سہانی فضا نے اس کے دل ودماغ میں جولانیاں پیدا کر دیں۔ اس نے وہاں بیٹھے ہوئے ایک قصیدہ لکھا۔ جو ابو عباسی خلیفہ دوم ابو جعفر منصور کی مدح میں تھا۔ اور جس میں اس نے ابو مسلم خراسانی کے قتل کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اُسے واجب القتل ثابت کیا تھا۔

منصور کی مدح سرائی کا تو ایک بہانہ تھا۔ خدا کو یونہی منظور تھا کہ اسے اس ذریعے سے ایسی لافانی شہرت حاصل ہو کر رہتی دنیا تک اس کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیا جائے۔ دربار عباسی میں زند نے تمام مقربین اور شعرا باکمال کے روبرو قصیدہ پڑھا جس کے ہر ہر لفظ پر اس نے وہ خراج تحسین حاصل کیا جو اس سے بیشتر کسی شاعر کو نصیب نہ ہوا تھا قصیدہ ختم ہوا اور زند ادب کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گیا کہتے ہیں کہ ابو جعفر منصور خساست اور بخل میں ضرب المثل تھا۔ لیکن زند کا لکھا ہوا قصیدہ سن کر اس کے دل میں ایسا غیر معمولی جوش فیاضی پیدا ہوا کہ خوش ہو کر بولا۔ "مانگو کیا مانگتے ہو؟" زند کی زبان سے بیساختہ نکلا۔ "دس ہزار درہم!" منصور نے فوراً یہ گرانقدر رقم انعام میں دے دی۔ اس کے بعد بر سبیل تذکرہ منصور کو معلوم ہوا کہ زند نے یہ قصیدہ ابو دلامہ کی ایک چوٹی پر بیٹھ کر لکھا تھا۔ اسی مجلس میں اسے ابو دلامہ کہہ کر منصور نے مخاطب کیا۔ اور اسی وقت سے زند کی کنیت ابو دلامہ مقرر ہوئی۔ اس کنیت سے وہ ایسا مشہور ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کا اصلی نام لوگوں نے فراموش کر دیا اور آج تک ہر شخص اسے اسی کنیت سے یاد کرتا ہے۔

شاعر ہر جگہ اکثر رند ہوتے ہیں۔ فارسی شعرا کی رندمشربی مشہور

ہے لیکن شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانہ میں شعرائے عرب کا درجہ رندی شعر میں تمام دنیا کے شاعروں سے بڑھا ہوا تھا حالانکہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کا دور شاعری صحابہ و تابعین کے خیر القرون میں گزرا تھا۔ اور مجتہدین اولین کے معاصر تھے لیکن اس پر بھی اس درجہ بیباک آزادمنش اور رند تھے کہ معاذ اللہ! ابودلامہ بھی ان رندانہ صفات میں کسی سے کم نہ تھا۔ بلکہ اس میں چند خوبیاں ایسی تھیں جو دوسرے شعراء میں نہ تھیں لیکن باوجود ان تمام عیوب کو دیکھنے اور جاننے کے کسی کو اس سے کسی قسم کا تعرض نہ تھا اور یہ صرف اس کی قادر الکلامی کی وجہ تھی۔

ابودلامہ نہ صرف اپنی شاعری اور موزونی طبع کے لئے مشہور تھا۔ بلکہ جس چیز نے اس کو بام عروج پر پہنچایا تھا وہ اس کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی تھی۔ وہ بے حد نظر شناس اور ظریف طبع واقع ہوا تھا۔ خوبی یہ تھی کہ موقع اور وقت کے اعتبار سے ایسی مزاح آمیز باتیں کرتا تھا کہ مخاطب بغیر ہنسے اور خوش ہوئے نہ رہتا تھا۔

ایک مرتبہ ابوجعفر منصور کے سامنے ابودلامہ نے ایک نظم پڑھی جس میں اس نے مرزا غالب کی طرح اپنی مفلسی اور تنگدستی کا واقعہ اس قدر دلچسپ اور مزاحی پیرایہ میں بیان کیا تھا کہ لطف و سرور کے ساتھ ابوجعفر اس کی زبوں حالی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا نظم کے اختتام پر جعفر نے حکم دیا۔ کہ "ابودلامہ کو چھ سو ایکڑ زمین مزروعہ اور چھ سو ایکڑ زمین بنجر دے دی جائے۔" ابودلامہ نے دست بستہ عرض کیا۔ "حضور بنجر زمین کیسی ہوتی ہے؟" منصور بولے "جو کاشت کے قابل نہ ہو۔" ابودلامہ اسی انداز میں بیساختہ بولے "تو امیر المومنین نجف اور حیرہ کے درمیان کی بارہ ہزار ایکڑ بنجر زمین میں حضور کی نذر کرتا ہوں۔" ابوجعفر منصور بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا کہ "اچھا سب زمین مزروعہ ہی دے دی جائے۔"

ابوالعباس سفاح کے انتقال کے بعد منصور نے حکم دیا کہ جملہ اہل دربار سیاہ کپڑے پہنیں۔ سر پر لمبی لمبی ٹوپیاں رکھیں اور قبا کی پشت پر یہ آیت لکھیں فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ "حکم کے مطابق ابودلامہ بھی اسی وضع قطع میں حاضر دربار ہوا جعفر نے پوچھا" ابودلامہ کیا حال ہے؟ جواب میں ایک شعر پڑھا گیا جس کا مطلب یہ تھا "حضور کے عہد میں حال کا کیا کہنا۔ ہر چیز ترقی پر ہے" منصور نے پوچھا اس کا مطلب؟ ابودلامہ نے فی البدیہہ چند اشعار اس مفہوم کے سنائے خدا نے

دوگالا پیدا کیا ہی تھا۔ آپ نے کپڑے بھی کالے کرا کے سیاہی کو دوبالا کر دیا۔ ٹوپیوں کو بڑھا کر اس درجہ بلند کر دیا کہ معلوم ہوتا ہے لوگوں کے سروں پر مے فروشی یہودیوں کے خم کپڑے میں لپیٹ کر الٹا دیئے گئے ہیں۔ اور سب سے زیادہ بددینی ترقی پر ہے۔ منصور نے چونک کر پوچھا وہ کیسے؟ ابودلامہ نے تعظیماً جھک کر شعر پڑھا۔ امیر المومنین وہ ایسے کہ کلام اللہ کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ان جوابات پر نہ صرف منصور بلکہ تمام حاضرین دربار ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ اور ابودلامہ کو کافی انعام واکرام دیا گیا۔

ایک روز ابودلامہ دربار میں بہت خاموش بیٹھے ہوئے تھے ابوجعفر منصور نے پوچھا "ابودلامہ خاموش کیوں ہو؟" ابودلامہ غمگین صورت بنائے ہوئے بولے "حضور میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے کہتے ہیں کہ خواب کی تعبیر الٹی ہوا کرتی ہے۔ اسی خیال سے پریشان ہو رہا ہوں۔" استفسار ہوا۔ بیان تو کرو کیا خواب دیکھا؟ ابودلامہ نے چند بند عرض کئے جن کا مطلب یہ تھا "میں نے دیکھا ہے کہ حضور نے مجھے ایک اطلسی خلعت اور دس ہزار درہم عطا فرمائے ہیں اب خود خیال فرمائیے کہ اگر اس خواب کی تعبیر برعکس ہو گئی۔ تو غلام کا کیا حال ہو گا۔" خلیفہ ہنسے اور خواب کی تعبیر پوری کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ اور رمضان المبارک کا مہینہ۔ ابودلامہ کے پاس خرچ نہیں تھا۔ بہت پریشان تھے۔ تیسرے چوتھے روز دربار میں حاضر ہوئے خلیفہ نے صورت دیکھتے ہی سوال کیا ابودلامہ کے پاس خرچ نہیں تھا۔ بہت پریشان تھے۔ تیسرے چوتھے روز دربار میں حاضر ہوئے خلیفہ نے صورت دیکھتے ہی سوال کیا۔ "ابودلامہ کیا روزوں کی وجہ سے چہرا اتر رہا ہے۔؟" ابودلامہ نے فوراً کچھ شعر کہہ ڈالے اور اپنا مطلب اس طرح ظاہر کیا۔ "امیر المومنین سنتا تھا کہ روزوں کا ثواب بے حساب ملتا ہے میں ایسی سخت گرمیوں میں تین چار دن سے روزے رکھ رہا ہوں۔ مگر بجائے ثواب کے تنگدستی کے عذاب میں مبتلا ہوں۔" منصور اس جواب سے بہت ہی مسرور ہوئے اور پانچ ہزار درہم عطا فرمائے۔

ابوجعفر منصور کے انتقال کے بعد ابودلامہ اس کی اہلیہ ام سلمہ بنت یعقوب کے پاس گیا اور اظہار رنج و غم کے طور پر کچھ اشعار اس کے سامنے پڑھے خود بھی رو دیا اور ام سلمہ کو بھی رُلا دیا۔ وہ نیک بخت بولی "ابودلامہ درباریوں میں جس قدر صدمہ ان کی وفات کا تم کو ہوا ہے کسی کو نہیں ہوا۔" ابودلامہ نے اس موقعہ پر بھی اپنی ظریف طبعی کو نہیں

چھوڑا روتی صورت بناتے ہوئے فوراً بول اُٹھا اور آپ کو بھی! اگر آپ کا ان کے سوا کوئی شوہر نہیں تھا۔ اور میں تو ان کا بیٹا بھی نہیں بن سکتا" یہ ایسا فقرہ تھا کہ ام سلمہ باوجود انتہائی حزن و ملال کے بیساختہ ہنس پڑی

ایک دن ابودلامہ خلیفہ مہدی اور عباسی امیر علی بن سلیمان کے ساتھ شکار کو گئے۔ پھرتے پھرتے انہوں نے کچھ فاصلہ پر ہرن کا ایک غول دیکھا دونوں نے ان پر کتے چھوڑ دیئے اور ان کے تعاقب میں گھوڑے دوڑا دیئے جب کچھ فاصلہ رہ گیا تو دونوں نے کمانیں کھینچ کر ان پر تیر چلا دئے۔ خلیفہ کے تیر سے ایک ہرن شکار ہوا۔ اور علی بن سلیمان کے تیر نے ایک کتے کو زخمی کر دیا جو فوراً ہی مر گیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر ابودلامہ نے برجستہ چند اشعار کہے جن کا مفہوم یہ تھا کہ "مہدی نے ہرن اور علی بن سلیمان نے کتے کا شکار کیا۔ دونوں کو مبارک ہو۔ اور دونوں اپنا اپنا شکار تناول فرمائیں۔ ان شعروں کو سن کر مہدی تو اس قدر ہنسا کہ پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور علی بن سلیمان شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ ابودلامہ کے یہ اشعار اس قدر مقبول ہوئے کہ علی بن سلیمان "صائد الکلب" یعنی کتے کا شکار کرنے والا مشہور ہو گیا۔

خلیفہ نے چچا کی لڑکی حمادہ بنت عیسیٰ کا انتقال ہو گیا جنازہ کے ہمراہ خود خلیفہ اور جملہ اکابر دولت قبرستان تک گئے میت کو دفنانے سے پیشتر خلیفہ نے قبر کی طرف دیکھ کر ابودلامہ سے کہا "تم نے اس گڑھے کو پُر کرنے کے لئے کیا چیز بہم پہنچائی ہے؟" اس نے بلا تکلف جواب دیا "امیرالمومنین کے چچا کی بیٹی" خلیفہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی

ابودلامہ کے سکونتی مکان کے متعلق کسی نے یہ دعوے کر دیا کہ مکان میرا ہے۔ مقدمہ کئی عدالتوں سے گزرتا ہوا قاضی عافیہ کی عدالت میں پہنچا۔ تاریخ مقررہ پر مدعی اور ابودلامہ پیش ہوئے۔ انہوں نے کھڑے ہوتے ہی تین اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا کہ "شریروں نے میرے مکان پر دعویٰ کیا ہے۔ ایک سال سے میں مقدمہ لڑ رہا ہوں۔ بعض قاضی ایسے ہیں جن کے جور سے میں ڈرتا ہوں۔ مگر اے قاضی عافیہ تمہاری طرف سے مجھے کوئی خدشہ نہیں"

عافیہ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ اس نے کہا کہ "ابودلامہ تم نے مجھ پر ناجائز دباؤ ڈالنے کی غرض سے میری ہجو کی ہے میں امیرالمومنین تک تمہاری شکایت پہنچاؤں گا"

ابودلامہ نے کہا "اگر تم نے ایسا کیا تو یقیناً اپنے عہدے سے برطرف کر دئے جاؤ گے" قاضی نے پوچھا کیسے؟ کہا کہ "امیرالمومنین کہیں گے کہ جو قاضی مدح اور ذم کے پہلو میں امتیاز نہیں کر سکتا وہ مقدمات کے فیصلے کس طرح کر سکتا ہے؟"

خلیفہ نے جب اس واقعہ کو سنا۔ تو بہت ہنسے اور ابودلامہ کو انعام دیا۔

دل کی آواز

از جناب ظفر واسطی صاحب شاہ آبادی

مری آہ بابِ اثر تک نہ پہنچی
اُسے میرے دل کی خبر تک نہ پہنچی

محبت کی تاثیر گو پیش رَو تھی
مگر میرے ساتھ اُس کے گھر تک نہ پہنچی

علاجِ غمِ دل تو مشکل نہ تھا کچھ
خبر ہی مگر چارہ گر تک نہ پہنچی

گناہوں کی تکرار سے فایدہ کیا
جو رحمت ہی دامانِ تر تک نہ پہنچی

محبت کی قسمت ہی میں ٹھوکریں تھیں
پھری دربدر اُس کے در تک نہ پہنچی

کرم کا تو کیا ذکر قسمت سے اب تک
ستم کی نظر بھی ظفر تک نہ پہنچی

شہزادی زیب النسا کا مزار کہاں ہے؟

نظم

از حضرت سیماب اکبر آبادی

اے جانشینانِ سلف، اے مدعیانِ شرف
اے وضعیت در نظر، اے تیغِ حریت بکف
یہ تو کہو تہذیبِ عمرانی تمہاری کیا ہوئی؟
ضرب المثل تعمیر سامانی تمہاری کیا ہوئی

وہ حفظِ آثارِ تمدن کے دعاوی کیا ہوئے
وہ ذہن جو تنظیم عالم پر تھے حاوی کیا ہوئے
گلشن کہاں محفوظ ذہنوں میں بہاریں بھی نہیں
باقی صنادید عجم کی یادگاریں بھی نہیں

اب مدفنِ زیب النسا، یا مرقد نورجہاں
ہے اک متاعِ رائیگاں اور ایک مٹتا سا نشاں
دورِ تنزل ہی سہی لیکن یہ کیا اندھیر ہے
نورجہاں کی خوابگہ ویرانیوں کا ڈھیر ہے

زیب النسا کا مقبرہ برسوں سے بے تحقیق ہے
حالانکہ اسکی ہند میں تدفین بالتوثیق ہے
کس مصلحت سے کر دیا آخر تہ و بالا اُسے
کس نے مٹا ڈالا اُسے اور کیوں مٹا ڈالا اُسے

جلتا کبھی تو اک دیا ہوتا اگر مدفن کہیں
ہیہات اس پر فاتحہ پڑھنے کا موقع بھی نہیں
ڈھونڈو کہ ناموسِ شہنشاہی کی تربت ہے کہاں
ڈھونڈو کہ وہ اقبال ماضی کی امانت ہے کہاں

مل جائے تو محفوظ کر لو اپنی جانوں کی طرح
تاریخ کی عظمت بداماں داستانوں کی طرح

میں پوچھتا ہوں کیا سند غیرت کی اسکے پاس ہے
جو قوم اپنی ماؤں کی قبروں سے بے احساس ہے

مرد کیلئے سب سے زیادہ دلکشی کی چیز ــــ عورت کا حسن
عورت کا حسن قائم رکھنے والی چیز ــــ عورت کی جوانی
عورت کی جوانی تباہ کرنے والی چیز ــــ لیکوریا کی بیماری
لیکوریا کی بیماری کا دوسرا نام ــــ سیلان الرحم
سیلان الرحم کی بیماری کا پہلا اثر ــــ جوانی کا خاتمہ
اور پھر اسکے بعد دوسرا خطرناک اثر ــــ بےوقت موت

عورت کی موت

اس لئے ایسا وقت آنے سے پہلے لیکوریا کی بیمار عورت کا علاج کرو بہت آسان علاج ہے۔ اور اب تو ہزاروں ڈاکٹر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کی لیکوریا کی بیماری یعنی پانی کی بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ ایسی عورت کو دوا "روک" کی ایک شیشی استعمال کرادو۔ تیسرے دن پانی گرنا بند ہو جائے گا۔ اور پوری شیشی ختم ہونے سے پہلے عورت بالکل تندرست ہو جائے گی۔ ایک شیشی دوا "روک" کی قیمت تین روپے ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے بی دہلی ۳۴ کو خط کر بذریعہ وی پی پارسل منگالیں پارسل پر تین آنے محصول لگیگا

ٹیلیفون نمبر ۳۴

تار کا پتہ "زنانہ دواخانہ" دہلی

اقرار گناہ

پراسرار افسانہ

نوشتہ :- ای - ایف - بنسین

مترجمہ :- جناب جمیل احمد کندھا پوری

پھانسی سے پیشتر قید خانے میں ڈاکٹر ٹینڈیل کو دو ایک مرتبہ مجرم سے باتیں کرنے کا موقع ملا تھا ---- اور جس طرح اکثر زندگی کی آخری امید ختم ہو جانے پر کیفیت ہوتی ہے، ڈاکٹر نے دیکھا کہ مجرم راضی برضا ہو کر اپنی قسمت پر مطمئن ہو گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب اسے اس صبح کے تصور سے خوف نہیں محسوس ہوتا، جسے وقت کا ہر لمحہ قریب سے قریب تر لا رہا تھا ---- !

موت کی تلخی اس کے لئے ختم ہو گئی تھی، اور یہ اسی وقت ہوا تھا جب اُسے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی اپیل نامنظور ہو گئی ..... ہاں! ان دنوں جب امید کی تابانی اس کے نہاں خانۂ دل کو منور کر رہی تھی، اس بدنصیب کو موت کا خوف ہر وقت ستایا کرتا تھا۔ لیکن جب اسے اس بات کی خبر کی گئی کہ امید فضول اور بے معنی ہے تو اس کی روح کو امید و بیم کی کشمکش اور روح فرسا تکلیف سے نجات مل گئی اور اس نے بے اعتنائی کے ساتھ قانون کے اٹل فیصلے کو منظور کر لیا پھر بھی یہ تبدیلی اس قدر غیر معمولی تھی کہ ڈاکٹر کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس غم انگیز خبر نے اس کی قوت احساس کو بالکل ختم کر دیا ہے اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ جس وقت اس کو نتیجہ سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اس پر بیہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹر ٹینڈیل کو اسی وقت طبی امداد کے لئے بلایا گیا تھا۔ مگر یہ دورہ بہت عارضی تھا۔ اور جلد ہی اسے ہوش آ گیا۔

قتل کی یہ واردات، اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت خوفناک اور دہشت خیز تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجرم کے لئے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی یا رحم نہ تھا۔ چارلس لنکور تھ جس کے لئے سزائے موت کا حکم صادر ہو چکا تھا۔ شہر شیفلڈ میں ایک چھوٹی سی دکان کا مالک تھا۔ اور گھر میں اس کے ساتھ نہ صرف اس کی بیوی بلکہ ماں بھی رہا کرتی تھی جسے چارلس نے نہایت بے رحمی سے مار ڈالا تھا، صرف اس لئے کہ اسے بڑھیا کے پانچسو پونڈ کی رقم پر قبضہ کرنا تھا، جسے عورت نے مشکلوں سے جمع کر رکھا تھا۔ چارلس جیسا کہ عدالتی تحقیقات سے ظاہر ہوا اس وقت مقروض تھا اور تقریباً ایک سو پاؤنڈ اسے دوسروں کو ادا کرنا تھے۔ اور اپنی بیوی کی غیر حاضری میں، جب وہ دوسرے شہر میں اپنے بعض رشتہ داروں سے ملنے گئی تھی۔ اس نے اپنی ماں کا گلا گھونٹ کر موت کی نیند سلا دیا۔ اور رات کے وقت گھر کی چھوٹی سی عقبی پھلواری میں لاش کو چپکے سے دفن کر دیا جب اس کی بیوی واپس آئی تو اس نے اپنی ماں کے غایب ہو جانے کی معقول سی کہانی بنا کر بیان کر دی۔ کیونکہ اس کے اور ماں کے درمیان پچھلے دو ایک سال سے ہمیشہ جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ ماں نے کئی مرتبہ دھمکی بھی دی تھی کہ وہ آٹھ شلنگ کی وہ رقم دینا بند کر دیگی جو وہ ہر ہفتہ خانہ داری کے اخراجات کے طور پر دیا کرتی تھی ---- اور اپنے اندوختہ روپوں کو لیکر علیحدہ ہو جائیگی۔ سچ پوچھئے تو یہ بھی حقیقت تھی کہ چارلس اپنی بیوی کی عدم موجودگی میں بھی ماں سے شدید طور پر جھگڑ پڑا تھا اور اس کی بنا انتظام خانہ داری سے متعلق ایک نہایت معمولی بات تھی۔ اس شدید جھگڑے کے باعث ماں نے سچ مچ بنک سے اپنے تمام روپے نکال لئے۔ اس ارادے کے ساتھ کہ وہ دوسرے دن شیفلڈ کو خیرباد کہہ کر لندن میں اپنی بعض پرانی سہیلیوں کے ساتھ اقامت اختیار کریگی۔ شام کے وقت اس نے چارلس کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا ---- اور رات کے وقت لڑکے نے اس کو بیرحمی سے مار ڈالا۔

بیوی کی واپسی سے پیشتر چارلس کا دوسرا قدم ٹھوس اور منطقی تھا۔ اس نے اپنی ماں کے تمام اسباب کو "پیک" کیا؛ اور سٹیشن لیجاکر انھیں پسنجر گاڑی سے شہر بھجوا دیا۔ شام کے وقت اس نے کئی احباب کو کھانے پر مدعو کیا، دوران گفتگو میں کہہ دیا کہ اس کی ماں شیفلڈ کو خیرباد کہہ کر لندن چلی گئی ہے۔ چونکہ وہ اس سے واقف تھے کہ ماں بیٹے کے درمیان تعلقات کچھ عرصہ سے ناخوشگوار ہیں اس لئے چارلس نے یہ بھی کہدیا کہ اب ماں کے لندن چلے جانے کے باعث اسے آئے دن کے جھگڑوں سے نجات مل گئی تھی۔ اور اب وہ سکون

اطمینان سے زندگی گذار سکے گا۔ جب اس کی بیوی سفر سے واپس آئی تو بجنسہ یہی واقعہ اس نے اس سے بھی کہا۔ البتہ صرف اس قدر اضافہ کر دیا کہ چونکہ جھگڑا بہت زیادہ شدید ہوا تھا اس لئے غصہ میں ماں نے اپنا پتہ بھی نہ بتایا۔ اس کی یہ ترکیب بھی نہایت دانشمندانہ تھی کیونکہ اس طرح اس کی بیوی اپنی ساس کو خط لکھنے سے باز رہ سکے گی اس کی بیوی نے اس قصے کو من وعن باور کر لیا۔ کیونکہ چارلس نے واقعات کو کچھ اس طرح پیش کیا تھا کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

کچھ عرصہ تک اس نے اس عیاری وچالاکی سے کام لیا جو ایک حد تک تمام مجرموں کا خاصہ ہوا کرتا ہے —— اور بالآخر اسی چیز کا فقدان عموماً "انکشافِ حقیقت" کا سبب ثابت ہوتا ہے۔ چارلس نے بھی فوراً قرض کی رقم بیباق نہ کی۔ بلکہ اپنے گھر میں ایک نوجوان کو بطور کرایہ دار مہمان لے آیا۔ جس نے اس کی ماں کے کمرے میں اقامت اختیار کی۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی دکان کے معاون کو برطرف کر دیا اور تمام کام خود ہی انجام دینے لگا۔ اس فعل سے کفایت شعاری کا گمان ہوتا تھا ساتھ ہی ساتھ وہ لوگوں سے اس حیرت انگیز ترقی کا بھی ذکر کرتا رہا جو اسے ان دنوں تجارت میں ہو رہی تھی اور جب تک ایک ماہ نہ گذر گیا اس نے وہ بنک نوٹ بھی نہ بھنائے جو اس نے اپنی ماں کے کمرے میں ایک مقفل دراز میں پائے تھے۔ اس کے بعد اس نے پچاس پچاس کے دو نوٹ بھنائے اور اپنے قرض خواہوں کا حساب صاف کر دیا۔

عین اس جگہ اس کی عیاری اور ہوشیاری کام آئی۔ اس نے ایک مقامی بنک میں پچاس پونڈ کے چار اور نوٹ زیادہ سود کے لالچ میں معین مدت کے لئے جمع کر دیئے۔ حالانکہ وہ صبر سے کام لیکر سیونگز بنک میں رہنے دینا چاہئے تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس "چیز" کے متعلق اُسے بہت پریشانی ہونے لگی جس کو اس نے بہت احتیاط سے عقبی پھلواڑی میں دفن کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں خود کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کر لینے کے لئے اس نے ایک گاڑی لکڑی کی سلیں اور پتھر کے ٹکڑے منگوائے اور تمام کاموں سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد گرما کی ایک شام اپنے کرایہ دار کی مدد سے اس جگہ ایک مصنوعی ٹیلا سا بنا دیا لیکن اس کے بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اس خطرناک راز کو دُنیا کے سامنے آشکار کر دیا۔

کنگس کراس اسٹیشن کے گمشدہ اسباب کے دفتر میں اتفاقاً آگ لگ گئی۔ (جہاں سے اس کو اپنی ماں کی چیزیں طلب کرنی چاہئے تھیں) اور ایک بکس کا کچھ حصہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ کمپنی تلافی کے لئے قانوناً ذمہ دار تھی اور چونکہ کپڑے پر اس کی ماں کا نام درج تھا اور بکس میں شیفلڈ کے پتہ پر ایک خط بھی پڑا تھا اس لئے ایک رسمی سرکاری نوٹس جاری ہوا کہ کمپنی دعوؤں پر غور کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہ نوٹس مسز چارلس کے نام آیا اور چارلس کی شریک حیات نے اسے وصول کیا اور پڑھا۔

یہ ایک بالکل بے ضرر تحریر تھی لیکن بالآخر یہی اس کے لئے پروانۂ موت ثابت ہوئی۔ بکسوں کے کنگس کراس اسٹیشن میں اب تک پڑے رہنے کی توجیہ اس کے بس سے باہر تھی، بجز اس کے کہ شاید اس کی ماں کو کہیں کوئی اتفاقی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اس واقعہ کو قانون کے مطابق اب انھیں پولیس کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا "تاکہ اس کی ماں کی نقل وحرکت کا پتہ لگایا جا سکے۔ غرضیکہ یہی طریق کار سوچ سمجھ کر اس کی شریک حیات اور کرایہ دار مہمان نے اس کو بتایا تھا جن کی موجودگی میں ریلوے کا نوٹس پڑھا گیا۔ اور اسے وصول کرنے سے انکار کرنا ناممکن تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد اس کی گرفتاری عمل میں آئی۔ پھر قانونی تحقیقات شروع ہوئی جو بہت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہی اور اس کے بعد سینچر کی ایک شام کو فیصلہ سننے کے لئے سیکڑوں مرد اور عورت ایوان عدالت میں جمع ہوئے۔ مگر اس مجمع میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اس نوجوان مجرم کے لئے ہمدردی محسوس کرتا۔

تماشائیوں میں بہت سی معمر اور باعزت مائیں بھی تھیں اور چونکہ یہ ہتک اور بے حرمتی تھی مادریت کی اس لئے انھوں نے نہایت دلچسپی سے تمام کارروائیوں کو سُنا اور جب جج نے اپنی بارعب سیاہ ٹوپی پہن کر سزا کا فیصلہ سنایا تو اس کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

جس کسی نے قانونی کارروائیاں دیکھیں اسے چارلس کے قصور وار ہونے کا یقین تھا۔ مگر چارلس نے اپنے خوفناک جرم کی سزا کا فیصلہ اسی بے پروائی سے سُنا جو اپیل کی نامنظوری کے بعد سے اس کی طبیعت کا خاصہ ہو گئی تھی۔ قید خانہ کے پادری نے بے انتہا کوشش کی کہ موت سے پیشتر یہ اپنے گناہ کا اقبال کر لے۔ مگر اس کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اور اخیر تک وہ اپنی بیقصوری ہی جتاتا رہا۔

ستمبر کی ایک درخشاں صبح کو جب آفتاب اپنی پوری تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا قید خانے کے اندر چارلس کو اپنی حفاظت میں

"پھانسی گھر" میں لے گئے۔ جہاں موت کے آلات اور دوسرے ضروری سامان اپنی اپنی جگہ رکھے تھے —— چارلس کو پھانسی دے دی گئی اور ڈاکٹر ٹیڈیل نے دیکھا کہ روح فوراً نکل گئی۔ پھانسی کے تختے کے سامنے وہ موجود تھا۔ اس نے دیکھا۔ کھٹکا کھینچا گیا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جس کا سر اور گردن کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور مشکیں کس کر بندھی ہوئی تھیں۔ گڑھے میں گر گیا۔ اس نے رسی کی چرچراہٹ بھی صاف طور پر سنی اور لٹکے ہوئے جسم کے پھڑکنے کا روح فرسا تماشہ بھی دیکھا لیکن یہ تمام واقعات صرف چند سکنڈ میں ختم ہو گئے۔ پھانسی نہایت کامیاب اور خاطر خواہ ہوئی۔

ایک گھنٹہ بعد اس نے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا اور دیکھا کہ اس کا خیال بالکل صحیح ثابت ہوا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کا جوڑ گردن کے پاس ٹوٹ گیا تھا اور اس سے پتہ چلتا تھا کہ موت یقیناً فوری ہوئی ہوگی سچ پوچھئے تو اب یہ تشریح بھی فضول تھی۔ اور صرف رسمی طریقے کی خاطر ڈاکٹر کو ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔ دفعتاً اس وقت ڈاکٹر کو یہ پریشان کن خیال ستانے لگا کہ مُردے کی روح بھی اس وقت اس کے پاس موجود تھی۔ جیسے یہ اب تک اپنے شکستہ مسکن میں موجود ہو —— بایں ہمہ جسم کے مُردہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا کیونکہ اس کو مرے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔

اس کے بعد ایک دوسرا چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جو بہت انوکھا سا معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس جیلر آیا اور اس رسی کی بابت دریافت کیا جسے ایک گھنٹہ پیشتر پھانسی میں استعمال کیا گیا تھا۔ پھانسی گھر میں وہ رسی موجود نہ تھی اور جیلر کا خیال ہوا تھا کہ شاید وہ یہاں لاش کے ساتھ لاش گھر میں چلی گئی ہو۔ لیکن یہاں بھی اس کا کوئی پتہ نہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بالکل غائب ہو گئی ہے۔ رسی نہ لاش گھر میں تھی اور نہ پھانسی کے تختے کے پاس —— اور انھیں حیرت تھی کہ رسی آخر گئی تو کہاں ——؟

ڈاکٹر ٹیڈیل ایک آزاد خیال نوجوان تھا اور اب تک شادی نہیں کی تھی۔ بڈفورڈ اسکوائر میں وہ ایک خوبصورت سے کشادہ مکان میں رہتا تھا۔ جہاں ایک سیدھی سادی مگر تجربہ کار باورچن اس کا کھانا پکایا کرتی تھی۔ اور اس کا شوہر گھر کے دوسرے کام انجام دیا کرتا تھا، چونکہ ڈاکٹر کو سیم وزر کی کمی نہ تھی اس لئے وہ پریکٹس نہیں کرتا تھا البتہ پڑھنے کا کام وہ ذاتی شوق کی وجہ سے کرتا تھا اور یہ شوق تھا، مجرموں کی ذہنیت کا مطالعہ —— ! بہت سے جرائم کو وہ دماغ کی اشتہائیت یا بھوک کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ مثلاً چوری کے جرائم، اس میں شک نہیں اکثر حقیقی ضرورت کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اس کی تحریک دماغ کے کسی غیر معروف مرض کی طرف سے ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں یہ جنونِ سرقہ (Klepto mania) (ایک مرض جس میں انسان بےضرورت چوری کرتا ہے) سے بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر بہت سے ایسے واقعات سے بھی واقف تھا جن کی تحریک طبعی ضرورت کی بنا پر نہیں ہوتی —— اور یہ واقعہ بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتا تھا۔

شام کو گھر واپس آتے وقت وہ اپنے ذہن میں مجرم کا تصور کر رہا تھا۔ اس مجرم کا جس کی زندگی کے آخری لمحات میں وہ آج صبح موجود تھا۔ روپوں کی ضرورت کچھ ایسی شدید معلوم نہ ہوتی تھی...... جرم قابل نفریں تھا اور اس قدر وحشت خیز اور غیر فطری کہ وہ قاتل کو مجرم کی بجائے پاگل سمجھنے پر مجبور تھا۔ بظاہر مجرم خاموش طبیعت کا ایک نیک مزاج شخص تھا۔ ایک وفا شعار شوہر...... ایک ملنسار پڑوسی لیکن ان باتوں کے باوجود اس نے جرم کیا تھا۔ ایسا جرم جس کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا قابل نفریں فعل، خواہ وہ کسی صحیح الحواس سے سرزد ہو یا کسی پاگل سے، مرتکب کو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہونا چاہئے! ان تمام باتوں کے ساتھ ڈاکٹر کو آرزو ہوتی تھی کہ کاش! مجرم مرنے سے پیشتر اپنے جرم کا اقبال کر لیتا۔ اس میں شک نہیں چارلس مجرم تھا، مگر اسے حیرت ہوتی تھی کہ زندگی کی تمام اُمیدیں ختم ہو جانے کے بعد اس نے پھانسی کے وقت پادری کے سامنے گناہ کا اقرار کیوں نہ کر لیا ——؟

اس شام اس نے تنہا کھانا کھایا، اور اس سے فارغ ہو کر اپنی لائبریری میں چلا گیا۔ جو کھانے کے کمرے سے ملحق تھی۔ چونکہ اس کی طبیعت اس وقت پڑھنے کی طرف راغب نہ تھی اس لئے وہ آتشدان کے مقابل ایک خوبصورت سی سُرخ آرام کرسی میں لیٹ گیا، اور ادھر ادھر کی باتیں سوچنے لگا۔ دفعتاً اس کا احساس اس انوکھے خیال کی طرف منتقل ہو گیا جو اس صبح اسے لاش گھر میں ہوا تھا، یعنی یہ کہ زندگی کی تابانی ایک گھنٹہ پہلے ختم ہو چکنے کے باوجود چارلس کی روح لاش گھر میں موجود تھی۔ زندگی میں کئی مرتبہ پیشتر بھی ڈاکٹر کو ایسا احساس ہو چکا تھا، خصوصاً اچانک موت کی صورت میں، لیکن آج تک کبھی یہ احساس قدر صریحی نہ ہوا تھا، سچ پوچھئے تو اس کے ذہن میں یہ احساس غالباً فطری اور روحانی صداقت کی بنا پر رہا تھا۔ ڈاکٹر

آئندہ زندگی کے نظریئے کا معتقد تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان کی موت کے ساتھ ساتھ اس کی روح فنا نہیں ہو جاتی —— اس لئے بہت ممکن ہے کہ چارلس کی روح فوراً جدا ہونے کو تیار نہ ہو۔ اور شاید اس دنیا کو اس قدر جلد خیرباد کہنے کو اس کا جی نہ چاہتا ہو۔

اپنے فرصت کے اوقات میں ڈاکٹر ٹیڈیل علوم مخفیہ occult کا نہایت دلچسپی اور انہماک سے مطالعہ کیا کرتا تھا کیونکہ دوسرے تجربہ کار اور ماہر اطبا کی طرح وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ روح اور جسم کے درمیان تفریق کی حد بہت تنگ ہے ۔۔۔۔ غیر محسوس کا اثر مادی چیزوں پر بہت زیادہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ ہمیشہ یہ باور کرنے کے لئے تیار تھا کہ ایک روح جسمانیت کا لبادہ اتار پھینکنے کے بعد بھی اس دنیا کے لوگوں سے براہ راست ربط و تعلق رکھ سکتی ہے۔

عین اس وقت کہ ڈاکٹر خیالات کے سمندر میں تنکے کی طرح بہا جا رہا تھا وہ چونک سا پڑا۔ سامنے میز پر اس کے ہاتھ سے بالکل قریب اس کا ٹیلیفون رکھا تھا' اور دفعتہً گھنٹی بجنا شروع ہوئی لیکن معمول کے مطابق نہیں' بلکہ بہت دھیمے سے جیسے رَو بہت کمزور ہو' یا مشین میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ بہرحال اس میں شک نہیں گھنٹی بج ضرور رہی تھی۔ لہٰذا ہاتھ بڑھا کر اس نے ہک پر سے فون اٹھا لیا۔

"ہاں ہاں" اس نے کہا۔ "آپ کون ہیں؟"

اس کے جواب میں ایک سرگوشی سی سنائی دی جو بہت دھیمی اور ناقابل فہم تھی۔

"میں آپ کی آواز نہیں سن سکا" ڈاکٹر نے کہا۔

پھر ایک مرتبہ سرگوشی سنائی دی۔ مگر پہلے سے زیادہ صراحت کے ساتھ نہیں۔ اس کے بعد سرگوشی بالکل ختم ہو گئی۔

تقریباً ایک آدھ منٹ تک ڈاکٹر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا کہ شاید گفتگو از سر نو شروع ہو لیکن خاموشی حکمراں رہی اور کوئی آواز نہ نکلی۔ اس کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا اور گھنٹی بجا کر ایکسچینج کو مخاطب کیا اور اپنا ٹیلیفون نمبر بتلایا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کس نمبر نے ابھی ابھی مجھے مخاطب کیا تھا؟" ڈاکٹر ٹیڈیل نے پوچھا۔

ایک لمحہ تک سکوت طاری رہا۔ پھر جواب آیا —— "یہ نمبر قید خانے کا تھا"

"براہ کرم میرا سلسلہ قید خانے سے ملا دیں" اس نے کہا۔

اس کی درخواست کی تعمیل کی گئی۔

"آپ نے ابھی ابھی مجھ سے گفتگو کرنی چاہی تھی" اس نے فون پر کہا۔ "ہاں میں ڈاکٹر ٹیڈیل ہوں ــــ کیا ہے؟ ــــ میں سن نہیں سکا، آپ نے کیا کہا؟"

آواز نہایت صاف اور قابل فہم طور پر آئی۔

"شاید آپ کو غلطی ہوئی جناب!" ٹیلیفون سے آواز آئی "یہاں سے کسی نے آپ کو مخاطب نہیں کیا تھا"

"مگر ایکسچینج سے تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی دو تین منٹ پیشتر آپ نے مجھے مخاطب کرنا چاہا تھا ــــ"

"شاید ایکسچینج والوں نے سننے میں غلطی کی" آواز آئی۔

"بڑی عجیب بات ہے! اچھا شب بخیر! ..... جیلر ڈریکوٹ! ... آپ ہی بول رہے ہیں نا!"

"ہاں میں ہی ہوں! ..... اچھا شب بخیر"

اس کے بعد ڈاکٹر پھر اپنی کشادہ آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ کچھ پڑھنے کی اس وقت بھی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ غیر ارادی طور پر یونہی ادھر ادھر کی بہت سی باتیں سوچتا رہا۔ لیکن ٹیلیفون کا پراسرار واقعہ بار بار اس کے [illegible] کھٹک رہا تھا اس میں شک نہیں کہ یہ کوئی نئی بات [illegible] اس سے پہلے بیسیوں مرتبہ ٹیلیفون پر غلط طور پر مخاطب کیا گیا تھا ــــ خدا جانے کتنی بار وہ ایکسچینج کی بھول سے غلط نمبر پر لگا دیا گیا تھا لیکن اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی کے اس طرح بجنے اور دوسرے کنارے سے ناقابل فہم سرگوشیوں کی آوازیں کچھ ایسی بات تھی جو بہت انوکھی معلوم ہوتی تھی ــــ اس واقعہ کے متعلق اس نے ہر ممکن طور پر غور کیا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"لیکن یہ ناممکن ہے" وہ پریشان ہو کر آپ ہی آپ بڑبڑایا اور آرام کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

دوسری صبح وہ حسب معمول قید خانے گیا اور ایک مرتبہ پھر یہ تحیرزا احساس اسے بیحد پریشان کرنے لگا کہ اس کے پاس کوئی غیر مرئی ہستی موجود ہے۔ اور جس "ہستی" کی موجودگی کا اسے احساس ہو رہا تھا۔ وہ وہی تھی جسے کل صبح پھانسی دی گئی تھی۔ چونکہ یہ واقعہ مقامی تھا اس لئے چھوٹے سے پھانسی گھر میں اسے نہایت شدید طور پر اس کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس اس قدر شاید تھا کہ

اگر اس مجرم کی خارجی صورت بھی اس وقت اس کو نظر آجاتی تو اسے حیرت نہ ہوتی۔ اور گزرگاہ کے دروازے سے جب وہ نکلے گا تو اس نے واقعی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شاید اس خیال سے کہ وہ نظر آجائے۔ مگر ہر وقت اس کے دل میں ایک گہری ہیبت مسلط رہی۔ اور اس غیر مرئی ہستی کی موجودگی کا اسے احساس عجیب حیرت انگیز طور پر پریشان کرتا رہا۔ ڈاکٹر کو خیال ہوا شاید وہ بیچاری مصیبت زدہ روح اس سے کوئی ضروری بات کہنا چاہتی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے کبھی یہ شک نہیں گزرا کہ اس کا یہ تصور خارجی تھا ــــ اس پیکر کو وہ ہرگز اپنی ایجاد بھی نہیں سمجھ سکتا تھا ــــ چارلس کی روح وہاں موجود تھی ــــ!

شفاخانے میں جاکر وہ تقریباً دو گھنٹوں تک اپنے کام میں مصروف رہا مگر یہاں بھی اسے ہر وقت یہ احساس ستاتا رہا کہ وہی غیر مرئی ہستی یہاں بھی اس کے سامنے موجود ہے۔ آخر میں گھر روانہ ہونے سے پیشتر اپنے نظریے کی جانچ کے لئے وہ پھانسی گھر میں داخل ہوا مگر چشم زدن میں وہ نہایت متوحش اور گھبرایا ہوا باہر نکل آیا اور دروازہ جلدی سے بند کر دیا ــــ زینہ کے اوپر ایک شخص جس کا سر جھکا ہوا تھا اور مشکیں کسی ہوئی تھیں کھڑا تھا۔ ڈاکٹر اس منظر کی تاب نہ لاکر فوراً وہاں سے بھاگ گیا۔

ڈاکٹر ٹیڈیل ایک باہمت آدمی تھا اور روحانی واقعات سے اسے بیحد دلچسپی تھی مگر اس کے باوجود اسے دوبارہ اس جگہ جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یا یوں سمجھئے کہ وہ جانے کی ہمت تو کرتا تھا مگر اس کے اعضا اس کا حکم ماننے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر چاہتا تھا کہ اگر مصیبت زدہ روح کو کوئی بات کہنی ہے تو دور ہی سے کہے۔ جہاں تک وہ سمجھتا تھا اس کا دائرہ عمل محدود تھا۔ قید خانے کی کوٹھری اور پھانسی گھر میں یہ بار بار چکر کاٹتی تھی۔ شفاخانے میں یہ بہت دھندلی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے بعد اس کے ذہن میں ایک دوسرا خیال آیا اور اپنے کمرے میں جاکر ڈریکوٹ جیلر کو بلا بھیجا جس نے پچھلی رات فون پر اس کی باتوں کا جواب دیا تھا۔

"کیا آپ کو اس کا یقین ہے کہ کل رات مجھے یہاں سے کسی نے فون کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

جیلر کے لہجہ میں ایک قسم کا تامل تھا جسے ڈاکٹر نے محسوس کر لیا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے" اس نے کہا، "مجھے آپ نے کل رات جس وقت فون کیا۔ اس کے آدھ گھنٹہ پیشتر سے

میں فون ہی کے پاس بیٹھا تھا۔ اگر کوئی شخص اس آلہ کے قریب آتا تو میں ضرور اس کو دیکھتا۔"

"اور آپ کو کوئی بھی نظر نہ آیا۔" ڈاکٹر نے ذرا زوردار لہجہ میں پوچھا۔

اس سوال کو سُن کر جیلر کے لہجے سے عجیب کشمکش مترشح ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی بات ہے جس کا اظہار اسے کسی قدر دشوار معلوم ہو رہا ہے۔

"اگر آپ اس طرح پوچھتے ہیں ——" اُس نے کہنا شروع کیا "لیکن شاید آپ میری بات سن کر کہیں گے کہ میں اونگھ رہا تھا یا کوئی نشہ آور چیز کھالی تھی۔"

ڈاکٹر نے اپنا بے پروایانہ انداز دور کرتے ہوئے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ "نہیں، اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ اسی طرح میں نہیں کہونگا جس طرح آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ پچھلی رات جب ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سنی تو اس وقت میں سویا ہوا تھا۔ خیال رکھنا جیلر! گھنٹی بجنے کی آواز معمول کے مطابق نہیں تھی۔ اگرچہ میں فون سے بالکل قریب بیٹھا تھا لیکن فون کی آواز بہت ہلکی ہلکی سنائی دی اور جب میں نے اپنا کان فون سے لگایا تو آواز ہلکی سرگوشی میں آئی۔ لیکن اس کے برعکس ایک ہی منٹ بعد جب میں نے آپ سے بات کی تو آواز نہایت صاف طور پر آئی۔ اب میرا کامل یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی ٹیلیفون پہ ضرور تھا جسے آپ شاید نظر انداز کر گئے۔"

جیلر نے اپنے سر کو معنی خیز انداز میں جنبش دیا۔

"میں بزدل نہیں ڈاکٹر"، اس نے کہا۔ "اور میں تخیل کی فضا میں بھی پرواز نہیں کرتا۔ سچ پوچھئے تو فون کے پاس کسی کے گشت لگانے کی آواز میں نے ضرور سنی —— یہ ہوا ہرگز نہیں تھی، کیونکہ رات گرم تھی اور ہوا کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ علاوہ ازیں دریچہ بھی بند تھا اور ہوا کسی طرف سے نہیں آسکتی تھی۔ ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ دیر تک وہ پراسرار ہستی ادھر ادھر کمرے میں چکر لگاتی رہی، اس نے ٹیلیفون بک کے اوراق کو بھی سرسرایا اور جب میرے قریب آیا تو اس نے میرے بالوں کو بھی بے ترتیب کر دیا۔ یہ سرد تھا ڈاکٹر —— بہت سرد۔"

ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کیا اس ہستی نے آپ کو کل صبح والے واقعہ کی یاد تو نہیں دلائی۔" اس نے دفعتہً استفسار کیا۔

اس مرتبہ جیلر نے پس و پیش کیا۔

"ہاں!" اس نے بالآخر کہا۔ "مجرم چارس کی۔"

ڈاکٹر نے اطمینان دلانے کے انداز سے اپنی گردن کو جنبش دیا۔

"تو یہ بات ہے۔" اس نے کہا "آج کی رات بھی آپ کی ڈیوٹی ہے؟"

"ہاں —— !"

"میرا خیال ہے روح خواہ جس کسی کی بھی ہو۔ یہ مجھے کچھ نہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کیا پچھلی رات قید خانے میں آپ کو کسی "شورش" سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے"

"ہاں! پانچ چھ آدمیوں کو بھیانک خواب پریشان کرنے لگا وہ سب چیخنے چلانے اور شور مچانے لگے۔ حالانکہ وہ فطرتاً خاموش طبیعت کے آدمی تھے —— لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں کیونکہ جب بھی پھانسی ہوتی ہے تو کبھی کبھی اس رات اس قسم کا واقعہ پیش آتا ہے"

"اچھا —— اب اگر یہ پراسرار ہستی جسے آپ دیکھ نہیں سکتے آج کی رات پھر ٹیلیفون کے پاس آنا چاہے تو اس کو ہر ممکن موقع دیجئے۔ غالباً وہ پھر ٹھیک اسی وقت نمودار ہوگی۔ میں اس کی وجہ تو بتا نہیں سکتا لیکن ہوتا بالعموم یونہی ہے —— اس لئے اگر کوئی ایسی خاص ضرورت پیش نہ آئے تو ٹیلیفون والے کمرہ میں ساڑھے نو اور ساڑھے دس کے درمیان نہ جایئے گا۔ تاکہ اسے ہر قسم کی سہولت میسر ہو۔ میں بھی اپنے گھر میں گوش برآواز بیٹھا رہونگا۔ اگر فون پر اس نے مجھ سے باتیں کیں تو گفتگو ختم ہونے پر میں اس کی اطلاع فون سے آپ کو دیدونگا۔"

"اس میں اندیشہ یا خوف کی بات تو نہیں ڈاکٹر؟" جیلر نے استفسار کیا۔

اس سوال کو سن کر ڈاکٹر کو خوف کا وہ لمحہ یاد آگیا۔ جو ابھی ابھی اسے پیش آیا تھا مگر اس نے اسے چھپاتے ہوئے کہا۔

"نہیں اس میں ڈرنے کی کونسی بات ہے؟" اس نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

آج کی رات ڈاکٹر کی ایک جگہ کھانے پر دعوت تھی۔ مگر وہ شریک نہ ہوا۔ اور اس وقت کہ رات کے ساڑھے نو بجے تھے وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا —— کچھ دیر کے بعد دفعتہً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اتنی مدھم طور پر نہیں جتنی کہ پچھلی رات ہوئی تھی لیکن

پھر بھی اس میں وہ تحکمانہ لہجہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر فوراً اُٹھ بیٹھا۔ اور ریسیور اپنے کان سے لگالیا۔ اس وقت جو آواز اس کے کان میں آئی وہ دل شکستہ سسکی کی تھی۔

کچھ بولنے سے پیشتر ڈاکٹر تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ اس میں شک نہیں اس وقت ایک عجیب نامعلوم خوف سے اس کے جسم میں لرزش سی پیدا ہوگئی تھی، مگر پھر بھی وہ اس مضطرب روح کی امداد پر مائل تھا۔ بشرطیکہ یہ اس کے حیطۂ امکان میں ہو۔

"ہاں ہاں!" اس نے بالآخر کہا۔ اس کی آواز میں اس وقت لرزش تھی۔ "میں ڈاکٹر ٹیڈیل ہوں۔ میں تمھارے لئے کیا کرسکتا ہوں؟ .... ہاں! .... اور تم ہو کون؟" اس نے آخر میں پوچھا، اگرچہ اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک غیر ضروری سوال تھا۔

آہستہ آہستہ سسکیوں کی آواز ختم ہوگئی اور اس کی جگہ سرگوشیوں نے لے لی۔

"میں کہنا چاہتا ہوں جناب .... میں کہنا چاہتا ہوں .... میں ضرور کہونگا"

"ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟" ڈاکٹر نے اشتیاق آمیز لہجہ میں دریافت کیا۔

"نہیں آپ سے نہیں، اس شخص سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں جو میری پھانسی کے وقت آپ کے پاس موجود تھے۔ کیا جو کچھ میں کہونگا۔ وہ آپ ان سے کہہ دینگے؟"

"مگر تم ہو کون؟" ڈاکٹر ٹیڈیل نے دفعتہً یہ سوال کیا۔

"چارلس لنکورتھ! ــــ میرا خیال تھا آپ پہچانتے ہونگے میں بڑی اذیت میں ہوں، قیدخانہ کو چھوڑنا میرے بس سے باہر ہے... کیا آپ اس شخص کو بلا دیں گے؟"

"تمھارا مطلب پادری سے ہے" ڈاکٹر ٹیڈیل نے پوچھا۔

"ہاں، پادری ہی سے۔ پھانسی سے کچھ دیر پیشتر انھوں نے میری "سروس" پڑھی تھی۔ ان سے باتیں کرکے میری اذیت دور ہو جائیگی"

ڈاکٹر نے کچھ لمحہ توپس و پیش کیا۔ اسے قیدخانہ کے پادری مسٹر ڈوکنس سے یہ کہنے میں شرم محسوس ہوتی تھی کہ ٹیلیفون پر مرحوم چارلس کی روح اس سے ہمکلام ہوئی تھی۔

"ہاں میں ان سے درخواست کردونگا کہ وہ یہاں آئیں" ڈاکٹر نے بالآخر کہا۔

"شکریہ جناب! ہزار ہزار شکریہ! تو آپ انھیں ضرور بلائیں گے،

ہے نا ــــ؟" آواز بتدریج مدھم ہوتی جارہی تھی۔

"تو اب کل رات باتیں ہونگی" روح نے کہا۔ "اس وقت میں اور زیادہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا ــــ مجھے جاکر دیکھنا ہے ــــ! او میرے خدا، میرے خدا"

سسکیوں کی آواز پھر از سرِنو شروع ہوگئی۔ مگر بتدریج مدھم سے مدھم تر ہوتی گئی۔

"کیا دیکھنا ہے؟" ڈاکٹر جلدی سے پوچھ بیٹھا۔ "بتاؤ تو سہی تمھارے ساتھ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟"

"میں نہیں بتاسکتا ــــ ممکن ہے آپ کو نہ بتا سکوں گا" روح نے بہت دھیمے لہجہ میں کہا۔ "اس کی وجہ ــــ!"

اور اتنا کہہ کر آواز بالکل رک گئی۔

ڈاکٹر ٹیڈیل پہلے کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد فون سے پھر کسی قسم کی آواز نہ آئی اور ریسیور کو اس نے پھر ٹک پر رکھ دیا۔ اس وقت پریشانی کے باعث اس کا چہرہ پسینہ سے بھیگ گیا تھا...... اس کے کانوں میں وہی آواز گونج رہی تھی، اس کا دل خوف اور حیرت سے زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ اپنے پریشان ہوش و حواس کو مجتمع کرنے کے لئے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ دو ایک مرتبہ اس نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی اس کے ساتھ یہ مہیب مذاق کر رہا ہو۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسی بات ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ اسے اس بات کا یقین سا تھا کہ اس وقت اس نے ایک ایسی روح سے گفتگو کی تھی جو زندگی میں سنگین جرم کا ارتکاب کرنے کے باعث اس وقت بڑی اذیت میں تھی۔ اور ندامت کے آنسو بہا رہی تھی۔ یہ فریب نظر ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں اس آرام دہ کمرے کے اندر اس نے چارلس لنکورتھ کی روح سے گفتگو کی تھی۔

چند منٹ بعد اس نے قیدخانہ فون کیا۔

"جیلر ڈریکوٹ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "کیا آپ ڈاکٹر ٹیڈیل ہیں؟"

"ہاں! کیا یہاں آپ کے ساتھ کوئی واقعہ پیش تو نہیں آیا؟"

دو مرتبہ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ شخص کچھ بولنے کی کوشش کر رہا ہے مگر بول نہ سکا۔ آخر تیسری کوشش میں الفاظ نکلے۔

"ہاں ڈاکٹر، وہ ابھی ابھی یہاں آیا تھا، میں نے اسے اپنی آنکھوں

سے اس کمرے میں جاتے دیکھا جس میں ٹیلیفون ہے۔"

"کیا آپ سے اس نے کوئی بات بھی کی؟"

"نہیں میں فرطِ خوف سے چپ چاپ بیٹھا مختلف دعائیں پڑھتا رہا۔۔۔ یہاں تقریباً نصف درجن قیدی نیند میں چیختے چلاتے رہے۔ مگر اب سکون ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس وقت پھانسی گھر میں موجود ہے۔"

"خیر گھبرانے کی بات نہیں۔ آپ مجھے پادری ڈوکنس کا پتہ تو بتا دیں"

پتہ اس کو بتا دیا گیا اور ڈاکٹر ہنڈیل اسی وقت اس کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ جس میں یہ درخواست کرتا تھا کہ کل رات وہ کھانا اس کے ساتھ کھائے۔ مگر دفعتہً اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی میز کے سامنے بیٹھ کر جہاں ٹیلیفون اس کے قریب ہی رکھا تھا کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اور وہ بالائی منزل پر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا جسے وہ شاذ ہی استعمال کرتا تھا۔ وہاں اس نے اپنے ہوش و حواس پر دوبارہ قابو پا لیا اور اب ٹھیک سے لکھ بھی سکتا تھا۔ خط میں کھانے کی درخواست کے بعد اس نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ اس سے عجیب تحیر زا واقعہ بیان کرے گا۔ اور اس کی مدد بھی چاہے گا۔ آخر میں اس نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر آپ کو کوئی دوسری مشغولیت ہو جب بھی میں درخواست کرونگا کہ آپ اسے ترک کر دیں۔ آج رات مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے بہت زیادہ افسوس رہتا۔

دوسری رات ٹھیک وقت پر پادری پہنچ گیا۔ اور کھانا ختم ہونے کے بعد جب وہ دونوں قہوہ پی رہے تھے ڈاکٹر نے اس سے کہا۔

"میرے دوست! جو کچھ مجھے اس وقت کہنا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "اسے سن کر تم مجھے پاگل نہ سمجھنا۔"

پادری ڈوکنس ہنسنے لگا۔ "نہیں میں ایسا کیوں سمجھنے لگا۔"

"کل اور پرسوں دونوں رات تقریباً اسی وقت چارلس کی روح نے فون پر مجھ سے باتیں کیں۔ وہی چارلس جس کو دو روز پیشتر ہم نے پھانسی دی جاتے ہوئے دیکھا۔"

جیسا کہ ڈاکٹر کو توقع تھی پادری ہنسا نہیں، اس نے اپنی کرسی پیچھے ہٹائی اور اس کے چہرے سے بیزاری آشکار ہو رہی تھی۔

"ڈاکٹر!" اس نے کہا۔ "کیا یہی کہنے کے لئے، کیا یہی مہمل بات

سنانے کے لئے تم نے مجھے اس رات یہاں بلایا ہے ؟"

" ہاں، اگر تم نے تو ابھی پورا واقعہ نہیں سنا! کل رات اس نے مجھ سے درخواست کی کہ کسی طرح تم کو یہاں لاؤں۔ وہ تم سے کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے تم بآسانی اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ کیا بات ہوگی ؟"

پادری اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔" ایسی مہمل باتیں نہ کرو۔" اس نے کہا "مُردے کبھی واپس نہیں آتے۔ علاوہ ازیں موت کے بعد وہ کس حالت میں اور کس طرح رہتے ہیں' اس کا علم ہمیں حاصل نہیں ——— لیکن اتنا ضرور ہے کہ مادی چیزوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

" لیکن میں تم سے یہ بھی ضرور کہونگا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ کہ دو رات پیشتر جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو آواز بہت مدھم تھی اور بجز سرگوشیوں کے کوئی آواز میرے کانوں میں نہ آئی۔ میں نے فوراً دریافت کیا کہ کہاں سے بولا جا رہا ہے۔ اور مجھے بتایا گیا کہ یہ آواز قید خانے سے آرہی ہے۔ اسی وقت میں نے قید خانہ فون کیا اور جیلر ڈریکوٹ نے جواب دیا کہ وہاں سے کسی نے بھی مجھے فون نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے کسی نہ کسی کی موجودگی کا احساس ضرور تھا۔"

" میں سمجھتا ہوں وہ جیلر بھی اب پینے لگا ہے۔" پادری ڈوکنس نے تیزی سے کہا۔

ڈاکٹر ایک لمحہ کے لئے چپ ہوگیا۔" میرے دوست! تمھیں اس طرح کی بات نہیں کہنی چاہیئے۔" اس نے کہا۔" جیلر تو ہمارے سٹاف کا سب سے شریف آدمی ہے۔ اور اگر اس پر پینے کا الزام لگاتے ہو تو میں کب اس سے بچ سکتا ہوں۔"

پادری پھر بیٹھ گیا۔" معاف کرنا۔" اس نے کہا۔" لیکن میں ان مہمل باتوں میں نہیں پڑ سکتا۔ علاوہ ازیں تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ سب دل لگی نہیں ہے۔"

" اور یہ دل لگی ———۔"

ڈاکٹر نے اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتہً ٹیلیفون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ ڈاکٹر کے کانوں میں یہ آواز صاف طور سے آرہی تھی۔

" تم نے یہ آواز سنی ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

" کون سی آواز ؟"

" ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز۔"

" مجھے تو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔" پادری نے ایک حد تک چیں بر جبیں ہوتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر خاموش رہا..... اور اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر بلب روشن کر دیا۔ پھر ہک پر سے ٹیلیفون کا رسیور اٹھا لیا۔

" ہاں!" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔" کون ہو؟..... ہاں پادری ڈوکنس یہیں ہیں..... میں کوشش کرونگا کہ وہ تم سے باتیں کر لیں۔" اتنا کہہ کر ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

" ڈوکنس! ایک روح سخت اذیت میں ہے۔ براہ کرم تم اس کی بات سن لو۔ خدارا اس کی عاجزانہ درخواست رد نہ کرنا۔"

پادری نے ایک لمحہ کے لئے پس و پیش کیا۔

" جیسی تمھاری مرضی۔" اس نے کہا۔

رسیور کو اٹھا کر اس نے اپنے کان سے لگایا۔

" میں ہوں پادری ڈوکنس۔" اس نے کہا۔ اور پھر انتظار کرنے لگا۔

" میرے کانوں میں تو کسی طرح کی کوئی آواز نہیں آتی۔" اس نے بالآخر کہا۔" لیکن معلوم ہوتا ہے کوئی ہے ضرور۔ سرگوشیوں کی آواز آرہی ہے۔"

" سننے کی کوشش کرو۔ سننے کی کوشش کرو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

پھر پادری نے رسیور کان سے لگایا۔ مگر دفعتہً اس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے فون کو ہک پر رکھ دیا۔

" کسی نے ——— ہاں نہ جانے کس نے کہا۔" میں نے اسے مار ڈالا، میں اعتراف کرتا ہوں۔ میں عفو کی درخواست کرتا ہوں۔" میرے پیارے دوست! یہ سب ایک جھانسا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو تمھارے رجحان سے واقف ہے' تمھارے ساتھ یہ مہیب مذاق کر رہا ہے میں ان خرافات پر یقین نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر ٹیڈیل نے رسیور اٹھا لیا۔" میں ہوں ڈاکٹر ٹیڈیل۔" اس نے کہا۔" کیا تم مسٹر ڈوکنس کے سامنے کوئی ایسی نشانی پیش کر سکتے ہو جس سے انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تم ہی ہو ؟"

" ہاں ———!"

" وہ کہتا ہے۔ وہ نشانی پیش کر سکتا ہے۔" اس نے پادری سے کہا " ہمیں ضرور انتظار کرنا چاہیئے۔"

اس وقت بھی رات بہت گرم تھی اور دریچے کھلے ہوئے تھے تقریباً پانچ منٹ تک دونوں اس جگہ خاموش کھڑے انتظار کرتے رہے لیکن کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا لیکن چند لمحات بعد ہوا کا ایک سرد جھونکا کمرے میں آیا اور اس کے باعث میز پر پڑے ہوئے کاغذات سرسرانے لگے۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر تمام دریچے بند کر دیئے۔

"تم نے محسوس کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں — ہوا کا ایک جھونکا۔ بہت سرد۔"

مگر بند کمرے میں بھی ایک مرتبہ ہوا کا جھونکا آیا اور تمام کاغذات سرسرا گئے۔ "تم نے محسوس کیا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

پادری نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اسے دفعتہً یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا ہے۔

"میرے خدا۔" اس نے خوفزدہ لہجہ میں کہا۔ "ہمیں آج کی رات آنے والے خطرات سے محفوظ رکھنا۔"

"کوئی چیز آرہی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

اور اتنا کہتے ہی وہ چیز آگئی۔ کمرے کے وسط میں ان سے صرف تین گز کے فاصلہ پر ایک شخص کا خاکہ موجود تھا۔ اس کا چہرہ چونکہ شانے کی طرف جھکا ہوا تھا اس لئے نظر نہ آسکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنے سر کو اوپر اٹھایا جیسے یہ کوئی وزنی بوجھ ہو — اور گھور کر ان دونوں کو دیکھیں۔ آنکھیں اور زبان نکلی ہوئی تھی۔ گردن کے گرد نیلگوں سُرمئی رنگ کا نشان تھا۔ اس کے بعد فرش کی پٹریوں پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور خاکہ نظروں سے غائب ہوگیا۔ لیکن فرش پر ایک نئی رسّی پڑی تھی۔

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ ڈاکٹر کا چہرہ پسینہ سے بھیگا ہوا تھا اور پادری ڈوکنس کے زرد لبوں سے صرف دعائیں آہستہ آہستہ نکل رہی تھیں۔ اس کے بعد بڑی کوششوں سے ڈاکٹر نے اپنے پر کسی طرح قابو پایا اور رسّی کی طرف اشارہ کیا۔

"پھانسی کے وقت ہی سے یہ چیز گم ہوگئی تھی۔" اس نے کہا۔

اس کے بعد پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس مرتبہ تحریک و ترغیب کی ضرورت نہ تھی۔ وہ فوراً اس جگہ چلا گیا اور گھنٹی کی آواز رک گئی۔ کچھ دیر تک وہ توجہ سے سنتا رہا۔

"چارلس!" اس نے بالآخر کہا۔ "کیا خدا کو حاضر و ناظر جان کر تم کہہ سکتے ہو کہ اپنے گناہ پر سچے دل سے نادم ہو؟"

اس سوال کا جواب اس قدر آہستہ آیا کہ ڈاکٹر مطلق نہ سن سکا

البتہ پادری نے سنا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور "مغفرت" کے الفاظ سنتے ہی ڈاکٹر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

اخیر میں پھر خاموشی حکمراں ہوگئی۔

"اب میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آتی۔" پادری نے رسیور رکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ملازم طشت پر "سپرٹ" کی ایک بوتل لئے ہوئے آیا۔ ڈاکٹر نے فرش پر نگاہ ڈالے بغیر اس سے کہا۔

"اس جگہ سے رسّی کو اٹھا لو اور فوراً جلا دو۔"

ایک لمحہ کے لئے کمرے میں خاموشی رہی۔

"مگر کمرے میں تو کوئی رسی نہیں جناب۔" ملازم نے کہا۔

اعزازت

از جناب محمد مصطفےٰ صاحب اعزاز کلیمی اعظمگڈھی

مژدہ سنا رہا ہوں رُخِ منتشر کو میں ‏ — ‏ اپنا حجاب پاتا ہوں اپنی نظر کو میں
میں سخت جاں ہوں مر نہیں سکتا شبِ فراق ‏ — ‏ طرزِ تپش سکھاتا ہوں شمعِ سحر کو میں
پہلے وفورِ شوق میں خط بھیج تو دیا، ‏ — ‏ اب رو رہا ہوں قسمتِ پیغامبر کو میں
آنکھوں کا میری فیض ذرا آج دیکھئے ‏ — ‏ گوہر میں ڈھال دیتا ہوں لختِ جگر کو میں
اے برقِ چشمِ یار جو دل ہی گیا تو کیا ‏ — ‏ تو پھونک اور بنایا کروں اپنے گھر کو میں
تصویرِ یار پیچھے ہے آئینہ سامنے ‏ — ‏ حیرت سے دیکھتا ہوں ادھر سے ادھر کو میں
مالک بنایا دل کا تو دل ہی اُجڑ گیا ‏ — ‏ اب آنکھ میں رکھونگا بُتِ فتنہ گر کو میں
یادِ شفق نے اور بھی بیچین کر دیا، ‏ — ‏ اعزاز کیا کروں غمِ سوزِ جگر کو میں

شکوۂ التفات

نظم

از حضرت عظیم اجے پوری

منظورِ چشمِ ناز ہے کیا انکسار سے — تیور ہیں آج کس لئے کچھ سازگار سے
یہ جبر کیا ہے نرگسِ جادو طراز پر — پرہیز کیوں ہے غمزۂ بے اختیار سے
یہ عشوہ کوشیوں کی جگہ تمکنت ہے کیوں — ضد آپڑی ہے کیا روشِ روزگار سے
یہ طرزِ التفات ہے کیا شوخیوں کے بعد — مدِّ نظر ہے کیا کرمِ آشکار سے
ہوتی ہیں آج کس لئے باتیں لگاؤ کی — اب کیوں نہیں وہ لاگ دلِ بیقرار سے
تحریرِ ناز کس لئے زیرِ جبیں نہیں — ابرو ہے صاف کیوں شکنِ بار بار سے

للہ یہ نمایشِ پاسِ وفا ہے کیوں
کیا ہو گئی خطا دلِ بے اختیار سے

کیا یوں خفا ہوئے کہ مرا جامِ زندگی — فرقت میں پُر ہوا نہ غمِ انتظار سے
کیا یہ مری خطا ہے کہ مانندِ عندلیب — خوش تھا قفس میں دورِ فضائے بہار سے
کیا یوں خفا ہوئے کہ تمہارے خیال میں — اُلجھا کیا میں گردشِ لیل و نہار سے

گر تم خفا نہیں ہو تو پھر کیوں نگاہِ ناز — ملتی ہوئی ہے کشمکشِ روزگار سے
گر تم خفا نہیں ہو تو یہ کیا کہ چتونیں — آشفتہ تر ہیں فتنۂ روزِ شمار سے
اچھا یہ بات ہے کہ مرا نشۂ وفا — آخر بدل چکا ہے سراسر خمار سے
عاجز ہوں یا نصیب کہوں یا نرے نصیب — آزردہ ہو تم اور مرے انتظار سے
ہاں یہ خطا ہے گرچہ ہیں اسکے سبب کئی — میں لائقِ سزا ہوں ہر اک اعتبار سے

صدقہ غرورِ حُسن کا وہ دیجئے سزا
جو تلخ تر ہو بادۂ ناخوشگوار سے

پھر بجلیاں گرائیے نخلِ مُراد پر　　چینِ جبیں سے خندۂ بے اختیار سے
پھر کوئی تازہ عہدِ وفا کرکے توڑیئے　　پھر دیکھئے اِدھر نگۂ شرمسار سے
پھر آئیے بہارِ چمن لُوٹتے ہُوئے　　چھپ چھپ کے منہ نکالئے پھر شاخسار سے
پھر مجھ سے پُوچھئے غمِ فرقت کا ماجرا　　پھر اپنا ذکر کیجئے کچھ اختصار سے
پھر کہئیے میری طرزِ سخن کو نوائے راز　　پھر اپنی لَے ملائیے بانگِ ہزار سے
پھر رُخ بدلئے بات کا سنجیدگی کے ساتھ　　پھر آئیے نظر مجھے کچھ بے قرار سے
پھر کھِل کھلا کے بات ہنسی میں اُڑائیے　　خاموش بیٹھ جائیے پھر اِک وقار سے
پھر ضبط کرکے جوشِ تبسّم بڑھائیے　　لعلِ یمن کی آب دُرِ شاہوار سے
پھر چُوڑیوں سے کھیلئے کچھ دل میں سوچ کر　　پھر صاف کیجئے گوشۂ دامن غبار سے
پھر رنگِ پاں چھُڑا کے ادا سے ملائیے　　مہندی کا لوچ موجِ لبِ میگسار سے
آنکھوں نہیں آنکھیں ڈال کے پھر دیکھئے ذرا　　گردن جھکا کے بیٹھئے پھر شرمسار سے
میری خطائے شوق سے پھر رُوٹھ جائیے　　پھر بخش دیجئے اثرِ اعتذار سے
پھر آئیے حجاب اُٹھا کر برہنہ سر　　پھر جائیے تو دیکھئے مُڑ مُڑ کے پیار سے
پھر چھیڑئیے بلائیے مجھکو پکار کر　　پھر باز آئیے نہ مکرر پکار سے
لیکن نگاہِ لُطف کے پردہ میں ترشیاں　　برسائیے نہ غمزۂ مستانہ وار سے

دل کانپتا ہے حرفِ تکلّم سے دیکھنا
گُل ہو نہ یہ چراغ نسیمِ بہار سے

نقد و نظر

جدید مطبوعات!

از:- ادارہ

امیر مینائی

مصنف:- شاہ ممتاز علی آہ مرحوم
تقطیع:- ۲۰×۲۶/۸ ۱۱۲ صفحات
ملنے کا پتہ:- شاہ محمد عبدالباری چیف کورٹ۔ لکھنؤ۔

حضرت امیر الشعرا۔ خواجہ امیر احمد امیر مینائی اردو شاعری کے ان ہمہ داں اور قادر الکلام اساتذہ میں سے ہیں جن کی سبد طبع میں علم و ادب اور شعر و فن کے تمام گلستاں آرا پھول موجود ہیں۔ امیر کی شاعرانہ عظمت، علمی فضیلت، صوفیانہ ذہنیت اور ادیبانہ صلاحیت دوپہر کے سورج کی طرح روشن ہے۔ اگرچہ بعض مقامات میں ان کا اشہب علم شاعری کے محدود میدان سے آگے نکل جاتا رہا ہے۔ لیکن متخیلہ و متمیزہ اور الفاظ و خیالات کے درمیان ربط و یکجائی کا جو رشتہ استوار ہے۔ وہ کسی وقت بھی ٹوٹ نہ سکا۔ اُن کی شاعری میں جہاں وجدانیات و کیفیات صحیحہ کی تصویریں نظر آتی ہیں وہاں نفسانیات اور سفلی حالات کے نقشے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس ہمہ دانی سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کی نظر میں فطرت انسانی کے تمام ظاہری و معنوی اور مجازی و حقیقی پہلوؤں سے دوچار ہو چکی تھیں۔ مطالعہ کی اِنہی نیرنگیوں کے باعث ان کے کلام میں اتنی یکسانی نہیں جس کے پیش نظر ان کے کلام کو کسی ایک مقام تک متعین کیا جا سکے۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات اس رائے کو "ہجو ملیح" سے ملوث کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی خصوصیت سے امیر کی قادر الکلامی اور ہمہ دانی کا ناقابل تردید ثبوت ملتا ہے، اور زیر نظر کتاب کو اگر شروع سے آخر تک پڑھا جائے تو اس قیاس کی اور بھی تصدیق ہو گی۔ کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں امیر کی داستان حیات اس انداز سے سپرد قلم کی گئی ہے کہ ان کی سیرت، اخلاق، عادات و خصائل، کردار و اطوار اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشے روشنی میں آ جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کے علمی و فنی کمالات کو بھی معلومات کی صاف ستھری فضا میں دیکھنے کا موقع میسر آسکتا ہے۔ فاضل مؤلف کی وسعت نظر کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ امیر کی کہانی کے پردے میں اس زمانے کی ساری شعری و علمی تاریخ چھپا دی ہے۔ اس لئے یہ کتاب شخصیت نمائی کی تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید نہیں رہی بلکہ معلومات آموزی کے وسیع ترین میدان میں آ چکی ہے اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آہ صاحب اپنی شاگردانہ عقیدت کو واقعہ نگارانہ صاف گوئی سے متاثر کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں اور تنقید و سوانح نگاری کے امتزاج سے انھوں نے جو اسلوب نگارش پیدا کیا ہے وہ تذکرہ نویسوں کے لئے مشعل رہنمائی ہو سکتا ہے۔ دوسرا حصہ فاضل مؤلف کی تنقید نگاری کا مرقع ہے۔ اس میں کلام امیر کے تمام پہلوؤں کا جائزہ مبصرانہ انداز میں لیا گیا ہے۔ ان کی شاعری کی کوئی فنی خصوصیت ہو گی جس پر ناقدانہ گفتگو نہ کی گئی ہو اور صرف کلام امیر ہی کو موضوع تنقید نہیں بنایا گیا۔ بلکہ طرز تنقید کی جامعیت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کلام امیر کے ہر حصے کو موازنہ و مقابلہ کے ساتھ اس تفصیل سے پیش کیا گیا ہے کہ اس زمانے کا شاعرانہ ماحول اور اس ماحول میں سانس لینے والے شاعروں کی قابلیت بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ اس وصف کے باعث کتاب کا افادی درجہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ کتاب کا تعارف نامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے جس کے لئے اگرچہ خاطر خواہ وقت مہیا نہیں کیا گیا لیکن اختصار کا دامن بھی جامعیت سے خالی نہیں" پیش نامہ پروفیسر سید مسعود حسن ادیب رضوی ایم۔ اے آف لکھنؤ یونیورسٹی کے زور قلم کا مرہون منت ہے۔ مقدمہ حضرت مولانا محمد عبد اللہ العلوی نے لکھا ہے جو ان کی علمی شہرت و قابلیت کی صحیح طور پر نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے اصل موضوع کے متعلق کوئی خاص تیاری نہ کی تھی اس لئے "امیریات" سے نہایت صفائی کے ساتھ دامن چھڑا لیا اور دہلی و لکھنؤ کے لسانی امتیازات اور زبان دہلی پر لکھنؤ کے احسانات کو موضوع مقدمہ بنا لیا۔ لیکن معلومات کی فراوانی اور طرز تحریر کی جامعیت نے اس مضمون کو

اس درجہ مفید اور معلومات آموز بنا دیا ہے کہ یہ اضافی کوشش حقیقی مقصد سے ہزاروں درجہ کامیاب اور حسب ضرورت ثابت ہوئی۔

کتاب ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر جو دو ایک کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کا تو تذکرہ ہی غیر ضروری ہے البتہ اس کی موجودگی میں آمیر کے متعلق کوئی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ امید ہے کہ اس کتاب سے کسی صحیح الخیال اردو دوست کی لائبریری محروم نہ رہے گی۔ (ل۔ل)

صحرا نورد کے رومان

مصنفہ:۔ میرزا ادیب بی۔اے

سائز:۔ $\frac{20 \times 16}{16}$ ۔ ۲۲۰ صفحات۔

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز۔ اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

جب اردو رسائل میں "صحرا نورد کے خطوط" کی اشاعت شروع ہوئی تو باذوق حلقہ چونک اٹھا تھا۔ کیونکہ میرزا ادیب نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لیکر اردو ادب میں پہلی مرتبہ ایک دیسا آرٹ پیش کیا جس کے مقابلہ میں رائیڈر ہیگرڈ کی اسرار نویسی اور ٹامس مُور کی رومان پسندی و رنگین بیانی بھی ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ میرزا ادیب کی صحرائی داستانوں کو ہندوستان کے طول و عرض میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اُس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ان کو نہ صرف اُردو کے بلند پایہ نقادوں نے سراہا بلکہ ہندوستان کی بعض اہم زبانوں میں بھی ان کو منتقل کیا جا چکا ہے۔ "اب صحرا نورد کے پانچ رومان" جسے ایک لحاظ سے صحرا نورد کے خطوط کا دوسرا حصہ کہنا چاہیئے زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس گرانقدر تصنیف میں پانچ طویل کہانیاں شامل ہیں یعنی مقدس دیوی، طوفانِ حوادث، مقدس درخت، تباہی کے بعد اور جزیرۂ ہامون۔ ان میں سے اکثر رومان خیام و عالمگیر میں شایع ہو کر پہلے ہی باذوق حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ داستانوں کا ماحول صحرائی ہے۔ لیکن کردار ایسے ہی ہیں جو شہروں اور آبادیوں میں عموماً چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان افسانوں کو بجا طور پر حقیقی زندگی سے بہت قریب کہا جا سکتا ہے۔ فاضل افسانہ نویس نے شہری زندگی کے بناوٹی اور پُر تصنع ماحول سے نکل کر انسانی حیات و معاشرہ پر جو تنقید کی ہے وہ ہر لحاظ سے سبق آموز اور نتیجہ خیز ہے۔ "صحرا نورد کے رومان" وقتی تفریح و تفنن اور دماغی عیاشی کے لئے نہیں لکھے گئے بلکہ ہر رومان کے پس پردہ کوئی نہ کوئی حقیقت پوشیدہ ہے جس کو ہر ہوشمند پڑھنے والا محسوس کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے دو ہی اہم مسائل ہیں۔ افلاس اور غلامی۔ میرزا ادیب نے انہی تلخ حقائق کو شیریں و دلنشیں حکایات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ لہٰذا اگر "صحرا نورد کے رومان" کو جدید ادب کا ترقی یافتہ نمونہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ انداز تحریر پختہ اور سنجیدہ ہے ہمیں امید ہے کہ اردو داں طبقہ اس گرانمایہ تصنیف کا پُر جوش خیر مقدم کرے گا (ع۔ش)

جواہر العلوم

مترجمہ:۔ مولوی عبدالرحیم منشی فاضل۔

۲۱۹ صفحات ۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ کتابستان۔ سوداگر واڑہ سورت

طنطاوی جوہری مصر کے اُن یگانۂ روزگار علماء میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی علوم دینیہ کی تبلیغ و اشاعت کے وقف کر دی۔ چنانچہ اُن کی تفسیر قرآن کا شمار دورِ حاضر کی بہترین کتب میں ہوتا ہے۔ لیکن اس تفسیر کے علاوہ اُنھوں نے اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سے بقول مولوی عبدالسلام ندوی "سب سے زیادہ دلچسپ، آسان اور عام فہم جواہر العلوم ہے" اس تصنیف میں عجائبات عالم اور قدرت کے اسرار و رموز پر ایک مکالمہ اور قصہ کی صورت میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں آیات اللہ کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس سے بہتر کتاب ابتک شائع نہیں ہوئی۔ مولوی عبدالرحیم صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور نے اس کتاب کا ترجمہ سلیس اور عام فہم اُردو زبان میں کیا ہے۔ جس سے نہ صرف اہل علم کو مستفید ہونا چاہئیے۔ بلکہ اسے بچوں کے دینی نصاب میں شامل کیا جائے تو شاندار نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

(ع۔ش)

آغاز و انجام

معنفہ :۔ جمیل احمد کندہائیوری ایم۔اے
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ = ۱۶۰ صفحات
قیمت ایکروپیہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ ۔ لاہور ۔

۔ جمیل احمد صاحب کندہائیوری اُردو کے ایک کامیاب مترجم اور وسیع المطالعہ مقالہ نویس ہیں۔ آپ کے ادبی شاہکار گزشتہ آٹھ نو برس سے ہندوستان کے بلند پایہ رسائل و جرائد میں شائع ہو کر مقبولیتِ عامہ حاصل کر رہے ہیں" آغاز و انجام" آپ کے آٹھ منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے! ان افسانوں میں نہ صرف رنگینی و رومانیت کی جھلک ہے ۔ بلکہ ان میں انسانی زندگی کی دھڑکنیں بھی سُنائی دیتی ہیں۔ ڈھائی سو روپیہ ۔ ملازمت اور فریب کا بیٹا ۔ ڈھائی سو روپیہ ۔ ملازمت اور فریب نگنگ پر لائق مطالعہ ہیں ۔ فاضل افسانہ نویس نے گردو پیش کے حالات کا مطالعہ دقیق بینی سے کیا ہے ۔ لہذا ان کے افسانوں میں واقعہ نگاری کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے ۔ کتاب کے آغاز میں جناب جمیل نے "فنّ افسانہ نگاری" پر بھی معلومات افروز روشنی ڈالی ہے ۔ جس سے مبتدی و ماہر یکساں مستفید ہو سکتے ہیں ۔ آغاز و انجام کا دیباچہ میرزا ادیب کے قلم کا رہین منت ہے جس میں انھوں نے فاضل افسانہ نگار سے اپنے دوستانہ تعلقات کی تاریخ لکھی ہے ۔

(ع ۔ ش)

جب سب طرف سے مایوسی ہو جائے

اور تمام کوششیں بیکار ہو جائیں

تو مندرجہ ذیل نقش و تعویذ سے کام لیجئے۔ یہ میرا وہ سرمایہ ہے جس کے حاصل کرنے میں میں نے ہزاروں روپیہ صرف کر دیا تھا اور برسوں محنت کی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد راز ہائے سربستہ کو چھپا کر رکھنا فرض سمجھتا تھا مگر ضرور تمندوں نے مجھ کو مجبور کیا کہ کیوں نہ خلق خدا کو اس گوہر گرانمایہ اور کلام الٰہی کی برکت سے مالا مال کر دیا جائے۔ اس لئے میں بے کم و کاست آپکی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کئے دیتا ہوں کہ مندرجہ ذیل نقش و تعویذ کبھی ناکامی نہ ہوگی میں چند پیسوں کی خاطر اپنے ایمان کو فروخت نہیں کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے ایماندارانہ قول کو سچا سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کامیابی کے بعد فقیر کے لئے دعائے خیر کریں گے۔ تعویذ و نقش حسب ذیل ہیں جن کا ہدیہ بہت قلیل ہے اور یہ تمام لفافہ کے اندر بذریعہ وی۔پی رجسٹری کرکے روانہ کئے جاتے ہیں۔ ہدیہ کے علاوہ رجسٹری لفافہ کا خرچ ۴ر اور ہوتا ہے۔

نقش بشارت — یہ نقش ہر کام کی کامیابی اور ناکامی کی بشارت دیتا ہے رات کو اپنے سرہانے رکھ کر سو جاؤ اور کام کا تصور دل میں رکھو سوتے وقت میں بشارت ہو جائے گی۔ بیاہ و شادی، مریض کی بیماری، تجارت میں کامیابی۔ ناکامی غرضیکہ اس کا موکل خواب میں آکر جواب دے دیتا ہے۔ ہدیہ ۱ روپیہ دس آنے (۱؎۱۰)

تعویذ دولت — مفلسی میں خدا ہی یاد آتا ہے۔ خدا کسی کو مفلس نہ کرے مفلسی دور کرنے کی جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئے یا روپیہ کی ترقی رک جائے تو اس متبرک تعویذ کی مدد سے آپ کی مفلسی دور ہوگی روپے پیسے میں رکھ دینے سے دولت کی زیادتی ہوگی، اور عجیب انگیز نتیجے آمدنی کے ذرائع پیدا ہونگے جن کی قدرتی نظر آئیگی ہدیہ ایک روپیہ چار آنہ (عہ۱)

محبت کی ڈوری — میرے بزرگ نے صرف مجھ کو اجازت دی تھی کہ یہ بیش ضرورتمندوں کو دی جائے جو جائز طور پر طلب کریں اسلئے اس محبت کی ڈوری کو ضرورتمندوں کے لئے پیش کر رہا ہوں کہ اگر کسی کا اپنے شوہر سے لڑائی رہتی ہو یا شوہر کی طبیعت بیوی کی طرف سے ہٹی ہوئی ہو بیوی سے زرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہوتا رہتا ہو تو یہ تعویذ آپس کی محبت بڑھانے میں محبت کی زنجیر ثابت ہوگا۔ چند دن میں سارے جھگڑے ختم ہو کر شوہر بیوی کا غلام بن جائے گا۔ یہ خدا کے کلام اور اس کے مقرب بندوں کی برکت ہے کہ جائز محبت کے وقت اس تعویذ معظم کی برقی قوت اپنا اثر دکھاتی ہے اور ضرور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ہدیہ صرف ڈھائی روپے (عہ۲)

اقرارنامہ — ہے ضرورتمند کو یہ اقرار کرنا ہوگا کہ میں اپنے سوا کسی دوسرے کو اس نقش و تعویذ کے استعمال کی ترکیب یا نقل نہ بتاؤں گا اور ہدایتوں پر عمل کروں گا۔

نواب میاں "شاہ صاحب" چھتہ حکیم آغا جان (اے ایں) دہلی

جان کی حفاظت کس طرح کرنی چاہئے

آپ کی جان کے بڑے دشمن یہی ہیں جو ہر وقت آپ کو پریشان کر رہے ہیں جنہوں نے آپ کی زندگی کو بے مزہ کر رکھا ہے۔ ان دشمنوں کو برباد کرنے کی ترکیب یہی ہے "ری جووین" کورس جس میں ایک کھانے اور ایک لگانے کی دوا ہوتی ہے' ان تمام شکایتوں کو دور کرنے میں فوری اثر دکھاتی ہے۔ اس کورس میں بڑی زبردست دوائیں ہیں جو سات دن تک استعمال کی جاتی ہیں۔ آٹھویں روز کے بعد پھر کسی دوا کی عمر بھر ضرورت نہیں رہتی کیسا ہی شکست اور ناکارہ انسان ہو' اس نے بچپن میں شرمناک حرکتیں کی ہوں۔ جوانی میں بے احتیاطی کا شکار بن گیا ہو۔ تمام خرابیاں اندرونی و بیرونی سات دن میں دور ہو جاتی ہیں۔ "ری جووین" کورس ایک ایسی علاج ہے جس کا نشانہ تیر کی طرح لگتا ہے پہلے ہی دن سے اثر ہونے لگتا ہے اور آٹھویں دن تو اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کا بیان تحریر میں نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی ڈھیلی اور پھسپھسی رگوں میں بجلی کی لہریں دوڑ جائیں گی اور مردہ اعصاب میں وہ بے پناہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ ضبط مشکل ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو آنکھ اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ اس زندہ طلسم "ری جووین" کی بدولت کئی کئی بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ سات دن میں آپ جوانمرد نہیں بلکہ شیر مرد بن جائیں گے۔ اگر آپ نے آج اس کورس کو استعمال نہ کیا تو یاد رکھئے کہ بعد کو پچھتانا پڑے گا اور دوسرے لوگوں سے تعریف سن کر آپ کو حیرت ہوگی۔ اس کورس کے ذریعہ بے شمار نامرد روزانہ مرد بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں جوانی آگئی۔ وہ اپنے گھر کے لئے مرد بن گئے۔ اور جوانی ان کے چہروں پہ نمایاں ہو گئی۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ سات دن میں جریان۔ احتلام۔ سستی۔ بادی کمزوری۔ ڈھیلا پن۔ پتلا پن۔ رگوں کا ابھار وغیرہ شکایتیں کس طرح دور ہو جاتی ہیں۔ یہ کورس اٹھارہ سال سے لیکر ساٹھ سالہ بوڑھوں پہ بھی اپنے برقی اثر دوڑا رہا ہے۔ اب تو ہر جوان آدمی "ری جووین" کا شکر گزار نظر آ رہا ہے۔ اگر اب تک تجربہ نہیں کیا تو فوراً منگا لیجئے اور پھر زندگی کا انقلاب دیکھئے۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے ہے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ۔ (اس بات کا اقرار کرنا ہوگا کہ سات دن تک ضبط سے کام لیا جائے گا)

ملنے کا پتہ:

منیجر اکسیری دواخانہ۔ کلاں محل (اے ایل)، دہلی!

اعتبارات

میری دنیا میں آفتاب نہیں

از :- حضرت دل شاہجہانپوری

برق ہے حسن بیحجاب نہیں
اس ادا کا کوئی جواب نہیں

نور ہی نور ہے ترا عالم
حسن ہی حسن ہے شباب نہیں

تجھکو کہئے ریاض خلد کا پھول
کوئی اس پھول کا جواب نہیں

کیا کہوں ماجرائے بختِ سیاہ
میری دنیا میں آفتاب نہیں

اک نظر اس طرف بھی اے واعظ
روحِ میکش ہے یہ شراب نہیں

زندگی زندگی ہے بے حاصل
کیا سمجھئے اگر عذاب نہیں

چشم حیراں تجلیوں کی دلیل
فطرتِ حسن میں حجاب نہیں

داغِ پیشانیٔ مقدّر ہے
وہ تمنا جو کامیاب نہیں

پردہ ڈالا ہے وہ تحیّر نے
نگہِ شوق کامیاب نہیں

لن ترانی کا راز اب سمجھے
خودنمائی ہے یہ حجاب نہیں

وہ جو پہلو نشیں رہیں اے دل
پھر کوئی وجہِ اضطراب نہیں

جلد ۳۸ — نمبر ۳

فہرست مندرجات اگست ۱۹۴۲ء

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱	ملاحظات	ادارہ	۱۰
۲	اخبار و افکار شعری	حضرت سیماب اکبرآبادی	۱۱
۳	تحقیق و تصحیح	پیر غلام دستگیر صاحب نامی	۱۶
۴	نقد و نظر	ادارہ	۷۵

علمی و ادبی مضامین

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۵	آرٹ ٹالسٹائی کی نظر میں	جناب محمود بریلوی	۲۵
۶	انگلستان کے عام کتبخانے	جناب حافظ رشید احمد ارشد	۳۸
۷	رحمان بابا	جناب خان کابلی	۵۰
۸	مارکو پولو	جناب محمد ہاشم	۶۱

افسانے اور ڈرامے

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۹	ہم جماعت	جناب اختر گیلانی	۱۸
۱۰	طوفانی رات	جناب طفیل ملک	۳۲
۱۱	پانچ سائے	جناب بشیر ساجد	۴۴
۱۲	اسپین کا سیّد	جناب قاضی امداد انصاری	۵۵
۱۳	ایفائے وعدہ	جناب جمیل احمد کندہاپوری	۶۳

منظومات

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱۴	غم پنہاں	حضرت صاحبزادہ شفق ٹونکی	۱۷
۱۵	دریائے سندھ	جناب صائب شیروانی	۲۳
۱۶	کشتیٔ نوح	حضرت نوح ناروی	۲۴
۱۷	بے نام ادائیں	حضرت مختار بارہ بنکی	۳۱
۱۸	دین و دنیا	حضرت راز یزدانی	۴۱
۱۹	سیل نور	جناب لطیف قریشی	۴۸
۲۰	جام تضمین	حضرت شفق رضوی	۴۹
۲۱	بھول جا	جناب سردار جلیل شیرکوٹی	۵۴
۲۲	تاج محل	حضرت دعا ڈبائیوی	۵۹
۲۳	فکر و نظر	جناب سحر عثمانی	۴۳

دی حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا سے شائع کیا۔

ملاحظات

از:- ادارہ

زیر نظر اشاعت میں "اخبار و افکار" کے تحت مولنا سیماب اکبرآبادی کا ایک اہم خطبۂ صدارت درج کیا جا رہا ہے جو آپ نے ۳۰ رجون ۱۹۴۲ء کو فتح پور سیکری کے ایک مشاعرہ میں پڑھا، خطبہ اپنی افادیت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اہل وطن اس کا غور و فکر کی نظروں سے مطالعہ کریں۔ "ہم جماعت" جناب احمد نیلانی شاہجہانپوری کا ایک دلگداز افسانہ ہے جو انداز بیان، ماحول نگاری اور کردار نویسی کے اعتبار سے خاص طور پر جاذب توجہ ہے جناب محمود بریلوی بہت دیر کے بعد محفل عالمگیر میں تشریف لائے ہیں۔ "آرٹ طالسطائے کی نظر میں" ایک محققانہ مقالہ ہے۔ لیکن مزید تشریح سے کام لیا جاتا تو مضمون کی افادیت دوچند ہو جاتی۔ "ایفائے وعدہ" اور "تاریخ سائے" روحانیت آمیز کہانیاں ہیں اور امید ہے کہ دلچسپی کی نگاہ سے پڑھی جائینگی "مارکوپولو"۔ "انگلستان کے عام کتب خانے" اور "خان بابا" اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے معلومات افزا مضامین ہیں۔ جناب امداد انصاری نے "اسپین کا سید" لکھ کر اردو داں طبقہ کو ایک نئی چیز سے متعارف کیا ہے۔ تاریخ اسلام کا یہ باب اکثر لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھا۔ جناب طفیل ملک کے افسانہ "طوفانی رات" میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ایک افسانے کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ حصہ نظم حسب معمول جدید و قدیم رنگ کا آئینہ دار ہے علی الخصوص حضرت نوح ناروی حضرت شفق کوٹلی۔ حضرت شفق رضوی۔ حضرت راز یزدانی، حضرت خمار بارہ بنکوی۔ حضرت دعا ڈبائیوی کی منظومات بلند پایہ اور وجد آفریں ہیں۔

(ادارہ)

نمونہ

نمونہ طلب فرمانے والے حضرات ۵ر کے ٹکٹ بھیجا کریں کاغذ کی گرانی کے باعث عالمگیر کا نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا۔

منیجر

مولود مسعود

علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ محترم حافظ محمد عالم مالک عالمگیر و خیام کو اللہ تعالےٰ نے اولاد نرینہ سے متمتع کیا ہے۔ مولود مسعود کا نام محمد عارف رکھا گیا ہے۔ قارئین دعا فرمائیں کہ حیّ و قیوم خدا مولود کو عمر خضر عطا کرے اور ملک و ملت کی بیش از بیش خدمات بجالانے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

(ادارہ)

خریداری نمبر نوٹ کر لیجئے

ماہ اگست سے خریداروں کی چٹیں از سر نو طبع کرائی گئی ہیں اس لئے معاونین کرام کے نمبر خریداری تبدیل ہو چکے ہیں لہذا ہر خریدار اپنا نیا نمبر خریداری جو اس ماہ کی چٹ کے ساتھ چھپا ہے اچھی طرح نوٹ کر لے اور آئندہ خط و کتابت کے وقت نئے نمبر کا حوالہ ضرور دے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی۔

عالمگیر بالعموم ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک حوالہ ڈاک ہو جاتا ہے۔ اگر کسی صاحب کو ۱۵ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو دوبارہ منگالے۔ ورنہ ۵ر کے ٹکٹ آنے پر پرچہ ارسال ہوگا۔

منیجر

اخبار و افکار

اُردو شاعری کا دورِ انقلاب

از حضرت سیماب اکبر آبادی

"اُردو شاعری انقلاب کے دروازے پر کھڑی ہے معاشی اور سیاسی قوتوں نے شاعروں کو زندگی کا جائزہ ایک نئے زاویے سے لینے پر مجبور کر دیا ہے اب گل و بلبل، زلف و گیسو اور شاہد و شراب کی شاعری کا زمانہ نہیں رہا۔ بلکہ نزاکت وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ جب تک ادب و شعر کی قوتوں میں انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا نہ کی جائے کوئی ملک آزادی کی فضا میں سانس نہیں لے سکتا۔ ہندوستانی شاعری کو مقتضیات زمانہ کے مطابق ڈھالنے کا سہرا علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے سر ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ شاعرانِ ہند کو بار بار تلقین کی جائے کہ وہ پامال رستوں کو چھوڑ کر نئی شاہراہ پر گامزن ہوں۔ حضرت سیماب اکبر آبادی کا "یہ خطبہ صدارت" اس ضرورت کو بوجوہ تمام پورا کرتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ تمام شاعر اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد خود ہی غور فرمائیں گے کہ کیا ان کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے ؟ (مدیر)

گرامی شعرا و سامعین!

میں "پریم سوسائٹی" اور عمائدین فتح پور سیکری کی عزت افزائی کا سپاس گذار ہوں کہ اس مشاعرے کی صدارت مجھے تفویض فرمائی گئی۔ ایک ایسی مبارک و مقدس بارگاہ کے ماحول میں میرا یہ امتیازی منصب مجھے نادم کرنے کے لئے کافی ہے۔ جہاں سراپا نیاز بن کر آنا ہی میرے لئے ہمیشہ وجہ نازش رہا ہے۔ بایں ہمہ میں اپنی اس نیازمندی کے احساس سے فارغ نہیں ہوں جو مجھے اس بارگاہ اور اس سرزمین سے ہے جس کی خاک پر سیکڑوں چاند اور ہزاروں سورج مصروف خرام رہے ہیں۔ جہاں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں جیسے پر جلال و جبروت شہنشاہوں کے سر عقیدت دارادت نے جھکا دیئے ہیں۔ جس کی فضائے جمیل میں جلیل القدر ادبا اور شعرا کی تصویریں اب بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ جہاں کی آب و ہوا نے ابوالفضل اور فیضی کے دماغوں کی پرورش کی ہے اور جہاں کی فضاؤں نے ہزاروں حیات آفریں نغمے سنے ہیں جن کی گونج سازِ ماضی میں ہنوز باقی ہے۔

حضرات! اس دورِ انقلاب میں جبکہ کرۂ زمین کا ¾ حصہ میدان جنگ بنا ہوا ہے اور انسانی خون پانی کی طرح خاک پر بہہ رہا ہے مشرقی روایات کے مطابق ہندوستان میں مشاعروں کا انعقاد اس ملک کے رہنے والوں کی وضعداری اور معاشرت دوستی کا ایک کھلا ہوا اور مستقل ثبوت ہے۔

اسی دنیا میں، ہماری نظروں سے دور جنگ کی ہولناکیوں نے جو قیامت اٹھا رکھی ہے۔ اس کی شورش، چل پکار، آہ و بکا، اور کراہ کے ساتھ ساتھ زمین کے بعض گوشوں سے نغمہ و شعر کے ساتھ "واہ واہ اور سبحان اللہ" کی صداؤں کا بلند ہونا اس کلیہ کو اور بھی مستحکم کر دیتا ہے کہ تضاد اور اختلاف ہی دنیا کا نام ہے۔

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہ دنیا اتنی وسیع و عریض ہے کہ یہاں کی مخلوق ایک حال اور ایک عالم میں کہیں نہیں ملتی، یہاں بیک وقت عیش و نشاط کی شہنائیاں بھی بجتی ہیں اور غم و الم میں ڈوبی ہوئی آوازیں بھی بلند ہوتی ہیں۔ مگر ان میں باہم تصادم نہیں ہوتا۔

خسخانوں میں برفاب کے ساتھ سکون کا سانس لینے والوں کو تپتے ہوئے بیابانوں میں بھوک اور پیاس کی تکلیف سے تڑپنے والوں کی مصیبت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ایک حصۂ زمین کو اگر بہار رنگ و بو سے شاداب کرتی ہے تو دوسرے حصۂ زمین میں خزاں کے سموم آفریں جھونکوں سے شرارستان تیار ہوتے ہیں مگر پھولوں سے کھیلنے والے آگ میں جھلسنے والوں کے حال سے بے خبر رہتے ہیں۔

لیکن دنیا کا یہ اختلاف حال شاعر کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ دنیا کا ہر فرد ایک دوسرے کے حال سے بے خبر سہی، مگر شاعر (میری مراد حقیقی شاعر سے ہے) ——— تمام کائنات کے درد اور خوشی سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کا ہمہ گیر تخیل اقصائے عالم کا کوئی گوشہ بغیر چھانے نہیں چھوڑتا۔ اور اس کے دل کا فطری درد مشرق میں بیٹھ کر مغرب کے مصائب سے اور جنوب میں بیٹھ کر شمال کے حوادث سے یکساں اثر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ یعنی ایک حقیقی شاعر کی نگاہ کبھی اپنے ماحول میں محدود نہیں ہوتی۔

شاعر کو (UNIVERSAL) یعنی آفاقی خیالات کا حامل ہونا چاہئے۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ آفاقیت "ادب اُردو" میں

فی نفسہ موجود نہ تھی، اور یہ نظریہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ادب کا مقصد و منشا ادب ہی کی تکمیل و ترصیع تک محدود ہے یعنی "ادب صرف برائے ادب" ہے۔

اس نظریہ کے ماتحت متقدمین و متاخرین کے کلام دیکھ جائیے سرسری مطالعہ کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ "ادب برائے ادب" کا نظریہ اپنی پوری قوتوں سے ملک گیر تھا۔ ادب کی آراستگی و تہذیب کے لئے صنائع بدائع، تشبیہ و استعارہ، کنایہ و مجاز اور ایسی ہی دوسری صنعتوں سے برابر کام لیا جا رہا تھا۔ بیشک صنائع و بدائع کے استعمال نے ادب اردو کے سنوارنے میں بڑی خوبی سے کام لیا لیکن ساتھ ہی ساتھ شعر میں صنعت یا بنوٹ بھی پیدا ہو گئی نفسیاتی تحلیل متقدمین سے لیکر آتش و ناسخ تک شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ البتہ متاخرین میں امیر و داغ اور جلال کے یہاں نفسیاتی اشعار زبان کی صفائی کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں۔

لیکن بیسوی صدی عیسوی کے آغاز کے بعد اس نظریہ میں تبدیلی ہو گئی۔ یہ تبدیلی تقاضائے وقت کے مناسب حال تھی۔ اب نظریہ یوں بدل گیا کہ "ادب برائے زندگی" ہے۔ ادب سے زندگی کا تعلق ہمیشہ رہا ہے لیکن ادب میں ہر جہتی زندگی کی ترجمانی ہمیشہ نہیں ہوئی۔ ادب کو زندگی کے ہر شعبہ کا ترجمان ہونا چاہئے لیکن شعرا نے زندگی کے صرف جمالیاتی اور جنسی پہلو پر زیادہ غور کیا اور دوسرے شعبوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

"ادب برائے زندگی" کے نئے نظریہ نے حساس اور صاحب نظر شعرا میں بصیرت کی ایک نئی روشنی پیدا کر دی۔ ان کا تنگنائے خیال وسیع ہو گیا اور انھیں اپنی شاعری کا ماحول غیر محدود نظر آنے لگا۔ پہلے اردو شاعری "غزل اور تغزل" تک محدود تھی۔ اب اس میں بلند خیالات اور نئے افکار کے لئے گنجائش نکل آئی قلعوں اور ایوانوں کی ہنستی ہوئی شاندار زندگی سے لے کر جھونپڑوں اور ویرانوں کی خاموش اور مترود زندگی تک ادب کی نگاہ پہنچنے لگی۔ کسانوں، مزدوروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے جذبات شاعر کی زبان سے ادا ہونے لگے۔ سرمایہ داری اور شخصیت کے خلاف شاعر کا قلم جنگ آزما ہوا۔ جو شاعر تغزل کے پردے میں صرف عورتوں سے محو گفتگو تھا۔ اب آزادی کے ساتھ بادشاہوں اور کجکلاہوں سے ہم کلام ہونے لگا۔ جو ذہن ذہنی یا لفظی حسن و محبت کے کھلونوں سے کھیلا کرتے تھے وہ حقیقی محبت و خلوص کی اہمیت محسوس کرنے لگے، محبت کا عنوان جو صرف نفسانی اور شہوانی افسانوں کو دیا جاتا تھا۔ اب بین الاقوامی اور بین المللی ربط و ضبط اور عالمگیر اتحاد کے ضابطوں پر چسپاں ہونے لگا۔ قدامت و کہنگی جن موضوعات کو صدیوں سے قلعی شدہ برتنوں کی طرح بار بار فریب نظر بنا کر الٹ پلٹ رہی تھی انکی جگہ زندگی کی نئی قدروں اور حیات انسانی کے نئے زاویوں نے لے لی۔ یعنی اب ادب کی وسعتیں براہ راست آفاقی زندگی کی تمام پہنائیوں اور گہرائیوں کو چھونے لگیں۔ سطحیت اس کے غلبے سے خود بخود دبتی اور مغلوب ہوتی چلی گئی اور بالآخر "اردو شاعری" بھی دوسری زبانوں کی مقبول شاعری کی طرح بنی نوع آدم کیلئے مفید تسلیم کر لی گئی۔

شاعر ہر ملک اور ہر زمانے میں پیغمبر کی طرح اپنے ملک اور قوم کی ہر گونہ اصلاح کے لئے موجود رہا ہے اور ہر ملک اور ہر زمانے میں کسی موجود العہد شاعر کو وقت نے آواز دی ہے اور شاعر نے وقت کی آواز سن کر اس کے تقاضوں اور مطالبوں سے دنیا والوں کو آگاہ کیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے چار سو تراسی برس (۴۸۳) پہلے سدارتھ گوتم بدھ نے ایک عرفانی اور ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے بھکشوؤں کے لئے ایک منظوم نظام تعلیم مرتب کیا۔ اُن کے یہ منظوم اشلوک آج بھی ہندوستان، تبت، چین اور جاپان میں قابل تعظیم و تبلیغ سمجھے جاتے ہیں۔ آج تک ان کا باقاعدہ پاٹھ ہوتا ہے اور ان کی تعلیم ماضی کی طرح مستقبل عالم کے لئے آج بھی مفید اور شایان عمل سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے جنگ مہابھارت کے موقع پر حضرت سری کرشن نے ارجن کو آمادۂ جنگ کرنے کے لئے جو الہامی نظم کہی تھی وہ "بھگوت گیتا" کے نام سے آج تک مشہور ہے اور ایک مقدس کتاب کی طرح اس کی پرستش ہوتی ہے۔ اس نظم نے مہابھارت کی جنگ کو فیصلہ کن جنگ بنا دیا تھا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں روسو اور والٹیر کے افکار نے فرانس میں آگ لگا دی۔ ان [illegible] ادیبوں کی آتش بیانیوں نے نوجوانوں کو جوش دلا کر آمادۂ انقلاب کر دیا۔ روسو نے "میثاقِ ملی" کے [illegible] سے ایک کتاب لکھی اس میں لکھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن اسے ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ

دیا گیا" یہی کتاب انقلاب فرانس کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی،

نصرتی ایک ترکی شاعر نے جنگ انگورہ کے عالم جمود میں جذر و مد کا ایک طوفان عظیم پیدا کر دیا۔ غازیان اسلام کے تیور بدل دیئے۔ اور ان کی رگ حمیت میں آگ کے سمندر موجزن کر دیئے۔ انگورہ کے دار الخلافہ بننے کی تاریخ کے ساتھ آج بھی نصرتی کا نام زندہ ہے۔

جب احمد شاہ کجکلاہ بادشاہ ایران کی عیش پسندیوں اور عشرت کوشیوں نے ایران کی سیاسی عظمت کو گرانا چاہا اور رعیت حکومت کی غفلت سے تباہ ہونے لگی تو وقت نے ایرانی شعرا کو آواز دی۔ ایرانی شاعر اٹھا اور اس نے اپنی گرم نوائی سے سلطنت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔

ہندوستان میں بھی ڈاکٹر سر اقبال مرحوم اور ان کے بعض معاصرین نے قومیت، وطنیت اور جمہوریت کی توضیح کرتے ہوئے شخصیت اور سرمایہ داری کی پھولی ہوئی برفانی رگوں کو اس طرح جھنجھوڑا کہ ملک میں جذبۂ قومیت گرما گیا اور جمود میں ایک قسم کی تحریک پیدا ہو گئی۔

تاریخ عالم میں ایسے متعدد ادبا اور شعرا کا نام زندہ ہے جو کسی نہ کسی قسم کے انقلاب کا باعث ہوئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں یک گونہ مسرت محسوس ہوتی ہے کہ آج بھی میرے ملک میں ایسے آتش نفس شعرا موجود ہیں جن کے افکار سے انقلاب کی بو آتی ہے اور جن کے انفاس سے انقلاب کی چنگاریاں اڑتی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ایسے شعرا صرف انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں۔

میری گذارش کا مقصد و مفہوم یہ ہے کہ شاعر کا وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہونا ہی اس کا فرض منصبی ہے۔ ادب و شعر سے تاریخیں بنتی ہیں۔ شعرا کے کلام میں جو تلمیحی کنائے ہوتے ہیں وہ نظر انداز نہیں کئے جاتے۔ شاعر کے اشارۂ قلم سے داستانیں مرتب ہوتی ہیں۔ مورخ اس کے مختصر خیالات موزوں کو تنقید و تحقیق کی روشنی میں پھیلاتا ہے۔ اس کے اشعار کے پس منظر سے حقائق و معارف کے جلوے ابھارتا ہے۔ اور پھر تاریخ کے صفحات پر شرح و بسط کے ساتھ الفاظ کی صورت میں بکھیر دیتا ہے۔

آج بھی جو انقلاب ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اسے دعوت دینے یا روک دینے کی قوت ہم میں موجود ہے۔ وقت، آج بھی ہندوستانی شاعر کو آواز دے رہا ہے کہ وہ اٹھے اور آنے والے انقلاب سے اپنے ملک کو آگاہ کر دے۔ یہ آواز ہر حقیقی اور غیر حقیقی شاعر کے کانوں تک مسلسل پہنچ رہی ہے۔

اب یہ بات شاعر کی فطری استعداد اور قوت شعور پر منحصر ہے کہ وہ اس سے متاثر ہو کر اس کے اثرات کا پرتو عوام الناس کے دلوں اور دماغوں پر ڈالے یا سماعت انداز کر دے۔

جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ لیکن سب کچھ ہو چکنے کے بعد جب دور انقلاب کے جائزہ کے ساتھ ہندوستانی شعرا کا لائحہ عمل بھی پرکھا جائے گا۔ اس وقت صرف اسی شاعر کو شرف قبولیت و شہرت عطا ہو گا جو زمانۂ انقلاب میں وقت کا 'ملک کا' اور اقتضائے فطرت کا ساتھ دیگا۔ ہمارے باقی شعرا (جن سے مجھے ہمدردی ہے) غیر شاعر مخلوق کی طرح نذر انقلاب ہو جائینگے، اور عہد جدید میں کوئی ان کا نام لینا بھی پسند نہ کرے گا۔

اب ہر شاعر اپنی اپنی جگہ سوچے کہ اسے خس و خاشاک کی طرح مٹ جانا ہے، یا مٹتی ہوئی دنیا کو سنبھالنا اور باقیات انقلاب کے ساتھ دنیا میں باقی رہنا ہے۔ شاعر کی زندگی اس کے کلام کی زندگی سے عبارت ہے ورنہ باقی رہنا تو صرف ایک ذات باقی کو شایاں ہے۔ ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام،

اُردو شاعری کے زندہ رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ شاعر کی آواز وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہو۔ اس دور میں تغزل محض یا لفظی شاعری مصلحتاً قابل ترک ہے۔ تغزل دور عیش و نشاط کی پیداوار ہے۔ یہ شعرا کے دماغوں کی خلاؤں میں علیٰ حالہٖ محفوظ رہ سکتا ہے۔ عہد جدید بھی اگر پرسکون اور عشرتناک ثابت ہوا تو خیالی رنگ رلیاں منانے اور جنسی جذبات سے کھیلنے کا موقع پھر مل جائے گا۔ لیکن اس پرشور زمانے میں جبکہ عیش کی محفلیں ویران ہو چکی ہیں، خواب آور گیتوں اور غفلت آفریں نغموں کے چھیڑنے کا وقت نہیں رہا۔ "غزل" کا عنوان "رجز" سے بدل دینے کی ضرورت ہے۔ تغزل، کی جگہ تخیل، تاثر، تدبر، اور تفکر کی ضرورت ہے خلوت میں بیٹھ کر پھولوں کی خیالی سیجیں سجانے سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہمارے راستوں میں جو واقعی کانٹے بچھے ہوئے ہیں انھیں سمیٹ دیا جائے۔

موضوع فکر اخلاقی اور اصلاحی ہو۔ رکیک خیالات فرسودہ موضوعات، جنسی تعلقات کے شرمناک اور عریاں مظاہرے

فرضی وحشت وجنوں اور صدیوں کے پرانے قصے' بازاری زبان یا نُرزوں کرکے مشاعروں کی چھتیں اڑا لینے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے زیراثر ماحول کو اصلاح وتہذیب کے پیغام دیئے جائیں- وقت کی نزاکتیں بیان کی جائیں- انسان اور فطرت کے رشتے کو مضبوط کیا جائے- مادیت نے حقیقت کے چہرے پر جو موٹے موٹے کثیف پردے ڈال دیئے ہیں انھیں چاک کیا جائے اور اسلاف کے نقوش قدم کو بار بار روندنے سے باز آکر آئندہ نسلوں کے لئے نئے نقوش راہ بنائے جائیں-

کتنے نادان اور سادہ لوح ہیں وہ میرے دوست! جو ایک ہی پرانے راستے میں ایک ہی جگہ پہ برسوں سے اچھل کود رہے ہیں' برسوں سے ایک ہی غلط راستے کی خاک اُڑا رہے ہیں' اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف ستر میل فی منٹ کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں' ان کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اسی راستے میں ان کے بہت سے ہمخیال وہم رنگ معاصرین اپنی اُڑائی ہوئی خاک میں ملکر خود بھی خاک ہوچکے ہیں اور آج تاریخ ادب اپنے صفحات پر انھیں ایک انچ جگہ دینے کو تیار نہیں-

قدیم الایام غزل کی ملکیت' وہی لاکھوں مرتبہ کی سنی سنائی پرانی دقیانوسی داستانیں ہیں' ان کو بار بار دہرانے سے بہتر یہ ہے کہ اتحاد وطن' اصلاح اعمال' تدبیر منزل' ارتقائے انسانیت' پیغام عمل' درس خود شناسی' اقتضائے وقت اور ضروریات زندگی کے نئے موضوعات سے ان کی تجدید کی جائے- آدمی کو انسان اور انسان کو فرشتہ بنانے کی کوشش کی جائے- سیاست کی خطرناک دست درازیوں کو محبت کے نازک اور لطیف ہاتھوں سے روکا جائے اور دنیا کو امن وسکون کی اس منزل تک پہنچانے میں مدد دی جائے جس کے لئے وہ صدیوں سے بھٹک رہی ہے-

اس دنیا میں رہنے والوں کی تمام مرادیں' تمام خواہشات تمام مقاصد اور تمام اغراض کی تکمیل کے ذرائع اسی دنیا میں موجود ہیں- صرف انھیں تلاش کرلینے کی ضرورت ہے یہ کام عوام کا نہیں بلکہ متفکر شعرا کا ہے- کہ وہ غور وفکر اور توجہ سے ان اسباب کو ڈھونڈ نکالیں اور اپنے اپنے ماحول میں اپنی آواز کے ذریعہ تقسیم کردیں-

وہی اشعار جو مشاعروں میں سماعت سے ٹکرا کر فوراً مر جاتے ہیں اگر اصلاحی اور اخلاقی قوتوں کے حامل ہوں تو ... گذر کر دل میں اور دل سے گذر کر ذہن ودماغ میں زندگی کا نیا شعور پیدا کرسکتے ہیں- ایسا شعور جو انسان کی اینٹھی ہوئی اور سکڑی ہوئی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑا کر اس کے مفلوج قوائے عمل میں حرکت پیدا کردے- انسانی قوائے عمل کی حرکت ہی ان اندھیروں کو عبور کرسکتی ہے- جنھوں نے سورج کی تابانی اور چاند کی روشنی میں بھی انسان کو اندھا بنا رکھا ہے-

دنیا حقیقت کبریٰ تک پہنچنے کے لئے ایک گذرگاہ ہے یہاں ہر متنفس ایک مسافر ہے- سب اپنی منزل کی طرف جارہے ہیں- مگر کسی کو اپنی منزل کا علم ہے اور کسی کو نہیں- شاعر کی منزل اس کا "نصب العین" ہے- نصب العین کا تعین گویا منزل کا تعین ہے- مگر اس دور کے بیشتر یعنی اسی فیصدی شعراء کا خصوصاً شعرائے متغزل کا کوئی نصب العین نہیں- اگر کہا جائے کہ غزل محض سے زبان کا تحفظ مقصود ہے تو زبان' غزل میں اب سے بہت پہلے محفوظ ہوچکی ہے- اردو زبان کا کوئی لہجہ کوئی اسلوب اور کوئی محاورہ ایسا باقی نہیں رہا جو نظم نہ ہوچکا ہو- غزل میں اگر گنجائش ہے تو جدید خیالات کی اور جدید خیالات کا دروازہ غزل گو شعراء پہ بند ہوچکا ہے-

شاعری فی نفسہ بہت کہن سال ہے- اس پر لاتعداد صدیاں گذر چکی ہیں- دنیا اور شاعری دونوں ہم عمر ہیں- انسانی مدرکات احساسات اور جذبات وہی ہیں جو آدم اول میں فطرتاً ودیعت ہوئے تھے- قرنوں تک خیال آرائی کرنے کے بعد اب وہ ایسا کون سا نیا خیال ہے جسے اردو غزل پیش کرسکتی ہے- عرب اور عجم کے شعراء نے کوئی خیال ایسا نہیں چھوڑا جو نظم نہ کیا گیا ہو- انسانی زندگی اور تصویر فطرت کا کوئی رُخ باقی نہیں رہا' جسے شاعر کے ذہن وقلم نے چھو نہ لیا ہو-

اب اگر کوئی نیا خیال پیدا ہوسکتا ہے تو صرف گرد وپیش کے نئے حالات سے دنیا کے روزانہ بدل جانے والے واقعات سے' انسانی حیات کی گوناگوں تبدیلیوں سے' اور کلیات زندگی کے نئے زاویہ ہائے نگاہ پر غور کرنے سے تو اس کے لئے تنگنائے غزل میں وسعت نہیں مرزا غالب ... نے آج سے ۷۶ برس پہلے اس کمی کو محسوس کرلیا تھا اور صاف کہدیا تھا کہ ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

غالب کو تو ظرفِ غزل" صرف" بقدرِ شوق" تنگ نظر آتا تھا۔ مگر نیا تجربہ یہ ہے کہ غزل کا ظرف" بقدرِ خیال" بھی وسیع نہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم نے لندن کے ایک جلسے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اردو زبان ہی میرے پیغام کی متحمل نہیں ہو سکتی" ——— تا بہ غزل چہ رسد"

غزل کی تنگنائی ثابت ہو جانے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اردو شاعری میں اور کون سی صنف کلام ایسی ہے جس میں جزئیات و کلیات زندگی کی ترجمانی بآسانی و بآزادی ہو سکے بدقسمتی سے ہماری دنیائے ادب میں اجتہاد و ایجاد کا قحط ہے شاعری کے قاعدوں اور موضوعات میں ہم عربی و فارسی شاعری کے مقروض و مقلد ہیں۔ اور چونکہ کوئی نئی صنف ایجاد نہیں کر سکتے اس لئے مجبوراً ہمیں اردو شاعری کے سرمایۂ موجودہ ہی کی طرف نگاہ تجسس ڈالنی پڑتی ہے۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جدید الاسلوب نظموں کے رواج نے ہمارے جدید رجحانات کی ترجمانی کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے اور اب ہم نظموں کے ذریعہ اپنے خیالات دنیا کے سامنے آزادی سے پیش کر سکتے ہیں نظم نویسی کا یہ دَور ایک کامیاب دور ہے۔ اس کے بعد بھی جو ارتقائی دور آنے والا ہے وہ مختصر نظموں ہی کا دور ہوگا۔ جن میں بجائے تفصیل و ترتیل کے خیال و موضوع کی روح ایجاز و اختصار کے ساتھ پیدا کی جائیگی۔ اور میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اردو شاعری کا یہ دَور ہر دَور سے زیادہ کامیاب ہوگا۔

اس قدر عرض کر دینے کے بعد اب میں پھر اپنے مقصود اصلی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور بہ آواز بلند اپنے دور کے تمام شعراء سے خطاب کرتا ہوں کہ وہ موجودہ عہد کے انقلابی مطالبوں سے آگاہ ہوں۔ وقت کی آواز توجہ سے سنیں اور اپنی ذہنی و طبعی قوتوں سے اس انقلاب کا مقابلہ کریں جو انگلینڈ، فرانس، جرمنی، رشیا، یونان، جاپان، چین اور برما کی پرسکون فضاؤں کو تاراج و برباد کر کے ہندوستان کی طرف آنے کیلئے پر تول رہا ہے اپنے ملک اور ملک کی تمام اقوام کو للکار کر جگائیں انھیں انقلاب سے بچنے کی تدبیریں بتائیں انہیں زندگی کی شاہراہوں پر اس طریقوں سے گذرنے کے طریقے سکھائیں اور اپنے الہامی نغموں سے ایسی فضا پیدا کر دیں کہ انھیں سن کر ایک مرتبہ انقلاب بھی اپنی جگہ پر جھوم جائے۔ زندگی اور زندگی شناسی کا ثبوت دینے کا یہی وقت ہے اگر ہمارے شعراء اس وقت بھی قدیم الخیالی اور تقلید کے اندھیرے میں چھپے رہے تو یاد رکھیں کہ ان پر زندگی کا سورج پھر کبھی طلوع نہ ہوگا۔

تحقیق و تصحیح

اصلاحِ تلفّظ

از پیر غلام دستگیر صاحب نامی

گزشتہ اشاعت میں بعض ایسے الفاظ پیش کئے گئے تھے جن کا پہلا حرف مفتوح ہے اب ایسے الفاظ درج کئے جاتے ہیں جن کا پہلا حرف "مضموم" ہے اور جن کا تلفظ عام طور پر غلط کیا جاتا ہے۔ (نامی)

تُوانا۔ (قوی)، توانائی (قوت) توانگر (دولتمند)
جُناب۔ (در، پہلو) جیم کی زبر سے بمعنی درگاہ وغیرہ
جُمہور۔ (آدمیوں کا گروہ)
جُمود۔ (جم جانا۔ بے حسی) بفتح اوّل وہ آنکھ جس سے آنسو نہ بہے
جُھٹ پٹا۔ (سرِ شام یا صبح تڑکے کی تاریکی)
دُرخشاں۔ (تاباں۔ چمکتا ہوا)
دُستور۔ (رواج۔ قانون۔ طریقہ) فارسی اور اردو میں بفتح اول مستعمل ہے
دُوَل۔ (دولت بمعنی سلطنت کی جمع)
شُتر۔ (اونٹ)
طُمطراق۔ (شان و تجمل۔ کرّوفر)
طُول عُمرہٗ۔ (اس کی عمر دراز ہو)
عُشر عَشیر۔ (دسویں کا دسواں یعنی سواں حصہ)
عُوج بن عُوق۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ایک طویل القامت شخص۔ عوج بن عنق غلط ہے۔
عُصیلا۔ (جلد طیش میں آنے والا شخص)
قُدُوم۔ (آنا) قَدَم کی جمع اَقدام ہے۔
قُضاۃ۔ (قاضی کی جمع) ض مشدد نہیں،
قُرشی۔ (قریش کی طرف منسوب شخص) بفتح قاف غلط ہے۔
کُنگرہ۔ (دیوار وغیرہ کا کنگورہ۔ ہر شے کی بلندی۔)
گُنبد۔ (مشہور ہے۔ دَ سے غلط ہے)
مُبارک۔ (برکت والا۔ ر کی زیر سے غلط ہے)
اُٹکھیلی۔ (شوخی۔ چنچلاہٹ۔ کھیل۔)
طُعمہ۔ (خورش۔ روزی۔ کھانا)
ظُہور۔ (ظاہر ہونا وغیرہ)
ظُنون۔ (ظن کی جمع بمعنی گمان، وہم)
عُرُوق۔ (جمع عرق بمعنی رگ۔ نس وغیرہ)

مُتواضع۔ (تواضع کرنے والا)
مُتوجّہ۔ (توجہ کرنے والا۔)
مُتوفّیٰ۔ (فوت شدہ) ان معنوں میں ف کی زیر سے غلط ہے۔
مُحاذی۔ (مقابل)
مُخاطَب۔ (خطاب کیا گیا) ان معنی میں ط کی زیر سے غلط ہے۔
مُدّ ظلّہٗ۔ (اس کا سایہ دراز ہو)
مُربّیٰ یا مُربّا۔ (پروردہ شدہ۔ شیرے میں ڈال کر رکھا ہوا میوہ) آخر میں ہ لکھنا غلط ہے۔
مُروّت۔ (مردانگی۔ احسان) و کے زیر سے غلط ہے۔
مُزدور۔ (مزدوری کرنے والا)
مُسمّیٰ۔ (نام رکھا گیا) ان معنی میں م کے زیر سے غلط ہے۔
مُسوّدہ یا مُسودّہ۔ (رف لکھی ہوئی شے)
مُطّلع۔ (اطلاع دیا گیا۔ واقف)
مُعنون۔ (عنوان دیا گیا)
مُعمّا۔ (پوشیدہ شے۔ چیستان)
مُفاد۔ (فائدہ)
مُلزم۔ (مجرم۔ قصوروار)
یُورش۔ (دشمن پہ حملہ کرنا)
یُوسُف۔ (نام پیغمبر) س کی فتح سے غلط ہے۔
یُونُس۔ (نام پیغمبر) ن پر ضمہ افصح ہے۔
عُقلا۔ (عاقل کی جمع بمعنی عقلمند)
عُقوبت۔ (عذاب۔ سزا)
عُلوم۔ (جمع علم)
فُسون۔ (سحر۔ جادو)
قُماش۔ (اسباب۔ ڈھنگ)
کُحل۔ (سرمہ)

غمِ پنہاں

کوئی نالہ کرے اور کوئی پریشاں ہو جائے

حضرت صاحبزادہ شفیق ٹونکی

آنکھ بھر کر جو تجھے دیکھ لے حیراں ہو جائے
سر سے تا پا تک ہمہ تن آئینہ ساماں ہو جائے

کارگر میرا اگر ذوقِ فراواں ہو جائے
لاکھ پردوں میں بھی تو ہو تو نمایاں ہو جائے

حال اتنا تو محبت میں پریشاں ہو جائے
کہ مری موت مری زیست کا ساماں ہو جائے

اس غمِ عشق کو کس طرح چھپائے کوئی —
دل میں رہ کر بھی جو کمبخت نمایاں ہو جائے

آج جس موجِ حوادث کو سمجھتا ہے حقیر —
کیا خبر ہے یہی کل پھیل کے طوفاں ہو جائے

خلشِ عشق کی توہین ہے تسکیں طلبی
وہ بھی کیا درد جو شائستۂ درماں ہو جائے

چاہتا ہوں تری شرمیلی نظر سے کوئی
ایسا نشتر جو ہم آغوشِ رگِ جاں ہو جائے

جسے منظور ہو تعمیرِ سکوں، وہ وحشی
نکہتِ گل کی طرح چاک گریباں ہو جائے

جانِ دہقانِ چمن، میں نہ سہی اور سہی
کیوں مرے بعد نشیمن مرا ویراں ہو جائے

پھر وہ کیوں دامِ علائق میں گرفتار رہے
اپنی ہستی کا جس انسان کو عرفاں ہو جائے

اس کے نیرنگیٔ لطافت کو کوئی کیا سمجھے
جو کہیں پھول، کہیں خارِ بیاباں ہو جائے

اَن سنے گیت سن اس وقت سکوتِ شب میں
نغمہ گر جب مری مضرابِ رگِ جاں ہو جائے

جذبۂ عشق کی درپردہ کشش تو دیکھو
کوئی نالہ کرے اور کوئی پریشاں ہو جائے

اثرِ جذب کا وہ وقت، الٰہی توبہ!
عشق کے بھیس میں جب حسن نمایاں ہو جائے

شورشِ غم سے جو حالات نہ کروٹ بدلیں —
زندگی عیشِ مسلسل سے پریشاں ہو جائے

شمعِ خنداں نہ سہی کرمکِ سوزاں ہی سہی —
کوئی تو میرا شریکِ غمِ پنہاں ہو جائے

کاش وہ جوشِ نوا اب کے چمن میں ہو شفیق
ہر کلی پھول بنے پھول گلستاں ہو جائے

ہم جماعت

دلگداز کہانی

از جناب اختر گیلانی شاہجہانپوری

گاڑی جا چکی تھی میں دفتر کی جانب جا رہا تھا۔ ایک ٹکٹ کلکٹر کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ مسافروں سے ٹکٹ جمع کر کے دفتر میں ڈھیر کر دوں۔ اور پھر اس دن تو مجھے ان کا اندراج بھی کرنا تھا۔

بابو جی! کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ آواز آشنا معلوم ہوتی تھی لیکن کچھ اجنبیت لئے ہوئے۔ جیسے گزرے ہوئے دنوں کا کوئی بھولا بھٹکا گیت لہراتا ہوا نکل گیا ہو۔ میں نے مڑ کے دیکھا ایک قلی میری طرف آ رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لئے میں سوچنے لگا بھلا اس قلی کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ لیکن ممکن ہے سامنے گیٹ والے بابو نے بھیجا ہو۔ وہ اکثر قلیوں کے ہاتھ ٹکٹ میرے پاس بھیج دیتا تھا۔ میں نے اس قلی کو کبھی پلیٹ فارم پر نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ نیا نیا آیا تھا۔ میرے پاس آکر وہ ٹھہر گیا۔۔۔ ”بابو جی“ اس نے کہا۔ ”آپ نے مجھے پہچانا؟“ اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں جواب کا انتظار کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر کے لئے میں خاموش ہو گیا۔ جب میری نظریں گزرے ہوئے وقت کے کثیف پردوں کو چیر کر ماضی کے اس حرکت پر رکیں جس کی یاد اب بھی اکثر دماغ کے گوشوں میں سرسراتی رہتی ہے۔ اور جس وقت وہ منظر جب میں قصبہ کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ اب بھی لرزتا ہوا سامنے آتا ہے۔ تو ایک خوشگوار بے چینی کا احساس کروٹیں لینے لگتا ہے۔ میں نے امجد کو مسکراتا ہوا دیکھا۔ ”ہاں پہچان لیا“ میں نے کہا۔ اور بڑھ کر اسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ اور اسی وقت دو چڑیاں ساتھ ساتھ اڑتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزریں اور ٹین کی چھت سے ٹکراتی ہوئی پل کے آہنی ستون سے رگڑتی ہوئی پھر سے نکل گئیں۔ اور چند لمحوں میں وہ دور اونچے شیشم کی بلند ٹہنیوں کے اوپر اڑ رہی تھیں۔

امجد پرائمری اسکول میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ میں نے پوچھا ”امجد! تم یہاں کب سے ہو؟“

”کوئی دو سال ہوئے“ اس نے کہا —— ”اور آپ کو یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟“ اس کے چہرے پر مسرت کی جھلکی تھی موجیں ابھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

”مجھے تین مہینے ہوئے“ میں نے کہا ”لیکن میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔“

”ہاں میں گھر گیا تھا۔ ماں بیمار تھی“

”اب کیسی ہیں؟“

”چل بسیں!“ اور اس کی دھندلی آنکھوں میں آنسو کانپنے لگے۔ جیسے کسی چھوٹے سے گڑھے کے برساتی پانی میں ڈوبتے ہوئے سورج کی کوئی پتلی سی کرن پڑ رہی تھی، اور اس کا پھیکا سا عکس پانی کی خاموش سطح پر تھرتھرا رہا ہو۔ اور وہ جانے لگا۔ میں نے کہا ”جب وقت ملا کرے آجایا کرو“۔ اور وہ چلتے چلتے بولا ”ضرور آؤں گا“

شام کو سونے لیٹا تو تصورات کے سامنے پرانے دنوں کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ میں اور امجد قصبے کے پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔ بوڑھا ماسٹر ہم دونوں کو بہت چاہتا تھا اور اکثر وہ بھری کلاس میں کہہ دیتا۔ ”اگر پڑھتے ہیں تو امجد اور محسن۔ اور باقی تو سب گدھے ہیں گدھے“ اس لئے کہ ہم اور لڑکوں کی طرح کھیل کود میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ایک دن ”انٹرول“ (وقفہ) میں بہت لڑکوں نے اسکول کے پاس ایک بوسیدہ مکان میں کھڑی ہوئی بیری پر اینٹوں کی اتنی بارش کی کہ بیروں کے ساتھ ساتھ آدھا درخت بھی جھڑ گیا اور اندر سے مکاندار ایک موٹا سا ڈنڈا لئے چیختا ہوا نکل آیا۔ ماسٹر لڑکوں کو دیکھنے ہمارے درجہ کے سامنے سے ہو کر گزرا۔ ہم دونوں نقشہ بنا رہے تھے۔ اس نے سب کو دیکھ لیا اور ”انٹرول“ کے بعد ایک ایک کو خوب ٹھونکا اور پھر خاموش کھڑکی سے باہر دور درختوں کے اوپر ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ کوئی نیا طوفان آنے والا ہے۔ آخر تھوڑی دیر بعد میز پر بید کی ضرب لگاتے ہوئے چیخا ”تم سب گدھے ہو۔ انتہائی نالائ-

کیوں نہیں کہیں جاکر اینٹیں ڈھوتے ہو کہ ماں باپ کی گاڑھے پسینہ کی کمائی یوں تو برباد نہ ہو۔ امجد اور محسن کو دیکھو ......

اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اور امجد آسمان کی بلندیوں میں اُڑ رہے ہیں۔ جہاں رات کو نیلگوں سمندر کی وسعتوں میں ستاروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہچکولے کھاتی پھرتی ہیں۔ لڑکے ڈر کے مارے اپنی اپنی جگہوں پر سہمے بیٹھے تھے۔ اور سامنے کھلی ہوئی کتابوں پر اُن کی خوفزدہ نظریں پریشان پھر رہی تھیں۔ جیسے شام کا اندھیرا اُترنے کے بعد [illegible] کانپتی پھرے۔ اس کے بعد ہم اتنے دوست ہو گئے کہ لڑکے ہم پر آوازے کسنے لگے۔ ہم ان آوازوں کا جواب ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے دیتے اور ہماری نظریں ہم آغوش ہو جاتیں گویا کہہ رہے ہیں "بیوقوف ہیں جو اپنا بُرا بھلا نہیں سوچتے اور بڈھا ماسٹر جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہے"

ایک دن امجد مجھے اپنے گھر لے گیا۔ قصبہ میں دکھن کی جانب پُرانے تالاب کے کنارے ایک کچا مکان تھا۔ جس میں ایک طرف ایک کوٹھری تھی اور ایک چھوٹا سا شکستہ دالان۔ اور دوسری طرف پندرہ بیس امرودوں کے درخت تھے۔ گھر میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت چکی پیس رہی تھی۔ امجد نے پکارا "اماں!" آواز چکی کے پاٹ سے ٹکراتی ہوئی اس کے کانوں تک پہنچی۔ وہ اُچھل پڑی "آگیا پڑھ کر!" اور پائجامہ جھاڑ کر اُٹھتے ہوئے اُس نے پوچھا "بیٹا یہ کون ہے؟"

"میرا ہم جماعت!" امجد نے کہا اور وہ ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ کو ذرا باہر کی طرف ہوا میں گھسیٹتی ہوئی بولی "تم امجد کے ساتھ پڑھتے ہو۔ آؤ بیٹا! بیٹھو" میں ایک طرف بیٹھ گیا امجد بھی منہ ہاتھ دھو کر آ بیٹھا۔ وہ کھانا لے آئی "آؤ بیٹا! تم بھی آؤ! ہاتھ دھو لو!"

"مجھے بھوک نہیں ہے"

"کیوں بھوک کیوں نہیں۔ اسکول سے آرہے ہو نا؟"

"جی!" میں نے کہا۔

"پھر کیوں نہیں کھاتے؟" میں خاموش تھا اور وہ مسکرا کر بولی "شاید ماں خفا ہوگی۔ اچھا ہے اس عمر میں بغیر ماں باپ کی مرضی کے کسی جگہ کھانا ٹھیک نہیں۔ لیکن امجد تو تمہارا [illegible]!" میں

زمین پر رینگتی ہوئی چیونٹیوں کی قطار کو دیکھنے لگا۔ اور گھڑے سے پانی انڈیلتے ہوئے امجد کی ماں نے پوچھا۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

"محسن!"

"محسن؟"

"جی!"

"اور تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"تھانہ کے پُرانے منشی بدلنے پر ان کے والد آئے ہیں" امجد نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ بڑھیا میرے قریب آبیٹھی اور سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی "آیا کرو بیٹا!" اس روز سے میں اکثر امجد کے یہاں گیا۔ اس کی ماں مجھے بہت پیار کرتی تھی۔

پرائمری اسکول سے نکل کر ہم ساتھ ساتھ مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ لیکن اسی سال میرے والد کا تبادلہ ہو گیا۔ امجد کو میں اپنے بھائی کی طرح سمجھتا تھا اور اس سے جدا ہوتے ہوئے مجھے کافی صدمہ ہو رہا تھا۔

آخری بار میں اس کے گھر گیا تو مجھے اپنی روح میں ایک کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی۔ امجد کی ماں باہر آرہی تھی۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور آنکھوں کے قریب پڑی ہوئی لاتعداد شکنوں میں گرد کی لکیریں صاف نظر آرہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولی "آؤ بیٹا! آؤ! امجد باہر گیا ہے آتا ہی ہوگا" میں چارپائی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور وہ باہر بکریاں باندھنے چلی گئی۔ مجھے اس چھوٹی سی جھونپڑی سے محبت ہو گئی تھی۔ میں ان امرودوں کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے ساتھ اپنے سکون سے بھی بچھڑ رہا تھا۔ جیسے ان کی صندلیں باہوں میں سکون کے لئے ایک مقناطیسی کشش ہے۔ اور میرے روحانی اضطراب نے حقیقت پر پڑے ہوئے تمام پردوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پھاڑ ڈالا۔ میں نے زندگی کو قسمت کی ابھرتی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلتے دیکھا۔ قسمت کی پگڈنڈیاں جو کبھی تو متوازی چلتی ہیں اور کبھی دور ہوتے ہوتے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جاتی ہیں۔ اور یہی نہیں کبھی کبھی بہت دور سے آکر ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں۔ اور بعض تو راستہ ہی میں ختم ہو جاتی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ اس کی پگڈنڈی اسے کہاں لے جائے۔ اور ختم ہونے سے پہلے کس پگڈنڈی سے قطع ہو اور کس پگڈنڈی سے دور ہٹ جائے۔ اور جب امجد کی ماں

سر سے واپس آئی میں نے بتا دیا "آج میں آخری بار آپ سے ملنے آیا ہوں"

"آخری بار کیوں؟" وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی اور اتنے میں امجد بھی دروازہ سے داخل ہوا۔

"میرے باپ کا تبادلہ ہو گیا ہم لوگ کل چلے جائیں گے"

امجد دوڑ کر ہمارے پاس آیا "کون جا رہا ہے؟" اس نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

"محسن کے باپ کا تبادلہ ہو گیا" اس کی ماں نے کہا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ہم تینوں سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ پاس کے گنجان نیم سے چڑیوں کا ایک جھنڈ چیختا ہوا نکلا۔ تالاب کے اس پار کسی نے فیر کیا تھا اور پریشان چڑیاں چیں چیں کرتی ہوئی اندھیرے میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ آنسوؤں کو میلی چادر میں جذب ہوتی بڑھیا بولی "کل جاؤ گے ۔ کس وقت؟"

"شام کی لاری سے"

"اچھا! خدا تمہیں خوش رکھے بیٹا! تم سے محبت ہو گئی تھی اب تم جا رہے ہو اس لئے کچھ تکلیف ہوتی ہے"

اور امجد اپنے خشک ہونٹوں کو بہت دیر تک تر کرتا رہا۔

دوسرے دن امجد صبح ہی سے میرے یہاں آ گیا اور میرے ساتھ تمام دن سرگرداں رہا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی زندگی میں ایک زیردست خلا پیدا ہو رہا ہے۔ شام کو جب سب کچھ تیار ہو گیا اور میں لاری میں بیٹھ گیا تو رخصت کرتے وقت اس نے کہا "بھول نہ جانا کہیں!" اور میرے والد نے جب اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک گئیں اور اس کے چہرے پر باطنی کرب کے نقوش ابھر آئے۔ میں نے کہا "امجد! تم ایسے لوگ دنیا میں روز روز نہیں ملتے اور انہیں بھولنا ان پر نہیں اپنے اوپر ظلم کرنا ہے" اور لاری چل دی۔ میں بھی اپنے اضطراب کو نہ دبا سکا۔ راستے میں گزرتے ہوئے درخت مجھے کانپتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور تمام کائنات پر اداسی کی موجیں لہراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

تیس چار روز بعد امجد میرے پاس آیا۔ اس وقت کوئی ٹرین نہ جا رہی تھی اور ایک بار میں نے پھر محسوس کیا کہ میں اور امجد امر دو دوں کو

چھدرے[1] سایوں میں کھیل رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے پوچھا "امجد تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟" ان الفاظ سے گویا اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا "مفلسی نے نہ پڑھنے دیا" اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دھیمی آواز میں کہنے لگا "میں نے کوشش تو بہت کی لیکن علم شاید میری تقدیر میں نہیں تھا" ایسا معلوم ہوا جیسے کنارے سے بہت دور کسی ڈوبتے ہوئے کی چیخیں فضا میں لہرا رہی ہوں۔ اس کی آنکھیں کچھ دھندلا سی گئیں اور چہرہ ایک دم مرجھا گیا اور مجھے بہت دیر تک ہر طرف افسردگی سی تیرتی ہوئی معلوم ہوتی رہی۔ آخر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "امجد! تم یہاں کہاں رہتے ہو؟"

"قندھاری بازار میں!"

"اکیلے رہتے ہو؟"

"نہیں! بیوی ہے دو چھوٹے بچے اور ایک بیوہ بہن"

میں سوچنے لگا کہ اس ملک میں معلوم نہیں کتنے لوگ ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ زندگی کیا ہے۔ ان کو تو صبح سے شام تک کام ہے اور کسی صورت سے اپنے متعلقین کا پیٹ بھرنا ہے۔ زندگی میں کتنے لمحے ایسے آتے ہیں جو ان کے لئے مسرت بہ آغوش ہوں شاید بچوں کی معصوم و حسین حرکتیں ان کے دل کے زنگ آلود تاروں کو کبھی کبھی بیدار کر دیتی ہیں۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہروں پر مسکراہٹ کی باریک باریک لہریں ابھرنے لگتی ہیں۔ لیکن جب ان کے سامنے دبلے پتلے جسم پھٹے پرانے کپڑوں میں سامنے آتے ہیں اور ان کے کان پاک روحوں کی دردناک کراہیں سنتے ہیں تو اس پھیکی سی عارضی مسکراہٹ میں غم کے نقوش نمایاں ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات تو یہی بچوں کے کھیل جو انہیں کچھ لمحوں کے لئے ان کی "زندگی" سے ناآشنا کر دیتے ہیں۔ ان کی سلگتی ہوئی روح پر تیل کا کام کرتے ہیں۔ دبا ہوا شعلہ ملتہب ہو جاتا ہے۔ وہ جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ پریشان ہو جاتے ہیں۔ بچوں کی طفلانہ شرارت کو غلیظت سے تعبیر کرتے ہیں صبح سے شام ہوتی ہے۔ دن پر دن گزرتے جاتے ہیں اور وہ تمام عمر مسرت کے مفہوم سے ناآشنا رہتے ہیں۔

---

[1] چھدرے یوپی کے اضلاع میں کم گھنے کو کہتے ہیں۔

ایک دن کہنے لگا "میں جب چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا میرے باپ کی نوکری چھوٹ گئی"

"کیسے؟" میں نے پوچھا

"شاید تمہیں یاد نہ ہوگا کہ ابا چونگی میں ملازم تھے"

"ہاں"

"پرانا سپرنٹنڈنٹ تو نیک آدمی تھا لیکن جب اس کی جگہ دوسرا آیا تو اس نے کہا کہ روز صبح ہمارے بنگلہ پر آیا کرو۔ وہ بلا ناغہ جاتے تھے۔ ایک دن ان کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ اس نے بہت برا بھلا کہا۔ انہوں نے اتنا کہہ دیا کہ ملازمت کی ہے عزت تو بیچی نہیں۔ اس پر وہ تلملا گیا سپرنٹنڈنٹ کو ایک چپراسی نے جواب کیسے دیا۔ خواہ وہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو چیخ کر بولا "تو بڑی عزت والا ہے تو نوکری کرنے کیوں آیا؟" یہ سنکر خون کھول اٹھا۔ لیکن ضبط کرتے ہوئے انھوں نے جواب دیا۔ "عزت تو ہر ایک کی ہے" اس کی آمریت کو صدمہ پہنچا اور اس نے بڑھ کر ایک تھپڑ مارا۔ اب ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ اٹھا کر اسے دے مارا اور خوب ٹھونکا اور تو کچھ نہ ہوا لیکن نوکری جاتی رہی اور اسی دن سے میری پڑھائی ختم ہوگئی۔ ابا کو پھر کوئی نوکری نہ مل سکی۔ امرودوں کے نیچے ایک چھوٹے سے کھٹولے پر لیٹے لیٹے حقہ پیتے ہیں سارا سارا دن گزار دیتے گھنٹوں درختوں کے اس پار افق پر کسی مرکز کو ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے۔ بیٹھے بیٹھے بڑبڑانے لگتے "آخر یہ موٹروں میں اڑنے والے کیوں نہیں تباہ ہوتے کیا ہم تباہ ہونے کے لئے ہیں جنھیں ایک وقت روٹی آرام سے نہیں ملتی" گلی میں گزرنے والے کہتے کہ بڈھا پاگل ہوگیا ہے۔ باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ کہتے "دنیا پیسے کی ہے" اور بعض دن جو جھلا سوار ہوتی صبح ہی سے رٹ لگاتے "آخر ہمیں کیوں اتنا غریب بنایا اور پھر نوکری بھی چھین لی"

اماں کہتیں "ہر حال میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے یہ ایک امتحان ہے"

ایک دم چیخ پڑتے "آخر یہ امتحان کبھی ختم بھی ہوگا"

اور ایک دن شام کو جب میں مزدوری سے لوٹا اماں رو رہی تھیں۔ ان کا امتحان ختم ہو چکا تھا"

"تم مزدوری کرنے لگے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا کرتا؟" وہ کہنے لگا "باپ کی یہ حالت تھی گزر اوقات کی تو کوئی اور صورت تھی نہیں ایک مکان تھا پرانے نیم کے پاس کھنڈر سا۔ اس کا کرایہ تین روپیہ آتا تھا۔ اس میں کرایہ دار اس کی مرمت بھی ایک عرصہ سے نہ ہوئی تھی۔ برسات میں چھت ٹپکنے لگی تھی اور دیواریں کمزور ہوگئی تھیں کرایہ دار روز دھمکاتا "مکان خالی کر دیں گے"

ہم لوگ خاموشی سے سنتے رہتے اماں اس کی خوشامد کو سمجھا دیتیں "تھوڑا صبر کرو پیسہ ہاتھ میں نہیں ہے بہت جلد مرمت کرا دیں گے" لیکن اس کی مرمت نہ ہوئی اور ابا کی تجہیز و تکفین میں جو قرض لینا پڑا۔ اس کی ادائیگی میں وہ مکان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اپنے میں طوفان میل آ گیا۔ ور [illegible] گیا

اسی دن شام کو میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ ایک بدشکل سا دبلا پتلا لڑکا میلے کپڑے پہنے ہوئے سامنے کے گھر کے دروازہ پر آکر رکا کبھی ایک دو قدم آگے بڑھ جاتا کبھی معلوم نہیں کیا سوچتا، چہرے پر ایک تاریک سی بدلی سایہ ڈالتی اور پیچھے ہٹ جاتا سہما ہوا پریشان کئی منٹ تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ آخر ہمت کر کے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک کرانڈیل سیاہ رنگ کا آدمی باہر آیا، آتے ہی دھاڑا "کیا ہے؟"

اور لڑکا چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سہمتے ہوئے اس نے جواب دیا "ابا بیمار ہیں، اماں نے کہا ہے میں آپ کو اطلاع کر دوں"

"میں کیا کروں؟" اور دروازہ بند کرنے لگا۔

لڑکے نے بڑھ کر دامن پکڑ لیا "چچا! ان کی بہت بری حالت ہے اور ہمارے پاس دوا کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے"

"چل دور ہو یہاں سے!" اور کھڑاک سے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ لڑکے کی مایوس نگاہیں بہت دیر تک فضا میں محبت اور ہمدردی کے بکھرے ہوئے اجزا جمع کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہیں اور پھر ایک تاریک سایہ گلی کے موڑ پر آوارہ پھر رہا تھا میری روح پر بہت دیر تک اداسی کی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی اور صبح جب میں اٹھا اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے رات بھر آنسو بہائے ہوں۔ ملک سے شام کو وعدہ ہوا تھا کہ کل سیر کریں گے۔ صبح ہی صبح وہ آ دھمکا۔ بولا "کیا روزی صورت بنائے پھرتے ہو" جی میں آیا کہہ دوں "آج میں نہیں جا سکوں گا"

پھر خیال آیا وہ بھی کیا سمجھے گا خود ہی تو کہا کہ سیر کو چلیں گے۔ اور خود ہی کہتا ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ کتنا احمق، کتنا بد اخلاق ہے اور پھر میں گھر میں ہی کر دل بھی کیا۔ اِدھر اُدھر کے خیالات تاریک سایوں کو جمع کر کے سامنے لا کھڑا کریں گے اور روح غم سے لپٹ کر ایسے خواب معلوم نہیں کب تک دیکھتی رہے گی۔ ڈراؤنے خواب۔ جو ہماری زندگی کے ہر لمحے میں تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی روح کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں میں نے کہدیا "چلوں گا"۔

ہم دونوں نے خوب سیر کی اور سکندر باغ پہنچتے پہنچتے ہمارے قہقہے فضا میں بکھر رہے تھے۔ مٹی کے ایک اونچے ڈھیر پر ایک ویران سی عمارت تھی۔ امرود دوں کے درخت کے نیچے ایک چوکیدار بیٹھا ہوا روٹی پکا رہا تھا۔ روٹی کو سینکتے ہوئے بولا "بابو! اِدھر نہ جائیو لنگور رہت ہے"

"ڈر رہا ہے؟" ملک بولا "چلو ضرور چلیں گے؟"

"مجور اکنکھنا ہے پھر سکایت نہ کریو" وہ چیختا ہی رہ گیا اور ہم لوگ اوپر چڑھ گئے۔ عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی ایک لنگور بہت زور سے ہم پر جھپٹا اور ہم بھاگے باہر نکل کر مجھے ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور ملک کہاں ہے۔ ایک پگ پھسلا تو نیچے ایک کھڈ میں آ رہا۔ جب تک ملک آیا میں اسی میں پڑا رہا۔

صبح ہی کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی میں نے پوچھا کون ہے؟

آواز آئی "امجد!" میں نے اندر بلا لیا۔ گھبرایا ہوا سا تھا۔ بولا "کیسی طبیعت ہے؟"

میں نے کہا "زیادہ چوٹ نہیں لگی، بائیں بازو میں کچھ خراش لگی ہے۔ ہاں سر میں درد ہے"

کہنے لگا "لیکن ملک بابو کہتے تھے کہ کمر اور ٹانگوں میں کافی چوٹ آئی ہے"

وہ میرے پاس آ بیٹھا اور اپنے گاڑھے کی سرخ قمیص کی نچلی جیب سے ایک شیشی نکال کر کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ کمر اور ٹانگوں پر آپ اس کی مالش کریں" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ان میلے کچیلے کپڑوں اور بھدے جسم کے اندر کتنی پاکیزہ تھی امجد کی روح۔ میں اس سے آنکھیں نہ ملا سکا۔ اس کے چہرے پر فرشتوں کا تقدس جھلک رہا تھا اور آنکھوں میں ملکوتی روشنی کی چمک تھی۔ وہ میری مالش کر رہا تھا۔

وہ صبح شام دونوں وقت میرے پاس آتا۔ میں اس سے کہتا "امجد! تم میری وجہ سے بہت زحمت اٹھاتے ہو" اس کے چہرے پر ایک غمگینی سی چھا جاتی، جیسے کوئی بچہ گھنٹوں کی محنت کے بعد ایک مٹی کا گھروندا تیار کرے اور کوئی آ کر اسے بگاڑ دے اور ڈانٹ کر کہے۔

"تم نے کتنی خاک اپنے چہرے پر مل لی ہے مٹی میں مت کھیلا کرو"

کہتا "نہیں! بابو جی!— میں تو کوئی خدمت نہیں کر سکتا ہوں"

ایک دن میں نے کہا "امجد! تم مجھے اب بھی ویسا ہی سمجھتے ہو" میں نے اس کے چہرے پر محبت کی لہریں بکھرتی ہوئی دیکھیں وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

تین چار مہینے بعد کا ذکر ہے۔ میں شام کو ٹہلنے جا رہا تھا۔ راستے میں مجھے چودھری مل گیا۔

بولا "میں تو تمہارے پاس آ رہا تھا شکر ہے کہ تم مل گئے"

"کیوں خیریت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آج ارادہ ہے کہ پکچر دیکھیں"

"تو پھر؟"

"ساتھی ضروری تھا اور وہ مل گیا" میں نے بہت حیلے تراشے مگر وہ ایک نہ مانا۔

ہم دونوں سینما کی طرف چل دیئے۔ چوراہے سے کینٹ روڈ کی طرف پہلی گلی میں شور ہو رہا تھا۔ بہت سے آدمی ایک طرف کو جھکے ہوئے تھے۔ میں واقعہ کی نوعیت سمجھنے کے لئے بے چین تھا۔ مجمع میں سے ایک شخص چیخ رہا تھا "آخر روپیہ کب دو گے؟— لیتے وقت تو کتنی خوشامد کر رہے تھے، جب مانگا کہہ دیا ابھی نہیں دو چار روز میں دوں گا— آخر یہ دو چار روز کبھی ختم بھی ہوں گے"

اور ایک ہلکی سی آواز آئی "میری بہن بیمار ہو گئی تھی"

"تو میں کیا کروں؟"

"میں پرسوں ضرور دے دونگا" اور مجمع میں سے لوگوں نے کہا "ہاں لالہ جی! آج جانے دیجئے۔ پرسوں اگر نہ دے

تو جو چاہے سزا دیجئے گا"

لالہ جی بولے "اجی اس بے ایمان کا پرسوں تو یہ سعد نہیں ہوگا"

"میں بے ایمان ہوں" اس نے چیخ کر کہا۔

مجھے امجد کی آواز معلوم ہوئی "بے ایمان نہیں تو کیا۔ تو بے ایمان تیرا......"

اور ایک تڑاخ سی آواز آئی۔ مجمع میں ایک تازہ شور کا اضافہ ہوگیا۔ میں مجمع کو چیرتا ہوا اندر پہنچا۔ ایک شخص امجد کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے جب روپیہ لیا تو دیتا کیوں نہیں" امجد نے میری طرف دیکھا تو نظریں نیچی کر لیں میرے دل میں آیا کہ اس شخص کے ایک تھپڑ کھینچ کے ماردوں اور کہوں۔ "تو اپنے پیسے لے گا یا کسی کی جان ۔ تجھے مارنے کا کیا حق ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی نہیں اور گھر لے جاکر اس کے سب دام دے دُوں۔ اور اگر خرخش کرے تو پولیس کے حوالے کر دُوں۔ پاس کے تھانہ کا انچارج تو میرا پُرانا دوست ہے"

پیچھے سے چودھری نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

"چلو کہاں پھنس گئے۔ دیر ہو رہی ہے"

ایک دھکا سا لگا اور میرے تمام خیالات کا قلعہ ایک لمحہ کے اندر مسمار ہو گیا۔

میں چل دیا ـــــ لیکن ایسا معلوم ہوا کہ دو پُر نفرت نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں اور سینما سے واپس ہوتے وقت مجھے اس گناہ کا احساس بہت بُری طرح بے چین کئے ہوئے تھا ٭

ایک تاریخی یاد

از جناب صہبا شیروانی بی اے (علیگ)

دریائے سندھ

دیکھ کر تجھ کو وہی اگلا سماں یاد آگیا
"قاسمی" افواج کا سیلِ رواں یاد آگیا

گونجتی ہیں اِن فضاؤں میں وہ تکبیریں ابھی
چومتی ہیں حریت کے گال شمشیریں ابھی

ہے زمیں کانپی ہوئی سہما ہوا ہے آسماں
نعرۂ مستانِ حق کی تاب دنیا کو کہاں

آئے تھے پیغامِ بیداری سنانے کے لئے
ہندیوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے

اُن کی آمد سے نئی تہذیب کا چرچا ہُوا
خارزارِ ہند رشکِ جنّت الماویٰ ہُوا

ہند کے اُجڑے چمن میں آگئی تازہ بہار
کلفتیں جاتی رہیں بدلے گئے لیل و نہار

کشتیٔ نوح

مرے دردِ دل میں کمی ہو رہی ہے

از:۔ حضرت نوح ناروی

ہمیں سے جُدا روح کیا ہو رہی ہے
تہِ قبر خلقت پڑی سو رہی ہے

مری چشمِ تر خونِ دل رو رہی ہے
کہاں کی کمائی کہاں کھو رہی ہے

شبِ ہجر تکلیف وہ ہو رہی ہے
کہ شبنم مرے حال پر رو رہی ہے

یہ ممکن نہیں دل سے حسرت جدا ہو
رہے گی ہمیشہ وہی جو رہی ہے

دَہل جاؤ گے جس سے تم وہ قیامت
مری آہ کی گود میں سو رہی ہے

مصیبت کی دنیا مسرت کا عالم
اِدھر ہنس رہا ہے اُدھر رو رہی ہے

ستم کرنے والے کرم کر رہے ہیں
محبت کی دنیا نئی ہو رہی ہے

اگر آپ ٹھکرائیں تو جاگ اُٹھے
مری قبر میں زندگی سو رہی ہے

محبت میں کیا تذکرہ آبرو کا
گئی تو گئی یہ رہی تو رہی ہے

تڑپ کر دوبارہ وہ تڑپائیں مجھکو
مرے دردِ دل میں کمی ہو رہی ہے

پسِ مرگ پرساں نہیں اور کوئی
فقط بیکسی قبر پر رو رہی ہے

تری تیغ کا رنگ نکھرے نہ کیونکر
مرے خون سے ہاتھ مُنہ دھو رہی ہے

شبِ ہجر آتی نہیں نیند مجھکو
خدا جانے وہ بھی کہاں سو رہی ہے

برسنے میں کیا میرے ارمان نکلیں
کہ بارش ترے ظلم کی ہو رہی ہے

نکلنا ہوا دل سے دشوار اس کا
مری جان کو آرزو رو رہی ہے

ابھی ناوکِ غم کو کیونکر بھلا دوں
کھٹک مٹ گئی ہے ٹپک ہو رہی ہے

مری سیلِ اشک محبت کو دیکھو
سیاہی شبِ ہجر کی دھو رہی ہے

شبِ غم میں عالم کو بیدار پایا
مگر وہ ہے تقدیر جو سو رہی ہے

بھروسہ تھا جس کشتیٔ دل کا ہم کو
وہ اے نوح غرقابِ غم ہو رہی ہے

آرٹ طالسطائے کی نظر میں!

حسن و جمال

از جناب محمود بریلوی

ریتان اعظم اپنی تصنیف مارک آوریلی میں عورتوں کے بناؤ سنگھار کی خیالی و آرائش کے کام کو "آرٹ" کے نام سے پکارتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جو لوگ عورت کے لباس اور آرائش میں عمدہ ترین آرٹ کا وجود نہیں پاتے وہ نہایت تنگ نظر اور بھدے مذاق والے ہیں۔ اسی طرح فاضل پروفیسر کرالک کی جمالیاتی تصانیف اور گیاؤ کی تصانیف میں لباس، ذائقہ اور لمس کے آرٹ شامل ہیں۔ کرالک پانچوں حواس ذائقہ، شامہ، لامسہ، باصرہ، اور سامعہ کو پانچ جمالیاتی آرٹ کا حامل بتاتا ہے۔ فرانسیسی مصنف گیاؤ کی، جس کی موجودہ زمانے کے بعض مصنف بڑی عزت کرتے ہیں، رائے میں حواس لامسہ، ذائقہ و شامہ جمالیاتی اثرات کے حامل ہیں۔

بوم گارٹین نے ۱۷۵۰ء میں فلسفۂ جمالیات کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت سے آج تک اس سوال کا کہ "حسن کیا ہے؟" جواب نہ دیا جاسکا۔ اور یہ مسئلہ ہنوز لاینحل ہے۔ جمالیات پر ہر نئی تصنیف میں اس سوال کا جواب بالکل نئے غیر تشفی بخش انداز سے دیا جاتا رہا ہے۔ بڑے بڑے مفکر اس کا کوئی شافی و مسکت جواب نہ دے سکے۔ ڈھائی سو سال سے لفظ حسن کے معنی ایک عقدۂ لاینحل بنے ہوئے ہیں۔ جرمن فیلسوف اور مفکرین نے سیکڑوں طریقوں سے اپنے انداز پر اس سوال کا جواب دیا ہے۔ انگریز مفکرین ہربرٹ اسپنسر، گرانٹ ایلن اور ان کے مقلدین نے اس سوال کا جواب اپنے رنگ میں دیا ہے۔ فرانسیسی فلاسفروں گیاؤ اور تینس اور ان کے متبعین نے اپنے انداز سے جواب دیا ہے۔ متذکرہ بالا تمام مفکرین اس مسئلہ کے اس حل سے کماحقہ واقف ہیں جو ان کے حسب ذیل پیشرو مفکرین دے چکے ہیں یعنی بوم گارٹین، کانٹ، شیلنگ، شلر، فشٹے، ونکلمن، لیسنگ، ہیگل، شوپنہار، ہارٹمن، شیسلر، کوزن، لیویک وغیرہ وغیرہ۔ قدما یعنی سقراط، افلاطون، ارسطو اور دیگر مفکرین نے کبھی حسن کو نیک چلنی سے علیحدہ نہیں سمجھا، مگر عہد جدید کے مفکرین جمالیات اپنے نظریئے کی بنا پر حسن اور نیک چلنی کو دو جداگانہ زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

فلسفۂ جمالیات کا بانی بوم گارٹین ۱۷۱۴ء میں تولد اور ۱۷۶۲ء میں فوت ہوا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "منطقی ذوق صداقت کا خواہاں ہے اور جمالیاتی یعنی شہوانی ذوق حسن کا۔ حسن کا اثر حواس پر ہوتا ہے اور صداقت کا اثر معقولیت پر۔ اور نیک چلنی دراصل تکمیل انسانیت و اخلاق ہے۔ بوم گارٹین کے خیال میں حسن کا بہترین مظاہرہ فطرت کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی رائے میں آرٹ کا بلند سے بلند مقصد و معیار فطرت کی نقل کرنا ہے۔ مگر جدید مفکرین جمالیات نے اس نظریہ کی تردید کی ہے۔ بوم گارٹین کے متبعین میئر، ایشین برگ اور ایبرہارٹ نے اپنے گرو کی تعلیمات و عقاید میں صرف اتنا اضافہ کیا کہ جمالیات کے ماتحت خوشگوار اور حسین کی اصطلاحوں کو واضح اور ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ بوم گارٹین کے فوراً بعد سلزر، مندلیسون اور مارٹز نامی مصنفین و مفکرین میدان میں آئے جنھوں نے نظریۂ جمالیات کو بالکل مختلف طریقہ سے پیش کیا۔ انھوں نے بوم گارٹین کے عقیدے کے خلاف آرٹ کا مقصد و معیار حسن و نقل فطرت نہیں بلکہ محض پاکدامنی بتایا۔ سلزر (سنہ ۱۷۷۰-۱۸۲۰ء) کہتا ہے کہ "محض اسی شے کو حسین و جمیل سمجھنا چاہیئے جو اچھوتی، پاک اور بے لوث ہو۔" حسن کے متعلق مندلیسون (سنہ ۱۷۲۹-۸۶ء) کا بھی کچھ یہی خیال ہے۔ اس کی رائے میں آرٹ حسن کے ارتقا کا نام ہے یعنی جب وہ صداقت و عصمت کا گہوارہ بن جائے۔ اور آرٹ کا مقصد اخلاق کی تکمیل ہے۔ اس اسکول کے جمالیاتیوں کی رائے میں ایک حسین جسم میں ایک حسین روح کا قیام ضروری ہے۔ ورنہ وہ حسن آرٹ کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا۔ اس طرح یہ طبقہ بوم گارٹین کے اس عقیدے اور نظریئے کے بالکل خلاف ہے کہ نقل

آرٹ تین چیزوں کا طالب ہے۔ صداقت، عفت اور حُسن۔ وہ حسن کو پاکیزگی اور صداقت میں جذب و مدغم کرنا چاہتا ہے۔

لیکن بعد کے مفکرین جمالیات اس نظریئے سے اختلاف رکھتے ہیں اور روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸ء) کا جمالیاتی نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ پاکبازی کو آرٹ سے متعلق نہیں کرتا اور محض ظاہری حسن کو آرٹ کا مطمح نظر قرار دیتا ہے۔ اس مفکر کے خیال میں آرٹ کا مقصد محض حسن ہے۔ وہ حسن جو ضروری نہیں کہ ما کہ بھی ہو۔ اس کی رائے میں حسن کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ سمعوں کی خوبصورتی، ۲۔ تخیل کی خوبصورتی اور ۳۔ بیان، اظہار و پیشکش کی خوبصورتی۔

موخرالذکر تیسری شرط اسی وقت پوری ہوتی ہے جب ہر دو اوّل الذکر شکلیں موجود ہوں۔ تیسری شرط آرٹ کا انتہائی اور بلند ترین مقصد قرار دی ہے جو صرف عہد عتیق کے آرٹ میں پائی جاتی تھی اور جس کی جدید آرٹ محض نقالی ہے۔

لیسنگ، ہرڈر اور بعد ازاں گوئٹے نے بلکہ جرمنی کے تمام ممتاز مفکرین جمالیات نے آرٹ کو اسی طرح سمجھا۔ حتی کہ کانٹ نے آرٹ کے نظریہ کو پھر بدل کے رکھ دیا۔

اس زمانہ میں انگلستان، فرانس، اٹلی اور ہالینڈ میں مقامی جمالیاتی نظریئے قائم ہوئے مگر وہ المانیہ (جرمنی) سے بھی زیادہ مبہم و متضاد تھے۔ جرمن ماہرین جمالیات کی طرح ان ممالک کے مصنفین نے بھی اپنے نظریوں کو حسن کے عقیدے پر قائم کیا۔ انھوں نے حسن کو پاکیزگی کے ساتھ یا تو شامل سمجھا یا دونوں کا منبع ایک ہی مقام قرار دیا۔

انگلستان میں بوم گارٹین کے ہمعصر یا اس سے کسی قدر قبل شیفٹس بری۔ ہچی سن۔ ہیوم۔ برکے۔ ہوگارتھ اور دیگر مفکرین جمالیات نے آرٹ پر اپنی تصانیف مرتب کیں۔ شیفٹس بری (۱۶۷۱-۱۷۱۳ء) کہتا ہے کہ۔

"خدا حسن و جمال کی اساس ہے۔ حسن و طہارت اسی سرچشمہ سے نکلے ہیں۔" ہچی سن (۱۶۹۴-۱۷۴۷ء) کا بیان ہے کہ "آرٹ کا مقصد حسن ہے۔" اس مفکر کی رائے میں حسن و طہارت لازم و ملزوم نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں جداگانہ اور بعض اوقات متضاد خصوصیات ہیں۔ لارڈ کیمس ہوم (۱۶۹۶-۱۷۸۲ء) کے خیال میں حسن وہ ہے جو دلپذیر ہو۔ برکے (۱۷۲۹-۹۷ء) کے نقطۂ نظر سے حسن و رفعت جو آرٹ کا مقصد ہیں ذاتی بقا اور سوسائٹی کے محرکات کے باعث وجود میں آئے۔ ذاتی بقا، اپنے جسم کو تر و تازگی، دفاع اور جنگ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور سوسائٹی مراسم و تبلیغ چاہتی ہے۔ چنانچہ ذاتی مدافعت و جنگ عرفان کا ذریعہ ہیں اور میل جول اور جنسی ترغیب حسن کی محرک ہوتی ہیں۔"

اٹھارویں صدی عیسوی میں آرٹ اور جمالیات کی تعریفیں انگریز مصنفین و مفکرین نے ایسی بیان کی ہیں جیسی کہ اوپر بیان ہوئیں۔ اسی زمانے میں فرانسیسی مصنفین و مفکرین جمالیات پیرے اندرے۔ بیتو۔ دودیرات۔ دی امبرٹ اور والٹیر تھے۔ پیرے اندرے ۱۷۴۱ء میں لکھتا ہے کہ حسن کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) وہ حسن جس میں الوہیت کے مظاہر نظر آئیں (۲) حسن حقیقی جو فطرت کی خوش مذاقی کو ہویدا کرے اور (۳) حسن مصنوعی۔

بیتو (۱۷۱۳-۱۷۸۰ء) کہتا ہے کہ "آرٹ فطرت کے حسن کی نقالی کا نام ہے اور اس کا مقصد تفریح ہے۔" دودیرات بھی آرٹ کی تعریف اسی طرح بیان کرتا ہے۔ انگریزی مصنفین کی طرح فرانسیسی مصنفین بیان کرتے ہیں کہ "حسن و جمال کا اعتراف محض اپنے اپنے ذوق پر منحصر ہے اور ذوق نظر کے لئے نہ تو کوئی ایسا قانون آج تک مرتب ہوا جو اس کا ایک عالمگیر معیار مقرر کرتا اور نہ ایسا ہونا کبھی ممکن ہے۔"

دی امبرٹ اور والٹیر کا بھی یہی خیال ہے۔

اس عہد کا اطالوی ماہر جمالیات پگانو کہتا ہے کہ "آرٹ فطرت کے جمال منتشر کو یکجا کرنے کا نام ہے اور ہمارا ذوق اس جمال کی پرکھ کرتا ہے۔ حسن و پاکیزگی ایک جان دو قالب چیزیں ہیں یعنی حسن ظاہری پاکیزگی کا نام ہے اور پاکیزگی اندرونی حسن کا۔"

دیگر اطالوی مفکرین مثلاً موراتوری (۱۶۷۲-۱۷۵۰ء) بالخصوص اسپالیتی جس نے ۱۷۶۵ء میں آرٹ پر ایک عمدہ تصنیف مرتب کی تھی کی رائے میں بقول برکے "آرٹ ایک ایسی ہیجان خیز اور خود سرانہ تحریک ہے جس کی بنیاد ذاتی بقا اور سوسائٹی کی خواہش پر قائم ہے۔"

ڈچ مصنفین ہیمس ترہوئس (۱۷۲۰-۱۷۹۰ء) جس کا جرمن ماہرین جمالیات خصوصاً گوئٹے پر کافی اثر تھا ممتاز ہستی شمار ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "حسن بہت انبساط بخشتا ہے اور وہ شے ہیں زیادہ انبساط بخشتی ہے جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے

زیادہ سرور آور ہو۔ حسن سے لطف اندوز ہونا کیونکہ وہ کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ لذت بخشتا ہے۔ تحصیل انبساط کی معراج ہے۔ جہاں تک انسان کی اب تک رسائی ہو سکی ہے۔"

اٹھارہویں صدی میں جرمنی سے باہر جمالیاتی نظریات ایسے تھے جیسے اوپر بیان ہوئے۔ جرمنی میں ونکل من کے بعد کانٹ (۱۷۲۴-۱۸۰۴ء) نے ایک بالکل نیا جمالیاتی نظریہ پیش کیا۔ جس نے حسن کے اور نتیجتہً آرٹ کے عقیدے کو سب سے زیادہ معین و واضح کر دیا ــ اس مسئلہ کی توضیح میں کانٹ کا فیصلہ نہایت مدلل و کامیاب ہے۔ کانٹ کی جمالیاتی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ "انسان کو اپنی ذات سے باہر دنیائے فطرت کا علم ہے۔ اور فطرت کی دنیا میں خود اسے کتنا دخل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اپنی ذات سے باہر دنیائے فطرت میں وہ خلوص و صداقت کا جویا ہے اور اپنے اندر وہ پاکیزگی کا متلاشی ہے۔ حسن عام طور پر حتمی طور پر بغیر کسی دلیل یا حجت اور ذاتی منفعت کے خوش آئند و دلفریب ہے۔ حسن ہمیں کوئی فائدہ پہنچائے بغیر بلکہ احساس مفاد کے بغیر ہمارے لئے اہم اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔"

کانٹ کے متبعین نے بھی حسن کی اسی طرح تعریف کی ہے ان میں شلر (۱۷۵۹-۱۸۰۵ء) جس نے موضوع جمالیات پر کافی خامہ فرسائی کی ہے لکھتا ہے کہ "آرٹ کا مقصد حسن ہے۔ اور حسن کا سرچشمہ مسرت و شادکامی ہے۔ ایسی مسرت و شادکامی جس سے کوئی عملی مادی منفعت حاصل ہو یا نہ ہو۔"

جمالیات کے مسئلہ میں شلر کے علاوہ کانٹ کے پیرووں میں سب سے زیادہ ممتاز فلسفی ولیم ہمبولٹ تھا جس نے ہرچند حسن کی تعریف میں چندے اضافہ نہ کیا لیکن اس کی مختلف شکلوں کو بیان کیا اور ڈرامہ، موسیقی و ظرافت کے آرٹ کے ساتھ تعلق کو واضح کیا۔

کانٹ کے بعد جمالیات پر حسب ذیل فلسفیوں نے تصانیف پیش کیں فشٹے۔ شیلنگ۔ ہیگل اور ان کے پیرو ــــ فشٹے (۱۷۶۲-۱۸۱۴ء) کہتا ہے۔ "کسی شے کا حسن یا بدصورتی محض ناظر کے ذوق نظر میں مستور ہے۔ اس لئے حسن دراصل دنیا میں کسی جگہ موجود نہیں بلکہ حسین روح میں محفوظ ہے اور آرٹ اس حسین روح کے مظاہرے کا نام ہے۔ جس کا مقصد انسانی ذہن و دل کی تعلیم و تربیت ہے۔"

فشٹے کے اتباع میں انہی اصولوں پر فریڈرش شلیگل (۱۷۷۲-۱۸۲۹ء) اور آدم مُلر نے حسن کی تعریفیں بیان کیں۔ شلیگل نے کہا کہ "حسن صرف آرٹ ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ نیچر اور محبت میں بھی ہے لہذا حسن حقیقی کا صحیح ترین مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب آرٹ نیچر اور محبت مدغم ہو جاتے ہیں۔"

اس طرح شلیگل اخلاقی اور فلسفی آرٹ کو جمالیاتی آرٹ سے علیحدہ نہیں بلکہ ان تینوں کو مشترک سمجھتا ہے۔

آدم مُلر (۱۷۷۹-۱۸۲۹ء) کے خیال میں "حسن دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک عام حسن جو عوام کے لئے جاذب نظر ہوتا ہے اور دوسرا انفرادی حسن جس کا تعلق ناظر کے اپنے ذوق نظر سے ہے۔ اجتماع ضدین انتہائی معیار حسن ہے۔ آرٹ کا ہر عمل اسی اجتماع ضدین کا مظہر ہوتا ہے اور بلند ترین آرٹ زندگی کا آرٹ ہے۔"

فشٹے اور اس کے پیرووں کے بعد اس کے ہم عصر فلسفی شیلنگ (۱۷۷۵-۱۸۵۴ء) نے موجودہ دور کے جمالیاتی عقائد پر اپنی تعلیمات و اقوال سے بہت اثر ڈالا ہے وہ کہتا ہے کہ "حسن محدود میں غیر محدود کے مشاہدے اور مظاہرے کا نام ہے اور آرٹ کے کارناموں کی اہم خصوصیت ان کی نامعلوم غیر محدودیت ہے۔ آرٹ فطرت کو معقولیت میں اور نامعلوم و نوف کو یقین و اقفیت میں تحلیل کر دینے کا نام ہے اس لئے آرٹ علم و ادراک کا بہترین ذریعہ ہے۔ فنان اپنے علم و ادراک یا چابکدستی سے حسن کے کسی عمل کی تخلیق نہیں کر سکتا بلکہ فی الحقیقت حسن کا خیال اس کے اندر موجود ہوتا ہے جو آرٹ کے کارنامے کو اس کے ہاتھ سے پیش کراتا ہے۔"

شیلنگ کے متبعین میں سے ممتاز ترین متبع سولگر (۱۷۸۰-۱۸۱۹ء) تھا۔ وہ کہتا ہے۔ "حسن کا تخیل کائنات کی ہر شے کے تخیل کی بنیاد ہے۔ دنیا میں ہم محض اس بنیادی تخیل کی بگڑی ہوئی شکلیں دیکھتے ہیں لیکن آرٹ اعلیٰ وارفع محسوسات کے ذریعہ سے اس بنیادی تخیل کی معراج تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہذا آرٹ تخلیق کا ہم معنی ہے۔"

شیلنگ کا دوسرا پیرو کراؤز (۱۷۸۱-۱۸۳۲ء) کہتا ہے کہ "حسن صحیح انفرادی صورت میں جمالیاتی تخیل کے مظاہرے کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ اور آرٹ حسن کے معیار کی اس تعین کا نام ہے جو انسانی دماغ میں آزادانہ طور پر موجود ہے۔ آرٹ کا انتہائی درجہ زندگی کا آرٹ ہے جو اس طرح محرک ہوتا ہے کہ زندگی سنور جاتی ہے

اور دنیا حسین انسانوں کے لئے ایک حسین گہوارہ بن جاتی ہے "

شیلنگ اور اس کے پیرووں کے بعد ہیگل کا جدید جمالیاتی نظریہ پیش ہوا جس پر بعض ذاتی واقفیت و احساس کے بعد کاربند ہوئے مگر اکثر ناواقفیت اور غیر محسوس طریقے سے اس کو سراہتے ہیں۔ اس مسئلہ میں ہیگل کی تعلیمات اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ مبہم، غیر واضح اور پراسرار ہیں۔ ہیگل (سنہ ۱۷۷۰-۱۸۳۱ء) کہتا ہے کہ "خدا، نیچر، آرٹ اور حسن کے ہیولے میں خود نمایاں ہوتا ہے۔ خدا نیچر اور روح دونوں صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے حسن الٰہی جمال کی مادی شکل ہے۔ صرف روح اور روحانی علایق حقیقت میں حسین کہلانے کے مستحق ہیں اس لئے نیچر کا حسن روح کے قدرتی جمال کا ایک عکس ہوتا ہے۔ یعنی جمیل شے روحانی پاکیزگی سے معرا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ روحانی پتلے مادی تشکیل میں پیش ہوتے ہیں۔ روح کے یہی مادی مظاہر حسن حقیقی کے نمونے ہیں۔ حسن و صداقت لازم و ملزوم ہیں البتہ صداقت میں غور و خوض کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر حسن جو اس کو یہ مہلت نہیں دیتا۔ چنانچہ آرٹ اسی حسن و صداقت کے موثر مظاہر کا نام ہے۔ وہ مذہب اور فلسفے کی طرح بنی نوع انسان کے عمیق و اہم ترین مسائل کو سلجھاتا ہے اور روح کے اعلیٰ ترین الفاظ تک حیات انسانی کو پہنچاتا ہے "

ہیگل کے بعد اس کے بہت سے پیرو ہوئے یعنی ویس۔ آرنلڈ روگ، روزین کرانٹز، تھیوڈور وشر اور دیگر۔ ویس (سنہ ۱۸۰۱-۱۸۶۷ء) کے خیال کے بموجب "حسن و جمال کی روحانی اصلیت کو بیرونی مادی فضا و ماحول میں متعارف کرنے کا نام آرٹ ہے۔ حسن ایک بین صداقت ہے اور آرٹ اس کا آلۂ اظہار "

روگ (سنہ ۱۸۰۲-۱۸۸۰ء) کے جو ہیگل کا نہایت معتقد پیرو تھا خیال کے مطابق "حسن جمال الٰہی کے دنیاوی مظاہر ہیں ..."

وشر (سنہ ...) کہتا ہے کہ "حسن مظہر جمال الٰہی ہے لیکن محدود منظر کی شکل میں "

ہیگل کے فلسفۂ جمالیات کی ہدایات و تعلیمات کے زیر اثر جرمن مفکرین کے جمالیات کے نظریات اوپر بیان ہو چکے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان عقاید نے تمام دیگر جمالیاتی خیالات کا احاطہ کر لیا تھا جرمنی میں ہیگل کے نظریات کے دوش بدوش حسن کے متعلق ایسے نظریات بھی پیش ہوئے جو نہ صرف ہیگل کے خیالات سے آزاد تھے بلکہ ان کے متضاد تھے اور ان کی تضحیک کرتے تھے۔ یہ متضاد نظریات ہربارٹ اور خاص کر شوپنہار کے تھے۔ ہربارٹ (سنہ ۱۷۷۶-۱۸۴۱ء) کہتا ہے کہ "حسن ہرگز کوئی ایسی شے نہیں جو بطور خود موجود ہو۔ جس چیز کا فی الحقیقت وجود ہے وہ ہماری اپنی رائے ہے۔ ہم بعض مخصوص وضع کی اشیا کو حسین کہتے ہیں اور آرٹ ان مخصوص وضع کی اشیاء کو بروئے کار لانے کا نام ہے۔ یہ مخصوص وضع کی اشیا نقاشی، مجسمہ سازی اور فن تعمیر میں پائی جاتی ہیں۔ موسیقی میں متواتر ملتی ہیں اور شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں "

ہیگل کا دوسرا مخالف شوپنہار تھا جس نے ہیگل کے فلسفۂ جمالیات کو ماننے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا۔ شوپنہار (سنہ ۱۷۸۸-۱۸۶۰ء) کے خیال سے "انسان اپنے اپنے مذاق کے مطابق حسن کا معیار مقرر کرتے اور اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ البتہ حسن ایک عام کشش و جاذبیت بھی ضرور رکھتا ہے۔ تمام انسان کچھ نہ کچھ حسن پرست ضرور ہوتے ہیں لیکن فنان میں احساس حسن و مذاق عشق شدید تر ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ حسن کو بہتر طور پر نمایاں کر سکتا ہے "

ان تمام ممتاز فلسفیوں کے بعد جرمنی میں کم درجے کے مصنفین کا دور دورہ ہوا۔ مثلاً ہارٹ مین، کرشمین، شازر، ہیلمو ہلٹز، برگمین، مینگھین اور دیگر بیشمار اہل قلم و اہل الرائے۔

ہارٹ مین (سنہ ۱۸۴۲ء) کہتا ہے کہ "حسن نہ تو کہیں بیرونی دنیا میں پایا جاتا ہے نہ وہ بطور خود موجود ہے اور نہ وہ روح انسانی میں مکین ہے بلکہ وہ فنان کے ... کا رہین منت ہے۔ حسن کوئی موجود شے نہیں ہے بلکہ فنان کی تخلیق شدہ ہے "

شازر (سنہ ۱۷۹۹-۱۸۷۵ء) کا خیال ہے کہ "کائنات میں حسن کامل کہیں موجود نہیں۔ فطرت صرف اس کی جانب رہبری کر سکتی ہے، ہاں آرٹ فطرت کی کمی پوری کر دیتا ہے۔ "

کرشمین (سنہ ۱۸۰۲-۱۸۸۴ء) کا بیان ہے کہ "تاریخ کی چھ مملکتیں ہیں یعنی علم و ادراک۔ دولت۔ سیاست۔ مذہب۔ اخلاق۔ اور حسن۔ آخری مملکت آرٹ کی آماجگاہ ہے "

ہیلمو ہلٹز (سنہ ۱۸۲۱-۱۸۹۴ء) رائے زنی کرتا ہے کہ "حسن غیر شعوری طور پر فنان کے ذریعے سے وجود میں آتا ہے۔ اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا "

برگمین۔ (تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۴۲ء) کہتا ہے کہ "حسن کی تعریف و توضیح ناممکن ہے۔ وہ صرف دیکھا اور محسوس کیا جاتا ہے اس لئے ماہرین جمالیات کا کام صرف یہ ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ کیا چیز کس کو پسند ہے "

مینگبین (متوفی سنہ ۱۸۰۵ء) کا خیال ہے کہ "اولاً حسن ایک ماورائے فہم شے ہے۔ ثانیاً وہ ہمارے اندر محض نظر و خیال سے مسرت و لطف پیدا کرتا ہے۔ اور ثالثاً وہ محبت کی اساس ہے۔"

دور جدید میں فرانس، انگلستان اور دیگر ممالک کے ماہرین جمالیات کے نظریات حسب ذیل ہیں۔ اس زمانے میں جمالیات پر فرانس کے ممتاز اہل قلم میں کوسن، جافرائے، پکٹیت، روائے سون اور لویک کا شمار ہوتا۔ کوسن (سنہ ۱۷۹۲-۱۸۶۷ء) جرمن فلسفیوں کا تبع تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "حسن ہمیشہ ایک اخلاقی بنیاد رکھتا ہے۔ حسن وحدت میں تنوع کا نام ہے۔"

کوسن کے بعد اس کا شاگرد جافرائے (سنہ ۱۷۹۶-۱۸۴۲ء) بھی جرمن جمالیاتوں کا مقلد تھا۔ اس کا خیال ہے کہ "حسن ایک مستور طاقت کو فطرتی عناصر سے نمایاں کرنے کا نام ہے۔ یہ بیرونی دنیا شاہد حسن کا ایک ذریعہ ہے اور بس!"

ملک سوئٹزرلینڈ کے مشہور اہل قلم پکٹیت نے ہیگل اور افلاطون کے عقاید کا اعادہ کیا۔ اس نے کہا کہ "حسن و جمال الہٰی کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو حواس کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔"

لویک، شیلنگ اور ہیگل کا مقلد تھا وہ کہتا ہے کہ "حسن ایک ایسی مستور طاقت ہے۔ جس کا پس منظر فطرت ہے۔ وہ ایک ایسی کشش یا جذب روحانی ہے جس کی تحریک غیر مختتم ہے۔"

فرانسی فلسفی لاشیلیئر کا بیان ہے کہ "وہ صداقت جو حسین نہیں ہے محض ایک دماغی عیاشی ہے۔ نہایت ٹھوس اور قابل قدر صداقت کا دوسرا نام حسن ہے۔"

ان مفکرین جمالیات کے علاوہ جنھوں نے اپنی تصانیف جرمن فلسفۂ جمالیات سے مرعوب ہو کر مرتب کیں۔ فرانس میں حسب ذیل مصنفین نے آرٹ اور حسن کی فہم و تفہیم کے مسئلہ کو بہت اُجاگر کیا۔ کوستر - چیرلولیز - گیاؤ - تین - اور ویرون وغیرہ

تین (سنہ ۱۸۲۸-۱۸۹۳ء) کہتا ہے کہ "حسن اپنی پوری اصلیت میں کبھی ظاہر نہیں ہو سکتا۔ حُسن دنیا کی اہم ترین خصوصیت کا اصل اساس ہے۔"

گیاؤ (سنہ ۱۸۵۴ء) کہتا ہے کہ حسن کوئی مذ فاضل یا غیر ضروری پیداوار نہیں ہے۔ وہ ایک سدا بہار پودے کی مانند ہے اور آرٹ انسان کو اس کی انفرادی زندگی سے بلند کر کے اجتماعی زندگی کے ارتقا پر پہنچا دیتا ہے۔"

فرانسی ماہر عقلیات روائے سون نے بھی حسن کی نوعیت پر مبہم اور غیر واضح رائے دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "حسن دنیا کی تخلیق کا مقصد و مطمح نظر ہے۔ کائنات کے اسرار سربستہ میں سے سب سے زیادہ مقدس اور خدائی سے ملتا جلتا راز حسن مکمل ہے۔ اس عالم کا ذرہ ذرہ اس صداقت و حقیقت پر دال ہے کہ حسن برحق ہے اور محبت اس کا لازمی نتیجہ۔"

چیرلولیز کہتا ہے کہ "آرٹ ایک ایسی تحریک ہے، جو ہمارے مذاق کی تشفی کرتا ہے، ہمارے ذہن خوش آئند تخیلات سے بھرپور کر دیتا ہے، اور ہمارے حواس دل، دماغ اور جذبۂ معقولیت کو یکساں طور پر محظوظ و مسرور کرتا ہے۔ حُسن کسی خاص جگہ موجود نہیں ہے بلکہ وہ ہماری روحوں میں بسا ہوا ہے۔ یوں تو حسن ایک فرضی سی شے ہے لیکن ہمارے حواس، مذاق اور روحانی لطافت اس کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں۔"

کوستر کہتا ہے کہ "حسن، نیکی اور صداقت کے تصورات ہمارے اندر موجود ہیں یہ تصورات ہمارے دماغوں کو منور کرتے ہیں۔ اور اوصاف الہٰی سے نسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ خدا خود نیکی اور صداقت اور نور ہے۔"

ویرون (سنہ ۱۸۲۵-۸۹ء) کا بیان ہے کہ "آرٹ ہمارے جذبات درون کے اظہار کا نام ہے۔"

اس زمانے میں انگلستان میں جمالیات پر لکھنے والوں نے حُسن کی تعریف، اس کے محاسن و خصوصیات کی بنا پر نہیں بلکہ مذاق انسانی کے اصول پر کی ہے۔ چنانچہ حسن کے بیان سے پہلے ذوق انسانی کی تعریف ضروری ہے۔ ریڈ (سنہ ۱۷۰۴-۹۶ء) نے کہا ہے کہ "حسن کلیتہً ناظر کے ذوق پر مبنی ہے۔"

الیسن (سنہ ۱۷۹۰ء) بھی اس عقیدے میں ریڈ کا ہم نوا ہے

اریزمس ڈارون (سنہ ۱۷۳۱-۱۸۰۲ء) مشہور عالم فلسفی چارلس ڈارون کا دادا بھی یہی کہتا ہے۔ انیسویں صدی کے اندر انگلستان میں فلسفۂ جمالیات پر ممتاز اہل قلم چارلس ڈارون، ہربرٹ اسپنسر، گرانٹ ایلن، کیرا اور نائٹ تھے۔

چارلس ڈارون (سنہ ۱۸۰۲-۸۲ء) اپنی تصنیف "نزول انسانی" مطبوعہ سنہ ۱۸۷۱ء میں کہتا ہے۔ "حسن ایک ایسا احساس ہے جس سے فطری طور پر نہ صرف انسان متاثر ہوتا ہے بلکہ چوپائے بھی ہوتے ہیں اور نتیجۃً بنی نوع انسان کے ابوالآبا بھی اس سے متاثر ہوتے ہونگے،

فن موسیقی کی ایجاد و ابتدا در اصل ذکور کے اناث کو اپنے انداز پر الاپ... پر اپنی طرف راغب و مائل کرنے سے ہوئی تھی۔

ہربرٹ اسپنسر (تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۲۰ء) کہتا ہے کہ "آرٹ کا آغاز لہو و لعب سے ہوا۔ لہو و لعب جس طرح اصل انسانی تحریکات کی نقل ہے اسی طرح آرٹ بھی ہے"۔

ناڈ ہنٹر اپنی تصنیف "نظریہ جمال" (سنہ ۱۸۷۲ء) میں رقمطراز ہے کہ "حسن وہ شے ہے جسے پیار کرنے کو دل بے اختیار چاہے اور جسے ہم اپنی معقولیت کی بنا پر اور اپنے وجدان محبت کے باعث سمجھتے ہیں۔ حسن کا اعتراف اپنے اپنے ذوق پر منحصر ہے۔ اس کے لئے کوئی معیار یا کسوٹی مقرر نہیں ہو سکتی۔ حسن متضاد اشیا کے ملاپ کا بھی نام ہے"۔

گرانٹ ایلن، اسپنسر کا مقلد تھا۔ وہ اپنی تصنیف "عضویاتی جمالیات" (سنہ ۱۸۷۷ء) میں لکھتا ہے کہ "حسن کی پیدائش مادیت سے ہوئی ہے۔ جمالیاتی حظائظ حسن و جمال کے تصورات سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن عقیدۂ حسن جسمانی نشو و نما کا طالب ہے۔ ذوق کی تربیت ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ جو موجودہ عہد میں بہترین ذوق جمال کا نمونہ پیش کرتے ہیں آئندہ نسل کے لئے ایک نوع کے معیار کا کام دیتے ہیں"۔

کیر اپنے مضمون "فلسفۂ جمالیات" (سنہ ۱۸۸۳ء) میں بیان کرتا ہے کہ "حسن سائنس سے اس نہج پر جدا ہے کہ وہ (حسن) کسی تلمیح و تشبیہ کے بغیر دنیا کے نازک ترین دقائق و تصورات کو ہمارے لئے آسان کر دیتا ہے"۔

نائٹ اپنی تصنیف "فلسفۂ جمال" حصہ دوم (سنہ ۱۸۹۳ء) میں بیان کرتا ہے کہ "حسن فطرت کی اس قیمتی شے کو اپنی طرف کھینچ لینے کا نام ہے جو انسان کے لئے بے پناہ کشش و جاذبیت رکھتی ہے۔ حسن اس چیز کے سچے اعتراف کا نام ہے جو فطری عناصر میں عام مگر دلفریب ہے"۔

سلی اپنی تصنیف "احساس اور وجدان۔ نفسیات و جمالیات کا مطالعہ" "Sensation and Intuition" Studies in Psychology & Aesthetics (سنہ ۱۸۷۴ء) میں حسن کے عقیدے ہی کو بالکل خارج کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "آرٹ ایک ایسی تحریک کی تخلیق کا نام ہے جو مستقل یا دیرپا اثر رکھے یا نہ رکھے لیکن وہ اپنے خالق کو شادمانی اور ناظر یا سامع کو لطف و مسرت بخشتی ہے۔ مگر اس سے ذاتی فائدہ کچھ بھی نہیں"۔ (ماخوذ)

بے نام ادائیں!

ایسی بھی ہیں کچھ حسن کی بے نام ادائیں

از حضرت خمار بارہ بنکی

کیا اُٹھتی ہیں ہم بادہ پرستوں سے گھٹائیں ‏ ‏ انگڑائی جو لیں کوثر و تسنیم کھینچ آئیں
اللہ رے ان عشق کے ماروں کی ادائیں ‏ ‏ کانٹوں سے اُلجھتے رہیں دامن کو بچائیں
جاتی ہیں فلک تک شبِ فرقت میں دعائیں ‏ ‏ آگے مری تقدیر وہ آئیں کہ نہ آئیں
کچھ اور سنور جائیں تری شوخ ادائیں ‏ ‏ ہو جائیں جو شامل مری نظروں کی خطائیں
دیوانگیٔ شوق میں ہم سر جو جھکائیں ‏ ‏ خود دیر و حرم سامنے دوڑے ہوئے آئیں
صدقے ترے اے آئی ہوئی موت پلٹ جا ‏ ‏ ہو جائینگی غارت مرے بعد اُن کی جفائیں
سو زندگیاں بھی ہوں تو ان لمحوں پہ قرباں ‏ ‏ میں غش میں ہوں وہ دیتے ہیں دامن سے ہوائیں
اُس وقت سمجھئے ہوئی معراجِ تصور ‏ ‏ جب قصۂ غم خود ہی سُنیں خود ہی سُنائیں
دریائے محبت کے شناور وہ ہمیں ہیں ‏ ‏ جو غرق بھی ہو جائیں مگر تھاہ نہ پائیں
جو ناز سے غمزے سے کسی طرح نہیں کم ‏ ‏ ایسی بھی ہیں کچھ حسن کی بے نام ادائیں
بیدادِ تصور ارے توبہ ارے توبہ! ‏ ‏ رہ رہ کے انھیں دی ہیں صدا اُن صدائیں
رحمت نے بصد شوق گل و لالہ سمجھکر ‏ ‏ دامن میں چھپالیں مری رنگین خطائیں

ایمان گیا جان گئی آہ خمارؔ آہ
راس آئیں نہیں کوچۂ جاناں کی ہوائیں

طوفانی رات

افسانہ

از جناب طفیل ملک

جب اُس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو سارے خاندان میں عید کی سی خوشیاں منائی گئیں اور دیوالی کی رات کی طرح سارے گھر میں روشنی کی گئی گویا لکشمی نے گھر میں جنم لیا ہے۔ ساری برادری کو کھانا کھلایا گیا۔ زچہ اور بچہ دونوں کو زیورات سے لاد دیا گیا۔ محلے والیاں اور اس کے رشتہ دار، اس کی نندیں اس سے بات کرنا تک فخر سمجھتی تھیں۔ جہاں وہ قدم رکھتی اس کی نندیں وہاں اپنا سر رکھتی تھیں۔

لیکن ایک سال کے بعد جب اس کا شوہر دو چار ہی گھنٹے میں اچانک چل بسا اور وہ سہاگن سے بیوہ ہوگئی تو بدقسمتی نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور اس کے اردگرد بدنصیبی کا تاریک پردہ چھا گیا۔ اس مصیبت میں کہ سسرال والے اسے دلاسہ دیتے اور انھیں اس ابھاگن سے کامل ہمدردی ہوتی اور اس کی نندیں اس سے نرمی سے پیش آتیں، اس سے سختی اور درشتی کا برتاؤ کیا گیا۔ اور سسرال والے ہر وقت ہی اس کی دلآزاری کا باعث ہوتے۔ یہ بات آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر کوئی جوانی ہی میں بیوہ ہو جائے تو اس بیوہ کا کیا قصور؟ بیوہ تو خود بیچاری مصیبت زدہ ہوتی ہے۔ اس کی تمناؤں، آرزوؤں اور اُمنگوں کا خون ہو چکا ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس سے ہمدردی ہونی چاہئے، لیکن اس کے برعکس لوگ اور اس کے اپنے رشتہ دار ہی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں گویا وہ منحوس ہے یا ڈائن ہے جس نے اپنے شوہر کو ہڑپ کر لیا ہے۔ چنانچہ اسے اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں تاکہ اس کا منحوس سایہ کسی پر نہ پڑ جائے۔

پہلے وہ گھر کی دیوی تھی جس نے گھر کی لکشمی کو جنم دیا اور اب وہ ڈائن تھی جس نے اپنے شوہر کو ہڑپ کر لیا اس نے سسرال میں رہ کر کم تکلیفیں نہ اٹھائیں۔ اس نے ان تکلیفوں کو رنج یا خوشی پر جیسے بھی ہوا برداشت کیا، مگر وہ اس بات کو کیسے برداشت کرتی کہ فلاں آدمی اس کا دم بھرتا ہے لہذا جب اسے کسی مرد سے خواہ مخواہ منسوب کر کے ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی بچی کو لیکر کہیں چلی جائیگی اور اب اس گھر میں نہ رہیگی۔

ایک اداس اور کثیف شام کو وہ اپنی بچی کو لے کر سینہ پر پہاڑ سا بوجھ لادکر اس گھر کو حسرت بھری نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ گئی۔ دور کسی گاؤں کے ایک شکستہ مندر میں جو دریا کے کنارے واقع تھا قیام کیا اور یہیں بود و باش اختیار کر لی اور بھگوان کی پوجا میں شب و روز مصروف رہنے لگی۔ مندر کا بوڑھا پنڈت جس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی ایک پرہیزگار متقی آدمی تھا۔ ہر وقت بھگوان کی یاد میں مورتی کے قدموں پر ماتھا ٹیکے رہتا۔ وہ اسے ہر وقت پوجا میں مصروف دیکھ کر بڑا خوش ہوتا۔

گاؤں والے پنڈت جی کی بڑی عزت کرتے۔ جہاں ان کا قدم پڑتا وہاں گاؤں والے اپنا سر رکھنے کو تیار رہتے پنڈت جی اسے دیوی کہتے۔ دیوی کی شہرت بھی روز بروز اُمنڈتی ہوئی ندی کی طرح بڑھتی گئی۔

پنڈت جی کا خیال تھا جب ساٹھ برس کی عمر میں وہ مکتی حاصل کرنے کے لئے کاشی جائیں گے تو اسے اپنے بعد مندر کی پجارن بنا جائینگے۔ اور جہاں یہ ماں بیٹی بھگوان کی یاد میں اپنی زندگی کے دن کاٹیں لیکن وہ ہر وقت اداس اور رنجیدہ دکھائی دیتی۔ اس کا رنج و غم بالکل بجا تھا۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد موت کے ظالم ہاتھوں نے اس بیچاری کا سہاگ اجاڑ دیا۔ ازدواجی زندگی کی خوشیاں منانے کے لئے چار دن بھی اس نے اپنے شوہر کے ساتھ نہ کاٹے۔ اس وسیع دنیا میں ماں نہیں، باپ نہیں، کوئی بھائی بہن نہیں صرف ایک ننھی یتیم لڑکی کہاں جاتی؟ یوں بھی تو بدنصیبی کے دنوں میں اور پھر بیوہ عورت کے لئے زمین بھاری ہو جاتی ہے دنیا میں جہاں گناہ کے جال [illegible] اپنا بچی کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھاتا [illegible] تھا۔ جی پنڈت جی

تھے جنھوں نے مصیبت کے وقت اسے اپنے سینے سے لگایا اور بیوگی کے المناک زمانے میں اسے بھگوان کے گھر پناہ دی۔ پنڈت جی کے محبت آمیز برتاؤ اور پدرانہ شفقتوں نے اس کی مصیبتوں کے بوجھ کو بہت کچھ ہلکا کر دیا۔ اگر کبھی وہ اپنی بدنصیبی کو یاد کر کے رونے لگتی تو پنڈت جی اسے دلاسہ دیتے اور اس کے ساتھ آنسو بہانے میں شریک ہوتے اس وقت اسے ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نے اس کے زخموں پر مرہم کافور کا پھاہا رکھ دیا۔ دنیا میں اور کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ زرد ہوتا گیا اور آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے۔ چہرہ بالکل اتر گیا۔ اسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اسے کوئی دکھ ہے جو اندر ہی اندر اُسے کھائے جا رہا ہے۔

اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا کلیجہ کوئی اندر سے مسل رہا ہے۔ وہ چاہتی کہ زور زور سے چیخیں مار کر مندر کی دیواروں سے سر ٹکرائے مگر اس خیال سے کہ پنڈت جی کو دکھ نہ ہو دل پر جبر کر کے اپنی بپتاؤں اور مجبوریوں پر ضبط سے کام لیتی مگر آنسوؤں کا طوفان تھا کہ کسی طرح نہ تھمتا برابر امنڈا چلا آتا تھا۔

آخر پانچ برس کے بعد وہ مندر کی شکستہ دیواروں کے سائے میں ہمیشہ کے لئے اپنی بچی کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مرتے وقت وہ پنڈت جی سے بولی۔ "پنڈت جی! میرے بعد میری اس معصوم بچی کا دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ میری نندوا کو آپ اپنی پناہ میں لے لیجئے۔ آپ کے پاس میری یہ محبت کی نشانی رہے گی۔ میرے سوا اس بچی کا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں نندوا آپ کو سونپتی ہوں میری آخری التجا یہی ہے کہ نندوا کو اپنے پاس رکھ کر اسے گناہ کے جال سے بچایئے گا۔"

پنڈت جی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔ "بیٹی تم اس بات کی کوئی فکر نہ کرو۔ نندوا میری اولاد ہے۔ تم نندوا سے بے فکر ہو جاؤ۔ نندوا اپنی ماں کی نشانی بن کر میرے پاس رہیگی۔"

اس کے بعد اس کا بے رونق چہرا اور اس کے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح خشک اور بے رنگ لب خاموش ہو گئے۔

اس کے حواس سلب ہونے کے بعد اس کا دماغ ہوش اور بیہوشی کے درمیان مسلسل کشمکش کر رہا تھا۔ اس کی مضطرب اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں نندوا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پنڈت جی پاس بیٹھے مالا پھیر رہے تھے تاکہ مرنے والے کو موت کے بعد شانتی نصیب ہو۔

موت کا سرد ہاتھ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وہ جلد جلد سسکیاں لینے لگی۔ تو چھوٹی نندوا کی چیخ نکل گئی۔ پنڈت جی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

دن گزرنے لگے اور چھوٹی نندوا نے اپنی ماں کا کام خود سنبھال لیا۔ مندر کا سارا کام اب اس کے سپرد تھا۔ نندوا پنڈت جی کی سیوا کرتی اور پنڈت جی بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی ایک باپ کو اپنی بیٹی سے ہو سکتی ہے۔ پنڈت جی کو اگر خدا کے بعد روئے زمین پر کوئی چیز عزیز تھی تو وہ یتیم و مسکین نندوا تھی۔

پنڈت جی نندوا کو مذہبی تعلیم دیتے اور اسے مذہبی تعلیم حاصل کرنے میں ایک خاص لطف محسوس ہوتا تھا۔ وہ پنڈت جی کے ہر حکم کی تعمیل کرتی۔ پنڈت جی کے کہنے پر وہ ہر روز مندر کا فرش دھونے کے لئے دریا سے پانی بھر کر لاتی اور پوجا کے لئے پھول لاتی۔ پنڈت جی اسے مذہب کے بارے میں جو سبق دیتے وہ اسے دھیان سے سنتی اور دریا کے کنارے بیٹھ کر اس پر غور کرتی۔ پنڈت جی کی مہربانیوں نے نندوا کے دل سے تمام صدمات کو مٹا دیا۔ اس کے ذہن میں وہ باتیں آنے لگیں جو پہلے کبھی نہ گزری تھیں۔ اس کے اداس چہرے سے ملال کی رنگت دور ہو گئی اور اس کا چہرہ پھول کی طرح پاک دکھائی دینے لگا۔

نندوا ننھی بچی سے ایک جوان لڑکی بن گئی۔ اور پنڈت جی پورنماشی کے دن پورے ساٹھ برس کے ہو گئے۔ پنڈت جی کا دل تو نندوا سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا تھا مگر وہ مجبور تھے۔ انھیں مکتی حاصل کرنے کے لئے اماوس کی رات تک کاشی پہنچنا ضروری تھا۔

رخصت ہونے سے پیشتر انھوں نے نندوا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا دل تو تم سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا لیکن مجبور ہوں دیکھو بیٹی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھو۔ دھیان سے سنو، اس دنیا کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ زمانہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ دنیا میں خوشی بھی آتی ہے اور رنج بھی، دنیا کی دلفریبیوں سے ہرگز دل نہ لگانا چاہئے یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس میں دل لگانے کے بجائے اپنے بھگوان سے دل لگاؤ۔ اس دنیا کا کوئی اعتبار نہیں۔ تم جوان ہو بیٹی دنیا میں چپہ چپہ پر گناہوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ تمھارے ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔ اب تک تم میرے پاس تھیں، اور اب میں تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ جس محبت اور جانفشانی سے میں نے تمھیں پالا ہے تمھیں اچھی طرح معلوم ہے۔ رنج و ملال اور گناہ سے بچنے کیلئے

حتی الوسع کوشش کرنا۔ تم دنیا میں اکیلی ہو۔ اس کا خیال کر کے ہر وقت ڈرتی رہنا۔ اپنے دل کو فقیرانہ بنا لو۔ دنیا کا خیال چھوڑ دو۔ ہر وقت بھگوان کی یاد میں مگن رہو۔ دنیا کی بجائے بھگوان سے دل لگاؤ۔ تم خود سمجھدار ہو بیٹی۔ اب تم اس مندر کی پجارن ہو اور لوگوں کے لئے تم دیوی ہو اور دیوتاؤں کو خوش کرنا تمہارا فرض ہے۔

مندر دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ قریب ہی ایک بڑا سا برگد کا درخت عرصہ دراز سے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس درخت کے نیچے دو بڑے بڑے پتھر رکھے تھے جہاں اشنان کیا جاتا۔ دریا کے نیلے پانی میں چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھتیں اور آپس میں ٹکرا ٹکرا کر فنا ہو جاتی تھیں طلوع و غروب کے وقت سورج کی سنہری کرنیں جس طرح مندر کے کلس کو سونے کی طرح چمکا دیتیں اسی طرح دوپہر کو جب نندا دریا سے اشنان کے بعد مندر کو لوٹتی تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح اس کے سارے بدن پر جھلکنے لگتے۔ شام کی پوجا کے بعد جب وہ دیوتا کی مورتی کے سامنے جھکتی تو مندر کے دیئے کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ یاسمین کے پودے کے مانند نظر آتی۔ جو جھکتے ہوئے پھولوں سے لدا ہوا ہو۔

دھوپ، بارش، آندھی، طوفان، ہر حال میں وہ اپنی پوجا کے فرائض کو انجام دیتی آخر آہستہ آہستہ تنہائی کی وحشت اور خوف اس کے دل سے دور ہو گیا۔ اور اسے دیوتاؤں کی پرستش میں حقیقی اطمینان نصیب ہونے لگا۔ اسے پنڈت جی کی باتیں یاد تھیں کہ ہم جو کچھ کہنا چاہیں بھگوان سے کہہ سکتے ہیں۔ ہر چیز اس کے اختیار میں ہے وہ رنج کو شادمانی سے بدل سکتا ہے۔ نندوا کو ان باتوں پر خلوص دل سے اعتبار تھا۔

ایک شام کے وقت ——

نندوا دریا کے کنارے پر بیٹھی کرشن اور اس کی گوپیوں کا خیال کر رہی تھی۔ کتنی خوش قسمت تھیں وہ گوپیاں جنہوں نے گوکل والے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی۔ نندوا جوان تھی۔ اس کی نیکی اور شرافت میں کوئی کلام نہ تھا۔ عالم شباب کی طوفان خیز لہریں برسات کی امنڈ ہوئی ندی کی طرح اس کے دل میں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا دل پنڈت جی کی تعلیم و تربیت سے خواہ کتنا ہی صاف کیوں نہ ہو گیا ہو لیکن پھر ایک شراب سے بھرپور دل تھا۔ شباب کی امنڈتی ہوئی مخمور گھٹائیں اس کے چاروں طرف چھا رہی تھیں۔ وہ پنڈت جی سے کرشن مراری اور ان کی گوپیوں کا قصہ سن چکی تھی۔ اب اس کے دل میں خیال تھا کہ کاش میں بھی کرشن کی گوپی بنتی۔ وہ برگد کے بوڑھے درخت کی شاخوں کو جھومتے ہوئے دیکھتی۔ اور ہوا کے تیز جھونکوں کو پتوں سے سرگوشی کرتے ہوئے سنتی تو اس کا سینہ خواہشات سے لبریز ہو جاتا۔ اسے تنہائی میں بھی یہی آرزو ستاتی اور اس کی پوجا میں بعض وقت یہی تمنا خلل ڈالتی، اور ان باتوں کے دہرانے سے اس کے جسم میں میٹھی میٹھی سی خلش ہوتی۔

وہ ایک شمع کے مانند تھی جو پروانے کے لئے بیتاب تھی۔ وہ ایک چکور تھی جو چاند کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس کے جسم کے اندر ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ انہی خیالات میں پرواز کر رہی تھی کہ اس کے کان میں بنسری کی دلکش اور شیریں و مترنم صدا آئی۔

شام کا وقت، تنہائی، دل شباب کی امنگوں سے بے قرار، بنسری کی مترنم لے نے اس کا دل بیتاب کر دیا۔ اس کے قدم بنسری کی آواز کا تعاقب کرنے لگے۔ اس نے دیکھا ایک نوجوان گوالا اس کی طرف بیٹھ کئے بنسری بجا رہا ہے اور اس کے اردگرد گائیں چر رہی ہیں نندوا کے قدم بڑی تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی کشش اسے اس طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ کچھ دیر محویت کے عالم میں اس نوجوان گوالے کو دیکھتی رہی۔ اس نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ مذہبی تعلیم زنجیر بن کر اس کے قدموں کو روک رہی تھی۔ مگر شباب اور مقدس کشش اسے بے اختیار آگے بڑھا رہی تھی۔ بانسری کی سریلی آواز اور تیز ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگی جیسے اس کی حالت متغیر ہو رہی ہے اور اس کا گلا خشکی اور تلخی سی محسوس کر رہا ہے۔

نوجوان نے پجارن کو اپنے پاس دیکھا تو گھبرا کر چونک پڑا۔ اس کی نگاہیں پجارن کی نگاہوں سے ملتے ہی پجارن کے قدموں پر گر گئیں ایک تیر تھا جو پجارن کے دل و جگر میں ترازو ہو گیا۔ پجارن نے شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ نوجوان گوالا مندر کی پجارن کو جانتا تھا اس نے رک رک کر پوچھا۔ "دیوی جی! آج آپ یہاں کیسے؟"

گوالے کے یہ الفاظ پجارن کے خرمن صبر و قرار پر بجلی بن کر گرے۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ "یونہی ذرا ادھر آ گئی ہوں۔ تنہائی سے جی گھبراتا ہے۔"

نندوا کے اردگرد گائیں چر رہی تھیں اور گوالے کے ہاتھ میں

بنسری تھی۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہُوا جیسے گوکل والا گوالے کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا ہے مگر گوپی کون؟"

دریا کے کنارے گاؤں کے میدان میں اسے گوکل کا جلوہ نظر آیا۔ اور وہ اپنے دل کی خاموش زبان سے بے ساختہ پکار اٹھی۔ یہی وہ کرشن مراری ہے جسے میں گوپی بن کر تلاش کر رہی ہوں۔

اس خیال کے آتے ہی نندو کے چہرے پر ایک چمک سی پیدا ہوئی سورج کی قرمزی شعاعوں میں پجارن کے لمبے لمبے سیاہ بال سونے کے تاروں کی طرح چمکنے لگے اور وہ گوالے کو بڑی دلفریب نظر آئی۔ اس نے پجارن کی طرف دیکھا، تنہائی، شام کا گہرا سناٹا اور اس کے پاس حسن و جمال کا مجسمہ، وہ بیتابی کے ساتھ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ نندوا کی گردن میں ڈال دیئے۔ نندوا کے نازک جسم میں بجلی کی سی لہریں نہایت تیزی کے ساتھ سرایت کر گئیں جیسے اس نے بجلی کے تار کو چھو دیا ہو۔

بادۂ شوق سے بدمست ہو کر وہ بھی نوجوان کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔ مقدس رشتے میں جکڑے جانے والے دو انسان ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ اور شام کے اداس سناٹے میں بوسوں کی آوازیں فضا میں گونج گئیں۔ تعلیم اسے مندر کی طرف کھینچ رہی تھی لیکن شباب کی زنجیروں نے اسے مقید کر رکھا تھا۔

دفعۃً ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں اسے مندر کی بُرجی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ مندر کا نظر آنا تھا کہ اس کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ اور جوانی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ تمام واقعات ایک ایک کرکے اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ماں کا مرنا، پنڈت جی کی تعلیم، ماں کی نصیحتیں، "پنڈت جی میری بچی کو گناہوں کے جال سے بچایئے گا" اس کے ضمیر کا اضطراب بڑھنے لگا۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ اور اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ مندر کی برجی کے پاس پنڈت جی اور اس کی ماں اسے غضب آلود نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ گھبرا کر نوجوان کی آغوش سے نکلتے ہوئے اس نے کہا "چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔"

نوجوان نے چاروں طرف طائرانہ انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیوی جی ——— !"

دیوی تڑپ کر اس کے سینے سے الگ ہو کر گرتی پڑتی مندر کی طرف بھاگ گئی۔ نوجوان حیران تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مندر میں پہنچ کر دیوی بے اختیار ہو کر مورتی کے قدموں میں گر پڑی۔

"پنڈت جی میری بچی کو گناہوں کے جال سے بچایئے گا" یہ الفاظ سیکڑوں کانٹوں کی طرح اس کے جسم میں چبھ رہے تھے۔ مندر سے وہ ایک پاک اور گناہ سے ناآشنا لڑکی کی حیثیت سے گئی تھی مگر اب مندر میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے آپ کو ایک گناہ آلود ہستی سمجھ رہی تھی۔ اس وقت اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اپنا سب کچھ گوالے کے نذر کر چکی ہے۔ اسے گوالا دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز نظر آنے لگا۔ تاریک رات میں روشن تارے کی طرح وہ اسے بھلانا چاہتی تھی لیکن بھول نہ سکتی تھی، اس نے ارادہ نہیں بلکہ فیصلہ کیا کہ اب اس کے پاس نہ جائیگی۔ وہ سارا دن اپنی توجہ مندر کے کاموں کی طرف مبذول رکھے گی۔ اور اس شام کے واقعہ کو ایک اتفاق سے زیادہ وقعت نہ دیگی۔

اس رات اسے نیند تک نہ آئی۔ اضطراب قلب کے باعث اسے پلک تک جھپکنا نصیب نہ ہوا۔ نندوا نے وہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ اسے بستر کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ وہ ساری رات کروٹیں ہی بدلتی رہی اور صبح کو جب اٹھی تو اُسے زمین و آسمان دونوں بدلے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ نیلا آسمان بہت دور، اُفق کے اس پار، زمین سے مل کر اس سے پیار کر رہا ہے۔ پوجا کو دل نہ چاہا۔ دل میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں نوجوان گوالے کا چاند سا مکھڑا بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے پھر کر اُس کے کلیجے میں چٹکیاں لے رہا تھا۔

پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنے دلکش نغموں کی تانیں فضا میں اُڑاتے قطار در قطار مصروف پرواز جا رہے تھے۔ سورج ابھی طلوع نہ ہوا تھا۔ وہ مندر سے نکل کر برگد کے درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ شام کا "آن ہونا" واقعہ اس کے دماغ میں بڑی تیزی سے چکر کھانے لگا۔ اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی، اس نے نظریں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ گوالا کچھ فاصلے پر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہوں میں گوالے کا چہرہ آفتاب سے کم نہ تھا۔ صبح کی مدھم روشنی میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ———

اس کے قدم بیخودی کے عالم میں گوالے کی طرف اٹھنے لگے، پیشتر اس کے کہ وہ گوالے کے پاس پہنچے پنڈت جی اور ماں کی غضب آلود نگاہوں کا خیال اسے ایکدم مندر میں واپس لے گیا۔ گوالا دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ غیر محسوس طریقے کے ساتھ وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرنے لگی۔

خاموشی اور اُداسی کی حالت میں اس کے دن کٹنے لگے۔ سارا دن مجبوراً وہ مورتی کے قدموں پر ماتھا ٹیکے رہتی۔ نوجوان حیران تھا دیوی کو ہو کیا گیا ہے، کیا وہ ناراض تو نہیں ہو گئی۔ محبت کا جوش اسے مندر تک تو لے جاتا مگر مندر کے اندر قدم رکھنے کی اسے جرأت نہ ہوتی۔

کئی دن گزر گئے ——— !

ایک شام،

شام سے قبل ہی سیاہ مہیب بادل سارے آسمان پر چھا گئے، ہر طرف سناٹا تھا، گہرا سناٹا۔ درختوں کے سوکھے پتوں کے کھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ بادل بھوکے شیروں کی طرح غرّا رہے تھے۔

گوالے نے جلدی جلدی اپنے ڈھور ڈنگروں کو یکجا کیا۔ وہ بت بنا ہوا ساکت و صامت، آسمان کی جانب نگاہیں گاڑے کھڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہوا کا زور و شور دمبدم زیادہ ہونے لگا۔ وہ جیسے کسی خواب سے چونک پڑا۔ گھبراہٹ میں بولا۔ "طوفان"

آسمان پر ہر سو تاریکی پھیل رہی تھی۔

ڈنگروں کو چھوڑ کر کسی جذبۂ خاص سے مسحور ہو کر وہ شکستہ مندر کی طرف بھاگا اور جھجکے بغیر ایکدم مندر میں داخل ہو گیا۔

"دیوی!" عالمِ وحشت میں وہ چلایا۔ "طوفان!"

دیوی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"مندر شکستہ ہے" گوالے کے منہ سے رک رک کر نکلا۔

دیوی مسکرا دی۔

"دیوی! تم میرا کہنا کیوں نہیں مانتیں؟" گوالا دیوی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے ناراض ہو؟"

دیوی نے گوالے کی درد بھری نظروں کی طرف دیکھا۔ گوالے کی وحشت زدہ نگاہوں میں ہمدردی کا سمندر موجزن تھا۔

"دیوی! طوفان لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا ہے"

"پھر کیا ہے؟" دیوی نے بے پروائی سے کہا۔

"مندر شکستہ ہے" گوالا اداس لہجہ میں بولا۔ "ایسا نہ ہو ———"

"کچھ بھی ہو، میں مندر سے کہیں نہیں جا سکتی" دیوی مضطربانہ لہجے میں بولی۔

"میرے لئے بھی نہیں؟" گوالا منت کے لہجہ میں بولا۔ "کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں؟" گوالے کے جسم کا روآں روآں کانپنے لگا۔ اور گوالے کی یہ حالت دیوی نے بھی اچھی طرح محسوس کی۔

دیوی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلیں۔ روتی ہوئی بولی۔ "تم خیال کرتے ہو گے کہ تمھیں مجھ سے ایسی توقع نہ تھی، لیکن تمھیں کیا معلوم کہ مجھ پر کیا گزری اور کیا گزر رہی ہے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میرا دل پتھر کا ہے۔ اگر تمھارا یہی خیال ہے تو پھر میں تمھیں بتائے دیتی ہوں کہ تمھاری یاد میں اس پتھر کے ٹکڑے سے آنسوؤں کے چشموں کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ صرف تمھاری محبت تھی جس نے میرے دل کو پتھر کی طرح سخت کر دیا۔ میں تو یہی چاہتی تھی کہ تم مجھے ظالم اور بے رحم خیال کرو اور بھول جاؤ۔ کتنی مرتبہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ تمھارے قدموں پر اپنا سر رکھ کر تمہیں اپنے دلی جذبات سے آگاہ کروں جنہوں نے تمھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میرے سینہ میں دل نہیں، مجھے سب کچھ یاد ہے تمھارا چہرہ، تمھاری نگاہیں، تمھاری حرکتیں، سب میرے دل پر نقش ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تم نے مجھے اور میں نے تمھیں ہمنشینی کے لئے منتخب کیا اور جب تک یہ صحبت میسر رہی میں نے تمام رنج و الم کو اپنے دل سے نکال ڈالا۔ اور وہ حقیقت اب ایک خواب سے زیادہ نہیں، مگر اس کا تصور ان مسرت آگیں لمحوں کی یاد دلا دیتا ہے۔ میں تمھیں بھلانا چاہتی ہوں لیکن بھلا نہیں سکتی"

گوالا بھول گیا کہ وہ کس مدعا کے لئے آیا ہے۔ وہ بے حس و حرکت چپ چاپ بت کی مانند کھڑا دیوی کے الفاظ سن رہا تھا۔

"میں نے تم سے یکدم ملنا ترک کر دیا۔ اور جب میں نے اپنے دل سے تمھارے ملنے کا خیال بھی نکال ڈالا تو میرے دل کے انتہائی گوشے میں تمھاری یاد کروٹیں لینے لگی اور تم سے ملنے کی ہوس بڑھتی گئی۔ لیکن میں ایسا کر نہ سکتی تھی۔ مجبور تھی"

دیوتا کی مورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیوی بولی "میں ہر وقت اس مورتی کے سامنے جھکی رہتی صرف اسی کے آگے اپنی بیکسی و مجبوری کا رونا روتی۔ مورتی کے سامنے جب ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے میں کھڑی ہوتی تو جس ہستی کا خیال میرے دل میں ہوتا وہ تم تھے۔ لیکن اس سے میرے دل کو تسکین نہ ہوتی۔ اور ایسا محسوس ہوتا گویا میں بھگوان کے ساتھ دھوکا کر رہی ہوں۔

تمھاری بنسری کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے اور اس خیال سے ایک سرور سا آ جاتا ہے۔ لیکن میرے دل پر ایک خوف سا چھا جاتا ہے کہ میں دیوتاؤں کی عبادت میں بے توجہی سے کام لے رہی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی سزا تم پر نازل ہو۔ عورت کے اعمال کی سزا اسے اکثر اپنے محبوب کی تکلیف

کی صورت میں ملتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمھیں میری خاطر تکلیف اٹھانی پڑے۔ طوفانی بھیگی ہوئی رات سر پر ہے۔ جاؤ تاریکی بڑھ رہی ہے ایسا نہ ہو کہ گاؤں پہنچنے سے پہلے بارش شروع ہو جائے اور تم بھیگ جاؤ۔"

دیوی کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ پھر بھی ایک ہی لمحہ میں سب کچھ کہہ گئی۔ اس کے چہرے پر جوش، ولولہ اور ہمدردی کے قطرے اُمنڈ آئے

"بولو" گوالا آہستہ سے بولا۔ "جاؤ گی؟"

"میں کہہ چکی ہوں کہ میں مندر سے باہر نہیں جا سکتی۔ تم جاؤ میرے لئے تم کیوں تکلیف اٹھا رہے ہو۔ گاؤں والے تمھاری راہ دیکھ رہے ہونگے۔"

گوالا کچھ کہنے آیا تھا، لیکن دل کی دل ہی میں رہی اور ایک مایوسانہ نظر ڈال کر ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا گیا۔ نندو دیوی کو ایسا محسوس ہوا کہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی بے انتہا آہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔

طوفان بڑی تیزی کے ساتھ بڑھا آ رہا تھا اور فضا کی ہر چیز کو ہلا رہا تھا۔ بڑے بڑے تناور درختوں کی جڑوں سے اکھڑ کر گرنے کی آوازیں اور ان کے پتوں کے کھڑکنے کی آوازیں دل میں ہوک پیدا کر رہی تھیں۔ دریا کا ٹھاٹیں مارتا ہوا پانی ساحلوں سے باہر اچھل کر بہہ رہا تھا۔ دروازے کی کنڈی اور پیتل کے زنگ آلود گھنٹے کی چھنن چھنن اس کے کانوں میں لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی، مندر کی شکستہ مٹی کی دیواروں سے دھول، تنکے اور کنکریاں اُڑ اُڑ کر اس پر گر رہی تھیں۔

طوفان ہائے ہو، ہائے ہو کرتا ہوا فضا میں ایک خوفناک بھرائی ہوئی سیٹی بجا رہا تھا۔ نندو چپ چاپ بیٹھی گوالے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس خیال سے اس کے جسم میں جھرجھری سی آ جاتی کہ گوالا ایسی تاریک بھیانک، طوفانی رات میں جنگل میں ہوگا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اچانک طوفان کے ایک تھپیڑے نے مندر کے دیئے کو بجھا دیا۔ تاریکی ہی تاریکی، نندو گھبرا گئی، ٹھٹھکی مگر دل پر قابو پا کر بیٹھی رہی۔ طوفان دریا کے پانی میں خطرناک لہریں پیدا کر رہا تھا۔ لہریں اٹھتیں اور مندر کی شکستہ دیواروں سے ٹکرا کر خوفناک شور پیدا کرتیں۔

بھیگی ہوئی تند ہوا کے جھونکے دیوی کے منہ سے ٹکرا رہے تھے آندھی کی رفتار بدستور تیز تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے بجلی کی ہر چمک کے بعد بادلوں کی گرج کی آواز پیدا ہوتی جو ہوا کے زناٹے میں مل کر فضا میں بھیانک "تلاطم" پیدا کر رہی تھی۔

بجلی کی چمک میں وہ دیکھتی کہ برگد کے بوڑھے درخت کی شاخیں طوفان کے آگے سر خم ہیں اور بڑی تیزی سے جھوم رہی ہیں بارش کے موٹے موٹے قطرے پتوں پر گر کر عجیب قسم کا بھیانک، شور مچا رہے تھے۔ اور کبھی کبھی کسی بڑے درخت کے جڑ سے اکھڑ کر گرنے کی آواز اس کے کانوں میں آ جاتی تھی۔

بارش ہو رہی تھی، بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے، طوفان زوروں پر تھا، مندر کی شکستہ دیواریں گر رہی تھیں مندر میں بھی ایک طوفان برپا ہو گیا۔ دیوی کے اپنے دل کے چھوٹے سے مندر میں بھی ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ "بھگوان نہ کرے کہ اس کا بال بھی بیکا ہو۔" اچانک اس کے کانوں میں ایک چیختی ہوئی دردناک، بھیانک آواز مٹی اور دھول کے ساتھ گونجی۔ "دیوی کہاں ہو۔ مندر کی دیواریں گر رہی ہیں۔ بولو دیوی کہاں ہو؟"

طوفان بدستور بڑھ رہا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ تاریکی میں، بجلی کی چمک کے سہارے گوالا بڑی دلیری سے مندر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ بجلی کی روشنی میں پانی کی لہریں چمک اٹھیں،

"دھن، دھن، دھن" برگد کا بوڑھا درخت مندر پر گر پڑا گوالا تیزی سے بھاگا لیکن اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ اور وہ وہیں بے حس و حرکت ہو کر گر پڑا۔

بھیانک، کالی، بھیگی ہوئی رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔

طوفان تھم چکا تھا——

سورج طلوع ہو رہا تھا۔

ساری فضا دھلی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں گاؤں کے مکانوں پر پڑیں تو لوگ بھاگے بھاگے مندر کی طرف آئے۔

مندر —— برگد کا بوڑھا درخت —— دونوں طوفان کی نذر ہو چکے تھے اور —— استھان کے پتھروں کے نزدیک گوالے کی لاش پڑی تھی۔ اور گوالے کی لاش کے قدموں میں دیوی آرام کی نیند سو رہی تھی ——!

انگلستان کے عام کتبخانے

سبق آموز مضمون

از جناب حافظ سید رشید احمد ارشد مولوی فاضل، منشی فاضل،

موجودہ دور میں انگلستان کو اپنی عظیم الشان لائبریریوں پر بہت ناز ہے۔ چنانچہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ کا شمار دنیا کے بہترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے ، وہ لندن، کیمبرج، اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانے نہ صرف اپنی نایاب و نادر کتب کے لحاظ سے لاثانی شہرت کے مالک ہیں بلکہ کتابوں کی تعداد، کتبخانے کے نظم ونسق اور پڑھنے والوں کے ذوق وشوق کا زندہ نمونہ ہیں۔ لائبریریوں کا وجود انہی علاقوں میں محدود نہیں ہے بلکہ شہروں، قصبات اور دیہات میں بھی عمدہ پیمانے پر لائبریریاں قائم ہیں۔ اور کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں خواندہ لوگوں کے لئے مطالعہ کتب کا انتظام نہ ہو۔

ان دور افتادہ دیہات میں جہاں کتابوں کا کافی ذخیرہ مہیا نہیں ہوتا مقامی بلدیات اور ضلع کی کمیٹی کی طرف سے گشتی لائبریریوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ چنانچہ اب دور دراز علاقے کا ایک دیہاتی بھی گھر بیٹھے ہوئے انگریزی کی بہترین کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ مقامی بلدیات اپنے علاقوں کے لئے کتابوں کی خریداری پر ایک معقول رقم خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتیں اور وہاں ہندوستان کے میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے برخلاف عوام کے مطالعہ کتب کا ویسا ہی خیال رکھا جاتا ہے جیسا ان کی صفائی، بیماری اور دیگر امور پر توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں اب انگلستان کے ہر طبقے کے گھرانے میں یہ چیز لوازم تمدن میں سمجھی جاتی ہے کہ ہر گھر میں اپنی حیثیت اور شوق کے مطابق ایک کتبخانہ ضرور ہونا چاہئے۔ بہت سے انگریزوں کے ذاتی کتب خانے مختلف نوعیت کے لحاظ سے ممتاز و مشہور ہیں اور ان لوگوں کی ایک کثیر تعداد ایسی بھی ہے جو مرتے وقت اپنے عظیم الشان کتب خانے اپنی قومی لائبریریوں کے نذر کر دیتے ہیں، تاکہ ان کے بعد ان کے علمی ذخیرے سے تمام قوم فائدہ اٹھا سکے۔

سردست ہم انگلستان کی لائبریریوں کے وسیع انتظامات اور کوششوں کی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مگر اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ اس شعبہ میں ان کی ترقی نصف صدی کے اندر اندر ہوئی اس سے پیشتر انگلستان میں حیرت انگیز طریقے سے لائبریریوں کا فقدان تھا۔ آج سے چند سو سال پیشتر نہ صرف انگلستان بلکہ تمام یورپ میں پبلک لائبریریوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ اور چونکہ تعلیم کا چرچا بھی بہت محدود تھا اس لئے ذاتی کتبخانے بھی برائے نام تھے۔ اس سلسلے میں انگریزوں کا جو کچھ مایہ ناز تھا وہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں اور برٹش میوزیم کے کتب خانے تھے۔ مگر یہ کتب خانے بھی علما و فضلا کے لئے مخصوص تھے۔ عام لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

رفتہ رفتہ انگلستان کے دوسرے شہروں میں بعض پیشہ ور لوگوں نے اپنی تفریح کے لئے کلب قائم کئے جہاں مخصوص قسم کے لوگ تفریح طبع کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اور مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ اس عرصہ میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وقت گزارنے کے لئے ناول اور افسانہ وغیرہ کی کتابیں مہیا کی جائیں، یہ ذخیرہ اس زمانے کی لائبریری کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر ان کتابوں کا انتظام بہت ناقص تھا۔ یہ کتابیں فرسودہ اور بوسیدہ حالت میں رہتی تھیں اور کباڑیوں کے ڈھیر کا نمونہ پیش کرتی تھیں۔

قدیم زمانے میں "فری پبلک لائبریری" کی حیثیت سے انگلستان میں صرف ایک لائبریری تھی جو "ہمفری چیتھم" نامی ایک شخص نے مشہور صنعتی شہر مانچسٹر میں قائم کی تھی۔ یہ شخص کرامویل کے زمانے میں فوت ہوا تھا۔ اور اپنی تمام کتابیں اور دولت کا بیشتر حصہ عوام الناس کے لئے ایک مفت لائبریری قائم کرنے کے لئے وقف کر گیا تھا۔ وہ لائبریری اب تک نہایت اعلیٰ پیمانے پر قائم ہے۔

لائبریریوں اور عام کتب خانوں کی کمی محسوس کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ممبروں نے ارادہ کیا کہ وہ ایک تحقیقاتی کمیشن

مقرر کریں جو تمام ملک کے کتب خانوں کی حالت کا معاینہ کرے۔ اور صورت حالات کو بہتر بنانے کی جو تدبیریں ہو سکتی ہیں ان کے متعلق رپورٹ کرے۔ چنانچہ جب اس کمیشن نے تحقیقات کی تو اسے معلوم ہوا کہ انگلستان کے کتب خانوں کی حالت بہت زیادہ خراب ہے اور بالخصوص پایۂ تخت لندن اس معاملہ میں بہت پیچھے تھا۔ نیز یہ عجیب اتفاق تھا کہ جن علاقوں میں انسداد جرائم کے لئے مزید پولیس مقرر کرنا پڑی وہاں کی علمی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرائم و جہالت دو نوں دوش بدوش "مصروف عمل" ہیں۔ اس کمیشن نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:۔

"انگلستان کے پائے تخت کے نو تعمیر شدہ حصوں میں ناخواندگی، علمی و ادبی تاریکی حیرت انگیز طریقہ سے چھائی ہوئی ہے ۔۔۔۔"

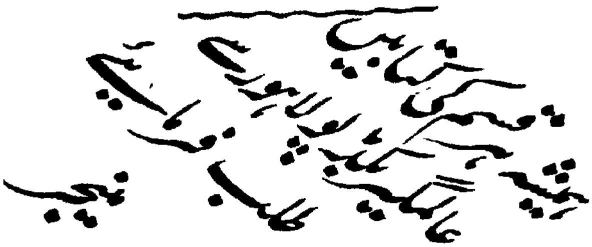
نہ صرف لندن ہی جو انگریزوں کا مایہ ناز شہر ہے جہالت اور "علمی افلاس" کا مرکز بنا ہوا تھا بلکہ تمام یورپ کی یہی حالت تھی۔ چنانچہ کمیشن کے سامنے ایک گواہ نے حیرت انگیز نقشہ پیش کیا جس میں مختلف رنگوں سے آبادی کے مطابق ہر ملک میں کتابوں کی موجودہ تعداد دکھائی گئی تھی۔ کمیشن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انگلستان اور ہالینڈ اس نقشہ میں بالکل سیاہ دکھائے گئے ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ دونوں ممالک تمام یورپ میں ذخیرۂ کتب کے لحاظ سے بہت پیچھے تھے۔ یہاں تک کہ روس جیسا پس ماندہ ملک بھی انگلستان کی بہ نسبت زیادہ کتابوں کا مالک تھا۔

اس تحقیق نے پارلیمنٹ کے اراکین کو اس درجہ حیرت زدہ کر دیا کہ انھوں نے ایک ایسا قانون منظور کرانے کا قطعی فیصلہ کر لیا جس کے ذریعہ سے شہر کی مقامی مجالس یا میونسپل کمیٹیوں کو اجازت دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو اہل شہر کی آمدنی سے کتب خانے قائم کر سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں شہریوں نے اپنے شہر کے انتظامات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ گزشتہ زمانے کی خرابیوں کو دور کرتے ہوئے اپنے شہر کو خوبصورت اور مہذب بنائیں گے۔ چنانچہ عام لائبریریوں کا قیام اسی عمل تہذیب کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

آج کل کی روشن خیالی کے زمانے میں اس بات کا یقین نہیں کیا جائے گا کہ جب عام کتب خانوں کے قیام اور توسیع کا معاملہ پارلیمنٹ کے زیر غور تھا تو اس وقت چند اراکین ایسے بھی تھے جنہوں نے اس کی بے حد مخالفت کی۔ ان میں سے ایک کرنیل صاحب بھی تھے۔ جنہوں نے اس موقع پر پارلیمنٹ کے سامنے کہا کہ وہ پبلک کے مطالعہ کتب اور تعلیم کا سلسلہ قائم کرنے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ نیز وہ آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ جب عام لائبریریوں کے قیام کے قانون کو منظور کرانے پر اصرار کیا گیا تو کرنیل مذکور بہت برافروختہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اشخاص تعلیم اور کتب قانون کو توسیع دینے کے سخت خلاف تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ عوام تعلیم حاصل کرنے کے بعد حکومت کو بہت تنگ کریں گے اور سیاسی کاموں میں روڑے اٹکائیں گے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایسے قانون اور تجویز کی مخالفت کرتے تھے جس کے ذریعہ سے عوام کی جہالت دور ہو کر ان میں روشن خیالی پیدا ہو سکے۔

یہ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ اس قسم کے تنگ خیال افراد کی جماعت اس وقت بہت محدود تھی۔ اور یہ نئے قوانین بخیر و خوبی منظور ہو گئے۔ اس کے بعد مقامی بلدیات اور علمی اداروں کے ذریعہ سے تمام انگلستان میں کتب خانوں کا ایک جال پھیلنا شروع ہو گیا اور اس طرح عوام میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔

ہمارا ملک ہندوستان اس معاملے میں بہت پیچھے ہے یہاں مقامی اور ضلع کمیٹیوں کو قائم ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ بڑی بڑی بلدیات کی طرف سے بھی عام کتب خانوں کے قیام پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ شہروں میں جب کتب خانوں کا فقدان ہو تو دیہات اور قصبات کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اراکین بلدیات اس طرف متوجہ ہو کر عوام کو بیدار کرنے کے لئے اس بہت بڑے ذریعہ سے کام لیں۔ اور ملکی جہالت اور علمی افلاس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔



دین و دنیا

اب آپکی بیداد بھی بیداد نہیں ہے

از:- حضرت راز یزدانی رامپوری

اس در کی سی حسرت زرا بھی زمانے میں کہیں ہے
جینا بھی نہیں ہے مجھے مرنا بھی نہیں ہے

اب واقفِ مفہوم وفا قلبِ حزیں ہے
اب آپکی بیداد بھی بیداد نہیں ہے

تو پاس نہیں ہے تو نہ دنیا ہے نہ دیں ہے
اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تو پاس نہیں ہے

خاروں نے کیا ہے مجھے پھولوں پر اشارہ
اور پھول یہ کہتے ہیں کہ وہ اور کہیں ہے

تم اور مری خانہ خرابی پہ تبسم
امید سے بڑھکر ابھی قدرِ دل و دیں ہے

یا تیرے سوا حسن ہی دنیا میں نہیں تھا
یا دیکھ رہا ہوں کہ جو منظر ہے حسیں ہے

یہ زیست ہے یا موت سمجھ میں نہیں آتا
اب درد ہے اور درد کی تکلیف نہیں ہے

وحشت اسے کہتے ہیں تو وحشت ہی سمجھ لو
پیشِ نظرِ راز نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

پانچ سائے

افسانہ

نوشتہ :- مارٹن آرمسٹرانگ
ترجمہ :- جناب بشیر ساجد بی-اے

میں عام حالات میں بارش میں چلنے پھرنے سے نہیں جھجکتا لیکن اس موقع پر بارش نہایت موسلا دھار ہونے لگی تھی اور مجھے ابھی دس میل کا فاصلہ طے کرنا تھا اس لئے مجھے پناہگاہ کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے ایک مکان دکھائی دیا جو سڑک سے ذرا ہٹ کر آنے والے گاؤں سے ایک میل ادھر واقع تھا۔ میں بھاگ کر وہاں پہنچا اور ملحقہ باغ کے پھاٹک میں سے اندر کی طرف جھانک کر دیکھا لیکن آبادی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ مکان غیر آباد معلوم ہوتا تھا کھڑکیاں تمام بند تھیں اور کسی پر پردہ وغیرہ نہیں پڑا ہوا تھا۔ میں نے نچلی منزل کی ایک کھڑکی سے اندر نگاہ دوڑائی تو دیواریں آرائش سے خالی دکھائی دیں۔ گیس لیمپ کی ایک جال ٹوپی اور ایک خالی آتشدان اندر پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باغ کی دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ پھولوں کی کیاریوں میں بھی گھاس اُگ رہی تھی اور احاطے کی باڑ سیدھی روشوں اور بنفشے کے پودوں کے سوا کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس کے باغ ہونے پر دلالت کرتی۔

اس لئے یہ اندازہ لگانا بہت آسان ہے کہ اس عالم میں جب ایک شخص بنفشے کے پودوں میں سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا میری طرف آیا تو میں کیسا حیران ہوا ہونگا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ صرف وہاں موجود ہی نہ تھا بلکہ برہنہ سر، بغیر برساتی اوڑھے، بغیر کسی نصب العین کے ادھر اُدھر گھوم رہا تھا حالانکہ بارش شرابور کئے دیتی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا قریبی مائل انسان تھا۔ پادریوں کا سا لباس سر سے گنجا اور داڑھی صفاچٹ، اور نگاہوں میں وہ سنجیدگی اور گہرائی تھی جو ولیم بلیک کی تصویروں میں نظر آتی ہے۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا، اس کے بازو جو پہلوؤں پر لٹکے ہوئے ہیں بے سکت سے ہیں۔ اس کے لباس اور چہرے سے بارش کے قطرے ٹپک ٹپک کر نیچے گر رہے تھے اور اسے بارش کا ذرا بھی احساس نہ تھا لیکن مجھے تھا۔ پانی اب میرے بالوں میں سے گذر کر گردن پر بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔ "معاف فرمائیے گا جناب کیا میں پناہ کے لئے اندر آسکتا ہوں؟"

وہ چونک پڑا اپنی متعجب آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا۔ "پناہ ۔۔۔؟"

"ہاں جناب! بارش سے پناہ۔"

"اوہ، بارش سے، بڑے شوق سے جناب! مہربانی کر کے اندر چلے آیئے۔"

میں پھاٹک کھول کر ایک روش پر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جو سامنے کے دروازے کی طرف جاتی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک طرف ذرا جھک کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ میں پہلے اندر داخل ہو جاؤں اور جب ہم ہال میں پہنچ گئے تو کہنے لگا۔ "مجھے خوف ہے کہ یہ جگہ آپ کو کچھ زیادہ آرام دہ نہ معلوم ہو گی۔ تاہم اندر چلے آیئے۔ ادھر، یہ جو بائیں جانب کو پہلا دروازہ ہے۔"

کمرہ خاصہ فراخ تھا لیکن ایک صنوبر کی میز اور ایک بنچ کے سوا بالکل خالی تھا۔ البتہ دروازے کے نزدیک ایک کونے میں ایک اور چھوٹی سی میز پڑی تھی جس پر ایک بجھا ہوا لیمپ رکھا تھا۔

"مہربانی کر کے تشریف رکھئے۔" میرے پناہ دہندہ نے ذرا جھک کر بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز آداب اور طرز گفتگو سے قدیم وضع کی شائستگی مترشح تھی۔ وہ خود نہیں بیٹھا بلکہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور مُنہ باہر نکال کر باغ کی طرف دیکھنے لگا جہاں بدستور جھڑی لگ رہی تھی۔ اس کے بیجان سے بازو ابھی پہلوؤں پر لٹکے ہوئے تھے۔

"بظاہر آپ کو بارش کی اتنی پروا نہیں جتنی مجھے ہے۔" میں نے گفتگو ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے جسم کو گھمایا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے سر کو نہیں گھما سکتا۔ اس لئے میری طرف دیکھنے کے لئے اسے تمام جسم کو گھمانا پڑا۔

"اوہ، بارش کی پروا؛ بالکل نہیں، سچ یہ ہے کہ جب تک آپ نے

یہ ذکر نہیں چھیڑا مجھے بارش کے نزول کا احساس تک نہ تھا۔"

"لیکن آپ تو بالکل بھیگ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ کپڑے بدل ڈالیں؟"

"کپڑے بدل ڈالوں؟" اس کی نگاہ متجس اور متوحش ہوگئی۔

"ہاں — !"

"کپڑے بدل ڈالوں، ہرگز نہیں جناب ہرگز نہیں، اگر یہ بھیگے ہوئے ہیں تو کیا ہوا۔ اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ خشک ہو جائینگے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہاں (کمرے میں) تو بارش نہیں ہو رہی۔"

میں نے اس کے چہرے کی طرف نظر دوڑائی۔ اس نے حقیقت میں سوال کیا تھا اور اس کا جواب چاہتا تھا۔

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ یہاں تک بارش کی رسائی نہیں ہے۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ میرے پاس کھانے پینے کی کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو پیش کر سکوں۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "صبح و شام گاؤں سے ایک عورت آتی ہے اور کھانا دے جاتی ہے۔ باقی اوقات میں میں بالکل مجبور ہوتا ہوں (اس نے اپنے لٹکے ہوئے بازوؤں کو پھیلایا اور پھر بند کر لیا) البتہ آپ باورچی خانے میں جاکر خود چائے تیار کر لیں۔ بشرطیکہ آپ ایسا کرنا جانتے ہوں۔"

میں نے انکار کر دیا لیکن سگریٹ پینے کی اجازت چاہی۔

"شوق سے پیجئے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو سگریٹ بھی پیش نہیں کر سکتا ..... دوسرا شخص، میرا پیشرو سگریٹ پیا کرتا تھا۔ لیکن مجھے پائپ کا شوق ہے۔"

اس نے جیب سے پائپ اور پائپ کیس نکالا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو استعمال کر رہا ہے۔

جب ہم دونوں کش لگانے لگے تو میں نے دوبارہ سلسلۂ گفتگو جاری کیا کیونکہ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ گفتگو کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے اور اگر میں آغاز کلام نہ کروں تو میرا عجیب و غریب میزبان مہر خاموشی کو توڑنے کی کبھی کوشش نہ کرے گا۔ بلکہ اپنے معلق بازوؤں کے ساتھ یونہی بیٹھا رہے گا۔ اور بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہے گا۔ باغ کی طرف یا میری طرف،

میں نے خالی اور غیر آراستہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا،

"میرا خیال ہے کہ آپ نے یہاں حال ہی میں نقل مکانی کی ہے۔"

"نقل مکانی؟" وہ ذرا اپنی جگہ سے ہلا۔ اور اپنی حساس مگر غیر آسودہ نگاہوں کو میری طرف پھیر دیا۔

"میرا مطلب اس مکان میں تشریف آوری سے ہے۔"

"تشریف آوری؟ نہیں جناب میں یہاں کئی سال سے رہتا ہوں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ مجھے خود یہاں رہتے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ اور اس سے پہلے دوسرا شخص یعنی میرا پیشرو یہاں پانچ سال تک رہا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسے فوت ہوئے سات مہینے ہو چکے ہیں۔ بیشک بیشک، (جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو اچانک اس کے لبوں پر افسردہ وار اس مسکراہٹ کھیلنے لگی اور چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔) آپ میری بات کا یقین نہیں کرینگے، مسز بلیوس بھی نہیں کرتی۔ جب میں کہتا ہوں کہ مجھے یہاں آئے ہوئے سات مہینے ہو چکے ہیں، یا اس کے قریب۔"

"اگر آپ ایسا کہتے ہیں تو میں کیوں آپ کی بات کا یقین نہ کرونگا۔"

یہ سن کر وہ چند قدم میری طرف چلا اور اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا جسے میں نے با دل ناخواستہ تھام لیا ہاتھ کیا تھا، سرد بیجان اور بےحس لوتھڑا سا تھا جس کے چھونے سے میرے جسم میں ایک ناخوشگوار سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرا یہ سلوک دیکھ کر وہ بولا۔

"شکریہ! آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ پہلے آدمی ہیں، ہاں بالکل پہلے ......"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس نے اپنا فقرہ مکمل نہ کیا وہ بظاہر محویت کی حالت میں تھا۔ لیکن معمولی وقفہ کے بعد اس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھنے کی اس طرح سعی کی۔ "اس میں شک نہیں کہ تمام کام ٹھیک ہو جاتے۔ اگر میرا یعنی میرے پیشرو کا ایک بوڑھا رشتہ دار یہ مکان اس کے نام وصیت نہ کر جاتا کیونکہ اس کے لئے اس کی پہلی جائے رہائش یعنی ایکتوری ہی بہتر تھی۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ پادری تھا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اسی کے کپڑے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر گم سم سا ہو گیا جیسے استغراق کے عالم میں ہو۔ لیکن جسمانی طور پر وہ پادری کے کپڑوں میں ملبوس میرے سامنے کھڑا تھا۔ آخر اس نے مجھ سے دفعتہً سوال کیا۔ "کیا آپ اعتراف کے قائل ہیں؟"

" اعتراف؟ آپ کی مراد مذہبی اصطلاح سے ہے نا؟"

وہ ایک قدم اور نزدیک آ گیا۔ اب وہ تقریباً مجھے چھو رہا تھا، پھر مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے دھیمی آواز میں کہا: "میرا مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ گناہ کا اعتراف یعنی جرم کا اقبال تسکین قلب اور نجات اُخروی کا باعث ہوتا ہے؟"

وہ مجھے کیا بتانا چاہتا تھا؟ اس کے اعتراف کے حوصلوں کو پست کرنے کے لئے مجھے چاہئے تھا کہ کہتا بالکل نہیں۔ لیکن اس نے ایسے ملتجیانہ لہجے میں سوال کیا تھا کہ اسے مایوس کرنا مجھے گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا۔ "ہاں! میرا خیال ہے کہ اعتراف گناہ سے اکثر انسان کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔"

وہ جھک کر تسلیم بجا لایا۔ اور بولا "چونکہ آپ بہت ہمدرد انسان ہیں۔ اس لئے میرے دل میں آپ کے وقت میں مخل ہونے کی خواہش اور جرأت پیدا ہو رہی ہے۔" اس نے اپنا ایک ہاتھ مشینی انداز میں بلند کیا اور پھر نیچے کر لیا: "کیا آپ صبر کے ساتھ میری باتوں کو سن سکتے ہیں؟"

وہ میرے پہلو میں کھڑا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لکڑی کا کوئی ڈھانچہ ہو۔ جسے درزی نے کپڑے پہنا کر وہاں کھڑا کر دیا ہے۔ اس کی ٹانگ میرے زانو کو چھو رہی تھی اور مجھے اس کے نزدیک ہونے کے باعث کراہت سی آ رہی تھی۔ آخر جس بنچ پر میں بیٹھا تھا اس کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا "کیا آپ وہاں بیٹھیں گے نہیں۔ اس طرح مجھے آپ کی باتیں سننے میں آسانی رہے گی۔"

اس نے اپنے جسم کو گھمایا اور غور سے بنچ کو دیکھا۔ پھر اس طرح اس پر بیٹھ گیا کہ ایک ٹانگ بنچ کے ایک طرف تھی اور دوسری مقابل کی طرف۔ مُنہ میری جانب تھا۔ قدرے آگے کو جھکا ہوا، وہ بولنا ہی چاہتا تھا کہ ایکلخت رک گیا اور کھڑکی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر پائپ مُنہ سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اور آنکھیں میری طرف پھیر کر کہنا شروع کیا: "میرا راز ——— میرا خوفناک راز ——— یہ ہے کہ میں ایک قاتل ہوں۔"

اس کے بیان نے مجھے خائف کر دیا۔ کرنا چاہئے تھا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ اس کے انتہائی عجیب پن نے ایک حد تک مجھے ہیبتناک چیزوں کے لئے تیار کر دیا تھا چنانچہ میں دم بخود ہو کر اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اور وہ بھی متوحش نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتظار کر رہا ہے کہ پہلے میں بولوں۔ لیکن پہلے تو مجھ سے بولا ہی نہ گیا۔ سوچنے کی بات ہے۔ میں کہہ ہی کیا سکتا تھا اور بالآخر جو الفاظ میرے مُنہ سے نکلے وہ قطعاً غیر محل اور بے تکے تھے۔ میں نے کہا۔

"اور یہ چیز آپ کی روح پر بوجھ بنی ہوئی ہے؟"

اچانک اس نے اپنے بھاری بھرکم اور ڈھیلے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور کہا۔ "یہ خیال میرے لئے سوہان روح بن گیا ہے۔ دن ہو یا رات، یہ کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کیا آپ صبر سے ......"

میں نے رضامندی کے طور پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، ہاں، بیان کیجئے۔"

"اگر میرے پیشرو کو یہ مکان ترکہ میں نہ ملتا تو یہ حالات پیش نہ آتے کیونکہ وہ اپنی "ریکتوری" (پادری کا گھر) ہی میں رہتا۔ اور میں ——— میں اس بکھیڑے میں کبھی نہ پڑا ہوتا۔ اگرچہ بیان کیا جاتا ہے کہ میرا پیشرو "ریکتوری" میں خوش نہیں تھا۔ وہاں اس کے ساتھ غیر دوستانہ سلوک ہوتا تھا، اور لوگ اسے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ صرف اسی لئے وہ پہلے اس مکان میں صرف چند دن کے لئے آزمائشی طور پر آ کر ٹھہرا تھا۔ وصیت کرنے والے نے صرف خالی مکان اس کے لئے چھوڑا تھا۔ فرنیچر، نقدی وغیرہ کچھ نہیں، چنانچہ جب وہ یہاں آ کر رہا تو یہ میز، یہ بنچ اور ایک تہہ ہو جانے والی ٹوٹی پھوٹی چارپائی جو اوپر کی منزل پر پڑی ہے اپنے ساتھ لایا۔ باورچی خانے کی چند اشیا بھی اس کے پاس تھیں، آپ سمجھ گئے ہونگے، کہ وہ پہلے اس مکان کی جانچ کیا کرتا تھا، اس کے آبادی سے الگ تھلگ ہونے کو وہ پسند کرتا تھا لیکن وہ بعض اور باتوں کے متعلق بھی اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ بعض مکان محفوظ ہوتے ہیں اور بعض غیر محفوظ، اس لئے وہ مکان میں مستقل رہائش اختیار کرنے سے پیشتر یہ معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ یہ محفوظ تو ہے (وہ ذرا ٹھہرا اور پھر جوش کے ساتھ کہنے لگا۔) اور میرے دوست! جب آپ کسی اجنبی مکان میں سکونت اختیار کرنا چاہیں تو میں آپ کو بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دونگا۔ کیونکہ بعض مکان بہت غیر محفوظ ہوتے ہیں۔"

میں نے سر کو جنبش دی۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ یہ سیلی ہوئی دیواریں، پانی کا غیر تسلی بخش نکاس وغیرہ وغیرہ ....."

اس نے اختلاف کے انداز میں سر ہلا دیا اور کہا: "نہیں

یہ چیزیں نہیں، کچھ ان سے بڑھ کر خطرے کا سامان، میرا مطلب مکان کی روح سے ہے۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے (کہ اس کی نظریں مجھے چبھتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔) کہ یہ مکان خطرناک ہے؟"

میں نے کندھوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا "غیر آباد مکان ہمیشہ قدرے غیر مشکوک ہوتے ہیں۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گیا اور آخر یوں استفسار کیا "کیا آپ نے اس مکان کے انوکھے پن کو تاڑا ہے؟"

جب اس نے مجھ سے یہ سوال کیا تو واقعی میں نے محسوس کیا کہ مکان اپنے اندر کچھ انوکھا پن رکھتا ہے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ میرے میزبان کا اپنا انوکھا پن بلکہ اس کی گفتگو کے مہیب و معنی خیز اشاروں کا انوکھا پن ہے اس لئے میں نے جواب دیا کہ "دوسرے غیر آباد مکانوں سے بڑھکر مشکوک اور انوکھا نہیں ہے۔"

اس نے مجھے بے اعتباری کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ عجیب بات ہے۔ بالکل عجیب کہ آپ محسوس نہیں کرتے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ میرے پیشرو کو بھی پہلے پہل اس حقیقت کا احساس نہ ہوا تھا۔ اور تو اور، یہ کمرہ بھی ——— کیونکہ جناب یہ کمرہ بہت خطرناک ہے۔ اسے ابتدا میں غیر معمولی معلوم نہ ہوا۔ حالانکہ یہ حد درجہ غیر معمولی ہے۔"

اگر مطلع صاف ہوتا تو میں سلسلہ گفتگو قطع کر کے اس سے رخصت ہو جاتا کیونکہ اس کی گفتگو اور اطوار سے میں بیشتر سے بیشتر پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن موسم خراب تھا۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور یہ ظاہر تھا کہ طوفان آیا چاہتا ہے۔

وہ یہ کہتے ہوئے بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ میں اس کمرے کا انوکھا پن آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ یہ صرف اندھیرا ہونے کے بعد نظر آتا ہے لیکن میرے خیال میں اب کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔"

وہ کونے والی میز کی طرف بڑھا اور لیمپ روشن کر دیا پھر اسے گلوب سے ڈھانپا اور لا کر بڑے میز پر میری بائیں طرف رکھ دیا۔

"اب میز کے عین مقابل بیٹھ جائیے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے سامنے کمرے کی بچھڑنگی قوسی

کھڑکی تھی۔ جس پر کوئی پردہ وغیرہ نہیں پڑا ہوا تھا۔

اس نے اپنا بھاری ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ اس جگہ بیٹھے ہیں جہاں وہ دوسرا شخص یعنی میرا پیشرو بیٹھ کر کھانا کھایا کرتا تھا"۔

میں اپنی چونکاہٹ کو چھپا نہ سکا۔ اور نہ ہی نظر پھیر کر اُسے دیکھنے کی خواہش کو ضبط کر سکا۔ یہ خیال مجھے پریشان کئے دیتا تھا کہ وہ میرے عقب میں میرے سر پر کھڑا ہے۔ اور میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔ میری اس حرکت سے اسے حیرانی ہوئی۔ اور وہ بولا ——

"آپ گھبرایئے نہیں۔ دوبارہ دیکھ کر مجھے بتایئے کہ آپ کو کیا نظر آتا ہے؟"

میں نے تعمیل کی اور کہا۔ "مجھے کھڑکی نظر آتی ہے"۔

"صرف کھڑکی؟"

میں نے کھڑکی پر نظریں جما دیں۔ پھر کہا۔ "مجھے اپنے پانچ عکس بھی نظر آتے ہیں ہر ایک شیشہ میں ایک ایک"۔

"ایسا ہی ہے، ایسا ہی، یہی وہ دوسرا شخص تنہا کھانا کھاتے وقت دیکھا کرتا تھا، یعنی پانچ اور ہستیوں کو تنہا کھاتے ہوئے جب پانی انڈیلتا تو وہ بھی پانی انڈیلتے اور جب سگریٹ جلاتا تو ان میں سے ہر ایک بھی ایسا کرتا"۔

"ٹھیک ہے اور اس سے آپ کا پادری دوست خائف ہو گیا"۔

"اس کا نام تھا، مقدس جیمس باکسٹر۔ وہ پادری تھا نہ! اس لئے مقدس، اس نام کو اچھی طرح یاد کر لیجئے۔ بھولیئے گا نہیں اور اگر لوگ آپ سے پوچھیں کہ اس مکان میں کون رہتا ہے تو کہہ دیجئے گا کہ مقدس جیمس باکسٹر، کیونکہ کسی کو معلوم نہیں کہ —— کہ —— !"

"کہ آپ نے اسے قتل کر دیا ہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں"۔ اس نے اچانک اپنی آواز کو دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ "کسی کو معلوم نہیں، کوئی جاندار اس بھید سے واقف نہیں، آپ پہلے انسان ہیں جن سے میں نے یہ ذکر کیا ہے"۔

"کیا مسٹر باکسٹر کی عدم موجودگی کسی نے محسوس نہیں کی۔ اور کیا آپ سے تحقیق و تفتیش کرنے کے لئے کوئی شخص یہاں نہیں آیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں! مسز ہیلوس بھی اس

واقعہ سے آگاہ نہیں حالانکہ وہ ابتدا سے اس کی ضروریات کی دیکھ بھال کرتی چلی آئی ہے۔"

میں نے گھوم کر اسے شک کی نظروں سے دیکھا اور کہا "مسز بیلوس بھی نہیں جانتی! کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ......"

"وہ نہیں جانتی کہ میں باکسٹر ہوں۔" اس نے توضیح کرتے ہوئے کہا "ہم ایک دوسرے سے بہت مشابہ تھے۔ تعجب کی حد تک مشابہ اس سے پیشتر کہ آپ تشریف لے جائیں۔ میں آپ کو ایک تصویر دکھاتا ہوں۔ جس سے آپ خود بخود مان جائیں گے کہ ہماری شکل و صورت میں کس قدر مشابہت تھی؟"

اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ بارش تھمے یا برسے مجھے ضرور چل دینا چاہئے۔ بارش کے سوا میرے توقف کرنے کی اور کوئی وجہ نہ تھی، اس لئے میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا "اچھا جناب! اب میں یہ امید کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں کہ آپ نے اپنا راز مجھے بتا کر اپنا جی ہلکا کر لیا ہے۔"

یہ سن کر وہ متفکر سا ہو گیا اور بار بار اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچنے لگا۔ آخر بولا۔ "لیکن ابھی آپ کو نہیں جانا چاہئے۔ آپ نے تو آدھا واقعہ بھی نہیں سنا۔ آپ کو ابھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ کیسے وقوع میں آیا۔ مجھے امید تھی کہ آپ صبر اور مہربانی سے ...."

میں دوبارہ بنچ پر بیٹھ گیا اور کہا۔ "بسر و چشم، اگر آپ کو ابھی کچھ اور کہنا ہے تو میں سننے کے لئے تیار ہوں۔"

"میں ابھی آپ کو بتا چکا ہوں۔ کہ میں —— وہ دوسرا شخص میرا پیشرو —— کھانا کھاتے وقت یہاں بیٹھا کرتا تھا۔ اور صبح و شام اپنے پانچوں عکسوں کو اپنی نقل اتارتے دیکھا کرتا تھا۔ جب وہ سگریٹ جلاتا تو ساتھ ہی پانچ اور سگریٹ بھی روشن ہو جاتے۔"

"قدرتی طور پر!"

"ہاں قدرتی طور پر، جیسے آپ کہتے ہیں۔ یہ بالکل قدرتی تھا، ایک رات، ایک خوفناک رات سے پیشتر تک کامل طور پر قدرتی" وہ رک گیا اور خوفزدہ آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"اور پھر ——!"

"پھر ایک عجیب اور خوفناک چیز وقوع میں آئی۔ جب وہ —— میرا پیشرو، سگریٹ سلگا چکا تو اس نے دیکھا کہ ان پانچوں ہستیوں میں سے جو بالکل بائیں طرف تھی۔ اس نے خلاف معمول سگریٹ کی بجائے پائپ سلگایا ہے۔"

میں زور زور سے ہنسنے لگا "میں سمجھ گیا ہوں جناب —— میں سمجھ گیا ہوں۔"

وہ بیچارا گھبراہٹ میں اپنے ہاتھوں کو دبانے اور مروڑنے لگا۔ پھر بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ واقعہ تمسخر انگیز ہے۔ لیکن خوفناک بھی ہے۔ اگر آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا تو آپ کیا خیال کرتے۔ کیا آپ اسے خوفناک تصور نہ کرتے۔ اور کیا آپ خوفزدہ نہ ہو جاتے؟"

"ہاں اگر حقیقت میں ایسا واقع ہوتا۔ اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا تو بیشک خوفزدہ ہو جاتا۔"

"اچھا تو یہ کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ یہ واقعہ حقیقت میں پیش آیا۔ مہیب اور دہشتناک واقعہ۔" اس کی آواز اس طرح خائف و لرزاں تھی جیسے سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ظہور میں آیا ہے۔

"لیکن میرے محترم جناب! آپ کے پاس ثبوت کے لئے صرف مسٹر باکسٹر کے الفاظ ہیں۔"

اس نے اپنی نظریں جن سے اعتماد و تیقن ہویدا تھا مجھ پر گاڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہ واقعہ ظہور میں آیا تھا۔ مجھے ایسا یقین ہے جیسا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی نہ ہو سکتا۔ سنئے چار دن تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ پانچ متواتر شامیں میرے خوفزدہ پیشرو نے اس انتظار میں گزاریں کہ حالات درست ہو جائینگے۔"

"لیکن وہ چلا کیوں نہ گیا۔ یعنی اس نے مکان کیوں نہ چھوڑ دیا۔"

"اُسے جرأت نہ ہوئی۔" میرے میزبان نے سرگوشی میں کہا۔ "ہاں اُسے جرأت نہ ہوئی اسے ٹھہر کر دیکھنا تھا کہ حالات ٹھیک ہوتے ہیں۔ یا نہیں؟"

"مگر حالات ٹھیک نہ ہوئے؟"

اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "چھٹی رات کو پانچواں سایہ جس نے اطاعت سے انکار کر دیا تھا۔ کہیں چلا گیا۔"

"چلا گیا ——؟"

"ہاں کھڑکی سے کہیں چلا گیا۔ میرا پیشرو دہشت کے عالم میں کھڑکی کے سادہ شیشے کی طرف تکتا رہا اور باقی چاروں اس کمرے کی طرف گھورتے رہے۔ وہ خالی شیشے سے نظریں ہٹا کر ان پر ڈالتا اور وہ خوفزدہ نگاہوں سے اسے گھورتے۔ یا کسی چیز کو جو اس کے عقب میں تھی۔ تب اس کا گلا گھٹنے لگا۔ ہاں گلا گھٹنے لگا۔ (میرے میزبان نے یہ الفاظ ہانپتے ہوئے کہے جیسے اس

کا اپنا گلا گھٹ رہا ہو۔) کیونکہ اس کی گردن کسی کے ہاتھ میں تھی۔ جو سختی سے دبا کر اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔"

"کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہاتھ اس پانچویں عکس کے تھے؟" میں نے پوچھا اور میں انداز تمسخر سے مسکرا دیا ہوتا اگر وہ خوف جو اس غریب مخلوق پر طاری تھا۔ مجھ پر بھی مسلط نہ ہو جاتا۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور اپنے بھدّے بھاری ہاتھ پھیلا دیئے اور کہا۔ "وہ میرے ہی ہاتھ تھے۔"

حقیقت میں میں پہلی دفعہ خوفزدہ ہوا۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف تکتے رہے۔ وہ ابھی ہانپ رہے تھے اور اس کی آواز میں خرخراہٹ تھی۔ آخر اسے تسلی و تشفی دینے کی غرض سے میں نے انتہائی تحمل سے کہا۔" اچھا تو آپ ہی پانچواں سایہ تھے؟"

اس نے اپنے پائپ کی طرف اشارہ کیا جو میز پر پڑا تھا، اور ہانپتے ہوئے کہا۔ "ہاں، میں ہی پائپ پینے والا ہوں۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ میرے دل میں دروازے کی طرف بھاگنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی لیکن کسی اخلاقی تامل نے مجھے ٹھہرائے رکھا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس خوفناک واہمے کا شکار بنے رہنے کے لئے تنہا چھوڑ کر چل دینا غیر انسانی فعل ہوگا۔

چنانچہ اسے ہوش میں لانے کی مبہم امید اور اس کی زخمی روح کو آسائش پہنچانے کے خیال سے میں نے پوچھا "آپ نے مردہ جسم کو کیا کیا؟"

اس کی سانس رک گئی۔ چہرے کی حالت بدل گئی۔ اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو زور سے بند کرتے ہوئے اس نے تشنج کی حالت میں اپنا سینہ ٹھوکنا شروع کر دیا۔ اور کرب و اضطراب کے لہجے میں کہا۔ "یہ، ہاں، یہ ہے وہ جسم!"

سیلِ نور

از:۔ جناب لطیف قریشی

ذوقِ دیدار کا عنواں ہی نرالا دیکھا
یعنی ہر اشک میں طوفانِ تمنا دیکھا

داغِ دل، داغِ جگر، داغِ تمنا دیکھا
ایک آئینہ میں ہم کیا کہیں کیا کیا دیکھا

بیخودی بن گئی میرے لئے جنت بہ کنار
جس طرف آنکھ اُٹھائی ترا جلوہ دیکھا

انقلابات کی موجوں کے سوا کچھ بھی نہیں
خوب اے گردشِ دوراں ترا دریا دیکھا

برق تھی جلوہ تھا یا کوئی فریبِ جلوہ
میں نے دیکھا تو، مگر یاد نہیں کیا دیکھا

اور پھر عشق کی معراج کسے کہتے ہیں
اپنا ارماں ترے چہرے سے ہویدا دیکھا

اُن کی محفل میں جو پہنچے تو اجل بھی آئی
ہم نے تقدیر کا بن بن کے بگڑنا دیکھا

داغہائے غم و آلام کے مٹنے سے لطیف
خانۂ دل میں نہ پھر ہم نے اُجالا دیکھا

جامِ تضمین

خمسہ بر غزلِ غالبؔ

از حضرت شفق رضوی مینائی،

ہستیاں عالم کی اجزائے پریشاں ہوگئیں — بے نشاں کچھ ہوگئیں کچھ نقش بیجاں ہوگئیں
کچھ مٹیں کچھ سبزۂ گور غریباں ہوگئیں — "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں"

طالع بیدار کیا کہنا ہے راتیں اُس کی ہیں، — بخت جس کا سو گئے جاگ اٹھا ہے راتیں اسکی ہیں
خواب کا بھی کچھ عجب نقشا ہے راتیں اسکی ہیں — "نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں"

پیر کنعاں کا ستارہ مصر میں تھا جلوہ گر — منزلوں چشمِ پدر سے دور تھا نورِ نظر
چاہ نے فرزند کی آخر دکھایا یہ اثر، — "قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں"

سوچ رکھا تھا پہنچکر دونگا میں ان کا جواب — سامنا جب ہوگیا مُنہ سے نہ کچھ نکلا جواب
تھے کہاں الفاظ میرے پاس کیا دیتا جواب — "واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں"

مرحبا ناوک کے صدقے ناوک افگن کے نثار — ہے جوابِ سینۂ مجروح پہلوئے فگار
یہ نہیں کھُلتا جگر میں کیوں خلش ہے بار بار — "وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں"

صورتِ آرام ہر کُلفت میں دکھلاتا ہے رنج — جو ہوا مانوسِ غم کب اس کو تڑپاتا ہے رنج
صبر کی عادت سے بن کر عافیت آتا ہے رنج — "رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں"

دیکھئے کب تک رہے شغلِ شفق گریہ کناں — دیکھئے کیا گل کھلائے رنگِ چشمِ خونفشاں
دیکھئے دریائے اشکِ غم رہے کب تک رواں — "گریونہی روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں"

رحمان بابا

رحمان بابا حضرت اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں پشتو زبان کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا کلام جو پشتو زبان میں ہے آج تک سرحد میں زبان زدِ خلائق ہے۔ وہ خوشحال خاں کٹک کے ہمعصر تھے، چنانچہ انہوں نے ان کی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ رحمان بابا ایک جگہ خود بھی فخریہ انداز میں کہتے ہیں ؎

خوشحال خان! دولت خان م غلامان دی
زہ رحمان پہ پشتو ژبہ عالمگیر یم

یعنی خوشحال خاں و دولت خاں (جو اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے) میرے غلام ہیں کیونکہ میں پشتو زبان کا عالمگیر ہوں۔ پشاور کے قریب چند میل کے فاصلہ پر رحمان بابا کی قبر ہے۔ آپ کی چند غزلوں کے اشعار کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱)

اگر اپنا دل کسی سے لگانا چاہتے ہو تو عنقا کا شکار کرو۔
حباب کی کلاہ اپنے سر پر رکھو۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔
خضر کی شان سے اٹھو اور بقا کا پانی پیو۔
زمین سے قدم اٹھاؤ اور عیسیٰ کی طرح آسمان پر پہنچو۔
کسی ایسے استاد کے شاگرد بنو جس کے آنسو کیمیا ہوں۔
جو کچھ میں نے بیان کیا ہے۔ جب یہ حاصل ہو جائے۔
تو اے رحمان! پھر حسینوں سے وفا کی امید کرو۔

(۲)

آفریں! عاشقوں کی ہمت پر۔ جو عشق میں یکسانی اور یکجہتی اختیار کرتے ہیں۔
اور ان میں کسی وقت بھی کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ چاہے تمام دنیا ان کو ملامت کرے۔
وہ یار کے لئے اپنی جان سے گذر گیا۔ کون دنیا میں ایسی سخت مشقت کر سکتا ہے؟
کوئی اسکو ہزار نصیحتیں کرے مگر یہ کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے

ادبیاتِ پشتو

از جناب خان حبیب الرحمٰن خان کابلی

اگر یار تمام عمر آنکھوں کے سامنے رہے تو اس کے لئے یہ عرصہ ایک ساعت سے بھی کم ہے۔
اگر یار ایک گھڑی کے لئے بھی جدا ہو تو یہ گھڑی اس کے لئے قیامت کی گھڑی ہے۔
اپنے یار کی محبت میں اگر وہ دوزخ میں جلائے تو وہاں اسے جنت کا جلوہ نظر آئے۔
یار کا ملنا تلاش اور تدبیروں سے ممکن نہیں بلکہ یہ کام اس کی عنایت پر موقوف ہے۔
عاشق کے دل میں غیر نہیں ٹھہر سکتا جس طرح چلتے ہوئے مست دریا کے سامنے نجاست اور گندگی نہیں ٹھہر سکتی۔
اے رحمان! اگر خدا یار کے دل کو پتھر کر دے تو اس سے عاشق کی تمناؤں کا شیشہ پاش پاش ہو جائے۔

(۳)

میں تیرے در کی خاکساری میں ایسا خوش ہوں جیسے سردار اپنی سرداری میں خوش ہیں۔
عاشقی اور لوگوں کے لئے مشکل ہے مگر میرے لئے سہل۔ میں نے اسے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔
بیار کو ناخوش کہو مگر مجھے نہیں کیونکہ میں بیارِ محبت ہوں، اور اس لئے خوش ہوں۔
یہ آنسو تیری محبت میں آنکھوں سے جاری ہیں۔ اے یار! یار کی آنکھوں سے آنسو پونچھ!
رحمان کی آنکھوں کے آنسو نہیں رک سکتے۔ کیا کسی نے دریا کی روانی کو روکا ہے۔

(۴)

مجھے ہجر میں وصالِ یار کی لذت نصیب ہوئی کیونکہ میں زندان میں اپنے یوسف سے ملا۔
جو تعلق لفظ کو معنی سے اور معنی کو لفظ سے ہے۔ وہی کیم

یار کو میرے دل اور میری جان سے ہے۔

خبردار! عاشقی کو آسان کام مت سمجھو۔ اس میدان میں سر دھڑ کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ *

رحمان کا حال بغیر یار کے ایسا ہی ہے جیسا زندانیوں کا زندان میں۔

(۵)

اے ناصح! میرے یار کو اپنانے کی کوشش نہ کر۔ میں نے اسے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔

مجھے اس زندگی پر افسوس ہے جو یار کے بغیر غفلت میں گذری۔

مجھ سے اپنے یار کا درد ہرگز جدا نہ ہوگا خواہ میرا سر ہی تن سے جدا ہو جائے۔

اے خدا! یہ وصال میں جدائی کیسی کہ میں پاس ادب سے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

اے یار! تیری درگاہ کے خاک نشین کہتے ہیں کہ تیری درگاہ جنت ہے۔ اس میں رنج و الم کا دخل نہیں ہے۔

جتنا میں تیرے در کی خاک نشینی سے خوش ہوں۔ بادشاہوں کو تخت پر بیٹھنے سے اتنی خوشی نہ ہوگی۔

اے رحمان! میں دولت عشق کے مقابلہ میں دنیا کی دولتوں سے بے پروا ہوں!

(۶)

حجاب تو غیروں سے مناسب ہے۔ یار سے حجاب کے کیا معنی؟

تمھارے مقابلہ میں جس قدر حسین ہیں ان میں تمھارا حسن انتخاب ہے جیسے آفتاب کے سامنے گل شرمندہ ہے۔ اسی طرح آفتاب تمھارے رخ روشن کے آگے ہیچ ہے۔

اے رحمان! میں یار کو کیا جواب دوں؟ کیا کبھی مردے بھی زندوں کو جواب دے سکتے ہیں۔

(۷)

اگر تمام دنیا کے غموں کا بار مجھ پر ڈال دیا جائے تو اس کا اٹھانا میرے لئے آسان اور سہل ہے بشرطیکہ میرا یار میرا یار ہو۔

ان کا شمار ہرگز عاشقوں میں نہیں جو سینہ کے داغوں کو شمار کیا کرتے ہیں۔

تم میرے یار کے ہمرنگ پھول تلاش کرتے ہو مگر ایسے پھول گلزار میں کہاں؟

---

(۸)

یہ زندگی ہوا کے سامنے غبار ہے اور آگ کے سامنے سوکھی گھاس۔

اے غافل! اسے کیا دیکھتا ہے۔ یہ خواب ہے جو نہ دیکھنے کا ہے نہ سننے کا!

جو لوگ خدا کی معرفت سے بیخبر ہیں وہ اگر بیدار بھی ہیں تو بھی سوئے ہوئے ہیں!

رحمان کے دل کی خبر صرف خدا کو ہے خدا جانے غم یار کے سوا اس کے دل میں کیا ہے؟

(۹)

اگر اپنے یار کے عاشق صادق ہو تو دین کو دنیا پر مقدم کرو۔

دلبروں کی جھوٹی وفا اور دھوکے سے بچو — یہ قوم متکبر اور بے وفا ہے۔

حسینوں کا فرقہ اتنا شوخ و شنگ ہے کہ کسی کی داد و فریاد نہیں سنتا۔

یہ اس قدر متکبر اور ناز و نخرے والے ہیں کہ تمھاری تو کیا اولیا کی باتوں پر بھی عمل نہیں کرتے۔

یہ دین و دل کو ایک نگاہ میں اڑا لے جاتے ہیں۔ کچھ خوف اور حیا نہیں کرتے۔

اگر یار کو چاہتے ہو تو حوروں کی تمنا چھوڑ دو۔

(۱۰)

اُسے اپنے یار کی کیا فکر؟ جو ہر جائی ہے۔ اور جس کے ہر جگہ ہزاروں یار ہیں۔

سچا عاشق وہی ہے جس نے دوسروں کی محبت سے توبہ کی ہے۔

زندگی کا مزہ ہے تو وصال یار ہی سے ہے۔ وہ زندگی جو اس کے بغیر ہے کس کام کی؟

اگر عاشق اپنے محبوب کے ہاتھوں آگ میں پڑ جائے تو یہ آگ بھی عاشقوں کے لئے گلزار ہے۔

اس کو سچا عاشق ہرگز نہ سمجھنا چاہئے جس کو اپنے سر اور دستار فضیلت کی فکر ہو۔

محبت میں آزار نہیں۔ خدا نہ کرے کہ تیری محبت کیلئے میرا دل تکلیف میں ہو۔

جس طرح مجنوں لیلیٰ کی محبت میں رسوا ہوا ہے۔ اس طرح اے رحمان! میں اپنے یار کے لئے مجنوں ہوں۔

(۱۱)

میں نے تمہارے دامن میں اپنے دل کو ڈال دیا۔
اب یہ میرا نہیں تمہارا ہے چاہے اچھا ہے یا بُرا۔
میں نے اپنے غرور اور سرکشی کو فراموش کر دیا۔
تمہارے قد و قامت کو دیکھ کر میرا دل محوِ حیرت رہے۔
اگر تیرے بغیر "گلستاں" میں "سیرِ گل" کرتا ہوں۔
تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ گلستاں نہیں زندان ہے۔
جب میں تیرا عاشق نہ تھا تو مجھے کون جانتا تھا؟
تیری محبت نے سارے جہاں میں مجھے رسوا کر دیا۔
مجنوں جیسے بہت سے عاشق گزرے ہیں۔
مگر مجنوں کے بعد میرے سوا کس کا نام و نشان باقی ہے؟
کون سے کیڑے سے پروانہ بڑا ہے؟ کہ اس کا افسانہ مشہور ہے
مگر عشق نے پروانہ کو سب سے نمایاں کر دیا۔
اگر دانا ہو تو سب کو اپنے جیسا سمجھو۔
کیونکہ اے عبدالرحمان! دنیا میں سبھی "عبدِ رحمان" ہیں۔

(۱۲)

لوگوں کی نظر میں عاشق بظاہر آدمی معلوم ہوتا ہے۔
لیکن حقیقت میں وہ "سگ درِ جاناں" ہے۔
جو اپنے آپکو "سگ درِ جاناں" سمجھتا ہے۔
میری نظر میں وہی فی الحقیقت آدمی ہے۔
مجھے میرا خدا غمِ یار سے نجات نہ دے۔
کیونکہ مملکتِ عشق کی ہولناک بربادی اسی کے دم سے ہے۔
میں غمِ یار میں اگر زرد رو ہوں تو خوش ہوں۔
کیونکہ میری یہ خزاں "خزاں" نہیں بلکہ بہار ہے۔
تم جو مجھے درِ یار سے جدا کرنے کی کوشش کرتے ہو۔
دنیا میں کوئی ایسا عاشق ہے جو اسے گوارا کرے گا؟
مجھے اس کی محبت نے اپنا شیدا بنا لیا ہے۔

اب اگر کوئی کہے کہ "میں ہوں" تو میں نہیں بلکہ وہی وہ ہے۔
میں وحشی اور مجنوں جنگلوں میں پھرتا تھا۔
وہ زلفوں کی زنجیروں میں جکڑ کر اور مجھے شکار کر کے شہر میں لایا۔
اہلِ زر "زرّیں جام" میں پانی پیتے ہیں۔
مگر اس سے غریب کا "جامِ سفال" اچھا ہے۔
اور نگزیب کو تختِ دہلی پر ناز ہے۔
میرے لئے اور ہر شخص کے لئے اپنا گھر ہی دہلی ہے۔
جو اپنے گھر سے جدا ہوتا ہے وہ مسافر ہی کہلاتا ہے۔
کسی کو اس سے کیا مطلب کہ وہ آزاد ہے یا غلام!
جس کے دل میں جذبۂ عشق موجزن ہے۔
وہ اگر صد سالہ پیر بھی ہے تو جوان ہے۔
میں رحمان اپنے یار کی جفا پر خوش ہوں۔
اس کی وفا اور جفا دونوں مجھے مرغوب ہیں۔

(۱۳)

ایک ایک داغ ہر انسان کے سینہ پر ہے۔
چاہے وہ بادشاہ ہو یا گدائے بے نوا۔
دنیا کے چشمہ پر سیرابی کہاں؟
ہر شخص اس پر تشنہ لب کھڑا محوِ فغاں ہے۔
دنیا کی راحتیں غم کھانے سے حاصل نہیں ہوتیں۔
بخیل کے گھر کی تھوڑی سی خیرات مصیبت ہے۔
اس پر دنیا کے آرام کیوں نہ حرام ہوں۔
جو دنیا کے کاروبار میں آلودہ ہے۔
مجنوں کا حال کیا پوچھتے ہو؟
ایسا زمانہ آیا ہے کہ گھر گھر لیلیٰ مجنوں ہیں۔
عشق نے ایسا افسوں پھونکا ہے۔
کہ عاشق کی سرگیں آنکھیں بینائی سے محروم ہیں۔

بھول جا

شوق طلب کہاں رہا راہ جو تجھکو مل گئی — منزلِ عشقِ یار میں خود کو گنوا کے بھول جا
مسلک حسن و عشق میں ہے یہی عین بندگی — سنگ درِ حبیب پر سر کو جھکا کے بھول جا
انکی طرف سے التفات تجھ ہو تجھکو واسطہ — تو انھیں ایکبار اور اپنا بنا کے بھول جا

جناب سعید ار جلیل شیرکوٹی بی۔ اے

روح کی تقریر

میں کبھی نہ مرتی

خاوند نے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا ہائے میں اکیلا رہ گیا۔ میری محبت کرنے والی بیوی کا انتقال ہو گیا اسکے ساتھ ہی تصور نے مرحوم بیوی کا مجسمہ سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ غور سے اس خوبصورت مجسمہ کو دیکھنے لگا۔

یکایک مجسمہ میں حرکت ہوئی۔ اس نے خاوند کی طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

میرے مالک!

اب کیا ہوتا ہے۔ نہ روئیے۔ آپ کے رونے سے میری روح بےچین ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو کچھ دن پہلے اپنی اس آنے والی بےچینی اور تنہائی کا یقین ہو جاتا تو سچ جانئیے میں کبھی نہ مرتی۔ لیکن اب آپ بھی مجبور ہیں اور میں بھی۔ کیا آپ کو وہ وقت یاد نہیں رہا۔ جب میں کچھ بیمار تھی اور دن بدن بیماری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن آپ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ آخر کار بیماری بڑھ گئی اور میرا دنیا سے علیحدہ ہونا ضروری ہو گیا۔

میں بےزبان تھی۔ حیا نے میری قوتِ گویائی پر مہر لگا رکھی تھی۔ میں کیسے کہتی کہ مجھے سیلان الرحم کی بیماری ہے۔ شریف تھی۔ اور شریف کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ میری زبان پر اس حیا سوز بیماری کا ذکر اس دنیا میں کیسے آتا لوگ مجھے بےشرم کہہ دیتے۔ آپ خود مجھے بےغیرت اور بےحیا سمجھتے۔

خاوند کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

روح نے کہا:۔

میرے سرتاج! آپکی یہ تنہائی آپکو یاد دلائیگی۔ کہ آپ نے ایک بےزبان کی صحت اور زندگی کا کچھ خیال نہ کیا۔ حالانکہ مختلف ذرائع سے آپ سمجھ چکے ہے کہ مجھے سفید رطوبت جاری رہنے کی بیماری ہو گئی ہے۔ اور آپ کو یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ اس بیماری سے تندرست کرنے کیلئے دوا "روک" کی ایک شیشی مجھے کافی ہو جاتی لیکن افسوس ہے کہ آپ نے تین روپے کا لالچ کر کے ایک بےزبان کو زندہ درگور کر دیا۔ مجھے معلوم ہے اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ کہ ہندوستان کی ہزاروں عورتوں نے میرے سامنے روک سے حیرت انگیز فائدہ حاصل کیا اور سفید زردی مائل رطوبت کا آنا بند ہو گیا۔

اب کیا ہوتا ہے پیارے۔۔۔ اگر یہ ٹھوکر آپکو سمجھدار کر دیگی۔ تو مجھے اپنی بیوقت موت کی قیمت مل جائیگی۔ اور میں سمجھونگی کہ میں نے اپنی زندگی فروخت کر کے اپنے دل و جان کے واحد مالک کی آنکھیں کھولدیں۔ اور انہیں دنیا میں خوش رہنے کے قابل کر دیا۔ اتنا کہہ کر روح چلنے لگی۔۔۔

خاوند آگے بڑھا اور اس نے لپک کر روح کو آغوش میں لے لیا۔ لیکن یہ اس کی نظر کی غلطی تھی۔ دالان کا سفید و چمکدار ستون اسکی آغوش میں آ گیا۔ حیرت و استعجاب میں اس نے چاروں طرف دیکھا تو قریب ہی اسکو ایک پرچہ پڑا ہوا ملا۔ جس پر حسبِ ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی:۔۔۔

عورتوں کو سفید پانی کی بیماری

عورت کو سفید پانی کی بیماری بھی بہت خطرناک ہوتی ہے اس بیماری کو سیلان الرحم اور لیکوریا بھی کہتے ہیں۔ اس مرض میں مبتلا ہونیوالی عورت کے خفیہ بدن سے وقت بیوقت سفید بدبودار پانی یا رطوبت نکلتی رہتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے اس عورت کی جوانی کا خاتمہ کر ڈالتی ہے۔ اسکی کمر، ناف نلوں اور پیٹ میں بلکہ تمام بدن میں درد ہونے لگتا ہے ماہواری بھی خراب ہو جاتی ہے یہ مرض بہت خطرناک ہے عورتوں کو اس سے غفلت نہ کرنی چاہیئے۔

سفید پانی کو روکنے کی ترکیب نئے زمانہ کی تحقیقات سے اب پوری طرح ثابت ہو چکا ہے کہ اس سفید پانی کی بیماری کو ختم کرنیکی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے۔ کہ ایسی بیمار عورت کو صرف ایک شیشی دوا "روک" استعمال کرا دی جائے۔ اس دوا کے استعمال سے ٹھیک تیسرے دن رطوبت کا نکلنا بند ہو جاتا ہے اور پوری شیشی استعمال کرنے سے سفید پانی کی بیماری بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ ہزاروں حکیم ڈاکٹر اب اس دوا کو اپنے مریضوں پر استعمال کر کے نیک نامی حاصل کر رہے ہیں۔ جس کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر "روک" کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لے۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپے ہے۔ محصولڈاک ساتھ آنے کُل ۔۔۔ ایک شیشی ایک عورت کو تندرست کرنے کیلئے کافی ہوتی ہے۔

اسپین کا سیّد

تاریخی ڈراما

از جناب قاضی امداد انصاری (علیگ)

افراد :- **سیّد :-** جنرل روڈرج بیوار (سپہ سالار افواج ہسپانیہ)
فاطمہ :- ایک دس سالہ خوبصورت عرب لڑکی،
فاطمہ کی ماں اور اس کا بھائی،
تاریخ داں نقیب 'سنتری' اور فوج قزاد وغیرہ

زمانہ :- آج سے ایک ہزار برس قبل،
مقام :- ہسپانیہ کا ایک شہر زامورہ،

منظر اوّل — میدان جنگ

اسپین کے شہر زمورہ میں خونریزی و غارتگری ہو رہی ہے، فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں ایک طرف عرب اور دوسری طرف ہسپانوی خیمہ زن ہیں۔ سپہ سالار اوڈرج بیوار کے خیمہ سے فتح و نصرت کے شادیانے بجنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ہسپانوی جھنڈا لہرا رہا ہے خیمہ میں جنرل بیوار کے سامنے ایک عرب ہسپانوی تاریخ داں کھڑا ہے اور شہر زامورہ کی تاریخی اہمیت بیان کر رہا ہے۔

جنرل بیوار۔ معزز تاریخ داں! کیا آپ شہر زامورہ کی مفصل تاریخ بیان کرکے میری معلومات میں اضافہ کرینگے ؟

تاریخ داں۔ جی حضور! جو کچھ مجھے معلوم ہے صحیح صحیح پیش کرتا ہوں،

جنرل۔ فرمائیے۔

تاریخ داں۔ حضور والا! یہ دنیا کا منحوس ترین شہر ہے۔ اس کے دامن میں ہمیشہ خاک و خون کی ہولی کھیلی گئی ہے۔ ہر زمانہ اور ہر عہد میں انسان کی باہمی آویزش و خونریزی کا سب سے بڑا مرکز یہی شہر رہا ہے۔ ہزاروں بار اس کی فضا لاشوں کی بدبو سے متعفن ہوئی ہے۔ تقریباً بیس مرتبہ عربوں نے اس پر قبضہ کیا اور پھر اسے کھو بیٹھے۔ یہاں کی منہدم عمارتیں اور آتش و آہن کی مسمار نشانیاں اب بھی اس کے ویران قلعوں اور آثار قدیمہ میں سے جھانک جھانک کر اس کی تباہی و بربادی کا المناک افسانہ دہرا رہی ہیں۔ سنہ ۷۱۸ء میں ہسپانوی طاقت نے عربوں کی فتح کو شکست سے بدل دیا لیکن سنہ ۸۱۳ء میں عرب پھر اس پر قابض ہوگئے۔ غرض سنہ ۹۸۶ء تک کئی مرتبہ اس پر عرب قابض ہوئے اور انجام کار سنہ ۱۰۶۱ء میں فرڈیننڈ اول نے اس کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور اپنی حسین و محبوب بیٹی ڈونیا کو تحفتہً پیش کیا۔

جنرل۔ اور اس وقت سے آج تک یہ ہمارے قبضہ سے باہر رہا۔

تاریخ داں۔ جی حضور! میں عرض تو کر رہا ہوں جب فرڈیننڈ کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے نے جو آج کل تخت نشین ہیں اور جن کے آپ ایلچی ہیں کئی مرتبہ اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہا لیکن گزشتہ چار صدیوں کے میل جول اور یکجا قیام سے عربوں اور ہسپانوی باشندوں میں تعلقات اتنے گہرے ہوگئے کہ مذہب و ملت کا امتیاز مٹ گیا۔ لیکن اس شہر کی لوح قسمت پر ہی شاید کشت و خون لکھا ہے۔ اس دوران میں بھی خوب حملے ہوتے رہے لیکن عربی اور ہسپانوی رعایا نے ہمیشہ مل جل کر بچاؤ کیا۔

جنرل۔ اچھا، تو کیا تم سمجھتے ہو شہزادی ڈونیا زیادہ عرصے تک قلعہ کی حفاظت کرسکے گی۔ اور ہمیں شہر میں داخل ہونے سے روک سکے گی ؟

تاریخ داں۔ حضور! اس کے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کی

فوجیں شہر میں داخل ہو چکی ہیں۔ کشت و خون ہو رہا ہے۔ شہر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ غریبوں پر ظلم ہو رہا ہے اور مدافعتی اور حملہ آور فوجوں میں آخری لڑائی ہو رہی ہے۔ آپ کے خیموں میں فتح و نصرت کے شادیانے بجنے شروع ہو گئے ہیں۔ کوئی لمحہ جاتا ہے جب آپ کے بادشاہ کی بہن آپ کے قدموں میں گرفتار کر کے لائی جانے والی ہے اور شہر زامورہ کی تاریخ ایک اور خونیں ورق پلٹ دیگی۔

جنرل بیوار۔ معزز تاریخ داں۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم شہزادی کی شان میں گستاخی کر کے بادشاہ کے حکم سے حملے کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ ہرگز نہیں، ہم تو ان کو بھی اپنی مالکہ تصور کرتے ہیں صرف ان کی فوجوں کو شکست دے کر اور مجبور کر کے ہم عملاً شہر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخ داں۔ حضور بلاشبہ انسانی شرافت اور خسروانہ شجاعت کا بہترین نمونہ ہیں۔

منظر دوم

(شہر زامورہ کا ایک عالیشان مکان)

ایک تنگ گلی میں ایک بڑی حویلی ہے جو اپنی بلندی اور ظاہری شان و شوکت سے اپنے مکین کی اولوالعزمی کا پتہ دیتی ہے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ یہ مکان اس وقت کچھ ویران سا معلوم ہوتا ہے اس کے اندر صرف تین آدمی ہیں۔ رات کی تاریکی ہے جہاں شہر کی فصیل اور خندق کے اردگرد خون کی سرخ چھینٹیں اڑ رہی ہیں وہاں اس مکان میں کچھ کانا پھوسی بھی ہو رہی ہے اور اضطراب و پریشانی کے آثار ظاہر ہیں مکان سے کراہنے کی آواز برابر آ رہی ہے۔

فاطمہ۔ امی آخر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ ننھا بھی بھوک سے بےچین ہو رہا ہے۔

ماں۔ بیٹی! میں خود بھوک سے بیتاب ہوں۔ کاش میں کچھ روز اور تم دونوں کی پرورش کر سکتی۔ میرا آخری وقت قریب آ پہنچا ہے۔ اللہ پاک تم دونوں کو سلامت رکھے۔ مجھے فاقہ کی تکلیف چنداں بھاری نہ تھی مگر اس بیماری سے مجبور ہوں۔ کل سے میں برابر تمہارے دادا اور والد کو خواب میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ خواب سچے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مجھے بلاتے ہیں، تم کو خبر بھی نہیں ہے کہ میں چار روز سے کچھ نہ کچھ مانگ جانچ کر جس طرح بھی ہو سکا تم دونوں کو کھلاتی رہی۔ اب دو روز سے میری حالت خراب ہے تو تم بیچارے بھی پیٹ سے پتھر باندھ کر پڑ جاتے ہو جیسی خدا کی مرضی۔ کم از کم ننھے کو بہلا کر خاموش کر دو اور اسے تسلی دینے کے لئے چولھے میں آگ جلا دو اور دیگچی میں پانی ابال لو۔

فاطمہ۔ مگر امی گھر میں پانی بھی کہاں ہے؟ میں تو کل سے پیاسی ہوں۔

ماں۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) اچھا بیٹا! جیسی خدا کی مرضی۔ سنو، میں تم کو آخری وقت ایک نصیحت کرتی ہوں۔ اور تم میری نصیحت کو گرہ باندھ کر رکھنا۔ اگرچہ تمہاری عمر کم ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تم اپنے باپ کے فرض کو پورا کر دوگی۔ تم میں ایک عرب کا خون ہے۔

فاطمہ۔ امی کیا بات ہے۔ صاف صاف بتاؤ۔

ماں۔ میری بچی! میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ سنو، تم ایک زبردست خاندان کی نشانی ہو۔ تمہارے باپ دادا عرب کے ممتاز ترین شرفا میں سے تھے۔ تمہارے بزرگ اعلیٰ محمد بن عبداللہ جب جنگ کے لئے باہر نکلتے تو ان کے ہمراہ کم سے کم تیس بیٹے پوتے اور چودہ پندرہ عورتیں ہوتی تھیں تاکہ زخمیوں کی فوری مرہم پٹی کر سکیں۔ آخرکار تمہارے والد اور دادا، اور خاندان کے تمام افراد مختلف جنگوں اور مدافعتی معرکوں میں کام آئے اور عورتیں دوسروں کے نکاح میں آ گئیں۔ کیونکہ وہ سب یہیں کی رہنے والی تھیں تمہارے والد کو اپنے وطن عرب سے بڑی محبت تھی۔ انہوں نے یہاں شادی کرنا پسند نہ کی۔ اور عرب ہی میں سلسلہ ازدواج قائم کیا تاکہ اصلی عربی خون سے شجاعت اور عالی ہمتی کے اثرات کم نہ ہو جائیں۔ ہمارے والدین کسی حالت میں کسی ہسپانوی عرب کو لڑکی دینا پسند نہ کرتے تھے لیکن چند ایسی شرائط پر وہ تیار ہو گئے جن کا دارومدار تمہاری رگ احساس سے متعلق ہے۔ وہ شرائط یہ تھیں کہ تمہارے والد کی وفات کے بعد میں کسی ہسپانوی عرب سے شادی نہ کروں اور میری اولاد کا ازدواجی سلسلہ عربی قبائل میں منسلک کیا جائے۔ اس کے علاوہ میری موت کے بعد میرا جسم ہسپانیہ کی عیسائیت آلود سرزمین کے سپرد نہ کیا جائے بلکہ یہیں میری ماں کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ تمہارے والد اپنے اور اپنی عزیز

کو ایک فرض سمجھتے تھے اور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ خدا نہ کرے اگر تم میرے سامنے مر گئیں تو میں سب سے پہلے اس فرض کو ادا کرونگا۔ ورنہ اپنی اولاد کو اس کی وصیت کر جاؤں گا اب ننھا چونکہ ناسمجھ ہے اور تم ماشاءاللہ سمجھدار ہو اس لئے تم اپنی والد کی وصیت کے پورا کرنے میں اپنی کم عمری اور کم بضاعتی کی پرواہ نہ کرنا۔ تمہارے والد اچانک جنگ میں اس دنیا کو چھوڑ گئے ورنہ وہ تم کو اچھی طرح سمجھاتے۔ اب میری بھی آخری تمنا یہی ہے اور تم سے امید ہے کہ تم اسے پورا کرنے میں کوئی دریغ نہ کروگی۔

(فاطمہ بیٹھی بیٹھی سوچ رہی ہے کہ کیا کرے اس کے دماغ میں سیکڑوں طرح کے خیالات آرہے ہیں۔ کبھی سوچتی ہے کہ جس طرح بھی ہوسکے اپنی بیمار ماں اور فاقہ زدہ بھائی کے کھانے کے لئے کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کرے کبھی خیال کرتی شہر میں مار دھاڑ ہو رہی ہے کس طرح باہر نکلوں اور کھانے پینے کی چیزیں کہاں ملیں گی۔ اور کبھی کچھ سوچتی۔ آخر اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔)

فاطمہ — امی تم تھوڑی دیر اور انتظار کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔

ماں — بیٹا ایسی خونریز فضا میں تم کہاں جاؤگی؟

فاطمہ — امی تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی آئی۔

منظر سوم

(جنرل بیوار کی خیمہ گاہ)

(رات کا وقت ہے۔ سیاہی پھیلی ہوئی ہے۔ شہر سے باہر ہسپانیوں کے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ سنتری ٹہل رہے ہیں۔ دور شہر سے چیخ پکار اور تلواروں کی جھنکار مسلسل سنائی دے رہی ہے۔ مشعلوں کے شعلے اژدہا کی زبانوں کی طرح لپک رہے ہیں اور لڑائی کا ڈھنگ صبح تک فیصلہ کن سا نظر آرہا ہے۔ سنتری کے نپے تلے قدموں کی آواز سے ایک خاص قسم کی متناسب اور منظم آواز نکل رہی ہے۔ یکایک ایک سایہ حرکت کرتا ہوا سیاہی میں سے برآمد ہوتا ہے۔ سپاہی تن کر کھڑا ہوجاتا ہے اور اپنا نیزہ مضبوطی سے سنبھال لیتا ہے۔ سایہ برابر بڑھتا چلا آرہا ہے اور سپاہی کے اس قدر نزدیک آجاتا ہے۔ کہ ایک انسانی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ حتیٰ کہ سپاہی کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عرب لڑکی چلی آرہی ہے۔)

سپاہی — رُک جاؤ، تم کون ہو؟

لڑکی — میں بڑی مشکل سے بچتی بچاتی شہر پناہ سے باہر آئی ہوں۔ میرا نام فاطمہ ہے۔ مجھے اس محاصرہ والی فوج کے سردار سے ملنا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔

سپاہی — اچھا، تم ٹھہرو میں سردار کو اطلاع کرتا ہوں۔

(سپاہی خیمہ میں جاتا ہے اور جنرل سے کہتا ہے) حضور ایک لڑکی جو آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے شہر سے آئی ہے۔

جنرل — آنے دو۔

سپاہی — (باہر آکر) اے لڑکی! تو اندر جاسکتی ہے۔ سردار تجھے شرف باریابی بخشتے ہیں۔

(فاطمہ خیمہ کے اندر داخل ہوتی ہے۔ سردار بیوار جس کی شکل پر داڑھی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ تھوڑی دیر تک لڑکی کو غور سے دیکھتا رہتا ہے، پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور فاطمہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے اور خود بھی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

جنرل — کہئے آپ کیا چاہتی ہیں اور آپ کون ہیں؟

فاطمہ — میرا نام فاطمہ ہے اور میں امیر عبداللہ مرحوم کے خاندان سے ہوں۔ جس میں اس وقت بدقسمتی سے صرف میں اور میری چالیس سالہ بیمار ماں اور چھ سالہ فاقہ زدہ بھائی باقی ہیں۔ ہم ہسپانوی افراتفری سے تنگ آچکے ہیں میں چاہتی ہوں مع اپنی ماں اور بھائی کے شہر سے باہر چلی جاؤں آپ کو معلوم ہے ہم اس وقت لاچار ننگے، بھوکے اور بیمار ہیں۔ لیکن میں آپ سے بھیک مانگنے نہیں آئی۔ کیونکہ میرے اندر ایک عرب کا خون ہے۔ بہت ممکن ہے میری بھوک کی تلوار ایک آدھ کو مار کر میرا خاتمہ کرادے ورنہ ویسے بھی ہم لوگ چند ساعت کے مہمان ہیں۔ بھوکوں مرجائینگے، میں آپ سے کھانا یا کپڑا طلب نہیں کرتی۔ کیونکہ دست سوال دراز کرنے سے مرنا بہتر ہے۔ آپ میری کم عمری پر نہ جائیے۔ بلکہ اس خون کو دیکھئے جو میری رگوں میں جاری ہے۔ میں آپ سے جو کچھ مانگتی ہوں کسی عنایت یا احسان کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر مانگتی ہوں۔

جنرل — لیکن آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ میں قانون کے اندر رہ کر حتی الامکان تمہاری امداد کرونگا۔

فاطمہ — سردار میری درخواست یہ ہے کہ آپ مجھے ایک گھوڑا دیدیں

تاکہ اس منحوس شہر زامورہ کی گندی، گھناؤنی اور پرآشوب فضا سے بچا کر میں اپنی ماں اور بھائی کو کہیں دور لے جاؤں اس کے علاوہ اپنی فوج کو ہدایت کر دیجئے کہ وہ ہمارے رستہ میں مزاحم نہ ہوں۔ میں آپ کی اس عنایت کے عوض آپ کو ایک نایاب زمرد کا ٹکڑا پیش کرتی ہوں جو ہمارے خاندان کی ثروت کی آخری نشانی ہے۔

جنرل۔ (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) لاؤ وہ زمرد مجھے دو تمہاری درخواست منظور ہے۔ کل تم لوگ بحفاظت یہاں سے چلے جاؤگے۔

فاطمہ۔ (اپنی مٹھی کھول کر زمرد کا ٹکڑا سردار کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) یہ لیجئے۔ اپنے گھوڑے کی قیمت۔ ایک عرب بھی ایک ہسپانوی اور ایک مسلمان کبھی کسی عیسائی کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کرتا۔ (جاتی ہے)

منظر چہارم

(شہر زامورہ کی حدود سے پار)

(رات کا وقت ہے۔ فاطمہ کی ماں اور بھائی دونوں گھوڑے پر سوار ہیں۔ فاطمہ خود پیدل چل رہی ہے اور تین ہسپانوی سوار اُن کی حفاظت کے لئے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ہسپانوی فوج کے خیموں سے باہر نکل کر تینوں سوار یکدم رک جاتے ہیں اور ان میں سے ایک کہتا ہے)

سوار۔ اے لڑکی! تو نے ایک گھوڑا خرید کر اپنی ماں اور بھائی کو سوار کر دیا اور خود پیدل چل رہی ہے۔ اب تم لوگ خطرے سے باہر نکل آئے ہو اس لئے ہم رخصت ہونا چاہتے ہیں اور تم سے ایک درخواست کرتے ہیں۔ امید ہے کہ تم منظور کر لو گی۔

فاطمہ۔ بولو —!

سوار۔ (چہرے سے نقاب اٹھا کر مسکراتے ہوئے اور زمرد کا ٹکڑا فاطمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے) لو اسے اپنے پاس رکھو یہ تمہارے خاندان کی مقدس یادگار ہے۔ کیونکہ جب عرب لوگ مجھے "سید" کے لقب سے یاد کرتے ہیں تو یہ ان کی ذاتی شرافت اور سرداری کا اعلان ہوتا ہے۔ اور وہ بھی سید اور سردار ہیں اس لئے مجھے بھی ان کی عزیز یادگار اور مقدس نشانی کا احترام کرنا چاہئے۔ اور میرے خیال میں ایک عیسائی سید کے پاس اس کا رہنا بے حرمتی ہے یہ ایک مسلمان سید کے مقدس ہاتھوں میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔

فاطمہ۔ (حیرت سے سردار کی طرف دیکھتے ہوئے) کیونکہ بجائے محافظ سپاہی کے وہ تو خود جنرل روڈریگ بیوار تھا جس سے فاطمہ ملی تھی۔ اور جو ہسپانوی افواج کا افسر اعلیٰ تھا۔ احسانمندی اور معترفانہ انداز سے جنرل کی طرف دیکھتے ہوئے فاطمہ کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ جنرل کے ہاتھ سے زمرد لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں) اے سردار واقعی تجھے سید کا لقب غلط نہیں دیا گیا — تو اسی کا مستحق ہے۔

جنرل۔ بیٹی! یہ تمہارا خیال ہے۔ میں اب تم سے ایک اور درخواست بطور باپ کے کرتا ہوں اور وہ یہ کہ میرا نفس مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں نے کس طرح گوارا کر لیا کہ ایک معصوم بچی پیدل چلے اور میں گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں تک آؤں۔ اگرچہ یہ گھوڑا اسی ارادے سے آیا تھا، لیکن میں ہسپانوی حدود میں اس راز کو فاش نہ کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ ہسپانوی سپاہی مجھے پہچان کر اپنے فرض کی ادائگی میں کوتاہی نہ کریں۔ اور میں تم لوگوں کی مدافعت سے محروم رہ جاؤں۔ خواہ اس وقت مجھے اپنی جان کی بھی پروا ہو۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا موقع ہی نہ آیا اور ہم صحیح وسلامت خطرہ سے باہر نکل آئے۔ اب تم اس گھوڑے کو اپنے لئے قبول کر لو۔ اس پر تمہارے لئے ایک ماہ کا زادِ راہ بھی ہے جو میں تم کو بطور اپنی بیٹی کے پیش کرتا ہوں۔

فاطمہ۔ (آگے بڑھ کر سردار کے ہاتھ چومتے ہوئے) سردار! آپ کا ایک سوار پیدل جائے گا۔

جنرل۔ نہیں بیٹی! دونوں سوار گھوڑوں پر جائیں گے۔ جس سردار نے تمہیں یہاں تک پیدل چلایا ہے وہ پیدل ہی جائیگا۔

فاطمہ۔ سید —!

آخری منظر

(لق ودق میدان)

سردار پیدل اور سپاہی گھوڑوں پر شہر کی جانب واپس جاتے ہیں جہاں آگ اور خون کی بارش ہو رہی ہے اور فاطمہ کا مختصر قافلہ گھوڑوں پر سوار ریگستان کی ایک لمبی سڑک پر عرب کی جانب چلا جاتا ہے۔ فاطمہ دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور دور ہوتے ہوتے محض ایک سیاہ نشان سا نظر آنے لگتا ہے جو تھوڑی دیر بعد اُفق کی سیاہی میں تحلیل ہو جاتا ہے

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے) (عربی سے)

تاج محل

نظم

از:- حضرت دعا ڈبائوی

مرمریں تیری عمارت ہے مجھے پروا نہیں — تجھکو حاصل اوج و رفعت ہے مجھے پروا نہیں
پُر جواہر بیش قیمت ہے مجھے پروا نہیں — روکش گلزار جنت ہے مجھے پروا نہیں
ہاں مگر اے تاج تیری ہمسری دشوار ہے
تو زمانے میں محبت کا علمبردار ہے

درس پیغام وفا تو نے زمانہ کو دیا — تیرے ہر ذرّہ سے روشن نام حسن و عشق کا
جذبۂ ایثار کا ہر نقش دیتا ہے پتا — اہل الفت ہی سمجھ سکتے ہیں تیرا مرتبا
دست قدرت نے نئی صورت نئے اعجاز سے
عشق کی تصویر کو کھینچا ہے اس انداز سے

رشک کے قابل تری تقدیر اے ممتاز ہے — سب کی نظروں میں تری توقیر اے ممتاز ہے
نیک نیت کی یہ سب تاثیر اے ممتاز ہے — قبر تیری عشق کی تصویر اے ممتاز ہے
جذبۂ صدق و وفا بیکار جا سکتا نہیں
نام تیرا حشر تک عالم مٹا سکتا نہیں

سنگ مرمر کی عمارات اور بھی ہیں چار سو — ان کی یہ عزت ہے دنیا میں نہ اتنی آبرو
تاج تو بے مثل ہے واللہ لاثانی ہے تو — اہل دل تو نام بھی لیتے نہیں ہیں بے وضو
حُسن و الفت کے یہ منظر ہر جگہ کمیاب ہیں
وہ محبت کرنے والے تجھ میں محو خواب ہیں

جذبۂ ایثار پوشیدہ رہے ممکن نہیں — خواہ بالائے فلک ہو خواہ بالائے زمیں
طالب و مطلوب کا رشتہ کبھی مٹتا ہے کہیں — جس کو شک ہو دیکھ لے وہ تاج کے نقش و نگیں
اِس طرف شاہِ جہاں ہے اُس طرف ممتاز ہے
حُسن کی جادوگری ہے عشق کا اعجاز ہے

ری جووین کورس متعلق کے ڈاکٹروں ویدوں اور اطبا کی رائیں!

اکسیری دواخانہ کی بڑی زبردست تحقیقاتی ایجاد کی تمام ہندوستان میں دھوم مچ گئی

کمزور مردوں پر احسانِ عظیم

ڈاکٹر محمد عظیم صاحب ایل۔ ایم۔ ایس۔ لاہور: آپ نے ری جووین کورس ایجاد کر کے ملک و قوم کی دعائیں لی ہیں اب تک اس قسم کی دوائیں ناکام رہی تھیں۔ مگر اس ایجاد کی کامیابی دیکھ کر مبارکباد دیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے مریضوں کو ری جووین کورس کا ہی مشورہ دیا کروں گا۔

ڈاکٹر شنکر داس۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ملتان: ری جووین کورس جس کے متعلق میں عرصہ سے سن رہا تھا کہ نامرد مریضوں کے لئے ویدک و یونانی کی اکسیری ایجاد ہے آخر تجربہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اور میں نے اسکو چند مریضوں پر استعمال کرا کے کامیابی دیکھی۔ واقعی اس ایجاد پر آپکو فخر کرنا چاہیئے

سوامی ہرداس وید اچاریہ (سورت): دیش میں ویسے تو بڑے بڑے کشتہ جات (بھسم) جیون کی (نربلتا) کمزوری کو دور کرنے کے ایجاد ہیں مگر کسی کے متعلق یقین نہیں کیا جا سکا کہ فائدہ کرے۔ آج مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے فلاسفی (اوکھدی) دوا تیار کر کے جاتی کے نربلتا کے روگیوں کو دوا رتیجم دیا ہے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ آپکی اس اوشدھی کا پرچار کرنے میں بہت وشواس ہو گیا ہے اسکے ورجن ری جووین کورس میرے پتہ پر بھیجنے کی کرپا کریں۔

گیانی پرتاپ سنگھ ویدبھوشن: کہتے ہیں کہ ہزاروں برس پہلے لوگ ایسی اوشدھیوں (دواؤں) کو جانتے تھے جن سے لوگ دوبارہ جوانی کو پا لیتے تھے مگر اس کے بعد کوشش تو سب نے ہی کی مگر کامیابی کسی منش (انسان) کو نہ ہو سکی۔ ایشور آپ پر کرپا کریں کہ آپنے بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ کمزوری سستی کے مریضوں کو میں آپ کی ایجاد کے سیون (استعمال) کرنے کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

پروفیسر پرونسا نند (سندھ): ری جووین بہت بڑی ایجاد ہے جس کے متعلق میرے دوستوں نے بتایا کہ اس زمانہ کا یا کلپ ہے اور اس سے بے شک تازہ کمزور انسانوں کو ہوتے ہیں میں اپنے دوستوں کو اس ایجاد کے استعمال کی سفارش کر رہا ہوں۔ ایسی ایجاد کی نسبت جتنی شہرت ہو کم ہے۔

مولوی محمد نور الاسلام صاحب (ہزاری باغ): حق بات کو چھپانا گناہ ہے اس لئے میں اس بات کو ظاہر کرنے میں بیباکی سے کام لے رہا ہوں کہ ری جووین کورس کی ایجاد صرف اس لیئے ہی نہیں ہے کہ لوگ عیاشی یا بدمعاشی کے لئے استعمال کریں بلکہ اس دوا سے دماغی کمزوری جسمانی کمزوری اور بہ تقاضائے عمر کمزوری کو دور کر کے انسان بہت خوش اور تندرست ہو کر زندگی بسر کرتا ہے ایسی ایجاد کی تعریف نہ کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔

ری جووین کورس دنیا کی عجیب ایجاد ہے۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ

پتہ:- اکسیری دواخانہ کلاں محل۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۱ (اے۔ ایل) دہلی

اپنے شہر کے بڑے دوافروشوں سے بھی طلب کر سکتے ہیں

مارکو پولو

تیرہویں صدی کا ایک سیاح

از :- جناب محمد ہاشم،

عہد وسطیٰ میں اطالیہ کا شہر وینس بہت مشہور تھا۔ اس وقت وینس تجارت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ مشرق و مغرب کو تجارت سے یہی ملاتا تھا۔ یہاں کے تجارتی جہاز یونان، مصر اور فلسطین جایا کرتے تھے۔ مشرق کے تجارتی قافلے فلسطین میں تجارتی سامان لاتے اور یہاں سے کاروبار کیا کرتے۔ وینس کے سوداگر دور دراز جگہوں مثلاً شمالی یورپ سے بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ وینس کا ہر باشندہ تاجر تھا۔ وینس خود جنت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ خوبصورت گرجے، شاہی محلات اور مصنوعی آبشار اس کی زینت تھے۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ بازاروں میں چہل پہل ہوتی۔ جگہ جگہ خوشنما پارک اور دلفریب سیرگاہیں تھیں جن میں سپیر کو زرق برق خوشنما لباسوں میں ملبوس سیم تن دوشیزاؤں اور خوش پوش و خوش طبع نوجوانوں کا جمگھٹا لگا رہتا، اہل وینس بہادر، جری، شجاع و عالی ہمت تھے خصوصاً پولو نامی ایک خاندان تھا جس کے افراد جوشیلے تھے، عقل و تمیز اور عالی ہمتی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ اس خاندان کے افراد کو اطالیہ میں بیٹھے بیٹھے تجارت سے تشفی نہ ہوتی تھی اس لئے انھوں نے اپنے کاروبار کی ایک شاخ یونان میں قائم کر رکھی تھی۔ اسی جگہ سے دو شخصوں نے جن کے نام نیکولو پولو اور ما فیو پولو تھے مزید تجارت کے سلسلے میں وسط ایشیا کا سفر کیا۔ اسی دوران میں ان کی ملاقات چین کے تجارتی قافلے سے ہوئی۔ اس وقت ملک چین کا شہنشاہ قوبلا خاں تھا۔ اس بادشاہ کو دور دراز ملکوں کی خبریں اور وہاں کے باشندوں کے حالات سننے کا شوق تھا۔ چنانچہ اس قافلے کے لوگوں نے ان دونوں کو ترغیب دی کہ ان کے ہمراہ ملک چین کا سفر کریں۔ وہ ان کے ہمراہ گئے اور تین سال کے بعد واپس چلے آئے۔ لوٹتے وقت شہنشاہ چین نے کہا کہ اگر وہ دوبارہ آئیں تو اپنے ہمراہ اپنے ملک سے سو ایسے عالم و فاضل لائیں جو مختلف علوم و فنون میں طاق ہوں۔ سنہ ۱۲۷۱ء میں نیکولو اور ما فیو نے چین کا دوبارہ سفر کیا۔ لیکن ایک سو عالموں کی بجائے ان کے ہمراہ صرف ایک شخص کا اضافہ ہوا تھا جو نیکولو کا لڑکا مارکو تھا اور جس کی عمر اس وقت صرف پندرہ برس تھی۔ وینس سے عکہ تک جہاز کا سفر کیا اور وہاں سے خشکی کی راہ سے۔

چوبیس سال تک ان لوگوں کا کوئی پتہ نہیں پایا گیا۔ سنہ ۱۲۹۵ء میں ایک روز وینس میں تین مسافروں کو داخل ہوتے دیکھا گیا۔ جن کی صورت سے تھکان کے آثار ہویدا تھے۔ اور جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اور بالکل نحیف و نزار نظر آتے تھے۔ ان لوگوں نے کہا کہ وہ خاندان پولو میں سے ہیں۔ لوگوں نے یقین نہ کیا اور سرد مہری سے پیش آئے کیونکہ سب یہی سمجھ چکے تھے کہ نیکولو ما فیو۔ مارکو مر چکے ہیں۔ ان تینوں مسافروں نے شہر میں ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب تمام لوگ آ گئے تو ان کی متحیر نگاہوں کے سامنے ملک چین کے زر و جواہر، سونا چاندی اور دیگر بیش قیمت اور نادر چیزیں بکھیر دیں۔ مہمانوں کو اب پورا اعتبار آ گیا۔ چنانچہ انھوں نے ان کی بیحد عزت افزائی کی۔ لوگ ان کی زبان سے مشرق بعید کے عجائبات کی کہانیاں بہت شوق سے سنا کرتے تھے۔ خصوصاً نوجوان مارکو کو اپنی داستان سنانے میں خاص لطف حاصل ہوتا۔ کچھ دنوں تک مارکو وینس ہی میں مقیم رہا لیکن جلد ہی اسے وینس چھوڑنا پڑا اور اسے اس بحری جنگ میں شریک ہونا پڑا جو وینس اور جینوا کے درمیان چھڑ گئی تھی۔ گھمسان جنگ کے بعد اہل وینس کو شکست ہوئی۔ ان کے بہت سے جہاز ڈبو دیئے گئے اور بہترین ملاحوں کو گرفتار کر لیا گیا جن میں مارکو پولو بھی تھا۔ جینوا کے قید خانے میں مارکو پولو اپنے ہمراہیوں کو وقتاً فوقتاً اپنے سفر کی داستان سنایا کرتا جن میں ایک مشہور محرر رسٹی سیانو تھا جو اس کی داستان کو قلمبند کر لیا کرتا۔ ایک سال کے بعد مارکو پولو رہا کر دیا گیا اور وہ وینس واپس آ گیا۔ اب اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی شادی کے بعد کئی ایک لڑکے بھی ہوئے۔ آخر کار تقریباً سنہ ۱۳۲۴ء میں وینس ہی میں اس مشہور سیاح نے وفات پائی۔ اس کی کتاب نے جلد ہی عالمگیر شہرت حاصل کی اور مختلف زبانوں

میں اس کا ترجمہ ہو گیا۔ یہی وہ پہلا یورپین تھا جس نے وسط ایشیا ایشیا کی مسافرت اختیار کی۔ اور جس نے یورپ کو ملک چین جاپان جاوا اور سماٹرا کے ملکی حالات سے آگاہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ تقریباً چھ سو برس تک یورپی تاجروں اور مسافروں نے اس راستے کو اختیار کیا جس سے مارکو پولو گیا تھا۔

مارکو پولو کی کتاب میں اس مختصر سی جماعت کے سفر کا حال لکھا ہے جو صرف نیکولو، ماتیو اور مارکو پولو کی ذات پر مبنی تھی۔ اس جماعت نے عکہ سے خلیج فارس تک کا سفر خشکی سے کیا۔ یہاں سے بحری سفر جاری کرنے کا ارادہ کیا لیکن جہاز کی حالت دیکھ کر اس خیال کو ترک کر دیا، اس جہاز میں صرف ایک ہی مستول، ایک ہی بادبان اور ایک ہی پتوار تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ تختۂ جہاز ندارد۔ ایسے جہاز میں بحری سفر کو جاری رکھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے پھر خشکی کی راہ سے سفر اختیار کیا۔ سطح مرتفع ایران کو عبور کر کے کوہ ہندوکش پہنچے۔ یہاں ان لوگوں نے بے شمار درخت، ہری بھری گھاس اور چشمے دیکھے۔ پامیر پہنچ کر مارکو پولو نے ایک قسم کی بھیڑ دیکھی جس کے سینگ عجیب طرح کے تھے، سینگ کی لمبائی ۴½ فٹ اور نچلے حصہ کی گولائی ۱۴-۱ انچ تھی، اس بھیڑ کا نام ہی پولو کے نام سے "اووس پولی" پڑ گیا۔ اس شاداب جگہ کو چھوڑ کر بے آب و درخت صحرائے گوبی میں داخل ہوئے یہاں سے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ ہے۔ پولو لکھتا ہے کہ اگر کوئی مسافر اپنے قافلے سے جدا ہو کر پیچھے رہ جائے تو اُسے غول بیابانی کی آواز سنائی دیگی۔ جسے وہ اپنا ساتھی سمجھے گا اور اسی طرح مارا مارا پھرنے کے بعد بے آب و دانہ مر جائے گا۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ عموماً یہ غول بیابانی مسافروں کو نام لے کر پکارتا ہے۔ یا کبھی کبھی بھولے بھٹکے مسافروں کو اصلی راہ سے دور ایک اور قافلے کے جانے کی آواز سنائی دیگی اور یہ اسے اپنا قافلہ سمجھ کر اسی آواز کی طرف چل پڑتا ہے اور اسی طرح بھٹکتے بھٹکتے مر جاتا ہے۔ غرضکہ صحرائے گوبی کا سفر خالی از خطرہ نہیں۔ صحرائے گوبی کو عبور کر کے مارکو پولو اور اس کے ساتھی بخیر و خوبی چین پہنچے اور قوبلا خاں کے دربار میں حاضر ہوئے۔

مارکو پولو نے تین چار قسم کی چینی زبانیں سیکھیں۔ شہنشاہ چین نے اسے شاہی وفد کے ساتھ چین کے مختلف حصوں میں بھیجا۔ یہاں تک کہ وہ برما میں بھی آیا۔ مارکو پولو جہاں کہیں بھی جاتا لوگوں کے طرزِ معاشرت کا بنظر غائر مطالعہ کرتا۔ نئی نئی چیزوں کی تحقیق کرتا اور مختلف علوم و فنون کا معاینہ کرتا۔ یورپ میں اس نے "سمنڈر" کا حال سنا تھا۔ جو آگ میں زندہ رہ سکتا ہے۔ چین میں اس نے اس کی تحقیق کی۔ اس کے علاوہ چین کے جادوگروں اور نجومیوں کے حالات لکھے جو اپنے عمل اور جادو کے زور سے پیالوں کو ہوا میں اڑا سکتے تھے اور دریاؤں اور چشموں کو اُلٹا بہا سکتے تھے۔ اس نے ہندوستان کے جادو اور نظر بندیوں کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں ملک چین اور چینیوں کے حالات مفصل طور پر لکھے ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے خان کا دربار پر رونق اور شاندار تھا۔ خان کے پاس دس ہزار گھوڑے ایسے تھے جو سراپا سفید تھے۔ شاہی محلات کی دیواریں سونے چاندی کی تھیں جن پر خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ چین کی معاشرت و تجارت بہت ترقی یافتہ تھی۔ راجدھانی میں ریشم کی گاڑیوں کی گاڑیاں آیا کرتی تھیں اس کے علاوہ مارکو پولو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں چین کا سکہ کاغذی تھا غرضکہ ملک چین اس وقت تہذیب و تمدن کا گہوارہ، تجارت کا مرکز اور صنعت و حرفت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور وہاں دولت و ثروت کی کوئی کمی نہ تھی۔

چند سال کی خدمت کے بعد ان لوگوں کو دیس واپس آنے کا موقع دیا گیا۔ فارس سے ایک شاہی وفد آیا جس نے شہزادی چین کا رشتہ شاہ فارس کے لئے طلب کیا۔ ایک چینی شہزادی مارکو پولو، نیکولو اور ماتیو کی سرپرستی میں روانہ کی گئی۔ یہ سفر عرصہ دراز تک جاری رہا کیونکہ جگہ جگہ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہفتوں تک ٹھہرنا پڑتا۔ چین سے یہ قافلہ جاوا سماٹرا ہوتے ہوئے جزائر انڈمان اور وہاں سے سراندیپ پہنچا۔ سیلون یا لنکا میں اس نے پل کا دم پر حضرت آدم علیہ السلام کے یا ہندو اور بودھی عقاید کے مطابق بدھ یا مہادیو کے قدم کے نشانات دیکھے جنوبی ہند میں سنٹ ٹامس کے مقبرہ کی زیارت کی۔ بالآخر خلیج فارس پہنچا۔ نیکولو، ماتیو اور مارکو پولو دربار فارس میں پہنچے اور شاہ فارس اور شہزادی چین کی شادی کے بعد وطن روانہ ہو گئے۔

یہ ہے تیرھویں صدی کے سیاح اعظم مارکو پولو کے سفر کی مختصر کیفیت۔ مارکو پولو نے علم کی تلاش و جستجو اور عجیب و غریب ملکوں کی سیاحت کی وجہ سے ہزاروں میل کا خشکی اور تری کا سفر اختیار کیا اور اپنے سکونت پذیر ہموطنوں کو عجیب و غریب معلومات سے سرفراز کیا۔

ایفائے وعدہ

حیرت انگیز افسانہ

نوشتہ:۔ الگرنن بلیک وڈ

ترجمہ: جناب جمیل احمد کندھا پوری ایم اے

رات کے گیارہ بجے تھے اور نوجوان میریٹ اپنے کمرے میں بیٹھا پوری سرگرمی اور انہاک سے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا، وہ اڈنبرگ یونیورسٹی میں چوتھے سال کا طالب علم تھا۔ اور اس درجے کے امتحان میں وہ اتنی مرتبہ ناکام ہو چکا تھا کہ مایوس ہو کر آخر اس کے والدین کو صاف صاف کہدینا پڑا کہ اب وہ اسکی تعلیم کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

چونکہ کالج فیس پر بہت کافی روپے صرف ہو جاتے تھے اس لئے اس نے بہت ارزاں اور معمولی کمرے میں اقامت اختیار کی دوسرے تمام اخراجات میں کمی کر کے اب اس نے مصمم عزم کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ہو وہ امتحان پاس کر کے ہی دم لے گا۔ ورنہ اسی کوشش میں اپنی جان دے دیگا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے چند ہفتوں سے وہ اتنی سرگرمی سے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ اس سے پیشتر وہ اپنا وقت اور والدین کے روپے برباد کر چکا تھا۔ مگر اب وہ ان کی تلافی پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ اور نہ صرف اپنی صحت بلکہ گرد و پیش کی تمام دوسری دلچسپیوں سے بھی بے پروا ہو کر امتحان پاس کرنے کی انتھک کوشش میں مصروف تھا۔

یہاں کے طالب علموں میں اس کے صرف چند دوست اور ملاقاتی تھے اور ان چند احباب نے بھی اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ رات کے وقت اس کے مطالعہ میں ہرگز خلل انداز نہ ہوں گے چونکہ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اس مرتبہ وہ مستعدی اور شوق سے محنت کر رہا ہے۔ لہذا اس وقت نصف شب کے اس سناٹے میں دروازے کی گھنٹی کی آواز سن کر میریٹ کو بیحد حیرت ہوئی، سے تعجب ہوتا تھا کہ آخر اس وقت اس سے ملنے کے لئے کون سکتا ہے۔ بعض آدمی ممکن ہے گھنٹی کی آواز بے پروائی سے سنتے ہی اسی انہاک سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ مگر میریٹ اس قسم دمی نہ تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اگر وہ یہ پتہ نہ لگاتا کہ ملاقاتی کون ہے اور کیا چاہتا ہے تو شاید تمام رات اسے الجھن سی رہتی اور اجنبی کا خیال تمام رات اسے بیحد پریشان کرتا رہتا۔ لہذا اس کے لئے اب بس ایک ہی صورت تھی کہ ملاقاتی کو اندر آنے دے اور جہاں تک جلد ممکن ہو اسے پھر باہر نکال دے۔

گھر کی مالکہ پابندی کے ساتھ ٹھیک دس بجے سو جایا کرتی تھی اور اس کے بعد وہ کسی قیمت پر بھی اُٹھ کر خود گھر کا دروازہ نہ کھول سکتی تھی۔ لہذا میریٹ کے لئے سوا اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ کتاب بند کر کے خود ہی جا کر دروازہ کھولے اور ملاقاتی کو یہاں لے آئے۔

اتنی رات گئے رات کے اس پہر شہر اڈنبرگ کی سڑکیں بہت خاموش اور سنسان ہو چکی تھیں۔ خصوصاً اس سڑک کے آس پاس جس پر میریٹ تیسری منزل میں رہا کرتا تھا شاید ہی کوئی آواز سکوت شب کو درہم برہم کر رہی تھی۔ ابھی وہ فرش سے گزر ہی رہا تھا کہ گھنٹی پھر ایک بار بجی۔ اور غیر ضروری شور کے ساتھ۔ میریٹ کی طبیعت خلل انداز کی اس بدتمیزی کے باعث سخت پریشان تھی۔

"سب کے سب جانتے ہیں میں امتحان کی تیاری میں مصروف ہوں۔ پھر ایسے ناموزوں وقت میں خواہ مخواہ لوگ مجھے کیوں ناحق پریشان کرتے ہیں؟"

میریٹ کتاب ہاتھ میں لئے دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا، اس امید کے ساتھ کہ ملاقاتی اب آن واحد میں اس کی نظروں کے سامنے آجائے گا۔ اجنبی کے بوٹوں کی آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ مگر وہ خود نظر نہ آتا تھا۔ میریٹ کو حیرت تھی کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس کے دل میں خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ ملاقاتی اس کی نظروں کے سامنے آئے اور وہ اسے چند تلخ کھری کھری باتیں سنا دے مگر ملاقاتی نظر نہ آیا۔ پراسرار قدموں کی آواز اسے اپنے پاس ہی سے بلند ہوتی سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اس پر بھی کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس وقت دفعتہً خوف کا ایک عجیب سا احساس اس کی

رگوں میں دوڑ گیا۔ نقاہت اور کپکپی کی ایک لہر سی اس کے سارے جسم میں رینگ گئی۔ مگر یہ لہر اسی تیزی سے ختم ہو گئی جس تیزی سے یہ شروع ہوئی تھی۔ اور اب وہ اپنے دل میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اپنے غیر مرئی ملاقاتی کو زور سے آواز دے کر پکارے یا کواڑ بند کر کے پھر مطالعہ میں مصروف ہو جائے کہ یکایک ایک شخص اُسے کنارے سے آتا ہوا دکھائی دیا اور آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

یہ ایک اجنبی تھا —— میریٹ نے دیکھا' اس کے سامنے ایک پست قد نوجوان' جس کا سینہ کشادہ ہے کھڑا ہے۔ اس کا رنگ بالکل سفید اور کھریا مٹی جیسا نکھرا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بہت درخشاں تھیں اور ان کے نیچے گہرے نشان تھے۔ اگرچہ اس کے رخسار اور ڈاڑھی منڈی ہوئی نہ تھی اور بال اُلجھے ہوئے تھے لیکن وہ شریف معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کی پوشاک وغیرہ بہت اچھی تھی۔ مگر سب سے تعجب خیز بات یہ تھی کہ نہ اس کے سر پہ ہیٹ تھی اور نہ ہاتھوں میں —— اور اگرچہ اس دن شام ہی سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی لیکن اس کے ساتھ اوورکوٹ یا چھتری نہ تھی۔

اس وقت اجنبی کو اس حالت میں دیکھ کر ہزاروں سوال میریٹ کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کے لبوں پر آ آ کر رک گئے۔ جن میں سے بیشتر اس قسم کے تھے —— "تم کون ہو؟ —— کس غرض سے یہاں آئے ہو؟ . . . !" مگر ابھی وہ اس قسم کے سوالات کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ دفعتہً اجنبی نے اپنے سر کو کچھ اس طرح اوپر اٹھایا کہ گیس کی روشنی ایک نئے زاویہ سے اس کے چہرے پر پڑی اور بجلی کی سی تیزی سے میریٹ نے اجنبی کو پہچان لیا۔

"کون —— تم ہو فیلڈ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

کئی سال پیشتر وہ دونوں ایک پرائیویٹ سکول میں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اور اگرچہ اس کے بعد ایک مرتبہ بھی یہ ایک دوسرے سے نہیں ملے لیکن چونکہ فیلڈ کا گاؤں قریب ہی تھا اور اس کے بعض رشتہ داروں سے میریٹ کی جان پہچان ہو گئی تھی اس لیے اکثر اسے اپنے دوست کی خیریت معلوم ہو جایا کرتی تھی۔ اور نہایت تفصیل کے ساتھ۔ اسکول سے نکلنے کے بعد فیلڈ اوباش مزاج سا ہو گیا تھا۔ میریٹ کو یہ تمام باتیں یاد تھیں کہ اس نے صرف شرابخواری ہی نہیں بلکہ کئی عورتوں سے ناجائز تعلقات بھی قائم کر لئے تھے۔ اور نشہ آور اشیا کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔

"آؤ آؤ! اندر آؤ!" —— میریٹ نے مسکراتے ہوئے کہا —— غصہ کے تمام آثار اس وقت اس کے چہرے سے مٹ گئے تھے۔ "شاید تم کسی پریشانی یا اُلجھن میں ہو۔ اندر چل کر مجھے تمام واقعات اطمینان سے سناؤ۔ ممکن ہے میں تمہارے کچھ ——"

اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے' زندگی کا تاریک پہلو اور اس کی ہیبت ناکیاں اس دنیا سے تعلق رکھتی تھیں جو اس کی اپنی کتابوں کی چھوٹی سی محدود دنیا سے بہت دور تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے پہلو میں آخر ایک انسان کا دل تھا۔

اس نے فیلڈ کو اندر بلایا اور بیرونی دروازہ احتیاط سے بند کر کے آہستہ آہستہ اپنے دوست کے ساتھ اندر جانے لگا۔ مگر اس نے دیکھا کہ فیلڈ کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے اور بظاہر وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال معلوم ہوتا تھا۔ میریٹ کے اندر ممکن ہے امتحان پاس کرنے کی صلاحیت نہ ہو' مگر کم سے کم بھوک اور فاقہ زدگی کی علامتیں وہ پہچانتا تھا —— ہاں' شدید بھوک کی علامتیں' جو اس کی صورت سے صاف عیاں ہو رہی تھیں۔

"آؤ آؤ" اس نے بشاش لہجے میں کہا۔ اور اس کی آواز میں سچی ہمدردی کا لہجہ تھا۔ "مجھے اس وقت تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں ابھی کھانا کھانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا اور تم ٹھیک وقت پر میرا ساتھ دینے کے لئے پہنچ گئے۔"

فیلڈ نے منہ سے کوئی جواب نہ دیا۔ اور کچھ اس طرح پاؤں گھسیٹتا ہوا چلا کہ اسے سہارا دینے کے لئے میریٹ کو اس کا بازو تھام لینا پڑا۔ اس وقت اس نے پہلی مرتبہ غور کیا کہ کپڑے اس کے جسم پر بالکل ڈھیلے ہیں۔ اور وہ اس قدر دبلا ہو گیا ہے جیسے ہڈیوں کا ڈھیر۔ اس کے بازو کو چھوتے ہی نقاہت اور خوف کا احساس میریٹ کی رگوں میں دوڑ گیا۔ یہ کیفیت صرف ایک لمحہ کے لئے رہی اور پھر ختم ہو گئی۔ اس نے سمجھا کہ یہ کیفیت ایک دیرینہ رفیق کو ایسی افسوسناک حالت میں دیکھنے کے صدمے اور تکلیف کے باعث ہوئی ہے۔

"مجھے آگے آگے چلنے دو۔ ہال میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے —— حد درجہ تاریکی۔ مجھے ہمیشہ اس کے متعلق شکایت کرنا پڑتی ہے۔" اس نے کہا۔ اپنے بازو پر کے وزن سے میریٹ نے یہ اندازہ کیا کہ فیلڈ کو رہبری کی شدید ترین ضرورت ہے۔ "گر وہ بوڑھی بلی صرف وعدہ کرتی ہے اور اسے وفا کرنا نہیں جانتی۔"

وہ اسے صوفہ تک لے گیا۔ اسے بعید حیرت ہو رہی تھی کہ یہ

شخص اس وقت کہاں سے آیا ہے اور اس کا پتہ اسے کس طرح معلوم ہوگیا ـ ان دنوں کے بیتے ہوئے جب وہ دونوں باہم ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھا کرتے تھے اور ایک دوسرے پر جان فدا کرنے کے لئے تیار رہتے۔ کم سے کم سات سال گزر چکے تھے۔

"اب اگر تم برا نہ مانو" اس نے کہا۔ "تو میں کھانے کا سامان کروں ہاں کچھ بولنے کی کوشش نہ کرو۔ بس صوفے پر اطمینان سے لیٹے رہو۔ میں دیکھتا ہوں تم تھک کر نڈھال ہوگئے ہو۔ اپنے حالات سے تم مجھے اطمینان سے مطلع کرنا اور ہم مناسب طریق کار پر غور کریں گے۔"

فیلڈ صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ میریٹ نے سوکھی روٹی، نرم کیک اور نارنگی کے مربہ کا ایک بڑا سا مرتبان نکالا جو آکسفورڈ کے طالب علم ہمیشہ اپنے نعمت خانے میں رکھا کرتے ہیں۔ نعمت خانے کے عقب سے اس نے دیکھا کہ فیلڈ کی آنکھیں بہت چمک رہی ہیں۔ اور میریٹ کے دل میں خیال ہوا کہ شاید یہ چمک نشہ آور اشیاء کے استعمال کی وجہ سے ہو۔ وہ اپنے دوست کو نظریں جما کر غور سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت بہت آزردہ اور پریشان تھا۔ اور ممکن ہے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے فیلڈ اپنے دل میں یہ سمجھنے لگے کہ وہ اسی وقت تمام اسباب دریافت کرنا چاہتا ہے۔

علاوہ ازیں وہ اس قدر تھکا ہوا اور نڈھال تھا کہ بمشکل کچھ بول سکتا تھا۔ لہٰذا اس لحاظ کے باعث اور ایک دوسری وجہ سے جس کی تشریح اس کے بس سے باہر تھی اس نے اپنے دوست کو جوں کا توں چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور خود کھانے کے انتظام میں مصروف ہوگیا۔ سپرٹ لیمپ کو اس نے کوکو تیار کرنے کے لئے روشن کیا اور جب پانی ابلنے لگا تو کھانے کی اشیاء کے ساتھ وہ میز کو صوفہ کے پاس گھسیٹ کر لے گیا تاکہ فیلڈ کو اٹھ کر کسی کرسی پر جانے کی زحمت بھی نہ اٹھانی پڑے۔

"اب ہمیں کھانا شروع کرنا چاہیئے" اس نے کہا۔ "اس کے بعد ہم پائپ پئیں گے اور باتیں کریں گے۔ تم جانتے ہو میرا امتحان بہت قریب ہے اور میں اس کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ تم مجھ سے ملنے کے لئے آگئے۔"

اس کے بعد میریٹ نے نگاہ اوپر اٹھائی اور دیکھا کہ اس کے دوست کی نظریں بھی اسی پر جمی ہوئی ہیں۔ نہ جانے کیوں اس وقت یک لخت غیر ارادی تھرتھری اس کے جسم میں سرتاپا دوڑ گئی۔ فیلڈ کا چہرہ موت کی طرح سفید تھا اور اس سے روح فرسا پریشانی اور دماغی اذیت کی کیفیت مترشح ہورہی تھی۔

"خدا کی قسم!" اس نے اچھلتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل بھول گیا میرے پاس یہاں تھوڑی سی شراب بھی ہے۔ اگرچہ میں خود ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا۔"

وہ نعمت خانے کے پاس گیا۔ اور ایک گلاس میں بوتل کی شراب انڈیل کر اپنے دوست کے سامنے بڑھا دی جسے وہ ایک ہی گھونٹ میں بغیر کچھ پانی ملائے پی گیا۔ اس کے شراب پیتے وقت میریٹ اسے بغور دیکھ رہا تھا ــــــ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری چیز بھی، فیلڈ کا کوٹ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور ایک شانے پر تھوڑا سا تار عنکبوت بھی لپٹا تھا۔ کوٹ بالکل خشک تھا، حالانکہ آج کی رات شام ہی سے بارش ہو رہی تھی۔ اور فیلڈ ٹوپ چھتری یا برساتی کے نہ ہونے کے باوجود بالکل صحیح و سالم تھا۔ اور یہی نہیں اس کے کپڑے غبار آلود تھے اور اس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی چھت کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ ان باتوں کا آخر مطلب کیا تھا؟ کیا وہ اسی عمارت کے کسی گوشہ میں چھپا بیٹھا تھا۔

یہ بات بظاہر بڑی حیرت انگیز تھی۔ میریٹ اپنے دل میں یہ مصمم عزم کر چکا تھا کہ جب تک وہ کھا پی اور سو کر تازہ دم نہ ہو جائے وہ کوئی سوال نہ کرے گا۔ غذا اور نیند بظاہر یہی دو چیزیں تھیں جن کی اس بیچارے کو سب سے زیادہ ضرورت تھی، اور جب تک وہ کسی قدر تازہ دم نہ ہولے اس کو پریشان کرنا قطعاً نامناسب تھا۔ اس وقت میریٹ کو یہ سوچ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کے اندر فوری تشخیص کی صلاحیت موجود تھی۔

دونوں نے کھانا شروع کیا۔ اور اس درمیان میں میریٹ اپنی طرف سے یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ اپنی ذات سے متعلق، کچھ آنے والے امتحان اور گھر کی مالکہ کے بارے میں اور مہمان کو ایک لفظ بھی کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ فیلڈ بالکل ساکت رہا۔ اس نے اپنی زبان کو زحمت گفتار نہ دی۔ ہاں! میریٹ خود تو یونہی صرف شغلاً کچھ نہ کچھ کھاتا رہا کیونکہ اُسے کچھ کھانے کی خواہش نہ تھی۔ مگر اس کے برعکس فیلڈ نہایت حریصانہ انداز میں کھا رہا تھا۔ ایک بھوکے آدمی کو اس طرح ٹھنڈے کیک، باسی بدمزہ جئی کی روٹی اور مربہ لگی ہوئی پاؤ روٹی حریصانہ انداز میں نگلتے ہوئے دیکھ کر اس ناتجربہ کار طالب علم کے لئے ایک حیرت انگیز انکشاف تھا جو اس

بات سے بے خبر تھا کہ دن بھر بھوکا رہنے کے بعد انسان کی کیا حالت ہو جایا کرتی ہے۔ وہ نہایت حیرت سے اس امر پر غور کر رہا تھا کہ یہ شخص اپنی رفتار میں کچھ کمی کیوں نہیں کر رہا ہے۔

لیکن فیلڈ جس قدر بھوکا تھا' اسی قدر خواب آلود بھی معلوم ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ سے زیادہ اس کا سر جھک گیا۔ اور اس نے غذا کو منہ میں دانتوں سے چبانا ترک کر دیا۔ میریٹ کو اپنا کھانا روک کر کئی مرتبہ اسے جھنجھوڑنا پڑا' ایک شدید تر جذبہ کمزور جذبے پر غلبہ پا لیتا ہے لیکن حقیقی بھوک کی اذیت اور شدید نیند کی کیفیت میں یہ کشمکش اس طالب علم کے لئے ایک انوکھا منظر تھا جو اس کیفیت کو خوف اور حیرت سے ملے ہوئے جذبات سے دیکھ رہا تھا۔ بھوکوں کو کھانا کھلانے اور انھیں کھاتے ہوئے دیکھنے میں جو مسرت ہوتی ہے اس کی بابت اس نے سنا تھا لیکن اس نے فی الواقع اس کیفیت کو بچشم خود کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اور اسے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ کیفیت ایسی ہوتی ہے۔ فیلڈ ایک جانور کی طرح حلق تک ٹھونس ٹھونس کر کھا رہا تھا۔

"مجھے خوف ہے شاید میں تمہارے سامنے کھانے کی بہت کم چیزیں پیش کر سکا۔ میرے دوست!" جب فیلڈ کھانے کی تمام چیزیں ختم کر چکا تو میریٹ نے کہا۔ مگر فیلڈ نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے اس پر تقریباً غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے صرف تشکر آمیز انداز میں اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔

"اب تمہیں فوراً بستر پر دراز ہو کر سو رہنا چاہیئے۔" میریٹ نے کہا۔ "ورنہ تم لڑھک کر نیچے آ گرو گے۔ مجھے تو اس منحوس امتحان کی وجہ سے تمام رات پڑھتے رہنا پڑے گا۔ تم نہایت اطمینان سے میرے بستر پر سو رہو۔ کل صبح ناشتے سے فارغ ہو کر ہم باتیں کریں گے اور آئندہ پروگرام پر غور کریں گے۔ تم تو جانتے ہی ہو مجھے لائحہ عمل بنانا خوب آتا ہے۔" میریٹ نے ہنستے ہوئے اپنا جملہ ختم کیا۔

فیلڈ نے اپنا پر اسرار سکوت برقرار رکھا اور میریٹ اُسے اپنے ساتھ خوابگاہ میں لے گیا اور کمرے کے چھوٹے ہونے کے لئے اس نے اس نیم گرسنہ نواب زادے سے جس کا اپنا مکان ایک محل جیسا تھا' معافی مانگی۔ مگر تھکے ہوئے پریشاں حال مہمان نے اس رسمی تکلف کا جواب شکریہ یا کسی دوسرے لفظ سے نہیں دیا۔ اپنے دوست کے بازو کے سہارے وہ لڑکھڑاتا ہوا کسی طرح خوابگاہ میں گیا۔ اور تمام کپڑے جوں کے توں پہنے ہوئے ہی دھڑام سے بستر پر دراز ہو گیا

اور ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ میریٹ نے دیکھا اسے گہری نیند آ گئی ہے۔

کئی منٹ تک میریٹ دروازے کے پاس کھڑا اپنے دوست کو بغور دیکھتا رہا اور اپنے دل میں دعا کرتا رہا کہ ایسی تکلیف دہ صورت حال میں وہ کبھی مبتلا نہ ہو۔ پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ کل صبح وہ اپنے عزیز دوست کی کس طرح خاطر کرے گا۔ مگر یہ باتیں وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکا۔ کیونکہ اسے اپنی کتابوں کا خیال آ گیا۔ اور خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے اس کے لئے امتحان میں کامیاب ہونا بہت ضروری تھا۔

پھر خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے وہ واپس آ گیا۔ اور پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ "میٹریا میڈیکا" کے اس حصے کا بغور مطالعہ کرنے لگا جس کو اطلاعی گھنٹی کی آواز سن کر اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کچھ دیر تک وہ کتاب پر اپنی توجہ مجتمع نہ کر سکا۔ رہ رہ کر اس کا خیال اس زرد رُو انوکھی آنکھ والے بھوکے اور گندے دوست کی جانب منعطف ہو جاتا جو اپنے تمام کپڑے اور بوٹ سمیت بستر پر دراز ہو کر سو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں سکول کے ان دنوں کا خیال رینگنے لگا جب بچھڑنے سے پیشتر وہ ایک ساتھ رہے تھے اور دائمی رفاقت کی قسم کھائی تھی۔ اور اب ــــ اب اس کی حالت کس قدر عجیب و غریب ہو گئی تھی۔

لیکن سکول کے دنوں میں ان دونوں نے باہم جو عہد کیا تھا اس کی یاد میریٹ کے دماغ سے شاید اس وقت بالکل محو ہو گئی تھی' اس وقت خواہ جس سبب سے بھی ہو اس عہد کی یاد اس کے ذہن کے پس منظر بن چکی تھی اور اس کی توجہ کسی طرح بھی اس طرف منعطف نہیں ہوتی تھی۔

نیم وا دروازے سے (خوابگاہ میں نشست گاہ ہی سے صرف ایک دروازہ جاتا تھا اور اس کے سوا دوسرا کوئی دروازہ نہ تھا) گہری لانبی سانس کی آواز آئی۔ ایک تھکے ہوئے آدمی کی باقاعدہ مسلسل سانس کی آواز ــــ ایسی کہ صرف اس کے سننے ہی سے میریٹ کے دل میں خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی کتاب بند کر کے سو رہے اور نیند سے لطف اندوز ہو۔

"اسے اس کی ضرورت تھی۔" میریٹ نے سوچا۔ "اور شاید ٹھیک وقت پر ہی اسے نیند آ گئی۔"

باہر تیز ہوا زور سے شور مچا رہی تھی اور بارش کی چھینٹیں

دریچے کے شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور ننھے ننھے قطرے سنسان سڑکوں پہ گرنے لگے۔ پیشتر ازیں کہ میریٹ پھر اطمینان سے جم کر اپنا مطالعہ شروع کرے اس نے بغل والے کمرے میں سوئے ہوئے شخص کی بھاری بھرکم سانس کی آواز صاف طور پر سنی۔

جب دو گھنٹے گزر گئے اور اس نے جماہی لیکر دوسری کتاب سامنے کھینچی۔ تو سانس لینے کی آواز اسے پھر سنائی دی اور وہ ادہر ادہر دیکھنے کے لئے پھر چپکے سے دروازے کے پاس گیا۔

پہلے شاید کمرے کی تاریکی نے ضرور اس کو دھوکہ دیا ہوگا۔ یا شاید اس کی آنکھیں اتنی دیر تک لیمپ کی روشنی میں پڑھتے رہنے کے باعث کچھ خیرہ ہو گئی تھیں کیونکہ وہ ایک منٹ تک فرنیچر کے تاریک ڈھیر اور دیوار سے لگے ہوئے ششدر مکے علاوہ کوئی چیز بھی نہ دیکھ سکا۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ اسے نظر آنے لگا۔ اور اس نے دیکھا کہ سوئے ہوئے شخص کا خاکہ بتدریج اندھیرے میں اس کے سامنے "تشکل" اختیار کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ سفید پلنگ پوش کے سامنے اس کا جسم صاف نظر آنے لگا۔

اس وقت وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ فیلڈ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا تھا۔ وہ ایک لمحہ تک وہ کھڑا اسے بغور دیکھتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آکر مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ بارش طوفان ہوا کے ساتھ ساتھ اس وقت بھی زور شور سے ہو رہی تھی، اور اس کی آواز سکوت شب کو ایک حد تک درہم برہم کر رہی تھی۔ سڑک پر آنے جانے والوں کا شور مطلق نہ تھا۔ کوئی کرایہ کی گاڑی بھی نہیں کھڑکھڑا رہی تھی اور دودھ والی گاڑیوں نے بھی ابھی آنا جانا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ بدستور اپنے مطالعہ میں مستغرق رہا۔ البتہ کبھی کبھی کتاب بدلنے یا اس زہریلی شے کو کھانے کے لئے جو رات کو بیدار رہنے میں اس کی معاونت کرتی تھی اور جس نے اس کے دماغ کو اس قدر سرگرم بنا دیا تھا' وہ رک جاتا تھا۔ اور ان موقعوں پر فیلڈ کے سانس لینے کی آواز اسے کمرے میں صاف طور پر سنائی دیتی تھی۔ باہر آندھی بدستور شور مچا رہی تھی مگر کمرے کے اندر ہر طرف سکوت حکمران تھا۔ لیمپ پوش سے ساری روشنی بے ترتیب میز پر پھیل گئی تھی۔ اور کمرے کا دوسرا کنارا انسبتاً کچھ تاریک سا رہ گیا تھا۔ خوابگاہ کا دروازہ ٹھیک اس جگہ کے سامنے تھا جہاں وہ بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

کوئی چیز بھی اس کے مطالعہ میں مخل انداز نہیں ہو رہی تھی۔ البتہ کبھی کبھی بارش کی بوچھاڑ دریچے سے ٹکراتی اور اس کے میں ہلکا سا ارتعاش ہوتا تھا۔

یہ درد جس کی توضیح و تشریح اس کے بس سے باہر تھی۔ د بار بہت ٹیس کے ساتھ اٹھا۔ اسے کچھ پریشانی سی ہوئی اور ا نے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ کب اور کس طرح یہ خراش اس ہاتھ پر پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی سعی بارآور نہ ہو سکی۔

بالآخر اس کی کتاب کے صفحے زرد سے خاکستری ہو گئے اذ سڑک پر سے گاڑیوں کی آمد رفت کی آواز آنے لگی۔ اس وقت چ بجے تھے۔ میریٹ نے پیچھے مڑکر بہت طویل جماہی لی۔ پھر اس پردے ہٹا دیئے۔ آندھی ختم گئی تھی۔ فضا کہر میں ملفوف تھی۔ ا نے ایک مرتبہ پھر جماہی لی اور ارادہ کیا کہ ناشتہ سے قبل بقیہ چا گھنٹے صوفے میں دراز ہو کر سو رہے۔ فیلڈ اب بھی برابر والے کمرے میں زور زور سے سانس لے رہا تھا اور سونے سے پیشتر وہ چپکے سے پھر دروازہ تک انگوٹھوں کے بل گیا۔ تاکہ ایک مرتبہ اپنے دوست کو دیکھ لے۔

نیم وا دروازے سے اس نے احتیاط سے جھانکا۔ اس کی نظر اس وقت سب سے پہلے بستر پر پڑی جو صبح کی زرد روشنی میں اس وقت صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے غور سے تاک کر دیکھا۔ پھر اپنی آنکھیں ملیں اور دروازے کے اندر قدم بڑھایا اس وقت پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ غور سے دیکھ رہا تھا مگر اس سے کوئی فرق رونما نہ ہو وہ ایک خالی کمرے کو تک رہا تھا۔

اس وقت خوف کی وہ لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی جو فیلڈ کو رات کے وقت سب سے پہلے دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی لیکن اس وقت یہ لہر زیادہ زور سے پیدا ہوئی۔ اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا بایاں بازو زور زور سے جنبش کر رہا ہے اور اس کو بہت درد پہنچا رہا ہے۔ کھڑا کھڑا وہ حیرت سے تمام چیزیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑی ہمت سے دل کو مضبوط کر کے وہ دروازے سے قدم بڑھا کر کمرے کے اندر داخل ہوا۔

بستر پر اس جگہ جسم کا ایک نقش تھا جہاں فیلڈ لیٹا اور سویا تھا۔ تکیہ پر سر کا نشان تھا اور پائنتی میں ذرا سا ونداتے دار خط تھا لیکن بستر پر سے نہ جانے کس طرح اس وقت بھی زور زور سے سانس

لینے کی آواز آ رہی تھی۔ چونکہ میریٹ اس وقت بالکل بستر کے قریب کھڑا تھا اس لئے یہ آواز اسے صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔

میریٹ نے اس وقت اپنے منتشر ہوش و حواس پر قابو پانے کی بے انتہا کوشش کی اور بڑی ہمت اور جسارت سے اس نے اپنے دوست کو نام لے کر پکارا ——!

"فیلڈ! میرے دوست، تم کدھر چھپ کر سوئے ہو؟"

مگر کوئی جواب سنائی نہ دیا۔ حالانکہ سانس لینے کی آواز —— مسلسل سنائی دے رہی تھی، اور یہ آواز سیدھی بستر سے پیدا ہو رہی تھی۔ میریٹ نے اب پھر آواز دیکر اپنے دوست کو پکارنے کی ضرورت نہ سمجھی لیکن وہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بستر اور تکیہ کا غور سے معاینہ کرنے لگا۔ پہلے اس نے گدے کو ہٹایا پھر تکیے بعد دیگرے غلاف اور چادریں ہٹائیں لیکن سانس کی آواز کے واضح طور پر سنائی دینے کے باوجود فیلڈ کا کہیں کوئی نشان نہ تھا۔ علاوہ ازیں اس چھوٹے سے کمرے میں کوئی ایسی جگہ بھی نہ تھی جہاں ایک انسان خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو چھپ کر بیٹھ سکے۔ پلنگ کو اس نے دیوار کے کنارے سے ہٹایا مگر آواز اسی جگہ قائم رہ گئی جہاں وہ پہلے سے جاری تھی۔ بستر کے ہلنے کے باوجود آواز اپنی جگہ سے نہ ہٹی۔

میریٹ کے لئے ایسی پریشان کن حالت میں اپنے پر قابو پانا بہت دشوار تھا۔ وہ فوراً کمرے کے چپہ چپہ کی تلاش پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے نعمت خانہ، ششدرہ اور کپڑے لٹکانے کی چھوٹی سی محراب نما غلام گردش تمام چیزوں کو بغور دیکھا، مگر کہیں کسی گوشہ میں بھی فیلڈ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ چھت کے پاس والا دریچہ بند تھا اور وہ اتنا کشادہ بھی نہ تھا کہ اس میں سے کوئی بلی بھی گزر سکے۔ فیلڈ کے مطالعہ کا کمرہ اندر سے بند تھا لہذا وہ اس طرف سے بھی بھاگ نہ سکتا تھا۔ میریٹ کے دماغ میں نہایت عجیب و غریب خیالات پیدا ہونے لگے اور نامبارک احساسات نے اس کے دل و دماغ کو پراگندہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے بستر کی تمام چیزوں کو ہٹا ہٹا کر دیکھا مگر بیکار۔ اپنے کمرے کے چپے چپے کا بھی اس نے دوبارہ، سہ بارہ جائزہ لیا۔ مگر اس کی سعی مشکور نہ ہوئی۔ اس کے جسم کے عضو عضو سے پسینہ نکلنے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں فرط خوف سے مفلوج سے ہو گئے۔ بایں ہمہ زور زور سے سانس کی آواز اس وقت تک اس گوشہ سے آنا بند نہ ہوئی جس میں فیلڈ رات کے وقت سویا ہوا تھا۔

اس کے بعد اس نے ایک دوسری ترکیب پر عمل کیا۔ اس نے پلنگ کو پھر اس کے پرانے مقام میں دھکیل دیا۔ اور خود اس پر لیٹ گیا بالکل اسی طرح جس طرح رات کے وقت اس پر اس کا دوست سویا تھا۔ مگر ابھی وہ لیٹا ہی تھا کہ آن واحد میں اس کو جست لگا کر اٹھ جانا پڑا۔ سانس کی آواز ٹھیک اس کے پاس ہی سے پیدا ہوئی، عین اس کے رخساروں کے پاس سے، اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس کے اور دیوار کے درمیان ہی سے نکل رہی تھی —— اس تنگ سی جگہ میں کوئی نومولود بچہ تک سکڑ سکڑا کر بھی نہیں سما سکتا تھا۔

وہ اب اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا اور کھڑکیاں کھول دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ہوا اور روشنی اندر آ سکے۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے اپنے صوفے پر بیٹھ کر تمام صورت حال پر چین اور سکون سے غور کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ جو لوگ زیادہ پڑھتے ہیں اور جنھیں سونے کا بہت کم موقع ملتا ہے وہ کبھی کبھی اس قسم کے فریب نظر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر اس نے رات کے ہر ہر واقعہ کو یاد کیا —— اپنے ٹھیک ٹھیک تاثرات۔ وہ جذبات جو فیلڈ کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اتنی باتیں کبھی اتنی دیر تک فریب نظر کے باعث قائم نہیں رہ سکتیں۔ اس کے بعد اس نے سنسنی اور ہیبت کی ان لہروں کو یاد کیا جو فیلڈ کو دیکھ کر پچھلی رات کئی مرتبہ اس کی رگوں میں دوڑ گئی تھی اور اس درد کے اسباب پر غور کرنے لگا جو رہ رہ کر اس کے بائیں بازو میں اٹھ رہا تھا۔ ان تمام باتوں کی تشریح و توضیح اس کے بس سے باہر تھی۔

علاوہ ازیں اس وقت تمام پچھلے واقعات کی تشریح کے سلسلہ میں ایک حقیقت بھی دفعتہً اس کی نظروں کے سامنے آ گئی۔ وہ یہ کہ جب تک فیلڈ اس کی نظروں کے سامنے رہا اس نے اپنی زبان کو زحمت گفتار نہ دی اور ابھی وہ اس حقیقت پر غور ہی کر رہا تھا کہ خوابگاہ سے سانس کی آواز کچھ اس طرح زور زور سے آنے لگی کہ جیسے یہ اس کے خیال کی ہنسی اڑا رہی تھی۔ مگر یہ تمام باتیں حد درجہ ناقابل یقین معلوم ہو رہی تھیں —— بالکل لغو اور مہمل!

اس دماغی الجھن اور جنون انگیز حالت سے نجات پانے کیلئے میریٹ ٹوپی اور برساتی پہن کر گھر سے چل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ کھلی فضا کی ہوا اس کے دماغی انتشار کو ایک حد تک دور کر دیگی۔ دلنواز پھولوں کی خوشبو اور صبح کا کیف آور سماں، یہ تمام چیزیں اس کے دماغ کو سکون بخش دینگی۔ دو گھنٹے تک وہ باہر سیر کرتا رہا اور جب اس کی طبیعت بالکل درست ہو گئی اور پچھلی رات کا خوف اس کے

دماغ سے کچھ بوسا ہو گیا اور اسے خوب بھوک محسوس ہونے لگی، تو پھر وہ واپس چلا آیا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ اس کے کمرے میں کوئی شخص دریچے سے لگا کھڑا ہے۔ اس کی پشت عقب کی جانب تھی۔ میریٹ نے اندر قدم رکھتے ہی فوراً پہچان لیا کہ یہ اس کا ہم جماعت گرین تھا جو اسی امتحان کی ان دنوں تیاری کر رہا تھا۔

"شاید تم تمام رات پڑھتے رہے ہو میریٹ!" اس شخص نے کہا "اس وقت میں تمہارے ناشتے کا کچھ حصہ کھانے کے لئے آیا ہوں۔ مگر تم آج اس قدر سویرے ہی سویرے کیوں باہر چلے گئے تھے۔؟" اس نے مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میریٹ نے بتایا کہ اس کے سر میں درد ہو گیا تھا اور اسی کو دور کرنے کے لئے وہ باہر نکل گیا تھا۔ گرین نے اپنے سر کو جنبش دی اور کہا۔ "آہ!" — لیکن جب خادمہ میز پر گرم گرم ربڑی جس سے بھاپ نکل رہی تھی، رکھ کر چلی گئی تو گرین نے کسی قدر زور دار لہجہ میں پوچھا — "کیا تم یہ نہیں جانتے تھے میریٹ کہ تمہارا کوئی دوست بھی پینے کا عادی ہے؟"

میریٹ نے خشک لہجہ میں جواب دیا کہ وہ اس بات سے باخبر نہ تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کسی حسینہ کو اس کمرے میں چھپا رکھا ہے جو اس وقت سو گئی ہے — کیوں، ٹھیک ہے نا؟" گرین نے خوابگاہ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اور اپنے دوست پر مستفسرانہ نظریں ڈالیں۔ دونوں چند سکنڈ تک غور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور اس کے بعد میریٹ نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو گویا تم بھی یہ آواز سن رہے ہو، خدا کا شکر ہے۔"

"ہاں، میں سن رہا ہوں، دروازہ کھلا ہوا ہے مگر مجھے افسوس ہے اگر تمہارا یہ مطلب تھا کہ —"

"اوہ! میرا یہ مطلب نہیں۔" میریٹ نے نرم لہجہ میں کہا۔ "مگر مجھے بیحد اطمینان ہو گیا۔ مجھے تمام واقعات بیان کرنے دو۔ اس میں شک نہیں کہ اگر تم بھی یہ آواز سن رہے ہو تو پھر سب کچھ ٹھیک ہے لیکن حقیقت یہ ہے، میں تو اس قدر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ تم باور نہیں کر سکتے۔ مجھے خیال ہو چلا تھا کہ مجھے سرسام ہو گیا ہے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور بات — مگر تم تو جانتے ہی ہو، ان باتوں کا اثر امتحان کی تیاری پر نہایت ناخوشگوار پڑتا ہے۔ اس کی ابتدا ہمیشہ آوازوں، خیالی صورتوں، یا کسی قسم کے خوفناک فریب نظر سے ہوتا ہے اور میں —"

"مہمل!" گرین بے صبری سے یکایک بول اٹھا۔ "کیسی مہمل باتیں کر رہے ہو —؟"

"میری باتیں مہمل نہیں گرین! —" میریٹ نے نہایت سکون و طمانیت کے ساتھ کہا کیونکہ سانس کی آواز اس وقت بھی صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ "تم قطع کلام نہ کرنا — میں تمام باتیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے وہ تمام باتیں بیان کیں جو پچھلی رات وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں اس نے ہر معمولی سے معمولی تفصیل کا بھی ذکر کیا۔ یہاں تک کہ اس درد کی بابت بھی کہا جو اس کے بائیں بازو میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور سب کچھ کہہ چکنے کے بعد وہ کرسی پر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"سانس کی آواز تو تمہیں صاف طور پر سنائی دے رہی ہے؟" اس نے گرین سے پوچھا۔

اور جب اس کے دوست نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے کہا۔ "اچھا میرے ساتھ آؤ! ہم دونوں مل کر کمرے کے ہر ہر گوشے کا جائزہ لیں گے۔"

"میں تو بہت دیر سے یہ آواز سن رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ شاید تم نے کسی دوشیزہ کو لا کر یہاں چھپا رکھا ہے۔"

میریٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر دروازے کو زور سے دھکا دے کر کھول دیا۔ کواڑ کے کھلتے ہی سانس کی آواز اور بھی صاف طور پر سنائی دینے لگی۔

"کوئی نہ کوئی ضرور یہاں چھپا بیٹھا ہے۔" گرین نے حیرت سے آواز کو سنتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہ کوئی ہے تو سہی مگر آخر کہاں؟" میریٹ نے کہا۔

اس کے بعد دونوں اس کمرے میں گئے اور بہت دیر تک نہایت غور سے ہر ہر چیز کو دیکھتے رہے۔ مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ بالآخر وہ برابر والے کمرے میں آ کر پائپ پینے لگے۔

گرین نے اپنے دوست سے بہت سے سوال کئے لیکن ان سوالات سے کوئی تشفی بخش حل دریافت نہ ہو سکا کیونکہ سوالات آخر حقیقتوں کو تو بدل نہیں سکتے۔

"اب جس چیز کی معقول اور قابل تسلیم تشریح چاہئے وہ میرے

بازو کا درد ہے" میرٹ نے گرین کو استفسارانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں آتا کہ کب اور کس طرح یہ خراش پیدا ہوگیا"

"مجھے اپنا بازو دکھاؤ تو" گرین نے ہنسکر کہا۔ "ہڈیوں کے علاج میں میں کافی مہارت رکھتا ہوں، یہ اور بات ہے کہ مستعنوں کا خیال اس کے برعکس ہے"

مذاق ہی مذاق میں میرٹ نے اپنا کوٹ اتار کر رکھ دیا اور بازو گرین کو دکھانے کے لئے اپنی قمیص کی آستین اوپر سمیٹ لی۔

"میرے خدا" میرٹ نے چونک کر کہا۔ "اس سے تو خون بہ رہا ہے۔ تم دیکھنا تو آخر ماجرا کیا ہے؟"

بازو پر کلائی کے قریب ہی ایک باریک سا سرخ نشان تھا۔ اس پر تازہ خون کا ایک ننھا سا قطرہ مچل رہا تھا۔ گرین آگے بڑھ کر قریب آیا اور کئی منٹ تک زخم کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر وہ حیرت واستعجاب سے اپنے دوست کے چہرے کو تکتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شاید تم نے نادانستہ طور پر اپنے بازو کو نچوڑ دیا ہے" اس نے فوراً کہا۔

میرٹ خاموش رہا۔ وہ کچھ اس طرح اپنے بازو کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے اس پورے راز کا حل درحقیقت اس کی کھال پر درج تھا۔

"آخر ماجرا کیا ہے؟ مجھے تو اس خراش میں کوئی انوکھی بات نظر نہیں آتی" شاید یہ تمھارے ہاتھ کے بٹن سے ہوگیا ہے۔ پچھلی رات تم نے جوش اور گھبراہٹ میں ——"

میرٹ کا چہرہ اس وقت خوف سے زرد ہوگیا تھا۔ اور پسینہ کے قطرے اس کی پیشانی سے ٹپکنا شروع ہوگئے تھے۔

"ذرا دیکھنا" میرٹ نے کسی قدر لرزتی ہوئی آواز میں کہا "تم یہ سرخ نشان دیکھ رہے ہو؟"

گرین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ دیکھ رہا ہے اور میرٹ نے اس جگہ کو رومال سے بالکل صاف کرکے گرین سے زخم کو پھر بغور دیکھنے کی درخواست کی۔

"ہاں، میں نے دیکھا" کچھ دیر تک بغور معاینہ کے بعد اس نے اپنا سر بلند کرکے کہا "یہ ایک پرانا داغ جیسا معلوم ہوتا ہے"

"ہاں! یہ ایک پرانا داغ ہے" میرٹ نے سرگوشیوں میں کہا اس کے لب کپکپا رہے تھے "اب یہ تمام قصہ میری سمجھ میں آگیا"

"کون سا قصہ؟" گرین نے اپنی کرسی پر مضطربانہ کروٹ لیکر کہا۔

"ذرا خاموش رہو۔ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں" اس نے کہا "فیلڈ نے ہی یہ داغ میرے بازو پر چھوڑ دیا تھا"

کامل ساٹھ سکنڈ تک دونوں ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے رہے۔

"فیلڈ نے یہ داغ بنایا تھا" میرٹ نے ایک مرتبہ پھر زیادہ پرزور آواز میں دہرایا۔

"فیلڈ! —— کیا تمھارا مطلب ہے کل کی رات؟"

"نہیں، کل کی رات نہیں —— بہت سال گزرے۔ اسکول میں اپنی اپنی چھری سے ہم نے ایک دوسرے کے بازو میں ایسا داغ بنا دیا تھا" میرٹ نے جلد جلد کہا۔ "ہم نے ایک دوسرے کے زخم میں اپنے اپنے خون کا قطرہ ڈالا —— اس نے ایک قطرہ میرے بازو میں ٹپکا دیا اور میں نے ایک قطرہ اس کے ——"

"لیکن خدارا بتاؤ تو، یہ سب کس لئے؟" گرین نے حیرت سے دریافت کیا۔

"یہ لڑکوں کا ایک معاہدہ تھا —— ہم نے ایک مقدس عہد کیا۔ ایک مستحکم پیمان وفا۔ مجھے یہ ساری باتیں اب اچھی طرح یاد آرہی ہیں، ہم ان دنوں ایک خوفناک کتاب پڑھ رہے تھے، اور ہم نے بھی ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہونے کی قسم کھائی تھی —— میرا مطلب ہے، ہم نے یہ عہد کیا کہ جو پہلے مرے گا وہ دوسرے کے سامنے ضرور ظاہر ہوگا، اور ایک دوسرے کے خون سے ہم نے اس مقدس عہد پر مہر ثبت کی —— مجھے یہ ساری باتیں بہت اچھی طرح یاد ہیں۔ سات سال پہلے موسم گرما میں ہم سہ پہر کے وقت کھیل کے میدان میں کھڑے تھے، اور ایک ماسٹر نے ہمیں اس حالت میں دیکھ لیا اور چھریاں چھین لیں —— اس کے بعد سے مجھے آج تک کبھی اس واقعہ کی یاد نہیں آئی، یہاں تک کہ آج ——"

"اور تمھارا مطلب ہے کہ ——" گرین نے ہکلا کر کہا۔

مگر میرٹ نے کوئی جواب نہ دیا، وہ اٹھا اور کمرے میں دو ایک مرتبہ ٹہل کر بیزاری کے ساتھ صوفے پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

گرین پر خود سکتہ کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے دوست کو خاموش چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور برآمدے میں ٹہل ٹہل کر صورت حال پر غور کرتا رہا۔ یکایک اسی وقت اس کے دماغ میں جیسے ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آیا۔

اور میریٹ کے پاس جاکر اس نے کہا۔

"میں کہتا ہوں، اس واقعہ کے باعث اس قدر پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میرا مطلب ہے اگر یہ ساری باتیں فریب نظر کا نتیجہ نہیں تو ہم جانتے ہیں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

"فریب نظر کا ذکر اب نہ کرو۔ یہ فریب نظر ہرگز نہیں ہو سکتا" اس نے بہت خوفزدہ لہجہ میں کہا۔ "بیچارہ فیلڈ ——!"

"اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ گمان سچ ہے، اور اس نے رات یہاں آکر اپنا وعدہ وفا کیا ہے، تو اس کے لئے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میریٹ نے اپنا سر ہلایا۔

"بتاؤ تو سہی" گرین نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ اس نے واقعی تمہارے ساتھ کھانا کھایا تھا؟"

میریٹ ایک لمحہ تک تو اس کو حیرت سے تکتا رہا، اور پھر کہا کہ بہت جلد وہ اس بات کی تصدیق کر لے گا۔

"کھانا کھانے کے بعد میں نے تمام برتن خود ہی ہٹا کر رکھے ہیں" اس نے کہا۔ "وہ سب کے سب نعمت خانے کے تیسرے تختے میں رکھے ہیں۔ اس کے بعد کسی نے اس وقت تک ان کو چھوا نہیں ہے۔" اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے اشارے سے بتایا، اور گرین مطلب سمجھ کر نعمت خانے کی طرف چلا گیا۔

"بجنسہ ویسا ہی، جیسا میں نے خیال کیا تھا" اس نے بغور دیکھ کر کہا۔ "یہ کسی حد تک فریب نظر کا نتیجہ تھا۔ کوئی چیز چھوئی تک نہیں گئی ہے۔ آکر خود ہی دیکھ لو۔"

دونوں نے مل کر نعمت خانے کا معائنہ کیا۔ اس کے اندر بھوری بھوری پاؤروٹی، جیئی کی روٹی، نارنگی کا مربہ سب کی سب چیزیں جوں کی توں رکھی تھیں۔ حتیٰ کہ شراب بھی گلاس کے اندر بجنسہ اسی طرح موجود تھی جس طرح اس نے بوتل سے انڈیلی تھی۔

"تم نے کسی کو کچھ بھی نہیں کھلایا میرے دوست!" گرین نے کہا "میں کہتا ہوں فیلڈ یہاں ہرگز آیا ہی نہ تھا۔"

"مگر یہ سانس کی آواز؟ ——" میریٹ نے آہستہ سے آہستہ سے پوچھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے سے حیرت و استعجاب مترشح ہو رہا تھا۔

گرین نے جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا خوابگاہ کی طرف بڑھا، اور میریٹ اپنی آنکھوں سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے دروازہ کھولا اور سانس کی آواز سنی۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی، میریٹ بھی اپنی جگہ سے صاف طور پر یہ آواز سن رہا تھا۔

گرین دروازہ بند کر کے پھر اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

"اب صرف ایک ہی صورت ہے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "فیلڈ کے گھر خط لکھ کر اس واقعہ کے متعلق دریافت کر لو اور اس اثنا میں میرے کمرے میں آکر اپنے امتحان کی تیاری کرو۔ میرے یہاں ایک فاضل پلنگ ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میریٹ نے کہا۔ "جس طرح بھی ہو امتحان پاس کرنا میرے لئے ازبس لازمی ہے۔"

اور اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا ——!

تقریباً ایک ہفتہ بعد میریٹ کو اپنے خط کے جواب میں فیلڈ کی بہن کا خط ملا۔ اس کا ایک حصہ جو اس نے گرین کو پڑھ کر سنایا وہ یہ تھا ——!

"یہ بڑی انوکھی بات ہے" اس نے لکھا تھا۔ "کہ اپنے خط میں آپ نے فیلڈ کے متعلق دریافت کیا ہے۔ شاید آپ اس سے واقف نہیں کہ فیلڈ کی نازیبا حرکات سے تنگ آکر میرے والد نے ایک پائی دیئے بغیر اس کو گھر سے نکال دیا —— مگر وہ گیا نہیں بلکہ گھر کے تہ خانے میں چھپ رہا اور بھوکوں مر کر اپنی جان دے دی —— لوگ اس میں شک نہیں اس واقعہ کو دبا دینے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن چونکہ آپ اس کے بچپن کے دوست ہیں —— اس لئے میں بلا کم و کاست تمام واقعات سے آپ کو آگاہ کر رہی ہوں۔ فیلڈ کی لاش لوگوں کو ۱۴ تاریخ کو ملی —— اور ڈاکٹر نے کہا کہ تقریباً بارہ گھنٹے پیشتر اس کی روح نکلی ہوگی ...... وہ خوفناک حد تک دبلا ہو گیا تھا ——"

"تو گویا وہ ۱۳ تاریخ کے دن کو مرا ——" گرین نے سوال کیا۔

میریٹ نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

"اور چند گھنٹے کے بعد اسی تاریخ کی رات کو وہ یہاں تم سے ملنے کے لئے آیا؟"

میریٹ نے پھر اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

نوٹ:— ہر قسم کی خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایئے۔

فکر و نظر

وہ آئے سامنے اور میں نظر اُٹھا نہ سکا

از جناب وزیر زادہ مہر عثمانی

نظر کسی کی نظر سے کبھی ملا نہ سکا
نگاہِ شوق کی عظمت بھی میں دکھا نہ سکا

اگرچہ شمعِ تمنا رہی ضیا افگن
سیاہ خانۂ دل پھر بھی جگمگا نہ سکا

مری نگاہ تھی اسرارِ عشق سے واقف
سرابِ حسن میں تیرا فریب کھا نہ سکا

جنونِ عشق میں اپنے کو بار ہا بھولا
مگر تجھے کسی حالت میں بھی بھلا نہ سکا

خیالِ دوست تری دلنوازیاں تسلیم
مگر مرا دلِ غمگیں قرار پا نہ سکا

وفورِ شوق کی بیچارگی معاذ اللہ
وہ آئے سامنے اور میں نظر اُٹھا نہ سکا

نگاہِ ناز سے جس کو گرا دیا تو نے
وہ بدنصیب کسی طرح چین پا نہ سکا

ہجومِ نور سے گھبرا گئیں مری نظریں
خطا معاف میں جلووں کی تاب لا نہ سکا

ترے بغیر او صبر و قرار کے مالک
کوئی خیال مجھے مطمئن بنا نہ سکا

نگاہِ یاس نے آخر کیا اُسے ظاہر
وہ رازِ دل جو زباں پر کبھی میں لا نہ سکا

وہ ابتدائے محبت کی پُر اثر نظریں
بھلانا چاہا مگر مہرؔ میں بھلا نہ سکا

نقد و نظر

محمد رسول اللہ

ترجمہ۔ مولوی عبیدالرحمٰن عاقل رحمانی۔ سائز $\frac{22 \times 29}{16}$، ۹۲ صفحات قیمت ۸/،

ناشرین:۔ کتابستان۔ سوداگر واڑہ۔ سورت،

یہ انگریزی فیلسوف ٹامس کارلائل کی مشہور تصنیف "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرت پر فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے اور ان معترضانہ اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے جو مسیحی علم طور پر کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کارلائل کی بعض باتیں اسلامی نقطۂ نگاہ سے غلط ہیں تاہم ایک نیک نیت مسیحی اجنبی سے اس سے زیادہ توقع بھی کیا رکھی جا سکتی ہے؟ لہٰذا یہ تصنیف اس قابل ہے کہ اردو داں اسے پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ دین حنیف کے متعلق اغیار کی کیا رائے ہے؟ عاقل رحمانی صاحب کا ترجمہ کامیاب ہے۔

ایک معلم کی زندگی

حصہ اول۔ مصنفہ ماسٹر عبدالغفار مدہولی۔ سائز $\frac{22 \times 29}{16}$ صفحات ۲۰۴ قیمت ۱۲/ ناشرین مکتبہ جامعہ دہلی۔

زیر نظر تصنیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالغفار صاحب مدہولی جامعہ ملیہ دہلی میں مدرسہ ابتدائی کے استاد ہیں انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں اپنی معلمانہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ جامعہ ملیہ کے قیام و ترقی کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر ان بچوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو جامعہ ملیہ میں تعلیم پاتے ہیں تاہم لائق مصنف نے کہیں کہیں چونکہ اپنے بیس سالہ تجربہ کی روشنی میں طریقۂ تعلیم پر بھی بحث کی ہے لہٰذا عام مدرسین کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا۔ مکتبہ جامعہ کی عام مطبوعات کی زبان حد درجہ ناقص ہوتی ہے تاہم زیر نظر کتاب اس اعتبار سے نسبتاً بہتر ہے۔

جدید مطبوعات

از:- ادارہ

آج کا مصر

مصنفہ پروفیسر محمد حسن الاعظمی و مسٹر عبدالسلام خورشید، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۷۰ قیمت ۱۲/، ناشرین اردو اکیڈمی لوہاری دروازہ لاہور،

اسلامیان ہند کو مصر سے جو دلچسپی ہے وہ محتاج تصریح نہیں، لیکن ہونٹی کی اس سرزمین کے سیاسی، مذہبی، تاریخی اور ثقافتی حالات پر ابھی تک کوئی کتاب جلوہ گر اشاعت پر نہ آئی تھی، پروفیسر اعظمی اور مسٹر خورشید نے اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر اعظمی مصر میں سلسلۂ تعلیم برسوں مقیم رہے ہیں۔ لہٰذا جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے یہ کتاب ایک اوسط درجہ کے ہندوستانی کی معلومات میں اضافہ کر سکتی ہے لیکن علمی اور تاریخی لحاظ سے اس تصنیف کو معیاری اور سیر حاصل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کتاب میں مصر کے اشخاص و مناظر کی چند تصویریں بھی شامل ہیں۔ جو ہندوستان میں دلچسپی کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر

مرتبہ پروفیسر محمد سرور، سائز $\frac{22 \times 29}{16}$ صفحات ۲۲۸، قیمت ۱۲/ ناشرین کتب خانہ پنجاب۔ لاہور

مولانا محمد علی مرحوم کم و بیش چھ مرتبہ یورپ گئے، اس دوران میں ان کو گہری نظر سے یورپی تمدن کے مطالعہ کا موقع ملا۔ انھوں نے یورپ کی زندگی کے ہر پہلو کو ٹٹولا، وہ علم و سیاست کی محفلوں میں شریک ہونے کے علاوہ رقص گاہوں میں بھی جا کر بیٹھے لیکن اس کے باوجود وہ مشرقی رہے اور ان کی طبیعت پہ مغربی رنگ غالب نہ آ سکا۔ انھوں نے یورپ سے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو متعدد خطوط لکھے جن میں ذاتی حالات کے علاوہ یورپی

تہذیب کا جائزہ ۔۔۔ انداز میں لیا گیا تھا۔ پروفیسر محمد سرور نے اس قسم کے بعض خطوط بڑی محنت سے تلاش کر کے شائع کرائے ہیں۔ مولانا محمد علی کے طرز نگارش کے متعلق کچھ کہنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ان خطوط میں حق گوئی بھی ہے اور منظر نگاری بھی طنز بھی ہے اور ظرافت بھی، برجستگی بھی ہے اور سلاست بھی۔ الغرض خطوط کا یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ باذوق حضرات اس کے مطالعہ سے فیض یاب ہوں۔

شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریکات

مصنفہ مولوی عبید اللہ سندھی۔ سائز ۲۲×۲۹/۱۶ ۲۱۴ صفحات قیمت دو روپے۔ ناشرین کتب خانہ پنجاب۔

مولوی عبید اللہ سندھی ان فاضل اجل علما میں سے ہیں جن کے علم و جہاد کی کرنیں ایوان ادب و سیاست کو مدت تک جگمگاتی رہیں۔ لیکن زیر نظر تصنیف دیکھ کر ازحد مایوسی ہوئی کیونکہ اول تو اسلامی تعلیمات سے علیحدہ حضرت شاہ ولی اللہ کی کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک ہی نہ ہو سکتی تھی۔ دوسرے فاضل مصنف کا انداز بیان ازحد ژولیدہ اور اُلجھا ہوا ہے۔ عام طور پر غیر متعلق مواد سے کتاب کی ضخامت بڑھا دی گئی ہے۔ جا بجا عربی اور فارسی کی عبارتوں یا حاشیہ آرائیوں کی بھرمار ہے جن کو بنظر تعمق پڑھنے کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی ضرورت کیا تھی؟ اکثر مقامات پر ضروری باتوں کو حاشیہ میں اور غیر ضروری باتوں کو متن میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کتابت کی بیشمار غلطیاں ہیں۔ لہٰذا یہ تصنیف کسی طرح بھی مولانا عبید اللہ سندھی کے شایان شان نہیں ہے۔

شانِ خدا

مرتبہ عبید الرحمٰن عاقل رحمانی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۷۵ قیمت عہ۔ ناشرین کتابستان سوداگر واڑہ سورت

آج کل دہریت کی وبا عام ہو گئی ہے۔ اس کتاب میں ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت میں دلائل دیئے گئے ہیں۔ دہریت کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ کوشش مستحق تبریک ہے لیکن طریقۂ استدلال کامیاب نہیں ہے۔ پرانے فلاسفہ کے اعتراضات تو مختصر طور پر

یش کر دیئے گئے ہیں لیکن موجودہ منکرین و متشککین کے خیالات افکار کا محاسبہ نہیں کیا گیا۔ آج کل دہریت کی بنیاد معاشی و ...باسی ہے لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام اعتراضات ...جائزہ اسلام کی روشنی میں لیا جائے جو خدا تعالےٰ اسکی صفات ...الی پر کئے جاتے ہیں اس کے علاوہ معجزات اور وجود ملائکہ پر بھی ...ددینے کی ضرورت ہے۔ الغرض "شانِ خدا" مقتضیات زمانہ ...مطابق تو نہیں ہے تاہم یہ کتابچہ قابل مطالعہ ضرور ہے۔

شیخ و برہمن

مصنفہ اعظم کریوی۔ سائز $\frac{17 \times 27}{16}$ ۲۱۸ صفحات ...ست دو روپلے۔ ناشرین: کتاب خانہ دانش محل، امین آباد پارک ...ھنؤ

یہ مسٹر اعظم کریوی کے سولہ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جس کے ...لق ابتدا میں بیان کیا گیا ہے کہ "یہ کہانیاں دیہات کے ہندو ...لمانوں کی اس یکجہتی کی آئینہ دار ہیں جو اب تک شیخ و برہمن ...اور زشوں سے آلودہ نہیں ہو سکی" حالانکہ خود افسانوں سے ...ابت نہیں ہوتا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کتاب کا نام ...خ و برہمن رکھنے میں کیا حکمت تھی؟ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ ...م چند آنجہانی کے بعد جن افسانہ نگاروں نے دیہاتی زندگی ...فسانے لکھے ہیں ان میں ڈاکٹر اعظم کریوی کا درجہ ...ب سے ممتاز ہے۔ حالانکہ افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ...کہ ڈاکٹر صاحب دیہاتی سماج اور دیہاتی ماحول ہی سے ...فت نہیں ہیں۔ اعظم صاحب کے افسانے عام طور پر ہندی ...بلا حوالہ ماخوذ ہوتے ہیں۔ "شیخ و برہمن" کی ترتیب بھی ...اسی طرح عمل میں آئی ہے۔ افادیت کے مقابلہ میں زیر نظر ...ب کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

...ل

جناب نصیر مہو چھاونی،

...گو مست ملا کر چلی گئیں
یعنی شرابِ شوق پلا کر چلی گئیں

...نگیں کا ماجرا
اک برق تھی کہ دل پہ گرا کر چلی گئیں

...رائیں پھر نصیر
کتنی بہاریں آئیں اور آ کر چلی گئیں



یابس

جریان اور سرعت انزال کی سب سے زیادہ کامیاب دوا

ایک ہزار مرتبہ

یابس کہنے سے شدید جریان کا بھوت اُتر جاتا ہے!

یہ رائے ان لوگوں کی ہے جنہوں نے "یابس" کا حیرت انگیز تجربہ کیا ہے۔ مگر "یابس" ہے کیا؟ کیا کسی موکل یا جن کا نام ہے یا کوئی ہمزاد ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ سفوف کی شکل میں

جریان کی ایک لاجواب حیرت انگیز دوا ہے

سفید قطرہ کا آنا۔ یا دھات کا گرنا۔ شب کو سوتے میں ناپاک ہوجانا نہایت بُرا مرض ہے اس مرض کی موجودگی میں مباشرت کی حقیقی لذت سے اِنسان محروم رہتا ہے۔ ہومیوپیتھک۔ ویدک وغیرہ طبوں میں اِس مرض کی دوائیں ہیں مگر وہ اِس قدر کامیاب اور زود اثر نہیں جس قدر

سفوف یابس ہے

پہلی ہی خوراک میں رقیق دھات کو جما دیتا ہے۔ کمر کا درد۔ چہرے کی بیرونقی۔ کاہلی۔ سستی۔ لاغری دُور کر دیتا ہے۔ ہزارہا مریض سفوف "یابس" کی بدولت صحتیاب ہوچکے ہیں اکثر ڈاکٹروں نے بھی اس دوا کے حیرت انگیز فوائد دیکھکر اپنے مطب میں استعمال کرانا شروع کردیا ہے پس اگر زندگی کا لطف اُٹھانا ہو تو آج ہی ایک کارڈ منیجر مشہور دواخانہ دہلی کو لکھئے اور یہ دوا بذریعہ وی پی پارسل منگا کر فائدہ اُٹھائیے، قیمت بیس خوراک کا بکس ایک روپیہ چودہ آنہ (۱ے۱۴) محصول ڈاک علاوہ ہوگا۔ ترکیب اِستعمال ہر خوراک کے پیکٹ پر تحریر ہے۔ منگانے میں جلدی کیجئے ورنہ دوبارہ تیاری کا اِنتظار کرنا ہوگا ✱


عالمگیر
لاہور
ہندوستان کا بہترین ماہوار رسالہ

ٹیلیفون ۵۵۵۴ — تار کا پتہ:- کلوریم۔ لاہور



رجسٹرڈ پرل کلوریم آئی ڈراپ



سوائے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریوں کو شفا دینے کیلئے اکسیر اعظم ہے

خالص ہندوستانی جڑی بوٹیوں اور قیمتی اجزاء کا مرکب ہے!

عرصہ چودہ ۱۴ سال سے ہندوستان اور ممالک غیر سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے!

زاید از ۳۵۰۰۰ آنکھوں کے لاعلاج مریض شفا کامل حاصل کر چکے ہیں،

آنکھوں کے ماہر ترین ڈاکٹر حکیم وید راجہ نواب اور ہر طبقہ کے معززین اس اکسیر کے استعمال سے شفا حاصل کرنے کیلئے پرزور سفارش کرتے ہیں

ہزارہا سرٹیفکیٹ وسفارشات میں سے ایک تازہ ترین چٹھی کی نقل باز بنڈی گھیب مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۴۲ء "جناب مینجر صاحب پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ۔ تسلیم میرے ایک عزیز رشتہ دار کی آنکھیں کافی عرصہ سے خراب تھیں سیکڑوں ادویات کا استعمال کرایا گیا مگر افسوس کہ کوئی دوا بھی کارگر ثابت نہ ہوئی دو دفعہ سول سرجن صاحب سے اپریشن بھی کرایا گیا ایک دفعہ اپریشن کھوکھر کی ضلع گوجرانوالہ میں اور دوسری دفعہ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں مگر سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہ ہوا اتفاقاً میں نے ایک شیشی پرل کلوریم کی آپکے ایجنٹ راولپنڈی سے خرید کر استعمال کرائی خدا جانے یہ دوا تھی یا جادو کہ چند ہی دنوں میں خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا جس کا وہم وگمان بھی نہ تھا اب متواتر پرل کلوریم جو کہ اپنے نہ معجزہ سے کسی طرح کم نہیں استعمال کرا رہا ہوں میں آپکو اس قابل قدر ایجاد پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں جس ایجاد نے سول سرجنوں کو مات کر دیا ہے اگر اس دوا کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو یہ ناقدر شناسی ہوگی۔ آپکا دعا گو ایس ایم صدیق لیڈر مرچنٹ بنڈی گھیب (آپ اس تحریر کو بندگان خدا کی بھلائی کیلئے استعمال میں لا سکتے ہیں)

پریس کی متفقہ رائے، علاوہ ہندوستان کے چوٹی کے اخبارات صرف لاہور کے ممتاز ترین اخبارات کی ریویو کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں روزانہ ملاپ، روزانہ پرتاپ، روزانہ ویر بھارت، شہباز۔ انقلاب، احسان۔ زمیندار۔ عالمگیر، خیام، مست قلندر۔ گورو گھنٹال۔ چترا، پکچر۔ وغیرہ وغیرہ۔ پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ بجائے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریوں مثلاً کالا موتیا، سفید موتیا، ہر قسم چیچک سے ضایع آنکھیں جالا۔ پھولا۔ ہائی ماوپیا و مائیوپیا ہر قسم آنکھ کا بیٹھ جانا۔ ککرے، پڑبال، آنکھوں سے پانی بہنا، چوٹ سے آنکھ ضایع ہونا وغیرہ وغیرہ کو شفا دینے میں اکسیر اعظم ہے۔ موجد نے اس دوائی کو ایجاد کر کے ہندوستان پر بڑا بھاری احسان کیا ہے یہ دوا خالص ہندوستانی جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور موجد نے ہندوستان کے ۵۵ بڑے بڑے شہروں میں دورہ فرما کر زاید از تین لاکھ آنکھوں کے لاعلاج مریضوں کو اس کے استعمال سے شفا بخشی ہے ہم پرزور سفارش کرتے ہیں کہ جس بھائی بہن کی آنکھ میں کوئی بھی بیماری ہو وہ اس دوائی کا استعمال کریں۔ کیونکہ اچھی چیزوں کی تبلیغ کرنا کار ثواب ہے۔

قیمتیں اسپشل پوٹینسی گیارہ روپے چار آنے نارمل بڑی چار روپے چار آنے چھوٹی شیشی دو روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک ذرخرچہ پیکنگ پرچہ ترکیب استعمال ہر زبان میں ہمراہ شیشی ہوگا اسپشل پوٹینسی کی دوائی منگوانے کیلئے پانچ روپے پیشگی آنا لازمی ہے اپنے شہر کے مشہور دوا فروشوں سے طلب کریں۔ نقال پیدا ہو چکے ہیں ان کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لئے کارڈ بورڈ کے بکس پر موجد کا فوٹو ملاحظہ فرما کر اصل چیز کو حاصل کریں۔ **لوکل ایجنٹس** ، چیف ایجنٹس میسرز بیلی رام اینڈ برادرز انارکلی لاہور لوکل ایجنٹ میسرز کشن چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ چوک انارکلی میسرز ہیرو برادرز چوک انارکلی لاہور میسرز نرائن داس جگوانداس انارکلی میسرز شنکر میڈیکل ہال ۔ سبت روڈ لاہور میسرز دیوان چند اینڈ کمپنی میکلوڈ روڈ لاہور نکڑین پرلز متصل اڈہ لوہاری لاہور۔ کریسنٹ میڈیکل سٹورز راواڈ نگا سنگھ بلڈنگ دی مال۔ لاہور

پتہ:۔ مینجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ کوٹھی نمبر ۹ (A. L.) ایبٹ روڈ۔ لاہور

(مریضان چشم موجد کے مشورہ سے صبح ۷ بجے سے ۱۱ بجے تک مفت فائدہ حاصل کر سکیں)

جلد ۴۸ — فہرست مضامین ستمبر ۱۹۴۲ء — نمبر ۴

نمبر شمار	مضامین	نگارندہ	نمبر صفحہ
۱	ملاحظات	ادارہ	۶
۲	اخبار و افکار	...	۷
۳	حقائق و معارف	مولانا ابوالکلام آزاد	۹
	علمی و ادبی مضامین		
۴	سلف صالحین اور خودداری	الحاج مولوی عبدالقیوم ندوی	۱۹
۵	سلطان واجد علی شاہ	مولوی نور احمد خاں صاحب	۲۹
۶	آہ عشق بے ثبات الخ	پیر غلام دستگیر صاحب نامی	۴۳
۷	عرب کے کاہن اور متنبی	جناب خان شبیر احمد خاں	۶۷
	افسانے اور ڈرامے!		
۸	پھول والی گلی	جناب انتصار حسین نیوتنوی	۱۴
۹	ڈبڈبائی آنکھیں	جناب افضل عابدی	۲۲
۱۰	موم بتی	جناب رشید اکیوردی	۳۸
۱۱	اعتراف شکست	جناب اے۔ آر۔ رشدی	۵۱
۱۲	تو یہ تو یہ بھول گئی	جناب غلام محمد ناظر انصاری	۶۰
۱۳	بہری جھنکار	جناب منظور عالم سعیدی	۷۴

نمبر شمار	مضامین	نگارندہ	نمبر صفحہ
	منظومات		
۱۴	تجلیات خورشید	جناب خورشید سہارنپوری	۱۳
۱۵	عہد رنگیں	حضرت خمار بارہ بنکوی	۱۸
۱۶	عشق تپاں	جناب اقبال حسین شبنم	۲۱
۱۷	ریاض خلیل	حضرت خلیل بیگوسرائی	۲۶
۱۸	رنگ و بو	حضرت صاحبزادہ شفق ٹونکی	۲۷
۱۹	تجلیات	جناب عبدالحق اختر واصفی	۳۵
۲۰	سیل رواں	حضرت علامہ محوی صدیقی	۳۷
۲۱	فریاد	جناب زخمی بیگوسرائی	۴۱
۲۲	صیاد	جناب محمد شرف الدین سلیم	۴۵
۲۳	یہ کیا —؟	جناب مولوی عبدالباری شاہ عشق	۴۷
۲۴	حقائق	حضرت علامہ امجد حیدرآبادی	۵۹
۲۵	وسعت خیال	حضرت شفق رضوی	۶۵
۲۶	ہاں میں بھی تمہارا ہوں	جناب ساقی صدیقی	۷۲
۲۷	خدا غارت کرے	حضرت بہزاد لکھنوی	۷۳
۲۸	آتش خاموش	جناب آزاد انصاری بیگانوی	۷۷

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

دسمبر میں حسب معمول "عالمگیر" کا خاص نمبر ۱۹۴۳ء شایع ہوگا۔ جس کے لئے بہترین مضامین نظم و نثر فراہم کئے جارہے ہیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خاص نمبر ۱۹۴۳ء کا ہر مضمون اور ہر افسانہ خاص ہوگا۔ اور کاغذ کی ہوشربا گرانی کے باوجود اسے بہمہ وجوہ کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ قلمی معاونین سے استدعا ہے کہ وہ اپنے اپنے جواہر پارے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۲عہ تک دفتر میں ضرور بھجوادیں تاکہ کتابت و طباعت کے مراحل بہ اطمینان طے ہوسکیں۔ "خاص نمبر" کی تفصیلات اکتوبر اور نومبر کی اشاعتوں میں پیش کی جائیں گی۔

اس مرتبہ "حقائق و معارف" کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک حقائق پرور اور پر معارف مقالہ ہدیہ قارئین ہے۔ مولانا آزاد نے بتایا ہے کہ دنیا کی موجودہ اور گذشتہ جنگوں کے نتائج قتل و غارت سلب و نہب اور ہلاکت عمران و تمدن کے سوا کچھ نہ تھے لیکن غزوات اسلامیہ نے اپنے پیچھے بعض ایسی مفید اور تعمیری یادگاریں چھوڑی ہیں کہ تہذیب انسانی بجا طور پر ان پر فخر کرسکتی ہے اس محققانہ مقالہ میں وہ تمام عالمانہ اور ادیبانہ خوبیاں جلوہ گر ہیں جو صرف حضرت مولانا کی شخصیت سے مختص ہوچکی ہیں۔ امید ہے کہ موجودہ جنگ کے زمانے میں یہ مقالہ خاص وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔

جناب انتصار حسین ترتوزی کے دو افسانے "عالمگیر" میں شایع ہوکر باذوق حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ نے طوائف کی نفسیات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ماجرا، فضا اور مکالمے کے لحاظ سے یہ افسانہ خاص طور پر لائق داد ہے۔ الحاج مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی نے "سلف صالحین اور خودداری" کے عنوان سے انسانیت کبریٰ کا ایک مہتم بالشان مقالہ پیش کیا ہے۔ امید ہے یہ مختصر مقالہ ان مولویوں کے لئے بھی نصیحت آموز ثابت ہوگا جنہوں نے مذہب کے نام پر بعض گداگرانہ ادارے قائم کررکھے ہیں۔ "بھابی" کے موضوع پر اردو میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن مسٹر جگناتھ [illegible]

زیر نظر اشاعت

از:- اداساکا

نے اسی موضوع کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ مجموعی طور پر دلگداز کیفیات کا حامل ہے اور جناب افضل عابدی نے اپنے ترجمہ میں اصل کی تمام تر خوبیاں برقرار رکھی ہیں۔ "سلطان واجد علی شاہ" کی شخصیت متعدد غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ جناب مولوی نور احمد خاں نے اودھ کے اس جلیل القدر بادشاہ کے صحیح ترین حالات پیش کرکے علم و تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ اس مقالہ کی دوسری قسط "کیا سلطان واجد علی شاہ عیاش تھے؟" آئندہ اشاعت میں نذر قارئین کی جائیگی۔ جناب خشید اکیوردی "فلم آرٹسٹ" ہونے کے علاوہ ایک مشہور افسانہ نویس بھی ہیں "موم بتی" آپ کی ادیبانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ پیر غلام دستگیر صاحب نامی نے مثنوی مولانا روم کی ایک حکایت کو اردو کا لباس پہنایا ہے۔ امید ہے کہ آج کل کے دل پھینک نوجوان اس کہانی کو آویزۂ گوش بنائیں گے۔ "اعتراف شکست" کے آئینہ میں ہندوستانی معاشرت کا ایک گھناؤنا رخ دکھایا گیا ہے۔ جناب رشدی ایک مشاق صحیفہ نگار ہیں۔ ان کا انتخاب قابل تحسین اور ترجمہ لائق ستائش ہے۔ جناب ناظر انصاری نے مرہٹی زبان سے انگریزی کے ایک شاہکار کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود اصل کی خوبیاں زائل نہیں ہوئیں۔ اس افسانہ میں ایک ایسی لڑکی کا نفسی تجزیہ کیا گیا ہے جو نسیان کے مرض میں مبتلا تھی۔ جناب خبیر احمد خاں نے تاریخ ابن خلدون کی روشنی میں عرب کے کاہنوں اور منجموں کے حالات سپرد قلم کئے ہیں۔ "بہری بھکارن" جناب منظور عالم سعیدی کا ایک جاذب توجہ افسانہ ہے۔ جس کا عروج خاص طور پر دلچسپ ہے۔

حصہ نظم حسب معمول کامیاب ہے۔ علامہ محوی صدیقی، علامہ امجد حیدر آبادی، حضرت شفق ٹونکی، حضرت شفق رضوی، حضرت خمار بارہ بنکوی، حضرت بہزاد لکھنوی، حضرت عقیل بیگو سرائی جیسے پختہ مشق شعرا کرام کا کلام یقیناً وجد آفریں ثابت ہوگا۔

——— (ادارہ) ———

اخبار و افکار

مسلمان اور ہندو علوم و فنون

عباسی خلیفہ منصور کے عہد میں عربی میں سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا۔ ہندوستان کا ایک نامور پنڈت منصور کے دربار میں کتاب سدھانت لے کر آیا۔ خلیفہ کے حکم سے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا برامکہ نے ہندوستان سے جن ویدک عالموں کو بلایا تھا۔ انہیں منکہ اور بکرما اور قلربل بہت مشہور ہیں۔ برامکہ نے بغداد میں جو ہسپتال بنوایا اس کا افسر اعلیٰ ایک ہندو پنڈت ساکل تھا۔ عرب مورخ اسے صالح کہتے ہیں۔ ابو معشر فلکی نے دس سال ہندوستان میں رہکر سنسکرت کے علوم و فنون حاصل کئے۔ ابو ریحان بیرونی نے سولہ سال سنسکرت زبان کی تعلیم حاصل کرنے پر صرف کر دیئے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ہندوؤں کے علوم و فنون کو عزت کی نگاہ سے دیکھا تھا، انہیں ہندوؤں کی زبان اور ان کے مذہب سے کسی قسم کا تعصب نہیں تھا۔ سلطان فیروز شاہ نے جب جوالا مکھی کی سیر کی تو وہاں کے کتب خانے کو بھی دیکھا تھا۔ جہانگیر کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے زمانے کے بڑے بڑے پنڈتوں اور سنیاسیوں سے ملنے کے لئے دور دراز کا سفر کیا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں سب سے زیادہ مشہور سنیاسی اور ویدانت کا عالم پنڈت جے روپ تھا۔ جہانگیر شوق سے اس سے ملنے گیا تھا۔ اور اس نے جس خلوص سے اس کی باتیں سنی تھیں ان کا حال وہ "توزک جہانگیری" میں بیان کرتا ہے۔ توزک جہانگیری میں جہانگیر نے بہت سے ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے جن سے اسے ہندو سنیاسیوں سے ملاقات کرنے کیلئے کوسوں پیدل چلنا پڑا تھا۔

اکبر سے صدیوں پہلے کشمیر کے بادشاہ زین العابدین نے سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرانے کے لئے ایک محکمہ قائم کیا تھا، ابراہیم عادل شاہ دکن نے نہ صرف بڑے بڑے عہدوں پر ہندوؤں کو مقرر کیا بلکہ اس نے دفتری زبان بھی بدل دی یعنی فارسی کی جگہ ہندی کر دی۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ "دفتر فارسی برطرف ساختہ بجائے (برہمن) را صاحب دخل گردانید"

حضرت امیر خسرو دہلوی نے ایک مثنوی نو سپہر دوں میں لکھی اس میں ایک مستقل باب ہندوستان کے فضائل کا قائم کیا ہے اور فضیلت کے مختلف وجوہ قرار دیئے ہیں ان وجوہ میں سے ایک وجہ فضیلت علمی قرار دی ہے اور اس پر دس دلیلیں قائم کی ہیں جن میں سے بعض کو ہم نقل کرتے ہیں۔

(۱) ہندوستان میں تمام دنیا کی بہ نسبت علم نے زیادہ وسعت حاصل کی

(۲) ہندوستان کے رہنے والے دنیا کی تمام زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔

(۳) ہندوستان میں دنیا کے ہر حصہ کے لوگ علم کی تحصیل کے لئے آتے ہیں۔

(۴) علم حساب میں صفر ہندوستان کی ایجاد ہے۔

(۵) کلیلہ و دمنہ جو دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہندوستان کی تصنیف ہے۔

(۶) شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے۔

(۷) موسیقی کو جو ترقی ہندوستان میں ہوئی کہیں نہیں ہوئی۔ (مقالات شبلی)

ریڈیائی لغت

حکومت ہند کا محکمہ ریڈیو آج کل جس انہماک و محنت سے ہندوستانی زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اس کا علم ان لوگوں کو نہیں ہو سکتا جو محکمے سے کسب فیض کے لئے اپنے پاس ریڈیو کا لائسنس نہیں رکھتے یا بالالتزام ریڈیو کے اعلانچیوں کے سامع نواز اور ادب پاش اعلانوں اور تقریروں کو نہیں سنتے۔ بہرحال آج کی اشاعت میں ہم ان الفاظ میں سے چند ذیل میں پیش کرتے ہیں جنہیں ریڈیو کے ملازموں نے ایجاد کر کے ہندوستان اور ہندوستانی زبان پر زبردست احسان فرمایا ہے۔

جزیرہ نما	کے بجائے	ٹاپو نما
ربط ضبط	"	تال میل
آبنائے	"	جل گھاٹی
خاکنائے	"	تھل گھاٹی

مشترکہ پروگرام	کے بجائے	ساجھا پروگرام
مشترکہ کانفرنس	"	ساجھا کانفرنس
حق خود اختیاری	"	آتم نرنے
پیغام	"	سندیسہ
وقت	"	سمے
مجمع جزائر	"	ٹاپو

یہ صرف چند نمونے ہیں، ورنہ ان کی فہرست خاصی بڑی ہو گئی ہے اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے یوں تو ہر لفظ پر روح وجد کرنے لگتی ہے۔ اور تعلق زبان کے بوسے لینے لگتی ہے لیکن ہمیں ٹاپو نما۔ تگڈم اور تال میل زیادہ پسند ہیں۔ کیونکہ تینوں شیرینی، ترنم اور حلاوت سے بھرپور ہیں۔ سنتے ہیں کہ آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر احمد شاہ بخاری آج کل اس ریڈیائی ہندوستانی کی جامع لغت ترتیب دے رہے ہیں اور جو لوگ اس لغت کے الفاظ سیکھنا اور استعمال کرنا چاہتے ہیں ان کو شاہ صاحب سے باقاعدہ اجازت لینی پڑتی ہے۔ (مدینہ)

مشترکہ سرمایہ

حیدرآباد دکن۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب نے جو نشرگاہ اورنگ آباد کے سالگرہ ہمایونی کے مشاعرے کے صدر تھے۔ بعد ختم مشاعرہ ایک مختصر سی تقریر فرمائی۔ جس میں شعرائے محفل کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "ملکی شعرا اور دلی کے شعرا کی شاعری میں کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ تخیل کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ آپ نے کہا کہ یہ شرف صرف اردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ وہ بلحاظ جغرافی حدود ہندوستان کے ہر حصہ ملک کا مشترکہ سرمایہ ہے اور اس زبان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم تمدن کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے اس لئے علاوہ مسلمانوں کے دوسروں کے کلام میں بھی جو اس زبان میں شاعری کرتے ہیں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔"

سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "مملکت حیدرآباد کو ہندوستان کے دوسرے تمام علاقوں پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہاں کی روادارانہ حکومت نے ملک کے اس مشترکہ سرمائے کو پروان چڑھانے میں مدد دی ہے۔ چنانچہ اس کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ملک کا ہر نوجوان بلالحاظ مذہب و ملت اس کے ذریعے خزائن علم سے مستفیض ہو سکتا ہے اور اس کو اس میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔" (نامہ نگار)

حقائق و معارف

غزوات اسلامیہ کی یادگاریں

از :- مولنا ابو الکلام آزاد

سیلاب آتا ہے تو اس کی سطح پر سر بفلک عمارتیں حباب کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ زلزلہ آتا ہے تو فقیروں کی جھونپڑی کے ساتھ قصر شاہی کے ستون بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔ آندھی چلتی ہے تو سب سے پہلے عظیم الشان محلوں کے کنگرے ہی ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

جنگ بھی ایک سیلاب ہے جو تمدن کے آثار کو بہا لے جاتا ہے لڑائی بھی ایک زلزلہ ہے جو نظام امنیتہ کی بنیادوں کو دفعتہً ہلا دیتا ہے۔ معرکہ کارزار بھی ایک آندھی ہے جو علم و تہذیب کے ایک ایک ریشے کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

دنیا کی تاریخ نے ہر زمانہ میں اس کی دردناک مثالیں بکثرت پیش کی ہیں۔ بخت نصر اٹھا اور بیت المقدس کو برباد کر دیا، ایرانی آئے اور بابل کے قدیم تمدن کو تاراج کر کے چلے گئے۔ رومی نکلے اور کارتھیج کی سرزمین کو آگ اور خون سے بھر دیا۔ سکندر یونان سے نکلا اور ایران کے در و دیوار کے ایک ایک نقش کو مٹا آیا۔ تاتاری ابھرے اور بغداد کے قدیم آثار تہذیب کو دجلہ میں ڈبو دیا۔

اس قسم کے حملوں نے مادی یادگاروں کے ساتھ ہمیشہ روحانی یادگاروں کو بھی فنا کر دیا ہے۔ تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانے کا ایک ایک حرف دجلہ کے بہتے ہوئے پانی سے دھو دیا۔ اسکندریہ کا عظیم الشان کتب خانہ آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا۔ ایران کے تاج شاہی نے موتیوں کے ساتھ اپنے علمی جواہر بھی غارتگروں کے پاؤں پر نثار کر دیئے۔ سیکڑوں بتخانے منہدم ہو گئے۔ سیکڑوں مسجدیں ویران ہو گئیں۔ ہزاروں گرجے گرا دیئے۔ لاکھوں مدارس برباد ہو گئے۔

لیکن کبھی کبھی وہی پانی جو طوفان بن کے موجیں مارتا تھا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابر کرم کا چھینٹا بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی زمین کی وہی حرکت جو زلزلہ بن جاتی ہے ایسا بھی انقلاب ہوتا ہے کہ سبزہ کی لہک اور بوئے گل کی موج ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا وہی تند جھونکا جو آندھی بن کے چلتا تھا ایسا بھی ہوتا ہے کہ نسیم خوشگوار بن کر چلنے لگتا ہے۔

اسلام اسی ابر کرم کا چھینٹا۔ اسی بوئے گل کا قافلہ، اسی نسیم سحر کی موج حیات تھا۔ بخت نصر نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تھا۔ ایرانیوں کے حملے سے بابل کا تمدن منہدم ہو گیا تھا۔ ایران کے در و دیوار سکندر کے حملوں سے چور چور ہو گئے تھے۔ تاتاری بغداد میں اینٹ پتھر کا ڈھیر چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ لیکن فرزندان اسلام نے خدا کی راہ میں جان و مال کو برباد کیا تاکہ دنیا کو آباد کریں انھوں نے اپنے آپ کو مٹایا تاکہ دنیا کی مٹی ہوئی یادگاریں پھر زندہ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے خون کو بہایا تاکہ دنیا کے چہرے کا وہ آب و رنگ پھر عود آئے۔ جس کو وحشیانہ حملوں کے سیلاب بہا لے گئے تھے۔

انھوں نے اس پاک مقصد کے لئے تلوار ہاتھ میں لی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو چیز سررشتۂ حیات کو پہلے کاٹ دیتی تھی وہ اب تمدن کے بکھرے ہوئے اجزا کو کیونکر جوڑ رہی ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ عرب کے جن میدانوں میں خاک اڑ رہی تھی اس میں نسیم خوشگوار کے جھونکے چلنے لگے۔ ایران کے مٹے ہوئے نقش و نگار پھر ابھر آئے۔ یونان کی برہم شدہ مجلس علم پھر گرم ہو گئی۔ مصر و شام کا کاروان رفتہ پھر لوٹ آیا۔ بیت المقدس پھر تمدن کا قبلۂ مقصود بن گیا۔ پہلوں نے جو کچھ لوٹا تھا۔ انھوں نے وہ سب کچھ واپس دلا دیا۔ پہلوں نے برباد کیا تھا۔ انھوں نے زندگی بخشی۔ ٹیٹس رومی یروشلم آیا تاکہ برباد کرے۔ لیکن اعراب حجاز یروشلم گئے تاکہ اس کے لٹے ہوئے باغوں کو سر سبز و شاداب کریں۔ رومیوں کی فوجیں افریقہ اور ایران سے گذریں لیکن ان کی راہوں میں ہلاکت اور بدحالی تھی۔ ٹھیک انھیں زمینوں پر سے مسلمان بھی گذرے مگر ان کے ساتھ ساتھ تمدن و آزادی اور امن و نظام کے فرشتے سایہ افگن تھے۔

دنیا کی موجودہ اور گذشتہ جنگوں کے نتائج تمہارے

سامنے ہیں۔ قتل، آتش زدگی، سلب ونہب، بربادی علم، ہلاکت عمران وتمدن کے سوا تعین اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آؤ اس قوم کی جنگوں کی یادگاروں کی جستجو میں نکلیں جس نے اپنا مقصد ظہور قیام صلوٰۃ الہٰی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ بتلایا۔ اور اس کے دشمنوں نے اول روز ہی سے اسے مسلح ہو جانے پر مجبور کر دیا ہم ڈھونڈیں گے کہ جنگ کے میدانوں میں وہ اپنے مقصد کی حفاظت کر سکی یا نہیں اور جب خون اور مٹی کے کیچڑ پر سے گذری تو جنگ کی کیا کیا یادگاریں اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔

اس سفر جستجو میں متعدد منزلیں پیش آئینگی۔ سب سے پہلے ہم روحانی یادگاروں کو جمع کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوگا کہ مسلمانوں کے غزوات کی سب سے پہلی یادگار "عبادت الہٰی" ہے۔ عبادت اسلامی کے ارکان عظیم نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ جہاد۔ ان میں سے کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جس کے لئے غزوات اسلامیہ کی یادگاریں سامنے نہ آجاتی ہوں۔ سب سے پہلے نماز سے شروع کیجئے۔

عبادت الہٰی روحانیت کا سرچشمہ، ہدایت قلبی کا منبع، نیکی کا مرکز، برکات الٰہیہ کا محیط اور انسان کو تمام بہیمی قوتوں اور نفسانی جوشوں سے بچانے والی ہے۔ نماز انسان کو تمام برائیوں سے روک دیتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہمیشہ خدا کے تعلق کا تصور قائم رہتا ہے پس وہ ایک قلعہ ہے جو برائیوں کے لشکر کو اپنے اندر گھسنے نہیں دیتا لیکن اس قلعہ کے ستونوں کو اس قوم کے سفر جہاد وغزوات ہی نے قائم کیا تھا۔ "آنحضرت اور مجاہدین کی فوجیں جب پہاڑ لیا کے اوپر چڑھتی تھیں تو تکبیر کا غلغلہ بلند کرتی تھیں اور جب اوپر سے نیچے اترتی تھیں تو سبحان اللہ کا نعرہ مارتی تھیں۔ پس نماز میں قیام وقعود، رکوع وسجود اور تکبیر وتسبیح کو اسی قالب میں ڈھالا گیا"

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز کے ارکان لڑائی ہی کی بدولت وجود میں آئے اس لئے نماز مسلمانوں کی لڑائیوں کی ایک پہلی یادگار ہے تمام نمازوں میں صلوٰۃ الخوف جہاد کے ساتھ مخصوص ہے جس کے احکام اور نمازوں سے مختلف ہیں۔

"اور جب تم مجاہدین کی صف میں نماز پڑھنا چاہو تو پہلے ایک گروہ تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لیکر شریک نماز ہو جائے جب وہ سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہو جائیں تاکہ حفاظت کرتے رہیں اور دوسرا گروہ آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی اور چاہئے کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلح ہو کر تمہارے ساتھ نماز ادا کریں کیونکہ کفار موقع ڈھونڈ رہے ہیں کہ تم اپنے ہتھیار اور اپنے مال ومتاع سے غافل ہو جاؤ تو دفعتاً تم پر ٹوٹ پڑیں"۔

مجاہدین اسلام نے اپنی اس یادگار کے ذریعہ دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کی صداقت کی محافظ قوم دشمن کے مقابلہ میں اپنی روحانی یادگاروں کو کیونکر قائم رکھ سکتی ہے؟ جبکہ میدان جنگ میں تمام قومیں فرصت کے لمحوں کو ستانے اور کھانے پینے میں خرچ کرتی ہیں تو مسلمان تلواروں کے سائے کے نیچے اپنی مہلت کی گھڑیاں صرف اللہ کی عبادت میں صرف کیا کرتے تھے۔

غرضیکہ صلوٰۃ الخوف بھی اسلامی غزوات کی ایک یادگار ہے۔

اسلام میں دو رکعت کی ایک اور نماز بھی بطور یادگار کے قائم رکھی گئی ہے جو ایک مظلوم مجاہد کے جوش مذہبی کی یادگار ہے۔ اسلام صبر واستقلال، تقویٰ وطہارت اور خشوع وخضوع کا ایک قلعہ تھا جس کو میدان جنگ میں کھڑا کیا گیا تھا۔

"خدا ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس استقلال کے ساتھ صف بستہ لڑتے ہیں گویا ایک دیوار ہیں جس کے اندر سیسہ پگھلا کر بھر دیا گیا ہے"۔

اس لئے اسلام نے سخت مصیبت کی حالت میں بھی عزم واستقلال کی زندہ امثال یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اس نے فساد کی لڑائیوں کو روکنے کے لئے عدالت کی جتنی لڑائیاں لڑیں ان کی یادگاروں میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ایک بار آنحضرت صلعم نے فوج کے دس دستے روانہ کئے اور عاصم بن ثابت انصاری کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔ جب یہ لوگ مقام ہرات میں پہنچے تو قبیلہ بنو لحیان کو ان کا پتہ لگ گیا اور انھوں نے دو سو قدر انداز ان کے پیچھے روانہ کیا۔ جب عاصم نے دشمن کے مسلح گروہ کو دیکھا تو پہاڑ پر چڑھ گئے۔ دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر لیا اور امان دیکر پہاڑ سے اترنے کی خواہش کی، لیکن عاصم نے کہا۔ "میں کسی کافر کی امان سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا" اس پر ان لوگوں نے تیروں کی بارش شروع کر دی اور وہ سات آدمیوں کے ساتھ شہید ہو گئے۔

مگر فوج کے تین دستے عہد ومیثاق لیکر اتر آئے۔ ان میں خبیب انصاری اور ابن دثنہ بھی تھے۔ کفار نے کمانوں کی زہ اتار لی اور اس سے ان لوگوں کو باندھ لیا۔ ان کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ پہلی عہد شکنی ہے جس سے مجھے قتل دھوکا

کی بو آتی ہے۔ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتا۔" ان لوگوں نے جبراً ساتھ لے جانا چاہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔ وہ حبیب اور ابن دثنہ کو ساتھ لے لیئے اور مکہ میں غلام بنا کر بیچ دیا۔ قبیلہ بنو حارث ابن عامر نے حبیب کو خرید لیا اور چونکہ یہ وہی حبیب تھے جنہوں نے غزوۂ بدر میں حارث ابن عامر کو قتل کر دیا تھا اس لیئے ان لوگوں نے اس خون کا انتقام لینا چاہا اور ان کو حرم سے باہر قتل کرنے کے لئے لے گئے۔ کیونکہ دارالامن میں قتل ناجائز تھا۔

لیکن حضرت حبیب کے عزم و استقلال نے شہادت کے وقت ایک روحانی یادگار قائم کر دی۔ انھوں نے دشمنوں سے دو رکعت نماز کی اجازت چاہی۔ کفار نے اجازت دیدی تو انھوں نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی، اور کہا کہ تم لوگ اگر اس کو جزع و فزع کے لیت و لعل پر محمول نہ کرتے اور یہ بدگمانی نہ ہوتی کہ میں موت کے وقت میں تاخیر ڈالنے کے لئے بہانہ کرتا ہوں تو میں نماز کو اور زیادہ طول دیتا اور بہت دیر تک اپنے خداوند کے حضور رہتا، اس کے بعد یہ اشعار پڑھے ؎

"جبکہ میں مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جاتا ہوں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ خدا کی راہ میں کس پہلو پر جان دونگا۔"

"میرا قتل صرف خدا کی راہ میں ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو کاٹے ہوئے جوڑوں میں برکت دے سکتا ہے۔"

کفار نے ان کو نہایت بیدردی کے ساتھ باندھ کر قتل کر دیا۔ اور انھوں نے دو رکعتوں کو ہر اس شخص کے لئے بطور ایک زندہ سنت صبر و ثبات کے یادگار چھوڑا جو ایسے ظالمانہ طریقے سے قتل کیا جائے۔

اسلامی غزوات کی ایک یادگار یہ تھی۔

عبادت اسلامیہ کی آسانیوں میں تیمم خدا کی دی ہوئی ایک یادگار آسانی ہے۔ اس کی برکات کا ظہور زیادہ تر سفر ہی میں ہوتا ہے۔ آنحضرت صلعم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا سفر اکثر جہاد ہی کے لئے ہوا کرتا تھا۔ اس لئے سفر ہی میں مسلمانوں کو یہ عطیۂ الٰہی بھی دیا گیا۔ چنانچہ ایک سفر میں حضرت عائشہ آپ کے ساتھ تھیں۔ سوء اتفاق سے راستے میں ان کا ہار کہیں گم ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام صحابہ کے ساتھ اس کے ڈھونڈنے کے لیئے ٹھہر گئے لیکن منزل پر دور تک کہیں پانی کا نام و نشان نہ تھا صحابہ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے اس کی شکایت کی۔ انھوں نے حضرت عائشہ پر ناراضی ظاہر کی کہ تمھاری ہی غفلت نے تمام قوم کو اس مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر آیت تیمم نازل ہوئی اور تمام صحابہ مسرت کے لہجہ میں پکار اُٹھے "اے آل ابی بکر یہ کچھ تمھاری پہلی ہی برکت نہیں ہے"

اس بنا پر تیمم بھی غزوات اسلامیہ ہی کی یادگار ہے۔

حالت سفر میں قصر اور رمضان میں افطار صوم کی اجازت بھی جہاد ہی کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے دی گئی۔ قرآن کریم کی آیات قصر میں صاف طور پر جہاد کے مواقع کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حکم قصر دراصل جہاد کے لئے ہوا تھا۔ (بخاری)

عبادات اسلامیہ میں حج مختلف یادگاروں کا مجموعہ ہے۔ وہ جس گھر میں ادا کیا جاتا ہے۔ خدا کے سب سے برگزیدہ بندے کے ہاتھ کی قائم کی ہوئی یادگار ہے۔

"جب حضرت ابراہیم اور اسماعیل خانہ کعبہ کی دیواریں چن رہے تھے تو اس وقت یہ دعا ان کی زبانوں پر تھی کہ خدایا ہمارے اس عمل کو قبول کرلے۔ تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

بلکہ دنیا کی مذہبی یادگاروں میں سب سے قدیم یادگار وہی ہے۔

"پہلا گھر جو انسان کی پرستش گاہ بنایا گیا وہی گھر ہے جو مکہ میں تمام دنیا کی برکت و ہدایت کے لئے تعمیر کیا گیا۔"

ان بندوں نے خدا کی وحدانیت کی ایک زندہ رہنے والی یادگار قائم کی تھی۔ خدا نے بھی اس میں ان کی یادگار قائم کر دی۔

"اس گھر میں مقام ابراہیم ایک نمایاں یادگار مقدس ہے۔"

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت ہاجرہ کی اس سراسیگی کا منظر تازہ کرتی ہے جب وہ پانی کی جستجو اور بچے کی محبت میں پریشاں حال تھیں۔ چاہ زمزم قدرت الٰہی کی اس کرشمہ سازی کو یاد دلاتا ہے، جس نے وادی غیر ذی زرع (بنجر اور خشک زمین) میں خدا کی رحمت کے دبے ہوئے چشمے کا منہ کھول دیا تھا قربانی

حقیقت اسلامیہ کی اس جاں فروشی اور فدویت کے بہتر روحانی کو محسوس و متمثل کر دکھاتی ہے جس نے حضرت خلیل و ذبیح علیہما السلام کے اندر سے ظہور کیا تھا۔ رمی جمار اس بہیمی و ابلیسی قوتوں سے دنیا کو روکتا ہے جو اس پاک مقصد کی تکمیل میں سنگ راہ ہو رہے تھے۔

لیکن غزوات اسلامیہ نے ان یادگاروں میں ایک یادگار کا اضافہ بھی کر دیا۔ فتح مکہ سے ایک سال پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قریش مکہ سے صلح کر لی تھی۔ جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے اس صلح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لئے تشریف لائے تو صحابہ کو مدینہ کی آب و ہوا نے چور چور کر دیا تھا اور بخار کے عام ابتلاء نے ان کی طاقت رفتار سلب کر لی تھی۔ اس ضعف کا اثر طواف کی حالت میں بھی صاف نمایاں ہوتا تھا اور مکہ والے دیکھتے تھے۔ اس پر کفار نے جو اسلام کی فوجی طاقت کا ہر موقع پر امتحان لیتے رہتے تھے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔ "مدینہ کے بخار نے تو ان کو چور چور کر دیا ہے۔"

اگرچہ ابھی تک عملاً ان کو یہ یقین نہیں دلایا جا سکتا تھا کہ یہی ناتوان ہستیاں، یہی ضعیف بندے ایک دن ان کی قوت کے سر پر غرور کو کچل دیں گے۔ تاہم علامات و آثار دکھلائے جا سکتے تھے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صحابہ کو تندرستوں کی طرح اکڑ کر چلنے کا حکم دیا، کہ روح کی ایمانی قوت کو جسم ضعیف کے پردے میں نمایاں کریں۔ یہ یادگار اب تک قائم ہے اور اس کو فقہا کی اصطلاح میں "رمل" کہا جاتا ہے جس کے معنی اکڑ کر چلنے کے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو موقوف کر دینا چاہا تھا کیونکہ بظاہر یہ ایک وقتی حکم تھا لیکن پھر رک گئے کیونکہ ان کی نظر دقیقہ سنج نے محسوس کیا کہ یہ یادگار مسلمانوں کے لئے ہمیشہ درس شجاعت و تحریک عزائم کا وسیلہ ہے اور ہر سال یاد دلاتی ہے کہ اس کے اسلاف کرام نے ضعف جسمانی کی حالت میں بھی کس طرح اپنی صولت اسلامی کو قائم رکھا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ افک بھی جو ایک سفر جہاد میں پیش آیا تھا اسی سلسلے کی روحانی یادگار ہے۔ یہ یادگار اگرچہ ابتدا میں نہایت درد انگیز معلوم ہوئی لیکن درحقیقت خدا کی رحمت کا بہت بڑا خزانہ اس کے اندر مستور تھا۔ قرآن مجید میں عورتوں کے تمدنی حقوق کی حفاظت کے لئے ایک خاص سورت سورہ نساء نازل ہوئی جس کو عورتوں کی مخصوص یادگار کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی وضع لباس، طرز معاشرت، حقوق منزلی و عشرت کی عام اصلاح کے متعلق اب تک کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس واقعہ کے بعد ہی سورۂ نور نازل ہوئی جو زیادہ تر انہی احکام سے مملو ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں انسانیت کا یہ شریف تر نصف حصہ انتہا درجہ کی بیکسی و ذلت میں ڈال دیا گیا تھا۔ تمدن اور مذہب دونوں نے اس کے ساتھ بے رحمی کی تھی۔ اسلام نے سب سے پہلی مرتبہ عورتوں کے حقوق کا اعلان کیا اور ان کے معاشرتی درجہ کو خاندان میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی۔ لیکن اس انقلاب کا بڑا حصہ سورۂ نور کے نزول سے وجود میں آیا اور سورہ نور ایک سفر جنگ کو یاد دلاتی ہے۔ پس عورتوں کے حقوق کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی اصلاح بھی غزوات اسلامیہ ہی کی یادگار ہے۔

حد قذف اور حد زنا کے متعلق بھی اب تک کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی لیکن اس واقعہ کے بعد ہی ان حدود کی تعین کے لئے آیتیں نازل ہوئیں۔

حضرت عائشہ کی فضیلت اگرچہ عام طور پر مسلم تھی لیکن قرآن مجید کی براءت نے اس کو اور بھی قطعی کر دیا۔ پس یہ واقعہ ان احکام کی روحانی یادگاروں کا ایک مجموعہ ہے جن کو حدود اللہ کے جامع و مختصر لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ ازواج مطہرہ کے فضائل مخصوصہ کا ایک باب ہے جس کو کفار نے کھول دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس کو مسلمانوں کے لئے خیر و برکت کہا گیا ہے۔

"اس واقعہ کو برا نہ سمجھو۔ وہ تو تمہارے لئے موجب خیر و برکت ہوا۔"

دنیا کی دوسری قوموں نے اپنے نمایاں کارناموں کی مادی یادگاریں قائم کی ہیں۔ خاص خاص لڑائیوں کو مختلف محسوس طریقوں سے نمایاں کیا ہے۔ عجائب خانوں میں سلاطین قدیم اور جانباز بہادروں کے آلات جنگ محفوظ رکھے ہیں، ان کی یادگار میں مجلسیں مقرر ہوتی ہیں اور شادی و غم کی قومی و ملکی تقریبیں قائم کی جاتی ہیں۔

اسلام نے اگرچہ اس قسم کا کوئی عجائب خانہ نہیں بنایا، تاہم اس کی یادگاریں محفوظ ہیں۔ اس کی لڑائیوں کی یادگار لوہے

کی تلوار نہ تھی جو عجائب خانہ میں رکھ دی جاتی بلکہ وہ روح اور دل کے تغیرات و انقلابات تھے جن کے لئے تمام عالم انسانیت یکسر عجائب خانہ ہے۔

مکہ اور مدینہ میں عجائب خانہ کے لئے ایک چھوٹی سی عمارت بنادی جاتی تو اس سے کیا فائدہ ہوتا جبکہ تمام دنیا کی سطح ارضی اس کے لئے دارالآثار بن گئی ہے۔ بدر اور حنین کی ڈھالیں اور نیزے یورپ کی طرح ہم نے بچاکر نہیں رکھے کیونکہ بدر کے کنارے نیزوں کے سامنے جو ہاتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے اٹھتے تھے وہ اب تک چالیس کروڑ انسانوں کے اندر سے ہر روز دن میں پانچ مرتبہ اٹھکر بدر کی یاد کو مٹنے نہیں دیتے۔

اور اس محسوس حق نے قائم یادگار رہتے ہیں معنوی و سنگی یادگاروں سے مستغنی کر دیا ہے۔

تجلیاتِ خورشید

پھر آگ دے رہا ہوں محبت کے گھر کو میں

از جناب خورشید سہارنپوری

بٹھلا رہا ہوں آنکھ میں گردِ نظر کو میں
اشکوں سے دھو رہا ہوں ترے رہگذر کو میں

بھولا نہیں ہوں لذتِ زخمِ جگر کو میں
پہچانتا ہوں خوب کسی کی نظر کو میں

جو کمسنی میں فتنۂ محشر سے بڑھ گیا
اس مبتدا کی ڈھونڈ رہا ہوں خبر کو میں

عنواں سیاہ دیکھ کے غربت کی شام کا
دُہرا رہا ہوں قصۂ صبحِ سفر کو میں

پھر دل میں ہے خیالِ رخِ تابناک کا
پھر آگ دے رہا ہوں محبت کے گھر کو میں

ہر شامِ غم ہے پردۂ صبحِ نشاط و عیش
پیچھے دھوئیں کے دیکھ رہا ہوں شرر کو میں

ہنگامِ نزع کھینچ کے اک دو نفس طویل
اُکسا گیا فتیلۂ شمعِ سحر کو میں

زندانیٔ حیات رہا مر کے بھی اسیر
پاتا ہوں قبر میں بھی تو دیوار و در کو میں

آواز دے تو کوئی بیاباں نورد پھر
دیکھے تو پھونک دوں گا نہ کس طرح گھر کو میں

کچھ جلوۂ حسیں سہی جز عشرتِ خیال
سمجھا ہوں حسن اپنے فسونِ نظر کو میں

آوارگیٔ ساحتِ گلشن کا دم نہیں!
بیٹھا ہوں اب قفس میں لئے بال و پر کو میں

خورشید جل بجھا ہے اُدھر کا جہاں تمام
کروٹ بدل چکا ہوں شبِ غم جدھر کو میں

پھول والی گلی

دلآویز کہانی

از جناب انتصار حسین نیوتنوی

چمپا کے گجرے اور منگلو کمہار کی صراحیاں، گرمیوں میں ہمارے شہر کی خاص یادگاریں ہیں۔ اب نہ چمپا ہے نہ منگلو، مگر بہتوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ گجرے چمپا بناتی ہے اور صراحیاں منگلو۔ یہ باتیں میرے زمانے کی نہیں ہیں مگر بزرگوں سے ان کے بڑے بڑے چرچے سُنے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں چمپا کے گجروں کا یہ حال تھا کہ اس کا ایک ہار گلے میں ڈال کر نکلو تو سارا محلہ خوشبو سے بس جاتا تھا۔ اسی طرح یہ روایت مشہور ہے کہ منگلو سال میں صرف بیس صراحیاں بناتا تھا اور وہ گرمی شروع ہونے سے پہلے ہی بک جاتی تھیں۔ اب بھی یہ دونوں دکانیں موجود ہیں اور خوب چلتی ہیں۔ ان پر بڑے بڑے تختے لگے ہیں۔ ایک پر لکھا ہے چمپا کے گجرے اور دوسرے پر لکھا ہے منگلو صراحی والا۔ یہ دونوں قدیم دکانیں ایک گلی کے اندر ہیں جو پھول والی گلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پھولوں کی دکانیں بہت ہیں اور شام کو جو چہل پہل یہاں ہوتی ہے شاید شہر کے کسی حصہ میں نہیں ہوتی۔

اس گلی میں زیادہ بھیڑ بھاڑ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گلی کے فوراً ہی بعد ایک چوک ہے جہاں کے تمام تماشبین اسی گلی سے ہو کر گذرتے ہیں۔ اس گلی میں پھولوں کی دو رُخی دکانیں بہت دور تک چلی گئی ہیں اور سب سے آخر میں چمپا کی دکان ہے۔ پھر اس کے بعد منگلو صراحی والے کی۔ آس پاس پھولوں اور صراحیوں کی بہت سی دکانیں ہیں مگر جتنے پیسے ان دونوں دکانوں میں آتے ہیں شاید گلی بھر کی دکانوں میں نہ آتے ہوں۔ چمپا کی دکان پر ایک جوان لڑکی پھولوں اور گجروں کی ٹوکریاں لئے بیٹھی رہتی ہے۔ کچھ گجرے کھلے ہوئے پھولوں کے ہوتے ہیں اور بعض مُنہ بند کلیوں سے گندھے ہوئے۔ منگلو کی دکان پر ایک بڈھا خرانٹ بیٹھ کر اونگھا کرتا ہے۔ پھول اور مٹی میں جو مناسبت ہے وہی پھول بیچنے والی لڑکی اور صراحی بیچنے والے بڈھے میں ہے۔ لڑکی جتنی ہنس مکھ اور خوشرو ہے بڈھا اتنا ہی اکھڑ اور بدمزاج۔

رات دن میں نہ جانے کتنے منچلے اس گلی سے گذرتے ہیں، کچھ گاتے ہوئے۔ کچھ ہنستے ہوئے اور کچھ اس طرح نیچی گردن کئے ہوئے کہ اگر ضرورت نہ ہوتی تو اس گلی میں نہ آتے۔ پھول بیچنے والے گجرے بناتے بناتے اکثر بابا نصیر خاں کا یہ دادرا گانے لگتے ہیں۔ "چلے چھوڑ بدروا" اکثر طوائفیں بھی اس گلی میں آنکلتی ہیں۔ اور اس آن بان کے ساتھ گویا گلی ان کے باپ کی ہے۔ یہ جس دکان پر پہنچ گئیں ایک آدھ گجرا اٹھا لیا۔ یا کسی نے خود ہی گجرا ان کے گلے میں ڈال دیا۔ ان کے آتے ہی ایک قسم کا طوفان بدتمیزی گلی کے اندر سما جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ "لاڈلی! صبح سے یہ گجرا تمہارے انتظار میں رکھ چھوڑا ہے۔ قسم ہے پالنے والے کی ۱۲ ٹکے ملا کئے اور نہیں دیا۔ اور تم نے صبح سے شکل ہی نہ دکھائی" طوائف ذرا نخرے سے بولتی۔ "اور کیا نگوڑے ایک گجرے کے لئے میں اتنی دور سے چل کر آتی۔ کبھی کوئی اچھا سا گہنا بنا کر دیتے تو ہاں یہ بھی سمجھتی کہ مجھے چاہتے ہو۔"

اور پھر دوسرے دکاندار ان پر آوازے کسنے لگتے۔ اکثر معزز اور خاندانی طوائفیں بھی اس گلی سے گذرتی ہیں مگر اپنے کوئے دیئے ہوئے۔ راستے بھر میں انہیں دو چار فرمائشی سلام کئے جاتے ہیں۔

"آداب، عرض ہے بائی خورشیدی۔ مزاج تو اچھے ہیں؟"

"مہربانی ہے حضور کی۔ آپ کے مزاج؟ یہ آخر آنا کیوں چھوڑ دیا آپ نے؟"

اس قسم کی رسمی خودداری کے ساتھ انہیں بائی جی جواب دیتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔ اکثر بے تکلف دکانداران کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ کوئی ان سے کہتا "تم آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے" اور کوئی انہیں دیکھ کر فانی کا یہ مصرعہ پڑھنے لگتا "کفن سرکاؤ میری بے حجابی دیکھتے جاؤ" اور بائی جی مسکراتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔

گلی کے نکڑ پر جہاں سے چوک کا بازار شروع ہوتا ہے

وہاں شاہی زمانے کا ایک امام باڑہ ہے۔ بوسیدہ، ٹوٹا پھوٹا، اپنی حالت پر خود نوحہ خواں۔ اس کے نیچے کے حصے میں کمہار بسا دیئے گئے ہیں اور اوپر کا حصہ غریب طلبا، کو مفت رہنے کے لئے دیدیا گیا ہے۔ ان طالب علموں میں میرا ایک دوست ارشد ہے۔ اسی امام باڑے کی طرح سکین اور غمزدہ۔ یہ میرا بہت جگری دوست ہے۔ میں روز شام کو اس سے ملنے جاتا ہوں۔ گلی سے گزرتے وقت مجھے کچھ گدگدی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ کبھی کسی سے کندھا لڑ گیا۔ کبھی کسی کے جسم کو بچا کر نکل گیا۔ کبھی کبھار کوئی دکاندار دیکھ کر پکار اٹھا "او میاں صاحبزادہ ایک ہار لیتے جاؤ۔" چمپا کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ایک اچٹتی ہوئی نظر لڑکی پر ضرور ڈالتا ہوں اس کی دکان پر ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ لڑکی مسکرا مسکرا کر سب کو گجرے دیتی رہتی ہے۔ کئی دفعہ دل چاہا کہ اس کی دکان پر کھڑے ہو کر ایک گجرا خریدوں۔ مگر ہمت نہ پڑی۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔ "لڑکی سے گجرا خریدتا ہے۔" اور میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا امام باڑے میں داخل ہو جاتا ہوں۔

ارشد جس کمرہ میں رہتا ہے اس کی کھڑکیاں اسی گلی کی طرف کھلتی ہیں۔ اگر ساری کھڑکیاں ایک ساتھ کھول دی جائیں تو بہت دور تک اس گلی کی چہل پہل اور آمد و رفت دکھائی دیتی ہے۔ ایک کھڑکی تو بالکل چمپا کی دوکان کے سامنے ہی ہے۔ میں زیادہ تر اسی کھڑکی کو کھول کر کرسی پر بیٹھا رہتا ہوں۔ اور اس لڑکی کی دکانداری دیکھا کرتا ہوں۔ ایک آیا۔ دو آئے۔ تین آئے۔ دس گئے۔ غرض دن بھر آدمیوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ پھر ایک چیز کی بکری نہیں ہوتی، کوئی دلہن کا گہنا مانگتا ہوا آتا ہے۔ تو کوئی نوشہ کے سہرے۔ دو چار دس منچلے دن بھر میں پھولوں کے بستر بھی خرید کر لے جاتے ہیں۔ جو پھولوں کی سیج کے نام سے مشہور ہیں۔ یہی حال ملی ہوئی مٹکلو کی دکان کا ہے۔ اس کی سیکڑوں صراحیاں ہاتھوں ہاتھ نکلی چلی جاتی ہیں۔ بڈھے کی بدمزاجی اور سا کھڑپن کا کوئی خاص اثر دکانداری پر نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ لوگ اب عادی ہو گئے ہیں۔ گاہک نے صراحی لی، اسے پیسے سے بجایا۔ پھر بولا "بڑے میاں! اس میں ٹھناکے کی آواز نہیں ہوتی، کہیں ٹوٹی ہے؟"

بڈھا بگڑ جاتا اور پیسے گاہک کے سامنے پھینک کر کہتا "بہت سی دکانیں موجود ہیں۔ گھوم آیئے۔ لوٹ کر آیئے گا تو دگنی قیمت پر دونگا۔ بولتی نہیں! بولتی نہیں! کیا کوئی انسان ہے جو بولے؟"

دوسرے دکاندار گیدڑوں کی طرح غل مچاتے۔ ادھر آیئے ادھر آیئے جناب —— اجی یہ دیکھئے جھنجھری دار صراحی۔ دوسری طرف سے آواز آئی "اجی یہ لیجئے بابو صاحب! چھ مہینے پورے بانو پر گزری رکھی رہی ہے۔ جب پانی بھر کر پیجئے گا تب کہئے گا۔" اور تیسرا اپنی دکان سے چلا کر کہتا "یہ صراحی نہیں بابو صاحب! چشمہ ہے چشمہ پانی میں آب زمزم کا مزہ نہ آئے تو میرا ذمہ۔" غرض اس چاؤں چاؤں میں گاہک خود گھبرا جاتا ہے اور کسی طرف چپکے سے چلدیتا ہے۔ یہ بڈھا بڑا ہوشیار اور زمانہ شناس ہے۔ وہ چاؤں چاؤں کی قطعی پروا نہیں کرتا۔ جب کوئی گاہک بڈھے کی دکان سے لوٹ جاتا ہے تو وہ صراحی کو وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ جیسے اس بات کا یقین ہو کہ ابھی پھر آ کر لے جائے گا۔

سر شام چمپا کی دکان کے سارے گجرے ایک آدمی لیکر چوک کے بازار میں چلا جاتا ہے۔ عجیب خوش بیانی اور ترنم کے ساتھ وہ سارے بازار کا چکر لگاتا ہے۔ "ہار بیلے کے ہیں۔ گجرے جوہی کے ہیں۔" کوٹھوں کے اوپر سے طوائفیں اپنی جھیبوں میں ڈوریاں باندھ کر نیچے لٹکا دیتی ہیں وہ ان میں ہار ڈالدیتا ہے اور پھر چھبیاں اوپر کھینچ لی جاتی ہیں۔

اس سڑک پر چلنے والے نہ سامنے دیکھتے ہیں اور نہ دائیں بائیں۔ سب کی نگاہیں اوپر لگی رہتی ہیں۔ اکثر مختلف سمتوں سے آنے والے لوگ، آپس میں ٹکرا جاتے ہیں اور پھر خفیف ہو کر ایک دوسرے سے معافی مانگنے لگتے ہیں۔

یہاں کی تمام طوائفیں شام کو اپنے کمروں سے نکل کر صحنچیوں میں بیٹھتی ہیں۔ اور اپنے حسن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسا نہیں کرتیں اور ان کے کمروں سے قہقہوں کی گونج۔ راگ راگنیوں کی گتیں اور مختلف قسم کا شور و غل سنائی دیتا ہے۔

جسم فروشی کا یہ بازار ساری رات اسی طرح جگمگا کر صبح ہوتے ہوتے خاموش ہو جاتا ہے۔ بجنسہ اس گھر کی طرح جہاں سے باراتی دلہن کو لے جا چکے ہوں۔ ارشد کو یہ نظارے ایک آنکھ نہیں بھاتے وہ ٹھوس اور سنجیدہ طبیعت کا انسان ہے۔ جب کبھی میں نے اس سے چوک چلنے پر اصرار کیا اس نے کچھ نہ کچھ بہانہ کر دیا۔

"ارے یار کیسے جوان ہو؟" میں نے باتوں باتوں میں کہا۔

وہ بولا۔ "میں بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں داخل ہو گیا ہوں۔ جوانی تو تمہارا حصہ ہے۔ تم ہی اس کے مزے اڑاؤ۔"

"چہ - بڑھاپا، بڑھاپا، عجیب آدمی ہو - ارماں پھر پیدا ہی کیوں ہوئے تھے - اور یا پھر بچپن سے سیدھے قبر میں داخل ہو جاتے - چلو اٹھو آج تمھارے بڑھاپے کا علاج ہو جائے گا۔"

غرض بہت تو تو میں میں کے بعد وہ چلنے پر راضی ہوا - آج صبح ہی سے میرے دماغ میں اس قسم کے خیالات آ رہے تھے - مہینے کی پہلی یا دوسری تاریخ تھی - اور جیب خرچ جو کچھ ملا تھا - وہ ویسا کا ویسا ہی موجود تھا -

"یعنی کیا ذہنیت ہے" ارشد چلتے چلتے بگڑ کر بولے "چمپا کی دکان پر جایا نہیں جاتا اور چوک کی سیر کرنے چلے ہیں - آخر تم اتنی ہمت کس طرح کر سکو گے؟"

"جس طرح آپ نے بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں داخل ہونے کی ہمت کی - سوچو نہ بالکل وہی بات ہے - آپ جوانی پھاند گئے - میں چمپا کی دکان پھاند سے جاتا ہوں"

"مگر میں نے فطرتاً ایسا کیا اور تم فطرت کے خلاف ایک کام کرنے جا رہے ہو"

"نہیں نہیں، جو کچھ تم نے کیا وہ فطرت کے خلاف کیا اور میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ عین فطرت ہے - دیکھو ابھی اس کا اطمینان ہوا جاتا ہے"

اس قسم کی باتوں سے راستہ کٹتا چلا گیا - نکڑ کی حد سے گذر کر جس وقت ہم بازار میں داخل ہوئے تو ایک بڑی بی نے آکر سلام کیا - مزاج پوچھا، پھر ارشد کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں "کہاں چھے میاں صاحبزادے میں تو روز آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتی تھی"

ارشد تو سٹپٹا سا گیا - اور میں یہ سمجھا کہ بڑھیا ضرور ارشد کی کوئی عزیزیا ہمو طن ہے - اور سرے سے بسم اللہ ہی غلط ہو گئی - اسی طرح اگر کوئی میرا عزیز مل گیا تو صبح کو خوب گت بنے گی -

"چلئے کہیں گھما لاؤں" بڑھیا ذرا مسکرا کر بولی -

"گھومنے تو ہم آئے ہی ہیں"

"آہستہ آہستہ بولئے" بڑھیا نے میرا ہاتھ دبا کر کہا "آپ لوگ شریف ہیں - کوئی سن لیگا تو کیا کہیگا"

"کہاں گھمانے لیچلو گی؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا -

"پرستان کی سیر کراؤں گی - وہ پریاں دکھاؤں کہ آپ اپنی شامل ہوں - آیئے میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے"

اتنا کہہ کر وہ ایک اور گلی میں مڑی - اور ہم دونوں پیچھے پیچھے چلے دیئے - ارشد نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا -

"ارے ڈائن ہے ڈائن، چلو لوٹ چلو"

"چلو بھی پرستان نہ چلو گے؟"

بڑھیا نے پیچھے مڑ کر کہا "ہولے ہولے باتیں کیجئے میاں آپ لوگوں کو اپنی عزت آبرو کا خیال نہیں"

پھر ہم دونوں خاموشی کے ساتھ راستہ طے کرنے لگے - گلی در گلی میں گھومتے گھماتے آخرکار ہم دونوں پھر اسی پھول والی گلی میں پہنچ گئے - اب بڑھیا کے قدموں کی رفتار سست پڑنے لگی - آخرکار اس نے ایک دروازے پر پہنچ کر دستک دی -

"کھولتی ہو کہ لوٹ جاؤں؟"

"کون! بوا کریمن؟" اندر سے آواز آئی -

"ہاں ہاں کھولو تو سہی!"

ایک مسن لڑکی نے آکر دروازہ کھولا - پھر بولی "سلام بوا کریمن"

"جیتی رہو" —— آیئے سرکار! کریمن نے پیچھے مڑ کر ہم دونوں کو دعوت دی -

یہ ایک بوسیدہ سا گھر تھا - چھوٹا سا آنگن، سامنے ایک دالان اور اسی سے ملا ہوا ایک زینہ کوٹھے پر چلا گیا تھا - ہم دونوں ان بلائے مہمانوں کی طرح آنگن میں جا کر کھڑے ہو گئے -

"چلو میاں اوپر بالاخانے پر" کریمن خوش ہو کر بولیں -

"بہت اچھا" اور ہم دونوں کھٹ کھٹ کرتے اوپر پہنچے - جہاں ایک دوسری صاحبہ پلنگ پر صاف چادر لگا رہی تھیں -

"تسلیم!" وہ ذرا آنکھیں مٹکا کر کہنے لگیں -

"سلام! سلام" ہم دونوں نے یکے بعد دیگرے جواب دیا -

"آیئے بیٹھئے!"

ہم دونوں بیٹھ گئے -

"گرمی بہت ہے - شیروانیاں اتار دیجئے نا؟"

ہم نے شیروانیاں اتار کر ٹانگ دیں -

"کچھ باتیں کیجئے"

"جی —— جی ——" ہم دونوں نے باری باری کہا -

اتنے میں پہلی والی صاحبہ بھی اوپر آ گئیں اور انھوں نے ہم دونوں کو لیٹ جانے کی دعوت دی -

ہم دونوں ایک ساتھ لیٹ گئے -

"کیا آپ لوگ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں؟" ایک صاحبہ نے مسکرا کر پوچھا

"جی ہاں! جی ہاں" ہم دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"اچھا آپ دونوں الگ الگ پلنگوں پر بیٹھیے" دونوں نے ایک دوسرے کو ہنستے ہوئے دیکھ کر کہا۔

ہم دونوں ایک ساتھ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

ایک نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے دوسری طرف چھت پر لے کر چلی گئی۔ یہاں بھی ایک پلنگ پہلے سے بچھا ہوا تھا۔ سرہانے پانی سے بھری ہوئی صراحی رکھی تھی۔ اور تکیہ پر بیدردی سے کچھ گجرے بکھرے پڑے تھے۔ میں پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"اب بیٹھیے نا؟" وہ بولی۔

"اور آپ؟"

"میں پہرہ دونگی"

"تو آپ بیٹھیے میں پہرہ دونگا" میں نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔

"اور جو ہم اور آپ دونوں —" لڑکی نے اتنا کہہ کر سامنے والے چراغ کو پھونک مار کر بجھا دیا۔

اتنے میں کہیں دور سے پہرہ والے نے صدا لگائی "جاگتے رہو"

"کچھ باتیں کیجیے" وہ بولی۔

"تھوڑا سا پانی پلائیے۔ میرا حلق خشک ہو گیا ہے"

اس نے صراحی سے پانی انڈیل کر دیا۔

"اہاہا کتنا ٹھنڈا پانی ہے۔ کیا یہ صراحی منگلو کی دکان کی ہے؟"

"جی ہاں"

"اماں ارشد!" میں نے پکار کر کہا "منگلو کی صراحی کا پانی —"

"آئیں! یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ جو ان کو اس وقت پکارنے کی کیا ضرورت تھی؟ توبہ توبہ شرم نہیں آتی آپ کو۔ دیکھئے وہ کہیں کچھ لیے ہیں"

"ہاں حماقت تو کی میں نے۔ بھول گیا تھا۔ معاف کیجیے گا"

"خبردار اب کوئی اور حماقت نہ کیجیے گا"

"نہیں نہیں آپ اطمینان رکھیں۔ لو اور یہ ہار کہاں کے ہیں؟"

"یہ ہار — چمپا کی دکان کے؟"

"اہاہا! بھئی کیا پیاری خوشبو ہیں۔ آپ روز چمپا کے ہار خریدتی ہیں؟"

"روز —!"

"آپ کہیں تو ایک ارشد کو دے آؤں؟"

"پھر وہی! کیا مردوں میں شرم و حیا بالکل نہیں ہوتی؟"

"او بھول گیا — اُن سے تو ملاقات ہی نہیں ہو سکتی معاف کیجیے گا"

"توبہ ہے! — معافی مانگنے اور معافی دینے میں ساری رات کٹ جائے گی"

"تو پھر کیا سو رہوں؟"

"نیند آ رہی ہو تو ......"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پہرہ والے کی صدا پھر کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "جاگتے —— رہو!"

صبح تڑکے میری آنکھ کھلی۔ نیچے ڈھابلی میں کوئی مرغا ککڑوں کوں کا شور مچائے ہوئے تھا۔ میں جلدی سے اٹھا۔ سوچا کہ ارشد کو چل کر جلدی سے جگا دوں مگر وہ پہلے ہی سے جا چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی اچکن پہنی۔ جیبیں ٹٹولیں تو خالی — مجھے اپنی غلطی کا احساس بُری طرح ہوا۔ گھر سے نکلا تو گلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اُمسی ہوئی گرمی میں لوگ چارپائیوں پر بے سُدھ پڑے خراٹے مارتے تھے۔ دکانیں سب بند تھیں۔ جگہ جگہ باسی پھول پڑے تھے۔ صراحیوں کے کچھ ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں کتے چپڑ چپڑ پانی پی رہے تھے۔ اتنے میں چمپا کی دکان کا ایک پٹ کھلا اور وہی لڑکی جھاڑو لیئے ہوئے باہر نکلی اور مجھے دیکھ کر پھر اندر گھس گئی۔ آگے بڑھا تو بڑھا صراحی والا لوٹا ہاتھ میں لیئے ہم پولس سے نکل رہا تھا۔ میں نے قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔ جیسے ہی میں نے امام باڑے کے پھاٹک پر قدم رکھا موذن نے کہیں دور سے اذان دی — اللہ اکبر! — ساتھ ہی کسی مندر سے گھنٹہ بجنے کی آوازیں آئیں۔ کمرہ میں پہنچا تو ارشد بولا "شب بخیر" مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری زبان کو تالے لگ گیا ہے!



عہدِ رنگیں!

بھلانے پہ وہ اور یاد آ رہے ہیں!

از :- حضرت خمار بارہ بنکی

مرے عہدِ رنگیں کے یاد آ رہے ہیں
ہم اپنے تخیّل سے شرما رہے ہیں

لبوں پر تبسّم نگاہوں میں مستی
اداؤں کے جھرمٹ میں وہ آ رہے ہیں

نظر لڑ گئی ہے جو میری نظر سے
پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں

بڑی دشمنی کی مرے ساتھ ناصح
بھلانے پہ وہ اور یاد آ رہے ہیں

سراپا خموشی، مجسّم تحیّر،
نہ جانے کسے یاد فرما رہے ہیں

وہ لبہائے نازک پہ بارِ تکلّم
وہ گویا کھڑے رنگ برسا رہے ہیں

کرم کر فریبِ تصوّر کرم کر
اب آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں

مخاطب ہے اُن کی طرف ساری محفل
نگاہوں کے نرغے میں وہ آ رہے ہیں

خبر لے اب اے اعتبارِ محبّت
کسی کی نظر سے گرے جا رہے ہیں

خمار اُس نے جب پھیر لی ہیں نگاہیں
تو پھر کس لئے ہم جئے جا رہے ہیں؟

سلف صالحین اور خودداری

انسانیت کبریٰ کا ایک گمشدہ ورق

ازالحاج مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے

خودداری وہ بیش بہا اور انمول دولت ہے کہ جب وہ کسی کے ملک میں آجاتی ہے تو پھر کسی اور مادی دولت کی پروا نہیں رہتی۔ اسلام نے اس چیز کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اللہ پاک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی فضیلتوں میں ایک فضیلت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ خوددار ہیں چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافا (سورۂ بقر)

ترجمہ (خیرات) ان حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں بیٹھے ہیں اور اگر کسی طرف جانا چاہیں تو جا نہیں سکتے۔ جو شخص ان کے حال سے بے خبر ہے وہ ان کی خودداری کی وجہ سے ان کو غنی سمجھتا ہے لیکن (اے مخاطب) تو اگر ان کو دیکھے تو ان کی صورت سے ان کو صاف پہچان لے (کہ محتاج ہیں مگر ہاں) لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

غیروں کے سامنے دست درازی، استغنا کے لئے بیحد مضر اور انسان کے دامن غیرت پر بہت ہی بدنما داغ ڈالنے والی شے ہے اسلام نے اسے بہت ہی سختی کے ساتھ روکا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ لا تلحفوا بی من المسئلۃ الحدیث سوال کرنے میں مجھ سے لپٹا نہ کرو۔ (دارمی صفحہ ۲۰۵) بعض کو سوال کرنے اور مانگنے کی کچھ ایسی بری عادت ہو جاتی ہے کہ باوجودیکہ ان کے پاس ضروریات زندگی ہوتی ہیں وہ اپنی اس عادت قبیحہ سے باز نہیں آتے۔ ان افعال کو اسلام اور شارع اسلام نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

عن عبد اللہ ابن مسعود قال رسول اللہ صلعم من سال الناس ولہ ما یغنیہ جاء یوم القیمۃ ومسئلتہ فی وجھہ خموش او خدوش او کدوح

کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

قیل یا رسول اللہ ما یغنیہ قال خمسون درھما او عوضھا من الذھب (ترمذی جلد ا صفحہ ۱۱۵)

عبداللہ ابن مسعود کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ بقدر کفاف ہوتے ہوئے جس نے لوگوں سے مانگا قیامت میں وہ اور اس کا مانگنا پیش ہوگا اس حال میں کہ اس کے چہرے پر سخت خراشیں ہونگی۔ کہا گیا کہ کفاف کیا چیز ہے فرمایا ۵۰ درہم یا اس کی قیمت سونے سے"۔

مسلمانوں کی بدقسمتی اور پستی کی حد ہو گئی کہ ان میں مانگنے والا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا ہے (فقیر) ان کا دن رات کا شغل صرف یہ ہے کہ وہ گھر گھر مانگا کریں۔ خواہ وہ کتنے ہی قوی اور توانا ہوں۔ حضور صلعم نے اس کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ لا تحل الصدقۃ لغنی ولا لقوی مرۃ سوی (ترمذی جلد ا صفحہ ۱۱۵) مالدار اور مضبوط آدمی کے لئے صدقہ لینا حرام ہے۔ ایک مرتبہ ایک بدوی نے آنحضور کی ردائے مبارک پکڑ کر کوئی چیز مانگی۔ حضور نے اس کو دے دیا اس کے بعد فرمایا کہ ان المسئلۃ لا تحل لغنی ولا لقوی مرۃ سوی الا لذی فقر مدقع او غرم مفظع۔ مالدار اور قوی آدمیوں کے لئے سوال کرنا جائز نہیں مگر صرف بہت ہی نادار کو یا بالکل مجبور قرضدار کو۔ (ترمذی صفحہ ۱۱۵)

حضرت ابوسعید خدری کا بیان ہے کہ ایک بار انصار کے کچھ لوگوں نے حضور سے کچھ مانگا۔ آنحضرت نے ان کے سوال کو پورا کر دیا۔ پھر انھوں نے دوبارہ مانگا۔ پھر آپ نے پورا کیا۔ پھر مانگا۔ یہاں تک کہ جو کچھ سرمایہ تھا سب ختم ہو گیا۔ تو آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔

"ما یکون عندی من خیر فلن اذخرہ عنکم ومن یستعفف یعفہ اللہ ومن یصبر یصبرہ اللہ لما اعطی احد عطاء ھو اخیر۔ (منفق الحدیث دارمی شریف)

میرے پاس کچھ اور بھی ہوتا تو میں تم سے چھپا کر نہ رکھتا۔ جو شخص طالب عفت ہوتا ہے خدا اس کو عفیف بناتا ہے اور جو مستغنی اور بے نیاز ہونا چاہتا ہے خدا اسے مستغنی اور بے نیاز کر دیتا ہے۔ جو صبر کرتا ہے خدا اسے صبر دیتا ہے اور جس کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع تر ہے۔ (دارمی ص۲۰۶)

حکیم ابن حزام ایک بہت بڑے صحابی ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے آنحضرتؐ سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا۔ حضور صلعم نے عنایت فرمایا پھر مانگا پھر دیا، پھر مانگا پھر دیا۔ اس بار آپ نے فرمایا کہ

یاحکیم ان ھذا المال خضر حلو فمن اخذہ باشراف نفس یبارک لہ فیہ ومن اخذہ بھوی لم یبارک لہ فیہ کان کالذی یاکل ولا یشبع (دارمیؒ)

ترجمہ۔ اے حکیم یہ مال نہایت شیریں ہے جس نے سخاوۃ نفس حاصل کی اس کو اس میں برکت دیجائے گی۔ اور جس نے نفس کی خواہش سے لیا اس میں برکت نہ ہوگی۔ وہ ایسا ہی ہے کہ کھاتا ہے اور آسودہ نہیں ہوتا ہے۔

ایک راوی کا بیان ہے کہ پھر اس تاریخ سے حضرت حکیمؓ نے کسی سے سوال نہ کیا یہاں تک کہ جب فاروقی دور آیا اور فتوحات کی کثرت ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کو مال غنیمت سے کچھ دینا چاہا انھوں نے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر پیش کیا۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ تیسری بار پھر کچھ عنایت کرنا چاہا آپ نے پھر انکار کیا، اور حضورؐ کے وہی نصیحت آمیز کلمات کا اعادہ کرکے دربار فاروقی میں عذر خواہ ہوئے اور مرتے دم تک پھر انھوں نے کسی سے ایک پیسہ کی بھی خواہش ظاہر نہ فرمائی۔ (طبقات ابن سعد جلد ۳)

مال خمس سے ایک حصہ اہلبیتؓ کو ملتا تھا۔ جس کا انتظام رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ کے متعلق کر دیا تھا۔ شیخین کے زمانہ میں بھی وہ اس عہدے پر مامور تھے۔ ایک بار حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کہیں سے بہت مال آگیا۔ حضرت عمرؓ نے حسب معمول حضرت علیؓ کو دینا چاہا آپ نے نہایت خوددارانہ انداز میں فرمایا۔ "میں نہیں چاہتا" بولے۔ "یہ تو تمھارا حق ہے" کہا اس سال تو ہم اس سے بے نیاز ہیں البتہ مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہے ان کو دیدیجئے۔ (ابوداؤد کتاب الخراج)

حضرت ابوبکرؓ کی خودداری کا یہ حال تھا کہ اگر سواری پر سے ان کا کوڑا بھی گر جاتا تو خود اتر کر اٹھا لیتے لیکن کسی سے اس کے متعلق سوال نہ کرتے۔ (اصابہ فی تمیز الصحابہ جلد اوّل)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس قدر بے نیاز واقع ہوئے تھے کہ جب عبدالعزیز بن مروانؒ نے ان کو لکھا کہ آپ اپنی ضرورتوں کو میرے دربار میں پیش کیجئے تو اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے الید العلیا خیر من الید السفلی۔ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ تم خیرات اس شخص سے شروع کرو جس کے تم کفیل ہو۔ نہ میں تم سے کچھ مانگتا ہوں اور نہ اس رزق کو واپس کرتا جو خدا مجھ کو تمھارے ذریعہ سے دیتا ہے۔ (مسند ابن حنبل ج ۲ ص)

ایک بار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن ارقمؓ کو تین ہزار درہم دینا چاہے مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ (استیعاب تذکرہ عبداللہ بن ارقم)

اسی طرح ایک بار حضرت وائل ابن حجرؓ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس آئے۔ انھوں نے نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا اور ان کو عطیہ دینا اور وظیفہ مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے کہا کہ ہم اس سے بے نیاز ہیں جو اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں وہ اسے قبول کر لیں گے۔ (استیعاب تذکرہ وائل ابن حجرؓ)

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کے ایک سرگرم رکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے لوگوں نے جب ان کا نام خلافت کے لئے پیش کرنا چاہا تو آپ نے کھلے لفظوں میں یہ فرما دیا کہ مجھ کو خلافت کی ہوس نہیں۔ میں اپنے حق خلافت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ یہ کیا تھا؟ یہ صرف استغنا اور خودداری تھی جس نے ان مقدس اور بزرگ ہستیوں کو ایسے ایسے عالی اور جلیل القدر مناصب کے قبول کرنے سے باز رکھا۔ (تاریخ ابن جریر طبری)

ایک بار امیر سلیمان نے اہواز سے ایک قاصد امام ادب خلیلؒ بصری کے پاس روانہ کیا اور ان کو امیر زادے کی تعلیم کے لئے طلب کیا۔ قاصد کی خبر پا کر وہ باہر تشریف لائے۔ خشک روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں تھا۔ یہ ٹکڑا قاصد کو دیا اور کہا میرے پاس تو صرف یہی ماحضر ہے اور جب تک یہ موجود ہے خلیل کو سلیمان کی پروا نہیں۔ اس کے بعد فی البدیہہ وہ اشعار کہے جن کو خودداری کی روح سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں ؎

ابلغ سلیمان انی لجنه فی سعة
وفی غنی عنه انی لست ذا مال

سلیمان کو باخبر کر دو کہ میں نہایت وسعت و غنا میں ہوں، اگرچہ میں مالدار نہیں۔

والفقر غنی النفس لا فی المال تعرفه
ومثل ذاک الغنی فی النفس لا مال

فقر نفس میں ہے مال میں نہیں اور اس قسم کے غنی بھی نفس ہی کے ہوا کرتے ہیں مال کے نہیں۔ (نزہتہ البلاغۃ فی تذکرۃ الاولیاءؒ)

حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو سعد بن وقاصؓ والی کوفہ کی طرف قاصد بنا کر بھیجا اور ساتھ ہی ساتھ ان کو کچھ خرچ بھی دینا چاہا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں یہاں تک کہ جب وہ کوفہ واپس آئے تو ان کا زادراہ ختم ہو گیا، تب انھوں نے درختوں کی چھال پر گذر اوقات کی۔ (تذکرۃ الاخیار)

نافعؓ نے حضرت ابن عمرؓ کی تین برس خدمت کی۔ ایک بار ابن عامرؓ نے تین ہزار روپیہ عنایت کیا۔ نافعؓ نے اپنے آقا ابن عمرؓ پر پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے خدشہ ہے کہ ابن عامرؓ کے درہم مجھ کو فتنے میں ڈالدیں گے۔ لیجاؤ اور اس کے ساتھ تم بھی آزاد ہو۔ (اخبار الدخل)

حضرت قاسمؒ نے ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ نہ قبول کیا، حالانکہ وہ ان کا حق تھا۔ (تاریخ الصلحاء)

سلمان بن عبدالملکؒ کا ایک بار کعبہ سے گزر ہوا وہاں انھوں نے سالمؒ (جو فقہائے سبعہ میں سے تھے) کو دیکھا اور یہ کہا کہ تمہیں جس چیز کی حاجت ہو مجھ سے کہو۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں خدا کے گھر میں خدا کے سوا کسی سے کچھ نہ مانگونگا۔ (اصابہ)

سعید بن المسیبؒ جو مشہور تابعی ہیں ایکبار ان کو دولت مروانیہ نے تیس ہزار سے زیادہ روپیہ دینا چاہا تو آپ نے فرمایا۔ لاحاجة لی فیها ولا حق ابن مروان مجھ کو اس کی مطلقاً پروا نہیں۔ اور نہ میں بن مروان کی ضرورت رکھتا ہوں۔ (اسد الغابہ)

کاش مسلمان ان سے نصیحت پکڑتے اور اسلام کے بتائے ہوئے راستہ کو اپنی راہ عمل قرار دیتے۔

عشقِ تپاں

از:۔ جناب اقبال حسین شبنم سترکھی

نامِ خدا جب اُنکا عہدِ شباب ہوگا — جس کی نظر پڑے گی ایماں خراب ہوگا

وہ آفتابِ محشر جب بے نقاب ہوگا — دُنیا کا ذرّہ ذرّہ اک آفتاب ہوگا

گلچیں مرا نشیمن ناحق اُجاڑ ڈالا — کمبخت تو بھی اک دن خانہ خراب ہوگا

مرقد سے حشر کے دن میخوار یوں اُٹھیں گے — ساغر بکف بغل میں ظرفِ شراب ہوگا

اب حسن کی نگہباں بچپن کی شوخیاں ہیں — جب تم جوان ہوگے، مانع حجاب ہوگا

شبنم تو باز آجا عشقِ تپاں سے ورنہ
رسوائے دہر ہوگا خانہ خراب ہوگا

ڈبڈبائی آنکھیں

دلگداز افسانہ

نوشتہ :۔ مسٹر جگناتھ مسرا، بی۔اے ایل ایل بی
ترجمہ :۔ جناب افضل عابدی،

کتابوں کو کرسی پر پٹکتے ہوئے میں نے کہا "بھابی! وہ کون تھیں ؟"
"وہ کون ؟"

بھابی ہونٹوں پر بار بار کھینچتی ہوئی مسکراہٹ کو اپنے ماتھے پر بل ڈال کر چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

"جان بوجھ کر انجان بنتی ہو بھابی! لہریا نوی دوپٹے کا اُڑتا ہوا چھور۔ بس میں کالی ناگن جیسی لمبی لہراتی ہوئی زلفیں دکھائی دے رہی تھیں اور شلوار کے تکون پائنچوں کے نیچے گوری گوری لال ایڑی سے ذرا ہٹ کر گذرتا ہوا سینڈل کا لال لال فیتہ۔ اندر قدم رکھتے ہی پلک بھر میں سامنے کے کواڑ سے کسی بھاگتے ہوئے کے پاؤں ..... بس میں یہی دیکھ پایا تھا۔ جیسے بجلی کی ایک جھلک سی ....."

"کوئی ہو۔ تمھیں اس سے کیا؟"

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی آئے اور تم کہتی ہو مجھے اس سے کیا!"

بھابی نے مسکرا دی "پڑھنے والے لڑکے لڑکیوں کی باتیں "نہیں" کیا کرتے۔"

لیکن بھابی کی یہ "نہیں" باپ اور بڑے بھائی کی "نہیں" نہ تھی، اس نہیں میں نہ واعظانہ انداز تھا نہ نصیحت کا کوئی پہلو۔ اس "نہیں" کا مطلب تھا ——— "اب کام ہے، پھر کبھی سب کچھ بتا دیں گے۔"

نئی نویلی بھابی اور کالج کے پڑھنے والے دیور کے پیار میں کچھ انوکھا پن ہوتا ہے۔ دل کی جس چھپی ہوئی دھڑکن یا اپنی پریم کہانی کو میں جھجک، شرم اور مذاق کے ڈر سے کسی عزیز، رشتہ دار یا ساتھی کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتا اسے بھابی سے بڑے مزے میں بیدھڑک کہہ جاتا ہوں، اور بھابی اسے سنتی ہیں بڑی ہمدردی سے۔ نہایت دلچسپی کے ساتھ۔

ماں باپ کی بات چھوڑو۔ وہ لوگ ٹھہرے پرانے زمانے کے

اتنے برسوں کے بعد "اپنی بات" انھیں شاید ہی اب تک یاد ہو۔ لیکن بڑا بھائی نہ جانے کیوں ہمیشہ "یہ نہ کرو"۔ "وہ نہ کرو" چلایا کرتا ہے۔ اسے تو اپنا زمانہ "نہیں بھولا۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ "محبت" کا اختیار صرف بڑے بھائی ہی کو ہے۔ زندگی کی ان مختصر اور سہانی گھڑیوں کا مزہ صرف اس کے لئے نہیں ہے۔ بڑی بہن کہتی تو کچھ نہیں، مگر آنکھیں دکھاتی ہے۔ ایک رہی بھابی: وہ بھی نئی تڑپتے دل کو وہ خوب سمجھتی ہے۔ ابھی ابھی تو اس نے محبت آشنا دنیا کی سنہری جھلک دیکھی ہے۔

اس دن سے سرتیا روز گھر آتی ہے۔ لیکن اب وہ مجھے دیکھ کر بھاگ نہیں جاتی۔ شرماتی ضرور ہے۔ ایک طرف سرتیا، دوسری طرف میں اور بیچ میں بھابی۔ میں بھابی سے بات کرتا مگر سرتیا کے لئے۔ سرتیا بھابی سے بات کرتی لیکن میرے لئے۔ کھلے منہ بات کرتے پہلے پہل ہم دونوں کو کچھ حیا سی معلوم ہوتی تھی۔ بھابی کے بیچ میں حائل رہتے ہوئے بھی ہمیں ایسا ڈر لگتا جیسے ہم لوگ اکیلے میں بات کر رہے ہیں۔ بھابی نے اپنے بڑے پن کو ہماری محبت میں کچھ ایسا کھو دیا کہ ہمیں ان کا بیچ میں حائل ہونا بالکل برا نہ معلوم ہوتا تھا۔

بھابی ہو یا نہ ہو سرتیا اور میں ضرور ملتے۔ ہنستے۔ کھیلتے اور باتیں کرتے۔ ادھر ادھر کی، ساتھیوں کی، کالج کی، سینما کی اور کتابوں کی، خوابوں کی اور دنیا کی، اتنی لمبی جتنی دنیا بغیر کان اٹھائے سن سکے۔ ان باتوں میں نہ جانے کیسی مٹھاس تھی کہ ختم ہونے کو نہ آتیں۔

اور ہمارا پتنگ اڑ چلا ——— بادلوں سے کہیں اوپر، لیکن اس کی ڈور بھابی کے ہاتھ میں تھی۔ ہمارے اڑنے میں ان کیلئے کوئی آفت نہ تھی مگر وہ ڈر رہی تھیں کہ بہت بلندی پہ کہیں پتنگ قابو سے باہر نہ ہو جائے۔

کئی دن بعد اچانک ایک روز بھابی نے مجھے اکیلے میں بلایا۔ ان کے

چہرے کی غیر معمولی سنجیدگی دیکھکر میں ڈر گیا۔ جیسے میں نے کوئی بڑا بھاری گناہ کیا ہو۔

بھابی نے کہا۔ "جانتے ہو کہاں جا رہے ہو؟"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آنکھیں نیچی کر کے پیر کے انگوٹھے سے میں زمین پر نہ جانے کیا کرید تا رہا۔ گویا بھابی کے سوال کا جواب وہیں ——— اسی جگہ زمین میں گڑا ہوا ہو۔ مجھے چُپ چاپ کھڑا دیکھ کر بھابی نے کہا۔

"محبت کی راہ بہت ٹیڑھی ہے سریش! محبت کرنا آسان ہے لیکن اس کا نباہنا بہت کٹھن۔ جس راہ پر تم چل رہے ہو وہ بڑی سخت اور دشوار گذار ہے۔ سرتیا کا ہاتھ پکڑا ہے تم نے۔ کہیں اسے معصوم جان کر رستے میں تو نہ چھوڑ بھاگو گے؟"

ایک دم سے بے چینی سے بات کاٹ کر میں نے کہدیا۔ "مجھے بزدل سمجھتی ہو بھابی؟"

بھابی نے ترش رو ہو کر کہا۔ "کہنے کو تو سب ہی مرد کہہ دیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایک آدھ ہی اپنی بات پر پورا اُترتا ہے۔ مرد بڑی ڈینگ مارتا ہے ——— مگر آخر کار دھوکہ دے کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔"

"پہلے ہی سے میں تمھیں کیسے یقین دلا دوں بھابی!"

"یقین دلانے کی بات نہیں سریش! اپنے دل کو خود ہی ٹٹول کر دیکھو۔ کہیں تم اپنے آپ کو اور بھولی سرتیا کو دھوکہ تو نہیں دے رہے ہو؟ ماں باپ کو ناراض کر کے۔ سماج کو ٹھکرا کر۔ ذات برادری سے باہر رہ کر، تم اس سے بیاہ کر بھی سکو گے؟ سرتیا میں بھی سماج کو چھوڑ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ہمت ہو سکے گی؟ ماں باپ تمھیں نالائق کہیں گے۔ سماج سرتیا کو بیسوا کہے گی۔ سان تک تم سے مُنہ موڑ لیگی۔ تم دونوں اپنے آپ کو دنیا سے بالکل الگ پاؤ گے۔ تنہائی ——— مفلسی ——— گھر نہ در ——— سمجھتے ہو ———؟"

بڑی سخت گھڑی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ سماج ——— ماں باپ ——— بیاہ ——— بھابی نے یہ سوال کیا کر ڈالا۔ سرتیا کی محبت میں میں اپنے آپ کو اتنا بھول گیا تھا کہ "کل" کی میں نے کبھی فکر ہی نہ کی۔

"بھابی! یہ بیاہ شادی اور ذات پات کا بکھیڑا تم نے کیا کھڑا کر ڈالا؟ میں تو بیاہ ہی کے خلاف ہوں۔ میں نے کب کہا ہے کہ میں بیاہ کروں گا۔ کیا بیاہ کر کے ہی محبت ہوتی ہے۔ کیا بیاہ کے بغیر محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ میں یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں بھابی!"

"دیکھتی ہوں، میں ہی غلطی پر تھی۔ سمجھتی تھی تم اپنا بھلا بُرا سوچ سکو گے۔ جانتے ہو سماج اور دھرم کی نظروں میں مرد اور عورت میں، بیوی اور خاوند کی محبت کے سوا باقی قسم کی محبت گناہ ہے۔ جس محبت کا انجام شادی پر نہ ہو اسے دُنیا کا کوئی بھی آسان سے آسان سماج پسند نہیں کرتا۔"

"سماج وماج کی بات چھوڑو بھابی! تم تو پرانے زمانے کی باتیں کرنے لگیں۔ بیاہ بھی بھلا کوئی ایسی ضروری چیز ہے جس کے بغیر آدمی کی گذر بسر نہ ہو سکتی ہو۔ انسان کو چھوڑ کر دنیا میں اور بھی کہیں بیاہ ہوتے دیکھا ہے۔ جیسے سرتیا اور میں اب محبت کرتے ہیں ویسے ہی ہمیشہ کرتے چلے جائیں گے آرام سے بیٹھیں گے۔ ہنسیں گے۔ کھیلیں گے۔ بس یونہی ہنسی خوشی کٹ جائے گی۔"

"پھر کتابوں جیسی باتیں کرنے لگے سریش! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ یہ ناول اور سینما تمھیں اس دُنیا کا نہ رکھیں گے اتنے بڑے ہو گئے مگر یہ ہوا میں اڑنا نہ جانے کب چھوڑو گے۔ بیٹھیں گے۔ ہنسیں گے۔ کھیلیں گے۔ کیا اس سے سب کچھ ہو جائے گا۔ بھابی کو سمجھا رہے ہو سریش! جان بوجھ کر بھی جاننا نہیں چاہتے کہ ان ساری باتوں کا انجام کیا ہوگا؟ ——— اور بدنامی! انسان ہو کر حیوانوں جیسے کام کرنا چاہتے ہو تم؟ صرف ایک "اس نشے میں" اپنے آرام کے لئے فطرت کی آڑ لینا چاہتے ہو۔ آج کل کی نئی روشنی کے لوگ چاہتے ہیں۔ اختیار ہو لیکن جبر نہ ہو، عیش اور مزہ ہو مگر ذمہ داری نہ ہو۔ جس بیاہ کو تم تن کا ملاپ سمجھتے ہو وہی سماج کو خوش رکھنے کی ایک آسان ترکیب ہے۔ صدیوں کے عمل اور تجربہ کا نچوڑ ہے۔ دو چار پنچوں نے بیٹھ کر بیاہ کی رسم کو ایک ہی دن میں گھڑ نہ لیا تھا، سمجھتے ہو؟"

بھابی نے کچھ رک کر پھر کہنا شروع کیا۔

"جب تم بن بیاہ ہی سرتیا سے ملنا، اُٹھنا، بیٹھنا اور ہنسنا کھیلنا چاہتے ہو تو پھر بزدلوں اور چوروں کی طرح چھپ کر ایسا کیوں کرتے ہو۔ اس ناتے کو انسانوں کی گواہی سے

سماج کے ذریعہ سے پاک اور مضبوط کیوں نہیں بنا لیتے ہو؟"

"انسانوں کی گواہی سے! سماج جو بُرا مانے گا بھابی! اور سماج کی گواہی سے باپ ناراض نہ ہو جائے گا" میں نے ہمت سے کام لیکر جواب دیا۔

بھابی کا چہرہ انتہائی غصے سے تمتما اُٹھا۔ ان کی قہر آلود آنکھوں کے سامنے میں زمین میں دھنسا جا رہا تھا۔ بھابی نے کرخت آواز میں کہا۔ "تب تمہیں سرتیا کی زندگی سے کھیلنے کا کوئی اختیار نہیں تمہیں اس کی پاک زندگی کو اس طرح برباد کرنے کا کوئی حق نہیں میں آج سے سرتیا کو تم سے ہرگز ہرگز نہ ملنے دونگی، تم دونوں کے بیچ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاؤنگی"

"لیکن میں سرتیا کے بغیر کیسے رہ سکوں گا بھابی" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تب تمہیں جلد ہی انتخاب کرنا ہوگا۔ سرتیا اور سماج میں، سرتیا اور ماں باپ میں، تمہیں ایکدم سے فیصلہ کرنا ہوگا۔ جائز اور ناجائز میں، محبت اور فرض میں!"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ مضمحل سا ہو کر میں بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے خیالات تصویریں بن بن کر ناچنے لگے۔ ماں باپ کی ناراضگی دربدر کی ٹھوکریں۔ سرتیا اور میں۔ سماج کی اٹھتی ہوئی انگلیاں، طعنے طشنے اور مذاق، یا پھر ماں باپ کی خوشی۔ لیکن سرتیا کے بغیر پھیکی زندگی کی تلخ گھڑیاں —— ایک ناقابل برداشت تکلیف اذیت اور جانے کیا کیا!

"بھابی! آج کل تم اتنی اُداس سی کیوں رہا کرتی ہو؟"

بھابی نے بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "سرتیا اور تمہارے لئے سرشیش!"

"نہ بھابی، تم ہم سے چھپاتی ہو۔ تمہیں کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہے" میں نے کہا۔

"یہ تمہیں کس نے کہا۔ مجھے تو کوئی ایسا دکھ نہیں" بھابی نے بےچین ہو کر کہا۔

"تمہیں کوئی دکھ ضرور ہے۔ جسے میں بھی دیکھ رہا ہوں —— اور ......"

"اور کیا ——؟"

"اور بھائی صاحب بھی کہہ رہے تھے۔ تمہاری بھابی کو نہ جانے کیا تکلیف ہے۔ بڑی اُداس سی رہتی ہیں —— معلوم مجھ سے کیا ناراضگی ہے۔ کہتے تھے مجھے تو اپنا دکھ نہیں بتاتیں۔ شاید تمہیں ہی بتا دے"

بھابی سامنے دیوار پر نہ جانے کیا ٹکٹکی دیکھ رہی تھیں اس طرح بےچین ہو کر بولیں۔ "نہ —— نہ سرشیش! مجھے تو کسی بات کی تکلیف نہیں۔ کئی دن سے ذرا کچھ طبیعت خراب تھی، تمہیں میرے سر کی قسم اپنے بھائی کو یقین دلا کر کہنا میں بہت خوش ہوں۔ ان دیوتا جیسے شوہر سے اگر میں ناراض ہو کر رہوں تو مجھے دہکتے ہوئے جہنم کی آگ میں جھلسنا پڑے گا۔ میں انتہائی کوشش کرتی ہوں لیکن ان کو خوش نہیں کر سکتی۔ نہ جانے کیوں وہ میرے دیوتا ہیں" بھابی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

میں نے سرتیا کو ایک بازو سے ہلا کر دبی زبان سے کہا "بھابی کے نام کی چٹھی آئی ہے"

"کہاں سے آئی ہے؟" سرتیا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بمبئی سے"

"کب؟"

"آج ہی کی ڈاک سے"

"کیا لکھا ہے؟"

"لو پڑھ لو"

"........ ہیں! یہ کیا؟"

"ہاں! یہی بات ہے"

"لیکن تم نے یہ لفافہ کیوں کھول لیا؟"

"بھابی کے بھائی کی چٹھی سمجھ کر"

"پہلے بھی کھول لیا کرتے تھے؟"

"نہیں"

"پھر ——؟"

"بھابی کو سنانے کا خیال تھا"

"بھابی ناراض ہو گی؟"

"اسے پتہ لگے۔ تب نا؟"

"اسے چٹھی نہیں دوگے؟"

"یہی سوچ رہا ہوں"

"کسی بہانے سے دے دو"

"بھابی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اور بھائی صاحب ان کا

چور چور ہو جائے گا۔ بھابی سے وہ محبت کرتے ہیں۔"
"اور بھابی؟"
"وہ بھی بھائی صاحب کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی ہیں۔ ان سے محبت کرتی ہیں، مگر اپنا سب سے بڑا فرض سمجھ کر۔ وہ ان کی بیوی جو ہیں۔"
"بس فرض سمجھ کر، دل سے نہیں۔"
"دل سے کرنا چاہتی ہیں۔ کرنے کی بہت کوشش کرتی ہیں۔"
"مگر یہ تو گناہ ہے!"
"اتنا ہی جتنا ہم دونوں کا میل ملاپ۔"
سرتیا کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔
"مگر دونوں نے آپس میں شادی کیوں نہ کر لی؟"
"ماں باپ نے نہ ہونے دی۔"
"اس میں ماں باپ کا کیا دخل؟"
"ان کی ناک جو کٹ جاتی۔"
"تب تو بھابی اپنے من موہن کی طرح ساری عمر کنواری ہی رہتیں تو اس سے اچھا تھا۔"
"لڑکی کی مرضی کو کون پوچھتا ہے؟"
سرتیا کچھ دیر کے لئے نہ جانے کیا سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا "من موہن فوج میں بھرتی کیوں ہونا چاہتا ہے۔"
"وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا ہے، اب مرنا چاہتا ہے۔"
"لڑائی میں جا کر؟"
"ہاں، خودکشی کو بزدلی سمجھتا ہے۔"
"اور لڑائی سے بچ کر جو آ جائے تو؟"
"بالکل ناممکن۔"
"اس نے یہ چٹھی کیوں لکھ ڈالی؟"
"اپنی زندگی کی بھینٹ چڑھانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو آخری سلام کہنے کے لئے۔"
"بیچاری بھابی کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"
"تب ہی تو سوچتا ہوں کہ بھابی سے اس کا ذکر ہی نہ کروں۔"
"یہ ٹھیک ہے۔"
"وعدہ کرو کہ اس چٹھی کا کبھی بھول کر بھی ان سے ذکر نہ کرو گی۔"
"وعدہ کرتی ہوں۔"

———

اُسی روز رات کو ——
ادھر میں، اُدھر سرتیا، بیچ میں بھابی۔ بھابی نے ہم دونوں کو دیکھ کر کہا۔ "کیا بات ہے سریش؟"
میں نے کہا: "تم سے کچھ کہنا ہے بھابی!"
"کیا —؟"
"سرتیا سے پوچھو۔"
آنکھیں نیچی کر کے سرتیا نے اپنے دوپٹے کے کونے کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے مروڑتے ہوئے کہا —" ابھی سے پوچھئے۔"
"کوئی کہے گا بھی یا یوں ہی۔"
"اس دن کی بات یاد ہے بھابی؟" میں نے کہا۔
"کیا —؟"
"تم نے کہا تھا تمہیں جلد ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ایک دم سے چن لینا ہوگا۔ سرتیا اور سماج میں —— سرتیا اور ماں باپ میں" میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔
"ٹھیک ہے۔"
"میں نے آج اپنا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے چن لیا ہے۔"
"کسے؟"
"سرتیا کو۔"
"مجھے یقین نہیں آتا سریش!"
"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بھابی!"
"اور — سرتیا تم؟"
"میں — میں بھی آپ کو یقین دلاتی ہوں۔" سرتیا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔
"سرتیا — سریش —! پھر تیسری دفعہ چاند کو بیچ میں رکھ کر قسم کھاؤ۔ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ کر سکے گی۔"
ہم نے چاند کو بیچ میں رکھ کر قسم کھا لی۔
"سرتیا لاؤ اپنا داہنا ہاتھ۔ سریش تم بھی اپنا داہنا ہاتھ دو۔" بھابی نے ہم دونوں کے ہاتھوں کو ملا دیا۔ سرتیا اور میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
لیکن بھابی دور افق پر نہ جانے غور سے کیا دیکھ رہی تھیں۔ دفورِ جذبات سے انکی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سامنے

ماضی کی ایک ایک رسیلی یاد فلم کی طرح آتی اور جاتی۔ بیچاری بھابی کو کیا معلوم کہ اس کے اندر بڑے پیار اور جتن سے چھپائی ہوئی اس کی محبت کا بھید کوئی اور شخص بھی جانتا ہے۔ بھابی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

دوسرے کمرے سے بھائی صاحب نے آواز دی۔ "پربھا! کیا کر رہی ہو؟ دیر ہو رہی ہے۔ سینما نہ چلو گی؟"

بھابی نے جھٹ اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"جی! ابھی آتی ہوں"

لیکن میں دیکھ رہا تھا۔ بھابی کے معصوم دل میں محبت اور فرض کی ایک خوفناک جنگ ہو رہی تھی۔

(ہندی سے)

ریاضِ خلیل

حسن کیا ہے؟ رنگ و بو ہے عشق کیا ہے؟ جوش ہے

از حضرت خلیل بیگوسرائی

جو گھٹا ہے آسماں پر میکدہ بردوش ہے
چرخِ مینائی نہیں ہے یہ کوئی مینوش ہے

چھوڑ دے، بکنے دے، چلانے دے، یہ مینوش ہے
کس کو سمجھاتا ہے واعظ کچھ تجھے بھی ہوش ہے

وہ ہے تسکین مجسم، یہ سراپا جوش ہے
عشق پردہ در ہے لیکن حسن پردہ پوش ہے

اتنے پردے پر تو یہ جلوہ ہے اس کے حسن کا
خیریت اتنی ہے جو آنکھوں سے وہ روپوش ہے

آرزو کرتے ہیں میری طور بھی فاران بھی
ذرہ ذرہ دل کا میرے جلوہ در آغوش ہے

پاس رہ کر یہ تکلف، پاس رہ کر یہ حجاب
آنکھ میں پھرتا ہے لیکن آنکھ سے روپوش ہے

بس رہا ہے اک جہانِ کیف تیری آنکھ میں
جام ہے، مینا ہے، ساقی ہے، مئے سرجوش ہے

وہ نہ ہرگز عیب کھولیگا کسی کا حشر میں
اپنا پردہ در نہیں وہ اپنا پردہ پوش ہے

عشق کو دل سے واسطہ اس کو تعلق آنکھ سے
حسن کیا ہے؟ رنگ و بو ہے، عشق کیا ہے؟ جوش ہے

کس قدر ہے ظرفِ انسانی میں جزر و مد خلیل
ہے تو اک قطرہ مگر دریا کا اس میں جوش ہے

رنگ و بو

ہم قفس میں بے نیازِ آشیاں کیوں ہو گئے؟

حضرت صاحبزادہ شفق ٹونکی

یہ مکاں والے بگڑ کر لامکاں کیوں ہو گئے
جن کے تھے لاکھوں نشاں وہ بے نشاں کیوں ہو گئے

چاند میں، تارے میں، جگنو میں، عیاں کیوں ہو گئے
آپ اپنی بے نشانی کا نشاں کیوں ہو گئے

بے سروسامانیاں کیوں ہو گئی ہیں جاوداں
ہم قفس میں بے نیازِ آشیاں کیوں ہو گئے

دعوتیں نیرنگ کی دیتا بہارِ خلد کو
رنگ و بو کے قافلے نذرِ خزاں کیوں ہو گئے

حسن میں اور عشق میں تو کچھ توازن ہی نہ تھا
میرے افسانے اب اُن کی داستاں کیوں ہو گئے

آہ بنیادِ نشاط اور اس قدر ناپائیدار
چند تنکے شاخِ نو پر آشیاں کیوں ہو گئے

مٹنے والے کیوں نہ اُبھرے پھر نئے عنوان سے
پردہ ہائے آب و گِل میں رائیگاں کیوں ہو گئے

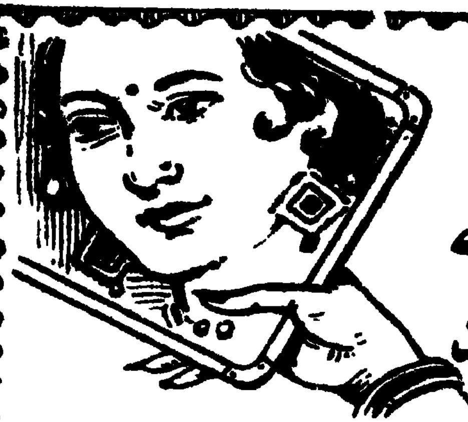
عشق کے میں جن فسانوں پر تھا کل تک خندہ زن
آج وہ میری ہی یارب داستاں کیوں ہو گئے

کیا مشیت ہے کسی تکمیل پر مصروفِ غور
لُٹ لُٹا کر پھر مرتب آشیاں کیوں ہو گئے

کر لیا شبنم سے فانی جان کر سب نے گریز
پھول وجہِ اعتبارِ گلستاں کیوں ہو گئے

یا نشاطِ روح بنتے، یا سرورِ زندگی
تم مرے ذوقِ تمنا پر گراں کیوں ہو گئے

تم تو یکسر پیکرِ رنگِ لطافت تھے شفق
تم کسی کی طبعِ نازک پر گراں کیوں ہو گئے؟



خون کی صفائی اور خوبصورتی کے لیے حیرت انگیز ایجاد

عورتوں کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے

اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ عورتیں بڑے بڑے جلاب لیے بغیر خوبصورت اور نازک اندام بن سکتی ہیں۔ عورتوں کو ہمدرد دواخانہ کی حیرت انگیز سائنٹفک دریافت صافی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہزاروں ایسی عورتوں کو جن کا چہرہ اور جسم بدنما ہوگیا تھا، نئے سرے سے جوان اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ صافی حلق سے اترتے ہی خون کی صفائی شروع کردیتی ہے۔ فاسد مادوں کو جسم سے نکالتی ہے اور اس زہریلے مواد کو خارج کردیتی ہے جو اس موسم میں ابل پڑتا ہے اور بعض اوقات جس سے سینکڑوں بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ صافی بگڑے ہوئے خون کو بچوں کے خون کی طرح صاف کردیتی ہے۔ فاسد مادوں کے اخراج کے [illegible] ب کی پتی کی طرح نکھر آتا ہے۔ گرمی والے پھوڑے پھنسیاں، بلے، داغ دھبے اور پرانا قبض سب دور ہوجاتے ہیں۔ فساد خون کی تمام بیماریوں کے لیے اکسیر ہے۔ صافی پاخانہ، پیشاب اور پسینہ کے ذریعہ زہریلے اور فاسد مادوں کو غیر محسوس طریقہ پر خارج کردیتی ہے۔ عورتوں مردوں اور بچوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

رسالہ ہمدرد صحت اور ہمدرد اطفال دواخانہ سے مفت طلب فرمائیے۔



ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی

سلطان واجد علی شاہ

تحقیقی نقطۂ نگاہ سے

از مولوی نور احمد خاں فاضل السنۂ شرقیہ

ابتدائے آفرینش سے آج تک جس قدر حرماں نصیب "اورنگ" "سلطانی کا تاج" سر پر رکھ کر "عالم مجاز" میں آئی ہیں ان میں سے ایک تاجدار سلطان واجد علی شاہ بھی ہے۔ جس کا نام آج عیاشی اور فحاشی میں ضرب المثل ہو چکا ہے۔ اس بدقسمت بادشاہ نے صرف آٹھ نو برس برائے نام حکومت کی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں جن مصیبتوں سے اسے دوچار ہونا پڑا وہ اس قدر دردناک ہیں کہ اہل دل جب ان پر نظر ڈالتے ہیں تو خون کے آنسو روتے ہیں لیکن ہمارے برخود غلط مورخین نے اس مظلوم شہریار کے خلاف اس قدر زہر اگلا ہے کہ خدا کی پناہ۔ دنیا کا کوئی فحش کام ایسا نہیں چھوڑا جو اس سلطان کے نام سے منسوب نہ کیا گیا ہو۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ "خدائے عزوجل می بیند و می پوشد۔ ہمسایہ نمی بیند و می خروشد"

نعوذ باللہ اگر خلق غیب داں بودے
کسے بحال خود از دست کس نیاسودے

قبل اس کے کہ ہم اس فرمانروا کے متعلق اپنی تحقیقی رائے پیش کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کرام کو اس کے حالات سے شناسا کیا جائے تاکہ بعد میں آپ کو زیر بحث مضمون کا پورا اندازہ ہو سکے۔

تعلیم و تربیت

موجودہ نام نہاد مورخین کے خنجر ناز کے شہید اعلیحضرت سلطان عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ سلطان امجد علی شاہ کے مشکوئے معلیٰ میں سنہ ۱۸۲۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے جب ذرا ہوش سنبھالا تو امجد علی شاہ نے نواب امداد حسین خاں جیسے علامہ روزگار کو ان کا اتالیق مقرر کیا۔ انھوں نے شبانہ روز کی مساعی سے اس ذہین و طباع شہزادے کو وہ جملہ علوم از بر کرا دیئے جن کی تحصیل ایک شہزادے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

سلطان امجد علی شاہ چونکہ خود پابند شرع تھے اس لئے انہوں نے علمائے باعمل کی ایک مجلس کو بھی شہزادے کی تربیت کا نگران مقرر کیا۔ اور یہ ہونہار بروا ان کی صحبت کی آبیاری سے پروان چڑھنے لگا۔ ہر وقت مسائل دین پر بحث ہوتی۔ اور قال اللہ و قال الرسول کا شہزادے پر اتنا اثر ہوتا کہ خشیت الٰہی سے حق بین نگاہیں اشکبار ہو جاتیں۔ اور یہ رنگ طبع پر اس قدر غالب آیا کہ بادشاہت سے اخیر وقت تک نہ کوئی روزہ قضا ہوا اور نہ کوئی نماز فوت ہوئی اور مزاج میں خشیت الٰہی اس قدر پیدا ہوئی کہ بزم عیش و نشاط میں جونہی کوئی "شعر رقت انگیز" پڑھا جاتا۔ یا کوئی صاحب دل خالق کونین کے قہر و غضب کا ذکر کرتا تو کانپ کر چیخ اٹھتے اور آنکھوں سے بے اختیار سیلاب اشک جاری ہو جاتا۔

اگرچہ والدین کی کوششوں اور علمائے باکمال کے فیض صحبت سے شہزادے صاحب اچھے خاصے فقیہ بن گئے تھے لیکن چونکہ فطرت کا رجحان فنون طرب کی طرف تھا اس لئے جب بھی موقع ملتا اس فن لطیف سے بھی استفادہ کرتے اور آخر کیفیت یہاں تک پہنچی کہ سلطان عالم بے نظیر اور بے مثل نائک بن گئے اور یہ بلا کچھ اس طرح گلے کا ہار بنی کہ باقی تمام اوصاف اس کے آگے ماند پڑ گئے اور اودھ کا یہ مدبر و عادل سلطان محض شاعری اور موسیقی سے منسوب ہو کر رہ گیا۔ ورنہ یہ ہمہ گو اور ہمہ داں بادشاہ کسی چیز میں کم نہ تھا۔

رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کو تو منصور کا ثانی!

جب شہزادے نے جوانی میں قدم رکھا تو بادشاہ نے اودھ کے اس یوسف کی شادی نواب عالم آرا بیگم سے کر دی۔ اس مبارک تقریب پر بادشاہ نے دل کھول کر خرچ کیا اور قلمرو میں خوشیاں منائی گئیں اور خیرات تقسیم کی گئی۔

تخت نشینی

۱۸۴۷ء میں جب واجد علی شاہ نے اپنی عمر کی بیس بہاریں طے کی تھیں ان کے والد ماجد سلطان امجد علی شاہ کا انتقال ہوگیا۔ نواب امین الدولہ وزیر اعظم نے کرنل رچمنڈ کو خبر کی جس پر وہ ڈاکٹر لوگن کی معیت میں محلسرائے میں تشریف لائے اور بادشاہ کی نعش سے دوشالہ اٹھوا کر دیکھا۔ فی الواقع بادشاہ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اور جسد خاکی بے حس و حرکت پڑا کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام کا درس دے رہا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر کوٹھی گلستان ارم میں آ کر بیٹھے اور وارث تاج و تخت کو اطلاع دی۔

سلطان عالم عجیب بیقراری کی حالت میں محل سے برآمد ہوئے۔ دونوں طرف خواص نے بازو تھام رکھے تھے۔ آنکھیں تھیں کہ ان سے آنسوؤں کے قطرات ٹپک ٹپک کر گر رہے تھے۔ دمبدم پریشانی اور بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں زرد کوٹھی میں نزول اجلال فرما کر لباس شاہی زیب تن کیا اور سواری کے بوچہ میں بیٹھ کر دربار کو روانہ ہوئے۔ چند قدم چلے تھے کہ کپتان ہالنگس نے بڑھ کر استقبال کیا۔ سواری کا "بوچہ" زینے سے ہو کر گذرا۔ بادشاہ کمرے میں داخل ہوئے۔ رزیڈنٹ سے معانقہ کیا۔ اندر وسطی کمرے میں تشریف لے گئے۔ بعد ازاں تخت رواں پر سوار ہو کر بارہ دری میں داخل ہوئے۔ پہلے خاص کمرے میں جا کر دو رکعت نماز شکرانہ پڑھی۔ پھر تخت پر ایستادہ ہوئے۔ مجدالدولہ نے کشتی میں تاج پیش کیا اور رزیڈنٹ نے اپنے ہاتھ سے فرق مبارک پر تاج رکھ کر سلطان عالم کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی اُمرائے دربار نے نعرہ لگایا۔ "واجد علی شاہ بادشاہ اودھ زندہ باد"

اس کے بعد بادشاہ نے تخت پر جلوس فرمایا۔ سب سے پہلے نواب امین الدولہ نے نذر پیش کی۔ پھر باقی اراکین دربار اور سلطنت اودھ کے جاگیردار زمیندار جو اس موقع پر تشریف لائے تھے انہوں نے بھی حسب حیثیت نذریں پیش کیں۔ اور انعام واکرام خلعت سے سرافراز ہوئے۔ سلامی کی توپیں چھوٹنے لگیں۔ انگریزی بینڈ بجنے شروع ہوئے۔ برمحل شادیانے بجنے لگے۔ رقاصائیں متحرک ہوکر ناچنے لگیں مگر چونکہ بادشاہ کی طبیعت سخت بے چین تھی اس لئے ایک لحظہ کے بعد تخت سے اُترے۔ رزیڈنٹ اور برگیڈیر نے تخت رواں تک پہنچایا۔ ادھر بادشاہ سوار ہوئے اور اُدھر روشن چوکی بجنے لگی۔ اور محلسرا میں تشریف لے گئے۔

مرحوم بادشاہ کی تجہیز و تکفین

بادشاہ نے والد بزرگوار کی تجہیز و تکفین کے لئے ایک لاکھ روپے کی گرانقدر رقم منظور فرمائی اور شاہانہ طمطراق سے جنازہ اٹھا۔ اگرچہ سلطان عالم سوگواری کی حالت میں کمال بیقرار و بے چین ہو رہے تھے مگر بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ جونہی راجہ جوالا پرشاد پر نظر پڑی فرمایا۔ "معتوب سرکار را از استفسار چہ سروکار۔ اگر مناسب باشد مواخذہ سازند"۔ راجہ صاحب کچھ عرصہ سے حکومت کی نظروں میں معتوب چلے آتے تھے۔ امرائے سلطنت یہ فصیح و بلیغ جملہ سن کر چونک پڑے کہ اگر بادشاہ کے تدبر کی یہی کیفیت رہی تو ہماری دال گلنے سے رہی۔ فی الواقع یہ جملہ سلطان عالم کی بیدار مغزی اور ان کی کمال واقفیت پر دلالت کرتا ہے کہ جب شہزادگی کے زمانہ میں اراکین دولت کے حال سے وہ اس قدر باخبر تھے تو جب قدرت نے ذمہ داری کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا تھا تو وہ ان سے غافل کیسے رہ سکتے تھے۔ ساتھ ہی اس فقرہ سے سلطان عالم کی تبحر علمی اور بدیہہ گوئی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ غرض بادشاہ جہاں کمال بے قراری سے والد ماجد کی تکفین و تدفین کے مراسم ادا کرتے رہے۔ وہاں عقابی نگاہوں سے اپنے دوست دشمنوں کے حرکات و سکنات کو بھی دیکھتے رہے۔ جب مرحوم بادشاہ کو سپرد خاک کر چکے تو خزانے کے دروازے کھول کر ان کی روح کو ایصال ثواب کرنے کے لئے سونا چاندی مستحقوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خیرات و صدقات کا سلسلہ حرمین شریفین اور کربلائے معلیٰ تک پہنچایا گیا۔ لکھنؤ کے اطراف و اکناف میں تو کوئی مستحق محروم نہ رہا۔

ملکی اصلاحات اور انتظامات

بیدار مغز سلطان نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی نواب امین الدولہ کی جگہ نواب سید علی نقی کو وزیر اعظم مقرر کیا اور چونکہ سلطان کی ولادت ماہ ذیقعدہ میں ہوئی تھی اس لئے اس کو سال کا پہلا مہینہ قرار دیا اور اسی طرح سال کے بارہ مہینوں کے نام

تجویز ہوئے۔ ۱۔ ذیقعدہ۔ ماہ واجدی ۲۔ ذی الحج۔ ماہ محمدی ۳۔ محرم۔ ماہ اختری ۴۔ صفر، ماہ سکندری ۵۔ ربیع الاول، ماہ حسینی ۶۔ ربیع الثانی۔ ماہ اثنا عشری ۷۔ جمادی الاول۔ ماہ آمانی۔ ۸۔ جمادی الثانی۔ ماہ منوبر ۹۔ رجب، ماہ مراتب ۱۰۔ شعبان، ماہ منصوری ۱۱۔ رمضان۔ ماہ سلیمان ۱۲۔ شوال۔ ماہ نبی،

بادشاہ کہا کرتے تھے کہ سلطنت کے استحکام کا دارومدار عدل دانصاف پر ہے اس لئے ان ہر دو امور پر غیر معمولی توجہ دی۔ حکم ہوا کہ جب دیوان عام کی طرف سواری روانہ ہو تو دو سوار آگے صندوق لے کر چلیں۔ تاکہ جو فریادی براہ راست مابدولت کی خدمت میں کوئی درخواست پیش کرنا چاہے وہ اس صندوق میں ڈالدے۔ چنانچہ یہ معمول ہوگیا کہ جب سواری روانہ ہوتی تو فریادی برسرراہ آکر اپنی درخواستیں صندوق میں ڈالدیتے اور یہ صندوق دربار میں بادشاہ کے سامنے کھلتا اور جہاں پناہ بذات خود ان کا ملاحظہ کرکے دست خاص سے اس پر حکم صادر فرماتے اس سے رعایا کو ایک گونہ اطمینان رہتا اور اہلکار خائف رہتے۔

منظوم حکم: ۔ بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ اس قدر زود فہم اور ذکی الطبع تھے کہ درخواستوں پر سکریٹری کو کچھ لکھنے کی اجازت نہ تھی۔ خود درخواست لیکر سرسری طور پر پڑھ کر بلاپس وپیش اس پر حکم لکھ دیتے۔ حکم کی عبارت اس قدر فصیح ہوتی کہ جو پڑھتا واہ واہ کرتا۔ اور سائل کی بھی تسلی ہوجاتی اور لطف یہ کہ اگر درخواست منظوم ہوتی تو جواب بھی نظم میں دیدیا جاتا۔ چنانچہ ایک دفعہ منشی امیر اللہ تسلیم کی درخواست پیش ہوئی۔ یہ شاہی فوج میں ملازم تھے۔ اور پلٹن کے تخفیف ہوجانے پر بیکار پھر رہے تھے۔ درخواست سرتاسر منظوم اور نہایت خوشخط تھی۔ بادشاہ نے ملاحظہ فرماکر فی البدیہہ اس پر یہ حکم لکھا۔

بشنوائے خوشنویس وائے خوش گو　　　ہر دو فن می کنی ؑ ہر دو نکو
اسم تو مندرج بدفتر شُد　　　بست وده روپیہ مقرر شُد

حکم چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مصرعہ میں سائل کے شاعر نغز گفتار اور خوشنویس ہونے کا اعتراف ہے۔ دوسرے میں شاعری اور خوشنویسی کے بدرجہ کمال ہونے کی داد ہے۔ تیسرے میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ تمہارا نام ملازمین شاہی کے زمرہ میں درج کرلیا گیا ہے چوتھے مصرعہ میں مشاہرہ کی تفصیل ہے۔ ہر دو اشعار میں معنویت اور فصاحت کے لحاظ سے تمام خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔ غرض اسی طرح روزانہ ہزاروں فرامین اسی انداز میں لکھے جاتے۔ افسوس کہ دربار میں کوئی فیضی یا ابوالفضل نہ تھا جو اس روشن دماغ سلطان کے احکام کو جمع کرکے کتابی صورت میں شایع کرسکتا۔ اگر یہ فرامین یکجا جمع ہوجاتے تو آج اُسے "توقیعات کسریٰ" سے پہلے نمبر پر جگہ ملتی۔

بادشاہ کی معاملہ فہمی: ۔ منصرم الدولہ واجد شاہی دربار کے مشہور معاملہ نگار تھے۔ خوبصورت اور مسجع و مقفیٰ عبارت تو خیر ایک دنیا لکھتی ہے مگر اس بزرگوار کی یہ حالت تھی کہ ہر معاملہ کو اس طرح پیچیدہ کرکے کچھ ایسے انداز سے لکھتے کہ بادی النظر میں سائل کی خواہش کو رد کرنا ناممکن ہوجاتا۔ یا ایک درخواست کے ساتھ چند اغراض اور بھی ملا دیتے تاکہ جلدی میں یا درخواستوں کے ہجوم میں وہ سب منظور ہوجائیں۔ لیکن سلطان منصرم الدولہ کی چالاکی کے کبھی شکار نہ ہوئے ہمیشہ تمام پہلوؤں پر غور کرکے حکم لکھتے اور منصرم الدولہ کو تسلیم کرنا پڑتا کہ بادشاہ نے میری غرض کو تاڑ لیا ہے۔ جواب کے الفاظ اتنے حسین اور فصیح ہوتے کہ پڑھنے میں ہر شخص کو لطف محسوس ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسی حسین وجمیل عبارت سے آج ہم لوگ محروم ہیں۔

بڑھیا کی دادرسی: ۔ ایک روز بادشاہ کی سواری جارہی تھی کہ ایک بڑھیا نے راستہ میں آکر واویلا کیا کہ ایک زمیندار نے میری لڑکی کو جبراً چھین کر اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ غصے سے کانپ اٹھے اور جوش غضب سے زبان میں لکنت پیدا ہوگئی۔ اسی وقت پیادے دوڑا کر زمیندار کو پکڑ بلوایا وہ لڑکی چھنوا کر بڑھیا کو دلوائی اور زمیندار کو عبرتناک سزا دی۔

حق بحقدار رسید: ۔ ابراہیم خاں ایک زمیندار تھا جس کی گذر اوقات ایک باغ سے ہوتی تھی۔ سہواً وہ باغ نواب خورد محل کی جاگیر میں دیدیا گیا۔ اور بیگم صاحبہ کے داروغہ نے جبراً اس پر قبضہ بھی کرلیا۔ اس پر وہ غریب روتا پیٹتا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے کمال دردمندی سے اس کے مقدمہ کی سماعت فرمائی۔ اگرچہ نواب خورد محل نے ضبطی باغ کی بابت بیحد زور لگایا مگر انصاف پرور تاجدار نے پروا تک نہ کی اور فرمایا کہ عدالتی کام میں ہرگز رعایت نہ ہوگی۔ البتہ اس کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ؎

اگر ز باغ رعیت ملک خورد سیبے　　　برآورند غلامان او درخت از بیخ

بہ تیم بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد زنند لشکریانش ہزار مرغ بسیخ

انجام کار فیصلہ ابراہیم خاں کے حق میں ہوا اور بلغ بیگم صاحبہ سے چھین کر حقدار کو واپس کر دیا گیا۔

قرضہ بورڈ کا قیام ۔ قرضہ جات کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے بادشاہ نے ایک نیا محکمہ کھولا۔ اس سے پہلے دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت ایک ہی مجسٹریٹ کرتا تھا۔ اس تفرلق سے رعایا کو ایک گونہ آرام ہوگیا۔ مزید براں بادشاہ نے رفاہ عامہ کی غرض سے تھانے مقرر کئے اخبار جاری کئے۔ سرحدی پولیس کے سواروں اور پیادوں کی جمعیت بڑھائی اور زراعت کی اصلاح میں ہر پہلو سے زیادہ توجہ صرف کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ملک میں ہر طرف فارغ البالی اور خوش الحالی نظر آنے لگی۔

ہندو نوازی :۔ بادشاہ کا لطف وکرم آفتاب عالمتاب کی طرح ہر کہہ ومہ پر عام تھا۔ اور اس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ چنانچہ ہزاروں ہندو روزانہ اس دربار سے انعام واکرام اور خلعت ہائے فاخرہ سے نوازے جاتے تھے۔ مہاراجہ مان سنگھ سے بادشاہ کے دوستانہ تعلقات تھے اور ان کی صاحبزادی برج راج کنور کو اپنی لڑکی سمجھتے تھے۔ جب مہاراجہ نے اس کی شادی بابو نرائن سنگھ سے کی تو بادشاہ نے ایک موضع اسے جہیز میں عنایت کیا جس پر اب تک ان کا قبضہ ہے اور سرکار برطانیہ نے بھی اُس کی معافی منظور کرلی ہے۔

فوجی سرگرمیاں :۔ یہ تو بادشاہ کے عدل وانصاف کی کیفیت تھی۔ فوج کی درستی اور تیاری پر جو توجہ صرف کی وہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ تھی۔ معمول یہ تھا کہ جہاں پناہ چار گھڑی رات رہے بیدار ہوتے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر رمنہ میں تشریف لے جاتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر فوج کی پریڈ ملاحظہ کرتے۔ جو سپاہی فنون جنگ میں اچھی مہارت پیدا کر لیتے بادشاہ ان کو دست خاص سے انعام واکرام دے کر سربلند وسرافراز کرتے۔ قواعد کے لئے بادشاہ نے خود فارسی میں اصطلاحات اور کلمات وضع فرمائے تھے۔ "راست رو"۔ "پست بیا"۔ "دست چپ بگرد" کے احکام اس خوبی اور فصاحت سے ادا کئے جاتے اور فضائے آسمانی میں ایسی حسین گونج پیدا ہوتی کہ "فارورڈ مارچ" "اباؤٹ ٹرن" اور "رائٹ ٹرن" میں وہ جاذبیت اور لوچ کہاں؟

فوج نے جب جنگی قواعد میں کافی مشق پیدا کرلی تو قلعہ ہندی کی شقی لڑائیوں کا پروگرام شروع ہوا۔ اس اثنا میں جب کوئی سپاہی گر تا یا اسے کہیں چوٹ آتی تو دردمند بادشاہ بیتاب ہو کر وہاں پہنچتا۔ زخموں کا ملاحظہ کر کے اپنے سامنے مرہم پٹی کراتے۔ اور ہمت افزائی کے لئے انعام میں اشرفیاں مرحمت کرتے۔ روزانہ اس قسم کے مشقی پروگرام عمل میں لائے جاتے اور بادشاہ خود ان میں شامل ہو کر تکمیل کو پہنچاتا۔ مزید براں ہر قسم کے باجے گاجے بھی جمع کر دیئے گئے اور انھیں ایسی سروں سے بجوایا جاتا کہ بزدلوں کے سینوں میں بھی خالد اور ضرار کا سا جوش پیدا ہو جاتا فوج میں ہوشیاری اور چالاکی کی ایک لہر دوڑ جاتی اور ہر سپاہی مستعد اور چاق وچوبند نظر آنے لگتا۔

نماز کی پابندی :۔ کثرت کار اور عدیم الفرصتی کے باوجود سلطان عالم کی نماز کی پابندی کا یہ حال تھا کہ جونہی سماعت علیا میں "اللہ اکبر" کی آواز پہنچتی فوراً پریڈ سے علیحدہ ہو کر لب دریا سجادہ بچھا اسی فوجی لباس سے عبادت الٰہی میں مصروف ہو جاتے اور ع "آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز" کا نقشہ کھنچ جاتا۔ غرض یہ شہریار ہر کام میں مستعد اور ہوشیار تھا۔ امرائے دولت سے افراد رعایا تک سب اس مستعدی اور ہوشیاری پر عش عش کرتے تھے ؎

لیکے آیا ہے جہاں میں عادت سیماب تو
تیری بیتابی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو

علاوہ دیگر رسالوں اور پلٹنوں کے بہت سی پلٹنیں اور توپ خانے ایسے بھی تھے جو ہر وقت تیار رہتے تھے جب بادشاہ ہوا خوری کے لئے سوار ہوتے تو ایک ضرب چاندی کی توپ بھی ہمراہ رہتی۔ بادشاہ نے اپنے عہد میں جو توپیں بنوائیں وہ بارہ کوس کی مار کرتی تھیں۔

ترک سوارنیاں :۔ محلات کی نگرانی اور حرم کے دیگر کاروبار کے لئے بادشاہ نے جوان اور حسین عورتوں کی بھی ایک چھوٹی سی فوج مرتب کر ڈالی۔ انھیں بھی باقاعدہ اصطلاحات کے ساتھ قواعد کی تعلیم دی گئی۔ ان کی وردی بیحد دیدہ زیب اور دلفریب تھی۔ جب وہ کرچیں ہاتھ میں لے کر مارچ کرتیں تو یہ معلوم ہوتا گویا آسمان سے حوریں اتر آئی ہیں۔ انھیں ترک سوارنیاں کہا جاتا تھا۔

غدارانِ ملک کی ریشہ دوانیاں

یہ تو سلطان عالم کی بیدار مغزی اور جفاکشی کی کیفیت تھی ادھر "ساحرالموط" جو عرصہ سے اودھ کی زرخیز اور زربار سرزمین پر دانت لگائے بیٹھا تھا۔ ہونہار تاجدار کی مستعدی اور معاملہ فہمی دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ۱۸۰۱ء کے میثاق کی رو سے جب تک سلاطین اودھ سے کوئی نقض عہد نہ ہوتا ایسے ملک کو دست تصرف میں لانا بعید از امکان تھا اس لئے رزیڈنٹ کی طرف سے شکایات کا سلسلہ شروع ہوا۔ درپردہ غدارانِ وطن کی ایک جماعت تیار ہوئی جن پر یہ نامبارک فرض عاید کیا گیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو بادشاہ کی توجہ اس طرف سے پھیر دی جائے۔ علامہ اقبال نے اقوام غالب کی اس سیاست کو کس خوبصورتی سے فاش کیا ہے۔ فرماتے ہیں

سہ

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

چنانچہ حاشیہ بوسان بزم بُری طرح بادشاہ کے پیچھے پڑ گئے جب بھی موقع ملتا سلطان عالم کو غافل کرنے کے لئے انتہائی خلوص اور دلسوزی سے عرض کرتے کہ حضور والا کی اس قدر فوجی سرگرمی اور سرج کشی کس لئے ہے؟ کیا کسی ملک پر چڑھائی کا ارادہ ہے؟ خدارا اب فوج کو خدام بارگاہ پر چھوڑیئے اور اپنی صحت کا خیال فرمایئے۔ عالم پناہ ذرا آئینہ تو ملاحظہ کریں۔ یوسفی چہرے پر کس قدر زردی آچکی ہے"!

اتنی سازش کے بعد بھی سلطان عالم ایک مستقل مزاج سپاہی کی طرح اپنے ارادوں پر جمے رہے یہاں تک کہ جب لارڈ ہارڈنگ، لکھنؤ تشریف لائے اور سلطان عالم نے ان کو "رمنہ" کے میدان جنگ میں "نقلی جنگ" دکھائی تو گورنر جنرل حیران رہ گئے۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد رزیڈنٹ نے دوبارہ اس امر کا نوٹس لیا کہ فوج پر اس قدر سرگرمی سے کیوں توجہ ہو رہی ہے۔ انہی ایام میں سلطان عالم کو پرچہ نویسوں نے رپورٹ کی کہ ناظم اور چکلہ دار محاصل سرکاری کی وصولی میں سخت بے دردی سے کام رہے ہیں۔ زر خاص کچھ پر رشوت لے لی جاتی ہے اور جو نہ دے اسے مختلف طریقوں سے سزا دی جاتی ہے۔ سلطان عالم نے فوراً حکم جاری کیا کہ

"تمام علاقہ جات قلمرو سلطانی حضور تحصیل ہو جائیں۔ زمیندار اور تعلقدار اپنے وکلاء کی معرفت زرآمدنی داخل خزانہ سلطانی کیا کریں۔ ناظم اور چکلہ دار موقوف کر دیئے جائیں اس لئے کہ یہ علاقہ پر جا کر زیادہ ستانی اور تنگ طلبی کرتے ہیں۔ رعیت تباہ ہوتی ہے اور سرکار کا نقصان ہوتا ہے"

ملازمین سرکار جو اس سلسلہ میں لاکھوں روپے کما لیتے تھے سخت پریشان ہوئے اور اندر ہی اندر اس بیدار مغز سلطان کے خلاف پروپاگنڈہ کرنے لگے۔

اُمرا کی بے راہروی

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

—— رومی

ابھی محاصل سرکاری کی وصولی کے فرمان پر پوری طرح عمل نہ ہوا تھا کہ سلطان عالم تبخیر قلبی و دماغی کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور انجام کار نوبت خفقان اور مراق تک جا پہنچی۔ امراء کی سازش سے حکماء نے یہ تجویز کی کہ دل و دماغ کا علاج تفریح اور عیش و عشرت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مناسب ہے کہ جہاں پناہ کاروبار سلطنت میں تا حصول صحت مطلقاً دخل نہ دیں۔ اس پر بھی سلطان عالم کی توجہ امور سلطنت کی طرف کھنچی رہتی۔ لیکن جب کوئی مسل طلب کرتے یا کاروبار سلطنت کا احتساب کرتے تو حاشیہ بوس امراء جھٹ بول اُٹھتے حضور یہ کیا غضب کر رہے ہیں۔ اس سے تو جہاں پناہ کا مرض ناقابل علاج ہو جائیگا۔ کیا ضبط سلطنت کے لئے حضرت کے غلام کچھ کم ہیں جو ایسی بیماری کی حالت میں بھی جہاں پناہ کی توجہ بار بار ادھر کھنچ رہتی ہے۔ ادھر امور سلطنت سے غافل کیا اور ادھر راگ رنگ کے جلسے قائم ہوئے۔ پریچہرہ رقاصائیں جمع کی گئیں۔ ہندوستان بھر کے نائک حاضر حضور ہوئے اور جس دربار میں آٹھوں پہر رعایا کے فلاح و بہبود کی تجویز پر غور ہوتا تھا۔ اب وہی دربار راجہ اندر کا اکھاڑا بن گیا۔ شہوانی جذبات ابھارنے کے لئے سلطان عالم کو کشتے کھلائے گئے۔ سلطان عالم کو قدرت نے حسن و جمال کمال فیاضی سے عطا کیا تھا اور ان کے مردانہ حسن کی دُور دُور تک شہرت تھی۔ شجاعت کا یہ عالم تھا کہ روپیہ چٹکی سے مل کر اس کے نقش کو مٹا دیتے تھے۔ اکثر عطا کر گولی بنا دیتے تھے۔ حکماء کی کشتہ بخشیوں نے قوائے حیوانیہ کو اور تیز کر دیا۔ جس پر وہ سلطان جو پہر رات سے گھوڑے پر سوار رہ کر شام کے چار بجے تک ایک جفاکش سپاہی کی طرح فوج کو تیار کرتا

اور امور عدالت کو انجام دینا تھا ان غداروں کی حیلہ گریوں سے داد عیش دینے پر مجبور ہو گیا۔

جب ادھر سے رزیڈنٹ کی دلجمعی ہو گئی تو سلطنت کے بدخواہوں کے ذریعے بادشاہ کے خلاف ہر جگہ پروپیگنڈا شروع ہوا۔ غلط سلط واقعات کو روایت کا لباس پہنا کر ہر جگہ ہوا دینے لگے۔ بڑے بڑے انگریز مرغ، بٹیر اور مینڈھے لیکر آتے اور بادشاہ کو ان کی لڑائی دیکھنے کی ترغیب دیتے۔ اور جب بادشاہ محض ان کی دلداری کے لئے برسر درباران کی لڑائی ملاحظہ فرماتے تو اس منظر کی دستی تصویریں بنوا کر دنیا میں پھیلا دیتے اور بادشاہ کو مفت میں بدنام کر دیتے۔ غرضکہ اس قسم کی ہزاروں کوششیں کی گئیں اور بادشاہ کو کہیں عورتوں کے ساتھ ناچتا ہوا اور کہیں راجہ اندر کا پارٹ کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کا یہ بے قصور اور نیکدل سلطان بدنام ہو گیا۔ اور سلطنت کے کاروبار ریذیڈنٹ سے متعلق ہو گئے۔ کہ جو دل چاہے کرے۔ ؎

دست گلچیں قتل عام لالہ و گل می کند
باغباں در صحن گلشن مست خواب افتادہ است

۱۸۴۹ء میں ریذیڈنٹ سلمن نے اودھ کا دورہ کر کے مراسم و ضوابط قدیمہ کے خلاف رعایا سے درخواستیں لے کر بادشاہ کے نام احکام اور تجاویز لکھ کر بھیجی تھیں اور ملازمین سرکار سے ملاقاتیں کر کے ان کے تحائف قبول کئے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں جنرل سلمن مذکورۃ الصدر اور جنرل اوٹرم نے متفقہ طور پر بادشاہ کے خلاف کمپنی کو رپورٹیں بھیجیں جس میں ملک کی بدانتظامی کا خاکہ کھینچا گیا۔ اس پر لارڈ ڈلہوزی نے بادشاہ کے نام ایک خط لکھا کہ۔

"پچاس برس سے گورنمنٹ اودھ ۱۸۰۱ء کے معاہدہ کی ایک نہایت سنگین اور اہم شرط کی خلاف ورزی کرتی رہی ہے اور جب بھی اسے اپنی ذمہ داری کے احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا ایسی حالت میں برٹش گورنمنٹ کے پاس سوا اس کے اور کوئی تدبیر نہیں کہ وہ ۱۸۰۱ء کے معاہدہ کو جس کی متعدد بار خلاف ورزی کی جا چکی ہے منسوخ اور بیکار سمجھ لے"

جب بادشاہ کو یہ نوٹس موصول ہوا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی فوراً سامان سفر آراستہ کر کے کلکتہ کو روانہ ہوئے تاکہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں اپنا مقدمہ پیش کریں۔ ابھی بادشاہ راستہ ہی میں تھے کہ ۳۱ر جنوری ۱۸۵۶ء کو کمپنی بہادر نے اودھ کے الحاق کا اعلان کر دیا اور اس مظلوم تاجدار کو معزول کر کے قلعہ فورٹ ولیم میں بھیج دیا گیا۔

کلکتہ کی نظربندی

بادشاہ تقریباً دو سال تک قلعہ فورٹ ولیم میں رہے اور پھر وہاں سے مٹیا برج میں منتقل کر دیئے گئے۔ یہاں اس ستم زدہ بادشاہ نے اپنی زندگی صرف کر دی۔ رہ رہ کر اپنے عروج و اقبال کے زمانہ کو یاد کرتے تھے اور ایک آہ جگر سوز نکالتے تھے۔ "حزن اختری" کے نام سے جو مثنوی انھوں نے لکھی ہے اس قدر دردناک ہے کہ پتھر دل انسان بھی بے اختیار رو پڑتے ہیں۔ لکھنؤ کا نام تادم زیست زبان پر رہا۔ اکثر اوقات مصاحبین نے بادشاہ کو یہ شعر پڑھتے اور آنسو بہاتے دیکھا ؎

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں
لکھنؤ پھر بھی دکھلائے گا مقدر میرا

کلکتہ میں اگرچہ کبھی کبھی دل بہلانے کے لئے بزم طرب بھی مرتب کر لی جاتی تھی لیکن بالعموم بادشاہ کتب بینی اور شعر و شاعری میں اپنی زندگی کے لمحات عزیز صرف کرتے رہے۔ فارسی ادب و انشا میں بادشاہ کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ اردو ورثہ میں ملی تھی۔ بڑے انہماک سے تصنیف و تالیف کا کام ہو رہا تھا۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ پلنگ پر لیٹے لیٹے دو دو تین تین مسجع و مقفع خطوط لکھ ڈالتے۔ عبارت کا پایہ اتنا بلند ہوتا کہ ابوالفضل اور طاہر وحید کی تحریریں بھی نگاہ نہ کھا سکتیں۔ تصانیف کی اشاعت کے لئے شاہی مطبع قائم تھا، اپنی زندگی میں ہی انھوں نے کتابیں لکھ کر طبع کرا ڈالیں۔ مگر پھر بھی ان کی تصانیف کا کافی حصہ شرمندۂ طباعت نہ ہو سکا آخر زمانے میں بادشاہ نے فارسی نثر کی کتاب "محبوب القلوب" کو اردو نظم کا جامہ پہنا رہے تھے۔ اور بالمرہ شام سے دس بجے رات تک یہ شغل جاری رہتا۔ ترجمے کی کیفیت یہ ہوتی کہ بادشاہ کی نظر اصل کتاب پر اور اس کے بعد اپنی تحریر پر برابر پڑتی رہتی۔ قلم مسلسل حرکت میں رہتا۔ دیکھنے والے کو یہ پتہ بھی نہ چل سکتا۔ کہ آپ نقل کر رہے ہیں یا فارسی کی ادق عبارت کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے بعد نظم کی صورت میں منتقل کرتے ہیں۔ پس فارسی کی عبارت کو ایک نظر سے دیکھ کر فی البدیہہ ترجمہ کے اشعار لکھ کے رکھ دیتے تھے۔

ابھی یہ کتاب لکھی جا رہی تھی کہ یہ قادر الکلام اور قادر التحریر سلطان عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال کر گیا۔ بادشاہ کے فوت ہونے پر جہاں اور چیزوں پر گورنمنٹ نے قبضہ کر لیا۔ وہاں اس مسودہ کو بھی ضبط کر لیا۔ خدا معلوم اس کا پھر کیا حشر ہوا۔ اس وقت ان کی تصنیف سے تقریباً چالیس کتابیں بازار میں فروخت ہو رہی ہیں۔ چھ دیوان ہیں۔ سات مثنویاں۔ تین جلدیں مراثی اور مختلف کتابوں کی ہیں۔ جو خطوط انھوں نے لکھنؤ کی یاد میں اپنی محبوب بیوی کو لکھے تھے وہ بھی مجموعہ کی صورت میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر شایع ہو چکے ہیں۔ کلکتہ میں اگرچہ یہ تاجدار بے تاج ہو کر پہنچا تھا، لیکن شاہانہ ٹھاٹ میں کمی نہ آنے دی تھی۔ وہی لکھنوی دربار اور منتخب امراء یہاں بھی نظر آتے تھے۔ علماء، شعرا، اتقیار بذلہ سنج اور صاحب کمال لوگ ہر وقت حاضر دربار رہتے تھے۔ تقریر میں صحت لفظی کا اتنا خیال رہتا کہ کیا مجال کہ کسی کی زبان سے کوئی غلط یا خلاف محاورہ لفظ نکل جائے۔ اپنے اعزہ اور اقارب سے بہت ہی اچھا سلوک کرتے تھے۔ حکم دیدیا تھا کہ میری صاحبزادیوں کی شادی میرے غریب رشتہ داروں میں کر دی جائے۔ وفات سے چار پانچ سال پہلے رقص و سرود سے توبہ کر لی تھی۔ شراب سے زندگی بھر پرہیز رہا۔ ممنوعات اور محلات کو بھی تحریری اطلاع دے دیتی تھی۔ کہ جس کا دل چاہے میرے ہاں رہے اور جس کا جی چاہے چلی جائے ہماری طرف سے پوری آزادی ہے۔

کلکتہ میں اگرچہ نواب مدار الدولہ سید علی نقی خان بہادر سہراب جنگ وزیر اعظم کی کوٹھی میں مرغوں کی پالی ہوتی تھی اور کلکتہ کے بڑے بڑے انگریز اپنے مرغ لاکے لڑاتے تھے لیکن بادشاہ نہ کبھی پالی میں تشریف لے گئے اور نہ کبھی بدکے بازی لگائی۔ جوئے سے طبعاً نفرت تھی۔

غرض یہ سلطان ہمہ صفت موصوف تھا۔ ایسے ہر دلعزیز اور نیک نفس تاجدار کو مطعون کرنا انسانیت، اخلاق اور شرافت سے کوسوں بعید ہے۔

تجلیات

از:-
جناب عبدالحق اختر واصفی

شبِ ماہ ہو کنارِ آبِ جُو ہو
صُراحی سامنے پہلو میں تُو ہو

اگر آمادۂ الطاف تو ہو
مری ہر سانس شرحِ آرزو ہو

سما جا میری نظروں میں یہاں تک
جدھر دیکھوں اُدھر بس تُو ہی تُو ہو

رہے تجھ میں نہ مجھ میں کچھ تفاوت
فنا یاں تک تمیزِ ما و تُو ہو

مری صورت کو جو اک بار دیکھے
پکار اُٹھّے کہ تم ہی ہُو بہُو ہو

مآلِ گل مرے پیشِ نظر ہے
مجھے پھر کیوں ہوائے رنگ و بُو ہو

نمازِ عشق کی نیت سے پہلے
سرِ شکِ غم سے لازم ہے وضو ہو

تلمذ ہے مجھے واصف سے اختر
مرا شہرہ نہ کیوں پھر چار سُو ہو

سیلِ رواں

کہیں ایسے ہندوستاں اور بھی ہیں؟

علامہ حضرت محوی صدیقی

مری طرح نالاں یہاں اور بھی ہیں
ہلاکِ غمِ دو جہاں اور بھی ہیں

خزاں میں شگفتہ، غلامی میں شاداں
کہیں ایسے ہندوستاں اور بھی ہیں

مری جان گھبرا گئی تو ابھی سے
یہاں تو کئی امتحاں اور بھی ہیں

جفا ہی نہیں وجہِ بربادئ دل
کئی صدمۂ ناگہاں اور بھی ہیں

وہ مظلوم تو جن کو روئیگا برسوں
زمیں پر سُن اے آسماں اور بھی ہیں

قفس میں یہ جی کیوں بہلتا نہیں ہے
یہاں تو مرے ہمزباں اور بھی ہیں

نہیں صرف یہ دل، یہ آنسو، یہ تارے
شبِ ہجر کے رازداں اور بھی ہیں

نہ منزل نہ مقصد چلا جا رہا ہوں
کہیں ایسے سیلِ رواں اور بھی ہیں

نہ ہو قیس و فرہاد پر عشق نازاں
غمِ دوست کے قدرداں اور بھی ہیں

سلامت قفس، دام، صیاد، بجلی
چمن میں کئی آشیاں اور بھی ہیں

جنھیں چارہ گر بھی نہیں دیکھ سکتا
کئی زخمِ دل خونچکاں اور بھی ہیں

ستم جن کی فطرت، جفا جن کی عادت
تمھیں کیا ہو سات آسماں اور بھی ہیں

ہوئی مفت بدنام فریادِ بلبل
ابھی شکوہ سنجِ خزاں اور بھی ہیں

نہ دلسوز نغمے، نہ جانسوز نالے
مری طرح بیحس جواں اور بھی ہیں

قیامت ہے محوی کی آتش نوائی
یہ مانا کہ رنگیں بیاں اور بھی ہیں

موم بتی

رقت انگیز افسانہ

از جناب شیدا کیوروی

رات نے اپنے سیاہ پر پھیلا رکھے تھے ــــ!

کھڑکی میں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ جھلمل جھلمل، جو ہوا کی لہروں میں غیر متوازن سی ہو جاتی۔ ننھی سی لو کبھی دائیں طرف جھکتی۔ کبھی بائیں طرف خم کھا کر ہوا کے تیز و تند جھونکوں کا مقابلہ کرتی ہوئی جل رہی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھل گھل کر اپنی ہستی کھو رہی ہے۔ اس کے سر سے ڈھلک پڑنے والی بوندیں کمرے میں حزن و ملال کا احساس پیدا کر رہی تھیں۔ اور موم کی اس بتی کی طرح اس کے پاس ہی ننھی سی ایک کھاٹ پر شکیلہ پڑی تھی جس کی بلغمی کھانسی سے ٹوٹے پھوٹے مکان میں کبھی کبھی زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ بیمار تھی۔ سانس رک رک کر آتا تھا جیسے تھکا ہوا مسافر اپنی منزل طے کر رہا ہو۔ اس کے جسم کی کھال لاتعداد جھریوں میں بدل گئی تھی۔ فاقے نے اس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ہمت باقی نہ چھوڑی تھی۔ وہ بالکل مُردہ سی معلوم ہوتی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں اب بھی زندہ تھیں۔ جن میں سے اس کی روح کی ساری افسردگی ایک معصومیت کے انداز سے جھانک رہی تھی۔ جیسے موم کے پیلے جسم میں سے دھاگے کی ڈور ــــ!

موم بتی کے سرے پر پتلی سی لو چمک رہی تھی۔ اور شکیلہ کے سامنے بیٹھے ہوئے اس کے شوہر کے دل میں غم و الم کی موم بتی جل رہی تھی۔ وہ کب سے جل رہی تھی اور کب تک جلتی رہے گی، یہ اس کا شوہر بھی نہ جانتا تھا۔ موم بتی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی کچھ بوندیں ادھر ادھر ڈھلک جائیں اور اس کا شوہر بھی اپنے دکھوں پر آنسو بہاتا۔ وہ بہت دیر سے پائنتی بیٹھا بیوی کے پژمردہ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس افلاس زدہ زندگی میں اس کی بیوی ہی سنسان چٹانوں کے درمیان تاریکی میں موم بتی کی طرح روشنی پھیلا رہی تھی مگر اب یہی موم بتی جھلملانے لگی تھی۔ رباب زندگی کے بچے ہوئے تاروں کو موت کے بے رحم ہاتھ بکھیرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اور یہ غم اس کے شوہر کے لئے جان لیوا تھا۔ اگر اس سے ممکن ہوتا تو وہ اپنی بیوی کے لئے آسمان سے تارے بھی توڑ کر لاتا۔ مگر وہ مجبور تھا بے بس تھا۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ دوا اور تیمارداری میں گھر کی ساری پونجی ختم کر چکا تھا۔ اور اب شکیلہ کی کشتیٔ حیات سرعت کے ساتھ موت کے منجدھار میں بہتے ہوئے دیکھ کر وہ ایک ناقابل برداشت روحانی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ہمدردانہ انداز سے ایک نگاہ شکیلہ پر ڈالی اور ایک نگاہ اپنی اکلوتی بیٹی نادرہ پر ــــ اس کی کل کائنات بھی ایک یہی تھی ــــ کیا اس مرجھائے ہوئے پھول پر وہ اشکبار ہوگا؟ لیکن غریبوں کے آنسو ہی کہاں ہوتے ہیں؟ چھوٹی بچی کی آنتیں بھوک سے تلملا رہی ہوں گی۔ مگر پیٹ بھرے تو کس طرح؟ ڈاکٹر کی فیس دینے کے لئے تو پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر شکیلہ مر گئی تو لاش کے لئے کفن خریدنے کے لئے بھی مجھے رباب بجا کر ہی پیسے جمع کرنا ہوں گے۔ بڑھئی کے پیسے ــــ اف، ان بوڑھے کندھوں پر یہ سارا بوجھ ــــ!

ابھی بوڑھا ربابی ــــ شکیلہ کا شوہر یہیں تک سوچنے پایا تھا کہ موم بتی ہوا کے جھونکوں سے غیر متوازن سی ہو گئی۔ اس کی لو ایک بار ہوا سے ذرا ٹیڑھی ہو کر ہوا سے مرتعش ہو گئی۔ ربابی دوڑ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ اور کھڑکی بند کرنے کے لئے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا پاس کی کوٹھی سے ریڈیو کی آواز اس کے کان میں آئی۔ کوئی گا رہا تھا۔ ربابی بڑبڑایا ــــ میرے ٹوٹے پھوٹے مکان کے پاس یہ فلک بوس مکان کھڑے ہیں جن میں ہمارے ہی ایسے لوگ رہتے ہیں۔ مگر ہماری مصیبتوں سے بے خبر ہیں۔ آہ! یہ دونوں مکان دنیا میں ایک دوسرے کے کس قدر قریب ہیں پھر بھی ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ ــــ اُف سرمایہ داری!

وہ اچانک رک گیا۔ اور اپنے بازوؤں کی طرف دیکھا جو موم بتی کی طرح مہین تھے۔ اس کے پتلے پتلے لبوں پر مُردہ سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ جیسے ایک لاغر شیر کچھ دور ایک ہرن کو دیکھ کر اپنے ہونٹ سکیڑتا اور پھیلاتا ہے۔ پھر اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور

کھڑکی بند کرکے شکیلہ کی کھاٹ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی بند ہونے کی آواز سے شکیلہ کی آنکھیں کھل گئیں اس نے پوچھا۔

"کون ہے ___؟"

"میں ہوں شکیلہ! اب کیسی طبیعت ہے تمھاری؟"

"اچھی ہوں، تم میری فکر نہ کرو۔ تھوڑا سا پانی پلا دو۔"

شکیلہ نے کمزور اور ضعیف آواز میں بڑی مشکل سے کہا۔ ربابی نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اور وہ جلد جلد پانی پی گئی۔ پانی پی چکنے کے بعد وہ پھر کھاٹ پر بچھی ہوئی چادر کو اپنے ارد گرد لپیٹ کر اپنے تصور کی موم بتی کو دل کی گہرائیوں میں جلائے لیٹ گئی۔ اس کے رخساروں پر دھندلی سی دو ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

موم بتی دور کھڑکی میں جس کی توں جل رہی تھی۔ اس کی مغموم لو پر ایک تینگا بار بار سر ٹیک کر کبھی دیوار پر جا بیٹھتا اور کبھی بتی کی لو کے ارد گرد ناچنے لگ جاتا۔ لو گرتی، مڑتی اور تینگا اب جلا تب جلا عین اس وقت باہر سے کسی نے پکارا۔

"اے میاں ربابی!"

ربابی جو سامنے موم بتی کی کمر پر ایک بڑی سی چپکی ہوئی موم کی بوند دیکھ رہا تھا یک بیک چونک پڑا اور اٹھ کر احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر آیا اور پوچھا۔

"کیا کام ہے؟"

"ربابی! آج نواب عبدالرحمٰن کی لڑکی کی شادی ہے۔ باجہ لڑائی پر گیا ہوا ہے اس لئے اب تمھارے رباب کی ضرورت ہے۔"

"لیکن میری بیوی بیمار ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟"

"کسی پڑوسی سے کہہ دینا کہ وہ تیمارداری کرے۔"

"لیکن ہمارے آس پاس تو بڑی بڑی کوٹھیوں والے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں رہتا۔ پھر میں وہاں جا کر بھی کیا کروں گا۔ رباب بجانے کو دل بھی تو چاہے۔"

"ارے بھائی رباب دل سے نہیں بجتا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ رباب پکڑ ہمارے ساتھ ابھی چلو۔ وہاں لوگ بے چینی سے تمھارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تمھارے رہنے سے تمھاری بیوی بچ تو جائیگی نہیں، اور پھر زندگی موت انسان کے اختیار کی چیز تھوڑے ہی ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن مرتے ہوؤں کی کچھ نہ کچھ مدد تو کی جا سکتی ہے۔"

مگر کمائی کا بھی تو خیال رکھنا چاہئے۔ نواب صاحب لکھ پتی ہیں تمھیں منہ مانگا انعام مل جائے گا۔ یوں دس روپے تو مل ہی جائینگے"

"صرف دس روپے؟ میرے غموں کا معاوضہ صرف دس روپے؟"

"میاں ربابی غموں سے آمدنی نہیں ہوا کرتی۔"

"تو کیا جنازے سے ہوتی ہے۔"

"چلو تمھیں پندرہ روپے مل گئے۔ آج کل کے زمانہ میں پندرہ روپے بہت ہوتے ہیں۔ تم اکیلے ہی فائدہ اٹھاؤ۔ منہ کا باجہ بھی آنے والا ہے۔ پھر بڑوں کی شادی روز روز نہیں ہوا کرتی۔"

"موت بھی تو روز روز نہیں آتی؟"

"چلوگے یا نہیں؟"

زرد زرد ربابی کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ اور گردن کی رگیں پھولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کا دل سمٹتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی زبان تالو سے چمٹ گئی۔ ادھر شکیلہ نے اسے کمزور سی آواز میں پکارا وہ آہستہ سے اپنی بیوی کی چارپائی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ چارپائی کے ہل جانے سے شکیلہ کی آنکھیں کھلیں۔ اور ربابی کو دیکھ کر بیٹھنا چاہا اس نے شکیلہ کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ شکیلہ نے نحیف آواز میں کہا ___

"وہ بلانے آئے ہیں تو کیوں نہیں جاتے؟"

"تمھیں ایسی حالت میں چھوڑ کر کیسے جاؤں شاکو؟"

"تم میرا خیال نہ کرو نواب صاحب کی لڑکی کی شادی بغیر باجے کے کیسی معلوم ہوگی؟"

"چلو ربابی دیر نہ کرو۔"

باہر سے آواز آئی۔ اور ربابی سوچنے لگا۔ شکیلہ زندگی کی آخری سانس لے رہی ہے۔ بیماری سے اس کی شکل تبدیل ہو کر آنکھوں میں آ گئی ہے۔ اسے چھوڑ کر کیسے جاؤں۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ آخر میری دوا کے لئے بھی تو پیسے چاہئیں"

شکیلہ نے پھر کہا۔

"تو جاؤں نواب صاحب کے یہاں شکیلہ؟"

شکیلہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نے کروٹ بدل کر موم بتی کو دیکھا جو جلتے جلتے اب آدھی سے بھی کچھ کم رہ گئی تھی۔ موم بتی کی حالت دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی جو باہر کی سرد ہوا میں جا کر مدغم ہو گئی۔ اس نے گردن موڑ کر ربابی کو دیکھا اور کہنے لگی

"جاؤ لیکن جلدی آنا۔"

"دل تو نہیں چاہتا کہ جاؤں مگر پیسوں کی ضرورت ہے، جانا ہی پڑیگا۔ اچھا جاتا ہوں۔ شاکو تم گھبرانا نہیں۔ جلد ہی آجاؤنگا۔"

ربابی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اور اس کا سر تکیہ پر رکھکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد بکس میں سے ایک چادر نکال کر کندھے پر ڈالی اور ایک ہاتھ میں رباب لیکر باہر سڑک پر آ گیا۔ اس اندھیری رات میں اس نے دروازے کو قفل بھی نہ لگایا۔ شکیلہ کم سے کم گھر کی نگہبانی تو کر سکتی ہے۔ وہ یہی سب کچھ سوچتا ہوا آئے ہوئے آدمی کے ساتھ چلتا بھی رہا۔ اور دوڑتا بھی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ربابی پسینہ میں شرابور اس آدمی کے ساتھ شادی کی محفل میں پہنچ گیا۔ محفل پھولوں سے آراستہ تھی اور جابجا جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔

کیلے کے پتے کی طرح ربابی کے چہرہ کو زرد دیکھکر نواب صاحب نے پوچھا۔ "ربابی! بہت گھبرائے ہوئے ہو؟"

"جو ہو سکے گا، کرونگا۔"

"اچھا" ایک صاحب بولے۔ "مگر یہ لو میاں ربابی!"

"شکریہ۔ اگر روٹی ہو سکے تو دے دو۔"

"اچھا لو یہ روٹی۔"

"آپ کتنے فیاض ہیں۔"

"یہاں کھانے کو بہت ہے۔"

"مگر میں یہ روٹی کھاؤنگا نہیں۔ اپنی بچی کے لئے گھر لیجاؤنگا۔"

"لیجانا۔ تمہاری بچی کے لئے اور مٹھائی بھی لا دونگا۔"

"مہربانی ـــ!"

"اچھا میاں ربابی!" نواب صاحب نے مذاق سے کہا۔ "اب تم اپنی تُن تُن شروع کرو۔ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔"

"لیکن ـــ لیکن میں سارے رستے دوڑتا آیا ہوں۔"

مگر ربابی کے کہنے پر بھی کسی نے اُسے تھوڑی دیر کی مہلت نہ دی، مجبوراً اس نے اپنا ساز اٹھایا۔ اور ایک اونچی جگہ چڑھ کر بیٹھ گیا۔ مضراب چلائی۔ کبھی اس تار کو دبایا کبھی اس تار کو دبایا اور چند منٹ میں رباب کو ملا کر ناچنے والوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"بتاؤ۔ کون سا ناچ ناچوگے؟ جتنا چاہو ناچو بلکہ اس سے بھی زیادہ"

وہ لوگ ناچنے لگے اور ربابی رباب بجانے لگا۔ ربابی کی انگلی میں جیسے آگ بھری تھی۔ وہ بجائے جا رہا تھا اور سب خوشی سے ناچ رہے تھے۔ ربابی کے دل سے شکستہ گھر میں موم بتی کی سسکتی ہوئی روشنی میں لیٹی ہوئی بیوی کا خیال جاتا رہا۔ وہ بجائے جا رہا تھا۔ موسیقی اور دل اس وقت ہم شکل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے غم کے عالم میں بھی دوسروں کی خوشی کے لئے بجائے جا رہا تھا۔

لیکن کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اب وہ تندہی سے رباب نہیں بجا رہا تھا۔ پہلے حاضر دماغ تھا۔ نئی نئی سُریں نکال رہا تھا کہ پندرہ روپے کا مستحق ہو سکے۔ لیکن اب بیوی کا خیال اسے پریشان کرنے لگا۔ گھڑی گھڑی انہی پرانی سُروں پر آ نکلتا تھا اور انہی کو عالم محویت میں بجائے چلا جاتا تھا۔ اس کی مضراب چل تو رہی تھی لیکن کولھو کے بیل کی طرح ـــ اور وہ اپنے خیالات کی رَو میں بہا جا رہا تھا۔ شام کو موم بتی پورا جلائی تھی۔ لیکن میرے آتے آتے صرف چار انچ جلنے کو باقی رہ گئی تھی۔ موم بتی آج ہی جلی اور آج ہی جل کر ختم ہو جائیگی۔ کل صبح موم بتی کی اس جلن کی یادگار کھڑکی پر کچھ جمے ہوئے موم اور تنکوں کے کچھ جلے ہوئے سِنکے نظر آئیں گے۔ لیکن ـــ لیکن اس وقت تو موم بتی غالباً جل ہی رہی ہوگی!

"کیوں میاں ربابی! تھک گئے ہو؟"

"نہیں حضور! خدمت کو حاضر ہوں۔"

ربابی نے نواب کے سوال پر چونکتے ہوئے کہا۔ یک بیک اُسے ایک دُھن یاد آئی جو اس نے شاہی سڑک پر خانہ بدوشوں سے چلتے چلتے سنی تھی۔ لیکن وہ تو مصائب و آلام کی ترجمانی کرتی تھی۔ سُروں کی آواز بھی ایسی مدھم تھی جیسے کوئی جنگلی جانور کانٹے دار جھاڑیوں سے زخمی ہوکر چلے اور کبھی اتنی تیز کہ بہشت جانے کی چاہ کی طرح چھاتیوں کو پھاڑ دے۔ اس موسیقی کا ناچ سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر ربابی نے موسیقی کو آہوں اور آنسوؤں سے بدل دیا تھا۔ اس کے راگ میں درد پنہاں تھا ـــ ایک مصیبت زدہ دل کی بات رباب کی مدد سے سطح پر آشکارا ہو رہی تھی مگر یہ ناچ کی دھن تو نہیں تھی۔ ناچنے والوں کے پاؤں بھی غلط پڑنے لگے۔ وہ بھری کشتیوں کی طرح کچھ دیر ہچکولے کھاتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ ایک ایک کرکے ٹھہر گئے۔

"ربابی تیرے ہوش و حواس تو درست ہیں؟"

"یہ کیسی دھن نکالی ہے جیسے جنازہ کے ساتھ بج رہی ہو۔"

مگر ربابی کا دھیان ان کہنے والوں کی طرف نہیں تھا۔ منہ سے بیساختہ نکل گیا "شکیلہ" ـــ پھر یونہی عالم محویت سے چونک کر

رباب بجانے لگا۔ مگر نواب صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔
"بوڑھا ہوتا جارہا ہے اور اُلٹی سریں بجاتا ہے"
"معاف کیجئے گا۔ اب ٹھیک ٹھیک بجاؤنگا"
"نہیں، اب ضرورت نہیں تیری۔ تیری وجہ سے ملّو خراب ہوگیا اب آئندہ تجھے نہیں بلاؤنگا" یہ کہہ کر فوراً ہی نواب صاحب نے پانچ روپے دیکر اُسے چلنے کے لئے کہدیا۔ باقی دس روپے اُلٹی سُریں بجانے کی وجہ سے کاٹ لئے گئے۔

کون جانتا ہے کہ کس پر کیا مصیبت آن پڑی ہے یا کسی کی آنکھیں کیوں اشکبار ہوتی جا رہی ہیں ——؟

ربابی یہ سوچتا ہوا وہاں سے روانہ ہوگیا۔ رات کی تاریکی میں اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ چلتے چلتے اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھیں اور ستارے پر جم کر رہ گئیں جو اس طرح کانپ رہا تھا جیسے ایک نیا نیا قیدی قید خانے میں۔ اس کے قدم اور تیز ہوگئے وہ دوڑنے لگا۔ اور جب ہانپتا کانپتا گھر کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ ہوا سے دروازہ کھلا پڑا ہے۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کی پہلی نظر اپنی شکیلہ پر پڑی۔ جو بے خبر پڑی تھی —— بے سُدھ! پھر موم بتی پر جو اب جل کر ختم ہونے والی تھی۔ اُس کی لو اب چند سے میں آگئی تھی۔ بتی کا بچا ہوا ٹکڑا یکبارگی چمک اٹھا۔ تاریکی کی لامحدود وسعت میں پھیل کر زرد مایوس اور سسکیاں لیتی ہوئی لو دم توڑنے لگی اور مٹتی ہوئی لو روشنی کو سمیٹ کر موم کے اس پیالے میں چھپ گئی

ربابی —— اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ اندھیرے میں اِدھر اُدھر پھیلا رہا تھا!

فریاد

از

جناب زخمی بیگوسرائی

پھُول ہے ساغر بکف، غنچہ سبُو بردوش ہے
پھر بہار آئی ہے، پھر ہنگامِ ناؤ نوش ہے

ہے گنا ہوں پر ندامت، عذر کا کب ہوش ہے
ہر کوئی محشر میں تیرے سامنے خاموش ہے

توڑ دے بانگِ عمل سے بزمِ ہستی کا سکوت
تیری خاموشی سے سازِ زندگی خاموش ہے

بات کرتا ہوں تو مُنہ آتے ہیں وہ ہر بات پر
چپ جو ہو جاتا ہوں فرماتے ہیں کیوں خاموش ہے

تاڑنے والوں سے دل کا حال چھپ سکتا نہیں
آنکھ سب کچھ کہہ رہی ہے گو زباں خاموش ہے

زندگی میں ایک دن صورت نہ دیکھی چین کی
ابتدائے عمر سے زخمی اذیت کوش ہے



جریان اور سرعت انزال کی
سب سے زیادہ کامیاب دوا

یابس

ایک ہزار مرتبہ

یابس کہنے سے شدید سے شدید جریان کا بھوت اُتر جاتا ہے!

یہ رائے ان لوگوں کی ہے جنہوں نے "یابس" کا حیرت انگیز تجربہ کیا ہے۔ مگر .....

یابس ہے کیا؟ کیا کسی موکل یا جن کا نام ہے یا کوئی ہمزاد ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ سفوف کی شکل میں

جریان کی ایک لاجواب حیرت انگیز دوا ہے

سفید قطرہ کا آنا۔ یا دھات کا گرنا۔ شب کو سوتے میں ناپاک ہو جانا نہایت بُرا مرض ہے اس مرض کی موجودگی میں مباشرت کی حقیقی لذت سے اِنسان محروم رہتا ہے۔ ہومیوپیتھک۔ ویدک وغیرہ طبوں میں اِس مرض کی دوائیں ہیں مگر وہ اِس قدر کامیاب اور زود اثر نہیں جس قدر

سفوف یابس ہے

پہلی ہی خوراک میں رقیق دھات کو جما دیتا ہے۔ کمر کا درد۔ چہرے کی بیرونقی۔ کاہلی۔ سستی۔ لاغری دُور کر دیتا ہے' ہزارہا مریض سفوف "یابس" کی بدولت صحتیاب ہو چکے ہیں اکثر ڈاکٹروں نے بھی اِس دوا کے حیرت انگیز فوائد دیکھکر اپنے مطب میں اِستعمال کرانا شروع کر دیا ہے پس اگر زندگی کا لطف اُٹھانا ہو تو آج ہی ایک کارڈ بنام مینیجر "مشہور دواخانہ دہلی" کو لکھئے اور یہ دوا بذریعہ وی پی پارسل منگا کر فائدہ اُٹھائیے۔ قیمت بیس خوراک کا بکس ایک روپیہ چودہ آنہ (عہ۱) محصول ڈاک علاوہ ہوگا۔ ترکیب اِستعمال ہر خوراک کے پیکٹ پر تحریر ہے۔ منگانے میں جلدی کیجئے ورنہ دوبارہ تیاری کا اِنتظار کرنا ہوگا ✷

آہ! عشقِ بے ثباتِ رنگ و بو

مثنوی مولانا روم کی ایک حکایت

از جناب پیر غلام دستگیر نامی

عالمگیر کی بعض گزشتہ اشاعتوں میں پیر مراد شاہ مرحوم کی مثنوی "مراد العاشقین" سے میں دو قصے عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچنے کے ثبوت میں پیش کر چکا ہوں۔ اب مثنوی مولانا روم سے ایک رنگ و روغن پر مٹنے والی کی داستان عشق بیان کی جاتی ہے جس کا عشق معشوق کا رنگ پھیکا پڑتے ہی اُڑ گیا۔ آج کل ہمارے نوجوانوں میں عشق اتنا عام ہے اور سینما کی وجہ سے ایسے عشق بازوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے جو ایکٹریسوں کی "سیج بیوٹی" پر فریفتہ ہو کر اسی میں اپنی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں کہ یہ مصنوعی حسین انھیں الکتوب نصف الملاقات ہی سے نوازیں۔ پوری ملاقات تو انہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو دولتمند ہوں اور دولت کو آگ لگانے کے لئے آمادہ۔ بقول سعدی بتصرف قلیل ؎

سر از عقل و دست از درم کن تہی
چو خاطر بایں شوخ چشماں نہی

آغاز داستان یوں ہے کہ ایک بادشاہ شکار کو نکلا۔ راہ میں آئے ایک زاہد فریب حسینہ نظر پڑی۔ وہ اس پر شیدا ہو گیا۔ زر کثیر دے کر اسے محل میں لایا۔ اور وہ سب حرموں میں ممتاز ہو گئی۔ بادشاہ اس پر سو جان سے نثار تھا۔ اس کے لئے ہر طرح کے آرام و آسائش کے سامان مہیا تھے۔ مگر اس کی طبیعت مضمحل سی رہتی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ بیمار ہو کر وقف بستر ہو گئی۔

بادشاہ نے دور و نزدیک سے بڑے بڑے حاذق طبیب منگائے ہر ایک نے انعام کے لالچ سے دل لگا کر علاج کیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ جو دوا دیتے اُلٹا اثر ہوتا ؎

از قضا سرکنگبیں صفرا فزود
روغن بادام خشکی می نمود
از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت
آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

سرکہ قاطع صفرا ہوتا ہے مگر وہ گرمی بڑھانے لگا۔ باداموں کا تیل خشکی دور کرتا ہے مگر اس کے استعمال سے اور خشکی بڑھنے لگی ہلیلہ قبض کشا ہے۔ مگر یہاں قابض ثابت ہوا۔ پانی کا کام آگ بجھانا ہے۔ مگر شاہ بیگم پر اس نے پٹرول کا کام کیا۔

بادشاہ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے رجوع الی اللہ کیا۔ اور گڑگڑا کر صحت کے لئے دعا مانگی۔ جو بارگاہ الہی میں درجہ اجابت پر پہنچی ؎

چوں برآورد از میان جان خروش
اندر آمد بحر بخشائش بجوش

وہ دعا کرتے کرتے سو گیا۔ خواب میں اسے بتایا گیا کہ کل جو مسافر تجھے پہلے ملے گا۔ اس کے علاج سے بیگم شفایاب ہو گی۔ بادشاہ بڑی بیتابی سے مسافر کی راہ تکنے لگا۔ اور جب نو وارد دور سے اس کی طرف آتا دکھائی دیا تو وہ بیساختہ پکار اُٹھا ؎

اے مرا تو مصطفٰے من چوں عمرؓ
از برائے خدمتت بندم کمر
ترجمانی ہر چہ ما را در دل است
دستگیری ہر کہ پائش در گل است

یعنی جس طرح حضرت عمرؓ رسول اللہ کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو گئے تھے۔ میں بھی حاضر ہوں۔ آپ کو سب حال معلوم ہے میں کیچڑ میں پھنسا ہوں، میری دستگیری کیجئے۔

نو وارد طبیب طعام سے فارغ ہو کر محل میں پہنچا۔ بیمار کی حالت دیکھی۔ چہرے کی رنگت اور نبض نے بتا دیا کہ اسے مرض عشق لاحق ہے اور کوئی بیماری نہیں ؎

عاشقی پیداست از زاری دل
نیست بیماری چو بیماری دل

طبیب نے بادشاہ سے کہا۔ آپ الگ ہو جائیں میں مریضہ سے تخلیہ میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ کو اس غیبی طبیب پر ہر طرح اطمینان تھا الگ ہو گیا۔ طبیب بیگم کے پاس گیا اور کہا۔ شاہ بیگم! مجھے یہ بتائیں کہ آپ کس شہر کی رہنے والی ہیں۔ یہ میں اس لئے پوچھتا ہوں کہ ہر شہر کا طریق علاج الگ الگ ہوتا ہے۔ اپنے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے نام بتائیں اور یہ بھی واضح کریں کہ شاہی محل میں پہنچنے سے پہلے آپ کہاں کہاں رہیں؟

یہ سوال کر کے طبیب نے بیگم کی نبض پر انگلی رکھی۔ کہ اس کی کیفیت دل معلوم کرے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اس کے لئے کتنا تردد کرنا پڑتا ہے۔ پاؤں زانو پر رکھتے ہیں۔ سوئی کی نوک سے کانٹے کا سر معلوم کرتے ہیں۔ اُسے لب سے تر کرنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں کانٹا معلوم ہوتا اور نکلتا ہے۔ جب خار پا کے لئے اتنی کاوش سے کام لینا پڑتا ہے تو دل کا کانٹا نکالنا اور معلوم کرنا کیوں مشکل نہ ہو۔

الغرض جب طبیب نبض بدست تھا تو بیگم نے یوں حال بیان کرنا شروع کیا۔

طبیب! میں فلاں شہر کی رہنے والی ہوں۔ وہاں فلاں فلاں خواجگان اور خواجہ تاش تھے۔ میری فلاں فلاں سہیلیاں اور رشتہ دار ہیں پھر میں وہاں سے فلاں فلاں جگہ گئی اور فلاں فلاں اشخاص سے موقع ملاقات میسر ہوا۔ (ابھی تک اس کے چہرے کا رنگ اور نبض غیر متغیر تھی) پھر میں سمرقند آئی۔ سمرقند کا نام لیتے ہی اس نے آہ کی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اسی حالت گریہ میں اس نے بیان کیا کہ وہاں مجھے خواجہ زرگر نے خرید لیا۔ میں اس کے پاس چھ مہینہ ہی رہی تھی کہ آہ اس نے مجھے دوسرے کے پاس فروخت کر دیا۔

طبیب نے کہا۔ اس سے آگے بیان کرنے کی ضرورت نہیں میں نے بیماری معلوم کر لی ہے۔ آپ بہت جلد شفایاب ہو جائینگی، باتوں باتوں میں اس نے خواجہ زرگر کے محلے اور مکان کا پتہ بھی دریافت کر لیا۔ اور کہا یہ حال بادشاہ سے بھی نہ کہنا۔ مراد بھید چھپانے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ اسرارت نہاں در دل شود	آں مرادت زود تر حاصل شود
گفت پیغمبر ہر آں کو سر نہفت	زود گردد با مراد خویش جفت
دانہ چوں اندر زمیں پنہاں شود	بعد ازاں سرسبزی بستاں شود

زر و نقرہ گر نبودندے نہاں
پرورش کے یافتندے زیر کاں

دیکھو دانہ زمین کے اندر چھپتا ہے تو باغ کو سرسبز کرتا ہے۔ سونا چاندی چھپ کر ہی کان میں پرورش پاتے ہیں۔ قصہ مختصر طبیب صاحب بیگم کے پاس سے اٹھ کر بادشاہ کے پاس آئے اور کہا کہ کسی حیلے سے فلاں زرگر کو سمرقند سے بلالیں۔ بیگم کی صحت اُس کے آنے پر موقوف ہے۔

بادشاہ نے اپنے دو خاص مصاحب سمرقند بھیجے۔ انھوں نے زرگر کو خلعت بادشاہی دے کر کہا وہ تمھارے ہنر کا شہرہ سن کر تمھارا عاشق ہو گیا ہے اور تمھارے لانے کو ہمیں بھیجا ہے۔ تم وہاں مالامال ہو جاؤ گے چلو ہمارے ساتھ۔ لالچ بُری بلا ہے۔ زرگر بال بچے اور گھر بار چھوڑ کر وطن سے چل پڑا۔ اور باریاب درگاہ سلطانی ہوا۔ بادشاہ بڑی عزت و تکریم سے پیش آیا اور گنج زر اس کے سپرد کر کے کہا کہ ہمارے لئے عمدہ عمدہ زیور تیار کرو اور عمر فارغ البالی سے گزارو۔

جب وہ چند زیور تیار کر چکا تو بادشاہ نے کہا ہم تمھارے کام سے بہت خوش ہیں اور اپنی خاص لونڈی انعام میں دیتے ہیں اسے ہر طرح آسودہ و خوشحال رکھنا۔ چنانچہ ؎

مدت شش ماہ می راندند کام
تا بصحت آمد آں دختر تمام

کنیز چھ ماہ زرگر کے پاس رہی اور اس کی صحبت میں رہ کر بالکل تندرست ہو گئی۔ اس کے بعد طبیب نے زرگر کے لئے ایک ایسا شربت تیار کیا جو دیکھنے اور ذائقہ میں بڑا خوشگوار تھا مگر تاثیراً چہرے کی رنگت اڑا دینے اور نحیف و نزار کرنے والا تھا۔ چنانچہ طویل بیماری سے اس کے چہرے کا رنگ و روغن نابود ہو گیا آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ مُنہ پر مردنی چھا گئی۔ جوں جوں اس کے حسن میں انحطاط آتا گیا کنیز کی محبت بھی گھٹتی گئی کیونکہ وہ اس کے حُسن ظاہری پر عاشق اور اس کی جوانی اور خوش ترکیبی پر مفتون تھی، جب وہ چیزیں جو ذریعہ کشش تھیں ناپید ہو گئیں اس کا عشق بھی جاتا رہا ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

چنانچہ زرگر اسی حال میں مر گیا۔ کنیز کا دل پہلے ہی اس کے عشق سے خالی ہو چکا تھا۔ موت نے تو بالکل ہی قطع تعلق کر دیا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

زانکہ عشق مردگاں پایندہ نیست
زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

مردوں کا عشق پائدار شے نہیں کیونکہ مردے ہمیں ملنے سے رہے۔

طبیب دانا نے رنگ و روغن پر مبنی ہوئی کنیز کے سامنے اس کے معشوق کو حسن و جمال سے معرّا کر دیا اور وہ مرض عشق سے شفا پاکر شاہی محل کی زینت بن گئی۔ زرگر کے دام عشق سے رہا ہو گئی

اور بادشاہ اسے تندرست پاکر سوجان سے فدا ہوا۔ اگر کنیز کا عشق صادق ہوتا تو وہ زرگر کے ساتھ گھل گھل کر مر جاتی۔ مگر اسے اس کے خون سے عشق تھا جب خون نچڑ گیا تو اس کا عشق بھی ہوا ہوگیا، آہ! خواجہ زرگر کو اس کا حسن اسی طرح وبال جان ہوگیا جس طرح طاؤس کو اس کے خوبصورت پر۔ لومڑی کو خوشنما پوستین، آہوئے ختنی کو نافۂ مشک اور ہاتھی کو اس کے سفید دانت۔

مولانا فرماتے ہیں فنا ہو جانے والے حسینوں کا عشق چھوڑ کر خدائے حی لایموت کا عشق اختیار کرلے جس کے عشق سے انبیا نے مراتب عالیہ حاصل کیئے ؎

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است
وز شراب جاں فزایت ساقی است
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیا
یافتند از عشق او کار و کیا

صیّاد

از:- جناب محمد شرف الدین علوی سلیم

قفس میں بھی ہو تماشائے گلستاں صیاد ۔۔۔ جو رنگ لائے مری چشم خونفشاں صیاد
فراقِ گل میں اثر دیکھ گرم نالوں کا ۔۔۔ قفس پہ رہتا ہے چھایا ہوا دھواں صیاد
چمن میں سن کے تڑپنے لگے سب اہلِ چمن ۔۔۔ گئی قفس سے ہماری کہاں فغاں صیاد
بہار آئی ہے غنچے چٹک کے پھول بنے ۔۔۔ خدا کرے کہ ہو ایسے میں مہرباں صیاد
بغور دیکھ رہا ہوں یہ میں نشیمن سے ۔۔۔ چمن میں تیری نظر ہے کہاں کہاں صیاد
جو حال درد ہمارا سنے گا رو دے گا ۔۔۔ نہیں ہے یہ گل و بلبل کی داستاں صیاد
دعا یہ دل سے نکلتی ہے میں رہوں نہ رہوں ۔۔۔ قفس رہے ترا آباد جاوداں صیاد
فدائے غنچہ و گل میں بھی ہوں عنادل بھی ۔۔۔ بچھائے دام فریب اب کہاں کہاں صیاد
تلاش کیا کروں گلشن میں چار تنکوں کی ۔۔۔ کہ میری سمت سے رہتا ہے بدگماں صیاد

سلیم پر نگہ لطف کی ضرورت ہے
یہی تو دل سے ہے اک تیرا قدرداں صیاد

یہ کیا؟

از:-
مولوی عبدالباری شاہ صاحب عشق

"یہ اُس زبان کے دو لفظوں ("یہ" اور "کیا") کا ایک چھوٹا سا جملہ ہے جسے صحیح معنوں میں "ہندی اتھوا ہندوستانی" کہا جا سکتا ہے لیکن دیکھیئے اُردو زبان جب اسے اپنا کر لیتی ہے تو کتنے معنی اور محل استعمال عطا کرتی ہے جس کی مثال شاید کیا غالباً ہندی زبان میں نہ مل سکے گی۔ اس سے اُردو زبان کی وسعت اور ملکی خدمت کا اندازہ کیجیئے۔ ذیل میں ہم تین غزلیں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج کرتے ہیں جن سے اس چھوٹے سے جملے کے مختلف محل استعمال معلوم ہونگے۔ بلبل ہندوستان نواب فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم کی غزل اگرچہ ان کے دیوان میں موجود ہے لیکن بہتوں کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ استاد تھے۔ ان کی زبان اور محاورہ بندی مشہور ہے ان کے کلام سے سند لی جا سکتی ہے۔ اس لئے ان کی غزل بھی درج کی جاتی ہے!!

داغ

تو ہے مشہور دل آزار یہ کیا — تجھ پہ آتا ہے مجھے پیار یہ کیا
جانتا ہوں کہ مری جان ہے تو — اور میں جان سے بیزار یہ کیا
پاؤں پر اُن کے گرا میں تو کہا — دیکھ ہشیار خبردار یہ کیا
تیری آنکھیں تو بہت اچھی ہیں — سب انہیں کہتے ہیں بیمار یہ کیا
کیوں مرے قتل سے انکار کیا یوں — اس قدر ہے تمہیں دشوار یہ کیا
سر اُڑاتے ہیں وہ تلواروں سے — کوئی کہتا نہیں سرکار یہ کیا
ہاتھ آتی ہے متاع اُلفت — ہاتھ ملتے ہیں خریدار یہ کیا
خوبیاں کل تو بیاں ہوتی تھیں — آج ہے شکوۂ اغیار یہ کیا
لے لئے ہم نے لپٹ کر بوسے — وہ تو کہتے رہے ہر بار یہ کیا
وحشتِ دل کے سوا اُلفت میں — اور ہیں سیکڑوں آزار یہ کیا

ضعف رخصت نہیں دیتا افسوس — سامنے ہے در دلدار یہ کیا
باتیں سنئے تو پھڑک جایئے گا
گرم ہیں داغ کے اشعار یہ کیا

عشق۔ خلف و تلمیذ حضرت آہ مرحوم

میں ہوں دل دیکے گنہگار یہ کیا — دل رُبا خود ہے دل آزار یہ کیا
عشق پر لطف و پُر آزار یہ کیا — نہ تو آسان نہ دشوار یہ کیا
ہے نگہ مائل اغیار یہ کیا — عام ہے اب ترا دربار یہ کیا
مسکرا دیتے ہو تم کہہ کے "نہیں" — صاف انکار نہ اقرار یہ کیا
چشم بد دور عجب آنکھیں ہیں — ہیں مسیحا بھی یہ بیمار یہ کیا
پردے ہی میں ہے ابھی تو وہ شوخ — اور عالم ہے طلبگار یہ کیا
دل بھی دیں جان بھی دیں اُف نہ کریں — تاب لا سکتے ہیں اغیار یہ کیا
کیا سوال ایک نظر کا ہے گناہ — کھینچ لی آپ نے تلوار یہ کیا
لے گئے لُوٹ کے وہ دل میرا — بن کے آئے تھے خریدار یہ کیا
صبر بھی آپ لئے جاتے ہیں — دیکھئے دیکھئے سرکار یہ کیا
جان کر یہ کہ وہ ہے دشمن جاں — اُس پہ آتا ہے مجھے پیار یہ کیا
خود تو ہیں در پئے آزار مرے — یاد ان کی مری غمخوار یہ کیا
تیری صورت تو بہت بھولی ہے — اور تو ایک ہی عیار یہ کیا
دے گئیں داغ وہ پلکیں چبھ کر — بن گئے پھول جو تھے خار یہ کیا
عشق کہتی ہے طبیعت اپنی — کہیئے شعر اور بھی دو چار یہ کیا

۲

دل میں رہتے ہیں دل آزار یہ کیا — اتنے پیارے ہیں ستمگار یہ کیا
تیرے اس کہنے پہ ہر بار یہ کیا — اور آتا ہے مجھے پیار یہ کیا
ابھی ہاں تھی ابھی انکار یہ کیا — کہدو اک بات ہے دشوار یہ کیا
ہاتھ ملتے ہیں مرے قتل کے بعد — کون پوچھے کہ ستمگار یہ کیا
بانہیں گردن میں تو ڈالیں نہ کبھی — خود گلے کا ہیں مرے ہار یہ کیا
دل مرا، جان مری، دین میرا — سب کے وہ مالک و مختار یہ کیا
جی اُٹھا دیکھ کے اُنکو تو کہا — مر رہا تھا تو ہی مکار یہ کیا
چاہتا ہوں جسے ہے جان مری — آپ اپنا ہوں طلبگار یہ کیا
دعوتِ عشق ابھی سے ہے ادھر — حشر پر وعدۂ دیدار یہ کیا
عشق میں سوز بھی ہے ساز بھی ہے — میں نہ اچھا ہوں نہ بیمار یہ کیا
ڈھونڈ لوں دل یہ اجازت ہے مجھے — پھر نہ کہئے گا خبردار یہ کیا
عشق میں آہ بھی کرتا ہے کوئی — ارے ہاں ہاں دل بیمار یہ کیا
مجھکو تو دشت نوردی ہی محال — پاؤں پڑتے ہیں مرے خار یہ کیا
بک گئے حسن کے ہاتھوں خود ہی — حسن کہے ہم تھے خریدار یہ کیا
زیست کی جان محبت ہے مگر — زندگی ہے مجھے دشوار یہ کیا

مرقدِ عشق کہیں دور نہیں
دو قدم پر تو ہے سرکار یہ کیا

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کی بات۔

جب میں باپ نہیں تھا

(ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی)

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن بہت عرصہ تک ...... میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں۔ شادی کیوں ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میرے دوست جب اپنی بیوی کے قصے مجھے سنایا کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے۔ اور اس کی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھدی ہے۔ بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا اُس نے پوچھا۔

کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے۔ میں نے کہا نہیں لیکن پھر اس نے کہا کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے خاص بات پوچھی میں نے کہا۔ میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ ایسا ہوتا ہے لیکن آجتک ......

میرا یہ جواب سن کر وہ چونک اُٹھا۔ اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اگر اسی زمانے میں بتلا دیتے، جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو، تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا۔ چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت زنانہ دواخانہ کو خط لکھکر "جوہر اعظم" دوا کی ایک شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی اور مجھے استعمال کے لئے دی۔ میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنے کے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ رطوبت خارج ہونی بند ہو گئی اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات محسوس ہوئی دوا ابھی پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک مفرد ...... بیوی

جنوری سنہ [illegible]ء کی بات

اپنے دوست کی مہربانی کی بدولت اب میرا اس جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش و خرم نوجوان کی جیسے کہ مجھ جیسی عمر کے انسان کو ہونا چاہیئے۔ میری بیوی ایک ماں ہے۔ اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے اور بچہ ہمک ہمک کی طرف دوڑتا ہے اور ماں کے سر کے بال نوچتا ہے۔ تو مجھے یہ آتی ہے کہ اس بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے۔ کیونکہ اسی کے کھانے سے ہی میری جریان کی بیماری دور ہوئی۔ اور میری خفیہ طاقت واپس آ گئی۔ کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے کہ اس دنیا کی اگر کوئی بھرپور دوا ہو سکتی ہے تو وہ "جوہر اعظم" ہے۔ ایک شیشی کی صرف تین روپے آٹھ آنے ہے۔ اس دوا پر عام فائدے کے لئے محصول ڈاک معاف ہے۔

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوت مردی پانی کی طرح بہہ جاتی ہو، رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت شرمندگی ہوتی ہو، انہیں چاہیئے کہ

مینجر زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی

کو خط لکھ کر جوہر اعظم دوا کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیں۔ ایک ہی شیشی تندرست کر دے گی۔

جوہر اعظم وہی مشہور دوا ہے جسے [illegible] میں آل انڈیا کا... نے کافی تجربہ کر کے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے اور تمام ملک سے پرزور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ آل انڈیا کا مریڈ سوسائٹی نے جوہر اعظم کا بہت کافی تجربہ کرایا ہے اور جگہ جگہ ہر مریض کو اس دوا نے تندرست کر دیا۔ چنانچہ ... مذکور کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا۔ صرف دوا کی قیمت لی جاتی ہے۔

شیفن نسٹ ...

اعترافِ شکست

دلچسپ افسانہ

از جناب اے۔ آر۔ رشیدی

یکم ستمبر

ڈیر پارس!

آخرکار مجھے بینا سے خفیہ طور پر شادی کرنا پڑی۔ بسترِ مرگ پر اس کی ماں نے بینا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں مقدس اعتماد کے ساتھ دے دیا تھا۔ میں نے خدا کے ایک بیش بہا تحفہ کے طور پر اُسے قبول کر لیا۔ اس کی نمناک آنکھوں کے سامنے جو استمداد کی ملتجی تھیں میں کسی طرح انکار نہ کر سکا۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ میرے چچا بہت امیر اور بے اولاد ہیں۔ انھوں نے اس شرط پر مجھے اپنا وارث منتخب کر لیا ہے کہ میں ان کی طرح تجرد کی زندگی بسر کروں۔ انھیں ابتدا ہی سے عورتوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ اب تک مستند کنوارے ہیں۔ ان کے خطوط میں صرف ایک ہی خیال ہوتا ہے کہ مجھے اعلیٰ تحریک انسانی چھوڑ کر وحشی نہ بننا چاہیئے۔ وہ اس سلسلے میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انھوں نے کنایتہً یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر میں نے شادی کر لی تو وہ مجھے عاق کر دینگے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مجھے ذاتی تحفظ کی خاطر پوشیدہ طور پر شادی کرنا پڑی۔ اور یہ کوئی حیرتناک بات نہیں۔ خوش قسمتی سے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ چچا شدید علیل ہیں بلکہ انھیں قریب الموت ہی سمجھنا چاہیئے۔ اس طرح میں بینا کے ساتھ اپنی زندگی مسرت و شادمانی سے گذار سکوں گا۔

یہاں یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ میرے چچا کو عورتوں یا شادی سے اس قدر نفرت و کراہت ہے کہ انھوں نے تمام دیویوں سے دستکشی اختیار کر لی ہے اور صرف کنوارے دیوتا ہی کے پجاری بن گئے ہیں جس کی مورت انھوں نے اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے۔ جب تک یہ بزرگ زندہ ہیں میں اپنی شادی کا انکشاف نہیں کر سکتا۔ میں اپنی زندگی بڑی تکلیف کے ساتھ گذار رہا ہوں۔

ہمیشہ تمھارا

گنیش۔

۲ ستمبر

پیاری بہن!

معاف کرنا، میں تمھیں جلد خط نہیں لکھ سکی مگر کیا کروں کچھ حالات ہی اس قسم کے تھے۔ تمھیں معلوم ہے کہ گذشتہ چند ماہ میں نے کس قدر رنج و الم کے ساتھ گزارے۔ جب مجھے اپنی ماں کا مرنا یاد آتا ہے تو جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ماں مجھے اس وسیع دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ گئیں ——! مگر گردشِ مقسوم نے کچھ اور ہی رنگ دکھایا۔ آج میں دنیا میں سب سے مسرور لڑکی ہوں۔ جس نوجوان کا میں نے اپنے پچھلے خط میں حوالہ دیا تھا جس کی بدولت ماں کو حسرت کے ساتھ مرنا نہ پڑا اس نے مجھ سے شادی کر لی ہے۔ میرا دل اس کی فیاضانہ محبت کی آماجگاہ بنا ہوا ہے مگر اس وقت ہماری مالی حالت سقیم ہے۔ میرا شوہر معتوب ہے جو کچھ آمدنی ہوتی ہے وہ ہمارے لئے مکتفی نہیں ہوتی۔ تم جانتی ہو کہ بازار میں یہ قصا بیر کس قدر کم نکلتی ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس ماہانہ گزارے پر ہی اکتفا کرنا پڑتی ہے جو میرے شوہر کا مالدار چچا دیتا ہے۔ وہ شمالی ہند میں رہتا ہے۔ میں اپنے شوہر پر مزید بار بن گئی ہوں۔ اس لئے قرض لینا ناگزیر ہے۔ اندھیری گھٹا میں صرف یہی ایک روپہلی کرن ہے کہ مالدار چچا کا ورثہ مل جائے گا جو اس وقت خطرناک طور پر علیل ہے۔ میرا شوہر اس کا واحد وارث ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جلد ہی مشکلات سے چھٹکارا ہو جائیگا۔

ہمیشہ تمھاری۔ بینا

۴ ستمبر

میرے اچھے گنیش!

میں تبدیلِ آب و ہوا اور طبی علاج کے لئے عنقریب کلکتہ آ رہا ہوں۔ اس سے اچھی جگہ مجھے کوئی اور پسند نہیں آئی۔ وہاں تمھارا سہارا میرے لئے بہت بہتر ہوگا۔ ابھی سے ایک صاف ستھرا کمرہ کرایہ پر لے لو۔ یہاں سے اپنے ساتھ اگر کوئی ملازم لاؤنگا تو زیادہ روپیہ ضائع ہوگا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار ایک خادمہ کو رکھنا پسند کرونگا کیونکہ عورتیں اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں۔ چنانچہ میری خدمت کے

واسطے ایک ادھیڑ اور پارسا عورت کو رکھ لو۔ روپیہ کی کوئی فکر نہ کرنا تندرستی کے سامنے روپیہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ میری دعائیں قبول کرو۔

تمہارا ٹھاکر داس

---

۵ ستمبر — مائی ڈیر پارس!

پاپا کا خط میرے لئے ایک اور مصیبت لے آیا ہے۔ میں سخت پریشان ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا آئندہ سینچر کو یہاں علاج کی غرض سے آرہا ہے۔

میری ابھی تک کوئی تصویر فروخت نہیں ہوئی ہے۔ اور اب اپنی موجودہ حالت کے بارے میں عجیب و غریب اذیت میں مبتلا ہوں اس پر مستزاد یہ کہ چچا یہاں آرہے ہیں۔ گھر میں بینا کی موجودگی اور زیادہ پریشان کن ثابت ہوگی۔ اگر یہ راز افشا ہوگیا تو دولت کے حصول کی تمام امیدوں پر پانی پھر جائیگا۔ بینا اس وقت کہیں نہیں جاسکتی۔ اس طوفان کے ختم ہونے تک میں اسے کسی اور جگہ رکھ بھی نہیں سکتا۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ تم ہی کوئی مشورہ دو۔

تمہارا مخلص۔ گنیش!

---

۹ ستمبر — پیاری بہن!

چچا ہمارے یہاں آرہے ہیں۔ قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ وہ عورتوں کو بڑی نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس وقت بھی انہیں معلوم ہوگیا کہ ہم نے خفیہ طور پر شادی کرلی ہے۔ وہ گذارا بند کردیں گے۔ کل کی رات ہم نے بڑی بے چینی کے ساتھ گذاری یکایک مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بوڑھے نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو بطور نرس کے ملازم رکھنے کے لئے لکھا ہے۔ میں نے نرس کا پارٹ ادا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ حالات اب جو بھی رخ اختیار کریں!

تمہاری اپنی۔ بینا

---

۱۱ ستمبر — سب سے اچھی بہن!

آخر کار وہ بھیڑیا آہی گیا۔ اس کی چڑچڑی فطرت نے ہر شے میں کچھ نہ کچھ نقص نکالا۔ مجھے تعجب ہے کہ آیا وہ اپنی زندگی میں کبھی مسکرایا ہے۔ جب سے وہ آیا ہے ہم پر لعن طعن کی بارش ہوتی رہتی ہے معلوم نہیں ہماری سکیم کا کیا حشر ہوگا۔ میرے شوہر نے جب مجھے خادمہ کے طور پر اپنے چچا سے متعارف کرایا تو مجھے صرف اپنی ہی خاطر نہیں بلکہ اپنے خاوند کی اذیت کا لحاظ کرکے بڑی تکلیف ہوئی۔

خادمہ کی طرح کام کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ جب پہلی مرتبہ میری ملاقات ہوئی تو میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ میرے کپڑوں کی مہک کی سخت مذمت کی گئی اور مجھے باہر چلا آنا پڑا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ایک نوجوان عورت کی دیکھ بھال کرنے سے تو مرجانا کہیں اچھا ہے۔

اس کے بھتیجے نے بہت کچھ معذرت کی اور کہا کہ وہ قلیل عرصہ میں کسی بوڑھی عورت کو نہ پاسکا۔ بالآخر چچا کسی قدر راضی ہوگئے اور کہا کہ اچھا ایک ہفتہ تک یا جب تک بوڑھی عورت نہ ملے اس کا کام دیکھیں گے۔ عورتوں کے متعلق وہ جو کچھ برا بھلا کہا کرتا ہے اس سے میں نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ چاہے جو بھی ہو میں اس کھوسٹ کو ٹھیک کرکے رہوں گی۔ اگرچہ مجھے ابھی تک خوف ہے کہ کہیں میں ناکام نہ ہوجاؤں۔

ہمیشہ تمہاری بینا،

---

۱۳ ستمبر — ڈیر متھورا!

میں پچھلے سینچر کو یہاں خیریت سے پہنچ گیا۔ سفر کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا اب کیا ذکر کروں؟ یہاں ایک اور مصیبت ہے بیوقوف بھتیجے نے ایک نوجوان عورت کو خادمہ کے طور پر ملازم رکھ لیا ہے۔ اس سے میں اس قدر اکتایا کہ تمہیں وقت پر اپنی آمد سے مطلع نہ کرسکا۔ تعجب در تعجب ہے! یہ ملازم لڑکی میرے ان عقاید کو جھٹلانے کے درپے معلوم ہوتی ہے۔ جو میں عورتوں کے متعلق رکھتا ہوں۔ وہ نوجوان ہے مگر ناز و عشوہ سے مبرا ہے' بڑی حد تک خوددارانہ خیالات کی حامل نظر آتی ہے۔ لاریب وہ اپنے فرائض کو تسلی بخش طور پر انجام دے رہی ہے پھر بھی جرائم خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ زہریلی ناگنیں بے خبری میں ڈس لیتی ہیں اور جب تک میں خود اپنے آپ کو نہ سنبھالوں محفوظ نہیں رہ سکتا۔

تمہارا۔ ٹھاکر داس۔

---

۱۴ ستمبر — پیاری بہن!

تمہارا شیریں نغمہ مجھے وقت پر مل گیا۔ کوئی تازہ خبر نہیں ہے، بڈھا کھوسٹ اچھا ہو رہا ہے۔ اور اس کا مزاج بھی بدلتا جا رہا ہے

گر خرخرا پن ابھی باقی ہے ۔۔۔ افعی کے زہریلے دانتوں سے کون انکار کر سکتا ہے؟ میری مساعی قدرے کامیاب ہو رہی ہیں اور وہ اپنے دوران قیام تک مجھے ملازم رکھنے پر راضی ہو گیا ہے۔ امید تو ہے کہ میں اس پر فتح حاصل کر سکوں گی۔ پھر وہ مجھے اپنے بھتیجے کی بیوی سمجھ کر بجائے ناراض ہونے کے یقیناً بہت خوش ہوگا۔

تمھاری بینا

---

۱۶ ستمبر

مائی ڈیر تھورا!

یہاں آنے کے بعد اب میں بڑی حد تک اچھا ہوں۔ خادمہ نے اپنی صنف کے متعلق میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس سے قبل میں نے کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا کہ عورتیں اتنی اچھی ہوتی ہیں جتنی یہ مجھے ملی ہے۔ وہ نہایت پاکیزہ اخلاق اور فرمانبردار ہے۔ وہ میرے آرام وسکون کا حد درجہ خیال رکھتی ہے۔ جب میں واپس گھر آؤنگا تو یقیناً مجھے اس کی یاد آئے گی۔ وہ مجھے اس قدر عزیز ہو گئی ہے کہ جب میں اس کے مسکراتے ہوئے چہرہ کو دیکھتا ہوں تو مجھ میں جوانی لہریں مارنے لگتی ہے۔ کاش اب سے چالیس پچاس سال قبل اس قسم کے حادثے نے میری زندگی بدل دی ہوتی میں بھی کیسا بیوقوف ہوں۔ وہ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔

اب مجھے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس لڑکی نے میرے دقیانوسی خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا ہے جو میرے دماغ میں مضبوطی سے جڑ پکڑ چکے تھے۔ اس کے طور و طریق سے وقار ٹپکتا ہے مجھے تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ وہ اونچی ذات کی ہے مگر بیچاری مفلسی کے ہاتھوں یہ کام کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

تمھارا ٹھاکر داس

---

۱۶ ستمبر

پیاری بہن!

تمھیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میری تدبیر کارگر ہو رہی ہے۔ بوڑھے چچا اب بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ ذرا سوچو تو وہ مجھے بڑے اشتیاق کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور حریصانہ انداز سے گفتگو کرتے ہیں میں مسکرا دیتی ہوں۔ اب کسی قسم کی جھڑکیاں نہیں دیتے لعن طعن رفت و گزشت ہو گئے ہیں۔ اب وہ میرے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور مجھے اپنے کمرے سے مشکل ہی سے جانے دیتے ہیں۔ شام کو وہ اپنی زبردست دولت کے بارے میں مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ حالات کی اس اچانک تبدیلی سے میرے شوہر کسی قدر پریشان ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چچا مجھ سے گہرا ارتباط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ خیر اس میں کوئی ہرج نہیں۔ ہم اس مذاق سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مگر میرے شوہر ہر چیز کو ظاہر کر دینے کے متمنی ہیں اور معذرت کے خواہاں ہیں لیکن میں نے ابھی ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ ذرا انتظار کریں۔

تمھاری بینا

---

۱۸ ستمبر

ڈیر تھورا!

تمھیں یہ خط قبل از وقت لکھ رہا ہوں۔ میں نے حسین تلی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم مجھ سے اس قسم کی بات سن کر نصیحت کرو گے کیونکہ میں ایک طویل عرصے تک شادی سے نفرت کرتا رہا ہوں اور تجرد کو پسند کیا ہے۔ بہرحال میں نے اس لڑکی سے شادی کرنے کے متعلق طے کر لیا ہے۔ جب تک تم لڑکی کو نہ دیکھ لو تم اس کا خیال تک نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے شادی کر کے میں اپنی زندگی سکون و مسرت کے ساتھ گزار سکوں گا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ جب تک کہ ہم ایک دوسرے سے منسلک نہ ہو جائیں خوشی کا وجود ہی نہیں رہے گا۔ کیا چالیس پچاس سال کی عمر کا فرق ایک انسان کی بہتر زندگی میں حائل ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچو تو کتنی معصوم لڑکیاں مفلسی کی شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں؟ کیا ہمارا فرض نہیں کہ ہم اس قسم کی ایک ہی زندگی کو بچا سکیں؟ کیا اس سے بڑھکر بھی کوئی اور چیز ہو سکتی ہے۔ مجھے کچھ قربانی کرنا چاہئے تاکہ میرے وہ گناہ جو جنس مخلوق کے ایک حصے سے نفرت کر کے سرزد ہوئے ہیں دُھل جائیں۔ خدا مجھے ایک اعلیٰ نظم قائم کرنے کی توفیق عطا کر رہا ہے تو اس سے کیوں محروم رہوں۔ میں ایسا کر کے رہونگا مجھے تم سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تم میرے پرانے دوست ہو اس لئے میں نے اپنے فیصلے سے تمھیں جلد مطلع کر دیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی عورتوں سے نفرت کرنے میں گذاری ہے اس لئے میں ان کے طور و طریق سے ناواقف ہوں۔ تمھیں عورتوں کا کافی تجربہ ہے اس لئے مجھے بتاؤ کہ کس طرح سب کچھ طے کرنا چاہئے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ صرف میری استدعا کا ہی انتظار کر رہی ہے۔

تمھارا مخلص۔ ٹھاکر داس

۲۰ ستمبر پیاری بہن!

یہاں حالات نے بڑی نزاکت اختیار کرلی ہے۔ میں بہت آگے بڑھ گئی ہوں میں نے بوڑھے کو نہ صرف پکڑ لیا ہے بلکہ یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے بے تجربگی میں اس کے اندر محبت کا جذبہ بھڑکا دیا ہے اور اس نے مجھ سے شادی کرنے کی تجویز کی ہے۔

ایسے معاملات میں وہ "ناتجربہ کار" ہے۔ کل رات ایک افسوسناک بات ہوگئی۔ جب ہم ایک ساتھ باتیں کر رہے تھے تب مجھے شبہ ہوا کہ وہ کچھ خاص بات کہنے والا ہے۔ وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور میرے بالکل قریب بیٹھ گیا۔

بوڑھے آدمی کا یہ انداز کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن میں کسی قدر مشوش ضرور تھی۔ سارا معاملہ آج نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ وہ نہایت فخر کے ساتھ اپنی دولت کے متعلق کہتا رہا اور پھر اچانک شادی کی تجویز پیش کردی۔ میں لرز گئی۔ اس کے پراشتیاق رویہ کی وجہ سے میں ہنستے ہنستے رہ گئی۔ اور میں نے جواب دیا کہ اس کا نباہ میری عزت کا باعث ہوگا۔ پھر بھی اس اہم مسئلے پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت چاہئے۔ اس نے مجھے سات روز کا وقت دیا۔ میں سخت پریشان ہوں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اس کا کیا جواب دونگی اگر انکار کیا تو اس گھر سے فوراً دفع ہوجانا پڑے گا۔ میں خیال نہیں کرسکتی کہ جب ہمارا راز کھل جائے گا تو کیا نتیجہ نکلے گا مجھ پر اس وقت مایوسی چھائی ہوئی ہے اور میری حالت قابل رحم ہے میں نے اس سے ابھی کچھ نہیں کہا ہے کہ ممکن ہے کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہوجائے۔

تمہاری مخلص، بینا

---

۲۳ ستمبر ڈیر ٹھاکر داس

ٹور سے واپس آنے پر مجھے تمہارے دو عجیب و غریب خط ملے مجھے اس وقت میں کچھ پریشان سا ہوں مگر اس نحوست کو گوارا نہیں کرسکتا میں تمہیں تباہ ہونے سے بچانے کی کوشش کرونگا۔ اسی خط جلدی میں لکھ رہا ہوں۔ تم نے پوچھا ہے "نقصان کیا ہے؟" میں کہتا ہوں اس میں سراسر نقصان ہے۔ یہ بالکل مہمل اور مضحکہ انگیز ہے۔ میری تم سے دوستانہ درخواست ہے کہ اس پاگل پن کو فوراً چھوڑ دو بڑھاپے اور حسن کی دلکشی نے شاید تمہیں یہ فراموش کرنے پر مجبور کردیا ہے کہ تمہاری شادی کی عمر کو پچاس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے مجھے یقین ہے کہ تمہارا سر پھر گیا ہے کیونکہ اس عمر میں شادی کا خیال ایک دیوانہ ہی کرسکتا ہے۔

تمہارا مخلص۔ متھرا چند داس

---

۲۴ ستمبر ڈیر متھرا!

مجھے تمہاری چٹھی سے اتفاق نہیں۔ میرا سر تو سلامت ہے تمہارا ہی دماغ چل گیا ہے۔ تمہارے خط کے آنے سے قبل ہی میں نے اس کے سامنے شادی کی تجویز پیش کردی اور وہ اس پر راضی بھی ہوگئی۔ اس اچانک تجویز سے وہ متعجب تو ہوئی۔ مگر اس نے اس پر غور کرنے کے لئے وقت مانگا ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ ہی اس کی رضامندی کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور غور و خوض کے لئے وقت مانگنا صرف ایک بہانہ ہے۔ میں نے تم سے متعدد بار سنا ہے کہ عورتیں انتہا سے کہیں زیادہ خاموشی سے کام لیتی ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ شان و وقار کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تم اس کو ایک قسم کا جنون سمجھے مگر تمہیں اپنی غلط فہمی کا جلد ہی احساس ہوجائے گا۔ تمہاری مبارکباد کا منتظر ہوں۔

تمہارا مخلص۔ ٹھاکر داس

---

۲۴ ستمبر اچھی بہن!

یہاں اب صورت حال انتہائی تشویشناک ہوگئی ہے بوڑھے چچا یہ علم خود سمجھ رہے ہیں کہ میں راضی ہوگئی ہوں۔ جب بھی میں ان کے کمرہ میں داخل ہوتی ہوں وہ محبت ہی کے متعلق بات چیت کرتا ہے۔ وہ عجیب طریقے سے اپنے جذبۂ محبت کا مجھے شکار بنا رہا ہے میں اور میرا شوہر دونوں حیران ہیں کہ اس سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔ اگر تم آڑے وقت میں اپنی ذہانت سے کام لے کر کوئی مشورہ دوگی تو میں بیحد ممنون ہونگی۔

ہمیشہ تمہاری بینا

---

۲۶ ستمبر ڈیر ٹھاکر داس!

اب معلوم ہوتا ہے کہ واقعی تم پاگل ہوگئے ہو۔ اور تمہارے ہوش و حواس جاتے رہے ہیں! بندہ خدا! یہ تو خیال کرو کہ تم اپنی پوتی کے برابر کمسن لڑکی سے شادی کرنے کی کس طرح جرأت کر رہے ہو۔ تم اپنے بڑھاپے کو کیوں بھول گئے ہو۔ جو لڑکی تمہاری تجویز

سے متفق ہو رہی ہے۔ اس کی نظر تمھاری دولت ہے۔ مجھے اس میں سراسر نقصان نظر آ رہا ہے کہ تم جیسا سن رسیدہ آدمی ایک دلکش چہرہ سے اس قدر مسحور ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ذرا اپنی زندگی کی ایک ہلکی سی تصویر تو کھینچو —— ایسی زندگی جس میں ایک عورت تم کو اپنے چشم و ابرو کے اشارے پر چلائے گی۔ تم دوستوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔ عشق پیری کے ایک مثالی نمونہ کے طور پر سوسائٹی تمھاری طرف انگلیاں اٹھائے گی اور تم نسوانی سحرکاری کے خطروں میں اس طرح الجھ جاؤ گے کہ لوگ تم سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرینگے۔ ایک ایسا خیال جس کی تمام عمر تلقین کرتے رہے ہو تمھارے لئے وبال جان بن جائے گا!

تم نے ان سب باتوں پر غور کر لیا ہے؟ یا حسن کی خاطر تم نے ہر نیک و بد سے آنکھیں بند کر لی ہیں؟ میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اس خیال خام کو چھوڑ دو اور لوگوں کو اپنے پر ہنسنے کا موقع نہ دو

تمھارا پرانا دوست متھورا۔

---

۲۹ ستمبر   ڈیر متھورا!

تمھارے آخری خط سے میں واقعی چونک پڑا۔ سچ مچ میں کھو گیا تھا جس کو سٹھیا پن ہی کہا جا سکتا ہے۔ میں اس لڑکی کی شریفانہ خدمات سے اس قدر متاثر ہوا کہ مجھے اس کی فلاح و بہبودی کے خیال کے سوا اور کچھ سجھائی ہی نہیں دیا۔ میرا اصل خیال صرف یہ تھا کہ میں اس قسم کی مفلس لڑکیوں کو کیونکر بچا سکتا ہوں۔ جب سے میں نے اس کے سامنے اپنی تجویز رکھی ہے اس کے طور و طریق میں بڑا فرق آگیا ہے۔ وہ اب ہر لحاظ سے اپنے فرائض سے تغافل برت رہی ہے اور جہاں تک ہو سکتا ہے وہ مجھ سے الگ رہنے کی کوشش کرتی ہے ہو سکتا ہے کہ اس نے میری دولت کی خاطر اظہار رضامندی کیا ہو جیسا کہ تمھارا شبہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے کوئی بہتر پناہ کی جگہ تلاش کرنے کے لئے وقت مانگا ہو۔ کیونکہ اسے انکار کی صورت میں یہاں سے علیحدگی کا خدشہ ہو سکتا ہے۔

بہرکیف اب معاملات کی اصلاح مشکل ہے۔ میں حد سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ میں نے جوہری کو زیورات کا آرڈر دیدیا ہے اور دعوت نامے بھی بھیج دیئے ہیں۔ اب اگر بات بگڑ گئی اور لڑکی تمھارے خیالات کے مطابق خطرناک قسم کی ہوئی جس کا مجھے شبہ ہے تو وہ مجھے بدنام کرنے کے لئے کیا کچھ نہ کر گذرے گی۔ جس سے میری ساری آبرو خاک میں مل جانے کا اندیشہ ہے۔ تم میرے پرانے اور مخلص دوست ہو۔ اس کشمکش کے وقت مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟ جس طرح بھی ہو سکے مجھے اس خطرہ سے بچاؤ۔

تمھارا۔ ٹھاکرداس

---

۲ اکتوبر   مائی ڈیر ٹھاکرداس!

مجھے تمھارا خط پڑھکر بڑا اطمینان ہوا۔ مجھے خدا کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ اس نے تمھیں پھر عقل عطا کی۔ بیشک معاملات نے بہت طول کھینچا ہے۔ پھر بھی یہ بدنامی کا خدشہ دور کیا جا سکتا ہے۔ میں اعلیٰ اور پست دونوں قسم کی عورتوں سے ملا ہوں۔ اور مجھے یہ تجربہ ہوا ہے کہ اگر وہ پست خیال ہے تو روپیہ اسے خرید سکتا ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا اور تم اسے اپنی سرپرستی میں لینا چاہتے ہو تا کہ اسے افلاس سے چھٹکارا مل جائے اور وہ حقیقتہً اسے پسند کرے تو پھر تمھاری بھلائی کی نہایت آسان ترکیب ہے۔ تم اس کی تحقیق کرو اور اگر وہ صحیح قسم کی عورت ہے تو تمام معاملہ طے ہو جائے گا۔ اپنے ساتھ نہیں بلکہ اپنے بھتیجے کے ساتھ اس کی شادی کر دو۔ تمھارے تمام دوست اور رشتہ دار تمھاری جگہ تمھارے بھتیجے کو دولہا دیکھ کر اس مذاق کو بہت سراہیں گے اور وہ اس تفریح سے خوب لطف اندوز ہونگے۔ اور مجھے امید ہے کہ تمھارے بھتیجے کو تمام واقعات اور اپنے مستقبل کے پیش نظر اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

ہمیشہ تمھارا۔ متھورا چند داس

---

۱۵ اکتوبر   میری پیاری بہن!

یہاں ایک عجیب پرلطف حادثہ پیش آیا ہے۔ چچا کچھ معاوضہ دیکر اپنی تجویز کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ کل جب میں کمرہ صاف کر رہی تھی میرے شوہر چپکے سے اندر داخل ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ چچا سو رہے ہیں مجھے اپنی آغوش میں لیکر پیار کرنے لگے۔ اچانک ہمیں خیال ہوا کہ بوڑھا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ میرے شوہر تو جلدی سے بھاگ گئے اور میں شرم کے مارے ڈھیری ہو گئی۔ وہ مجھے مجوب دیکھ کر کہنے لگا کہ کچھ تحفے کر میں اس کو تجویز شادی سے آزاد کر دوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کس طرح یہ طے کیا کوئی عجب نہیں کہ اس نے مجھے "فاحشہ" عورت سمجھا ہو۔

کیونکہ اس نے مجھے اپنے بھتیجے کے ساتھ کچھ ایسی ہی حالت میں دیکھا تھا۔ اگر وہ مجھ سے چھٹکارا چاہتا ہے تو یہ فطری بات ہے۔

بہرحال ابھی تک وہ راز راز ہی ہے کہ ہم خفیہ طور پر شادی کر چکے ہیں۔ اس نے مجھے ہدایت کی ہے کہ جیسے ہی میرا بھتیجا آئے اسے میرے پاس بھیج دیا جائے۔ یقیناً وہ مجھے اپنے شوہر کی بدکار عورت خیال کرے گا۔ اُف کس قدر شرمناک بات ہے۔ دیکھو اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

تمہاری بینا

مائی ڈیر پارس!

لو تمہیں ایک مژدہ سنا رہا ہوں۔ میں نے ایک بڑی تصویر فروخت کر دی تھی اور بینا کو یہ خبر سنانے کے لئے تیزی سے گھر پہنچا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چچا کا کمرہ صاف کر رہی ہے۔ وہ مجھے کچھ اس قدر حسین نظر آئی کہ میں اسے اپنی آغوش میں لئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے بیتابی کے عالم میں اس کے یاقوتی ہونٹوں پر کئی بوسے ثبت کر دیئے۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا۔ میں نے چچا کو محوِ خواب سمجھ لیا تھا۔ لیکن چچا کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں یکدم وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور سب کچھ بینا کو چھوڑ گیا۔ جب واپس آیا تو مجھے جراثیمی خطرے کے متعلق ایک لیکچر دیا گیا۔ چچا نے کہا: "یہ ادنیٰ طریقہ ہے۔ تمہارے سوا اب اس لڑکی کا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں اس سے شادی کرنا پڑے گی۔ اس کے سوا تم اپنے گناہ کا کفارہ کسی اور طرح ادا نہیں کر سکتے"۔

آہ میری تصویریں، میری شادی بینا کے ساتھ اب دوبارہ ہوگی اور وہ بھی چچا کے شیخ سے۔ کیا بات ہے؟ مگر میری جان جہاں چچا پر مزید بار ڈالنا پسند نہیں کریگی۔ کیونکہ اب اسے چچا سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم نے طے کر لیا کہ بلا کم و کاست تمام باتیں بیان کر دیں خواہ کچھ بھی ہو کیونکہ ہم پہلے ہی سے شادی شدہ ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا انہیں اس سے پہلے بھی شبہ تھا اگر وہ خبر سن کر بہت خوش ہوا کہ میں نے صحیح انتخاب کیا ہے۔ دوست! اب تمام مصائب کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ہمارا ماہانہ گزارا دوگنا کر دیا گیا ہے اور بینا کو جہیز کے طور پر بہت سے زیورات مل گئے۔ وہ بظاہر تیار نہیں ہوئے تھے۔ صرف دولہا ہی کی تبدیلی ہوئی ہے۔

ہمیشہ تمہارا گنیش۔

(ترجمہ)



عورت کے بدن میں زہر ہوتا ہے

یہ زہر بڑا خطرناک ہے بعض اوقات اس کا اثر خود عورت پر ہو جاتا ہے۔ یہ زہر عورت کے بدن میں بڑی تیزی سے
ا رہتا ہے اور ہر مہینہ خارج ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ زہر عورت کے اندرونی جسم میں سے خارج نہ ہو یعنی عورت کو
واری ایام پوری طرح بغیر تکلیف کے نہ ہوں تو سمجھ لیجئے کہ یہ زہر عورت کے بدن میں پھیل رہا ہے۔

جو عورتیں ماہواری کی بیمار ہیں

یعنی کسی عورت کو ماہواری خون کم جاتا ہو یا رک رک کر جاتا ہو یا درد سے جاتا ہو یا زیادہ جانے لگے یا ماہواری کے
ں میں دورے پڑنے لگیں یا ماہواری کی اور کوئی خرابی ہو جائے تو سمجھ لیجئے۔ کہ یہ زہر عورت کے تمام جسم میں پھیل
ہے اور کسی نہ کسی وقت نہایت خطرناک صورت پیدا کرے گا۔

اپنی عورتوں کو بچاؤ

ماہواری کی کمی بیشی یا اس زمانہ کا درد یقیناً عورت کے لئے بڑی تباہ کن چیز ہے۔ اس کا نتیجہ بڑا خطرناک ہوتا
ہے۔ عورت کو مختلف نسوانی امراض میں پھانس کر اس کی جوانی کو تباہ کر۔ ۔ ۔ ۔ ہر جبدار مرد کا پہلا فرض
ہے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کو اس خطرناک مرض سے بچائے۔

بہت آسان علاج

ماہواری کی ہر خرابی یعنی خون کم آنا زیادہ آنا یا رک رک کر آنا یا اس زمانہ میں سخت درد ہو کر خون آنا ان سب تکلیفوں کو
یک کرنے کے لئے بہت آسان علاج یہ ہے کہ ایسی بیمار عورت کو صرف ایک شیشی دوا کورس کھلا دینی چاہیئے
ر ہر مہینہ بغیر تکلیف اور درد کے ٹھیک مقدار میں ماہواری آنے لگتی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

ے پتہ پر خط لکھ کر دوا کورس کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے۔ ایک شیشی کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے
ل پر صرف سات آنے محصول لگے گا۔ اس طرح بہت معمولی خرچ میں عورت ماہواری کی تمام خرابیوں سے تندرست
ر ہر مہینہ بغیر کسی تکلیف کے ماہواری سے فارغ ہو جایا کریگی۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶

جب میں کنواری تھی

(ایک نوجوان لڑکی کے قلم سے)

بے شک وہ دلفریب زمانہ تھا جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی مجھے کوئی غم نہ تھا۔ اور میرے دل میں وہ تمام باتیں تھیں۔ جو ایک نوجوان لڑکی میں ہوتی ہیں۔ وہ خوبصورت تمنائیں وہ حسین اور پرلطف خواہشیں۔ میری سہیلیاں کہا کرتی تھیں۔ "تو کتنی حسین ہے" یہ سن کر میرے دل میں نہ جلنے کیا ہونے لگتا تھا۔ اور جب میں آئینہ دیکھتی تھی تو دل میں گدگدیاں سی ہوتی تھیں۔ وہ گورا گورا رنگ وہ چہرہ کی ملاحت چکنی جلد۔ مجھے خود شبہ ہونے لگتا تھا کہ میری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ اور میرے خال و پر سرخی بھی ہے۔ قدرتی سرخی جو تقدیر سے ہی کسی کو میسر آتی ہے۔ کبھی کبھی میرا چنچل دل کہتا تھا تو بڑی سندر ہے۔ تجھے ...... ایسا ہی ملنا چاہیئے جیسی تو ہے۔

تقدیر نے یہاں بھی ساتھ دیا۔ وہ بھی بے شک حسین ہیں۔ بڑی موہنی صورت والے۔ کون ہوگی جو انہیں دیکھکر آپے میں رہ جائے۔ سچ مچ میں بڑی تقدیر والی تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے۔ اچھی جوڑی ہے۔

مگر واہ رے تقدیر زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میرا شباب۔ میری جوانی میرے چہرے کی جاذبیت اور دلکشی سب کچھ ایسے ڈھلنے لگے جیسے دھوپ کی تیزی سے گلاب کے پھول کی نازک پتیاں مرجھانے لگتی ہیں۔ وہ حسن جسے میری سہیلیاں رشک سے دیکھا کرتی تھیں۔ کچھ ایسے مدھم پڑنے لگا جیسے چاند کو گرہن لگنا شروع ہو جائے۔ اور پتہ نہیں ایسا کیوں ہونے لگا۔ میری عمر پورے اٹھارہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ میرا سب کچھ چھن گیا۔ آئینہ میں صورت دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی ۳۵ برس کی عورت۔ اسی حال میں سال بیت گئے۔ وہ بھی کچھ روٹھے روٹھے سے رہنے لگے۔ میری دنیا میں سناٹا سا چھانے لگا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے میرا کوئی ہے ہی نہیں۔ سارا عالم مجھ سے منہ پھیرے لیتا ہے۔

انہی دنوں میری ایک رشتہ دار عورت نے کچھ محسوس کیا میری حالت کو سمجھا۔ مجھ سے پوچھا۔ اور میں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ وہ سب باتیں سن کر بولیں۔ ٹھیک تو ہے۔ تمہارا اس سے بھی بدتر حال ہو جانا چاہیئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ مجھے لیکوریا کی بیماری ہوگئی تھی۔ اور وقت بے وقت یہ بدن سے پانی گرنے لگا تھا جس کی وجہ سے میری کمر اور پنڈلیوں میں اور پیٹ میں درد رہنے لگا تھا۔ اور یہ تکلیف "مہینہ" آنے پر اور زیادہ ہو جاتی تھی۔ مگر میں نے اس کو بیماری ہی نہ سمجھا۔ علاج کیا خاک کرتی۔ خود ان سے بھی اس کا تذکرہ نہ کیا۔ میری یہ رشتہ دار عورت بڑی تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہیں۔ انہوں نے فوراً ہی

۳۴

لیڈی ڈاکٹرز نانہ دواخانہ ۱۔ بی دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر دوا روک کی ایک شیشی منگا کر مجھے دی۔ میں نے یہ دوا استعمال کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ پانی جو روز جایا کرتا تھا۔ تیسرے دن آنا بند ہوگیا اور پوری شیشی دوا روک استعمال کرنے سے میری صحت ویسی ہی ہوگئی اور رفتہ رفتہ میرے چہرے پر پھر وہی جوانی چھا گئی جس کے لئے میری سہیلیاں رشک کرتی تھیں۔ اب مجھے پتہ چلا کہ لیکوریا یعنی سیلان الرحم کی بیماری عورت کے لئے تباہ کن ہے۔ میری رشتہ دار عورت کہتی ہیں کہ لیکوریا کی بیماری کا بہترین علاج یہ ہے کہ ایسی عورت ایک شیشی دوا "**روک**" استعمال کرے۔ اس کے بعد پانی گرنا بند ہو جاتا ہے۔ اور عورت تندرست ہو جاتی ہے۔ ہزاروں جگہ اس دوا کا تجربہ ہوا ہے اور ہر جگہ مریضہ کو اس دوا نے تندرست کر دیا۔ اس لئے جو عورتیں سفید پانی کی بیماری میں مبتلا ہوں انہیں پتہ بالا سے دوا روک منگا کر استعمال کر لینی چاہیئے۔ ایک شیشی دوا روک کی قیمت تین روپے ہے۔ بذریعہ وی پی پارسل منگا لینی چاہیئے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگتا ہے ہر عمر کی لڑکی یا عورت کے لئے یہ دوا یکساں مفید ہوتی ہے۔

ٹیلیفون نمبر ۳۲۹

حقائق

آدمی تھوڑے ہیں شیطان بہت

از علامہ امجد حیدرآبادی

نہ کرو جینے کے ارمان بہت   کہ ہیں اس نفع میں نقصان بہت
ہم نے دنیا میں جہاں تک دیکھا   آدمی تھوڑے ہیں شیطان بہت
گر پڑھا ہو تو قسم لے لیجے!   گھر میں رکھے تو ہیں قرآن بہت
ماحصل سب کا ہے تسلیم و رضا   گرچہ مذہب میں ہیں ارکان بہت
تم بھی اے حضرتِ امجد لے لو
آج کل بکتے ہیں ایمان بہت

لایؤمن احدکم حتّٰی یحبّ لاخیہ ما یحبّ لنفسہ

رُباعی

ایمانِ حقیقی کا پتہ بھی نہ ملا   دل اپنا کسی دل سے ذرا بھی نہ ملا
سنتے ہیں کہ لوگوں کو خدا ملتا ہے   ہم کو کوئی بندۂ خدا بھی نہ ملا

توبہ توبہ بھول گئی

مرہٹی زبان سے ترجمہ

از جناب غلام محمد ناظر انصاری

سچ پوچھئے تو دنیا کو کسی کی خوبیوں کی پرواہی نہیں ہے - وہ صرف ظاہری نمائش کو دیکھتی ہے - جس کسی سے بیزار رکھتی ہے بس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے - یہ دنیا ہے دنیا، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ مسٹر جیمس سیمور جیسے ہوشیار ذہین، ماہر برقیات کو گذشتہ دو مہینے میز پر پیر پھیلائے بیٹھے بیٹھے گذارنے پڑیں - یا اپنی ناظمہ ڈورا کی تصویریں کھینچنے کے سوا کوئی دوسرا اشغلہ نہ رہے -

ڈور کیوں جایئے! آج پیر کا دن اور دوپہر کا وقت کام کی مصروفیت میں کٹنا چاہئے - لیکن مسٹر سیمور ایک علیحدہ کمرے میں ڈورا کی تصویر کھینچنے میں غرق ہیں جو چاء تیار کر رہی ہے ملاقات کے لئے کسی کے آنے کا خوف! توبہ!! ——— اس کی امید ہی نہ تھی -

"کیا چائے؟ ہاں لے آؤ" جیمس نے ڈورا کی طرف دیکھتے ہوئے جو چاء کی کشتی لا رہی تھی کہا -

"اور بسکٹ؟"

"اوہو! بھول گئی" ڈورا نے شرمندگی سے جواب دیا - "میں جانتی ہوں کہ میری اس فراموش کاری سے آپ کو بڑی کوفت ہوتی ہے - تاہم میں اپنی طرف سے حتی الامکان کوشش کرتی ہوں لیکن کیا کیا جائے حافظہ ہی بیکار ہوا جا رہا ہے"

"چھوڑو بھی ڈورا اس قصے کو! میں تو اس زندگی ہی سے بیزار ہو چکا ہوں"

"آپ کی فرمائشوں کو میں اکثر فراموش کر دیتی ہوں اسی لئے تا ؟ آئندہ میں کوشش کرونگی ...."

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں - دو تین مہینے بیکاری میں گزر گئے کام بند پڑا ہے - معاش کی فکر ہے - اور اب ——— اور اب بھی کوئی امید نظر نہیں آتی"

"یعنی ——— ؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ "ماہر برقیات" کے خطاب سے زندگی کی منزل طے نہ ہوگی - پبلک کو شاید اب مجھ سے ماہرین کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی - اور بار بار کمبخت وہ بھی کرایہ کا تقاضا کر رہا ہے - اگر جلد کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس مکان پر کرایہ کا اشتہار نظر آئیگا نہ روزگار میسر ہے نہ پیسہ!"

اس تقریر سے ڈورا بہت متاثر ہوئی اس کے دل میں جیمس سے ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی - "میری موجودہ تنخواہ میں اگر قدرے تخفیف ہو جائے تو مجھے منظور ہے میرا گذارا ہو جائیگا"

"تمھارا گذارا تو یقیناً ہو جائیگا لیکن میں قرض کس طرح ادا کرونگا؟ اور اس تخفیف سے شاید ایک ہفتہ کا کرایہ ادا ہو سکے - اوں ہوں، اب امید کی ایک ہی کرن نظر آ رہی ہے" اس کے تخیل نے کہیں دور سکھ - شانتی اور عیش کی رنگین محفل سجائی جس سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں - سگار کو وہ اپنے انگوٹھے کے ناخن پر جھٹکتے ہوئے کہنے لگا -

"اگر انکل وڈ نے میری نئی مشین خرید لی تو ....."

"وہی ویکیوم کلینر گزٹ؟" ڈورا نے پوچھا -

جیمس نے اثبات میں سر ہلایا -

"اگر وہ گزٹ خرید لے تو مجھے امید ہے کہ ہم دونوں کے لئے نفع رسانی کی بہترین صورت پیدا ہو جائیگی - لیکن افسوس اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا - اس کے خط کا جواب دیئے عرصہ ہو چکا مگر اس نے کوئی اطلاع نہ دی - دوبارہ خط لکھیں یا فون کریں مگر اس بوڑھے کے بگڑ جانے کا خوف ہے؟"

"یا اللہ! میں بھول گئی" ڈورا نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا - "آج صبح انکل وڈ نے آپ کو فون کیا تھا - آپ کہیں باہر گئے تھے"

"کیا کہا انھوں نے؟" جیمس نے کھڑے ہو کر پوچھا -

"وہ خود نہ تھے، ان کی ناظمہ تھی"

"اچھا کیا کہا اس نے؟"

"ہاں یہی کہ آپ دوبارہ انگل وڈ کو فون کریں۔"
"تو بیوقوف! تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہدیا۔"
ہونٹ دانتوں میں دبا کر ڈورا نے کہا۔ "بھول گئی۔ بھول گئی میں ——"

"تمھاری اس حرکت سے مجھے بڑا رنج ہوتا ہے۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو۔" یہ کہہ کر جیمس نے انگل وڈ کو فون کرنے کے لئے نمبر گھمایا۔

"ہیلو، ہیلو، کیا مسٹر انگل وڈ ہیں؟ —— نہیں! تو کیا آپ ہیں ان کی ناظمہ؟ میں ہوں سیمور!"

"کون؟ سیمور! ہیلو تم اپنے نئے گزٹ کے متعلق ہی کہنا چاہتے ہونا؟"

"جی! جی!" جیمس نے اضطراری طور پر جواب دیا۔ "مسٹر انگل وڈ نے مجھے دوبارہ فون کرنے کی اطلاع دی تھی۔"

"درست! لیکن فون صبح ہی ہونا چاہئے تھا۔"

"صبح ——!"

"ہاں یہی تاکید تھی۔ اب مسٹر انگل وڈ اپنے دولتخانے پر تشریف لے گئے۔ جاتے وقت وہ مجھ سے کہہ گئے کہ تم نے وقت پر فون نہیں کیا۔ اس لئے اب مجھے تمھارے گزٹ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"لیکن اگر میں انھیں کل صبح فون کردوں تو ......"

"کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ مسٹر انگل وڈ بذات خود وقت کے بیحد پابند ہیں۔ اور غیروں سے بھی یہی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ بڑے با اصول آدمی ہیں۔ تم نے ان کے خط کا جواب بھی نہ دیا اس لئے وہ تم سے بہت ناراض ہیں۔"

"خط کا جواب تو میں عرصہ ہوا دے چکا۔"

"ہمیں تمھارا خط نہیں ملا۔ آج صبح تمھارے لئے آخری موقع تھا۔"

"افسوس! افسوس! کیا اب کوئی امکانی صورت نہیں نکل سکتی؟"

"کوئی نہیں۔"

"اچھا شکریہ!" یہ کہہ کر جیمس نے فون ہاتھ سے رکھ دیا۔

"کیوں خیریت تو ہے۔ کیا کہا انگل وڈ نے؟" ڈورا نے غمگین لہجہ نا امید لہجے میں پوچھا۔

اب جیمس کی قوت برداشت ختم ہوگئی۔ اس قدر اہم موقع ہاتھ سے نکل ہی چکا تھا۔ اس لئے وہ دلگیر ہوگیا۔ وہی ڈورا جو عرصہ دراز سے اس کی محبوب ناظمہ تھی اب ایک احمق ملازم سے بدتر معلوم ہونے لگی۔

"سب کچھ ٹھیک ہے۔" جیمس نے کرخت اور دلشکن لہجے میں چلا کر کہا۔ "میں نے تمھیں تاکید کردی تھی کہ انگل وڈ کو فون کردیا جائے۔"

"معاف کیجئے گا! میں ...... میں ......"

"لیکن یہ کیا تماشہ ہے؟ میں نے انگل وڈ کے نام ایک خط لکھ کر تمھیں دیا تھا کہ فوراً ڈاک میں ڈال آؤ۔ وہ انھیں ملا ہی نہیں۔"

"ہاں ... ہاں ... جی۔ میں سمجھتی ہوں۔ میں وہ ....."

"سمجھا، تم وہ خط ڈاک میں ڈالنا بھول گئیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ اب وہ بوڑھا چڑا ہے اور میری طرف متوجہ ہونا نہیں چاہتا۔"

جیمس بے انتہا اکتا گیا تھا۔

"یہ سب میرا قصور ہے۔" ڈورا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"درست! بالکل درست!"

"تو کیا آپ مجھے ملازمت سے علیحدہ کردینگے؟" اس نے غمگین صورت بنا کر کہا۔ جیمس نے نظر اوپر اٹھائی۔ اس نے سوچا کہ اسے ایک مرتبہ اور موقع دینا چاہیئے۔

"میں تمھیں ایک مرتبہ اور معاف کرتا ہوں۔ اور آخری مرتبہ ایک اور موقع دیتا ہوں۔ آئندہ اگر تم نے اس فراموش کاری سے کام لیا تو دوسری ملازمت تلاش کرنی ہوگی۔"

جیمس نے یہ سب کچھ کہہ تو دیا —— لیکن اسے خود اپنے کاروبار کی فکر تھی۔

۲

دوسری صبح جیمس کے تفکرات میں اور اضافہ ہوگیا۔ ڈورا بھی بیحد متفکر اور ملول نظر آرہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر پارکر (مالک مکان) اندر آئے۔

"گڈ مارننگ سیمور!"

"گڈ مارننگ!" جیمس نے جواب دیا۔

ایک میلے رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پارکر نے کہا۔ "آج بڑا حبس ہے۔"

"جی ہاں —— فرمائیے!" جیمس نے پوچھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پارکر کو سورج کی تپش سے نہیں بلکہ رکے ہوئے کرایہ کے باعث حبس ہو رہا تھا۔

"میں کرایہ کے متعلق کہنے آیا ہوں۔"

"جی ہاں —— دیکھئے [illegible] وقت [illegible]"

آپ کچھ دن اور مہلت دیں تو۔۔۔۔۔ "

"توبہ توبہ! اب اور کتنی مہلت چاہیئے نہ۔۔۔۔ نہ۔۔۔۔"

"آپ کے روپے ڈوبیں گے نہیں۔ مجھے تھوڑی سی مہلت اور درکار ہے۔"

"ہاں مجھے یقین ہے تم روپے ادا کردو گے۔ لیکن۔۔۔" اپنے چوڑے چکلے کندھوں کو حرکت دیتے ہوئے بارکر نے کہا۔ "لین دین کے معنی کیا ہیں؟ لین دین ہی تو ہیں نا؟ تمھاری اس نئی ایجاد کا کیا حشر ہوا؟ کیا وہ فروخت کردی گئی؟"

"جی نہیں، کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن چند سے اور مہلت دیجئے۔"

"بھئی میں بھی تو عیالدار آدمی ہوں۔ مجھے بھی تو اوروں کو دینا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میں تمھارے قرضخواہوں کا قرض تمھارے روپیوں کے بغیر کیسے ادا کرسکتا ہوں؟"

"جی! بجا ہے!"

"شاباش! کیا بات کہی ہے؟ دیکھو میں تمھیں ایک تدبیر بتاؤں۔ تمھاری وہ ایجاد کیا چیز ہے۔ وہ مجھے کوئی اہم اور خاص چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن ہمارا۔۔۔۔۔۔ اچھا جانے دو۔ ہاں دیکھو! میں تمھاری اس ایجاد کے عوض دوسو پونڈ دینا چاہتا ہوں۔ کیا رائے ہے تمھاری؟"

"کیا صرف دوسو پونڈ؟ یعنی بمنزلہ صفر! تو آپ نے اس کی کیا قدر کی ——؟"

"اچھا، یہ اگر منظور نہیں تو سنو۔ تمھاری طرف جتنا کرایہ واجب الادا ہے وہ سب معاف کئے دیتا ہوں۔ علاوہ ازیں دوسو پونڈ اور دیتا ہوں۔ کیوں منظور ہے تمھیں؟ مجھے اسی وقت جواب نہیں چاہیئے۔ غور و فکر کے بعد جواب دو۔ آج دوپہر کو خط روانہ کردو۔ وہ مجھے شام کو مل جائے گا۔ اور کل صبح میں تمھیں چیک روانہ کردونگا۔ اگر تمھارا خط نہ آیا تو تم جانتے ہی ہو کیا ہوگا ——؟ گڈ مارننگ!"

بارکر چلا گیا۔ جیمس بڑی دیر تک زندگی کے نشیب و فراز پر غور کرتا رہا۔ جلد سے جلد کسی فیصلے پر پہنچنا اس کے لئے اشد ضروری تھا۔ وہ کوئی طویل بحث لگانا نہ چاہتا تھا۔ لیکن دوسو پونڈ اسے نسبتاً بہت کم معلوم ہو رہے تھے اور ایڈگل وڈ کی طرف سے امید کی ایک شعاع بھی باقی نہ تھی۔

بالآخر وہ ایک قطعی فیصلہ پر پہنچا۔ یہ طے کرکے کہ کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔ دوسو پونڈ پر اکتفا کرکے اس نے خط کی ابتدا کی۔ خط مکمل طور پر لکھنے کے بعد اس نے لفافہ بند کیا اور مہر لگا کر ٹکٹ ڈھونڈنے لگا۔ لیکن تلاش بسیار کے باوجود ٹکٹ نہ ملا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ڈورا کہیں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اس نے پوچھا "کہاں؟ لنچ کے لئے جا رہی ہو نا؟"

"جی، اگر آپ کا ہرج نہ ہو" ڈورا نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں، جب چاہو جا سکتی ہو۔"

"واپسی پر مجھے تاخیر ہو گی۔ آپ کا کوئی ہرج تو نہ ہوگا۔ مجھے ایک جگہ ضرور جانا ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں، بےفکر جاؤ۔ اب یہاں کوئی کام نہیں میں بھی لنچ کے لئے جا رہا ہوں۔ ہاں اس لفافہ پر ٹکٹ چسپاں کرکے لیٹربکس میں ڈال دینا۔ بھولنا نہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"جی نہیں ایکی مرتبہ نہ بھولوں گی۔ ضرور ڈال دونگی۔"

"اچھا ڈورا" جیمس رکا "کل میں نے تمھیں بڑی دلخراش باتیں سنائیں مجھے معاف کردو ڈورا!"

"توبہ توبہ! وہ بہت بجا اور مناسب گفتگو تھی۔ اب میں اس کی تلافی کردوں گی" ڈورا نے کہا۔

"کس طرح؟ یہ خط بروقت ڈال کر ہی نا؟"

"جی اپنے طرز عمل سے بھی" ڈورا نے کہا۔

—— ۳ ——

جیمس ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں لنچ کے لئے ہمیشہ جاتا تھا۔ یہ جگہ اسے بیحد مرغوب تھی۔ آج بھی وہ حسب معمول اسی ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔ کھاتے کھاتے اسے قریب کے کمرے سے مسٹر بارکر کی آواز سنائی دی۔

"ایسے کم عمر چھوکروں کو بنانا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ آج ہی صبح کی ایک مثال لے لو۔ یہاں ایک ماہر برقیات ہے جس نے ہنوز عمر کی پچیسویں منزل بھی طے نہیں کی۔ میں نے اس کی ایک ایجاد صرف دوسو پونڈ میں اڑائی ہے۔ وہی چیز میں کم سے کم ایک ہزار پونڈ میں فروخت کردونگا۔ ہیں نا یاروں کے پو بارہ۔ شام کو اس کا خط آئیگا۔ ہر ماہ اسی طرح ایک شکار پھنس جائے تو بس کافی ہے۔"

جیمس کے پردۂ سماعت میں جیسے کوئی گھونسہ مار رہا تھا۔ اس سے یہ گفتگو سنی نہ جاتی تھی۔ تاہم اسے برداشت کرنا پڑی

اُسے پارکر پر بڑا غصہ آیا۔ وہ بے انتہا غضبناک ہوا۔ لیکن اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ کیونکہ وہ اقرار نامہ پر دستخط کر کے روانہ کر چکا تھا۔

"کیا لفافہ جا چکا ہوگا ۔۔ یا ڈورا پھر بھول گئی ہوگی؟ ۔۔ نہیں نہیں اب وہ نہیں بھول سکتی۔ اب اس کی فراموش کاری ناممکن! کل میں نے اسے کس قدر سخت سست کہا تھا؟ لیکن کوشش، کوشش تو کر کے دیکھوں!"

وہ براہ راست اپنے دفتر پہنچا۔ لیکن ڈورا وہاں موجود نہ تھی۔ وہ مایوس ہو گیا۔ اتنے میں اس کا ایک بیحد باتونی دوست مل گیا۔ پانچ بجے تک اس سے گفتگو کرتا رہا۔ دوست کے رخصت ہونے پر وہ اٹھا اور گھر جانا ہی چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ جیمس نے آلہ سماعت اٹھایا۔

"ہیلو! کون ہے؟ میں ہوں سیمور۔"

"ہیلو، گڈ آفٹر نون مسٹر سیمور، میں ہوں انگل وڈ۔"

"گڈ آفٹر نون مسٹر انگل وڈ۔"

"دیکھو سیمور!" مسٹر انگل وڈ نے ابتدا کی۔ ان کی پرزور لیکن محبت آمیز آواز اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ وہ سننے لگا۔ "دیکھو بیٹا تمھارا مقدر روشن نظر آ رہا ہے۔ میں نے تمھارے لئے بڑے فائدے کی بات سوچی ہے۔ میں نے اپنی رائے تبدیل کر لی ہے اور تمھارا گزٹ خریدنے کو تیار ہوں۔"

جیمس نے جواب دیا۔ "میں آپ کا شکر گذار ہوں۔"

"میرا شکریہ ادا نہ کرو اپنی ناظمہ کا شکریہ ادا کرو۔"

"کیا مطلب؟"

"ابھی ابھی چند ساعت پیشتر تمھاری ناظمہ ڈورا یہاں آ کر گئی۔ اس نے مجھے پوری حقیقت سنائی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اور یہ گذارش کی کہ تمھیں ایک اور موقع دیا جائے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ لیکن تجارت اور کاروبار کے بالکل ناقابل۔ اس طرف اس کے ذہن کی رسائی ہی نہیں۔ خیر ہاں دیکھو میں تمھاری اس ایجاد کو خریدنے کے لئے تیار ہوں۔ ایک ہزار پونڈ نقد اور ایک شلنگ رائلٹی حقوق۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ تمھیں منظور ہے؟"

جیمس حیران رہ گیا اور گھبرا سا گیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ...."

"دیکھو میاں لڑکے! میں بحث و تمحیص کو پسند نہیں کرتا۔" انگل وڈ نے پرزور لہجے میں کہا۔

"جی! آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں روپے اور شرائط کے نقطۂ نظر سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں وہ میری خواہشات اور اغراض و مقاصد سے بہتر ہے۔ اور میری توقع سے بہت زیادہ۔ لیکن آج ہی صبح میں نے انتہائی مایوس ہو کر احمقوں کی طرح ایک شخص کو دو سو پونڈ میں حقوق دیدیئے!"

"افسوس! معلوم ہوتا ہے تمھیں کسی نے فریب کے جال میں پھانس لیا۔"

"جی! مجھے بھی اس کا احساس ہے۔"

"اررر! بہت برا ہوا۔ اس شخص سے واپس لینے کی کوشش کرو۔ مجھے وہ ضرور چاہیئے۔"

"جی بہتر! کوشش کرتا ہوں۔" جیمس نے جواب دیا۔

"ہاں ضرور کچھ نہ کچھ کرو۔ اور دو تین روز کے اندر اندر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔" انگل وڈ نے کہا۔ "تمھارے متعلق تمھاری ناظمہ ڈورا اور میں بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ لڑکی بہت اچھی ہے۔ اس کے دل میں تمھارا بڑا درد ہے۔ وہ تمھارے متعلق نہایت ہمدردانہ اور فکر آمیز گفتگو کر رہی تھی۔ لیکن وہ تجارتی معاملات میں ناقابل محض ہے۔ اگر تم میری رائے پر عمل کرو تو اس سے شادی کر لو اور دوسری ناظمہ لے آؤ۔ اچھا خدا حافظ!"

جیمس نے مایوس ہو کر فون رکھ دیا۔ پارکر سے گزٹ واپس ملنے کی اُسے مطلق امید نہ تھی۔ اس نے پھر سوچا اگر وہ خط ہی واپس مل جائے تو کتنا بہتر ہو ۔ دیکھوں کوشش کر کے ۔۔۔! پارکر کو وہ خط ساڑھے چھ بجے ملنے والا تھا۔ اس وقت چھ بج رہے تھے وہ روانہ ہو گیا۔

۴

وہ ڈاکیہ جو پارکر کو خط دے کر واپس آ رہا تھا بنگلے کے قریب ہی ملا۔ وہ ایک کھڑکی کے قریب پہنچا۔ ملازم خطوط کو ترتیب دے رہا تھا۔ اس نے خطوط کو ترتیب سے رکھا۔ کرسیوں کی نشست درست کی اور روانہ ہو گیا۔

جیمس کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہوا۔ وہ خطوط کا پلندہ ہاتھ میں لے کر یکے بعد دیگرے دیکھنے لگا۔

"واہ ہماری ملاقات بھی نہایت مفید ثابت ہوئی۔" جیمس نے مڑ کر دیکھا تو پارکر کی فربہ اندام پست قد صورت دانت نکالے ہنس رہی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے بڑی قیمتی چوری کی جا رہی ہے؟"

"دیکھیئے مسٹر پارکر ...!" جیمس نے بولنے کی کوشش کی۔

"چپ رہو میاں لڑکے! خاموش رہو" بارکر کرخت لہجہ میں چلایا اور ساتھ ہی گھنٹی بجا کر ملازم کو طلب کیا۔ "خطوط اپنی جگہ رکھتے ہو یا پولیس کو بلاؤں۔ تم نے سوچا ہوگا خطوط لے کر کھڑکی سے فرار ہو جاؤں۔ لیکن یاد رکھو کل پولیس تمھاری ملاقات کو آئے گی۔"

جیمس نے لرزیدہ ہاتھوں سے تمام خطوط رکھ دیئے۔ بارکر نے انھیں اٹھا کر بغل میں دبا لیا۔

"دیکھیے مسٹر بارکر! مجھے اعتراف ہے کہ آپ نے مجھے بروقت پکڑا۔ لیکن یہ بتائیے کہ آپ میرا خط مجھے کس قیمت پر واپس دے سکتے ہیں؟" جیمس نے پوچھا۔

"کسی قیمت پر نہیں۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو کر و لیکن میں کسی صورت میں وہ خط تم کو نہیں دے سکتا۔" خطوط پر ہاتھ مار کر بارکر نے کہا۔ "تمھارا تحریری اقرار نامہ یہاں میرے پاس محفوظ ہے۔ اور وہ تمھیں ہرگز ہرگز واپس نہیں مل سکتا۔ ہاں تمھیں اب اپنے گھر جانا ہوگا۔ آؤ میں تمھیں اپنے موٹر سے گھر پہنچا دوں۔" بارکر نے خندہ پیشانی سے کہا۔

"آگ لگے تیرے موٹر کو۔" یہ کہہ کر جیمس نے اپنا رستہ ناپا۔

اس کا دماغ سُن ہو گیا۔ وہ خود اپنے آپ پر جھنجلایا اور لعنت ملامت کرنے لگا۔ رنج و غم اور غیظ و غضب کے مخلوط جذبات اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ وہ اسی کیفیت سے اپنے مکان کی طرف آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ پہلے ہی موڑ پر وہ کسی سے ٹکرایا وہ تھی ڈورا ——!

"ایں ڈورا تم ..... یہاں ..... کیسے؟" جیمس نے تعجب سے پوچھا۔

"میری خواہش نہ تھی کہ میں آپ کو اطلاع دوں۔ میں ..... وہ خط ..... دینے جا رہی تھی۔ وہی جو آپ نے مسٹر بلیک کو لکھا تھا۔ میں بذات خود اسے پہنچانے جا رہی تھی۔ کیونکہ میں نے اُسے ڈاک کے حوالے نہیں کیا —— مسٹر اَصل وڈ کی ملاقات کی گڑبڑ میں ——"

"تم خط ڈالنا بھول گئیں۔ کیوں یہی نا؟"

"جی!" شرم سے گردن جھکا کر اس نے جواب دیا۔

"سچ! کہاں ہے وہ خط؟ لاؤ مجھے دو۔" یہ کہہ کر جیمس نے ڈورا سے وہ خط لیا اور اس کے پرزے پرزے کر دیئے۔

"ایں! آپ نے اسے چاک کر دیا۔"

"ہاں!" اطمینان اور آزادی کا سانس لیتے ہوئے جیمس نے جواب دیا۔ اسی وقت پشت کی جانب کے بنگلے سے حیرت انگیز آواز اور متواتر گالیاں سنائی دیں۔ بارکر صاحب جیمس کا خط نہ ملنے کے باعث طوفان بدتمیزی اٹھا رہے تھے۔

"آؤ تمھیں گاڑی میں تمام حالات سناؤں۔" یہ کہہ کر جیمس اس کے ہمراہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں ایک چھوٹے سے ڈبہ میں علیحدہ بیٹھ گئے —— دوسری طرف سے ایک شخص اسی ڈبہ میں سوار ہونے کی غرض سے آیا۔ لیکن ان دونوں کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا —— اور فوراً دروازہ بند کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وسعتِ خیال

جاتے ہیں دل میں داغِ تمنّا لئے ہوئے

از حضرت شفق مینائی عمادپوری

اک وسعتِ خیال کی دُنیا لئے ہوئے
ہر دل ہے ذرّے ذرّے میں صحرا لئے ہوُئے

ارمان و آرزو و تمنّا لئے ہوئے
تنہا ہم آئے جاتے ہیں کیا کیا لئے ہوئے

آ آ کے ڈھونڈتے ہی رہے اُس کو طُور پر
موسیٰ بھی مشعلِ یدِ بیضا لئے ہوئے

تِل اوٹ اک پہاڑ ہے اوجھل خدائی شان
آنکھیں مری ہیں کوزے میں دریا لئے ہوئے

پہلو میں دل ہے اور بتوں کا ہے دل میں گھر
کعبہ بھی ہے بغل میں کلیسا لئے ہوئے

چھلکا رہی ہیں بجلیاں بھر بھر کے بوتلیں
بادل ہے دوش پر خُمِ صہبا لئے ہوئے

ساقی کی مست آنکھوں کے قربان جائیے
دو بادہ کش ہیں ساغر و مینا لئے ہوئے

آئے تھے پھول چُننے کو باغِ جہاں میں ہم
جاتے ہیں دل میں داغِ تمنّا لئے ہوئے

ساحل غریب خاک اُڑاتا ہے تشنہ لب
آغوش میں ہے موجوں کو دریا لئے ہوئے

زلفوں سے ہے عیاں رُخِ روشن کی یوں جھلک
جیسے ہو ابر چاند کا ٹکڑا لئے ہوئے

اس سے تو میکدے ہی میں رہنا مرا ہے خوب
مسجد میں جاؤں ساغر و مینا لئے ہوئے

اُٹھا ہے وقتِ نزع جو بالیں سے نا اُمید
جاتا ہے میری جان مسیحا لئے ہوئے

ہر ذرّہ کہہ رہا ہے کہ رکھ دے جبیں یہیں
رستے میں اس کا نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

جاتا کہاں ہے اے دلِ مرحوم خیر ہو
کاندھے پہ حسرتوں کا جنازا لئے ہوئے

دو گز کفن تو ساتھ ہے گو کچھ نہ ہو شفق
دنیا سے جا رہا ہے تو دنیا لئے ہوئے

بیمے کے ذریعے پورا تحفظ

یہ وہ چیز ہے جو اورنیٹل اپنے لاکھوں بیمہ داروں کو اپنی ۷۰ سالہ زمانہ
امن زمانہ جنگ کی زندگی میں بیمہ زندگی کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق
کاروبار کے انتخاب سے مہیا کرتی رہی ہے - اورنیٹل آپ کے لئے
ں کچھ کر سکتی ہے جو اس نے ان کے لئے کیا ہے۔

سابقہ ادا کردہ بیمہ ۲۶ کروڑ روپے سے زیادہ
بیمہ جات جو جاری ہیں ۵۰½ کروڑ روپے سے زیادہ
سال ۱۹۴۱ء کی آمدنی قریباً ۵ کروڑ روپے
سرمایہ قریباً ۳۰ کروڑ روپے

ں جوئی ایف سی آئی (اڈنبرگ) ایف - آر - ای - ایس (لندن)
سکیرٹری اورنیٹل لائف آفس - اورنیٹل بلڈنگ ۷ ہ - سی
دی مال - لاہور

دفتر بمبئی ——— قائم شدہ ۱۸۷۴ء

تپ دق

دق کی بیماری پھیپھڑوں کی ہو یا آنتوں کی مریض کے قیمتی
فضول قسم کے علاجوں میں ضائع نہ ہونے دیں - اور
سب سے زیادہ کامیاب علاج کے لئے آج ہی پتہ ذیل پر

کتاب تدابیر دق مفت

ں کی ہدایات سے فائدہ اٹھائیں - اس کتاب میں دق و
ہیت، اسباب، علامات، اقسام، حفظ ماتقدم، غذا،
حتیاط اور اس کے مکمل اور بہترین علاج کا بیان ہے،

پتہ
نا کیمیکل ورکس، نئی دہلی،
New Delhi !!

منہ مانگی مراد مل سکتی ہے

ناامید ہونا گناہ عظیم ہے اور مایوسی نامردوں کا شیوہ نہیں صرف ہمت اور کوشش کریں جس طرح مقدمہ میں کسی لائق وکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور بیماری میں حکیم کی شفا و فتح خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے پس اگر آپ کسی بھی مشکل و مصیبت میں مبتلا ہیں اور اس کے حل کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی تو مشہور معروف عامل حکیم کریم الدین کو لکھئے ان کے عملیات روحانی سے مشکلیں حل ہو جاتی ہیں بیماری میں شفا ہوتی ہے مقدمہ میں فتح ہوتی ہے عورت مرد کے ناخوشگوار تعلقات ہوں تو محبت میں بدل جاتے ہیں امتحان میں یقیناً کامیابی ہوتی ہے بشرطیکہ آپ روحانی امداد لیویں ہزارہا بندگان خدا کامیاب ہو چکے ہیں اور علم و عمل کی تعریفیں کر رہے ہیں مشورہ کی فیس معاف لیکن خط و کتابت جوابی سے مشورہ کریں۔

دیکھئے دنیا کہتی ہے

کہ عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی انارکلی لاہور اپنے

علم و عمل میں ماہر ہیں

جناب محمد باقر صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور حال امرتسر جناب سر میرزا ظفر علی خانصاحب جج ہائیکورٹ لاہور جناب میاں جگدیش سنگھ صاحب اول مجسٹریٹ دہلی - جناب شیر چشتی پیر سکندر ریاست بہاولپور - جناب خانبہادر خانصاحب سب رجسٹرار ریٹائرڈ و آنریری مجسٹریٹ راولپنڈی جناب آغا جعفر حسن ایس - ڈی - او راولپنڈی حال لاہور فیشنر جناب ملک نور محمد صاحب پنشنر آئی - او - ایم - کنڈاں ضلع شاہپور - جناب فیض الحق صاحب تحصیلدار و سپیشل مجسٹریٹ جیور ضلع بلند شہر -

علاوہ ازیں

لاکھوں افسران و شرفا تحریر فرماتے ہیں کہ عامل حکیم کریم الدین کے علم و عمل کی آزمائش کی آپ اپنے فن میں ماہر از حد شریف اور ملنسار ہیں، آپ بھی ایکمرتبہ آزمائش کرکے حکیم صاحب کی تعریف کریں گے

مینجر دفتر عامل حکیم کریم الدین، انارکلی - لاہور

عرب کے کاہن اور متنبی

تاریخ ابن خلدون کی روشنی میں!

جناب خان شبیر احمد خاں!

ابن خلدون لکھتا ہے۔ عناصر اربعہ کے چار درجے ہیں۔ سب سے نیچے مٹی ہے اس کے اوپر پانی، اس سے اوپر ہوا اور اس سے اوپر آگ۔ یہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ہر ایک میں خدا تعالےٰ نے یہ قوت رکھی ہے کہ اپنے قریب والی صورت اختیار کرلے مثلاً پانی ہوا ہوجاتا ہے اور ہوا آگ ہوجاتی ہے۔

ان میں سے جو اوپر ہے وہ بہ نسبت نیچے والے کے لطیف ہے، مثلاً پانی بہ نسبت مٹی کے لطیف ہے اور ہوا بہ نسبت پانی کے، اور آگ بہ نسبت ہوا کے۔ اور افلاک ان سب سے زیادہ لطیف ہیں۔ اسی طرح کائنات عالم میں بھی درجے ہیں۔ سب سے پست درجہ معدنیات کا ہے۔ اس سے بڑا نباتات اور اس سے بھی بڑا حیوانات کا درجہ ہے۔ معدنیات کا آخری درجہ حیوانات کے ادنیٰ درجہ سے قریب ہے۔ یعنی معدنیات میں اگر ذرا نرمی ہوجائے تو نباتات کی حد میں داخل ہوجائے۔ اور نباتات میں اگر ذرا نرمی ہوجائے تو حیوانات کی حد میں پہنچ جائے۔ مثلاً خرما اور انگور کو دیکھو۔ یہ حلزون اور صدف سے قریب ہیں کیونکہ حلزون میں قوت لامسہ کے سوا کوئی قوت نہیں ہے۔

اب حیوانات کو دیکھو۔ ان میں درجات کا کتنا فرق ہے۔ کسی میں فقط قوت لامسہ ہے۔ کسی میں کوئی اور قوت بھی زیادہ ہے اسی طرح بڑھتے بڑھتے اکثر حیوانات میں پانچوں ظاہری قوتیں اور بعض میں باطنی اور ظاہری دونوں قوتیں پیدا ہوجاتی ہیں پھر باطنی قوتوں میں بھی تفاوت ہے۔ کسی میں زیادہ ہے کسی میں کم ——— سب سے آخری درجہ حضرت انسان کا ہے جس کے قوائے ذہنیہ و باطنیہ کا مقابلہ کوئی حیوان نہیں کرسکتا۔ اگرچہ انسان انسان میں بھی عقل و ادراک کے لحاظ سے فرق ہے کوئی کم عقل ہے کوئی زیادہ عقلمند ہے۔ کسی میں کہانت تک کی عقل ہے کسی میں نبوت تک کی ——— مگر اس سے زیادہ ترقی کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کے بعد ابن خلدون نے بڑی تفصیل سے نفس مدرکہ و محرکہ کو انسان میں ثابت کیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اس سے بالاتر بھی ایک ایسا وجود ممکن ہے۔ جو نفس مدرکہ و محرکہ میں زیادہ قوت پیدا کرے اور اس کا ادنیٰ مرتبہ انسان کے آخری مرتبہ سے قریب قریب ہو۔ اس میں قوت ادراک اس درجہ بڑھی ہوئی ہو کہ وہ مجسم علم و ادراک بن جائے۔ اسی مرتبہ کو ہم "عالم ملائکہ" کہتے ہیں۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفس انسانی میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ اپنی حدِ بشریت سے نکل کر حدِ ملائکہ تک پہنچ جائے بلکہ جنس ملائکہ میں داخل ہوجائے۔ خواہ یہ کسی وقت اور کسی لمحہ

ابن خلدون نے نفس انسانی کی تین اقسام بیان کی ہیں۔

(۱) وہ نفس جو روحانی ادراک تک پہنچنے سے بالکل عاجز ہے (جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے) اور اسے فقط اپنے خیالی اور حسی مُدرکات سے کام لینے کی قوت حاصل ہے اور علوم تصوریہ و تصدیقیہ میں صرف اتنا حصہ لے سکتا ہے جتنا اس کی عقل و ادراک اجازت دے۔

دوسرا وہ نفس ہے جو اپنی قوت فکر کی امداد سے عقل روحانی تک پہنچ سکے، اور اسے اتنی ادراکی قوت حاصل ہوجائے کہ بدنی آلات کے استعمال کی ضرورت نہ رہے۔ اس درجہ میں اس کے ادراک کا دائرہ زیادہ وسیع ہوجاتا ہے اور اوّلیات اور بدیہیات کے علم سے نظریات تک اس کی عقل چلنے لگتی ہے۔ اور مشاہدات باطنیہ اس پر روشن ہونے لگتے ہیں۔ یہی مرتبہ و درجہ اولیا اور ان لوگوں کا ہے جن پر خدا تعالےٰ کی طرف سے علوم نازل ہوتے ہیں۔

تیسرا نفس وہ ہے جس میں بالفعل اتنی قوت موجود ہو کہ وہ انسانی لباس اتار کر ملائکہ کی حد تک پہنچ سکے بلکہ کسی وقت سچ مچ "ملک" بن جائے۔ اور جو علوم و مدرکات ملاءِ اعلیٰ کے ملائکہ کو حاصل ہیں۔ وہ اسے بھی میسر آنے لگیں، اور وہ کلام الٰہی کو

سُننے لگے۔ یہ درجہ انبیا کو وحی کی حالت میں حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی فطرت ہی اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ تمام مدارج طے کرکے حدِ بشری سے نکل جاتے ہیں اور ملائکہ کے مرتبے کو پہنچ جاتے ہیں کہانت کا درجہ بھی انسان کے خواص نفسی سے ہے یعنی انسان کے نفس کو یہ استعداد حاصل ہے کہ اپنی بشریت کے دائرہ سے نکل کر روحانیت کی حد میں آسکے اور چونکہ یہ استعداد انسانی فطرت میں موجود ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفسِ انسانی میں ایک درجہ ایسا بھی ہے جو انبیا کے اعلیٰ مرتبہ سے کم لیکن معمولی انسانوں کی عقلوں سے زیادہ ہے۔ اور اس میں اتنی قوت موجود ہے کہ جب اس کی قوتِ فکریہ میں شوق اور ارادے سے حرکت پیدا ہو تو قوتِ عقلیہ بھی اس کا ساتھ دے لیکن جس کی قوتِ عقلیہ اس مرتبہ سے کم ہوگی وہ محسوسہ و متخیلہ کی جزئیات سے اُلجھ کر رہ جائے گا کیونکہ قوتِ عقلیہ کی حرکت کا اصول ہے کہ جب کسی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ضرور کسی نہ کسی چیز تک اس کی انتہا ہوتی ہے۔ اگر ان علوم کلیہ تک پہنچ گئی جو ملائکہ کی حدِ ادراک ہے تو پھر کیا کہنا۔ اگر وہاں تک نہ پہنچ سکے تو اس کے ماتحت کی جزئیات و متخیلات تک آکے رک جاتی ہے۔ مثلاً شفاف چیزیں جیسے ستارے وغیرہ حیوانات کی ہڈیاں یا کلام کا مقفیٰ ادا کرنا، یا چرند پرند کی آواز یا افعال و حرکات سے کوئی نتیجہ نکالنا۔

اب چونکہ یہ قوت ان چیزوں میں پھنس کے رہ گئی ہے اس لئے انہی سے نتائج پیدا کرتی ہے۔ کبھی مُردوں کی ہڈیوں سے کبھی طیور و حیوانات کی آوازوں سے اور اسی کے مطابق حکم نکالتی ہے۔ کہ یہ ہوگا ــــ اور یہ نہ ہوگا، اسی قوت کو کہانت اور اسی قوت کے مالک کو کاہن کہتے ہیں۔

مگر کاہن کو معقولات و کلیاتِ عالمِ بالا کے ادراک سے بالکل حصہ نہیں ملتا کیونکہ اس کی وحی کی حد فقط شیطان تک ہے، اس قوت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی کلام موزوں و مقفیٰ سے اپنی ترقی کیلئے استمداد کرے اور اپنے حواسِ ظاہری کی امداد سے عالمِ بالا تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس مقصد کے لئے چونکہ انسانی ادراک سے نفسانی قوتوں کا جدا ہونا ضروری ہے اس لئے وہ اپنی کوشش میں چنداں کامیاب نہیں ہوسکتا، اور یہی وجہ ہے کہ کبھی تو اس کا کہا ہوا بالکل صحیح ہوتا ہے۔ اور کبھی بالکل جھوٹ ہوتا ہے۔ لیکن نبوت کے زمانہ میں کہانت کی قوت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔

کہانت کے مرتبے سے قریب قریب خواب دیکھنا۔ ریاضت اور ضاعت وغیرہ بھی ہیں جن کی بحث آگے آئیگی۔ یہود و نصاریٰ اور باقی اُمتوں میں کاہن اسی شخص کو کہا جاتا ہے۔ جو ذبیحوں اور قربانیوں کو خدا تعالےٰ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اس لفظ کے معنی میں غیب پر حکم لگانے کے معنی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

کاہن وہ شخص ہے جو آئندہ ہونے والے واقعات کی خبر دے۔ اور اسرار کے جاننے اور علم غیب سے واقفیت رکھنے کا دعویٰ کرے۔ کلیات میں لکھا ہے کہ ــــ کاہن وہ شخص ہے جو گذشتہ حالات کی خبر دے اور عراف وہ ہے جو آئندہ حالات کی خبر دے۔

اس فرض کو پورا کرنے والے زمانۂ جاہلیت میں بہت تھے جن کاہنوں کے حالات مفصل معلوم ہو سکے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اسود عنسی مذحج قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ اس کا نام عیہلہ بن کعب تھا۔ اسے ذوالحمار بھی کہتے تھے۔ اس کے پاس ایک تربیت یافتہ کالا گدھا تھا۔ جب وہ اپنے گدھے سے کہتا۔ اپنے رب کو سجدہ کر تو وہ سجدہ کرتا تھا اور جب وہ کہتا کہ بیٹھ جا تو وہ بیٹھ جاتا اسی وجہ سے اسے ذوالحمار کہتے تھے۔ اس نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ شعبدے بھی دکھاتا تھا۔ جو شخص اس کی تقریر سُنتا اس کا قیدی بن جاتا تھا۔ ایک شخص فیروز نام نے اُسے قتل کر دیا۔

۲۔ عامر بن عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ یہ عثمان بن عفان کا رضاعی بھائی تھا۔ یہ شخص رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتا تھا۔ ایک دن ابتدائے خلقت والی آیت لکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بیاختہ فتبارک اللہ احسن الخالقین اس کے مُنہ سے نکل گیا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا یہ بھی لکھ لو۔ خدا کی طرف سے یہی آیت نازل ہوئی ہے۔ عامر یہ سنتے ہی مرتد ہو گیا۔ اور کہنے لگا اگر یہ نبی ہیں تو میں بھی نبی ہوں۔ کیونکہ مجھ پر بھی تو وحی ہوئی ہے۔

جب آنحضرت صلعم نے اس کا خون مباح کر دیا تو عثمان رضی اللہ عنہ اسے لیکر گئے اور سفارش کی آخر حضرت نے معاف فرما دیا۔

۳۔ مسیلمہ کذّاب۔ یہ بکر بن وائل کے قبیلہ سے تھا۔ اس نے یمامہ میں نبوّت کا دعویٰ کیا۔ لوگ اسے ازراہ مذاق رحمان الیمامہ کہتے تھے۔ ہوتے ہوتے وہ بے انتہا جھوٹ بولنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا جھوٹ ضرب المثل ہوگیا۔ چنانچہ "اکذب من ابی ثمامہ" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ آخر خالد بن ولید نے خلافت ابوبکرؓ کے زمانے میں اسے قتل کر دیا۔

۴۔ سجاح۔ ایک عورت قبیلہ بنی تمیم کے بنی یربوع میں سے تھی۔ اس کا باپ حارث بن سوید بن عقفان تھا۔ اس کی کنیت امّ صادر تھی۔ مسیلمہ کذاب کے زمانے میں اس نے بھی دعویٰ نبوت کیا تھا۔ جب مسیلمہ کذاب کا دعویٰ مشہور ہوا تو ایک دن مناظرہ کرنے کے لئے اس کے پاس گئی آخر مسیلمہ کذاب کو بعد امتحان اپنا نبی تسلیم کر لیا۔

۵۔ طلحہ اسدی۔ دور جاہلیت اور عہد اسلام کے مشہور بہادروں میں سے تھا۔ پہلے اس نے اسلام قبول کیا پھر مرتد ہوگیا پھر نبوت کا دعویٰ کیا ایک بہت بڑی جماعت اس کی مرید ہوگئی وہ کاہن بھی تھا۔ مگر جب خالد بن ولید نے اس کی جماعت کو منتشر کر دیا تو وہ پھر مسلمان ہوگیا۔

اب ان کاہنوں کا مختصر تذکرہ سنئے جنھوں نے نبوّت کا دعویٰ نہیں کیا۔

کندہ (مشرقی یمن) میں ایک قبیلہ سکاسک نامی تھا۔ یہ لوگ بھی سحر و جادوگری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے کاہن گذرے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ مشہور اور چوٹی کے صرف دو ہی تھے۔ ایک کا نام شق تھا دوسرے کا سطیح یہ دونوں دو بہنوں کی اولاد سے تھے اور ان کا ظہور اسلام سے کچھ ہی قبل ہوا ہے۔

شق کا نام ابو صعب شکر بن رہب بن اقول بن یزید بن قیس ابکر بن انمار تھا۔ اس کے شق کہلانے کی وجہ یہ تھی، کہ وہ نصف دھڑ کا آدمی تھا یعنی اس کا ایک ہی ہاتھ تھا اور ایک ہی پاؤں۔

سطیح کا نام ربیع بن ربیعہ بن مسعود بن مازن بن ذئب بن عدی بن مازن بن غسان تھا۔ اس کے نسب میں چونکہ ایک شخص ذئب بن عدی نامی بھی تھا۔ اس لئے اسے ذئبی بھی کہتے تھے۔

یہ شخص محض گوشت ہی گوشت تھا۔ ہاتھ پاؤں بالکل نہ تھے اس کا مُنہ اس کے سینہ پر تھا۔ گردن بھی ندارد اور سر بھی غائب، بالکل بیٹھ نہ سکتا تھا۔ لیکن جب اسے غصہ آتا تو وہ حرارت سے پھول جاتا اور اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔

شق اور سطیح کی پیدائش ایک ہی دن ہوئی۔ اسی روز طریفہ بنت الخیر حمیری جو بڑی کاہنہ اور عمر مزیقیا عمران کاہن بن عامر ماء السماء کا بھائی تھا کی بیوی تھی۔ جب سطیح اور شق پیدا ہوئے تو طریفہ کو خیال ہوا کہ اب یہی بیوی میری خلیفہ بنے گی اس لئے دونوں کو لپٹنے پاس منگایا اور دونوں کے مُنہ میں تھوکا۔ گویا اپنا علم کہانت دونوں کو دے دیا اور اسی وقت فوت ہوگئی۔

مشہور ہے کہ یہ دونوں چھ سو برس تک زندہ رہے۔ ایک شخص نے تو لکھا ہے کہ سطیح سات سو برس تک زندہ رہا۔ اور نوشیروان کسریٰ کے زمانے میں فوت ہوا۔ جس طرح جاہلیت کے زمانے میں عرب اپنے نسبی جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے حکام کے پاس جاتے تھے۔ اسی طرح حوادث روزگار کے ازالہ اور باہمی تنازعات کے فیصلہ کرنے کی غرض سے وہ ان کاہنوں کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے۔ تاریخوں میں ان کے متعلق بہت سی باتیں مذکور ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

"(ترجمہ) میں نے یمامہ کے عارف کاہل سے کہا کہ تو میرا علاج کر۔ پس اگر تو میری دوا کر دیگا تو کیا مضائقہ ہے کیونکہ تو طبیب ہے۔"

دوسرا شاعر کہتا ہے۔

"(ترجمہ) میں نے یمامہ اور نجد کے عارفان کاہل (کاہنوں) کو اختیار دے دیا کہ وہ مجھے شفا دیدیں۔ لیکن دونوں نے کہا کہ خدا تجھے شفا دے کیونکہ بخدا تیری اس آگ (عشق کی آگ) پر جو تیری پسلیوں کے درمیان ہے ہمیں کچھ اختیار نہیں ہے۔"

اس قسم کے لوگ اسلام کے بعد بھی ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور موسیٰ بن صالح تھا۔ مسلمان عام طور پر جفر کی کتاب پر انحصار رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس تصنیف میں نجوم و آثار کے علوم بند ہیں مگر اس سے زیادہ وہ اسے وقعت نہ دیتے تھے اور نہ اس کی حقیقت سے آگاہ تھے۔

اس کتاب کی حقیقت یہ ہے کہ ہارون بن سعید عجلی جو فرقہ زیدیہ کے رئیس تھے، کے پاس ایک کتاب

مطالب امام صادق سے مروی تھے۔ اس کتاب میں تمام اہلبیت کے حالات عموماً اور بعض اشخاص کے حالات خصوصاً درج کئے گئے تھے۔ یہ حالات حضرت صادق اور ان سے قبل اور بعد کے اماموں کو کشف و کرامات کے ذریعہ حاصل ہوئے تھے۔ یہ نسخہ حضرت صادق کے پاس بکری کی کھال پر لکھا ہوا تھا۔ ہارون عجلی نے اس کی نقل لے لی اور اس کا نام جفر رکھا۔ کیونکہ بکری کی کھال کو جفر کہتے ہیں۔ آخر یہی نام اس کتاب کا پڑگیا۔ اس کتاب میں قرآن مجید کے اسرار و رموز اور عجیب عجیب معنی حضرت صادق سے مروی ہیں۔" (ابن خلدون)

مگر ابن خلکان لکھتا ہے کہ رافضیوں کی تفسیر قرآن عام طور پر اسی جفر پر مبنی ہے۔ چنانچہ سعید بن ہارون عجلی اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

"ترجمہ کیا تم نہیں جانتے کہ ہمیں رافضیوں سے کیا اختلاف ہے۔ انھوں نے آل محمدؐ کے بارے بارے میں عجیب عجیب اقوال نقل کئے ہیں۔ کسی نے تو ان کو امام کہا اور کسی نے ان کو نبی سمجھ لیا۔ مجھے تو ان کی کتاب جفر پر تعجب آتا ہے۔ میں جفر جاننے سے برات چاہتا ہوں اور خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔"

علم جفر اس علم کو کہتے ہیں جس میں حروف سے بحث کی جاتی ہے مگر اس حیثیت سے کہ ہر حرف مستقل معنی رکھتا ہے اسی کو "علم حروف" اور "علم التکسیر" بھی کہتے ہیں۔

سید السند نے لکھا ہے کہ علم جفر اور جامعہ کی دو کتابیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں علم الحروف کے قاعدے سے ان تمام حوادث پر روشنی ڈالی گئی ہے جو قیامت تک دنیا کو پیش آئیں گے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ایسے بھی بہت سے آدمی دیکھے ہیں جو پیش آمدہ حالات کو ظاہر ہونے سے پہلے ہی بتا دیتے ہیں۔ ان کی فطرت ہی کچھ اس قسم کی ہے۔ وہ کسی صنعت کے ذریعے سے نہیں بتاتے۔ نہ علم نجوم کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے ذہن کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ تمام باتیں ان پر منکشف ہو جاتی ہیں انہی لوگوں میں ناظروں کا گروہ بھی ہے جو آئینہ وغیرہ کی طرح صاف و شفاف چیزوں میں یا پانی بھرے طشت میں نظر ڈالتے اور بہت سی غیب کی باتیں دیکھ لیتے ہیں۔

انہی میں سے طارقین حصٰی (سنگریزہ پھینکنے والے) اور

اور گیہوں کے دانے اور گٹھلی پھینکنے والے بھی ہیں۔ یہ سب لوگ کاہنوں ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن کاہنوں کے مقابلے میں ان کا درجہ کمتر ہے۔

یہ تمام قوتیں انسان میں موجود ہیں۔ اگر آدمی اپنی حالت پر غور کرے اور ان میں سے کسی بات کی مشق کرے تو اسے ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کا دماغ صحیح ہو۔

اس سے گھٹیا درجہ کے وہ لوگ ہیں جو بخوردں۔ تعویذوں اور فتیلوں میں اپنی قوت حسیہ صرف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ان کے ذریعہ سے صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور جس بات کو دریافت کرنا ہو ہمیں اس کی ہیئت، مثال اور اشارا معلوم ہو جاتا ہے۔

ان کے بعد مجنونوں کا درجہ ہے کیونکہ دیوانوں کی باتیں بھی اکثر صحیح ہوتی ہیں۔

قیافہ۔ جاہل عربوں میں دو طرح کی قیافہ دانی تھی قیافۃ البشر اور قیافۃ الاثر۔

"قیافۃ البشر" یہ ہے کہ کاہن چہرے کے خدوخال اور بعض اعضائے بدن کی بناوٹ پر غور کرکے جو پوچھا جاتا بتا دیتے تھے، ایسے شخص کو حاذی کہتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک بچہ بیس آدمیوں کے درمیان رکھدیا گیا اور حاذی سے پوچھا گیا کہ یہ کس کا بچہ ہے اور اس نے توجہ کرنے کے بعد بتا دیا کہ فلاں شخص کا ہے۔

"قیافۃ الاثر" سموں کے نشان اور اونٹوں کے پاؤں اور قدموں کے نقوش سے پتہ لگا لیتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کی عمر جنس، حاضر اور مسافر میں بھی فرق معلوم ہو جاتا تھا۔

فراسہ بھی قیافہ کی ایک شاخ ہے۔ کبھی تو فراسہ میں یہ ہوتا ہے کہ صورت دیکھ کر دل کی بات معلوم کر لی جاتی ہے۔ کبھی ہیئت دیکھ کر اس کا پیشہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کے جسم کی ساخت دیکھ کر اخلاق پہچان لیا جاتا ہے۔

تفاؤل و تشاؤم (نیک فالی اور بدفالی) اسی قیافہ اور عرافہ سے تفاؤل و تشاؤم بھی پیدا ہوتا ہے۔ فال کی یہ صورت ہے کہ کوئی صاحب غرض کہیں جا رہا ہے پیچھے سے کسی نے کہدیا — "یا واجد" یا "یا غانم" بس وہ سمجھ لیتا ہے کہ اب میں ضرور کامیاب لوٹونگا۔ غلاصہ یہ کہ فال کسی ایسے نیک اور مبارک کلمہ کو کہتے ہیں جس سے کسی موقع پر نیک نتیجہ نکالا جائے مثلاً اگر داہنی آنکھ پھڑکتی تو سمجھتے تھے کہ دوست سے ملاقات ہوگی۔ شاعر اسی مطلب کو یوں بیان کرتا ہے۔

"ترجمہ میری آنکھ جب پھڑکی تو اس نے گویا خوشخبری سنائی کہ اب میں تجھے ضرور ہی دیکھونگا۔ حالانکہ اس سے پہلے ہم دونوں ہی ڈر رہے تھے کہ شاید ملاقات نہ ہو"

یا اگر داہنا ہاتھ پھڑکتا ہو تو اس سے سمجھتے تھے کہ یہ شخص پکڑا جائیگا۔ اگر بایاں پھڑکے تو رہائی کی دلیل تھی۔ کان کے پھڑکنے کے بعد کسی حادثے کی اطلاع کا انتظار کیا جاتا تھا۔ الغرض اس قسم کی بہت سی باتیں تھیں۔

کوّے کو عرب بیحد منحوس سمجھتے تھے۔ عربی میں کوّے کو "غراب" کہتے ہیں۔ غالباً اسی لئے مسافر کو "اغتراب" اور "غریب" کہنے لگے۔ عربوں کا خیال تھا کہ کوّے کی کائیں کائیں میں نحوست کا اثر غالب ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر کوّا دو مرتبہ بولے تو بڑی نحوست کی علامت ہے۔ اگر تین مرتبہ بولے تو سعادت کی علامت ہے —— منحوس ترین وہ کوّا ہے جس کی چونچ اور پنجے سرخ ہوں۔

عیافہ ۔ پرندے کا اڑانا۔ یہ بھی ایک قسم کی کہانت ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص فال لینے کے لئے بیٹھے ہوئے پرندے کو اڑاتا ہے۔ اگر وہ دائیں طرف سے ہو کر اڑے تو مبارک اگر بائیں طرف سے ہو کر اڑے تو منحوس۔

ایک عالم نے لکھا ہے۔ کوّے کی دو آوازیں ہوتی ہیں۔ ایک "نعیب" دوسری "نغیق"۔ "نعیب" تو بدفالی کی علامت ہے اور "نغیق" خوشحالی کی (یعنی جب غاق غاق کہے تو منحوس ہے اور غیق غیق کہے تو نیک فالی ہے۔)

دوار القمقم ۔ کوئی کاہن جب چاہتا کہ کسی چوری کا پتہ لگائے، تو ایک لوٹا لیتا تھا اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں کے کلمے کی انگلیوں سے پکڑ کر دم کرتا اور پھراتا جاتا تھا۔ جب اس کے خیال کے موجب چور کے نام پر پہنچتا تو لوٹے میں خود بخود حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔ اسی لئے مثل مشہور ہے "دار القمقم"۔ یہ مثل اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی خبر کی انتہا کسی خاص شخص پر ہو۔

ھاتف غیبیہ میں یہ بھی ہے کہ بعض آدمی جب سو جاتے ہیں تو ابتدائے خواب میں غیر اختیاری طور پر ان کی زبان سے کچھ

کلمات نکل جاتے ہیں جو مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح مرنے والے کی زبان سے۔ موت کے قریب اور مقتولوں سے سر یا دھڑ جدا ہوتے وقت ایسے کلمات ادا ہوتے ہیں جو اکثر صحیح ثابت ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ اس طرح کی غیب دانی میں ریاضت کے ذریعے مہارت حاصل کرتے ہیں اور مصنوعی مُردے بن جاتے ہیں، یا کسی کو مصنوعی مُردہ بنا لیتے ہیں۔ یعنی کوئی ایسی ترکیب کرتے ہیں جس سے تمام بدنی قوتیں باطل ہو جاتی ہیں اور پھر اس کے ذریعے سے غیب کی خبریں لے آتے ہیں۔ اس قسم کے دو گروہ ہیں صوفی، اور جوگی۔ صوفیوں کی ریاضتیں دینی طریقے پر ہوتی ہیں لیکن جوگی دنیاوی طریقے استعمال کرتے ہیں۔

ان صوفیوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے کہ بظاہر وہ دیوانے نظر آتے ہیں لیکن باطن میں اعلیٰ درجہ کے عاقل ہوتے ہیں۔ ولایت کے تمام منازل طے کر چکے ہوتے ہیں اور غیب کی خبریں بھی ان پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ بعض علما انہیں نہیں مانتے کیونکہ یہ لوگ خدا کی عبادت بالکل نہیں کرتے حالانکہ ولایت کا درجہ خاص عبادت گذاروں کو ملا کرتا ہے۔

رویا اور تعبیر رؤیا پر بھی عرب بہت اعتماد کرتے تھے۔ ابن خلدون لکھتا ہے۔ "وہ خواب جو کمزور اور دھندلا ہو یا محض حکایت اور مثال کی طرح سوتے میں محسوس ہو۔ اس کی تعبیر کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن جب واضح خواب ہو تو تعبیر کی ضرورت نہیں ہے" اسی لئے خواب کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک خواب جو خدا کی طرف سے ہوتا ہے دوسری ملائکہ کی طرف سے جس میں فقط حکایت ہی حکایت ہوتی ہے اور تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی تیسرے شیطانی خواب جو بالکل لغو ہوتا ہے اس کا نہ کچھ اثر ہوتا ہے نہ مطلب اکثر لوگوں نے علم تعبیر کے متعلق کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں سے محمد بن سیرین کا نام پیش پیش ہے۔ یہ بڑے زاہد تھے پیشہ بزازوں کا تھا کان کے بہرے لیکن علوم باطنیہ میں خاص مہارت رکھتے تھے انتقال ۱۱۰ھ میں ہوا ان کی کتاب آج کل بھی مستند تسلیم کی جاتی ہے۔

ہاں میں بھی تمہارا ہوں!

از:- جناب محمد عتیق الکریم ساقی صدیقی

مجھکو نہ بھلانا تم دیکھو میں تمہارا ہوں
آنکھوں کا اُجالا ہوں قسمت کا ستارا ہوں

تم مجھ پہ جو مائل ہو، پوچھو تو ذرا دل سے
کیا دل بھی تمہارا ہے، کیا میں بھی تمہارا ہوں

تم عرشِ تجلّی پر اک انجمِ نورس ہو
میں چرخِ محبت پر اک صبح کا تارا ہوں

صدقے میں سہیرا کے دل جس نے لیا میرا
وہ میری تسلی ہے میں اس کا سہارا ہوں

جس نے بھی مجھے چاہا محکوم بنا ڈالا
کچھ حسن پریشاں کا کچھ عشق کا مارا ہوں

میں ساقی محبت ہیں ہوں چین و قرار اُس کا
میں اُس کی نگاہوں کا ہلکا سا اشارا ہوں

خدا غارت کرے

اے زبانِ مدعا تجھکو خدا غارت کرے

از حضرت بہزاد لکھنوی

او کرمِ نا آشنا تجھکو خدا غارت کرے
او سراسر بیوفا تجھکو خدا غارت کرے

توبہ توبہ قدر تو نے میرے سجدوں کی نہ کی
اے کسی کے نقشِ پا تجھکو خدا غارت کرے

مٹ گیا تیری بدولت میری خودداری کا رنگ
اے زبانِ مدعا تجھکو خدا غارت کرے

پھر کسی کی مست رفتاری مجھے یاد آگئی
اے نسیمِ عطر زا تجھکو خدا غارت کرے

کوئی حد بھی ہے کہاں تک صبر کرتا جاؤں میں
مخزنِ جور و جفا تجھکو خدا غارت کرے

کچھ خبر تجھکو نہیں ہے میرے حالِ زار کی
او تغافل آشنا تجھکو خدا غارت کرے

دیکھ لے آنسو مچلتے ہیں نکلنے کیلئے
جذبۂ صبر و رضا تجھکو خدا غارت کرے

جامِ مے سے مل رہی ہے تلخیٔ خونِ حیات
ساقیٔ شیریں ادا تجھکو خدا غارت کرے

ایک جنبش سی ہوئے جاتے ہیں ٹکڑے دل جگر
اے نگاہِ سرمہ سا تجھکو خدا غارت کرے

کیوں دلِ بے مہر پر ہوتا نہیں کچھ بھی اثر
ہائے آہِ نارسا تجھکو خدا غارت کرے

بہری بھکارن

دلچسپ افسانہ

از جناب منظور عالم سعیدی کانپوری

دہلی کا مشہور مصوّر اختر کمال اپنے نگارخانے میں بیٹھا ایک بھکارن کی تصویر بنا رہا تھا۔ بھکارن اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک طرف کمال کی بیوی صبیحہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ یکایک کسی نے نگارخانے کے بیرونی دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

کمال نے صبیحہ سے کہا: "تم اندر چلی جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے منصور آ گیا۔"

صبیحہ بھکارن کی طرف دیکھ کر بولی: "اور یہ ....."

کمال نے کہا: "ان کو اسی طرح یہیں چھوڑ دو۔ تم فوراً اندر چلی جاؤ۔"

صبیحہ اندرونی دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گئی۔ کمال نے بھکارن سے کہا۔ "تم جس طرح کھڑی ہو اسی طرح کھڑی رہو۔ تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سمجھ گئیں نا؟"

اتنے میں کنڈی کی کھٹکھٹاہٹ کے ساتھ باہر سے آواز آئی

"کمال صاحب ہیں؟ کمال صاحب!"

کمال دروازہ کھولتے ہوئے بولا: "تم آ گئے منصور!"

منصور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا: "یہ تمہارا نگارخانہ ہے؟"

کمال نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں فون نہ کرتا تو شاید تم آتے بھی نہ؟"

منصور نے کمرے میں نگاہ دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "تم فون کرتے یا نہ کرتے میرا آنا ضروری تھا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ میں دہلی آتا اور تم سے نہ ملتا۔ اور ہاں تم نے اپنے نگارخانے کو ہر طرح مکمل کر لیا ہے۔ ایک آرٹسٹ کو جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے میں دیکھتا ہوں وہ سب تمہارے نگارخانے میں مہیا ہیں۔"

کمال ۔ اچھا تو تمہیں میرا نگارخانہ پسند آیا؟

منصور ۔ (بھکارن کی طرف دیکھتے ہوئے) بہت پسند اور ہاں یہ کون ہے؟

کمال ۔ (مسکراتے ہوئے) یہ ایک بھکارن ہے۔ میں اس کی مدد سے ایک تصویر بنا رہا ہوں۔ اور ہاں تمہارے ریسرچ کا کام کیسا ہو رہا ہے؟

منصور ۔ (بھکارن کی طرف بغور دیکھتے ہوئے) خوب اچھی طرح۔ تمہارے یہاں اور تو سب خیریت ہے؟

کمال ۔ تم بیٹھو گے بھی یا کھڑے کھڑے روزے سے ہو؟

منصور ۔ (دھیمی آواز میں) بیٹھتا ہوں۔ یہ بھکارن تو بہت زبوں حال معلوم ہوتی ہے؟

کمال ۔ زبوں حال کیوں نہ معلوم ہو گی۔ بھکارن ہی ہے لیکن تمہیں اس کے بارے میں آہستہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم آزادی کے ساتھ باتیں کر سکتے ہو۔

منصور ۔ کیوں؟ آزادی سے کیوں؟

کمال ۔ یہ بہری ہے۔

منصور ۔ بہری ہے؟

"بہری ہے؟"

"ہاں جب تک چیخ کر نہ بولا جائے یہ کچھ سنتی نہیں۔"

"لیکن ہے بہت حسین!"

"ہو گی! لیکن تم بیٹھ تو جاؤ۔ تاکہ میں تم سے باتیں بھی کرتا رہوں اور کام بھی تو ہوتا رہے۔ کام پورا کر کے اسے رخصت بھی تو کرنا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" منصور ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کمال تصویر بنانے لگا۔ منصور بھکارن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تعجب ہے کہ تم نے اب تک غور نہیں کیا۔"

"کس چیز پر؟"

"اسی پر کہ بھکارن بےحد حسین واقع ہوئی ہے۔"

"میرے خیال میں تو اس میں کوئی حسن نہیں اور غالباً یہ میرا خیال درست بھی ہے۔"

منصور بولا: "غریب بھکارن ہے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹی ہوئی ہے اس لئے اگر تمہیں یہ حسین معلوم نہیں ہوتی تو جائے تعجب نہیں لیکن اگر یہ صاف ستھری ہوتی اور اس کے بدن پر نفیس اور قیمتی کپڑے ہوتے تو تمہیں مجبوراً اس کے حسن کا اعتراف کرنا پڑتا۔

کمال۔(تصویر بناتے ہوئے بے اعتنائی سے) ممکن ہے۔

"تمھیں یہ ملی کہاں؟"

"یہیں اسی گلی میں۔ کیا میں اسے کچھ تلاش کرنے گیا تھا؟"

"چلی جا رہی ہوگی۔ تم نے بلا لیا ہوگا۔"

"ہاں اور کیا؟"

"وہ تمھارے پاس آتے ہوئے جھجکی نہیں۔ تمھارے گھر میں تو شاید کوئی عورت بھی نہیں ہے۔"

"در در کی بھکارن بھلا وہ میرے پاس آتے ہوئے جھجکتی کیوں؟ اور ہاں میرے گھر میں ایک عورت ہے۔ میری ملازمہ۔"

"تم نے اس بھکارن کو کتنے پیسے دینے کے لئے کہا ہے؟"

"چار آنے!"

"صرف چار آنے؟ کتنی دیر کے لئے؟"

"دو گھنٹے کے لئے۔"

"اور غریب کو دو گھنٹے تک کھڑے رکھ کر صرف چار آنے پیسے دوگے؟"

"اس کے لئے چار آنے کیا کم ہیں۔ یہاں تو دو گھنٹے ایک جگہ کھڑی رہے گی اگر یہ دو گھنٹے ماری ماری پھرتی تو تمھیں بتاؤ کیا پاتی؟"

"تم آرٹسٹ ہو اس لئے تمھیں تو پیسوں کا سا معاملہ نہیں کرنا چاہیئے"

"تمھیں معلوم نہیں کہ آج کل بازار کا کیا حال ہے۔ اور ہم لوگوں کا کاروبار کتنا خراب ہو رہا ہے۔ آخر ہم لوگ بھی کفایت سے کام نہ لیں تو کیا کریں؟"

"اب اور کتنا کام باقی ہے۔"

"صرف آدھ گھنٹے کا۔" "ٹھہرو میں ذرا تمھارے لئے چائے بنانے کو کہہ دوں۔"

"نہیں نہیں پہلے تم اپنا کام کر لو۔ اس کے بعد چائے بنے گی۔"

"کام تو پورا ہو ہی جائے گا۔ تم پورے ایک سال کے بعد لکھنؤ سے آئے ہو۔ یہ بتاؤ تم نے خط و کتابت میں اتنی کمی کیوں کر دی تمھارے والد صاحب بھی شکایت کر رہے تھے اور ہاں اب تو تمھاری عمر بھی کافی ہو چکی ہے۔ شادی کب کروگے؟"

"اور تم ——؟"

"مذاق نہیں منصور! اگر تم کہو تو میں تلاش شروع کر دوں میں آرٹسٹ ہوں اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایک آرٹسٹ بہرحال اہل نظر اور حسن شناس ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اختلاف خیال کی بنا پر میں اس بھکارن کے متعلق تم سے اتفاق رائے نہ کر سکا۔"

"میں سوچ رہا ہوں ...."

"کیا سوچ رہے ہو بھئی؟ میں بھی سن سکتا ہوں؟"

"میں سوچ رہا ہوں کیا یہ بھکارن خادمہ کا کام کرنے پر رضامند ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہ تو بڑی خوشی سے رضامند ہو سکتی ہے اگر تم اسے نوکر رکھ لو تو اس بیچاری کی زندگی سنور جائے۔ اگر تم کہو تو میں اس سے ....."

"نہیں نہیں، میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کسی اور جگہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔"

"کسی اور جگہ کیوں؟"

"یونہی ——!"

"یونہی کیوں؟ تمھارے یہاں اتنے آدمی رہتے ہیں تو کیا اس کا گذر نہیں ہو سکتا۔ اگر تمھیں اس سے ہمدردی ہے تو تمھیں اس کو اپنے ہاں رکھنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔"

"مجھے تو انکار نہیں لیکن ذرا والد صاحب سے ...."

"ہاں میں ان سے گفتگو کر لوں گا۔ لیکن تم اسے اچھی طرح دیکھ لو تاکہ بعد میں کوئی عیب نکال کر اسے اپنے ہاں سے علیحدہ نہ کرنے لگو"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اس کے متعلقین ——"

"اس کے متعلقین کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہی کرے گی جو میں کہوں گا۔"

"تو شاید اس سے تمھاری کافی شناسائی ہو چکی ہے۔"

"کافی تو نہیں مگر کسی حد تک شناسائی ضرور ہے۔"

"تو شاید اس کے پہلے بھی وہ تمھارے ہاں دو چار بار آ چکی ہے۔"

منصور نے کہا۔ "ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں۔ مگر کرنا چاہتی ہے۔"

"تمھیں کیسے معلوم؟"

"اس کے طور و طریق سے معلوم ہوتا ہے۔"

منصور کچھ سوچتے ہوئے۔ "تمھارا کام ختم ہوا یا نہیں؟"

"ختم ہی سمجھو!"

یہ کہہ کر کمال نے اندرونی دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی اور آواز دی۔ "صبیحہ ——!"

منصور نے متعجب ہو کر کہا۔ "یہ صبیحہ کون ہے؟"

"میری بیوی ——!"

"تمھاری بیوی؟ تم نے شادی کر لی؟"

"میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں منصور! کہ میں نے تمھاری لاعلمی میں یہ حرکت کر ڈالی"

اتنے میں صبیحہ دروازہ کھول کر کمرے میں آگئی۔ کمال نے صبیحہ اور منصور کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیں میری رفیقۂ حیات صبیحہ بیگم، اور آپ ہیں میرے دوست مسٹر منصور احمد!"

منصور اور صبیحہ نے ایک دوسرے کو آداب کیا اس کے بعد کمال نے بھکارن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اور آپ ہیں میری سالی مس ناہید، میں ان کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک پوز بنانے کا موقع دیا"

منصور وقف حیرت بنا ہوا کمال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمال بولا "اچھا مس ناہید اب آپ جا کر کپڑے بدل آیئے"

ناہید اندر چلی گئی۔

کمال نے منصور سے کہا۔ "تمھیں میری یہ سب باتیں عجیب معلوم ہوتی ہونگی منصور!"

منصور۔ یقیناً میں اس معمے کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں"

کمال۔ گھبراؤ نہیں یہ معمہ ابھی حل ہوا جاتا ہے۔

منصور آنکھیں پھاڑے کمال کی طرف دیکھتا رہا۔

کمال نے صبیحہ سے کہا "اب تم جا کر ناشتے کا سامان لاؤ اور ناہید کو تو ذرا میاں بھیجدو۔ ان کی غیر موجودگی نہایت شاق گذر رہی ہے۔

صبیحہ نے مسکرا کر کہا۔ "کیسے؟"

کمال۔ (مسکراتے ہوئے) بحث نہ کرو۔ جا کر اسے جلدی سے بھیجدو

صبیحہ۔ منصور صاحب بھاگ تو نہ جائینگے؟

کمال۔ منصور صاحب بھکارن کو خادمہ بنا چکے ہیں اسے چھوڑ کر بھاگ کیسے سکتے ہیں؟

"اچھا تو میں جاتی ہوں"۔ یہ کہکر صبیحہ اندر چلی گئی۔

کمال نے منصور سے کہا۔ "ناہید کے متعلق تمھارے والد صاحب سے گفتگو ہو چکی ہے اس نے اسی سال انٹرمیڈیٹ آرٹس پاس کیا ہے اس کے والد ایک معقول تجارت کے مالک ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں ناہید کے ساتھ شادی کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا"

"تم بڑے جعلساز معلوم ہوتے ہو"

"تمھارے جو جی میں آئے کہہ سکتے ہو۔ لیکن تمھیں اس ڈرامیٹک جعلسازی کی داد تو دینی ہی پڑے گی۔ تم تاریخ کی تحقیقات کر رہے ہو کیا تم کہہ سکتے ہو کہ آئندہ ہونے والے میاں بیوی کو ایک دوسرے سے متعارف کرنے کا اس سے بڑھ کر کوئی دلچسپ طریقہ تمھاری نظر سے گذرا؟"

اتنے میں صبیحہ ناشتے کا سامان اور ناہید کو ساتھ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ ناہید ہلکے پیازی رنگ کی نفیس ساری اور بلاؤز میں سراپا رنگ وجمال اور حسن ولطافت نظر آرہی تھی میز کے گرد پڑی ہوئی دو کرسیوں پر دونوں بہنیں بیٹھ گئیں۔

کمال نے منصور سے کہا۔ "بھئی تم نے اپنی بھکارن کی اجرت پر اعتراض کیا تھا اب جو تم کہو اسے دیدیا جائے"

منصور نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

کمال۔ ارے بھئی اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے۔ اب تو بھکارن تمھاری ہے لیکن اگر تم بتانے سے گریز کرتے ہو تو میں بھکارن ہی سے پوچھتا ہوں کہ وہ کیا اجرت چاہتی ہے۔

یہ کہہ کر کمال نے مسکراتے ہوئے ناہید کی طرف دیکھا۔ ناہید شرما گئی۔ کمال بولا "میں اجرت میں تمھی کو بھکارن کے حوالے کرتا ہوں"

یہ سن کر منصور مسکرا پڑا اور ناہید کا چہرہ دفور حیا سے سرخ ہو گیا۔ صبیحہ نے کمال اور منصور کے سامنے کی پیالیوں میں چاء بھری۔ کمال چائے کی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ارے بھائی ایک بات تو رہ ہی گئی منصور"۔

"کون سی بات ؟"

"یہی کہ مس ناہید کس قسم کی بہری ہیں ؟"

"کس قسم کیا معنی ؟"

"یہی کہ مس ناہید کس حد تک سنتی ہیں اور کس حد تک نہیں"۔

پھر کمال ناہید کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "دیکھو بھئی یہ تمہیں نوکر رکھ رہے ہیں تو انہیں حق ہے کہ تمہارے بارے میں ہر طرح اپنا اطمینان کر لیں"۔ ناہید چاء کی پیالی میں دیکھ رہی تھی۔ کمال بولا۔ "میں ایک فقرے کو تین ٹکڑے کر کے آہستہ آہستہ متوسط اور پوری آواز میں بولتا ہوں۔ تم دہراتی جاؤ"۔

ناہید کی نظریں اب بھی پیالی پر جھکی ہوئی تھیں۔

کمال آہستہ سے بولا۔ "پیا——!"

ناہید نے دہرایا——"پیا——!"

کمال نے ذرا زور سے کہا۔ "رے——!"

ناہید نے بھی کہا——"رے——!"

کمال نے زور سے کہا——"منصور!"

صبیحہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی—— ناہید کا چہرہ دفور حیا سے ارغوانی ہو گیا۔

کمال بھی ہنسنے لگا—— اور منصور کے ہونٹوں پر بھی تبسم کی لہر دوڑ گئی۔

آتشِ خاموش

جس کو کہتے ہیں سکوں نام ہے مر جانے کا!

از جناب آزاد انصاری مالیگانوی!

کیا بیاں کیجئے حال اپنے سیہ خانے کا!
شمع سوزاں کا ٹھکانا ہے نہ پروانے کا

شمع سے ذکر نہ کر میرے سیہ خانے کا
ذرے ذرے میں یہاں نور ہے پروانے کا

حاصلِ عمر ہے اک تشنۂ اُلفت کے لئے
ایک جرعہ جو ملا ہے ترے پیمانے کا

زندگی دل کے لئے، دل ہے محبت کے لئے،
یہی مطلب ہے فقط عشق کے افسانے کا

خاک ہو کر یہ شرف پائے زہے دولتِ عشق
ہے مزاج عرش پہ آج آپ کے دیوانے کا

جیتے جی دہر میں ہے فرصتِ ہستی مفقود
جس کو کہتے ہیں سکوں نام ہے مر جانے کا

میں سمجھتا ہوں کہ ہے گو ہر مقصود نہاں
شمع کی آتشِ خاموش میں پروانے کا

سوزشِ غم سے ہوئی شمع بھی جل کر خاموش
اس طرح ختم فسانہ ہوا پروانے کا

مستی کوثر و تسنیم انوکھی تو نہیں
صدقہ ہے مرے ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

شورشِ عشق نے رکھا نہ کہیں کا دل کو
نہ تو کعبے کا ہوا یہ نہ صنم خانے کا

دل تو کیا چیز ہے، یہ ارض و سما کانپ اٹھے
دیکھ کر حال پریشاں ترے دیوانے کا

جادۂ مہر و وفا کی ہے وہ معراج آزاد
جب نہ اپنے کا ہو احساس نہ بیگانے کا

خبردار!

اپنی جوانی کو برباد نہ کرو

اگر تم اپنی جوانی کو اپنے ہاتھوں تباہ کر چکے ہو اگر تم ہوائی کمزوریوں کا شکار ہو چکے ہو اور چھپے چھپے بازاری دوائیں منگا کر اپنی صحت کو خراب کر چکے ہو تو خدا کے لیئے ایسی اناپ شناپ دواؤں کے استعمال سے باز آ جاؤ!

دیکھ لیجئے کیا لکھا ہے

جتنی وبا ہندوستان میں کمزوری کی پھیلی ہے اتنی دنیا کے کسی ملک میں ہوا اور جتنی لوٹ یہاں کے اشتہار بازوں نے مچا رکھی ہے اور پبلک کی صحت کو برباد کر رکھا ہو ایسی دنیا کے کسی خطہ میں نہیں ہے کیا آپ کی آنکھیں ابھی تک نہیں کھلیں جبکہ آپ بھی جھوٹ اور فریب میں پھنس کر اپنا روپیہ اور صحت کھو بیٹھے ہیں اس اندھیر گردی اور عام صحتوں کے برباد ہونے سے متاثر ہو کر آیورویدک اور یونانی طب کے فلاسفروں نے ایک وقت میں بیٹھ کر بڑے غور و فکر کے بعد کمزوری جوانی سستی اور عام جسمانی کمزوری کا علاج معلوم کر لیا اور اس علاج سے ہندوستان کے لاکھوں انسانوں کو دوبارہ جوانی مل گئی جن کی وجہ سے ان کے گھر کی خوشی قائم رہ گئی اور ہزاروں بربادگھر آباد ہو گئے جو لوگ جوانی کے لیے ٹکریں مارتے پھرتے تھے۔ راتوں کی تنہائی میں اپنے کئے پر پچھتا کر آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتے تھے آج ان کے گھروں میں جا کر دیکھو وہ اولاد سے کھیلتے نظر آتے ہیں اور ان کے گھروں میں سکھ اور چین نظر آ رہا ہے۔

چند دن میں جوانی کس طرح مل سکتی ہے

بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ جوانی کو لوٹانے کا علاج بہت آسان ہو گیا۔ علاج کے دنوں میں ضبط سے کام لینا بہت ضروری ہے کیونکہ اسی طریقہ سے علاج کامیاب ہو سکتا ہے اس لئے صرف انہی لوگوں کو یہ کورس استعمال کرنا چاہیئے جو چند دن صبر سے کام لینے کا اقرار کریں۔ اس علاج میں دو دوائیں ہوتی ہیں ایک کھانے کی اور ایک لگانے کی دونوں دواؤں کے کورس کا نام تری جودین ہے کھانے کی دوا کی پہلی خوراک حلق سے اترتی اور اس نے تمام اعصاب کو ہوشیار کرنا شروع کر دیا اور کمزوری کو اس طرح بدن سے نکالنا شروع کر دیا جیسے گند دور کر دی۔ لگانے کی دوا بھی اپنے ایک قطرے کا کمال دکھاتی ہے مریض خود حیرت زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ بجلی کی طرح لہریں دوڑنے لگتی ہیں اور طاقت کا سمندر ابل پڑتا ہے اس کورس میں عجیب و غریب صفات بند ہیں اگر کوئی تندرست انسان بھی ایک دفعہ استعمال کرے تو جوانی کا پورا سماں دیکھ لے۔

گارنٹی اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ ہمارے "تری جودین" کورس سے اگر انسان تندرست نہ ہو تو قیمت واپس کر دی جاتی ہے اور ایک پیسہ رکھنا بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے ہے محصول ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ (یہ کورس صرف انہی لوگوں کو بھیجا جائے گا جو چند دن تک صبر سے کام لینے کا اقرار کریں گے)

منیجر اکسیری دواخانہ۔ پوسٹ بکس ۱۴۲۱ کلاں محل (اے ایل) دہلی

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے

اپنے صدر اعظم سے کہا دنیا میں ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں۔ تعمیل حکم کیلئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئزرلینڈ اور شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں کی گلچینی کی گئی جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی کھانا پینا ترک کردیا۔ مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزرا سے مشورہ طلب کیا مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا!

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کیلئے واحد جہاز ران کمپنی جو مسلمانوں نے قائم کی!!

بمبئی۔ کلکتہ اور کراچی سے حاجیوں کیلئے سروس

سامان اور مسافرے جانے کیلئے بمبئی اور کراچی سے عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور سویز تک جہاز جاتے ہیں۔ اسی طرح جب بھی موقع ہو بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک باربرداری اور مسافروں کو لے جانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

سروسیں اور تاریخیں اطلاع کے بغیر منسوخ ہو سکتی ہیں۔ کرایہ وغیرہ کی تفاصیل کے لئے پتہ ذیل پر لکھیے:۔

ٹرنر مارسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶۔ بینک سٹریٹ بمبئی

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی - ادبی - معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۸ | فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۴۲ء | نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱	ملاحظات	ادارہ	۶
۲	اخبار و افکار	ادارہ	۷
	علمی و ادبی مقالات		
۳	حقائق و معارف	مولٰنا ابوالکلام آزاد	۱۰
۴	مسلمان حکمرانوں کا محکمہ اطلاعات	جناب عبدالقیوم ندوی	۱۹
۵	سلطان واجد علی شاہ	جناب نور احمد فریدی	۳۱
۶	قزلباش خاں اُمید	میرزا محمد بشیر ایم - اے	۵۰
	افسانے		
۷	وہ بلیک آؤٹ والی رات	جناب شوکت صدیقی	۱۴
۸	چور	جناب جمیل احمد کندنا پوری ایم اے	۲۲
۹	مرجھایا ہوا پھول	جناب طفیل ملک	۴۳
۱۰	عید کا چاند	جناب مسیح الزماں جائسی	۵۵
۱۱	چھٹ کی راکھ	جناب محمد ناظر انصاری	۶۰
۱۲	رقاصہ کی محبت	محترمہ آنسہ ہاجرہ مسرور	۶۶
۱۳	رباب کا آخری تار	جناب شیدا کیورجی	۷۱

منظومات

نمبر شمار	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱۴	صدر بزم قدس	حضرت اظہر امرتسری	۸
۱۵	نماز عید اور محاسبہ ضمیر	حضرت سیماب اکبرآبادی	۹
۱۶	متفرق اشعار	جناب اسعد سدیدی	۱۳
۱۷	حسن تخیل	جناب عشرت لکھنوی	۱۷
۱۸	مجھے تو فریب فسانہ دے	حضرت علی اختر حیدرآبادی	۱۸
۱۹	لمعات	جناب نیر امرتسری	۲۱
۲۰	عید کا چاند	جناب سرورش ملیح آبادی	۲۸
۲۱	عرفانیات	حضرت محوی صدیقی	۲۹
۲۲	غزل	کلانجوی ایم - اے	۴۰
۲۳	لیلۃ القدر	جناب مقبول حسین احمد پوری	۴۱
۲۴	کمال عشق	حضرت ہادی مچھلی شہری	۴۹
۲۵	نور قسمر	حضرت قمر سہسوانی	۵۹
۲۶	دیکھ !	جناب علی احمد	۶۴
۲۷	قطعات	حضرت عاصم جے پوری	۶۵
۲۸	خراب محبت	حضرت خمار بارہ بنکی	۶۸
۲۹	عہد آزادی	جناب غبار بارہ بنکی	۷۴

[illegible] لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا

ملاحظات

خاص نمبر ۱۹۴۳ء کے لئے جو مضامین نظم و نثر اس وقت تک دفتر میں موصول ہو چکے ہیں ان پر نظر ڈالنے کے بعد ہم قارئین کو یقین دلا سکتے ہیں کہ کہ عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۴۳ء نہ صرف ترقی یافتہ ادب کا بہترین نمونہ ہوگا بلکہ علمی و تحقیقی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کا پایہ بہت بلند ہوگا۔ خاص نمبر کے مضامین کی ایک جھلک آئندہ اشاعت میں ہدیہ قارئین ہوگی جن حضرات نے ابھی تک اپنے رشحات گرامی ارسال نہیں فرمائے وہ ۲۰ / اکتوبر ۱۹۴۲ء تک ضرور توجہ فرمائیں ورنہ خاص نمبر میں شامل نہ ہو سکیں گے

زیر نظر شمارہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بلند پایہ مقالہ درج کیا جا رہا ہے۔ امید ہے قارئین اس علمی و تحقیقی شراب سے بہت زیادہ محظوظ ہو سکیں گے۔ مولوی نور احمد خاں نے عالمگیر کی گزشتہ اشاعت میں سلطان واجد علی شاہ کے حالات زندگی کا مختصر طور پر جائزہ لیا تھا۔ اس مرتبہ مولوی صاحب نے ان تمام بیہودہ الزامات کی تردید کی ہے جو عام طور پر تاجدار لکھنؤ کی ذات سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے بعض قارئین کو مولوی صاحب کے استدلال میں مبالغے کا عنصر دکھائی دے لیکن اس مضمون کے مطالعے کے بعد کم سے کم یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ کی موجودہ کتابوں میں سلطان واجد علی شاہ سے یقیناً بے انصافی کی گئی ہے۔ مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی نے مسلمان حکمرانوں کے محکمہ اطلاعات پر معلومات افزا روشنی ڈالی ہے امید ہے یہ مضمون موجودہ جنگ کے زمانے میں خاص دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

افسانوں کا حصہ بھی حسب معمول کامیاب ہے۔ طفیل ملک کے افسانے ہر حلقے میں مقبول ہو رہے ہیں۔ "مرجھایا ہوا پھول" ملک صاحب کا ایک دلگداز افسانہ ہے جس میں ایک ایسی حسینہ کے احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے جس کا شوہر عیاشی و تماشی کی جانب مائل تھا یہ افسانہ ہر وجہ کامیاب ہے۔ جمیل احمد کندھا پوری نے بنگال کی مشہور افسانہ نویس خاتون سیتا دیوی کے ایک معاشرتی شاہکار کو اردو کا لباس پہنایا ہے اس افسانہ میں ہندوستانی معاشرت کے ایک گھناؤنے پہلو کو بے نقاب

زیر نظر اشاعت

از ــــ ادارہ

کیا گیا ہے۔ شیدا آکیوڑدی، شوکت لکھنوی اور آنسہ ہاجرہ کے افسانے بھی اپنے اپنے انداز میں خوب ہیں۔

زیر نظر اشاعت کا حصہ نظم علی الخصوص بلند پایہ ہے حضرت سیماب اکبر آبادی، حضرت محوی صدیقی، حضرت علی اختر حیدر آبادی، حضرت اظہر امرتسری اور حضرت عاصم جے پوری، غبار بارہ بنکوی، خمار بارہ بنکوی کا تازہ کلام تعریف و تعارف سے بے نیاز ہے اور ان کے لئے کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے۔

ادارہ

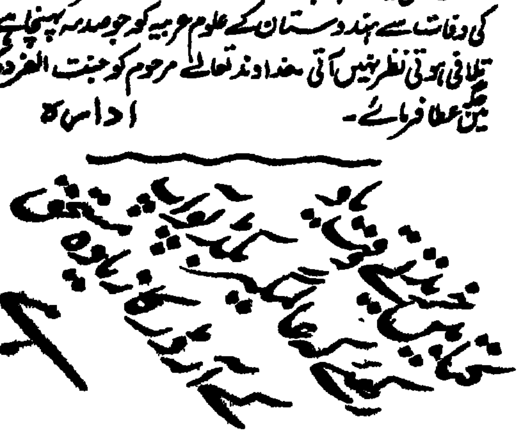
بقیہ صفحہ ۷

اور شہر شہر کی سیاحت کرنے لگے۔

عمر کے آخری حصے میں ان کا علمی شغل قلمی کتابوں کی تلاش و جستجو کے سوا کچھ نہ تھا۔ آخر علی گڑھ میں قیام پذیر ہوئے یہاں مرض استسقاء نے ان کے علمی مشاغل کا سلسلہ توڑ دیا۔ بالآخر اسی مرض کے باعث آپ ۷ / اگست کو عازم فردوس ہوئے

مرحوم کی طبیعت چونکہ ضرورت سے زیادہ بیقرار تھی اس لئے ان کے چشمۂ فیضان سے کوئی بھی ادارہ اچھی طرح سیراب نہ ہو سکا نہ کوئی علمی یادگار ہی چھوڑنے کے قابل ہو سکے۔ بہر حال مولانا سورتی کی وفات سے ہندوستان کے علوم عربیہ کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی ہوتی نظر نہیں آتی خداوند تعالے مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

ادارہ



اخبار و افکار

لت آصفیہ کا ذریعہ تعلیم

دکنی سیاسیات میں جب سے مہا سبھائی تعصب کے جراثیم داخل
ہیں اس ملک کو علمی عوارض کا بھی سامنا ہو رہا ہے چنانچہ ہندوؤں
طبقے نے شور مچا رکھا ہے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینا درست
شیر دکن" لکھتا ہے کہ غیر زبان کا واسطہ تعلیمی ترقی کے رستے
سخت رکاوٹ ہے اسی اصول کے مدنظر ہماری ریاست ابد مدت
یک ملکی زبان اردو کو واسطہ تعلیم قرار دیا گیا ہے مگر اس زریں
کا استفادہ صرف ان طبقات رعایا کو مل رہا ہے جن کی مادری زبان
ہے باقی لوگوں کو جن کی مادری زبان ملک کی کوئی زبان تلنگی
یا کنڑی ہے ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد کسی غیر زبان کے واسطہ
تعلیم پانے کی مجبوری ہو رہی ہے۔ یہ ہیں "شیر دکن" کے خیالات لیکن ان
ت کے پردے میں مہا سبھائی تعصب کا ایک ہنگامہ پوشیدہ ہے
نظام کی ہندو نوازانہ روایات پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے لیکن جس
دروغگو کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اسی طرح غلط مطالبہ کی بنیاد بھی کمزور
ال ہی پر رکھی جاتی ہے۔ چنانچہ "شیر دکن" اردو ذریعہ تعلیم کی
ت میں سب سے بڑی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان
تلنگی اور کنڑی ہے وہ ثانوی مدارج میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے
حیثیت ہی نہیں رکھتے یا انھیں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اس میں
نہیں کہ مادری زبان دوسری زبانوں کی بہ نسبت تعلیم کے لئے آسان
ذریعہ ہو سکتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت قلمرو کے آصفیہ میں
کم اکیس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر آج "شیر دکن" ذریعہ تعلیم بنانے
تین زبانوں کو پیش کرتا ہے تو کل باقی اٹھارہ زبانیں جاننے والی
الشن جماعتیں بھی انھیں کی اور ان میں سے ہر جماعت یہی مطالبہ
ہماری مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے اس کے بعد
گا؟ حکومت کو سارا نظام تعلیم بدلنا پڑیگا کیونکہ ہر جماعت کے
مطالبہ کے مطابق اس کی زبان جاننے والے مدرسین اور ممتحنین
کرنا ضروری ہوگا۔ اس کام کے ملنے تک کم از کم پچاس برس کی
ضرورت ہوگی تو کیا اتنے عرصے میں دکن کی تعلیمی مشینری بالکل یونہی کھڑی
رہیگی؟ اس مطالبہ کے یہ معنی ہیں کہ شیر دکن کو اکسانے والے لوگ
اپنے ملک کے نظام تعلیم کا شیرازہ پریشان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ تجربات سے
ثابت ہو چکا ہے کہ صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو تمام دکنیوں کے لئے
تعلیم کا بہترین ذریعہ ہو سکتی ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے تجربات نے اس قیاس
کو اور بھی قابل اعتماد بنا دیا ہے اور اس یونیورسٹی نے اپنی تعلیمی قوت سے اردو
کا علمی و ادبی اثر دکن کے تمام فرقوں، جماعتوں اور باشندوں تک پہنچا دیا ہے
اگر آج اردو سے چشم پوشی کی جائے تو ان تمام مساعی اور سرمائے کا معاوضہ کیا
ہوگا؟ جن سے جامعہ عثمانیہ کو ترقی نصیب ہوئی۔ لہذا علمی و تعلیمی اشتراک
و اتحاد کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ دکن میں اردو ہی کو بدستور ذریعہ تعلیم قرار
دیا جائے اس کے سوا اگر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا تو کامیابی کی توقعات
کے مقابلہ میں ناکامی کے امکانات زیادہ روشن ہونگے۔

مولانا محمد سورتی

۷ اگست کی شام کو مولانا محمد سورتی اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے مولانا
عربی علوم و ادبیات پر اتنی مہارت رکھتے تھے کہ اس دور میں ان کی نظیر مشکل ہے چنانچہ سید
سلیمان ندوی لکھتے ہیں "مرحوم کا پایہ علم ادب اور رجال و انساب وغیرہ میں اتنا اونچا تھا
کہ اس عہد میں اس کی نظیر مشکل تھی جو کتاب دیکھتے تھے وہ ان کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی
سیکڑوں نادر عربی قصاید، ہزاروں عربی اشعار اور لغات و انساب نوک زبان تھے
ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علما، ادبا اور محدثین کی وسعت
حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں وہ یقیناً صحیح ہیں۔"
مرحوم کے علمی پایہ کی وضاحت کے لئے یہ سطور کافی ہیں لیکن ان کا ادبی درجہ اس سے بھی
زیادہ بلند ہے بلکہ ادبیت ان کے مشاغل تدریس پر اس درجہ غالب تھی کہ جامعہ
ملیہ کی پروفیسری کے زمانہ میں جب طلبہ کو درس حدیث دینے لگتے تو اس وقت
اگر کوئی شعر یاد آجاتا تو اصل درس کو وہیں چھوڑ دیتے اور اپنا وقت تشریح
شعر ہی کی نذر کر دیتے مرحوم کو صحاح ستہ کے اکثر حصے یاد تھے اور احادیث پر
جتنی کتابیں آج تک شائع ہو چکی ہیں ان کے افادی حصے بھی از بر تھے باایں ہمہ
مرحوم کی طبیعت میں آزادگی و وارفتگی ضرورت سے زیادہ تھی کسی ایک جگہ
استقلال سے نہیں رہے کسی زمانہ میں متعلقین ندوہ سے وابستہ رہے
پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں آئے اس کے بعد جامعہ ملیہ میں علم حدیث کی حیثیت
سے کام کرتے رہے پھر جامعہ رحمانیہ بنارس میں گئے لیکن یہاں بھی زیادہ دن
نہ رہ سکے چنانچہ بمبئی چلے گئے اور ایک مدرسہ میں درس حدیث دیتے
رہے یہاں بھی مرحوم کی آزادہ روی بر روئے کار آئے بغیر نہ رہی

(باقی ملاحظات کے بعد دیکھئے)

صدرِ بزمِ قدس

حلقہ ترے رکاب کا حلقۂ چشمِ ماہتاب

غلام غلامانِ مصطفوی اظہر امرتسری

واقفِ رازِ ہست و بود عالمِ حکمت و کتاب — رحمتیں تیری بےشمار برکتیں تیری بےحساب

تیری گلی کی خاکِ پاک سُرمۂ دیدۂ قمر — تیرے حریم کا غبار غازۂ روئے آفتاب

تیرے سکوت میں نہاں نغمۂ ربطِ جہاد — تیرے کلام سے عیاں جوشش و خروشِ انقلاب

تیرے جمال سے عیاں جلوۂ گلشنِ بہشت — تیرے جلال میں نہاں نارِ سعیر کا عذاب

زین ترے براق کی کرسئ صدرِ بزمِ قدس — حلقہ ترے رکاب کا حلقۂ چشمِ ماہتاب

خشک عرب کی خاک پر رنگِ بہار آگیا — جھوم کے جب برس پڑا تیرے فیوض کا سحاب

توسنِ گردشِ فلک پر ہے اسی کا اختیار — جس نے رہِ نیاز میں چوم لیا ترا رکاب

رہزنوں کو بنا دیا چشم زدن میں رہنما — آگ کدوں میں پھونک دی تیرے کرم نے روحِ آب

دور ہوا فنا کا خوف ہستئ بے ثبات سے
بزمِ حیات ہو گئی مستِ مئے حیات سے

نمازِ عید اور محاسبۂ ضمیر

نظم

از حضرت مولٰنا سیماب اکبرآبادی

دخیلِ کعبۂ دل شورشِ فتن تو نہیں؟
ترے خیال کی خلوت میں انجمن تو نہیں؟

تو عیدگاہ میں آیا ہے کیا بطورِ رواج؟
اسیرِ رسم و روایت ترا چلن تو نہیں؟

تری نگاہ کی نازش نمازِ عید کے وقت
کلاہ و جبّہ و دستار و پیرہن تو نہیں؟

یہ دیکھ لے ترے سر میں دمِ قعود و قیام
غرورِ طاعت و پندارِ ما و من تو نہیں؟

کرے جو سجدہ تو پہلے یہ غور بھی کر لے
جبینِ صاف پہ اندیشۂ شکن تو نہیں؟

ترا حریم حقیقت سے دور تو نہیں سر؟
ترے سجود کا مرکز بتِ وطن تو نہیں؟

نشاطِ نفس کی [illegible] تو نہیں ہے نماز
نظر میں شام و شبِ عید کی پھبن تو نہیں؟

براہِ راست جدا [illegible] خدا سے قطعِ نظر
کسی حسیں کا تصور میں بانکپن تو نہیں؟

نمو [illegible] ریا تو نہیں [illegible] ہے؟
ترا [illegible] ستارِ اہرمن تو نہیں؟

زبان [illegible] ہے عادتاً مصروف
خمار [illegible] ولذّتِ دہن تو نہیں؟

حریمِ قدس میں خوف نگاہ دل کے سوا
خیالِ سیر و سرِ جلوۂ چمن تو نہیں؟

جہاں ہے عظمت و خوفِ خدا ترے دل میں
وہیں محبتِ فرزند و خت و زن تو نہیں؟

ضمیر و ذہن میں تیرے خدا کی یاد کے ساتھ
فریب و ناز و مباہات و مکر و فن تو نہیں؟

یہ زینت اور تکلف یہ غیر معمولی
رہینِ منتِ راہن ترا بدن تو نہیں؟

ادھار تو نہیں لایا ہے چار جامۂ عید؟
ادائے قرض کی دل میں ترے گھٹن تو نہیں؟

جوانِ قلعہ شکن ہے۔ مگر کر اندازہ
کہ تیرے خون میں گرمی سہی، جلن تو نہیں؟

تو جس میں بھر کے "زکوٰۃ حیات" لایا ہے
یہ زندہ لاشۂ مزدور کا کفن تو نہیں؟

اگر نہیں ہے۔ تو ہے ہدیۂ نیاز قبول
یقین کر [illegible] تری عید کی نماز قبول

حقائق و معارف

بیت المقدس کا محاصرہ

از مولانا ابوالکلام آزاد

۷۰ ویں عیسوی سنہ کا آغاز تھا کہ روم سے جنگ آزماؤں اور ٹڈی دلوں کا ایک سیلاب عظیم شام کی طرف امنڈا اور شہنشاہ طیطس نے بنی اسرائیل کی ہزارہا سالہ عظمت و جبروت کے مسکن حضرت داؤد کے عظیم الشان ہیکل اور تخت گاہ سلیمان پر نوحہ گستی کر دی۔ اسرائیل کے گھرانے کی یہ وہ آخری بربادی تھی جس کی یسعیاہ نبی نے خبر دی تھی اور نسل اسحٰق کی بداعمالیوں کی وہ سب سے آخری سزا تھی جس پر حزقیل نبی نے ماتم کیا تھا۔ اور خداوند خدا نے کہا تھا کہ اے اسرائیل کی بدکار عورت! تو نے مجھے چھوڑ دیا پس میں غیر قوموں کو بھیجوں گا جو تیری عظمت و ناموس کو ناپاک کر دینگے۔

رومی فوج کشی وہ آخری عذاب الٰہی تھا جس کے بعد جلال خداوندی نے ہمیشہ کے لئے اولاد اسرائیل سے اپنا رشتہ کاٹ لیا اور سعیر کی روشنی نے فاران کی چوٹیوں کو اپنا مطلع و مبدأ بنایا۔

رومی فوج نے شہر کے قریب پہنچکر اپنا قاصد بھیجا اور باشندگان شہر سے کہا کہ شہر حوالے کر دیں مگر وہ بیت المقدس کے مستحکم حصار اور آہنی عمارات جنگ کی طرف سے مطمئن تھے انھوں نے تسلیم شہر سے (عربی میں حوالگی کے معنوں میں "تسلیم" کہتے ہیں اور اس کو اردو میں رائج ہونا چاہئے) انکار کر دیا۔ اب رومی فوج کے لئے محاصرہ ناگزیر تھا تیس ہزار آہن پوش فوج نے چاروں طرف سے شہر کو محاصرہ کر لیا۔ بیت المقدس اس وقت نہایت محفوظ تھا۔ یکے بعد دیگرے تین نہایت مستحکم شہر پناہیں تھیں اور ان کے باہمی فاصلے مدافعت کے آلات و اسباب جنگ کے لئے نہایت مضبوط عمارتیں رکھتی تھیں طیطس نے اپنی فوج کے چار حصے کر دیئے تین حصے شمالی جانب پر متعین کئے جو بیرونی شہر پناہ سے ایک میل کے فاصلے پر جم گئے اور باقی ایک حصہ جانب مشرق مقرر کیا جو مشہور مسیحی مقدس پہاڑ (کوہ زیتون) کے حوالی میں تھا۔

رومی فوج کے ساتھ اس زمانے کے ترقی یافتہ آلات جنگ بھی تھے علی الخصوص طویل و وزنی گرز۔ سنگ بار منجنیقیں۔ آتش فشاں پہیہ دار منارے اور قدیم زمانے کا وہ عجیب و غریب آلہ جنگ جس کے لئے عربی میں کبش کا لفظ مستعمل ہو گیا تھا۔

گرز قدیم قوموں کا سب سے بڑا آلہ جنگ تھا جس کو رستم و سہراب کے کاندھوں پر شاہنامے میں ہم نے ہمیشہ دیکھا ہے لیکن رومیوں کے پاس ایک خاص طرز کا گرز ہوتا تھا جس کو محاصرے میں استعمال کیا کرتے تھے یہ معمولی گرز سے بہت زیادہ لمبا اور اس کے ضرب کا لٹو بہت زیادہ وزنی ہوتا تھا اور شہر پناہ کی دیواروں اور قلعہ کے دروازے کے توڑنے میں کام آتا تھا۔

منجنیق ایک کثیر الاستعمال مشین تھی جس کے ذریعہ بڑے بڑے وزنی پتھر غنیم کے لشکر اور محصور شہر کے اندر پھینکے جاتے تھے۔ یہ میکانک کے یونانی اصل کا معرب ہے ورعلم الحیل (فن وضع آلات و مشینری) کی قدیم ترین ایجاد۔ عربوں نے بھی اپنی جنگوں میں اس سے کام لیا ہے۔ یہ گویا قدیم زمانے کی توپ تھی۔ پتھر کے بڑے بڑے گولے جب اس سے نکل کر اڑتے تھے تو ان کی ضرب دیواروں اور قلعوں پر نہایت سنگین پڑتی تھی۔

آتش فشاں منارے [illegible] جاتے تھے اس کے نیچے پہیے لگے ہوتے تھے تاکہ گاڑی کی طرح نقل و حرکت ممکن ہو۔ اس کی کئی منزلیں ہوتی تھیں اس میں بیٹھ کر حملہ آور محصورین کی طرف تیزی سے بڑھتے تھے اور ان کے برجوں سے آتشیں روغن کو شہر کی دیواروں اور عمارتوں پر پھینکتے تھے۔

کبش اس زمانے کا بہترین ہتھیار تھا کچھ آدمی گاڑی کو کھینچتے تھے اور کچھ حفاظت کرتے تھے۔ یہ گاڑی شہر پناہ سے بھڑا دی جاتی تھی اور اندر کی فوج محصورین کی تیر اندازی سے محفوظ رہ کر دیواروں میں نقب لگا دیتی تھی۔

عربوں نے اس کو کبش اس لئے کہا کہ اس کے سامنے کے رخ پر ایک مینڈھے کا مصنوعی سر بنا کر لگا دیا جاتا تھا۔

شہر کی بیرونی شہر پناہ اور رومی لشکر کے شمالی حصے کے مابین جو آباد قطعے تھے وہاں کے تمام درخت اکھڑوا ڈالے گئے تھے تاکہ فوجی نقل و حرکت میں مانع نہ ہوں۔

اطراف شہر کی سرسبزی کا اس وقت یہ حال تھا کہ یہ تمام قطعات طرح طرح کے شاداب درختوں کی کثرت سے ایک جنت ارضی کا منظر معلوم ہوتے تھے اور اس کثرت کے ساتھ تھے کہ صرف ان کی جڑوں کے کھودنے اور اکھاڑنے میں کامل ۴ دن رومی فوج نے صرف کئے۔ یہ شام کی سرزمین تھی جس کی نسبت قرآن کریم نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا۔ "بارکنا حولہ" ہم نے بیت المقدس کے اطراف کو اپنی برکات سے مالامال کر دیا تھا۔

اس کے بعد فوج شمال کی جانب بڑھی اور ایک ایسے مقام پر خیمہ زن ہو گئی جہاں سے بیرونی حصار شہر کا ایک گوشہ نظر آتا تھا۔ یہاں محاصرین نے چند برج تعمیر کئے اور ان میں بیٹھ کر بیت المقدس پر سنگی گولے برسانا شروع کر دیئے۔

یہ وہی بیت المقدس تھا جس کو خدائے ذوالجلال نے اپنی رحمت و برکت کا نشیمن بنایا تھا۔ ابراہیمؑ کے گھرانے سے جو الٰہی وعدے ہوئے تھے ان کے ایفا کا گھر اسی میں تھا۔ بنی اسرائیل کے عظمت و جبروت کے سیلاب اسی کی شہر پناہ سے نکلتے تھے اور دنیا کی بڑی بڑی عظیم الشان سرزمینوں کو مع ان کے بسنے والوں کے بہالے جاتے تھے مگر انھوں نے اس عہد و پیمان کو توڑ دیا جو مصر کی غلامی سے نجات پانے کے بعد خداوند خدا نے قدوس سے سینا کے پہاڑ پر باندھا تھا جب وہ طرح طرح کی بد اعمالیوں اور فسق و فساد میں مبتلا ہو گئے تو رحمت الٰہی ان سے روٹھ گئی اور اس نے اپنی برکت کی جگہ اپنے قہر و غضب کو بھیج دیا۔ خدا کا اس دنیا میں سب سے بڑا قہر یہ ہے کہ وہ کسی قوم کی حکومت و فرمانروائی کی عزت چھین لے اور غیر قوموں کی غلامی و محکومی کی زنجیریں اس کے پاؤں میں ڈال دے۔ پس یہودیوں کے لئے بھی اب دنیا میں اس سزا کے سوا کچھ نہ تھا۔ بخت نصر کی فوج کشی اور بابل کی قید کے بعد عزیر کی آہ و زاری نے ان کی سزا کی مہلت بڑھا دی تھی پر انھوں نے اس فرصت سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اس لئے ضرور تھا کہ آخری غضب الٰہی کسی جابر قوم کے استیلا و تسلط کی صورت میں ظاہر ہو۔

اور وہ جب کبھی کسی قوم سے روٹھتا ہے تو اس کی عادت ہے کہ اپنی کسی جابر مخلوق کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ پھر وہ اس کے تخت حکومت کو الٹ دیتی ہے۔ غلامی و محکومی کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں ڈال دیتی ہے اور عزت ملی اور شرافت قومی کی روح اس کے اندر سے کھینچ لیتی ہے۔

رومیوں کا یہ حملہ یہودیوں کے لئے اسی سلسلہ غضب الٰہی کی آخری سزا تھی جس کے بعد بنی اسرائیل کی عظمت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ بخت نصر اور بابلیوں کا ورود پہلا عذاب تھا اور یہ آخری، انہی دو عذابوں کی طرف قرآن کریم نے یہ اشارہ کیا ہے۔

"اور ہم نے بنی اسرائیل سے ... کتاب توراۃ میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم ضرور ... تین پر ... میں مبتلا ہو گے اور اپنی بداعمالیوں میں مغرور ہو کے نہایت سخت زیادتیاں کرو گے۔ تو اے بنی اسرائیل کے لوگو جب تم میں ظہور فساد دو عدوان کا پہلا وقت آیا تو ہم نے تمہارے مقابلے میں بابل کے ان لوگوں کو بھیجا جو نہایت جابر اور سخت ... تھے۔ وہ تمہاری بستیوں کے اندر پھیل گئے۔ اور وہ سب کچھ کیا جو ان کو کرنا تھا اور اللہ کے وعدے کو پورا ہونا تھا اور وہ پورا ہو کر رہا۔"

یہ قوموں کے اعمال کے قدرتی نتائج ہیں جس بیت المقدس پر ملائکہ الٰہی رحمت و برکت ... اترتے تھے آج حملہ آوروں کے برجوں سے اس پر پتھروں کے گولوں کی بارش ہو رہی ہے۔

عروج و زوال امم کا یہ قانون الٰہی ہے۔ اور اے کاش کہ آج وہ پیروان اسلام جن کو خدا نے بنی اسرائیل کی اس عظمت و جبروت کا جانشین بنایا تھا اور جو اس خلافت ارضی کے وارث ہوئے تھے جس کی اہلیت داؤد اور سلیمان کی نسل میں باقی نہیں رہی تھی تاریخ کے ان نتائج قریبہ سے عبرت پکڑیں اور آنے والے وقت سے ڈریں۔

"اسی طرح اللہ گذشتہ قوموں اور ملکوں کی مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ شاید غافل قومیں عبرت پکڑیں"

یہودیوں کی حالت اس وقت نہایت افسوسناک تھی۔ بابل کی قید اور عرصہ کی غلامی نے پھر اسی سیرۃ ادنیٰ پر پہنچا دیا تھا جس سے دریائے نیل کے کنارے حضرت موسیٰ نے انھیں نجات دلائی تھی۔

تاہم انھوں نے اس موقع پر اپنے تمام قویٰ کو جمع کیا اور پوری جانبازی سے مدافعت کا سامان کرنے لگے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ رومیوں کے سے آلات جنگ اور اسلحہ ہلاکت ان کے پاس نہ تھے اور سنگ باری کے برجوں، عظیم الشان کبشوں اور آتشیں روغن کی بارش کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے۔

پھر ممکن تھا کہ وہ اس کا جواب دے سکتے مگر قدرت الٰہی کے بھیجے ہوئے عذاب یا اپنے اعمال بد کے قدرتی نتائج کا ان کے پاس کیا جواب تھا۔

"پس عذاب الٰہی نے انھیں جا پکڑا اور وہ اپنے ظلموں کی وجہ سے

اسی کے مستحق تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصے کے بعد بیرون شہر کی سرحد محاصرین نے فتح کرلی اب رومیوں نے زیادہ شدت اور مستعدی سے قدم آگے بڑھائے اور کوہ زیتون کی مشرقی فوج نے اپنی منجنیقوں کا رخ مقدس ہیکل کی طرف کردیا۔ ساتھ ہی مشتعل روغن کی بارش بھی شروع کردی۔ یہودی اب بہت مضطرب ہوئے کیونکہ منجنیقوں کے گولے اور مشتعل روغن کی پچکاریاں ہیکل کی دیواروں تک پہنچنے لگیں۔ بعض پرانی جنگوں میں انھیں چند منجنیقیں مل گئی تھیں وہ نکالی گئیں اور محصورین کی طرف سے بھی گولہ باری کا جواب دیا جانے لگا۔ لیکن ابھی اس انتظام کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک اس سے بھی بڑھ کر مصیبت کی خبر ملی یعنی لوگوں نے دیکھا کہ شمالی شہر پناہ کے اندر جا بجا سوراخ ہو گئے ہیں۔ اس خبر کے پھیلتے ہی محصورین کے دل بیٹھ گئے۔ ہمتوں نے جواب دیا۔ بالآخر مایوس ہوکر پیچھے ہٹ آئے اور اس طرح شہر کی پہلی شہر پناہ پر رومی قبضہ ہوگیا۔

اب دوسری شہر پناہ کے محاصرے کے لئے برج تیار ہونے لگے۔ اس عرصہ میں رومیوں نے بارہا باشندوں سے تسلیم شہر کی درخواست کی سمجھایا کہ اس طرح ان کی جانیں تہ تیغ ہونے سے بچ جائینگی۔ مگر یہودی قید بابل کا تجربہ کرچکے تھے انھوں نے ہر مرتبہ اطاعت سے انکار کیا، اور بدستور محصور رہے۔

اسلحہ کے باب میں یہودی رومیوں سے بہت کمزور تھے اس لئے رودررو مقابلہ ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ ایک شہر پناہ مسخر ہوچکی تھی اور اس سے قوم کی اخلاقی حالت میں بھی فرق عظیم پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے یہودیوں نے اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ کمزور مگر باتدبیر اقوام کے مشہور ہتھیار حیلہ طرازی سے کام لیا جائے۔

چنانچہ انھوں نے شہر پناہ کے اندر سے ایک عمیق سرنگ رومی لشکر گاہ تک کھودی اور اس کا نتیجہ معاً ظاہر ہوگیا یعنی زمین کے مجوف ہوجانے کی وجہ سے لشکر گاہ کے تمام برج دفعتہً بیٹھ گئے۔ رومیوں کو واقعی اس سے سخت نقصان پہنچا۔ اور کئی دن کی متصل محنت کے بعد پھر دوبارہ برج تعمیر کئے گئے۔ تاہم جس ساز و سامان کے ساتھ وہ آئے تھے۔ اس پر ان نقصانات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا فوج بدستور محاصرہ کئے پڑی رہی۔

دوسری شہر پناہ بھی یہودیوں کو چھوڑ دینی پڑی اور رومانی فوج کا تمانہ اس پر بھی قابض ہوگئی۔ اب یہودی تیسری شہر پناہ میں محصور تھے اور یہ حفاظت کا آخری نشیمن تھا۔ کیونکہ اس کے بعد چوتھی

شہرپناہ تھی۔ اسی کے اندر ہیکل اعظم اور تمام مقامات مقدسہ تھے اور اس کے مفتوح ہوجانے کے بعد بچنا دشوار تھا۔

انھوں نے ایکے پھر سرنگیں کھودیں اور اس محنت و جانفشانی کے ساتھ کہ چند دنوں کے بعد ہی تمام زمین کھوکھلی کردی اور رومی برجیاں اور عمارات محاصرہ پہلی مرتبہ سے زیادہ نقصان دہ طریقے پر منہدم ہوگئے اس سے رومیوں کا غیظ و غضب اور مشتعل ہوگیا اور جوش انتقام نے مجنون کردیا۔ انھوں نے اپنی عظیم الشان منجنیقیں اور بڑے بڑے کبش لے کر آخری حملہ کردیا۔ وہ برابر ہلاکت اور بربادی پھیلاتے ہوئے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ آخری شہرپناہ میں بھی شگاف پڑگئے۔

اس سے بھی بڑھکر مصیبت عظمیٰ یہ تھی کہ مشتعل روغن کی بارش نے مقدس ہیکل کی دیواروں تک پہنچنا شروع کردیا تھا۔ بدبخت یہودیوں نے ہرچند کوشش کی مگر اپنی ہزار سالہ عظمت کے گھر کو نہ بچا سکے۔ اصل یہ ہے کہ اب اسرائیل و اسحٰق کا خدا بھی اُسے نہیں بچانا چاہتا تھا۔ اس کا بڑا حصہ آتشزدگی سے برباد ہوگیا اور گنبدوں اور میناروں میں سنگی گولوں سے سوراخ پڑگئے۔ جو قبل نبی نے کہا تھا "میں ہیکل کے گنبدوں پر غیر قوموں کے لگائے ہوئے دھبے دیکھ رہا ہوں۔ بالآخر اس بدبخت اور خدا کی مغضوب قوم کی آخری سزا کی تکمیل ہوگئی اور عروج و زوال امم کے قانون الٰہی کے نفاذ کو کوئی انسانی سعی نہ روک سکی۔ رومیوں کے برجوں کی گولہ باری کا اب جواب ناممکن تھا۔

ایک دن صبح کو یہودیوں نے دیکھا کہ رومی لشکر عظیم قتل و غارت اور نہب و سلب کے ہتھیار ہاتھوں میں لئے آخری شہرپناہ سے اندر داخل ہورہا ہے۔

"پس وہ بستیوں اور آبادیوں میں پھیل گئے اور اللہ کے وعدے کو پورا ہونا تھا اور پورا ہوکر رہا۔"

پھر وہ سب کچھ ہوا جو اس کے بعد ہونا تھا۔ اس قتل و غارت کا کون اندازہ کرسکتا ہے جو کئی دن تک اس مقدس شہر میں جاری رہا عورتوں اور بچوں تک کو خونخوار فاتحوں کی تلوار سے امان نہ تھی۔ عمارتیں جل رہی تھیں اور دیواریں زمین کے برابر ہوگئی تھیں جو بچ رہے تھے وہ قیدی بنالئے گئے تھے۔ اور جو بھاگ گئے انھوں نے پھر بنی اسرائیل کے ہزار ہا سالہ گھرانے کی نسبت کوئی اچھی خبر نہ سُنی۔

"پھر انسانوں کی کتنی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک و برباد کردیا کیونکہ وہ نافرمان تھیں اور انھوں نے احکام الٰہی سے سرتابی کی تھی۔ پس وہ اس طرح اُجڑ گئیں کہ ان کی بڑی بڑی دیواروں والی عمارتیں اپنی چھتوں پر گر پڑیں۔ ان کے لبریز کنوئیں بیکار و معطل ہوگئے اور پکی اینٹوں کے بنائے ہوئے عظیم الشان محل ویران نظر آنے لگے پھر کیا دنیا کے غافل انسانوں نے زمین پر سیر و سیاحت نہیں کی ہے؟ اور گذشتہ قوموں اور ملکوں کے ان انقلابات کو نہیں دیکھا ہے؟ اگر نظر عبرت سے دیکھتے اور ان کے پاس دل ہوتے جو انجام کار کو سمجھتے اور کان ہوتے جو صدائے الٰہی کو سنتے اصل یہ ہے کہ جب کسی قوم کے بُرے دن آتے ہیں تو لوگوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہوجاتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو ان کے سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں"

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسیں — تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا (جمیل)

اے صرصرِ حوادث برباد کر نہ دینا — کچھ پھول ہم لئے ہیں دامانِ آرزو میں (محوی)

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر — ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر (سیماب)

ماہر وہ آشنائے غم و درد ہی نہیں — تم اُن سے کس اُمید پہ کرتے ہو التماس (ماہر القادری)

دہر میں کام کر نیا سازِ عمل بجا ذرا — عہد کہن بدل گیا مشقِ تصورات سے (درد کاکوروی)

(منتخبہ م۔ع۔ اسعد سعیدی)

وہ بلیک آؤٹ والی رات

افسانہ

از جناب شوکت صدیقی لکھنوی

آخر جھجکتے ہوئے لرزتا ہوا میں سیڑھیوں پر چڑھا اور دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ فضا خموشیوں میں الجھ کر مردہ ہو گئی تھی غضب کی اندھیری رات تھی۔ آج شہر میں بلیک آؤٹ تھا۔ کالی کلوٹی سڑک کے سینے پر کنارے لگی ہوئی بجلی کے قمقموں کے جھکے ہوئے دھندلے عکس بکھرے ہوئے تھے۔ میں دم سادھے دہلیز پر کھڑا تھا۔ لرزتی ہوئی انگلیاں دروازے پر جمی تھیں لیکن اسے اندر کی جانب دھکیلنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

آج نیلما نے مجھے بلایا تھا۔ اس کے پتا شب کی ٹرین سے بنارس گئے ہوئے تھے۔ گھر پر اس کے علاوہ اور موجود ہی کون تھا؟ لے دے کے ایک بوڑھا ملازم دمے کا پرانا مریض، اتنی رات گئے تو وہ کب کا سونے کے لئے جا چکا ہوگا۔ یہ سب کچھ سہی لیکن پرائے مکان میں اس طرح جانا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ پھر اس سے ملنا بھی ضروری تھا اس نے بہت تاکید کے ساتھ لکھا تھا کہ اگر آج نہ آئے تو مجھے بہت دکھ ہوگا ایک خاص بات پر رائے لینی ہے۔ اور وہ خاص بات کیا تھی؟ یہ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پتا، اس کے بیاہ کی بات چیت کرنے ہی گئے ہیں اسی لئے میں بھی ملنے کے لئے بہت بیچین تھا۔

جسم میں سنسناہٹیں رینگ رہی تھیں اور دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ رگ رگ خوف سے پھڑکنے لگی۔ عجیب مشکل میں جان تھی، کم از کم میرے لئے تو بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ اتنے میں "حامد نواز" کا بوڑھا گھڑیال پھٹی پھٹی آواز سے گرجا۔ گیارہ بجے تھے۔ خاموشیاں چونکیں اور پھر وہی ماتمی سکوت ——!

اب مجھے اندر چلا جانا چاہیئے تھا۔ رات زیادہ آتی جا رہی تھی بس ایک دفعہ دروازہ دھکیل ہی تو دیا۔ خفیف سی چرچراہٹ پیدا ہوئی اور ساتھ ہی میں ڈگمگاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ پھر دروازہ بند کیا اور اندر کا جائزہ لینے لگا۔ ادھر کونے والا کمرہ ابھی تک روشن تھا زرد زرد روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اس وقت تک اس کے سوا وہاں کون ہو سکتا تھا؟

دبے دبے قدموں سے کمرے کے پاس پہنچا اور دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ میرا خیال ٹھیک نکلا۔ سامنے میز پر جھکی ہوئی وہ ایک کتاب کے مطالعہ میں غرق تھی۔ بکھری ہوئی زلفوں کے درمیان اس کا چہرہ ضوفشاں تھا۔ میں خواب کے سے عالم میں کھڑا گم سم ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

یکایک اندر داخل ہونے والا دروازہ شور کرتا ہوا کھلا۔ نیلما مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں دروازے کی آڑ میں اندھیرے میں دبک گیا۔ اس وقت کیا گذر رہی تھی یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ بس سانس روکے کھڑا تھا —— دم بخود!

باہر پھیلی ہوئی پھیکی پھیکی روشنی میں میں نے دیکھا داخل ہونے والے نیلما کے پتا تھے۔ ہاتھ میں چھوٹا سا ایک اٹیچی لٹک رہا تھا۔ شاید اسٹیشن سے آ رہے تھے۔ وہ سیدھے اسی کمرے میں آئے اور دروازے ہی پر سے پوچھا۔

"ارے نیلما تو اب تک سوئی نہیں؟" اور وہ یونہی دروازے کے بیچ میں کھڑے ہو گئے۔

"بس سونے ہی جا رہی تھی پتا جی!" میں نے دیکھا تو نہیں لیکن خوب یقین ہے غریب کا چہرہ پھیکا پڑ گیا ہوگا۔

"اتنا نہ پڑھا کرو۔ ورنہ تندرستی خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

"آج ذرا دیر ہو گئی۔" اور پھر نزدیک آ کر اس نے اٹیچی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "لیکن آپ واپس کیوں چلے آئے؟"

"کچھ پوچھو نا!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولے۔ "آج کل تو گاڑیوں میں اتنا "رش" رہتا ہے کہ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ مسافر ہے تو ایک دوسرے پر ٹوٹا پڑتا ہے۔ کون درگت بنوا آتا۔ کل ذرا جلد ہی اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔"

"اچھا کیا آپ نے۔"

وہ وہیں کھڑے تھے اور مجھے رہ رہ کر نیلما پر غصہ آ رہا تھا جو ان کو اس طرح باتوں میں لگائے ہوئے تھی۔ یہاں اس انتظار میں کہ ذرا وہ کھسکیں اور میں چلتا بنوں۔ آخر اسے کچھ خیال آ ہی گیا حالانکہ

اُسے کیا خبر کہ میں یہاں چوروں کی طرح چھپا کھڑا ہوں۔

"چلئے، اوپر چل کر کپڑے بدل لیجئے۔ باہر سنسناہٹ ہے یہاں آپ کو تو گرمی محسوس ہو رہی ہوگی"

"چلتا ہوں۔ ذرا نراین کو تو بلاؤ" اور پھر خود ہی پکارنے لگے "نرائن! — ارے او نرائن!"

پشت پر کھانسی کی آواز کھڑکھڑائی۔ "آیا بابو جی!" ایک بوڑھی آواز سنائی دی۔

ایک اور مشکل پیش آئی۔ بدن سُن ہونے لگا۔ لیکن میں آنے والی مصیبت کے لئے اتنی جلد تیار نہ تھا۔ پیچھے کا دروازہ کھلا اور اندر کی روشنیاں باہر پھوٹ پڑیں۔ اب میں بالکل صاف روشنی میں تھا — بوڑھے ملازم کے بالکل سامنے۔ بلا غور کئے میں تیزی سے لپکا اور جھٹ سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

بھاگتے ہوئے میں نے سُنا۔ نیلما کے پتا کہہ رہے تھے۔ "نرائن! ارے کیا ہوا؟ کون تھا — کون — ؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں اور بے تحاشا سامنے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ لیکن اس طرح ناک کی سیدھ میں بھاگتے رہنے سے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ تھوڑی دُور تک دوڑنے کے بعد مجھے خیال آیا۔ بس جھٹ سے ایک برابر والی گلی میں گھس گیا۔

یونہی تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ ٹھوکریں کھاتا۔ لڑکھڑاتا۔ اندھیرا غضب کا تھا ہی۔ پھر گھبراہٹ، عجیب دیوانگی کا عالم تھا اور دوڑتے دوڑتے یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے بہت بلندی پر سے اٹھا کر پٹک دیا۔ نہ معلوم کس چیز سے اس زور کی ٹکر ہوئی۔ سر چکرا گیا تھا۔ آنکھوں کے تلے اندھیرا آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑی مشکل سے سنبھل کر اٹھا۔ خیر ہوئی کہ کہیں چوٹ نہیں آئی۔ اب چلنے کی ہمت کہاں تھی۔ تھکان سے جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ سانس تھی کہ سینے میں سماتی ہی نہ تھی۔

سامنے ایک چھوٹے سے مکان کا دروازہ تھا۔ اندر جلتے ہوئے چراغ کی دُھندلی روشنی درزوں سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ اس پھیکی پھیکی شعاعوں میں میں نے پہچانا کہ پاس ہی کوئی کھڑا کپڑے جھاڑ رہا ہے۔ میری اسی سے ٹکر ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچتے ہوئے میں نے معذرت کی۔

"مجھے بڑا افسوس ہے!"

جواب تو کوئی نہ آیا البتہ چوڑیوں کی نرم نرم جھنکاریں بکھر گئیں

میں حیرت سے چونک پڑا۔ وہ کوئی عورت تھی۔ غور سے دیکھا تو خیال ٹھیک نکلا۔ نزدیک جا کر کہا۔

"کہیں چوٹ تو نہیں آئی آپ کے۔ میں بہت شرمندہ ہوں"

"جی نہیں" وہ آہستہ سے بولی۔ "لیکن گلیوں میں ذرا دیکھ کر بھاگا کیجئے" اور پھر مجھے سر سے پاؤں تک ناقدانہ نگاہ سے دیکھنے لگی۔ نہ جانے کیا اندازہ لگا رہی تھی۔

"کیا بتاؤں" میں نے جلدی سے بات بنا کر اسے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ "آج کئی کلاس فیلو مل گئے۔ بس اسی بات پر آمادہ تھے کہ آج میں ان کو سینما دکھاؤں۔ سکنڈ شو دیکھنے سے میں اس لئے گھبراتا ہوں کہ شب بیداری کا میری صحت پر بڑا بُرا اثر پڑتا ہے۔ تمام دن طبیعت سُست سُست سی رہتی ہے۔ پھر سچ پوچھئے تو میری جیب میں آج اتنے پیسے بھی نہ تھے"

وہ مسکرا دی۔ میرے اوسان ذرا قائم ہوئے۔ اسے کم از کم یہ تو اندازہ ہو گیا کہ میں کسی کالج کا سٹوڈنٹ ہوں کوئی چور بدمعاش نہیں۔

"بس اُنہی سے جان چھڑا کر بھاگا ہوں۔ میرا پیچھا بھی کیا تھا یہیں کہیں ڈھونڈتے نہ پھرتے ہوں" یہ کہتے کہتے میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ سچ مچ کہیں کوئی آ نہ جائے مگر وہاں الّو بولنے کی دیا تھی۔

وہ بولی۔ "تو یہ کہئے! میں سمجھی نہ معلوم کیا بات ہے۔ سچ پوچھئے تو میں گھبرا سی گئی تھی"

"لیکن اتنی رات گئے آپ تنہا کیسے؟" میں نے اِدھر اُدھر اچھی طرح دیکھ کر پوچھا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ بڑی خیر ہوئی ورنہ وہ درگت بنتی کہ سارا عشق نظر آ جاتا۔

"کچھ نہ پوچھئے۔ بڑی مصیبت میں ہوں"

"کیوں کیا ہُوا؟"

"بات یہ ہے کہ میں اپنے بھیّا کے ساتھ آئی ہوئی ہوں۔ ان کی بھیا سسرال ہے۔ آج ہم فرسٹ شو سینما دیکھنے گئے تھے۔ واپسی پر نہ معلوم وہ لوگ کدھر نکل گئے۔ میں اُن سے چھُٹ گئی۔ ابھی آئے ہوئے دس ہی تو دن ہوئے ہیں۔ محلے کا نام بھی تو نہیں معلوم۔ بس یونہی اندازے پر نہ معلوم کب سے بھٹک رہی ہوں"

"یہ تو بہت بُرا ہوا"

"بہت پریشان ہوں"

"آپ ٹھہری کس کے یہاں ہیں؟"

"بھیّا کے سسر کا نام درگا داس ایڈووکیٹ ہے"

"کہاں رہتے ہیں ؟"

ہنسکر جواب دیا۔ "اگر یہی معلوم ہوتا تو یوں مارے مارے کاہے کو پھرنا پڑتا۔"

مجھے اپنی حماقت پر خود بھی ہنسی آگئی۔ "میں بھول گیا۔ مکان کس قسم کا بنا ہوا ہے ——— کوئی خاص نام تو نہیں ؟ ——— شاید کچھ اندازہ لگا سکوں۔"

"بس اتنا جانتی ہوں۔ پیلے رنگ کی کوٹھی ہے۔"

باتوں باتوں میں میں بھول ہی گیا کہ میں ابھی تک خطرہ میں ہوں میرا یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن وہ بیچاری پریشاں حال لڑکی۔ اسے یوں چھوڑتے دکھ ہوتا تھا۔

"آپ کس طرف جائیں گی ؟"

"ادھر —— !" اس نے سامنے ہاتھ اٹھا دیا۔ "بس یونہی راستہ تو معلوم نہیں۔"

اور اسی طرف نیلما کا مکان تھا۔ بھلا میں کیسے ادھر جا سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "ادھر تو میں جا نہیں سکتا۔ آپ جانتی ہی ہیں، کوئی نکل گیا تو مصیبت ہی آجائیگی۔ اگر اس طرف سے چلیں۔" میں نے ایک قریب کی گلی کی طرف اشارہ کیا۔ "تو میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں گا۔ ادھر سے گھوم کر ایک لمبے چکر کے بعد ہم اسی سڑک پر آسکتے تھے۔"

اس نے ایکبار نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ کچھ کہنے سے پیشتر ہی میں جھٹ سے بول اٹھا۔

"ہم اسی سڑک پر پہنچ جائینگے۔"

"اچھی بات ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"آپ شرمندہ نہ کریں۔ بھلا کسی کی مصیبت میں اگر کوئی کام نہ آئے تو وہ انسان ہی کیا ہوا ؟"

ہم دونوں اسی طرف مڑ گئے۔ مجھے جلدی تھی۔ خطرے سے جلد از جلد دور ہونا تھا۔ اس لئے کسی قدر عجلت سے چل رہا تھا مجبوراً اسے بھی چلنا پڑا۔ لیکن وہ بہت دور تک ساتھ نہ دے سکی۔ تھکی ہوئی آواز سے کہنے لگی۔

"مجھ سے اتنا تیز نہیں چلا جاتا۔"

آخر مجھے ہی دھیما ہونا پڑا۔ رات تیزیادہ ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن وہ خاموش رہی۔ اتنی دیر ہو گئی تھی۔ اب تک کوئی آیا نہ تھا اس لئے مجھے اطمینان ہو چلا تھا۔

"یہاں آپ کی سسرال ہے ؟" جانتے بوجھتے میں نے شرارت سے پوچھا۔

"میری ؟" وہ حیرت سے بولی۔ "آپ بھول گئے نہیں میرے بھیا کی، میں تو ابھی پڑھ رہی ہوں۔" اس آخری جملے کا مطلب صاف تھا۔ گویا وہ ابھی تک ان بکھیڑوں سے آزاد تھی جیسا میں پہلے ہی قیاس لگا چکا تھا۔

"اوہ ! معاف کیجئے گا۔ میں اب تک یہی سمجھے بیٹھا تھا۔"

وہ صرف مسکرا دی۔

"کہاں پڑھتی ہیں آپ ؟" راستہ کاٹنے کے لئے کچھ تو بات چیت جاری رہنا چاہیئے تھی۔ پھر اس کے متعلق تو مجھے یوں بھی بہت کچھ جاننا تھا شاید پھر کبھی کوئی ملاقات کی صورت نکل آئے۔ خوبصورت لڑکی سے جان پہچان کوئی بری بات نہیں۔ یہ بھی قسمت کی بات ہے۔

"آگرہ میں ! تمام خاندان وہیں ہے۔"

"لکھنؤ پہلی بار آئی ہیں ؟"

"جی !" اور وہ ہنس دی۔ میٹھے میٹھے نغمے بکھر گئے۔

مجھے اپنے بے تکے سوال پر ندامت ہوئی۔ بھلا اگر اس سے قبل آچکی ہوتی تو یوں مکان کی تلاش میں سرگرداں کیوں ہونا پڑتا۔ لیکن مجھے تو گفتگو طویل کرنا تھی۔ پوچھنے سے پہلے غور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

"سنئے مسٹر . . ."

"ہرلش سنہا !" میں نے جملہ پورا کر دیا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ ؟" وہ مانوس ہوتی جا رہی تھی۔

"یہیں نزدیک ہی۔ کیننگ سٹریٹ پر۔" میں نے جواب دیا۔

"جی !" اور یہ کہتے کہتے وہ راستہ میں پڑے ہوئے کسی پتھر سے ٹکرا گئی اور لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ میں نے بڑھکر بازو تھام لیا۔

"راستہ بڑا خراب ہے۔ ذرا سنبھل کر چلئے۔" میں نے بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"کتنا اندھیرا ہے۔"

"آج بلیک آؤٹ جو ہے۔" میری ہمت بڑھ گئی اور میں نے بلا تکلف دوسرا ہاتھ بڑھا کر شانے پر رکھ دیا۔ "بس تھوڑی دور تک یہ مصیبت اور ہے۔ پھر تو سڑک آجائے گی۔"

وہ خاموش رہی اور بلا کسی مزاحمت کے میرے سہارے چلتی رہی۔ میرے سینے کے اندھیروں میں ایک دھواں سا منڈلانے لگا۔ جسم میں گرمیاں

پہنچ گئیں۔ تنہائی اور جوانی کا قرب۔ خود اپنی ذات کو بھول گیا خطرہ کا تو گمان بھی نہ تھا۔

"آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ کوٹھی کا رنگ پیلا تھا" میں ٹھہر گیا۔ دراصل مجھ سے اب چلا بھی نہ جاتا تھا۔ قدم بہک رہے تھے۔

"جی ہاں!" اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

اور میں نے آہستہ سے اسے اپنی طرف دبا لیا۔ "ذرا رک جاؤ"

"کیوں؟" بڑے بھولے پن سے اس نے پوچھا۔

"بتاؤں؟" اور میں نے اُسے زور سے بھینچ لیا۔

دفعتاً پیچھے سے شور پیدا ہوا۔

"ادھر گیا ہے ـــــ ادھر گیا ہے!"

"ہاں ہاں۔ اسی طرف ـــــ!"

"دیکھنا جانے نہ پائے"

"لینا۔ پکڑنا"

ایک طوفان بدتمیزی تھا۔ ٹارچ کی روشنیاں دور دور تک بکھرنے لگیں۔ میں نے نیلما کے ملازم نرائن کی آواز پہچان لی تھی۔ غصہ تو بہت آیا لیکن ایک لمحہ ضائع کرنا مصیبت میں پھنس جانے کے لئے کافی تھا بس ایکدم میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ بولی بھی۔ "ارے کہاں؟ سنئے تو!"

مگر وہاں کون سنتا۔ بس بھاگے ہی جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے بچا ہوں تو بلیک آؤٹ کے اندھیرے نے پردہ ڈال دیا ورنہ پھنس جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی

حسن تخیل

ضعیفی میں جوانی کے مزے ہم یاد کرتے ہیں

از حضرت عشرت لکھنوی مرحوم

نہ تھی میعاد قید عشق وہ آزاد کیا کرتے
اسیر اپنی رہائی کے لئے فریاد کیا کرتے

اشارے قاتل عالم، نگاہیں فتنۂ دوراں
بس اب اس سے زیادہ وہ ستم ایجاد کیا کرتے

کوئی طرز ستم تم سے جو بچ جاتا تو بہتر تھا
فلک بیداد کرتے تو نئی بیداد کیا کرتے

فروغ عالم ہستی وہاں کی سب بہاریں تھیں
عدم میں ہم خیال گلشن ایجاد کیا کرتے

نشان قبر تک باقی نہ تھا اجزائے ہستی پر
فلک آخر ہماری خاک کو برباد کیا کرتے

خزاں میں اک نہال خشک پر باقی نشیمن تھا
جلا کر چار تنکے دل کو خوش صیاد کیا کرتے

اسیر دام لطف نغمہ سنجی نے کیا ہم کو
شکایتہائے گلچیں شکوۂ صیاد کیا کرتے

یہ کہہ کر نیراں کا گوشۂ دل سے نکل آیا
کہ اس اجڑی ہوئی بستی کو ہم آباد کیا کرتے

تلطف کی امید ایسے جفا جو سے تو کیا ہوتی
نہ دیتا داد بھی گردوں تو اس کو یاد کیا کرتے

نہ وہ دل ہے نہ وہ جوش طرب باقی ہے اب عشرت
ضعیفی میں جوانی کے مزے ہم یاد کیا کرتے!

مجھے تو فریب وفا نہ دے

یہ ہوائے عقل کی تیز رَو، تری دل کی شمع بجھا نہ دے

حضرت علی اختر حیدر آبادی

یہ بساطِ عجز الٹ نہ دے یہ حجابِ عقل اٹھا نہ دے
کہ فریب جلوہ بصارتوں کو مری نظر سے گرا نہ دے

کہیں تجھ کو تجھ سے نہ چھین لے یہ طلسم عرصۂ آب و گل
یہ ہوائے عقل کی تیز رو ترے دل کی شمع بجھا نہ دے

وہی نامرادِ ازل ہوں میں مجھے آشنائے سکوں نہ کر
کوئی نالہ ہے جو رسا بھی ہو کوئی زخم ہے جو ہوا نہ دے

وہی حادثاتِ زمانہ ہیں وہی ہیں اور وہی زندگی
وہی میری قسمتِ نارسا کہ مرے عدو کو خدا نہ دے

میں قفس میں ہوں مرے ہمنوا یہ حدیث صبح بہار کیا
مرے سوز غم کو جگا نہ تو مری بیکسی کو ہوا نہ دے

یہ قدم قدم پہ قیامتیں یہ پیام مرگ نفس نفس
جو امینِ رازِ حیات ہو وہ نظر کسی کو خدا نہ دے

وہی تیر ظلم گھمائے جا وہی حشر ناز اٹھائے جا
مجھے شکوۂ غم دل نہیں مجھے تو فریبِ وفا نہ دے

مسلمان حکمرانوں کا محکمۂ اطلاعات

تاریخی مضمون

از الحاج مولوی عبدالقیوم ندوی

آج مغرب کو اپنے محکمۂ اطلاعات یا سی آئی ڈی پر بے حد ناز و فخر ہے اور فی الواقع بعض لحاظ سے اس محکمہ نے دُنیا کو متحیر بھی کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس محکمہ کے باقاعدہ بانی مسلمان اور صرف مسلمان ہیں اور خود انہی کے زمانہ عروج و کمال میں دوسرے محکموں کی طرح اس نے بھی اس قدر ترقی حاصل کر لی تھی کہ اس کے مقابلہ میں آج کل کے محکمے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

علامہ امام ذہبیؒ نے اپنی مشہور معتبر تاریخ جس میں ۷۰۰ھ تک کے واقعات نہایت صحت و استناد سے قلمبند ہیں لکھتے ہیں کہ "محکمہ اطلاعات کو باقاعدہ قائم کرنے والے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہیں۔ ۱۷ھ میں آپ کے مقرر کئے ہوئے پرچہ نویس تمام بڑے بڑے شہروں اور تجارتی منڈیوں عام گزرگاہوں اور مشہور ناکوں میں موجود تھے جو نہایت ہی ہوشیاری اور دیانتداری سے صحیح صحیح اطلاعات دربار فاروقی میں روزانہ اور کئی ہفتہ وار روانہ کیا کرتے تھے حضرت عمرؓ ان واقعات سے اپنی ساری حکومت کا اندازہ لگاتے اور واقعات کے متعلق صحیح رائے قائم فرماتے" آگے چل کر علامہ موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ پرچہ نویس اس قدر صداقت اور سچائی کے مالک تھے کہ گورنروں اور جرنیلوں کے اعمال و افعال پر تنقید کرتے ہوئے بھی نہ رُکتے اور ان کی کمل کارگزاری سے دربارِ خلافت کو باخبر کرتے رہتے تھے حضرت عمرؓ تحقیقات کے بعد احکام صادر فرمایا کرتے تھے۔ (تاریخ ذہبی)

بنو امیہ نے اس محکمہ کو اور بھی زیادہ ترقی دی اور ایسا باقاعدہ انتظام کیا کہ دُور دراز ممالک کی خبریں بھی ایک ہی دن میں بسا اوقات پہنچ جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کو ایک ہی رات کو مختلف پانچ صوبوں کی بغاوت کا حال معلوم ہوا۔ مگر اس کے باوجود [illegible] رات بھر اپنے دوستوں اور مصاحبوں کے ہمراہ داد عیش دیتا رہا۔

پھر جب ۱۳۲ھ میں خلافت امیہ ختم ہو کر خلافت عباسیہ کی داغ بیل پڑی تو اس وقت اس محکمہ میں اور بھی ترقی ہوئی اس زمانہ میں کبوتروں اور دوسرے ذرائع سے کام لیا جاتا تھا۔ (دیکھو تاریخ ابن اثیر کامل)

عباسی خلفا نے ہر شہر بلکہ ہر قریہ میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ جو نہایت چابکدستی سے واقعات کی تلاش و جستجو کرتے اور پوری تفصیلات دربارِ خلافت میں روانہ کرتے تھے (ابناء العمر علامہ ابن حجر)

خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی کے عہد میں اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ ساری مملکت میں خفیہ پولیس کا زبردست جال بچھا دیا گیا تھا۔ جس سے گوشہ گوشہ کی حالت سے خلیفہ باخبر رہتا۔ اگرچہ اس کے زمانہ میں کئی بغاوتیں ہوئیں اور بہت سے فتنے برپا ہوئے۔ مگر اس نے اس محکمہ کی وجہ سے بہت جلد اُن پر قابو پا لیا اور اس کا اثر کچھ ایسا ہوا کہ رعایا خائف ہو گئی اور خفیہ سازشوں کا ایک حد تک بہت کچھ قلع قمع ہو گیا (تاریخ ابن جریر طبری)

اسی طرح جاسوسی کے محکمہ میں ترقی ہوتی گئی حتیٰ کہ خلیفہ عباسی الناصر لدین اللہ احمد سنہ جلوس ۵۷۵ھ کے عہد میں تو اس میں وہ ترقیاں ہوئیں اور ایسی ایسی حیرت انگیز مثالیں دیکھنے میں آئیں کہ شاید اب کبھی دیکھنے میں نہ آئیں پھر اس زمانہ [illegible] رفت کو دیکھ کر تو فی الواقع اس درجہ تعجب ہوتا [illegible] دماغ [illegible] علامہ امام ذہبی [illegible] محدث اور جلیل القدر نقاد گزرے ہیں۔ اپنی مشہور تاریخ میں لکھتے ہیں کہ خلیفہ [illegible] کے عہد میں اس محکمہ نے اتنی حیرت انگیز ترقی حاصل کر لی تھی کہ کوئی پرائیویٹ مجمع چھوٹا یا بڑا خفیہ یا علانیہ ایسا نہ ہوتا جس میں خلیفہ کے جاسوس موجود نہ ہوں اور جو باقاعدہ حالات قلمبند کر کے دربارِ خلافت میں روانہ نہ کرتے ہوں (تاریخ امام ذہبی)

علامہ ابن عساکر محدث جلیل اپنی تاریخ میں جو ۸۰ جلدوں میں ہے، لکھتے ہیں کہ "خلیفہ الناصر لدین اللہ کے عہد میں محکمہ

ت وتناو سیع ہو گیا تھا کہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ حق خلیفہ کے
ں - جو اسے حیرت انگیز طریقوں سے ادنیٰ و اعلیٰ حالات کی
تے رہتے ہیں۔ (تاریخ ابن عساکر جلد ۳۰)
لیولات میں منقول ہے کہ اس محکمہ کی وجہ سے لوگوں میں اتنی
ت پھیل گئی تھی۔ کہ اگر دو آدمی آپس میں مصروف گفتگو ہوتے
لیے دوسرے کو حکومت کا جاسوس خیال کرتا۔ اس خوف و
ن کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فتنہ و فساد کا دروازہ بند ہو گیا،
ں ختم ہو گئیں، چوری ڈاکے اور قتل و غارت گری کا انسداد
مد پر عمل میں آ گیا۔ رعایا پُر امن، خوشحال اور نہایت آرام
ی (طیولات جلد ۲)

علامہ جلال السیوطی لکھتے ہیں کہ موفق عبداللطیف نے لکھا ہے
ر نے اپنی ہیبت اور خوف سے لوگوں کے دلوں کو پر کر دیا
اس سے اہل ہند اور اہل مصر اتنے ہی ڈرتے جتنے اہل بغداد۔
م کے بعد خلافت مردہ ہو چکی تھی۔ مگر اس نے اسے زندہ کر دیا۔
اور شام کے بادشاہوں کی مجلسوں میں جب ناصر کا ذکر ہوتا
ت سے آواز یں مدھم کر لیتے تھے۔ (دیکھو تاریخ الخلفاء)
س کے رعب و داب کا راز صرف اس کا محکمہ اطلاعات تھا۔

علامہ ابن اثیر اپنی تاریخ کامل میں لکھتے ہیں کہ خبر رسانی
نا خلیفہ الناصر کے وقت ہو چکی تھی اور اب شاید ایسا باخبر
نہ کبھی پیدا نہ ہو۔ علامہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ والیٔ ماژندران
ی خلیفہ کے دربار میں آیا۔ تو ہر صبح اس کی ڈائری کا پرچہ
ار میں پہنچتا تھا۔ یہ دیکھ کر سفیر نے اپنے کام نہایت پوشیدہ
یہ انجام دینا شروع کئے۔ مگر اس کے باوجود پرچہ اسی طرح
تا رہا۔ ایک رات اس نے ایک عورت کو چور دروازے سے
اپنے پاس رکھا اور اپنے محل میں سخت نگرانی رکھی۔ لیکن اس
باوجود ساری کیفیت حتیٰ کہ بستر کا رنگ اور لحاف کی تصویروں
ی ذکر تھا۔ یہ دیکھ کر اور پریشان ہو کر سفیر واپس چلا گیا۔
ریخ ابن اثیر)

اس واقعہ کو جب اس نے اپنے ملک واپس جا کر بادشاہ
اہل دربار کو سنایا تو سب کو یقین ہو گیا کہ خلیفہ کو علم غیب
مل ہے اور وہ سب کے سب پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہو گئے
ر اطاعت و فرمانبرداری میں زیادتی کی۔ (تاریخ الخلفاء)

اسی طرح ایک مرتبہ خوارزم کے والی کا قاصد خلیفہ کے
دربار میں آیا اور اپنے بادشاہ کا سربمہر لفافہ پیش کیا۔ خلیفہ نے
اسے بغیر پڑھے بتا دیا کہ اس کا پورا حال مجھے معلوم ہے تم
واپس جاؤ۔ اس واقعہ سے والیٔ خوارزم نے بھی یہی سمجھا کہ
خلیفہ کو علم غیب معلوم ہے۔ (دیکھو تاریخ الخلفاء تذکرہ الناصر
لدین اللہ)۔ حالانکہ غیب کا علم صرف خداوند عالم کے ساتھ
ہی مخصوص ہے۔

علامہ صعلی نے اپنی تاریخ میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ
اور حیرت انگیز واقعہ تحریر فرمایا ہے۔ جس سے اندازہ ہو سکیگا
کہ خلیفہ کے جاسوس نہ صرف اپنی حدودِ مملکت میں پھیلے ہوئے
تھے بلکہ دوسرے مقامات اور حکومتوں میں بھی موجود تھے جو
نہایت ہی کمال عمدگی اور زود رفتاری سے تمام اہم باتوں
کی اطلاع خلیفہ کو پہنچاتے تھے۔

ایک مرتبہ ہندوستان سے ایک شخص ایک طوطا لیکر
دربارِ خلافت میں حاضر ہونے کے لئے چلا۔ اس طوطے میں
یہ صفت تھی کہ قل ہو اللہ شریف نہایت اچھی آواز سے پڑھتا تھا
جب یہ چلا تو خلیفہ کے جاسوسوں نے اس کے تمام حالات سے
خلیفہ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا۔ جس روز یہ شخص بغداد پہنچا شومیٔ
قسمت سے طوطا مر گیا۔ اس کی ساری آرزوئیں خاک میں مل گئیں
اور یہ سخت رنجیدہ ہوا۔ اتنے میں خلیفہ کا آدمی آیا اور طوطا
طلب کیا۔ اس نے رو کر جواب دیا کہ وہ تو مر گیا"۔۔۔ آدمی بولا
یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ لیکن اب تم بتاؤ کہ تمہیں خلیفہ سے کتنے
کی توقع تھی، جواب دیا کہ ۵۰۰ کی۔ آدمی نے فوراً پانچسو پیش کئے
کہ خلیفہ نے عنایت کئے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جس روز
تم ہندوستان سے نکلے تھے اسی دن خلیفہ کو ساری باتوں کا
علم ہو گیا تھا۔ (اوراق)

ایک مرتبہ ایک فقیہہ جو دار الخلافہ سے بہت ہی دور دراز
علاقہ میں رہتا تھا عازم دار الخلافہ ہوا۔ اس کے پاس ایک
نہایت ہی عمدہ گھوڑا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لیجانے کا خیال
کیا تو گھر والوں نے روکا کہ کہیں اسے راستہ میں چور چرا نہ لیں
انہوں نے یہ کہتے ہوئے نہ مانا کہ "چور تو چور خلیفہ بھی اسے
نہیں لے سکتا"۔

غرضیکہ جب یہ بغداد کے قریب پہنچے تو خلیفہ نے چند
آدمیوں کے ذریعہ سے اسے چوری کرا دیا۔ فقیہہ صاحب سخت

پیدا اور حیران ہوئے، بالآخر تاصنیوں سے فریادی ہوئے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر وہ خلیفہ کے دربار حاضر ہوئے۔ اس وقت خلیفہ نے انہیں وہی گھوڑا نقرئی ساز وسامان اور بہت کچھ نقد انعام اور خلعت بیت کئے۔ پھر مسکرا کر فرمایا "بے شک خلیفہ تو تمہارا گھوڑا بھی لینے پہ تھا ورنہ تھا مگر معمولی لوگ لے سکتے تھے"۔۔۔ اس پر فقیہہ صاحب فرطِ خوف سے بیہوش ہو کر گر پڑے۔۔۔ (تاریخ الخلفا الناصر لدین اللہ)

یہ چند واقعات ہیں جن سے معلوم ہوا ہوگا کہ مسلمانوں نے اس محکمہ کو کس قدر بلند سے بلند تر مقام پر پہنچا دیا تھا۔

لمعات

میں رہا خاموش لیکن ترجمانی ہو گئی

جناب نیّر اکرام شہری

قابلِ تقلید اُس کی زندگانی ہو گئی
موت ہی جس کی حیاتِ جاودانی ہو گئی

پھولتا پھلتا ہے نخلِ عشق بے نیلِ مرام
وہ رہا ناکام جس کو کامرانی ہو گئی

تو جو چپ رہتا تو میں بھی کیوں مُصر ہوتا مگر
وجہِ شوقِ دید تیری لن ترانی ہو گئی

ذکر اپنے حُسن کا سُن کر وہ برسے اس طرح
شرم سے محفل کی محفل پانی پانی ہو گئی

پُرسشِ احوال پر آنسو نکل آئے ندیم
میں رہا خاموش لیکن ترجمانی ہو گئی

اب جنونِ عشق چھوڑو سے بھی چھوٹے گا نہیں
فطرتِ ثانی ہے جو عادت پُرانی ہو گئی

عالمِ پیری میں اُس کی خستہ حالی کیا کہوں
وقفِ اندوہ جہاں جس کی جوانی ہو گئی

عافیت ملتی نہیں اولادِ آدم کو یہاں
یہ زمیں گویا بلائے آسمانی ہو گئی

عشق کے انجام کی آغاز دیتا ہے خبر
روزِ اول اُن کو مجھ سے بدگمانی ہو گئی

یاد کچھ باقی نہیں عذرِ ندامت کے سوا
داستانِ عشق اب قصہ کہانی ہو گئی

شمع کا جلنا ہی نیّر ہے اُجالے کی سبیل
رونقِ محفل مری شیوہ بیانی ہو گئی

چور

افسانہ

نوشتہ:- سبیتا دیوی
مترجمہ:- جناب جمیل احمد کندرہاپوری ایم اے

جاڑا ہو یا گرمی خزاں ہو یا بہار، پریا بالا کو ہر موسم میں نہایت سویرے اٹھنا پڑتا — ہر روز وہ صبح سویرے غسل کرنے کی عادی تھی اور اس کے بغیر کوئی کام شروع نہ کرتی تھی۔ وہ ایک بیوہ تھی اور اس کے خیالات حد درجہ مذہبی تھے۔ غسل خانہ میں ہر روز وہ کم سے کم ڈیڑھ گھنٹہ ضرور ٹھہرتی۔ مگر کلکتہ کے کرایہ کے مکانوں میں کسی فلیٹ میں ایک سے زیادہ غسل خانہ تو ہوتا نہیں لہذا پریا بالا کو گھر کے اور لوگوں سے کہیں پہلے اٹھ جانا پڑتا — گرمیوں میں تو خیر تکلیف نہیں ہوتی تھی مگر جاڑوں میں سویرے اٹھنا سخت مصیبت ہو جاتا تھا۔ اس کا بھائی جینتا بیسویں صدی کا ایک آزاد خیال نوجوان تھا اور آٹھ بجے سے پہلے کبھی سو کر نہیں اٹھتا تھا۔ دوسرا بھائی بسنتا اپنی بہن پر اس درجہ کرم کرنے کا عادی تو نہ تھا مگر پھر بھی اس کے آرام کا کسی قدر خیال ضرور رکھتا سامنے ہی نوجوانوں کا ایک بورڈنگ ہاؤس تھا۔ وہاں کے بعض لوگوں سے بسنتا کی جان پہچان تھی۔ اس لئے وہ تقریباً ہر صبح وہیں چلا جایا کرتا اور پریا بالا چین سے یہاں غسل خانہ میں نہاتی۔ پریا بالا کی چھوٹی بہن تپتیا بھی ہمیشہ دیر سے اٹھنے کی عادی تھی لہذا اس کی طرف سے پریا بالا کو اندیشہ نہ رہتا تھا مگر جینتا کی بیوی منیکا سے پیچھا چھڑانا آسان نہ تھا۔ وہ تقریباً ہر اعتبار سے نئی روشنی کی دلدادہ تھی۔ بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا تھا اور صورت شکل بھی اچھی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے والدین بھی بڑے امیر لوگ تھے۔ انہی اوصاف کے باعث پریا بالا کو وہ ایک نظر نہیں بھاتی تھی اور اس کی نند اسے حد درجہ [illegible] سمجھتی تھی۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود منیکا پہلی کرن پھوٹتے ہی اٹھ جایا کرتی تھی اور اتفاقاً جب کبھی وہ یہ دیکھ لیتی کہ غسل خانہ خالی نہیں ہے تو اس کی پیشانی پر فوراً بل آ جاتے اور چہرے سے خفگی کے آثار مترشح ہونے لگتے مگر پریا بالا کو ان باتوں کی مطلق پروانہ تھی۔ وہ آخر منیکا کے والدین کے روپوں پر تو نہیں جی رہی تھی۔ اس پر اگر کسی کا احسان تھا تو اس کے بھائی جینتا کا۔ مگر وہ حد درجہ زن مرید تھا اور اپنی بیوی کے خوف سے مرا جاتا تھا اسی وجہ سے پریا بالا بعض اوقات سہم کر رہ جاتی ورنہ وہ بڑے باپ کی بیٹی کو ایسا سبق پڑھاتی کہ اسے چند دن تک یاد رہتے

ابھی آسمان پر تارے جھلملا ہی رہے تھے کہ پریا بالا نے اٹھ کر پکارا — "بینا! او بینا! ذرا دیکھنا تو کیا وقت ہوا ہے؟ میں ذرا چندرا مکھی کے ساتھ اشنان کے لئے جاؤں گی۔ ساڑھے پانچ بجے ہی ہمیں روانہ ہو جانا ہے۔"

"تم نے تو دیدی لوگوں کا سونا مشکل کر دیا ہے۔" بینا نے چڑ کر کہا۔ "خود اٹھ کر کیوں نہیں دیکھ لیتیں۔"

"میں مشورہ نہیں چاہتی۔" پریا بالا نے غصہ سے کہا۔ "بڑی بہن سے اسی طرح باتیں کی جاتی ہیں؟ — بڑی بہن، جو تمہاری ماں کے برابر ہے۔ اب معلوم ہوا کہ آج کل کی تعلیم نے تمہیں کس قدر فائدہ پہنچایا ہے ٹھیک ٹھیک گھڑی دیکھ کر بتاؤ کہ کیا وقت ہوا ہے۔"

بینا کو بستر سے اٹھ کر گھڑی پر نگاہ ڈالنی پڑی

"پانچ بج چکے۔" اس نے زور سے کہا۔ "اب بتی بجھا دو۔"

پریا بالا نے بتی بجھا دی اور بستر سے نیچے اتر آئی۔ سڑک والی بتی کی تھوڑی سی روشنی دریچوں سے اندر آ رہی تھی اس کی مدد سے اس نے اپنی ساری، تولیہ اور پیتل کا لوٹا جمع کئے۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور پریا بالا اپنی گٹھری اٹھا کر باہر جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

"بینا! تم اٹھ کر دروازہ بند کر دینا۔" پریا بالا نے کہا — "میں جا رہی ہوں۔"

"کل سے میں باورچی خانے میں ہی سویا کروں گی۔" بینا نے چڑ کر کہا۔

"کیسا منظر ہے [illegible]" پریا بالا [illegible] سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ ان [illegible]

پریا بالا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور دیکھا کہ چندرا مکھی جو ایک بوڑھی سی عورت تھی رکشا پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

"آؤ آؤ جلدی کرو۔" پریا بالا کو دیکھتے ہی اس نے کہا "آفتاب چند ہی منٹ میں نکل آنے لگا۔"

پریا بالا رکشا میں بیٹھ گئی اور قلی نے اسے کھینچنا شروع کر دیا جیسے وہ کوئی جانور تھا۔

"بینا کے شوہر کا کوئی خط آیا؟" چندرا لکھمی نے پوچھا۔

"وہ ایسا آدمی نہیں" اس نے کہا "اس کی ماں پہلے درجے کی شیطان ہے اور بیٹے کو بہو سے ملنے نہیں دیتی۔ میں مانتی ہوں کہ بینا کالی ہے مگر اس کے چہرے کی تراش بُری نہیں۔ علاوہ ازیں رشتہ طے کرنے سے پیشتر انھوں نے لڑکی کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ ہم نے اس کے چہرے پر اس وقت پاؤڈر اور غازہ تو نہیں مل دیا تھا —— جہیز بھی انھوں نے کچھ کم نہیں لیا۔ پتاجی کو اسی شادی کی وجہ سے گھر تک بیچ دینا پڑا تھا مگر اس پر بھی ان لوگوں کا دل نہیں بھرا۔ اور اب بات بات پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن بہن اصل بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ اور روپے چاہتے ہیں مگر اب روپے انھیں دے کون؟"

"وہ دیکھتے ہونگے کہ تمھارے دونوں بھائی کما رہے ہیں اور یہی دیکھ کر ان کو لالچ آتا ہوگا" چندرا لکھمی نے کہا۔

"کما رہے ہیں! —— ہاں، بہت زیادہ" پریا بالا نے مُنہ بسورتے ہوئے کہا "سچ پوچھو تو مشکل سے گذارا ہوتا ہے۔ بسنتا کو پچھتر روپے ملتے ہیں اور وہ تمام کی تمام رقم اپنی ذات پر صرف کر دیتا ہے۔ آج تک اس نے مجھے آٹھ آنے بھی نہیں دیئے۔ جنیا کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ہے مگر اسے بیوی ایسی ملی ہے جو اپنے آپ کو شہزادی سے کم نہیں سمجھتی —— اگر اس کے شوہر کو ہزار روپے ملیں جب بھی وہ تمام کی تمام رقم کھا پکا کر برابر کر دے گی۔ نوکروں کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کر سکتی جب تک میرے بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ہم آرام سے تیس روپے کرائے کے گھر میں رہتے تھے مگر شہزادی کے خیال میں وہ گھر بہت چھوٹا تھا اس لئے ہمیں فوراً ساٹھ روپے کرایہ کے "فلیٹ" میں منتقل ہونا پڑا۔"

بوڑھی چندرا لکھمی گویا خبر رساں ایجنسی رائٹر کی ایک مختصر ایڈیشن تھی۔ نہ جانے اسے محلے کی تمام بُری بھلی، چھوٹی بڑی خبریں کس طرح سب سے پہلے معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ ممکن ہے اشنان کے لئے ہر روز گھاٹ پر آنا اس سلسلے میں اس کی کچھ معاونت کرتا ہو۔

"سنا ہے تمھاری بھاوج کو باپ کے یہاں سے ہر ماہ پچاس روپے جیب خرچ کے لئے ملتے ہیں۔ یہ سچ ہے؟" چندرا لکھمی نے پوچھا۔

مگر پریا بالا کو یہ بات سن کر غصہ سا آ گیا۔

"مجھے کیا معلوم؟" اس نے بڑبڑا کر کہا "وہ تمام باتیں مجھے تھوڑے ہی بتا دیتی ہے۔ میری بلا سے اسے پچاس نہیں سو ملا کریں۔"

چندرا لکھمی سمجھ گئی کہ اسے جو خبر ملی تھی وہ غلط نہیں۔

"تمھارے ننھے بھتیجے کی "نمک چشی" کی تقریب نہیں ہو گی یا ابھی نانا کے گھر؟" اس نے پھر استفسار کیا۔

"نہیں!" پریا بالا نے جواب دیا "ہم آخر بار بار وہاں کیوں جانے لگے۔ ہمارے خاندان کا یہ سب سے پہلا لڑکا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ تقریب دھوم دھام سے یہیں منائی جائے۔ مگر اس سلسلے میں فضول بہت سے روپے برباد ہونگے۔ میری شہزادی آخر اپنی وضعداری میں کیوں فرق آنے دیگی۔ وہ تو اسی وقت سے مہمانوں کی لمبی چوڑی فہرست تیار کر رہی ہے۔"

چندرا لکھمی کو لوگوں کے آپس میں لڑانے میں بہت لُطف آتا تھا۔ وہ ایک لاوارث بیوہ تھی اور اب انہی اشغال سے اپنا دل بہلاتی تھی۔

"کنبہ میں تو سب سے بڑی تم ہی ہو۔ کیا وہ کسی کام میں تم سے مشورہ نہیں لیتے؟" اس نے پوچھا۔

"مشورہ، کبھی نہیں!" پریا بالا نے تنک کر جواب دیا "وہ تو مجھے ایک خدمتگار سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ تمام باتیں جب آپس میں پہلے طے ہو جاتی ہیں تو رسمی طور پر آخر میں کبھی کبھی مجھ سے پوچھ لیا کرتے ہیں۔"

"مینکا کے گھر سے کتنے آدمی آئیں گے!" چندرا لکھمی نے پوچھا۔

"بہت سے" پریا بالا نے جواب دیا "بچے کا ماموں آئے گا اور اس کی بیوی بھی۔ ان کے علاوہ مینکا کی چھوٹی بہن بھی آئیگی نانا بھی ضرور آتا مگر اس کی طبیعت ناساز ہے اس لئے مشکل ہے۔"

"تم لوگ بینا کے شوہر کو بھی کیوں نہیں بلاتیں۔ ممکن ہے وہ آ جائے۔"

"ہاں! میں جنیا اور اس کی دلھن سے ذکر کروں گی" پریا بالا نے کہا "تقریب کے سلسلے میں آخر تمام اختیارات تو انہی کو حاصل ہیں —— مگر بہن! —— سچ پوچھو تو یہ بینا بھی بہت شریر ہے۔ شوہر کو دیکھتے ہی اس سے لڑنا شروع کر دیا کرتی ہے۔ اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ وہ ایک عورت ہے اور برابری کے ساتھ مردوں سے نہیں لڑ سکتی۔"

"ٹھیک کہتی ہو بہن!" چندرا لکھمی بولی "آج کل کی لڑکی عورت نہیں جنگجو سپاہی ہوتی ہے۔ لو ہم پہنچ لئے باتیں کرتے ہوئے وقت کس قدر جلد گزر جاتا ہے۔"

دونوں رکشا سے اتر کر گھاٹ کی جانب لپکیں وہاں انھیں کئی شناسا عورتیں مل گئیں۔ پریا بالا نے پانی میں غوطہ لگایا اور "پوتر جل" سے اپنا لوٹا بھر لیا۔ اس کے بعد دونوں پھر رکشا میں بیٹھ گئیں اور گھر کی جانب روانہ ہو گئیں۔ رکشا کا کرایہ ہمیشہ چندرا لکھمی ہی دیا کرتی تھی اور یہ چیز پریا بالا کو بہت پسند تھی۔

———

گھر پہنچ کر پریا بالا نے دیکھا کہ ہر شخص سو کر اُٹھ چکا ہے اور اپنے کام کاج میں مصروف ہے۔ بینا باورچی خانہ میں زمین پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے پیتل کے ایک بڑے سے پیالے میں چائے اور چند چپاتیاں رکھی تھیں پہلے وہ چینی کی پیالی میں کرسی پر بیٹھ کر چائے پیا کرتی تھی مگر جب سے نیکا نے اپنے لئے یہ طریقے اختیار کئے تھے اس نے گویا بطور احتجاج یہ دونوں باتیں ترک کر دی تھیں۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنی بھاوج جیسی نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

"بسنتا کہاں ہے؟" پریا بالا نے پوچھا۔ "وہ چائے پی چکا؟"

"ابھی تھوڑا سو کر اٹھا ہے اور پورڈ نگ گیا ہے۔" مینا نے جواب دیا۔ "اس کی چائے رکھی ہوئی ہے۔"

پریا بالا نے لوٹا اور کپڑے زمین پر رکھ دیئے۔

"کیا ہریا بازار سے واپس آچکا ہے؟" اس نے پوچھا۔

بینا نے نفی میں اپنی گردن کو جنبش دی مگر ملازم عین اسی وقت واپس آگیا۔ اور پریا بالا اس سے سودا سلف کا حساب لینے لگی۔ بیچارے ہریا کے لئے یہ وقت بڑے عذاب کا ہوتا کیونکہ حساب میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ الٹ پھیر ہو ہی جایا کرتی تھی ——— پریا بالا اسے ہر روز صبح صبح جی بھر کر گالیاں دیا کرتی تھی مگر چونکہ ہریا دو ایک پیسے زاید ہی لا کر واپس کر دیا کرتا تھا اس لئے وہ کبھی اس کو برطرف کرنے کا خیال بھی نہیں کرتی تھی۔

ابھی ہریا نے حساب چکانا ختم بھی نہ کیا تھا کہ جینتا اپنی خوابگاہ سے جماہی لیتے ہوئے نکلا۔

"دیدی! تم اس سردی میں اشنان کے لئے دریا گئی تھی؟" اس نے پوچھا۔ "آخر اس طرح اپنی جان دینے پر کیوں تلی بیٹھی ہو ——— ناحق کسی نہ کسی دن سردی لگ جائیگی۔"

"کیا خوب بات کہی۔" پریا بالا نے کہا۔ "کیا جتنے آدمی دریا میں نہاتے ہیں انھیں سردی لگ جایا کرتی ہے۔ میں آخر موم کی گڑیا تو نہیں کہ ذرا سی گرمی سے پگھل جاؤں۔"

عین اسی وقت جینتا کی بیوی آگئی۔

"تمہارے لئے چائے آخر کتنی مرتبہ گرم ہوا کرے گی! ———" اس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"میں ابھی آیا۔" جینتا نے جلدی سے کہا۔ "مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا۔" اتنا کہہ کر وہ غسل خانہ میں چلا گیا۔

نیکا نے پریا بالا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "باورچی کو سمجھا دو کہ اپنا کام توجہ سے کیا کرے! کل اس نے کھانا بالکل برباد کر ڈالا تھا۔"

"بہت اچھا! میں کہہ دونگی۔" پریا بالا نے مُنہ بنا کر کہا۔ "تمہیں کو تو زبان ہے خود کیوں نہیں کہہ دیا۔"

نیکا کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے اس طرح کی طعن آمیز باتیں بہت ناگوار ہوتی تھیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ نیکا کھانے پکانے کے فن میں ماہر نہ تھی تاہم روزمرہ کے معمولی کھانے بنانا وہ جانتی تھی اور دوسروں کو سکھا بھی سکتی تھی مگر جب کبھی وہ باورچیخانہ میں قدم رکھنے کی کوشش کرتی تو پریا بالا اور مینا دونوں لپک کر دوڑ جاتیں اور اسے ان کاموں سے باز رکھتیں۔ ان کا خیال تھا کہ نیکا خانہ داری کے کاموں سے بالکل ناواقف ہے اور وہ دوسروں کو بھی اس حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہتی تھیں۔

اس بات کی تشہیر دونوں بہن ہر جگہ اور ہر موقع پر کرتیں۔ اَور باتوں کے لحاظ سے نیکا ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی مگر کھانا پکانا ایک ایسا فن تھا جس میں وہ اپنے سامنے نیکا کو حقیر سمجھتی تھی۔

غسل سے فارغ ہو کر جینتا اپنے کمرے میں آیا اور ناشتہ کے لئے بیٹھ گیا۔ گھر میں کمرے صرف چار ہی تھے۔ تین خوابگاہیں اور ایک ڈرائنگ روم۔ کھانے کا علیحدہ کمرہ ایک بھی نہ تھا۔ لہذا ہر شخص کو اپنے اپنے کمرہ میں ہی کھانا پڑتا۔

"اب صرف دس روز باقی رہ گئے ہیں۔ اور تم نے کوئی انتظام شروع نہیں کیا۔" نیکا نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔ "دعوتی خطوط تو آج لکھ کر بھیج دینے چاہئیں۔"

"تم ہی کیوں نہیں لکھ دیتیں! کیا مضائقہ ہے؟" جینتا نے پوچھا۔

"میں کیوں لکھنے لگی۔" اس کی بیوی نے تنک کر کہا۔ "لوگوں کو تم اپنے یہاں بلا رہے ہو۔ میرے یہاں نہیں۔"

جینتا کو اپنی بیوی کے چھیڑنے میں لطف آتا تھا۔

"کیا اس گھر کو تم اپنا گھر نہیں سمجھتیں؟" اس نے پوچھا۔

نیکا چڑ گئی اور اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"اچھی بات ہے۔" اس نے غصہ سے کہا۔ "تم کسی کو کچھ نہ لکھو۔ میں کسی کو دعوت دینا نہیں چاہتی۔ ہم سیدھے سادے طور پر بچے کے مُنہ میں چاول ڈالیں گے۔"

جینتا نے ہاتھ پکڑ کر اُسے کرسی پر بٹھایا۔

"بس بگڑ گئیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "میں [illegible]

صرف پوسٹ کرنا باقی ہے۔"

اتنا سنتے ہی نیکا کا سارا غصہ کافور ہوگیا ــــ "بسنتا کہتا تھا کہ بورڈنگ والے دو تین دنوں کے لئے ایک کمرہ مہمانوں کے لئے خالی کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔" نیکا نے کہا۔ "تم ان سے مل کر پھر پوچھ کیوں نہیں لیتے؟"

"مگر اس کا فائدہ؟" جینتا نے پوچھا۔ "کیا تم وہاں جاکر رہوگی؟"

"ہم نہ رہیں تو کیا ہوا؟ مہمان تو رہیں گے۔" نیکا نے جواب دیا۔

عین اسی وقت بنیا اپنی چائے ختم کر کے آگئی۔

"تم بچے کی نمک چشی کے متعلق باتیں کر رہے ہو بھیا!" اس نے پوچھا

"ہاں!" نیکا نے کہا۔ "اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

"بھیا! میں تم سے ایک بات کہوں! ـــ مانوگے؟" بنیا نے پوچھا۔ اس کے چہرے سے ہلکا سا اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

"ضرور" جینتا نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں کچھ بولنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں۔"

"میں چاہتی تھی کہ تم ایک خط "ان لوگوں" کو بھی بھیج دیتے"۔ بنیا نے شرماتے ہوئے کہا۔

"میں ان بدتمیز جانوروں کو کچھ لکھنا نہیں چاہتا" جینتا نے کہا۔ "البتہ پردبودھ کو میں خط لکھ دونگا ــ اور یہاں بلاؤنگا بھی"۔

"بس بس! یہ کافی ہے۔" نیکا نے ہنسکر کہا۔ "ان لوگ" سے تمہاری بہن کا مطلب "ان" ہی تھا ــ یہ گویا ایڈیٹوریل کے "ہم" جیسی بات ہے۔"

"بنیا تم یہاں آکر ذرا سبزی تو چھیل لو۔" پریا بالا نے پکار کر کہا۔ "تنہا مجھ سے یہ سارا کام نہیں ہوتا۔"

بنیا لپک کر فوراً چلی گئی۔

"عجیب عورت ہے۔" نیکا نے کہا۔ "ہمیشہ اپنی تنہائی کا ہی رونا روتی رہتی ہے۔ مگر جب میں ہاتھ بٹانے جاتی ہوں تو کچھ کرنے بھی نہیں دیتی۔"

جینتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش ہی رہا۔ شادی کے بعد سے اس نے اپنا یہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ بیوی کے خلاف نہ وہ اپنی بہنوں کی طرف داری کرتا تھا اور نہ بہنوں کے خلاف اپنی بیوی کی ـــ! ایک بیوہ تھی اور دوسری کو شوہر نے چھوڑ دیا تھا اس لئے وہ کسی کو بھی سخت سست کہنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

خطوط اسی دن روانہ کر دیئے گئے۔ بچے کے ماموں نے لکھا تھا کہ وہ ضرور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ تقریب میں شریک ہوگا۔ نیکا کی چھوٹی بہن بھی آنے والی تھی ـــ بنیا کے شوہر پردبودھ کو بھی دعوت دی گئی تھی جینتا کے ایک چچا یو۔پی میں رہتے تھے انھیں بھی لکھا گیا تھا مگر کسی کو امید نہ تھی کہ وہ اس قدر دور سے آسکیں گے۔ بورڈنگ والوں نے ایک نہایت کشادہ کمرہ جس سے ایک غسل خانہ بھی ملحق تھا مہمانوں کے لئے خالی کردیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ تقریب کے دن اور بھی ہر طرح کی مدد پہنچائیں گے۔

نیکا نے جلد جلد تقریب کے لئے بچے کے کپڑے تیار کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے بازار سے ایک چھوٹی سی لال دھوتی اور ایک چادر منگائی اور ساتھ ہی بچے کے لئے قیمتی مخمل کا ایک خوبصورت سا کوٹ بھی سلوایا۔ جس پر زری کا کام بنوایا گیا۔ نانا نے ایک جوڑا سونے کا کڑا بھیج دیا تھا اور ماموں نے ایک طلائی ہار دینے کا وعدہ کیا تھا۔

"کیا تم بچے کو کوئی زیور نہ دوگے؟" نیکا نے اپنے شوہر سے پوچھا "مینا کو تم نے کپڑے بنوا کر دیئے تھے۔"

مگر جینتا اب اور زیادہ روپے خرچ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

"لڑکا آخر اتنے زیورات کیا کریگا؟" اس نے پوچھا۔ "مینا لڑکی ہے اور چونکہ اس کی تقریب تمہارے والد کے گھر میں ہوئی تھی اس لئے اچھی سی چیز بنوا کر دینی ضروری تھی ـــ اس وقت، تم جانتی ہو، ہمارے پاس فاضل روپے نہیں۔ ہاں دفتر کے کوآپریٹو سوسائٹی سے روپے قرض لئے جاسکتے ہیں ـــ مگر میں قرض کے روپوں سے تماشہ کرنا نہیں چاہتا۔"

نیکا کو آخر خاموش ہو جانا پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا شوہر کوئی کروڑپتی نہیں ہے۔"

بچے کی دونوں پھوپھی باورچی خانہ میں بیٹھی آپس میں مشورہ کررہی تھیں۔ بسنتا کو ادھر سے گذرتے دیکھ کر انھوں نے چپکے سے اُسے بھی وہاں بلا لیا۔

"بسنتا! میں پوچھتی ہوں۔ کیا تم بچے کو کوئی تحفہ دوگے؟" پریا بالا نے پوچھا۔

بسنتا سیدھا سادا نوجوان تھا۔ وہ اپنی بہن کا اصل مطلب سمجھ سکا۔ بولا۔ "ہاں کیوں نہیں ضرور دونگا۔ بھیا ہم لوگ کی ذات پر اس قدر خرچ کرتے ہیں ہمیں بھی ان کے بچے کو کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیئے۔"

پریا بالا کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ یہ سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی کہ جینتا یا نیکا ان لوگوں کے لئے کچھ کرتے تھے۔

"وہ ہمارے لئے کیا کرتا ہے؟ اس کے متعلق میں فضول تم سے

پھنسٹ کرنا نہیں چاہتی۔ مگر بتاؤ تو تم بچے کو دوگے کونسی چیز؟"

"میں اسے ایک اچھی سی گاڑی خرید دونگا۔ ویسی ہی جیسی راجیت باپیکر لڑکے کے پاس ہے۔" لبنتا نے جواب دیا۔

"مگر اس پر تو تمہارے بہت سے روپے صرف ہو جائینگے" پریابالا نے حیرت و استعجاب سے کہا۔

"ہاں پچیس تیس روپوں میں اچھی سی گاڑی مل جائیگی۔" لبنتا نے کہا۔

"سنو!" پریابالا نے قریب آکر کہا۔ "تم آخر کوئی بچہ نہیں — جوان ہو۔ خواہ مخواہ روپے کیوں برباد کرتے ہو؟ تمہیں اسی وقت سے کچھ نہ کچھ آئندہ کے لئے پس انداز کرنا چاہئے۔ ورنہ جب تمہاری شادی ہو جائے گی اور دلھن گھر آئے گی تو کیا کروگے؟ اگر تمہارے پاس کچھ روپے نہ رہے تو اس وقت آدمی تو کیا کتے اور بلی بھی تمہاری تقدیر کو روئینگے۔"

"رونے دو۔" لبنتا نے چڑکر کہا۔ وہ اب اپنی بہن کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اور ایسی مہمل باتیں سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ "مگر تم خود میرے لئے اسی وقت سے آنسو نہ بہاؤ۔ عجب فطرت ہے تمہاری۔" یہ کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

"بہن! تم اس کو نہیں پہچانتیں۔" بینا نے کہا۔ "تمہارا خیال تھا کہ وہ اپنی بھاوج کے خلاف ہماری طرفداری ضرور کرے گا۔ مگر دیکھ لیا نا اس کا انداز —؟"

پریابالا کا نشانہ خطا ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے غصہ برس رہا تھا۔ "وہ جو دل چاہے سمجھے!" میں تو اسی کے فائدے کے لئے کہہ رہی تھی۔ بہت جلد اسے معلوم ہو جائیگا کہ اس کے سچے خیر خواہ کون ہیں؟ اگر وہ اپنے روپیوں کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے تو کرنے دو — وہ چاہتا تو صرف معمولی سے چند کھلونے لاکر دے سکتا تھا۔ مفت پچیس تیس روپیہ برباد کر رہا ہے۔"

"بہن! تم بچے کو کیا دوگی؟" بینا نے پوچھا۔ "کچھ سوچا تو ہوگا۔"

"میں چاندی سے ایک تھالی اور ایک پیالہ لائی ہوں وہی دے دونگی۔ وہ ابھی نئے ہی رکھے ہیں۔ تم تو جانتی ہی ہو میں ایک محتاج بیوہ ہوں اور دوسروں کی روٹیوں پر جی رہی ہوں — میرے پاس روپے کہاں کہ قیمتی قیمتی تحائف خرید سکوں۔"

مگر پریابالا اتنی مفلس نہ تھی جتنی وہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے پاس سونے کے کئی زیورات تھے اور اس کے علاوہ کچھ نقد روپے بھی تھے۔ جو اس کا شوہر چھوڑ کر مرا تھا۔ لہذا وہ اگر چاہتی تو کوئی قیمتی تحفہ دے سکتی تھی مگر اسے یہ پسند نہ تھا کہ کوئی اس کے روپوں اور زیور کا ذکر کرے اس لئے اس نے فوراً گفتگو کا موضوع بدل دیا اور بینا کو نصیحت شروع کر دی۔

"تم لبنتا جیسی بیوقوفی نہ کرنا۔ فضول کاموں پر روپے صرف کرنا عقلمندی نہیں۔ مینکا صرف اوپر دل سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے اسے تم سے محبت تھوڑے ہی ہے۔ وہ تو چاہتی ہوگی کہ ہم جلد سے جلد اس گھر کو چھوڑ کر کہیں چلی جائیں۔"

مگر بینا کو اس قسم کی نصیحت کی ضرورت نہ تھی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو دیدی!" بینا نے کہا۔ "آخر قیمتی تحفہ میں کب دے رہی ہوں اگر وہ آگئے تو بچے کے لئے بازار سے کوئی کھلونا لے آئینگے۔ میں ایک پائی بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں۔"

دوسرے دن ہر شخص نے تقریب کی تیاری شروع کر دی۔ گھر پہلے خوب اچھی طرح صاف کیا گیا اور مہمانوں کے قیام کے لئے کمرے آراستہ کئے جانے لگے۔ بازار سے تمام ضروری چیزیں خرید خرید کر لائی جانے لگیں۔ لبنتا بھی جینتا ہی کی طرح پورے انہماک سے کام کر رہا تھا۔ بینا جہاں تک ممکن ہوتا الگ تھلگ ہی رہتی۔ پریابالا کا دل تو رشک اور حسد سے جل رہا تھا تاہم بظاہر وہ ہنس ہنس کر کام کاج میں ہاتھ بٹا لیتی تھی۔ ڈرائنگ روم سے تمام فرنیچر ہٹا کر بورڈنگ ہاؤس پہنچا دیا گیا۔ لبنتا نے بھی اپنا کمرہ خالی کر دیا تھا اور عارضی طور پر بورڈنگ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ وہ دونوں کمرے مہمانوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ گھر میں آنگن اچھا بڑا سا تھا۔ اس کے اوپر نہایت خوبصورت شامیانہ آویزاں کیا گیا۔ اور مہمانوں کو اسی کے نیچے کھانا کھلانے کا انتظام کیا جانے لگا۔ جینتا اور مینکا نے اپنے تمام پڑوسیوں کو بھی کھانے پر مدعو کیا تھا۔

تقریب سے ایک روز پیشتر ہی تمام مہمان پہنچ گئے۔ بچے کے ماموں و ممانی۔ مینکا کی چھوٹی بہن اور ان کے علاوہ بینا کا شوہر پرفل بھی آیا۔ جینتا تمام مہمانوں کو اسٹیشن سے ٹیکسی میں لایا۔ مینکا نہایت خوشی خوشی ان کے خیر مقدم کو آگے بڑھی۔ پریابالا اور بینا بھی شرط اخلاق سے مجبور ہو کر آگے نکل کر کھڑی ہو گئیں۔ شوہر کے آجانے کے باعث بینا کا دل باغ باغ ہو گیا تھا اور وہ بہت بشاش نظر آتی تھی البتہ پریابالا کے چہرے پر بدستور خفگیں موجود تھیں۔

نیکا جب مہمانوں کو لانے کے لئے سیڑھی سے اترنے لگی تو اس نے اپنا منہ بسورتے ہوئے طنز سے کہا۔ "ذرا دیکھو تو۔ یہ آخر دوڑ کس طرح رہی ہے؟ اس کے رشتہ دار کیا آگئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی — اور دیکھنا نیکا کی بھاوج آخر اس قدر زیورات پہن کر کیوں آئی ہے۔ کیا وہ یہ سمجھتی ہے کہ ان لوگوں کے سوا کسی نے پہلے کبھی زیورات دیکھے ہی نہیں۔"

"بہن! تم سمجھی نہیں۔" بینا نے کہا۔ "ہم لوگ چونکہ غریب ہیں اس لئے وہ ہم پر رعب جمانے کے لئے اپنے زیوروں کی نمائش کر رہی ہے۔"

جب مہمان قریب آگئے تو انھوں نے اپنی گفتگو ختم کر دی — دونوں بہنوں نے مسکرا کر ان سے خیریت دریافت کی اور ان کے بچوں کو پیار کرنے لگیں۔ نیکا ان کو کمرے میں بٹھا کر ان کی خاطر و مدارات میں مصروف ہو گئی — اس کا بھائی اور بھاوج مینا اور ننھے بچے سے کھیلنے لگے۔

"بینا! تم اور پردیودھ یہاں سو رہنا۔" پریا بالا نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "جینتا تو بالکل احمق ہے۔ ممکن ہے وہ دوسرے کمرے میں اسے اپنے سالے کے ساتھ جگہ دیدے۔ سنا ہے۔ شام کی گاڑی سے چاچا جی بھی آجائیں گے۔ تعجب ہے اتنے سارے لوگ آخر ٹھہریں گے کہاں؟ جینتا کو تو ان باتوں کی فکر ہی نہیں — بہرحال پردیودھ ایک عرصے بعد آیا ہے اس کی خاطر میں کسی طرح کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔"

بینا کو علیحدہ کمرہ مل گیا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ مگر اس نے نہایت متانت اور تہذیب سے پوچھا — "مگر دیدی! تم کہاں سوؤ گی؟ کہیں جگہ تو نظر آتی نہیں۔"

"میری فکر نہ کرو۔" پریا بالا نے کہا۔ "کوئی انتظام کر لوں گی — صرف ایک رات کی تو بات ہے۔ یہاں جگہ نہ ملی تو چندر امکھی کے یہاں چلی جاؤں گی آخر تم دونوں کو باتیں کرنے کا موقع تو ملنا ہی چاہیے۔"

تمام دن ہما ہمی اور شور و شغب میں گذر گیا۔ مہمانوں کے آرام کا ہر ممکن انتظام کیا گیا۔ پھر بھی نیکا مطمئن نہ تھی۔ بینا اور پریا بالا کبھی کسی کام میں ہاتھ بٹا لیتیں۔ اور پھر گھنٹوں نہ جانے کدھر غائب ہو جاتیں۔ شام کے وقت سے کھانا پکانے کا انتظام شروع ہوا — پڑوس کی چند عورتیں بھی اس سلسلے میں مدد دینے کے لئے آگئیں۔ بسنتا اپنے دو ایک دوستوں کے ساتھ بعض ضروری چیزیں خریدنے کے لئے بازار چلا گیا — دو ایک ہوشیار باورچی کرایہ پر بلائے گئے تھے۔ گھر کے لوگ رات کو مطلق نہ سو سکے۔ بچوں نے بھی جاگتے رہنے کی کوشش کی مگر آخر نیند غالب آنے لگی اور وہ تھک کر سو رہے۔ نو بجے کے بعد پریا بالا نے زبردستی بینا کو بھی کمرے میں بھیج دیا۔ جہاں پردیودھ پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

تقریب کا اصل ہنگامہ صبح سے شروع ہوا۔ نیکا نے بچے کو نہلا دھلا کر نئے نئے کپڑے اور زیور پہنائے۔ مینا نے رو رو کر احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی ہی جیسے کپڑے اور زیور مانگتی تھی۔ آخر نیکا کو اسے بھی زیورات پہنانا پڑے۔

کپڑے پہن کر دونوں بچے خوبصورت تیتریوں جیسے نظر آتے تھے بسنتا گاڑی لے آیا تھا اور بچہ اس میں بیٹھ کر سامنے کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد "نمک چشی" کی رسم ادا کی گئی۔ بچے کو بہت سے تحائف اور کچھ نقد روپے بھی ملے۔ پریا بالا نے جو سوچا تھا وہی کیا۔ جب بڑی پھوپھی نے بچے کو تھالی اور لوٹا دیا۔ تو نیکا بھی پیچھے مڑ کر مسکرانے لگی۔ پردیودھ نے چند معمولی کھلونے پیش کئے۔ اور جینتا کے چچا نے ایک اشرفی دی۔ جب یہ رسم ختم ہو گئی تو مہمانوں کو نہایت پر تکلف کھانا کھلانے کا انتظام شروع ہوا۔

محلے کے مہمان کھا پی کر اب یکے بعد دیگرے رخصت ہو رہے تھے، شام ہونے سے پیشتر سب کے سب مہمانوں نے کھا لیا۔ گھر میں اب کسی کو بھی اور کھانے پینے کی خواہش نہ تھی۔ لہذا کھانا پکانے کا انتظام موقوف تھا۔ ہر شخص تھک کر چور چور ہو گیا تھا — اور اب ذرا لیٹ کر آرام کر رہا تھا۔

جب اندھیرا چھا گیا تو بعض اٹھے اور ہاتھ منہ دھو کر چائے پی۔ باقی اپنے بستر پر جمے رہے اور اٹھنا پسند نہ کیا۔

دوسرے دن تمام مہمان رخصت ہو کر چلے گئے اور نیکا کو اپنے لوگوں سے چھوٹنے کا بہت غم تھا۔ مینا اپنے ماموں زاد بھائیوں کے لئے رو رہی تھی مگر بچہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ بھاری بھرکم کپڑے اور زیور اتار دیئے گئے تھے اور وہ اب اپنے کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

پریا بالا اپنے کمرے میں بیٹھی ہر ہر چیز پر نکتہ چینی کر رہی تھی۔ "سارا گھر گندہ ہو گیا۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی۔ "سمجھ میں نہیں آتا آخر تنہا کس طرح صاف ستھرا کروں؟"

پرو بودھ جا چکا تھا۔ اس لئے مینا ایک کنارے خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ پچھلی دو راتوں کی یاد سے اس وقت اسے تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہیں اسے جانے کے متعلق پرو بودھ نے تم سے کچھ کہا؟" پریا بالا نے پوچھا

"وہ اس قسم کے آدمی نہیں۔" مینا نے بڑبڑا کر کہا۔

"مگر تم نے پوچھا تھا یا نہیں؟" پریا بالا نے پھر زور دیکر استفسار کیا

"ہاں انھوں نے کہا کہ اپنے گھر کے وہ مالک نہیں ہیں۔ میرے والد نے وعدہ کے مطابق جہیز کے تین سو روپے نہیں دیئے اور جب تک یہ روپے وصول نہ ہونگے میرا سسر مجھے اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیگا۔"

"واہ! کیا اچھی بات کہی۔" پریا بالا نے تنک کر کہا۔ اور پھر قدرے توقف کے بعد آپ ہی آپ بولی۔ "روپیوں کو بکس ہی میں بند کر دوں چندا مکھی نے آخر کچھ وہ دونوں روپے دیدیئے۔"

اتنا کہہ کر وہ اٹھی۔ آنچل سے کنجی کا گچھا نکالا اور بکس کھولنے کے لئے بڑھی مگر ابھی اس طرف بڑھی ہی تھی کہ اس کی چیخیں نکل گئیں "ہے بھگوان! ـــ میرا بکس کس نے کھولا ہے ـــ کیا تم نے کھولا مینا؟"

زور سے چیخ کر پریا بالا نے پوچھا۔

مینا ڈر کر چونک سی گئی۔ "کیا بکتی ہو دیدی؟" اس نے پوچھا "میں تمہارا بکس کیوں کھولنے لگی۔ رات میں تمہارے کمرے میں سوئی ضرور تھی۔ مگر صبح سے تو تم خود یہاں موجود ہو ـــ کیا تم نے کبھی مجھے اپنا بکس چھوتے ہوئے دیکھا ہے؟"

پریا بالا اب زور زور سے اپنا سر پیٹ رہی تھی ـــ رو رو کر کہہ رہی تھی۔ "ہے بھگوان یہ کیا آفت آئی۔ میں تو بالکل ہی تباہ ہو گئی! بکس میں میرے سو روپے موجود تھے اور اب ایک بھی نہیں ـــ ہائے غریب بیوہ کو کس نے لوٹ لیا؟ ـــ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا اگر میں تمام روپے کل اپنے بھتیجے ہی کو دیدیتی ـــ ہے بھگوان جس نے مجھ بیکس کا دل دکھایا ہے وہ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی تڑپ تڑپ کر مر جائے۔"

مینا کی آنکھیں جیسے ماتھے سے نکلی جاتی تھیں۔ لپک کر اس نے اپنا ہاتھ پریا بالا کے منہ پر رکھدیا تاکہ وہ اور بددعا نہ دے سکے۔

ٹیکا اور جنیتا بھی شور سن کر کمرے سے باہر نکل آئے اور اس منظر کو دیکھ کر حیران و ششدر کھڑے تھے۔

عید کا چاند

از:- حضرت سروش ملیح آبادی

چرخ کا تاجدار عید کا چاند!   وہ ہوا آشکار عید کا چاند
ہے کھلی چشم شوق گردوں پر   ہے شبِ انتظار عید کا چاند
جھانکتا ہے شفق کی چندری سے   ہے کوئی پردہ دار عید کا چاند
آسماں سے ٹپک رہی ہے شراب   ہے لبِ میگسار عید کا چاند
ٹوٹ کر ایک حور کا کنگن   بن گیا زرنگار عید کا چاند
اپنی کرنوں سے تیز کرتا ہے   نبضِ لیل و نہار عید کا چاند
کاش لے جائے مجھکو کشتی میں   اس افق کے بھی پار عید کا چاند

میرے دل کے صنمکدے میں سروش
کر گیا خلفشار عید کا چاند

عرفانیات

مری غربت کا پہلا دن ہے وقت شام آتا ہے

حضرت مولٰنا محوی لکھنوی

ہوا کا شوخ جھونکا ان کا دامن تھام آتا ہے
مگر میری ہی آہِ سرد پر الزام آتا ہے!

امیدیں جی اٹھیں سب کی مگر رو میں نہ سو جائیں
اگر گردش میں جام اے ساقی گلفام آتا ہے

یہ سورج ڈوبتا ہے یا مرا دل قافلے والو
مری غربت کا پہلا دن ہے وقت شام آتا ہے

وہاں رخ سرخ ماتھے پر پسینہ تیر چٹکی میں
یہاں دل خوش وفا پر ناز کا ہنگام آتا ہے

مری خودداری دل کا لہو ہے اس کی گردن پر
جو نالہ عرش کو جا جا کے یارب تھام آتا ہے

دھڑکتا ہے مرا دل بابِ زنداں کھولنے والے
رہائی کی خبر یا موت کا پیغام آتا ہے

ٹپک کر آنکھ سے ہر اشک دامن تھام لے ان کا
ذرا دیکھیں تو پھر کیونکر انھیں آرام آتا ہے

جو ہے اے خفتگان خاک برحق حشر کا آنا
خرام ناز پر پھر کس لئے الزام آتا ہے

یہ آخر آپ کو آتا ہے غصہ کیوں اسیروں پر
زبانوں پر اگر کچھ شکوۂ ایام آتا ہے

غم احباب وہ غم ہے کہ برسوں آزما دیکھا
نہ میرے کام آتا ہے نہ ان کے کام آتا ہے

حواس و ہوش پر جب نیند دل پر موت طاری ہو
قفس میں بستر گل سے سوا آرام آتا ہے

وہ کنج غم کا نالہ ہو کہ نغمہ بزم عشرت کا
بہر صورت انھیں کے نام کچھ پیغام آتا ہے

فلک سے درد و غم کے نشتروں کی پھر نہ بارش ہو
مرے لب پر تبسم پھر برائے نام آتا ہے

قفس کے بعد یہ دل پوچھتا رہتا ہے تربت میں
یہاں بھی کیا رہائی کا کبھی پیغام آتا ہے

سفینہ ڈوبتا جاتا ہے شمعیں بجھتی جاتی ہیں
ارے او ناخدا یاد اب خدا کا نام آتا ہے

لب رنگیں پہ ہے کچھ کپکپی سی آنکھ میں آنسو
الٰہی آج مجھ کمبخت کا کیا نام آتا ہے

اچھلنے لگتے ہیں رگ رگ سے فوارے خون کے محوی
زبان تیغ پر ان کی جو میرا نام آتا ہے

سلطان واجد علی شاہ

تحقیق کی روشنی میں

از مولوی نور احمد خاں منشی فاضل

گزشتہ اشاعت میں اجمالی طور پر سلطان واجد علی شاہ کے حالات زندگی پیش کیے جا چکے ہیں اب ہم ان الزامات کو بحث و تنقید کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں جو عام طور پر اس مظلوم تاجدار سے چسپاں کیے جاتے ہیں۔

ملک کی بدنظمی

سب سے بڑا الزام بادشاہ پر بدانتظامی کا لگایا جاتا ہے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں بادشاہ کو جبراً کاروبار سلطنت سے غافل کیا گیا۔ ملک کے سیاہ و سفید کے تمام تر ذمہ دار رزیڈنٹ صاحب بہادر رہتے خود ہی احکام جاری کرتے اور خود ہی بدنظمی کی شکایت کرتے تھے۔ صرف اودھ پر کیا منحصر ہے تاریخ عالم کو دہرائیے۔ جہاں کہیں آپ کو دو حاکم ایک ہی ملک میں حکمرانی کرتے نظر آئیں گے وہاں امن عامہ مفقود ہوگا۔ اسی لئے جناب سعدی نے فرمایا تھا

"دو بادشاہ در یک اقلیمے نمی گنجند"

جب تک ایک علاقے پر ایک شخص کی فرمانروائی رہی ہے وہاں نقص امن یا بدانتظامی کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی اودھ میں جب تک کمپنی بہادر کا دخل نہ ہوا تھا اس کی آبادی اور خوشحالی پر دنیا رشک کرتی تھی۔ نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے تدبر اور نیک نیتی نے اودھ کو فردوس ارضی بنا دیا تھا۔ نواب وزیر خاں کو بھی رزیڈنٹ کی عنایتوں نے فرمانروائی سے معزول کر کے فورٹ ولیم میں نظر بند کرا دیا۔ جہاں ان کی باقی زندگی حسرت و ارمان میں بسر ہوئی ذیل کے اشعار سے ان کے رنج و غم کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے تو پر نہ گیا   بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ ثمر تھے کسی مالی کے لگائے   ہر گز کبھی نہالوں میں کبھو آصفی کے پلے ہم
زنداں مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں
رہتے ہیں وزیر علی ہی سے نئی ان دل سے ملے ہم

پنجاب پر بھی جب تک مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دور دورہ رہا یہ ملک ہر پہلو سے آسودہ رہا۔ مگر جونہی بیک وقت لاہور پر تین حاکموں کا اقتدار ہوا ان کے دست تصرف سے نہ محلات بچے نہ مقبروں کے روضے کنگرے شالامار۔ آصف جاہ۔ نور جہاں بیگم۔ اور شرف النسا بیگم کے مقابر سے سنگ مرمر کو اس طرح لوٹا اور کھسوٹا گیا جیسے ہڈیوں سے گوشت پوست کو نکھور لیا جاتا ہے۔ بادشاہی مسجد کو بھی شاہی اصطبل بنا دیا گیا پچھلے دنوں جب میں لاہور گیا تھا۔ مجھے مسجد کے مشرقی دروازے کی محراب پر چڑیوں کی تصویریں بنی ہوئی نظر آئی تھیں۔ یہ سب کچھ دوعملی کی برکات ہیں۔ آج بھی جہاں بدنظمی ہو اسے "سکھا شاہی" سے مثال دی جاتی ہے لیکن عہد واجدی میں لکھنؤ کی علمی ترقیاں اور اس کا تمدن ہندوستان کے بہت سے مقامات سے اچھا تھا۔ ایران اور بخارا سے لوگ جوق در جوق آ اودھ کو آ رہے تھے اور ایران کا مشہور سیاح ناطق لکھنؤ پر ایسا فریفتہ ہوا کہ بے اختیار پکار اٹھا۔ "گدائی لکھنؤ بہ سلطنت ربع مسکوں نوکے دارد"

بغرض محال اگر بدنظمی کے وہ الزامات جو اس مظلوم تاجدار پر لگائے جاتے ہیں صحیح بھی ہوں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو محض ایک تجارتی کمپنی تھی اس کی اصلاح کا درد کیوں ہو گیا اور اگر غلبہ اور اقتدار سے اسے ایسا کرنے کا مجاز بھی تھا تو اس نے ملک پر قبضہ کرنے کی بجائے ملک کے ضبط و نظم پر توجہ منعطف کیوں نہ کی؟ کیا کمپنی ملک پر قبضہ کرنے کی بجائے یہ حکم صادر نہ کر سکتی تھی کہ چونکہ واجد علی شاہ انتظام مملکت کے نااہل ہیں۔ اس لئے مدت العمران کے اختیارات ریذیڈنٹ یا گورنمنٹ کے کسی قابل ہندوستانی عہدہ دار کے کنٹرول میں رہیں گے اور اگر یہ بھی کمپنی بہادر کے سیاست کے متقاضی نہ تھا تو وزیر علی خاں کے عزل پر جس طرح نواب سعادت علی خاں کو مسند نشین کیا گیا تھا اب بھی واجد علی شاہ کی جگہ اس کے بھائی یا کسی بیٹے کو بادشاہ بنا سکتے تھے۔ کیا یہ خاندان اپنے سابقہ حقوق اور مودت و وفاداری کے پیش نظر اس سلوک کا مستحق تھا جو اس سے روا رکھا گیا؟ کیا ایک فرد واحد کے جرم کی پاداش میں اس کے سارے خاندان کو یا اس کی ساری رعایا کو

سزا دینا قرینِ انصاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان عالم واجد علی شاہ کو بدنام کرنا اور ان کے اعمال کا محاسبہ کرنا محض ایک بہانہ تھا۔ جو امر پیش نظر تھا وہ آج کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ؎

پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا؟ کیونکر ہوا؟

خود سلطان عالم اپنی تباہی و بربادی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں کہ "۱۸۵۶ء میں اہالی سرکار کمپنی نے زبردستی اور بے انصافی کی راہ سے ملک پر قبضہ کرلیا۔"

آج تک اصلاح خانہ کے مقصد سے کسی کا گھر ضبط نہیں ہوا تھا اس بارے میں سلطان عالم واجد علی شاہ دنیا میں پہلے ایسے فرمانروا ہیں جن کے عزل پر یہ مثال قائم کی گئی اگر ملک میں بدنظمی ہوتی تو اس کا اثر ملک کی آمدنی اور تمدن پر ضرور پڑتا لیکن تاریخیں اس امر کی شاہد ہیں کہ عہد واجدی میں اودھ کی آمدنی اسی قدر رہی جتنی نصف صدی پیشتر سے چلی آتی تھی۔ غلہ ارزاں تھا آبادی پہلے سے زیادہ اور رعایا آسودہ تھی۔ خدا معلوم وہ کیسی بدنظمی اور بدانتظامی تھی کہ چپ چاپ ملک میں ہوتی تھی مگر اس سے ملک کی کوئی چیز اثر انداز نہ ہوسکی۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

چونکہ سلطنت کا خاتمہ واجد علی شاہ کے عہد میں ہوا اس لئے وہی ہدف ملامت بن گئے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس زمانہ میں صرف اودھ کے ڈراما کا ہی ڈراپ سین ہوا تھا یا ہندوستان کے باقی حصے پر بھی اس کا اثر پڑا تھا؟ اس کا جواب تاریخ سے پوچھو جو ببانگ دہل پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسی دور میں :۔

ا۔ پنجاب سے سکھوں کا استیصال ہوا
ب۔ دکن سے مرہٹے "مرہٹے"
ج۔ بنگال سے نواب سراج الدولہ کی حکومت ختم ہوئی۔
د۔ دہلی سے آخری تاجدار سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوا۔
ھ۔ میسور میں ٹیپو سلطان کی شہادت واقع ہوئی۔

یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر مدبر۔ شجاع اور زبردست مانے جاتے تھے۔ نہ ان میں کوئی واجد علی شاہ تھا نہ کسی میں تلون مزاجی کی عادت تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ان سب کے گلستانوں میں یک وقت خزاں آگئی اور بھرے بھرائے دربار ویران اور تباہ ہو کر رہ گئے درا صل وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں کمپنی کے گل پرزوں نے ان کو سلطنتوں کے درمیان حقد اور عداوت کی ایک خلیج حائل کردی تھی جس سے یکے بعد دیگرے وہ سب تباہ و برباد ہوتے چلے گئے اور کوئی کسی کی امداد کو نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ جنرل ڈکین گورنر جزائر مارشیس وغیرہ کے اعلان کے یہ الفاظ اس دعویٰ کی حرف بحرف تائید کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

" ہندوستان کے رؤسا! آپ نے اس طرز عمل کو دیکھ لیا جو ہندوستان سے روا رکھا جارہا ہے۔ آپ نے وہ دغابازی بھی دیکھ لی جس کے سبب سے وہ بنگال اور بہار پر قبضہ حاصل کرسکے۔ آپ نے اس بے رحمی اور تشدد کو بھی ملاحظہ کرلیا ہے جو بنارس سے خارج کرنے میں چیت سنگھ کے ساتھ کیا گیا۔ فیض آباد کی بدقسمت بیگموں کے ساتھ ان کا وحشیانہ اور غیر مردانہ سلوک۔ سورت۔ ارکاٹ اور اودھ کا علاقہ جائز داروں سے چھین لینے میں ان کی بے انصافی ٹیپو سلطان کی مقبوضات کو اپنے قبضہ میں لے لینے میں ان کے مکر، ظلم اور سب سے آخر میں وہ غیر منصفانہ اور جارحانہ جنگ جس میں وہ آج کل مرہٹہ سرداروں سے معرکہ آرا ہیں یہ سب امور آپ کے مشاہدہ میں آچکے ہیں ـــــ الخ "

(اعلان جنرل ڈکین ۱۸۰۴ء)

پچھلے اوراق میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہندوستان کے سلاطین کو نااہل ثابت کرنے میں کتنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا ہے۔ آئیے اب ذرا انگریزی حسن انتظام کی بہار بھی مشاہدہ کرلیں۔

غلام حسین طباطبائی انگریزوں کا پروردہ اور اپنے ہم عصر سلاطین کا مخالف ہے۔ سیر المتاخرین (جو در اصل انگریزوں کی تحریک سے لکھی گئی تھی) میں جگہ جگہ اپنے آقایان نعمت کے مزے لے لے کر تعریف کرتا ہے۔ ایک جگہ بے اختیار چند حقائق کا انکشاف بھی کرجاتا ہے۔ جن کا ملخص حسب ذیل ہے۔

(۱) انگریزی عملداری میں اعلیٰ خاندان اور گھرانے کے لوگوں کی جانب کچھ توجہ نہیں کی جاتی اور انھیں دیوار کے برابر بتوں کی طرح بٹھا دیا جاتا ہے۔

(۲) اکثر انگریز اپنی رعایا کی زبان نہیں سمجھتے جو انگریزی سے قطعاً نابلد ہے۔

(۳) جو لوگ ذمہ دار اور بھروسے کے عہدوں پر قائم ہوتے ہیں، انھیں جلد جلد تبدیل کردیا جاتا ہے۔

(۴) جب انگریز اپنے تئیں بھیڑ بھاڑ میں دیکھ لیتے ہیں یا جب وہ ان کی شکایات اور واویلا کو سنتے ہیں تو اس وقت وہ نہایت چیں بجبیں اور غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔

(۵) یورپین نے ان ممالک کے باشندوں کو مختلف قسم کی تجارت اور آرام و آسائش کے سامان سے محروم کر دیا ہے جس سے وہ اب تک متمتع ہوتے چلے آئے ہیں۔

(۶) انگریز اپنے اہل ملک۔ رشتہ دار اور دیگر متوسلین کا بہت زیادہ لحاظ اور طرفداری کرتے ہیں۔

(۷) انگریزوں نے مقدمات فیصل کرنے کے لئے عدالت ہائے عالیہ کا قیام کیا ہے جہاں فیصلہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو اپنی ساری عمر کی کمائی دینی پڑتی ہے۔

(۸) درخواستوں کا انگریزی مترجم بہت سی اشرفیاں وصول کرتا ہے اور عدالت عالیہ جانے کے لئے طول طویل اور گرانبار سفر اختیار کرنے پڑتے ہیں۔

(۹) انگریز اپنے متوسلین کے نمائندگان پر حد سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں۔

(۱۰) عام درباروں کے ذریعہ سے کارروائی کرنے کی بجائے سزاؤں وغیرہ کے معاملات میں وہ پرائیویٹ طریقہ سے فیصلہ کرتے ہیں۔

جب ایک جفاکش، عاقبت اندیش، مہذب اور شائستہ قوم پر ان کا اپنا خیر اندیش مورخ یہ الزامات لگا سکتا ہے تو پھر بچارے واجد علی شاہ کا کیا قصور ہے کہ جو نہ تو کمپنی جیسا مطلق العنان فرمانروا تھا اور نہ اس کا ماحول موافق تھا۔ حکومت کے جس قدر کل پرزے تھے وہ بھی سب غیروں کے کنٹرول میں تھے ایسے حالات میں بادشاہ پر بدنظمی کا اتہام لگانا بے انصافی نہیں تو کیا ہے؟

تعیش پسندی

اس بادشاہ پر سب سے بڑا الزام جو چسپاں کیا جاتا ہے وہ "عیش کوشی" کا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بادشاہ طبعاً حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ خود بھی غضب کے حسین تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے محل میں تین سو ساٹھ بیگمات تھیں لیکن عمر بھر نہ تو انھوں نے کہیں حرام کیا اور نہ افیون شراب یا کسی اور نشہ آور چیز کو منہ لگایا۔ بیگمات کی کثرت پر بادشاہ پر شرعی حیثیت سے تو کوئی الزام آ ہی نہیں سکتا کیونکہ بادشاہ مذہباً اثنا عشریہ تھے اور ان کے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے جائز تھا۔ چنانچہ سلطان فیروز شاہ بہمنی آٹھ سو عورتوں سے روزانہ متعہ کا صیغہ پڑھتے تھے۔ جن کا ذکر فرشتہ ان الفاظ میں کرتا ہے: "دریک روز ہشتصد زن را صیغہ متعہ خواند" بیگمات کا ہجوم غفیر علاوہ تھا۔ جن کا اندازہ "از ازدحام و کثرت زنان اندیشیدہ

قضا بطہا مقرر کردہ" سے ہو سکتا ہے۔ سلطان السنہ عالم کا عالم تھا۔ اس لئے ہر ملک کی عورتوں کو محل میں داخل کر رکھا تھا اور اُن سے ان کی اپنی زبان میں گفتگو کرتا تھا فرشتہ منجملہ ان کے دکنی محل، عربی محل، چرکسی محل، ترکی محل، روسی محل، گرجی محل، فارسی محل، فرنگی محل، خطائی محل، افغانی محل، راجپوتی محل، بنگالی محل، گجراتی محل، بنگشی محل، کنہری محل، مرہٹی محل، کا ذکر کرکے آگے لکھتا ہے وغیرہ ذالک۔ خدا معلوم صحیح تعداد کیا ہوگی۔ اور ساتھ ہی مذہبی پابندی کا اس طرح ذکر کرتا ہے کہ "ہر روز ربع جزو کلام اللہ می نوشت و ہیچ فریضہ فوت نمی کرد"

لوگ کثرت ممتوعات پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ یہ امر واجد علی شاہ کے اتقا اور احتیاط کا ثبوت ہے۔ وہ ایک لحظہ کے لئے بھی اس بات کے روادار نہ تھے کہ ان کی نگاہ کسی نامحرم عورت پر پڑ سکے لیکن وہ ایک بڑی سلطنت کے فرمانروا تھے جہاں ہر وقت خادماؤں۔ محلدارنیوں۔ مغلانیوں۔ بہشتنوں اور مہترانیوں کی ایک بڑی جماعت کو حاضر رہنا پڑتا تھا۔ متعہ کرنے سے غرض یہ نہ تھی کہ اسے بادشاہ کی خلوت گاہ میں بھیجا جا سکے۔ صرف یہ پہلو ملحوظ خاطر تھا کہ ان کا دیکھنا جائز ہو جائے اور اگر کسی پر نظر انتخاب پڑ جائے تو بستر عیش پر طلب کیا جا سکے اس لئے جو رقاصہ یا خادمہ محل شاہی میں داخل ہوتی پہلے انھیں "قبلہ و کعبہ" کے حضور میں پیش کیا جاتا اور حضرت "قبلہ و کعبہ" یہ تحقیق کر لینے کے بعد کہ ان کی کہیں باقاعدہ شادی تو نہیں ہو چکی۔ سلطان عالم کے ساتھ "نکاح موقت" پڑھ دیتے۔ اس طرح اگرچہ سیکڑوں ممتوعات محل شاہی میں داخل ہو چکی تھیں مگر سوا چند خوش بخت ممتوعات کے باقی سے ازدواجی تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے بہشتنوں اور مہترانیوں کو بھی زوجیت میں لے رکھا تھا۔ وہ سخت دھوکہ میں ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ بادشاہ دو خادماؤں سے "آبدست" لینے میں امداد لیتے تھے چونکہ ان پر "ستر" ظاہر کرنا پڑتا تھا اس لئے بادشاہ نے ان سے متعہ کرکے ایک کو "آب رساں بیگم" اور دوسری کو "مصفیٰ بیگم" کا خطاب عطا کیا تھا۔

سلاطین اور والیان ریاست تو ایک جگہ رہے آج کل معمولی معمولی زمینداروں اور رئیسوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور ملازموں کے گھروں میں بلا تکلف گھس جاتے ہیں اور والیان ملک تو افراد رعایا کی ہر شے اپنی ملکیت خیال کرتے ہیں۔ ان کے محلات میں چند بیگمات کے علاوہ ہزاروں خادمائیں اور کنیزیں چلتی پھرتی نظ

جن میں سے کوئی ایک آدھ "مشی فی النوم" کی خدمت سے بچ جائے تو بچ جائے ورنہ اکثر و بیشتر حلال و حرام کے امتیاز سے ورا الورا، نظر آتے ہیں جن میں سے ہزاروں شاہزادے غریبی کے لباس میں اپنی زندگی "نبے ملک نواب" بن کر بسر کر جاتے ہیں لیکن سلطان عالم نے "حدود اللہ" کا احترام کرتے ہوئے جوانی کی بہار کا لطف اٹھایا تو کون سی قباحت ہو گئی مگر اس پر بھی ہم کہیں گے کہ بادشاہ نے عمر بھر نہ کبھی حرام کیا اور نہ کسی عورت کو اپنے سامنے آنے دیا۔ گویا ع

بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

بادشاہ پر جو فرد جرم لگائی جاتی ہے اس کی ایک شق یہ بھی ہے کہ بادشاہ خود ناچا کرتے تھے۔ اور اس تہمت کو اتنی ہوا دی گئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ بادشاہ کے ناچنے کی فرضی اور جھوٹی تصویریں بنوا کر نہ صرف ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلائی گئیں بلکہ ان کو لندن کے بازاروں تک پہنچایا گیا۔ یہ عنایت بھی رزیڈنٹ صاحب بہادر کی شرمندہ احسان ہے آپ نے انتزاع سلطنت کے سلسلے میں جہاں خاندان شاہی کے معزز افراد کو ان کے خلاف اکسایا اور ہزاروں "کردہ" و "ناکردہ" الزامات ان کے سر تھوپے گئے وہاں یہ غیر شریفانہ کوشش بھی عمل میں لائی گئی حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ناچ میں بادشاہ کو اتنی بصیرت حاصل تھی کہ اگر کوئی شخص ناچ میں یا اس کی گت میں غلطی کرتا تو یہ سرفن مولا بادشاہ ہاتھ اٹھا کے بتا دیتا کہ یوں نہیں بلکہ اس طرح ناچو۔ لیکن خود سلطان عالم نہ کبھی لکھنؤ میں ناچے نہ کلکتہ کے مٹیا برج میں۔ اس امر کی محقق لوگوں نے ان ڈاڑھیوں سے تصدیق کی ہے جو سالہا سال بادشاہ کے ساتھ رہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو زبان کا سب سے پہلا ڈرامہ "اندر سبھا" ان کے زمانہ میں امانت نے لکھا لیکن نہ تو یہ سلطان عالم کے اشارہ سے تصنیف کیا گیا اور نہ اس کا کھیل کبھی قیصر باغ میں ہوا اور نہ بادشاہ اس میں شریک ہوئے لیکن بد دستوں نے یہاں تک مشہور کر دیا کہ بادشاہ خود راجہ اندر بنے تھے۔ سبحانک ہذا بہتان عظیم۔ ؎

آں قدر جور کن کہ گر جائے !
گفتہ آید کس اعتماد کند،

اس قسم کے بیہودہ الزامات جو بادشاہ کی ذات سے منسوب کیے گئے ہیں کسی معتبر تاریخ میں نہیں ملتے۔ ابھی تو سلطان عالم کو دنیا سے پردہ کئے نصف صدی کے قریب عرصہ ہوا ہے ان کے دیکھنے والے اور ان کے بال بچے بقید حیات ہیں۔ واقعات و حالات "پردہ اخفا" میں بھی نہیں رہ سکتے نہ ہو سکے۔ پھر یہ کیا ظلم ہے کہ جس کا جو جی چاہتا ہے لکھ دیتا ہے نہ گورنمنٹ احتساب کرتی ہے اور نہ ان کی اولاد ایسے بدباطن اور بدبیں اشخاص پر ہتک حرمت کا دعویٰ کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب اگر اخبارات میں طلا اور ضماد کے اشتہارات چھپتے ہیں تو انھیں بھی اس بادشاہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

طلائے واجد علی شاہ

میں نے کئی رسائل اور اخبارات میں اس عنوان کے اشتہار پڑھے ہیں۔ ہمیں اس کی حقیقت سے انکار نہیں کہ رزیڈنٹ کے اشاروں پر قوت شہوانی کو ہیجان میں لانے کے لئے کشتے کھلائے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ طلاؤں تک نوبت پہنچی ہو مگر کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آج کل ملک کے ملک کے بر خود غلط نواب اور امرا طلاؤں کا استعمال نہیں کر رہے۔ کیا لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے قسیس، رہبان۔ علما اور مشایخ کشتہ خوری سے انکار کر سکتے ہیں۔ کیا بڑے بڑے صوفی اور پیر اس غرض کے لئے افیون اور سنکھیا سے شوق نہیں کر رہے؟ مزید براں طلاؤں اور معجونوں کی جو آج کل گرم بازاری ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ کسی اخبار کو اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو اس کا ⅓ حصہ قوت مردمی کے اشتہارات سے بھرا ہوا نظر آئیگا۔ اور اشتہارات کے الفاظ ایسے فحش اور عریاں ہونگے کہ انسانی شرافت آپ کو ان کے مطالعہ کی مطلق اجازت نہ دیگی، بہر حال اگر طلاؤں اور معجونوں کی نمائشی ایک مذموم سی چیز ہے اور ان کا استعمال قوم و ملک کے لئے بیحد مضر ہے تو مناسب یہ ہے کہ ان کی روک تھام کی جائے اور ایسی گندی چیزوں کو سلاطین یا فرمانرویان ملک کے ناموں سے منسوب نہیں کرنا چاہئے اور اگر یہ سلسلہ مذموم نہیں ہے تو پھر غریب واجد علی شاہ پر کیا منحصر ہے؟ اب ہم سلطان عالم کی اصلی تصویر تحقیق و تنقید کی روشنی میں ناظرین کرام کے پیش کرتے ہیں۔

سلطان عالم کے اوصاف جمیلہ

دنیا بھر کی تاریخیں دیکھ ڈالئے آپ کو ایسا کوئی تاجدار نہ ملے گا، جس میں دنیا بھر کے کمالات جمع ہو گئے ہوں۔ یہ صرف اور صرف سلطان عالم ہی کا حصہ ہے کہ اسے قدرت نے جہاں فیاضی سے حسن ظاہری عطا فرمایا وہاں باطنی خوبیوں سے بھی متمتع کیا۔ اس بے مثل و بے نظیر سلطان میں بابر کی جفاکشی۔ ہمایوں کی اقربا پروری۔ اکبر کی رواداری۔ جہانگیر کی عدل نوازی، شاہجہاں کا شوق تعمیرات۔ اورنگ زیب کا اتقا

ابوالفضل اور وحید طاہر کی انشا پردازی - امیر خسرو اور نظیری کی شاعری قدرت نے اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی کہ یہ ہر حیثیت اور ہر لحاظ سے جامع کمالات نظر آنے لگے تھے - حافظ جلیل حسن صاحب جلیل اپنے رسالہ "تذکیر و تانیث" میں لکھتے ہیں کہ "حضرت اختر ہمہ گو اور ہمہ داں" تھے - اگرچہ دربار میں ہر فن کے کامل جمع تھے مگر سلطان عالم جملہ علوم و فنون کے مربی اور مبصر تھے - دماغ ایسا نازک اور صحیح واقع ہوا تھا کہ بعض باتوں پر دنیا کو حیرت میں ڈال دیتے تھے - ایک موقع کا ذکر ہے کہ سلطان عالم اسد منزل میں تشریف رکھتے تھے ایک بڑے جشن کی تقریب تھی - آپ چاندی کے پلنگ پر بیٹھے تھے اور چاروں طرف ممتوعات کا جھرمٹ تھا - سامنے ناچ ہو رہا تھا - بیٹھے بیٹھے دفعتہ سلطان عالم نے ناک سکوڑی - اشفاق السلطان داروغہ محلات نے گھبرا کر عرض کی "اے جہاں پناہ کیا ہوا ؟" فرمایا "چمپے کے پھول کی بُو آتی ہے" کہا گیا "عالم پناہ ! چمپے کا یہاں کیا کام ؟" ارشاد ہوا "تحقیق ہونی چاہیئے" اس پر ممتوعات کی تلاشی لی گئی - چند ساعت کی کدو کاوش کے بعد ایک ممتوعہ جو سلطان عالم سے پندرہ بیس گز کے فاصلہ پر بیٹھی تھی اس کے کان سے چمپے کا پھول نکلا دیکھنے والے ششدر رہ گئے -

سلطان عالم کی زبان ایسی فصیح، شیریں اور دلنشین تھی کہ سامع کا جی چاہتا کہ وہ بولتے رہیں اور یہ سنتا رہے - افسوس آج کل بازار میں ان کی جو تصانیف بک رہی ہیں ان کی نظموں اور تحریروں میں عالم پناہ کے بولنے والی زبان نہیں - وہ زبان جس پر دنیا جان نثار کرتی تھی جس کی دلکشی اور شیرینی پر موسیقی کے سارے سُر تال قربان ہوتے تھے ان کے وجود مسعود کے ساتھ قبر میں دفن ہوگئی کیونکہ اس وقت تک عام قاعدہ کے مطابق تحریروں میں لوگ عربی اور فارسی کی مشکل ترکیبوں کو داخل کرنا لازمہ فصاحت خیال کرتے تھے اور چونکہ سلطان عالم بھی اسی ماحول میں پروان چڑھے تھے اس لیئے ان کی تحریر بھی غرابت سے خالی نہ تھی اس لیئے سلطان عالم کی تحریر کو ان کی تقریر کا درجہ دینا حد درجہ کی بے انصافی ہے -

آج کل گندہ دہنی کی شکایت اس قدر عام ہو چکی ہے کہ خدا پناہ عوام کی رذالت اور خواص کے قہر و جلال کا مظہر بنی ہوئی ہے - مگر سلطان عالم کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے عمر بھر غصہ کے وقت بھی کسی سے سخت کلامی نہیں کی - بسا اوقات ایسا ہوتا کہ جب کسی سے ناراض ہوتے تو چپ ہو جاتے اور اگر کسی سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوتی تو خفا ہونے کی جگہ اسے پیار محبت سے سمجھاتے کہ ایسا نہیں بلکہ یوں کرنا چاہیئے -

اخلاقی حالت اس قدر بلند تھی کہ عمر بھر قوت ناطقہ "کذب آشنا" نہ ہوئی - سخاوت کا یہ عالم تھا کہ سیکڑوں شعرا خزانۂ عامرہ سے وظائف پاتے اور لاکھوں فقرا و مستحقین قبلہ و کعبہ کی وساطت سے دونوں وقت بادشاہ کے لنگر سے "قوت لایموت" حاصل کرتے تھے خیرات و صدقات اور انعام و اکرام کی انتہا نہ تھی - لوگوں کے ذہنوں سے حاتم اور برامکہ کی یاد محو ہو چکی تھی - مزید براں حق پسند راست گو - رعایا پرور حلیم - مدبر اور عالی ظرف انسان تھے - ملاقات کو خواہ کتنا حقیر سا آدمی کیوں نہ آتا سلطان عالم اس قدر انکساری اور فروتنی سے کام لیتے اور اتنی سادگی سے گفتگو فرماتے کہ چہرے پر معصومیت دوڑ جاتی اور جبین شاہی چمک اٹھتی - ایسے پریم و شانتی کی کیفیت پیدا ہو جاتی کہ ملاقاتی سو جان سے فدا ہو جاتا - لیکن اس پر مزاج میں خودداری اور غیرت کا مادہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا -

وضعداری کی روشن مثال

زمانہ شاہی میں دستور تھا کہ باہر سے جو راجے مہاراجے اور تعلقدار ملنے کے لیئے آتے انھیں صرف وزیر اعظم کی باریابی نصیب ہوتی مہاراجہ بنارس آپ کے باجگذار تھے اور جب بادشاہ کلکتہ کی طرف کونسل میں اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیئے آ رہے تھے تو راستہ میں مہاراجہ صاحب نے کمال عقیدتمندی سے میزبانی کا حق ادا کیا تھا - بادشاہ کلکتہ پہنچتے ہی نظر بند کر دیئے گئے - کچھ عرصہ بعد پرنس آف ویلز کی آمد پر ایک بڑا دربار منعقد ہوا جس میں شامل ہونے کے لیئے مہاراجہ بنارس بھی تشریف لائے ادھر سے فارغ ہو کر بادشاہ کے وزیر اعظم کے حضور میں حاضر ہوئے ایک عرضداشت بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیئے دی اور زبانی یہ عرض کیا کہ "میں اپنی حقیقی سرکار جہاں پناہ ہی کو سمجھتا ہوں - لہذا مجھے جتنی مسرت ان کے ہاں باریابی میں ہوگی اور کسی بات میں نہیں ہو سکتی - اس کے علاوہ میرے پاس چند قیمتی جواہر بادشاہ کے قابل ہیں - چاہتا ہوں کہ انھیں بادشاہ کی نذر کر دوں "

وزیر اعظم نے مہاراجہ صاحب سے وعدہ کیا کہ میں آپ کو بادشاہ سے ضرور ملا دونگا - اور وہ عرضداشت جو اس قسم کے گذارشات کی حامل تھی لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساتھ ہی کہا کہ مہاراجہ صاحب حضرت کے انتہائی عقیدتمندوں سے ہیں اور انھیں جہاں پناہ کی ملاقات کا اشتیاق بیحد کمال ہے اور پھر جواہرات کا لالچ بھی دیا -

جن کے پیش کرنے کا مہاراجہ صاحب نے زبانی وعدہ کیا تھا۔ بادشاہ نے ایسے ہی کچھ یوں بیان کر دی جس سے وزیر صاحب نے یہ سمجھا کہ بادشاہ نے ملاقات منظور فرمائی ہے لیکن جب مہاراجہ صاحب کی وہ عرضداشت ملاحظہ سے ہو کر واپس آئی تو اس کی پیشانی پر ذیل کے الفاظ تحریر تھے۔

"حسب دستور سابق وزیر السلطان بہادر ملاقات نماید"

مہاراجہ صاحب نے بھی اس خیال پر عرضداشت گزاری تھی کہ اب چونکہ شاہی نہیں رہی اس لئے جواہرات کی طمع پر سلطان عالم ملنا گوارا کر لیں گے۔ نواب وزیر السلطان نے بھی قریباً قریباً یہی سوچ کر ملاقات کا موقع دینے کی سفارش کی تھی۔ لیکن جب اس نے یہ حکم دیکھا تو حیران رہ گیا۔ دوسرے دن جا کر التماس کی کہ جہاں پناہ نے مہاراجہ صاحب کی بڑی دلشکنی فرمائی ہے۔ بادشاہ نے فرمایا "نواب صاحب! مہاراجہ صاحب بنارس کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں۔ میں ان سے ضرور ملتا لیکن آپ نے جو یہ کہا کہ وہ کچھ جواہرات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اب آپ ہی خیال کریں کہ اگر میں ان کی پیشکش قبول کر لیتا تو ضرور تھا کہ ان کی قیمت سے زیادہ کا خلعت بھی مرحمت کرتا۔ مگر اب ہمارے پاس دھرا کیا ہے۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ ان کی ملاقات کو کسی معقول بہانے سے ٹال دیا جائے۔"

اس واقعہ سے جہاں بادشاہ کی وضعداری کی داد دینا پڑتی ہے وہاں بادشاہ کی مصیبت پر رونا بھی آتا ہے کہ انھیں اتفاقات و حادثات نے کس قدر بے بس کر دیا تھا اور وہ جب اس طرح اشتیاق مالا یطاق رکھنے کے باوجود دل پر پتھر کی سل رکھ کر ملنے سے انکار کر دیتے ہونگے تو انھیں کس قدر غم ہوتا ہوگا۔ غرض ؏

میرے مٹنے کا تماشہ دیکھنے کی چیز تھی

سلطان عالم کے علمی و فنی کمالات

سلطان عالم کا فطری رجحان موسیقی اور فنون طرب کی طرف تھا اگرچہ علم و فضل اور تدبر و دانش میں بھی سلطان عالم یکتائے روزگار تھے مگر یہ فنون لطیفہ ان سب پر غالب آگئے تھے۔ اور جس طرح چاند کے نکل آنے پر تمام ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اسی طرح وہ جملہ خصائص اپنی اپنی جگہ برقرار ہوتے ہوئے بھی شیرہ چشم حضرات کو نظر نہ آتے تھے۔ لاریب جہاں آپ نے ورثہ میں اودھ کی سلطنت پائی تھی اسی طرح فطرت نے آپ کو اقلیم شعریت کا تاجدار بنا دیا تھا۔ مورثی سلطنت نے دھوکہ دیا اور خند ... سلطان کو چھوڑ کر غیروں کی گود

میں چلی گئی۔ مگر شعر و شاعری نے نہ صرف زندگی تک اس تاجدار کا ساتھ دیا بلکہ اس کے بعد بھی اسی کے دامن سے وابستہ رہی چنانچہ آج بھی مشرق و مغرب میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ان کا کلام پڑھنے والے موجود ہیں۔

سلطان عالم کی شاعری

بادشاہ اُردو میں اختر اور ہندی میں جانِ عالم تخلص کرتے تھے میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے اصلاح لیتے تھے۔ مرزا شوق کی مثنویوں کو جو دیکھا پسند آگئیں اور پھر اسی رنگ میں کہنا شروع کر دیا۔ دربار اسیر۔ برق۔ قلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں قبول۔ شفق۔ بیخود۔ ہنر۔ عطارد۔ ہلال اور سرور جیسے فاضل شعرا سے بھرا ہوا تھا۔ نظم و نثر کا اس قدر چرچا تھا کہ تحریر تو بجائے خود رہی تقریر میں بھی کیا مجال کہ کسی کی زبان سے کوئی غلط یا خلاف محاورہ لفظ نکل جائے سلطان عالم اس زمانے کے عام رنگ کے مطابق شعر کہتے تھے ان کے کلام میں لفظوں کی رنگینی۔ محاوروں کی بندش تمثیلات کا اندازہ حسن بیان۔ استعاروں کا استعمال اور تشبیہ مجازی کو اتنا دخل ہے کہ قدر شناس حضرات تحسین ادا کئے بغیر نہیں رہتے نمونہ کے طور پر تبرکاً دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

کمر دھوکا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ
تکلم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ

برائے سیر مجھ سا رند میخانے میں گر آئے
گرے ساغر۔ لنڈھے شیشہ۔ ہنسے ساقی بہے دریا

آپ نے چھ دیوان، سات مثنویاں اور تین جلدیں مراثی کی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں جو کم و بیش ہندوستان کے ہر شہر سے مل سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان عالم بیحد بے تکلفی اور سہولت سے شعر موزوں کرتے معلوم ایسا ہوتا گویا نثر لکھ رہے ہیں۔ ایک موقع پر آپ بوجہ پردہ ہو محل خاص سے امام باڑہ سبطین آباد کو جا رہے تھے کثرت کار اور عدیم الفرصتی سے مرثیہ لکھنے کے لئے وقت نہ نکال سکے چنانچہ اسی وقت اس بلبل ہزار داستان نے آئمہ معصومین کی شان میں نغمہ سرائی شروع کی۔ دو محرر ساتھ تھے۔ ایک نے مرثیہ کے بند اور دوسرے نے سلام کے اشعار جو جدا جدا بحروں میں تھے لکھنے شروع کئے مگر اس سرعت سے کہ سلطان عالم کلام موزوں کر رہے تھے اور ان دونوں کا قلم رکنے نہ پاتا تھا۔ ابھی ایک شعر لکھ کر فارغ نہ ہوتے کہ بادشاہ دوسرا شعر لکھوا دیتے

امام باڑہ سلطین آباد تک بمشکل ڈیڑھ سو فرلانگ کے قریب کا فاصلہ تھا پہنچتے پہنچتے چھ بند اور پورا سلام لکھوا دیا۔ مگر افسوس کہ یہ رنگ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

سلطان عالم کی طرب نوازی

بادشاہ کو موسیقی سے حد درجہ محبت تھی اس فن میں آپ نے اتنی ترقی کی تھی کہ بڑے بڑے گویئے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ ستار اس غضب کا بجاتے کہ روتے لوگ ہنس پڑتے اور ہنستے رو دیتے۔ لَے سلطان عالم کی رگ و پے میں اس قدر سرایت طے کر چکی تھی کہ سوتے میں بھی پاؤں کا انگوٹھا لَے پہ چلنے لگتا تھا۔ موسیقی میں تو بادشاہ اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ سیکڑوں کلاونتوں کے ہاتھوں میں ناڑے بندھوا دیئے تھے۔ جُنّی خاں کلکتہ کا ایک مشہور مطرب تھا اس کی آواز میں اتنی دلکشی تھی کہ اس کے سامنے کسی طوائف کا رنگ بھی نہ جم سکتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مٹیا برج میں کسی کے یہاں گا رہا تھا بادشاہ نے آواز سنی تو بیتاب ہو کر طلب کرایا لیکن جب وہ گانے بیٹھا تو فرمایا۔ "ہاں آواز تو اچھی ہے مگر گانا نہیں جانتا۔"

ہندوستان کی تاریخ میں کئی مسلمان بادشاہ فن موسیقی کے استاد تسلیم کئے گئے ہیں۔ شاہجہاں بادشاہ کے متعلق تو صاحب سیرۃ المتاخرین یہاں تک لکھتے ہیں کہ ان کے گانے میں اس قدر سوز و گداز ہوتا تھا کہ کتنے باخدا صوفیوں نے وجد میں آکر جان دیدی تھی۔ محمد شاہ روشن اختر اور بہادر شاہ ظفر بھی موسیقی میں جواب نہ رکھتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس قدر فنی معلومات سلطان عالم کو حاصل تھیں نہ سلاطین ماضیہ میں سے کوئی ان کا عامل تھا نہ حال کے سلاطین، نواب اور جاگیردار وں میں سے کوئی اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

لاریب بادشاہ، شاہ سخن تھے۔ اور ان کی سخن فہمی و سخن سنجی غضب کی تھی۔ دربار میں صرف ان ڈھاڑیوں کی باریابی ہوتی جنھیں موسیقی میں کمال حاصل ہوتا مگر ان میں سے بھی نصیب والے اپنا رنگ جما سکتے تھے۔ ناچ دیکھنے کے بھی سلطان عالم بیحد مشتاق تھے مگر اس میں بھی عمر بھر شریعت کا پہلو ملحوظ خاطر رہا یعنی بازاری عورتوں اور طائفوں کو بادشاہ نے اپنے حضور میں حاضر ہونے سے روک دیا تھا لیکن چونکہ اس شوق کا پورا کرنا بھی ضروری تھا اس لئے ممتوعات کے مختلف گروہ اور طائفے بنا لئے مثلاً جھومر والیاں۔ نقل والیاں۔ لکن والیاں۔ نتھ والیاں۔ رادھا منزل والیاں۔ وغیرہ ان سب کو تعلیم دینے کے لئے کامل الفن ڈھاڑی مقرر کئے گئے جو صبح شام انھیں آکر تعلیم دیتے۔ جب کبھی بادشاہ کو ناچ دیکھنے کا شوق ہوتا انھیں بلا کر طبیعت کی تسکین کر لیتے۔

ایک دفعہ بادشاہ نے اسد منزل میں پندرہ روز کا جشن کیا۔ اس کے ایک بڑے ہال میں سلطان عالم چاندی کے پلنگ پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے اردگرد پری جمال اور حسین متاعیوں کا جھرمٹ لگا تھا۔ ناچ شروع ہوا ممتوعات کے طائفے باری باری آکر مجرا کرنے لگے۔ جب بھی ان سے بھاؤ یا گت میں غلطی ہوتی۔ خود جہاں پناہ ہاتھ اُٹھا کے بتا دیتے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے آنکھ سے اس خوبی کے ساتھ اشارہ کرتے کہ رمز شناس ممتوعات سمجھ جاتیں۔ ٹھمری کہنے میں تو سب سے بازی لے گئے۔ اتنا عرصہ گذرنے کے باوجود آج بھی یو۔پی اور بہار کے نواح میں عام لوگ ان کی ٹھمریاں گاتے نظر آتے ہیں۔ مزید براں بادشاہ نے کئی راگنیاں بھی ایجاد کی تھیں۔ اور ان کے نام اپنی طبع عالی کے موافق بادشاہ پسند۔ جوگیا۔ کنٹر، جوہی وغیرہ رکھے تھے۔

فنّ ڈراما

آج کل "ڈراما" کا فن جس اوج کمال کو پہنچ چکا ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ "ڈرامائی دنیا" کے لوگ موجودہ قحط سالی میں بھی سونے اور چاندی سے کھیل رہے ہیں نہ ان پر جنگ عالمگیر کا کچھ اثر پڑ رہا ہے۔ اور نہ بین الاقوامی منافرت ان کا کچھ بگاڑ سکی ہے۔ جب بھی کوئی نیا ڈراما تیار ہوتا ہے ایک دنیا دیکھنے کو ٹوٹ پڑتی ہے۔ نہ ڈراما دیکھنا توہین خیال کیا جاتا ہے اور نہ ڈراما کی اداکاری میں کوئی ہتک محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا جو چیز آج کل اس قدر مرغوب و مطبوع خیال کی جاتی ہے کہ ملک و ملت کے ممتاز لیڈر اور کونسل کے معزز اراکین اس کی مدح و ستائش میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ وہی چیز اگر ایک بادشاہ سے منسوب کی جاتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بدنام کیوں کیا جاتا ہے جب ایک چیز حال کے امرا اور اراکین سلطنت کے لئے محمود تصور کی جاتی ہے تو اسی چیز کو ماسبق سلاطین کے لئے مذموم اور نامحمود خیال کیوں کیا جاتا ہے؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو ڈراما کا آغاز اودھ کی مردم خیز زمین سے حضرت سلطان عالم کے عہد میں ہوا لیکن یہ قطعاً غلط ہے کہ بادشاہ نے بطور چیف ایکٹر کے کام کیا۔ یا بادشاہ کے تیار کردہ

قیصر باغ میں اس کا کھیل کھیلا گیا۔ درحقیقت واقعہ صرف اتنا ہے کہ امانت نے آپ کے زمانہ میں اُردو زبان کا پہلا ڈراما "اندر سبھا" لکھا اور لکھنؤ میں اس کا کھیل بھی کھیلا گیا۔ بدگمانوں نے اس کے ساتھ یہ ایزاد کر دیا کہ یہ ڈراما قیصر باغ میں سٹیج ہوا اور خود بادشاہ سلامت نے راجہ اندر کا پارٹ کیا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ بادشاہ نے مہاراج سری کرشن جی کا رہس دیکھا تھا۔ اور ان کی یہ رومانی ادا اس قدر پسند آئی کہ اس رہس سے اپنا کھیل ڈراما کے طور پر ایجاد کیا۔ چنانچہ سالگرہ کی تقریب پر موتیوں کو جلا کے بھبھوت رمائی جاتی اور بادشاہ گیروے کپڑے پہن جوگی بن کر قیصر باغ کے بڑے درخت میں مرمریں چبوترے پر آ بیٹھتے۔ ناچ رنگ کی مجلسیں گرم ہوتیں اور کرشن جی اور ان کی گوپیوں کا سا سماں نظر آنے لگتا۔ لیکن اس میں بادشاہ کی محض شمولیت ہوتی تھی۔ کرشن جی کا پارٹ آپ نے کبھی نہیں کیا۔

واجد علی شاہ کی مذہبی زندگی،

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ سلطان عالم شیریں بیان شاعر اور کامل الفن نائک ہونے کے باوجود مذہب کے بڑے پابند تھے۔ حالانکہ رندی اور شاعری دو متراد ف چیزیں سمجھی گئی ہیں اسی لئے کہا گیا ہے ؎

کیا پوچھتا ہے مذہب شاعر کی بات شیخ
جس وقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی

کسی وقت اگر مسجد جامع میں منبر کے قریب تلامیذ الرحمٰن بڑے جوش و خروش سے حمد الٰہی کے گیت گا رہے ہیں تو دوسرے وقت اپنی جبین نیاز پر جو خدائے حی و قیوم کے واسطے مخصوص تھی قشقہ کھینچکر بہ زبان میر یوں فرما رہے ہیں ؎

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

لیکن سلطان عالم کی مذہبی پابندی کا یہ عالم تھا کہ عمر بھر شراب، افیون اور چرس کو مُنہ تک نہ لگایا۔ شرعی پہلو کی نگہداشت کے لئے محل میں جس قدر خدمتگار عورتیں تھیں سب سے متعہ کا صیغہ پڑھا لیا تاکہ کسی نامحرم عورت پر نگاہ نہ پڑ سکے۔ علوم مذہبی کے متبحر عالم تھے اور عالم بھی باعمل، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "عالم نا پرہیزگار کور مشعلہ دار است"۔ نماز سے دلی شغف تھا اور وقت پر ادا کرتے تھے یہاں تک کہ رمنہ کے میدان میں کئی بار دیکھنے میں آیا کہ سلطان عالم فوجی وردی زیب تن کئے فوج کی قواعد ملاحظہ کر رہے ہیں کہ اچانک کہیں سے "حی علی الصلوٰۃ" کی آواز آئی فوراً علیحدہ ہو گئے۔ اسی وقت دریا کے کنارے سجادہ بچھ گیا اور فوج کا جرنیل اپنے فوجی لباس میں خدا کے حضور جھک گیا۔

گھر میں حکم دے رکھا تھا کہ اگر نماز صبح کے وقت میں بیدار نہ ہو سکوں تو پاؤں کھینچ لو یا پانی چھڑک دیا کرو۔ روزانہ قرآن مجید کی تلاوت فرماتے۔ ہر سال پانچ لاکھ روپے صرف زکوٰۃ کے نکلتے اور جناب قبلہ و کعبہ میرن صاحب کی خدمت میں مستحق لوگوں میں تقسیم کے لئے بھیج دیئے جاتے۔ صدقات و خیرات کا سلسلہ اس کے علاوہ تھا۔

رمضان شریف کا بڑے شوق اور عقیدت سے انتظار رہتا۔ اور تیسوں روزے پورے آداب کے ساتھ رکھتے۔ محرم آتا تو حزن و ملال کی پوری تصویر بن جاتے سبطین آباد میں جاکر خود مرثیہ خوانی کرتے جو اکثر بادشاہ کے اپنے طبعزاد ہوتے۔ چنانچہ سلطان عالم کی شعر و شاعری کا نصف سے زیادہ حصہ مراثی پر مشتمل ہے۔ محرم کی ساتویں تاریخ آسمانی کوٹھی سے بادشاہی مہندی اٹھتی۔ اس میں معمول یہ تھا کہ بادشاہ خود کمال عقیدت اور گرویدگی سے گلے میں تاشہ ڈال کر بجاتے اور بڑے بڑے نامور اور مشہور گویئے گلوں میں ڈھول ڈال کر ساتھ دیتے بادشاہ ایسی خوبی اور صفائی سے تاشہ بجاتے کہ ڈھاڑی بے اختیار واہ واہ کہہ اُٹھتے اور جنھیں اس فن سے مس نہ ہوتا وہ بھی مبہوت ہو جاتے جن لوگوں نے ائمہ معصومین کے اس خادم کو تاشہ بجاتے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ تاشہ بجانے کا وہ ایمان افروز منظر آج تک انھیں اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہے۔

سلطان عالم واجد علی شاہ بیشک پکّے بلکہ کٹّر شیعہ تھے مگر مزاج میں تعصب کا دخل تک نہ تھا بلکہ بالعموم کہا کرتے تھے کہ میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سنّی۔ ملازمین سرکار کی بیشتر تعداد سنیوں پر مشتمل تھی۔ ایک دفعہ دو آدمی مذہبی تکرار میں ایسے اُلجھے کہ معاملہ مارپیٹ تک جا پہنچا بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو دونوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا بلکہ دربار کی حاضری سے بھی محروم کر دیا۔ اور فرمایا کہ "ایسے لوگوں کا ہمارے یہاں گذر نہیں ہو سکتا"۔

آخری ایام میں جب بادشاہ مٹیا برج میں نظر بند تھے آپ کی ایک کتاب میں بعض ایسے ناگوار الفاظ طبع ہو گئے جن سے کلکتہ کے سنیوں میں ایک شورش پیدا ہو گئی۔ اگرچہ وہ الفاظ اصل کتاب میں نہ تھے بلکہ دوسروں کی تقریظ میں تھے لیکن باوجود اس کے جیسے ہی سلطان عالم کو علم ہوا بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے پر آمادہ ہو گئے۔

حافظ جمال الدین صاحب کلکتہ کے اکابر علماء میں سے تھے انھوں نے

کسی کی وساطت سے بادشاہ کو کہلوا بھیجا کہ اگر آپ سُنّی مذہب قبول فرمالیں تو یہ فقیر وعدہ کرتا ہے کہ اودھ کی سلطنت آپ کو واپس مل جائیگی اگرچہ بادشاہ اپنی راجدھانی کی یاد میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے اور رہ رہ کر ایک آہ جگر دوز کے ساتھ کہہ اٹھتے ع

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا

اور کبھی تحسّر انگیز لے میں کمال رقت کے ساتھ فرماتے ؎

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

لیکن باوجود اس فراق رنج و الم کے جونہی مولانا کے اس ترغیبی پیام کو سنا غصّے سے لال بھبوکے ہوگئے اور برہم ہوکر فرمایا کہ "میں ایمان فروش نہیں ہوں" کیا اس سے زیادہ مذہبی آدمی ہونے کی اور کوئی مثال ہوسکتی ہے؟

بادشاہ کا شوق تعمیرات

سلطان عالم کو عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ ہندوستان میں شہنشاہ شاہجہاں کے بعد اگر اس سلسلے میں کسی بادشاہ کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ اسی ستم رسیدہ بادشاہ کا نام ہے۔ واقعی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اپنی ذات خاص سے اتنے کم عرصے میں اور ناموافق ماحول میں بادشاہ نے اس قدر عمارتیں کس طرح بنوالیں افسوس کہ جہاں زمانے نے اس سلطان سے تاج شاہی چھین لیا۔ وہاں اس کی یادگار زمانہ عمارات کو بھی باقی نہ رکھا لکھنؤ میں انھوں نے جس قدر محلات اور کوٹھیاں بنوائی تھیں ماسوائے قیصر باغ اور سبطین آباد کے باقی سب بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔

تا سحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

واجدی عمارتوں میں قیصر باغ کو وہ شہرت حاصل ہے جو جہانگیر اعظم کی عمارتوں میں نشاط باغ کشمیر کو حاصل ہے۔ اس عظیم الشان اور یادگار عالم عمارت کو سلطان عالم نے دو کروڑ کے مصارف سے تعمیر کرایا تھا۔ جن تذکرہ نویسوں نے اسی لاکھ روپے کا اندازہ تحریر کیا ہے وہ صرف مزدوروں کی اُجرت پر مشتمل ہے۔ جب یہ فلک رفعت اور فردوس مثال باغ بن کر تیار ہوگیا تو بادشاہ نے اس میں پرلطف میلہ منعقد کیا جس میں تین یوم تک مسلسل اسّی ہزار وابستگان سلطنت کو مطبخ شاہی سے کھانا ملتا رہا سلطان عالم خود میزبان تھے اور ایسے فیاض میزبان کے یہاں اطعمۂ لذیذہ واشربۂ نفیسہ میں سے کس چیز کی کمی ہوسکتی تھی۔ دراصل یہ میلہ بادشاہ کی سالگرہ کی تقریب پر منعقد ہوا تھا۔ جیساکہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اس موقع پر بادشاہ جوگیا لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے چنانچہ اس میلے پر بھی قیصر باغ کے باہر ایک بڑے بھاری سایہ دار درخت کے نیچے جہاں پہلے سے سنگ مرمر کا گول چبوترہ بنادیا گیا تھا سلطان عالم جوگی بن کر گیروے کپڑے پہنے آگئے اور اس مرمریں چبوترے پر دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ پبلک کو جہاں پناہ کے اس پرکیف شغل کی رونق دیکھنے کی پوری آزادی تھی۔ مگر شرط یہ تھی کہ جو آئے گیروے کپڑے پہن کر آئے چنانچہ شہر کا شہر جوگی بن کر ٹوٹ پڑا اور تین چار یوم تک ایک عجیب و غریب روحانی کیفیت سی پیدا ہوگئی۔ لیکن افسوس آج یہ باغ محض ایک کھنڈر کی صورت میں رہ گیا ہے۔ وہ محل جہاں آٹھوں پہر عیش و عشرت کا بازار گرم رہتا تھا۔ جہاں اودھ کی رعایا اپنے محبوب بادشاہ کی آغوش میں کچھ دیر کے لئے اپنے سارے رنج و غم بھول جاتی تھی آج حیرت سے منہ کھولے ایک ایک کا منہ تک رہا ہے۔

سلطان عالم کی عمارتوں اور باغوں کے آثار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم، شاعر اور نائک ہونے کے علاوہ بہت بڑے ریاضی داں بھی تھے۔ آپ کو عمارات میں تناسب اور زیبائش کا اس قدر خیال رہتا کہ بسا اوقات یہ مشاہدہ میں آیا کہ ایک عمارت خواہ کتنے اہتمام اور مصارف سے تعمیر کیوں نہ ہوئی ہو اگر کہیں اس میں تھوڑی سی کجی یا بدنمائی نظر آجاتی اسی وقت کھڑے کھڑے مالیوں کو طلب فرماکر اپنے سامنے کھدوا ڈالتے اور پھر چند دنوں میں ہی از سر نو بن کر تیار ہوجاتی۔ باغات میں بادشاہ خود ایسی ایسی نئی خوشنما اور جدت طرازی کے ڈھنگ سے روشیں بنواتے کہ بڑے بڑے ماہر انجینیر اور معزز انگریز آکر دیکھتے تو عش عش کر اٹھتے اور پوچھتے یہ ڈیزائن کس نے تیار کیا ہے اور جب انھیں معلوم ہوتا کہ خود سلطان عالم کا تیار کردہ ہے تو حیران ہوجاتے اور کہتے کہ معلوم ہوتا ہے آپ کے بادشاہ ڈرائنگ اور ڈیزائن بنانے کے کامل الفن استاد ہیں۔ اگرچہ بادشاہ مٹیا برج میں ایک قیدی سے زیادہ پوزیشن نہ رکھتے تھے لیکن رنج و الم کے ان لمحات میں بھی شوق تعمیر اپنا کام کئے بغیر نہ رہا۔ اس بے کیف اور بےرونق ماحول کو اس قدر حسین و جمیل اور رنگین بنادیا کہ خدام دولت کو لکھنؤ بھول گیا۔ دوسرے معنوں میں یوں کہئے کہ مٹیا برج کو دوسرا لکھنؤ بنادیا کلکتہ میں دورے گیس کی روشنی کو جو دیکھا پسند آگئی۔ حکم ہوا کہ تمام محلات میں گیس کی روشنی کی جائے۔ چونکہ گیس کا سلسلہ مٹیا برج تک نہ تھا اس لئے تین لاکھ کے مصرف سے "مرصع منزل" کے پھاٹک

سے ایک فرلانگ کے قریب باہر کی طرف گیس کا کارخانہ بڑے اہتمام سے لگایا گیا اور شاہی باغات میں چاروں طرف گیس کی لالٹینیں آویزاں کی گئیں۔ پہلے ہی دن بادشاہ گاڑی پر سوار ہو کر جو سیر کو نکلے تو گیسوں کی روشنی کو دیکھ کر فرمایا۔ "بھئی یہ روشنی تو آنکھوں میں گھسی جاتی ہے" چنانچہ گشت کو ملتوی کر کے واپس لوٹ گئے۔ دوسرے دن مزاج شناس وابستگان دامن دولت نے لالٹینوں پر سبز شیشے چڑھا دیئے۔ بادشاہ ہواخوری کو نکلے تو یہ کیفیت دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے مگر جلد ہی چکر لگائے ہونگے کہ اچانک ناک بند کر لی اور فرمایا ایسی روشنی سے ہم باز آئے اس سے تو ناقابل برداشت بو آتی ہے چنانچہ تین لاکھ کا یہ کارخانہ جس سرعت سے معرض وجود میں آیا تھا اسی سرعت سے حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ خدا معلوم اگر آج سلطان عالم ہوتے اور الیکٹرک لائٹ ملاحظہ فرماتے تو کتنے خوش ہوتے! لیکن ہاں ان کے مقدر میں اگر خوشی ہوتی تو وہ تخت سے معزول کیوں کئے جاتے؟

سلطان عالم کی جودت طبع

سلطان عالم کی قوت حافظہ اس قدر تیز تھی کہ جو شخص ایک دفعہ نظر سے گزر جاتا پھر کیا مجال کہ اس کے خدوخال کا نقشہ ذہن سے اتر سکے بادشاہ کا معمول تھا کہ جو شخص یا چیز ملاحظہ سے گزرتی اسے اس کے خصائل کے موافق ایک خطاب مرحمت کر دیتے اس سلسلہ میں انھوں نے نہ صرف اپنے امراء اور خدام کو خطاب بخشے تھے بلکہ جانوروں، درختوں، کوٹھیوں، اور باغوں کو بھی اس بخشش سے محروم نہ ہونے دیا تھا یہاں تک کہ کلکتہ میں آپ نے جو چڑیا گھر بنوایا تھا اس کے ہر ایک جانور اور پرندے کو جداگانہ خطاب دے رکھا تھا اس میں کچھ شک نہیں کہ خطاب دینا اور پھر ان کا یاد رکھنا ہر کہ ومہ کا کام نہیں اور جبکہ خطاب یافتگان کی یاد ایک دو سو دو سو نہیں بلکہ ہزاروں پر مشتمل ہو مگر قربان جائیے اس حافظے کے کہ جب بھی کوئی خادم یا جانور نظر سے گزرا اس ذہین و طباع تاجدار نے اسی خطاب سے یاد کیا غرض سلطان عالم کی کس کس بات کو سراہا جائے سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ ہمہ صفت موصوف تھے اب ایسا کامل الفن اور ہر دلعزیز تاجدار کہاں پیدا ہوتا ہے اس مظلوم کی جو تصویر اس کے مخالفین نے کھینچی ہے اس میں تمام تر تعصب اور عداوت کا رنگ بھرا گیا ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھے۔ وہ انسان تھے اور جس طرح ہم تم میں ہزاروں کمزوریاں ہیں ان میں بھی تھیں لیکن ہماری نسبت بہت کم اور اس کے ساتھ ان میں جو خوبیاں تھیں وہ مجموعی طور سے ہم میں سے کسی میں بھی نہیں اس لئے وہ ہم سب سے کئی درجہ اچھے تھے اور اگر کمپنی بہادر کی باز پرس اور ارکین سلطنت کی منافقانہ چال ان کے سدراہ نہ ہوتی تو وہ دنیا میں خوب چلتے اور ان کا عہد [illegible] فیروز شاہ بہمنی سے کچھ کم نہ ہوتا اور اب بھی جو کچھ ہوا اس میں اس مظلوم تاجدار کا ذرہ بھر بھی قصور نہیں یہ سب انہی کا کیا کرایا ہے جو ناحق اس سلطان پر عیاشی اور بدمستی کا الزام لگاتے ہیں ؎

مکن خنجر مزن بر سینۂ من   توئی در دل مبادا بر تو آید

غزل

از:-
کلانچوی۔ ایم۔ اے

مجھے غیاب میں حاصل حضور رہتا ہے   مرے قریب بھی ہے مجھ سے دُور رہتا ہے
تصوّرات کی دُنیا میں کھو گیا ہوں مَیں   دل و دماغ میں ابدی سُرور رہتا ہے
مُریدِ مال کے دل میں دھواں مشینوں کا   دل مجاہد و زاہد میں نُور رہتا ہے
مرے جنوں کی جنوں آفرینیاں توبہ!   نظر میں دشت نہ صحرا نہ طُور رہتا ہے

لیلۃ القدر

نظم

از حضرت مقبول حسین احمد پوری

چھیڑتی تھی بانسری پر شام نغمہ طور کا   منتظر تھا عالم فانی پیام نور کا
بج رہا تھا دل میں جیسے ایک لاہوتی رباب   جھک گئے اکدم دھندلکے چاند نے الٹی نقاب
نغمہ زن تھی چاند کی سیمیں کرن پر کوئی شے   یہ نہیں معلوم تھی وہ کون سے نغمے کی لے
لوریاں گاتا تھا کوئی نغمۂ خاموش میں   اور محبت سو رہی تھی حسن کے آغوش میں

گھل رہی تھی روح میں یہ کیف پرور راگنی
عرض تھا یہ سب تصور اور جوہر راگنی

قلب میں امید نے دکھلائی ہلکی سی جھلک   کھل گئی جیسے جھپک کر دیدۂ دل کی پلک
یوں نظر آتا تھا گویا روح بھی کھل جائیگی   زندگانی کی گرہ بھی خود بخود کھل جائیگی
ہر طرف بکھرے ستارے دانہ تسبیح تھے   رات کی تاریکیوں کے قلب کی تصحیح تھے
رشک روح القدس کوئی چھیڑ کر لویں لگا ساز   گا رہا تھا اپنا نغمہ روح تھی محو نیاز

آمد آمد ہے محبت کی کھلے جنت کا در
گھر کریں فردوس میں سب آج کی شب جاگ کر

ایک شاعر تھا خیال حسن میں کھویا ہوا   دل تو کچھ بیدار تھا لیکن تھا خود سویا ہوا
جاگ اٹھا وہ اپنے اس خواب گراں سے یک بیک   گو ابھی الجھی ہوئی تھی نیند سے اس کی پلک
ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "میرے خدا میرے خدا   بعد مرنے کے نہ اس کے قرب سے کیجو جدا
وہ جسے پیکر بنایا تو نے اپنے نور کا   وہ دیا جس نے دلوں پر ڈال شعلہ طور کا

بھر گیا جو ایک کیفیت سی ڈوبی آہ میں
سوز جس کا آج تک ہے ساز الا اللہ میں

یوں ندا آئی دعا یہ بارور ہوگی ضرور   ہاتھ باندھے ہے کھڑا نغمہ ترا اس کے حضور
وہ جسے اب ما و تو میں کھو کے بے ہوش ہیں   وہ جسے سب رنگ و بو میں ڈھونڈ کر خاموش ہیں
سن رہا ہے دل کا مالک سن رہا ہے یہ دعا   رک گئے ہیں آج سیارے بھی سن کر یہ صدا
یونہی چھیڑے رہ ابھی تقدیس کا ساز نیاز   حل ہوا جاتا ہے لاہوتی حقیقت میں مجاز

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی چاند تھا محو سرور
چھن رہا تھا آسماں سے ایک لاہوتی سا نور

عجائب شاہی میں غدر سے ... (مشہور مصنفین کی کتابیں)

عجائب نئی اور عمدہ

...مغلوں کے باکمال پیشہ ور پیسے کو محتاج ہو گئے تو وہ راز جو صدیوں سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ ...ہونے شروع ہوئے کتاب "جدید مکمل باورچی خانہ" میں مغل شہنشاہوں کے مرغوب اور پسندیدہ کھانوں کی مفصل ترکیبیں درج ہیں اور اب دورِ جدید کے انگریزی کھانوں کی ترکیبیں بھی اس میں تفصیل سے لکھدی گئی ہیں یہ مشہور کتاب رضیہ سلطانہ چمن ...صاحبہ کی ... اسے پڑھ کر

قورمہ۔ پلاؤ۔ متنجن۔ مرغ۔ شکار۔ پراٹھے۔ انڈے۔ بادام کا سالن۔ کباب۔ مچھلی۔ ...ذائقہ دار پکوان۔ بادام۔ پستہ اور بہت سی چیزوں کے حلوے۔ مزیدار مٹھائیاں۔ کیک۔ بسکٹ۔ حلوہ سوہن۔ مربے۔ چٹنیاں۔ مختلف اقسام کی چائے۔ ہر قسم کے انگریزی کھانے۔ ناشتہ۔ شربت۔ لسی۔ آئس کریم۔ فالودہ۔ پوریاں) اور بہت سے مزیدار کھانوں کی ترکیبیں ... ساڑھے ... سو صفحات کی اس ... کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے اور محصول چھ آنے علیحدہ۔

اس سلسلہ کی دیگر بہترین کتب :- عصمتی دسترخوان دو روپے۔ مشرقی مغربی کھانے دو روپے۔ عصمتی ہنڈ کلیا بچوں کے لیے آٹھ آنے۔ ناشتہ دس آنے۔ بیماروں کے کھانے دس آنے۔ مذا ... کھانے چھ آنے۔

ایک ماہ میں انگریزی آجائیگی

یہ ایک ہندوستانی پروفیسر کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ اُس نے کئی سال کی لگاتار محنت کے بعد ایک ایسی کتاب تیار کی جو پڑھنے والے کو بغیر استاد کی مدد کے انگریزی پڑھا دیتی ہے۔ اس کتاب کا نام "انگلش ٹیچر" ہے کوئی بچہ یا بڑا عورت ہو یا مرد اس کتاب کو توجہ کے ساتھ صرف ایک مہینہ پڑھ لے تو وہ انگریزی زبان سے پوری طرح واقف ہو جاتا ہے اور وہ انگریزی زبان بول بھی سکتا ہے۔ درحقیقت اس کتاب کی ترتیب ہی کچھ اس ترکیب سے دی گئی ہے کہ خواہ مخواہ انگریزی پر عبور ہوتا چلا جاتا ہے۔ انگریزی لکھ بھی سکتا ہے۔ پڑھ بھی سکتا ہے۔ جو لوگ جلد سے جلد انگریزی زبان سیکھنا چاہیں اُن کے لئے یہ جادو کی کتاب کہی جا سکتی ہے دو سو سے زائد صفحات ہیں۔ سفید چکنا کاغذ ہے جلد بندھی ہوئی ہے اور قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔ بذریعہ وی پی منگا لیجئے چھ آنے محصول ڈاک لگے گا۔

تصانیف ایم اسلم

- مہدی سے/
- خار و گل سے/
- مرزا جی کامل صہ/
- تفسیرِ حیات ہے/
- گل نو عہ/
- آشوبِ زمانہ عہ/
- ثمرہ گناہ عہ/
- سراب ہستی عہ/
- مضامین اسلم عہ/
- پیغام سرفروش عہ/
- عروسِ نوبت عہ/
- بقائے دوام عہ/
- چار سہیلیاں عہ/
- نرگس عہ/
- گناہگار عہ/
- گھونگھٹ
- طلسم سامری
- ہلال و صلیب
- تحفے علیکم
- شب غم

تصانیف ٹیگور

- سرد شعلے
- کون کس کا
- جیون پربھات
- طوفان
- ترکش
- پاکیزہ افسانے

تصانیف منشی پریم چند

- نوادان
- میدانِ عمل
- غبن
- آخری تحفہ
- کربلا
- واردات
- بیوہ
- زادِ راہ
- دودھ کی قیمت
- دکھی راج
- روحانی شادی
- آسمان کی پری

تصانیف سدرشن

- چندن
- آزمایش
- سولہ سنگار
- اندھے کی دنیا
- چٹکیاں
- کنج عافیت
- خوش انجام
- سدا بہار
- پارس

تصانیف کرشن چندر

- نظارے
- ٹوٹے ہوئے تارے
- نئے زاویے

نیز ہر قسم اور ہر مذاق کی کتابیں جو ملک کے نامور ادیبوں کی شاہکار رہیں۔ ہم سے طلب کیجئے

ملنے کا پتہ: منیجر عورتوں کا کتب خانہ اردو بازار جامع مسجد دہلی

مُرجھایا ہُوا پھُول

دلگداز افسانہ

از جناب طفیل ملک

گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھ جاتی اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا، اب میں کیا کروں۔ دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی اور جب شام ہوتی تو اس کا دل دھڑکنے لگتا اور رات کے اندھیرے میں اسے ایسا محسوس ہوتا گویا اس کے لئے زندگی وبال جان ہے۔ ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے اور ---- اس کے اردگرد دیواریں گھومنے لگتیں اور گھر کی چار دیواری کی چیزیں سوئیوں کے مانند اس کے ناتوان جسم میں چبھنے لگتیں۔

اس کی شادی کو یہی تین چار سال ہوئے ہونگے۔ پہلے دو تین سال کتنی جلدی بیت گئے تھے اور اب ---- اب وہ گذرے ہوئے برسوں کی اس امید پر کہ شاید گذرا ہوا زمانہ پھر لوٹ آئے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں اور گردن میں باہیں حمائل کر کے "رانی" کہنے والے اس کے پھر اپنے ہو جائیں۔

مگر اب "وہ" - وہ نہیں تھے۔ اس کی زندگی کے لمحات۔ پہاڑ دن سے دن اور نہ گذرنے والی اداس راتیں ---- اسی خوشگوار یاد میں بسر ہوتیں۔

آج سے دو سال قبل وہ حسین تھی۔ اس کی بڑی بڑی شہلائی آنکھیں لمبی لمبی پلکیں، رخساروں کی سیبی رنگت، پھر اس پر نرم نرم ہونٹوں کا تناسب اور ---- وہ اس وقت حسین تھی اور آج اس کا یہ حسن، اس کی یہ خوبصورتی اس سے کبھی کی رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ ہڈیوں کے ڈھانچے کے سوا کچھ نہ تھی۔

وہ بڑی بڑی رات گئے تک ان کے انتظار میں جاگتی رہتی۔ وہ روز ایسا ہی کرتی تھی مگر اسے روز ناکامی ہوتی۔ رات کے بارہ بج جاتے اس کی آنکھوں کا انتظار تھک جاتا۔ مگر وہ اس کے پاس نہ آتے۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی۔ کھڑکی سے جھانکتی۔ گھڑی پر غور سے نگاہیں ڈالتی۔ آخر اسی امید و بیم میں وہ تھک کر لیٹ جاتی۔ اپنے خیالات کے سمندر میں صبح تک یونہی متلاطم رہتی اور وہ ---- اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا کہ وہ اب اس سے اس قدر بے نیاز کیوں ہیں؟

اب وہ ساری ساری رات گھر سے باہر رہتے۔ وہ جانتی تھی کہ گھر میں ان کا جی نہ لگتا تھا مگر وہ یہ نہ جانتی تھی کہ یہ طویل راتیں وہ کہاں بسر کرتے ہیں۔ دو ایک مرتبہ اس نے ان سے پوچھنے کی جرات بھی کی تھی مگر انھوں نے اسے "تم فضول تنگ کرتی ہو" کہہ کر ٹال دیا تھا۔ اب اسے ان سے کچھ پوچھنے کی جرات ہی نہ تھی اور اس خیال سے اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور اس کے کانوں میں کوئی چٹکیاں لیتے ہوئے کہتا: "وہ محبت خریدنے جاتے ہیں۔ جہاں حسن بکتا ہے۔ جہاں محبت کوڑیوں کے مول بکتی ہے۔ جہاں حسین و جمیل تیتریاں بستی ہیں۔ پھولوں کی طرح خوشبو سے بھرپور مگر ---- مرجھائے ہوئے پھول!

اس کی آنکھوں کے سامنے پاوڈر میں چھپے ہوئے چہرے، رنگے ہوئے ہونٹ، مٹکتی ہوئی آنکھیں آ جاتیں، اور ایک جھرجھری سی اس کے سارے جسم میں دوڑ جاتی۔ اصرار کرتی تو وہ چڑھ جاتے اور اسے جھڑک کر خاموش کر دیتے۔ اور وہ اپنے آپ کو سنبھالے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیتی اور کمرے میں پہنچتے ہی بستر پر لیٹ جاتی لیکن بستر پر اسے نیند نہ آتی۔ بستر کانٹوں کی مانند چبھنے لگتا۔ وہ دل کھول کر رونا چاہتی مگر آنکھوں سے آنسو نہ نکلتا۔ اس کے دل میں آگ کی بے انتہا چنگاریاں سلگنے لگتیں وہی گھر جس میں اس کا وقت عیش و عشرت اور راحت کے ساتھ کٹتا تھا اب اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس کے دل کو ٹھیس لگتی تھی ہوئے آنسو ابلتے ہوئے خون کی طرح آنکھوں میں امنڈ آتے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ بیتے ہوئے دنوں کی یاد اس کے جسم کو چھلنی کر رہی تھی۔ بستر پر پڑے پڑے، کانٹوں میں الجھے ہوئے وہ سوچنے لگتی یہ کیا؟ وہ اٹھتی، بیٹھتی، ٹہلتی، انھیں یاد کرتی، اور وہ اس طرح اس کی فرقت میں غیروں کے ساتھ عیش اڑا رہے ہیں ---- رنگ رلیاں منا رہے ہیں ---- !

کیا وہ شکل و شباہت میں اچھی نہیں؟ بازاری عورتوں میں کچھ وہ کون سا وصف ہے جو یہ ان کے پیچھے پیچھے پھرنے پر مجبور ہیں؟

اور جن کی خاطر وہ اپنی بیوی کو کبھی نگاہ میں نہیں لاتے۔

اسے شادی کے وہ رنگین ایام یاد آجاتے جب وہ اس کی باہوں میں باہیں ڈال کر کہتے "تم کتنی حسین ہو؟" اور اب وہ اس خیال کو اپنے جسم میں ایک گدگدی سی محسوس کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے خاوند کی بے لوث اور بے پناہ محبت سے محروم ہو گئی ہے لیکن پھر بھی وہ اس وقت کے انتظار میں تھی کہ کب اس کا خاوند پھر سے اس کا ہو جائے اور وہ ــــ تنہائی اور اداسی کی زندگی سے تنگ آ گئی تھی ــــ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی اور اس کے اردگرد دیواریں گھومنے لگتیں۔

ایک رات ــــ!

رات کے اندھیرے میں حسب معمول وہ گھر سے غائب تھا، اور وہ حسب معمول ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بستر کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ طرح طرح کے خیالات میں محو ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی دل ہی دل میں ان باتوں پر غور کر رہی تھی۔ وہ برادری میں سب سے بڑے آدمی کی بہو ہے۔ غیر اس کی خوش قسمتی دیکھ دیکھ کر رشک کھاتے ہیں۔ قیمتی زیورات سے بھرے ہوئے بکس ــــ مگر یہ سب کچھ اسے کیا راحت دیتا ہے؟ یہ غیر کیا جانیں۔ والدین بھی نہیں جانتے۔ وہ بستر پر پڑے پڑے اپنی لڑکی کی راحت اور خوش قسمتی کے کیسے کیسے عجیب خواب دیکھتے ہونگے مگر انہیں کیا معلوم کہ ان کی نازوں پلی لڑکی اپنی زندگی کے دن کس طرح پورے کر رہی ہے اور وہ کن کن تکلیفوں اور دکھوں میں مبتلا ہے۔ یہ ایک عالیشان مکان اور اس کے والدین کا شکستہ تنگ و تاریک مکان اور ــــ

گذرے ہوئے واقعات کا سمندر آج گوشہ تنہائی میں اس کی آنکھوں کے سامنے خون آلودہ لہروں کی شکل میں موجیں مارنے لگا۔ والدین کا لاڈ پیار۔ وہی چھوٹا سا گھر ایک ایک کر کے سب کچھ یاد آ گیا۔ اوائل عمر میں اس کی زندگی کتنی بے فکری کی زندگی تھی۔ اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہ تھی جس کو پورا کرنے کے لئے اسے فکر ہو۔ شادی کے وقت اس کے دل میں کتنی ہی امیدوں نے جگہ حاصل کر لی تھی لیکن شادی کے دو تین سال بعد ہی اس کی امیدوں کا وہ خوشنما باغ زمانہ کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا اور ایک ہی جھونکے میں زندگی کے جہاز کے بادبان نہ معلوم کہاں اڑ گئے۔ اس کے سارے جسم میں ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جس نے ہلچل مچا دی، قسمت نے اس کے ساتھ کھیل کھیلا ــــ کیسا بیدرد کھیل!

اس کی نمناک آنکھیں آسمان پر تھیں جو شاید مایوسیوں اور ناکامیوں کا آخری سہارا ہے۔ اور جہاں غبار آلود چاند بادلوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے، چمکتا ہوا دل آویز چاند اور روشن ستارے گویا سب کے سب مسکرا رہے تھے۔ اور اس کی موجودہ حالت پر شاید ہنسی اُڑا رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر اس کا درد بھرا ٹوٹا ہوا دل بے قابو ہو گیا اور اس کے تمام جسم کا خون کھولنے لگا۔ رگیں پھول گئیں آنکھیں غصے سے جل اٹھیں۔ اس نے وہاں سے اٹھنے کی ازحد کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی اس حالت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ ایک گہری سانس لیکر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا تمام جسم آگ کی طرح جل رہا تھا۔ اس کے جسم میں نہ جانے رات کے اندھیرے میں کون زور زور سے کانٹے چبھو رہا تھا۔

رات گذر رہی تھی اور کائنات پر تاریکی مسلط ہو رہی تھی۔ ابھی تک اس کا خاوند گھر نہیں لوٹا تھا۔

رات کے اندھیرے میں "وائٹ ہارس" کی بوتل کبھی اس ساغر میں کبھی اس ساغر میں الٹتی تھی۔ شراب کے پیالے میں ننھے ننھے رنگین بلبلے ناچ رہے تھے اور وہ چھوٹے چھوٹے بلبلے جب آپس میں ٹکراتے تو فوراً ہی ایسے غایب ہو جاتے کہ ان کا نقش بھی باقی نہ رہتا جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں بدستور شراب کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ رات کی تھکن سے اس کے شانے ابھی تک بوجھل تھے اور آنکھیں خمار آلود اور رادھا ابھی تک اُس کی آغوش میں مدہوش پڑی تھی نیم برہنہ ——— رادھا کے بال بکھرے ہوئے اور کچھ پریشان سے تھے۔ اس کے خوبصورت نرم نرم گال جو سرخی مجھانے اور اس کے باربار چومنے سے دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھے۔ نازک، رسیلے اور چمکیلے رنگے ہوئے ہونٹ۔ اس کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کی چھاتی ——— ! خوبصورت اُبھری ہوئی چھاتی کی دو گولائیاں، اس کا سڈول اور ننگا جسم ——— ! وہ آہستہ سے رادھا کے جسم پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ رادھا کے سارے جسم میں ایک کپکپی، گدگدی اور ایک لرزش سی پیدا ہو گئی۔ وہ جھکا اور اسے مضبوطی سے اپنی آغوش میں لیکر اس کے دہکتے ہوئے گالوں کو چومنے لگا۔ رادھا ایک انگڑائی لیتی ہوئی اُٹھی۔ اس نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی اور اس کی اشتہا اور بھی تیز ہو گئی وہ اپنے اندر ایک گرمی سی محسوس کرنے لگا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا [illegible] جھلملانے لگیں، اور رادھا ——— کتنی معصومیت رہے اس کے چہرے پر۔ اس کی آنکھوں میں کیسی چمک ہے؟ اور اس کی نظریں، اور اس کا مسکرانا ——— اور یہ عورتیں جنھیں چھونے سے جسم میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور دل میں میٹھی میٹھی سی گدگدی جوانیوں کی دنیا میں آگ لگا دیتی ہیں۔ جذبات کو بے قابو کر دیتی ہیں ——— عورت جوان عورت تو ہوتی ہی حسین ہے۔ خواہ کالی ہو یا گوری۔ اس کی ہر ادا خوبصورت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے والی اور ناز نخرے کرنے والی بازاری عورتیں ——— !

رادھا کے ہونٹ مسکرانے لگے۔ اور اس کی بھوکی نگاہیں اس کی جیب میں اپنی روزی تلاش کرنے لگیں۔ اس نے آج تک جتنی عورتوں کے ساتھ وقت گذارا تھا وہ تمام رنگین تیتریاں تھیں اور وقت کی ضرورت سے آشنا۔ اس نے رادھا کو سرتاپا دیکھا۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی اور ——— اسے اچانک اپنی بیوی کا اداس و مغموم، ایک پھیکا بے کیف اور محبت سے ناآشنا بے حس و حرکت اترا ہوا چہرہ یاد آ گیا۔

اور میز پر جہاں وائٹ ہارس کی بوتل اور شیشے کے گلاس تھے، روپیوں کی جھنکار کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک، دو، تین، چار ——— دس۔ دس روپے ——— !

رادھا جو اس وقت بھی نیم برہنہ تھی اور جو آدھی رات سے زیادہ عرصے تک اس کی آغوش میں رہی تھی جلد جلد روپے سمیٹنے لگی۔ اور وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا ادھر اُدھر دیکھتا ہوا اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے بچاتا ہوا رات کے اندھیرے میں گلی میں غایب ہو گیا۔ وہ گھر پہنچ گیا۔ بیوی اس کے انتظار میں تھی۔ جب اس نے گھر میں قدم رکھا۔ بیوی نے حسب معمول پوچھا ——— "کہاں رہے آپ اتنی دیر تک؟"

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کی طرح وہ خاموش رہا بالکل خاموش ——— ! اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی شراب کے نشے سے سرخ مخمور آنکھیں دیکھ کر بیوی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ——— !

رات کا واقعہ اُس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک رادھا کی یاد تھی۔ گھنگھروؤں کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ حرکت کرتے ہوئے پاؤں، لچکتا ہوا، اٹھکیلیاں کرتا ہوا نازک بدن ——— موجوں کی طرح بل کھاتی ہوئی ننگی مرمریں باہیں اور باریک ریشمی لہنگے میں چمکتی ہوئی سڈول پنڈلیاں اس کی نگاہوں کے سامنے ابھی تک اسی طرح پھر رہی تھیں۔ ساز کے زیر و بم کے ساتھ رادھا کے پاؤں اُٹھ رہے تھے۔ سرخ شراب شوخ ہونٹ، آگ کے انگارے کی طرح دہکتے ہوئے سرخ گال، رنگین

میں دوڑتا ہوا سرخ خون ——— جوانی سے بھرپور لوث آمیز زندگی!
اسے بیوی کے روپ میں رادھا نظر آئی۔ بیوی کے سوکھے ہوئے ہونٹ، دبلی پتلی ٹانگیں اور سوکھی ہوئی باہیں ——— مرمریں باہوں اور رنگین پنڈلیوں میں تبدیل ہوگئیں۔
ہر طرف رادھا کھڑی تھی ——— رادھا اس کے جسم کے عضو عضو میں چھائی ہوئی تھی۔
وہ بیوی کی طرف جھپٹا۔ اور وہ بیوی کے ہاتھ پکڑ کر بار بار اس کے پچکے ہوئے سوکھے ہوئے رخساروں کے بوسے لینے لگا۔ شراب کی بدبو سے اس کی بیوی کا دماغ پھٹنے لگا۔ بیوی کو اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے بولا ——— "رادھا! رادھا رانی۔ آؤ میری جان رادھا یہاں آؤ۔ یہ یہ ——— تمھاری آنکھیں تیر برساتی ہیں ——— تم میری جان کتنی معصوم دکھائی دیتی ہو ——— تمھارے شہابی ہونٹ! ——— ادھر آؤ اف میری جان! تمھارے ان سرخ ہونٹوں کو چوم لوں اور ———"
اس کی بیوی نے یکایک اسکے بازوؤں کو پرے جھٹک دیا جیسے اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔
اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی چھاگئی، رادھا کی حسین ننگی مرمریں باہیں، اس کی بیوی ہڈیوں کا ڈھانچہ ——— وہ ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہوگیا اور یہ حیا سوز واقعہ! اور ——— وہ جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔
اس وقت باد نسیم کے سرد جھونکے آہستہ آہستہ اٹھکھیلیاں کرنے لگے تھے۔ اب اس کی بیوی بے حس و حرکت پڑی کانپ رہی تھی ——— اس کے جسم کے عضو عضو سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔
ہوا کے سرد جھونکوں کے جسم پر لگنے سے اس نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے دل میں حسد کی آگ روشن کردی ہے۔ اس نے اپنی پیشانی کا پسینہ صاف کیا اس وقت وہ خوفزدہ نظر آتی تھی۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آکر زمین پر بیٹھ گئی۔ بستر پر وہ لیٹنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں اس بستر پر کانٹے بچھے ہوئے تھے۔ جو اسے رات کے اندھیرے میں سونے نہ دیتے تھے۔ اور ——— یہ حسین و جمیل تیتریاں اسے اپنی صاف و شفاف پگڈنڈی کی راہ میں کانٹوں کی مانند دکھائی دینے لگیں ——— اسے اپنی زندگی کی پگڈنڈی پر کانٹے ہی کانٹے دکھائی دینے لگے۔ ہر طرف خاردار جھاڑیاں اور رادھا ——— اور وہ خود ——— ان کانٹوں کے درمیان ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح!
اسے اپنی زندگی کی شاہراہ کانٹوں سے الجھی ہوئی نظر آنے لگی، اور اس کا خاوند ——— اور یہ حیا سوز واقعہ ——— کسی کیل کی طرح اس کے دماغ میں گھس گیا ——— جو اس کے جسم کو کانٹوں کے ساتھ ساتھ چھلنی کرنے لگا۔
اور ——— وہ اوندھے منہ چارپائی پر گر پڑی،
اور ——— رات کے اندھیرے میں اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز فضا میں سنائی دینے لگی ———!

کمال عشق

لفظ الجھ کے رہ گئے بات کوئی بنی نہیں

از حضرت ہادی مچھلی شہری

کون کہیگا عشق میں موت بھی زندگی نہیں
کس کو گماں ہے درد دل حاصلِ صد خوشی نہیں

دیدۂ مست یار کی بات اگر رہی نہیں
عشقِ جنوں نواز کو فرصت بیخودی نہیں

پرتوِ حسنِ یار نے دل کا یہ حال کر دیا
ورنہ حقیقتہً ابھی جلوہ گری ہوئی نہیں

دیدے کی تم کو فکر کیا پردے کی شکل یوں بھی ہے
مجھکو ہجوم شوق میں فرصت دید ہی نہیں

اس کو کمال عشق اگر میں نہ کہوں تو کیا کہوں
مانعِ ذوق آرزو دل کی شکستگی نہیں

جذبِ نظر نے کر دیا دید کی مشکلوں کو حل
میرے اور ان کے درمیاں اب کوئی پردہ ہی نہیں

چارہ گری سے کیا ہوا چارہ گروں نے کیا کیا
سوز وہی ہے آج تک درد میں بھی کمی نہیں

جلوہ گری کے ساتھ ہی بے خبری کا بھی ہے لطف
میری نگاہ بیخودی دیکھ کے دیکھتی نہیں

عذرِ خطا کا طرز ہی فعلِ خطا کا تھا ثبوت
لفظ اُلجھ کے رہ گئے بات کوئی بنی نہیں

خوابِ اجل کا انتظار کیوں نہ بلائے جاں بنے
کروٹیں لے رہا ہوں میں آنکھ ابھی لگی نہیں

اس کا علاج کیا کہ اب دل کو نہیں ذرا قرار
اس کو میں کیا کروں کہ اب قسمت ضبط ہی نہیں

دل کو ہلاک درد کر آہوں کو جوئے خوں بنا
جس پہ سکوں کا ہو گماں موت ہے، زندگی نہیں

ہائے یہ اضطراب دل جان بھی دوں تو کس طرح
اس نے تو صاف کہدیا اس میں مری خوشی نہیں

عشرت دید ہے یہی اپنا بھی کچھ رہے نہ ہوش
جلوہ بقید تاب دید اصل میں جلوہ ہی نہیں

عشق کو با اثر ذرا ہادیؔ مبتلا بنا
آنکھیں ابھی ہیں بند بند آنکھیں کچھ نمی ہیں

قزلباش خاں امیدؔ

تنقیدی مقالہ

ازجناب میرزا محمد بشیر ایم۔اے

قزلباش خاں امیدؔ کا شمار ان قدیم اُردو شعرا میں ہے جن کے حالات اکثر اصحاب تذکرہ نے نظر انداز کر دیئے ہیں اور ان کے کلام کے متعلق عمداً غلط فہمی سے کام لیا ہے۔ ہم ان کے کلام پر نظر ڈالنے سے پیشتر ان کی زندگی کے حالات چند مستند تذکروں سے پیش کرتے ہیں۔

ان کا نام مرزا محمد رضا تھا۔ امیدؔ تخلص ہمدان کے باشندے تھے عالم جوانی میں اصفہان آئے اور مرزا طاہر وحید کے شاگرد ہوئے۔

وہ اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے بہادر شاہ نے ان کو "قزلباش خاں" کا خطاب اور ہزار کا منصب کیا اور ان کو برہان پور بھیجا لیکن اس منصب سے وہ کچھ خوش نہ تھے۔ چنانچہ ان کا ایک فارسی شعر ہے ؎

مثل بلبل ہمیشہ نالانم　　　　این بود منصب ہزاری ما

قزلباش خاں برہانپور میں تھے کہ امیر الامرا فیروز جنگ نے ان کو معزول کر دیا لیکن ان میں علم مجلس کا سلیقہ دیکھ کر ان کو حکومت کرناٹک کا داروغہ مقرر کیا اور ارکاٹ بھیجدیا۔ اس زمانے میں کرناٹک کے ناظم مبارز خاں تھے۔ سنہ ۱۱۳۷ھ میں نظام الملک آصف جاہ سے جنگ ہوئی۔ ناظم کو شکست ہوئی اور وہ جان بحق تسلیم ہوئے قزلباش خاں امیدؔ گرفتار ہو گئے۔ امیدؔ نے نواب کی تعریف اور عذر تقصیر میں ایک غزل کہی۔ سخن شناس نواب کو غزل پسند آئی اس لئے نہ صرف رہائی کا حکم دیا بلکہ قلعدار بنا دیا۔ "قلعداری منی مرک کی نواب نے عنایت فرمائی"[1] امیدؔ نے اسی زمانے میں رخصت لی اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔

سنہ ۱۱۵۰ھ میں آصف جاہ دہلی طلب ہو کر آئے تو امیدؔ بھی ساتھ تھے۔ نادر شاہ کی واپسی کے بعد آصف جاہ دکن لوٹ گئے۔ لیکن امیدؔ دہلی میں رہ گئے اور نوکری ترک کر دی۔ ان کا انتقال سنہ ۱۱۵۹ھ میں ہوا۔

امیدؔ ایک نہایت طرحدار۔ رنگین اور خوش اختلاط شخص تھے ان کو علم مجلس کا بڑا سلیقہ تھا۔ لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں مشہور تھے ایک محفل میں اپنا لطیفہ خود بیان کیا۔ "ایک دن میں نے کچھ شکایت زمانے کی نواب ذوالفقار خاں بیٹے نواب اسد خاں وزیر کے جو تھے[1]

[1] گلشن ہند صفحہ ۱۷۰

کے سامنے کی۔ سن کر فرمانے لگے کہ سچ ہے دنیا کو امید کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ میں نے عرض کی اگر دنیا کو امید کے ساتھ بسر کرتے ہیں تو افسوس ہے آپ مجھ بغیر دنیا کو بسر کرتے ہیں کہ میرا تخلص امیدؔ ہے"[1]

انھوں نے فارسی میں آٹھ ہزار اشعار کہے۔ اُردو میں جو کچھ کہا وہ ضائع ہو گیا۔ پھر بھی ان کے جو اشعار تذکروں میں درج ہیں ان سے ان کے کلام کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں —"جو اہل ولایت شاعر ہوتے تھے وہ فارسی شعر کہتے تھے اُردو انھیں آتی نہ تھی کہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تمسخر کرتے ہیں —— قزلباش خاں امیدؔ کے متفرق اشعار دیکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو اس وقت ٹوٹی پھوٹی زبان تھی اسے پورا ادا نہ کر سکتے تھے —— باوجودیکہ فارسی میں بڑے نامور ہیں اور اہل ہند کے ساتھ ان کے جلسوں کی گرم جوشیاں بھی مشہور ہیں مگر اُردو میں جو کچھ اظہار کمال کیا ہے وہ یہ ہے ؎

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ موں پری
غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی[2]

آزاد مرحوم کے بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ امیدؔ کو اہل ولایت سمجھ کر اُردو سے ناآشنا تصور کرتے تھے امید کے ایک شعر سے جو ایک خاص طرز میں کہا گیا تھا اس قسم کی قطعی رائے قائم کر لینا اصول تنقید کے منافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امید کا کلام ریختے کے قدیم طرز[3] کی اچھی مثال ہے۔ خسرو و سعدی دکھنی وغیرہم نے اس طرز کو مقبول عام کیا ملا عبد المومن معروف بہ ملا دوپیازہ نے بھی ریختہ گوئی میں گل افشانیاں کی ہیں یہ ان کے دو اشعار ہیں ؎

دوپیازہ از دل وجاں قرباں چرا نباشم
جوبن ہے مدکاماتا وہ سانولا سلونا
نہ دوپیازہ کی دلداری کرت ہے
مگر صدگونہ ہا خواری کرت ہے
وہ گویا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھوتا
ایسا لگے ہے مجکو جوں کھانڈ کا کھلونا

[1] گلشن ہند ص ۲۱ [2] آبحیات ص ۸۰ [3] ملاحظہ عالمگیری حصہ
[4] خزانہ عامرہ ص ۷۱۱۔

شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ایک بزرگ لا فوری تھے ان کا شعر ہے

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد　　بیچارۂ لوذی نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

امید ان بزرگوں کے مقلد تھے اور ان ہی کے نقش قدم پر چلے۔

آبحیات میں جو شعر امید کا پیش کیا گیا ہے وہ اس مسلسل غزل کا ہے جو حسن اتفاق سے بعض تذکروں میں ملتی ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ آزاد نے اس غزل کے دو مصرعوں سے خود مطلع بنا لیا ہے ورنہ امید نے یوں نہیں کہا ہے۔ امید نے اس غزل میں ایک نووارد مغل اور برہمن کی لڑکی کا عاشقانہ مکالمہ اور چھیڑ چھاڑ لکھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ خود ان کی آپ بیتی تھی تو بھی موضوع سخن اور بلاغت کلام کا تقاضا تھا کہ مکالموں میں وہی زبان ہو جو ایک نووارد مغل کی ہو سکتی ہے۔ خود ہمارے زمانے میں اکبر نے یورپین لڑکی کی زبان اسی طرز پر لکھی ہے ؎

وہ مس بولی کہ کرتا آپ کا ذکر اپنے فادر سے

مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کے مافک ہے

آپ نے وہ قصہ سنا ہوگا کہ ایک نووارد مغل کسی سبب سے بھاگ رہا تھا اور بادشاہ کے سپاہی اسے گرفتار کرنے آ رہے تھے۔ مغل ایک بھاتی کے گھر میں گھس گیا۔ اس کی لڑکی چکی چلا رہی تھی۔ اس سے منت کی اور خود اس کی کپڑے پہن کر چکی چلانے لگا۔ بادشاہ کے سپاہی گھر میں داخل ہوئے اور دریافت کیا کہ کوئی مغل تو ادھر نہیں آیا۔ خود بول اٹھے۔ "مغل چغل نیست پارسی خان کا دختر گندم پیستا ہے" اس قدیم حکایت میں مغل کی زبان کا وہی انداز ہے جو اس غزل کی جان ہے ؎

با ناز حور و حسن ملک جلوۂ پری

بامن کی بیٹی ایک مری آنکھ میں پڑی[2]

رفتم بہ پیش گفتم و جانم فدائے تست"

غصہ کیا دگالی دیا اور دگر لڑی

ایسی نہ سیتا اور نہ بھوانی نہ رادھکا

کرتا رنے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی

گفتم کہ "تیرے پاؤں پڑم اور بلا لیم"

گفتا کہ "داڑھی جار مغل تجھکو کیا پڑی"

گفتم "امید وصل پہ ہم تیرے جیتے ہیں"

گفتا کہ "مل پرے دئی مارے سبحے مری"

---

[1] مقالات شبلی ص ۱۱۱

[2] "مری آنکھ میں پڑی" علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ یہ "در نظرم افتاد" کا ترجمہ ہے بعض نسخوں میں "گھڑی" ہے۔

[illegible] جیسا کہ ان کے کمالات سے منکشف ہے ہندوستان [illegible] زیب کے عہد سے [illegible] تک وہ یہ عمر چالیس [illegible] پیدا ہوا۔ امید سے ذہین و طباع شخص کے لئے اتنے عرصہ ہندوستان میں رہ کر ریختے میں نہ کہہ سکنا یا ریختے سے ناآشنا رہنا قابل [illegible] صورت میں جبکہ ان کی زندگی ان ہندوستانی اور [illegible] کے دربار میں گزر رہی تھی جہاں اردو شعر و شاعری کا چرچا [illegible] تھا۔ "سرو آزاد" میں غلام علی آزاد امید کے متعلق لکھتے ہیں عجیب مجمع کمالات نظر آیا۔ باوصف ولایت زادگی کے ہندی راگوں [illegible] اور سمجھنے میں نہایت طبع چست اور فہم درست رکھتا تھا جب ہندی راگ راگنیوں کے گانے اور سمجھنے میں ایسی مہارت حاصل کر لی تھی تو اس وقت کی اردو زبان یا ریختے میں کمال حاصل کر لینا تو ان کے لئے کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ ان کی زبان کا طرز اور ادائے بیان وہی ہے جو ان کے معاصرین ولی، آبرو وغیرہم کا تھا۔ یہ امید کا شعر ہے ؎

اُس کی انکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں،

میر تقی میر تحریر فرماتے ہیں کہ "امید ہر سیر تماشے میں جاتے تھے صحبتوں میں شریک ہوتے تھے چنانچہ ایک دن سید حسن رسول نما قدس سرہ کے عرس میں بندہ بھی بہمراہ دوستوں کے مزار سے چلا گیا تھا اور وہ (امید بھی تشریف) رکھتے تھے جیسے ہی مجھکو دور سے دیکھا بولے "خوش رہو کہ میں نے بھی ان دنوں دو شعر ریختے کے کہے ہیں سنو" ان دو شعروں میں ایک یہ تھا ؎

دو دو یار سے اب صحبت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

یہ مطلع اس غزل کا ہے جو مکمل "گلشن ہند" میں موجود ہے ؎

دو دل میں سے جو ہم نے نہ کہا ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے
دہر میں پاس نفس لازم ہے شیشہ و سنگ پہ سب صحبت ہے
دست اغیار ہے زیر سر یار آج امید کو دعب صحبت ہے

امید نے ریختے کی جو خدمت کی ہے اس پر خاک ڈالنا سراسر ناانصافی ہے ان کا شمار ان ہستیوں میں ہے جنھوں نے ریختے کی آبیاری کی ہے۔ یہ بات کچھ کم قابل ستائش نہیں کہ ایک صاحب ولایت نے اہل ہند کے دوش بدوش اردو کی ابتدائی ترقیوں میں حصہ لیا۔ نکات الشعرا۔

[illegible]

عید کا چاند

افسانہ

از جناب سید مسیح الزماں جائسی بی اے!

"وہ دیکھئے اس طرف نیم کی چوٹی کے اوپر ذرا بائیں جانب بالکل ناخن کی طرح پتلا ہے۔ ہے آج ہی کا"

"ارے آپ کو دکھائی ہی نہیں دیتا، اچھا یہ میری انگلی کی سیدھ میں دیکھئے تو، وہ جو ہلکا سا ایک بادل کا ٹکڑا ہے نا، اسی سے ذرا دو ایک گز اوپر دیکھئے وہ مہین سا — وہ — غور سے دیکھئے — ہاں دیکھ لیا نا آپ نے جی ہاں، بالکل باریک ہے، آج ہی کا ہے، اور ہمارے یہاں تو سب سے پہلے ثریا نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ہیں تو چھوٹی مگر دیکھتی ہے بہت صاف، دیکھتے ہی چیخ اٹھی، چاند چاند، ہم لوگوں نے پوچھا کہاں ہے کہاں ہے تو بیچاری نے بتایا، لیکن بڑی مشکل سے ہم لوگ بھی دیکھ سکے تھے، اور جب اس نے دیکھا اس وقت تو اور زیادہ روشنی تھی — اور یہ لوگ فضول بھی تو شور مچا دیا کرتے ہیں — وہ آپ کو یاد ہے نا — وہی جب عطیہ خالہ سامنے والے مکان میں تھیں۔ کیسا شور مچ گیا تھا"

اور اب میرا خیال کوئی تین چار سال پہلے کی طرف گیا جب ہمارے پڑوس والے مکان میں عطیہ خالہ ٹھہری تھیں۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں اور تین لڑکے، چاند دیکھنے کے لئے وہ اپنے کوٹھے پر آئے تھے اور ہم اپنے پر، ہر کوئی اسی کوشش میں تھا کہ پہلے چاند وہی دیکھے، سب کی نگاہیں آسمان پر لگی تھیں کہ ایکبارگی اختر چلا اٹھی، وہ دیکھا، اور چھت پر تالیاں بجانے لگی۔ اب دوسرے کا نمبر تھا، یکایک کوئی روشن چیز آنکھوں میں چمکی اور میں فوراً بول اٹھا، ہاں ہاں وہ کیا ہے، مگر ہے بہت مہین، اتنا ہی کہا تھا کہ آفتاب نے بھی ہمارے تائید کی اور رفتہ رفتہ سب نے چاند دیکھ لیا، شور مچ گیا سب خوش ہونے لگے۔ لیکن اتنے میں عطیہ خالہ جو اوپر آئیں تو ہماری ساری خوشیاں ختم ہو گئیں چاند باوجود کوشش کے نہ ہم دیکھ سکے اور نہ دکھا سکے خوب ڈانٹ پڑی ہم لوگوں پر اور اختر تو بیٹھی بھی تھی پاس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں جو اس کے یہاں گیا تو وہ دیوار سے لگی رو رہی تھی، میں نے جو ناک پر ہنسی بلائی تو ہنسنے لگی اور اس کے بعد پھر رونے لگی، ہم سب اس کی اس حرکت پر ہنسنے لگے اور وہ بھی ہنسنے لگی جس پر رضیہ باجی نے اسے ڈانٹا بھی تھا۔ ہاں وہ رضیہ باجی تھیں تو ہم لوگوں سے بڑی کوئی پانچ چار برس لیکن باتیں ہم لوگوں میں گھل مل کر بہت کرتی تھیں ان کی باتیں بھی عجیب ہوتی تھیں ہمیں ان کی باتیں بالکل پسند تھیں۔ وہ تو جب دیکھو شادی ہی کی باتیں کیا کرتی تھیں سلمیٰ کا بیاہ کس کے ساتھ ہوگا اور زبیدہ کس کے پلے باندھی جائیگی اور یہ کیا ہوگا اور وہ کیا ہوگا یہی ان کی سب باتیں ہوتی تھیں آخر کوئی دو چار منٹ ہو تو کوئی نے کہاں تک سنتا چلا جائے کچھ دیر میں ہم اکتا ہی جاتے لیکن وہ بندی اسی طرح باتیں کرتی رہتی۔ گویا سارے محلہ کی شادی کرانے کا ٹھیکہ لئے بیٹھی ہے اور وہ جو میں ایک دن وہاں سے اکتا کر اٹھا تو انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور پوچھنے لگی کہ میں شادی کہاں کروں گا جہاں ہو جائے گی، میں نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ جیسے میں جانتی نہیں ہوں۔ تمہاری شادی اختر سے ہو رہی ہے اختر سے، اور میں نے گھبرا کر اختر کی طرف دیکھا تھا وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی اپنے جمپر کے پھٹے ہوئے دامن کو دیکھ رہی تھی، پھر میری نظریں سب پر باری باری پڑیں، کوئی مجھے دیکھ رہا تھا کوئی اختر کو۔ کوئی مسکرا رہا تھا اور آخر میں رضیہ باجی مجھے وادطلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر پھر مجھے ایسی شرم آئی کہ میں گھر بھاگ آیا اور دو تین روز تک اختر کے قریب جاتے ہوئے جھجکتا رہا۔ لیکن رضیہ باجی کو جب موقع ملتا مجھے اختر کا میاں کہہ دیتیں اور میں شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

اور پھر رفتہ رفتہ میری ساری شرم چھوٹ گئی اور میں بے تکلف اپنے آپ کو اختر کا میاں کہلا لیتا۔ بلکہ کبھی تو خود

بھی کہہ دیتا اور ہماری چھوٹی سی ٹولی میں یہ الفاظ ہم دونوں کے نام کے مترادف ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو میں اختر کے سامنے بھی اپنا یا اس کا لقب دہرا دیتا اور وہ بڑے مزے سے مسکراتے ہوئے "بھگ" کہہ کر اپنا سر نیہوڑا لیتی' اور یہاں انہی دنوں اختر کے ابا نے اسے ربڑ کی ایک بڑی سی گڑیا لا دی' اختر نے اس کے ننھے ننھے کپڑے بنائے' جمپر' بلوز' شلوار' فراک' سفید نیلے' پیلے' گلابی سب ہی رنگ کے۔ اور انھیں تہ دے کر اپنے کمرے کی الماری میں ایک ننھے سے بکس میں رکھا' کیسے اچھے لگتے تھے وہ ننھے ننھے کپڑے۔ اور وہ روز اسے کپڑے بدلواتی' پاؤڈر اور سرخی لگاتی اور بڑے پیار سے بٹھایا کرتی تھی۔ جب میں لکھنؤ سے واپس آ کر ان کے گھر گیا تو رضیہ باجی نے بڑی شوخی سے مجھے پکڑ کر کہا کہ "اسے دیکھا ہے" لیکن نہیں شاید یہ کہا کہ "لڑکی دیکھی؟" اور میں نے متعجب ہو کر جو پوچھا کہ کون لڑکی تو انھوں نے — ہاں یہی تو کہا تھا کہ "اپنی لڑکی اور کون" اور مجھے گھسیٹتی ہوئی اختر کے کمرے میں لے گئی تھیں جہاں وہ بیٹھی اپنی گڑیا کے سنگھار کر رہی تھی۔ "یہ کیا اختر؟" میں نے کہا تھا اور وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔ "کب پیدا ہوئی یہ" میں نے پھر پوچھا تھا۔ لیکن وہ مسکراتی رہی۔ "کے مہینہ کی ہے؟" میں نے بزرگانہ شان سے جب پھر سوال کیا تو وہ خاموش نہ رہ سکی تھی اور جھینپ کر سر کو نیچے کی طرف جھٹکتے ہوئے "بھگ" کہا تھا اور میں نے مسکراتے ہوئے گڑیا کو یوں اٹھا لیا تھا جیسے کوئی اپنی لڑکی ہی تو تھی جس پر رضیہ باجی قہقہے مار کر ہنسنے لگیں اور اختر جھپٹ کر گڑیا چھین کر اس کے دامن میں لگے ہوئے ستارے ٹھیک کرنے لگی۔

رضیہ باجی کہا تو یہی کرتی تھیں کہ وہ شادی کبھی نہ کریں گی اور ہمیشہ یوں ہی رہیں گی۔ لیکن انھیں شادی کی باتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بتایا کرتی تھیں کہ ان کے والدان کے جہیز کا سارا سامان لا چکے ہیں۔ امداد کی شادی کا سب سامان تیار ہے۔ لیکن وہ خود کسی سے کرنے کو راضی ہی نہیں ہوتیں۔ روز ایک نہ ایک تو میرے یہاں ضرور ہی آتیں اور گھنٹوں باجی سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ انہی کے پاس ان کا جی بھی لگتا تھا اور وہ بھی تو ان کا جی بہلانے کی خوب خوب ترکیبیں نکالتی تھیں۔ کبھی ان کا گھونگھٹ کاڑھ کے دلہن بنا کر جو ان کے دولھا کا ذکر کرنے لگتیں تو رضیہ باجی کے چہرے پر سرخی آ جاتی اور وہ مسکرا کر ان کی گود میں اپنا سر رکھ دیتیں اور باجی ان کا باریک دوپٹہ چہرے پر سے یوں سرکاتیں جیسے چاند پر سے بدلی سرکتی ہے۔ ان لوگوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں بڑی دلچسپ — ہاں دلچسپ — تو خیر — کائیں، کائیں! کائیں! نے مجھے چونکا دیا اور میں نے نگاہ اٹھا کر آواز کی جانب دیکھا۔ ایک کوا اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اور مجھے اس دن کا خیال آیا جب اختر اور میں کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو کوے دکھلا رہے تھے۔ اسی کوٹھے پر تو تھے وہ بائیں کونے پر جہاں وہ پھٹا کنکوا پڑا ہے بالکل اسی جگہ وہ کھڑی تھی۔ اور بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کو جھٹلاتے اور کوے دکھاتے رہے۔ لیکن آخر میں اختر مجھے کوا نہ دکھا سکی تھی۔ قریب قریب اندھیرا ہو گیا تھا اور میں اسے چڑانے لگا تھا۔ کہ اکبری مسجد کے اس مینار کی طرف سے ایک کوا اڑتا ہوا بڑھا اور اختر نے فاتحانہ انداز سے وہ "کوا" کہہ کر مجھے خاموش کر دیا۔ پھر ہم نیچے اترنے لگے' جب زینہ کے موڑ پر پہنچے تو میں نے آنچلے کی طرف اشارہ کر کے اسے ڈرا دیا اور وہ چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی "کیا ہے" نیچے سے امی نے آواز دی۔ اور جب اختر نے بتایا کہ میں نے اسے ڈرا دیا تو امی مجھ پر خفا ہوئی تھیں۔ بڑکی وہ تھی وہ بھی۔ آخر نہ کہتی تو اس کا کیا چلا جاتا۔ ذرا سا ڈرا دینا بھی کوئی چیز ہے۔ اسی نے مجھے لاکھوں بار ڈرایا تھا۔ ارے وہی جو میں ثریا کے سالگرہ کی مٹھائی لئے اس کے ہاں جا رہا تھا۔ تو اس نے مجھے دہلیز میں ڈرایا تھا۔ میرے ہاتھ سے شیرینی کی طشتری بھی گر گئی تھی۔ لیکن میں نے کہیں شکایت کی تھی! اور وہ شبرات کے دن جو میں شاید محمود چچا کے یہاں سے آ رہا تھا تو وہ اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔ میں جو قریب پہنچا تو چیخ پڑی "ارے چھچھوندر" اور میرا پیر پچھاری نالی میں جا پڑا۔ کپڑے تو خراب ہو گئے ہی تھے۔ لیکن حلوے کی آدھی قاش بھی میرے ہاتھ سے چھٹک کر نالی میں چلی گئی اور وہ جو تھی تو کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں خیر یہ سب تو برداشت کر لیتا۔ لیکن وہ تو اسی طرح جا کر بانو' زبیدہ' شمیمہ' ثریا' پروین اے سب ہی سے تو کہہ آئی اور مجھے سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ اسی لئے تو میں نے اس سے بولنا بند کر دیا تھا۔ اور پھر دو دن تک نہیں بولا تھا۔ تھی بھی تو بڑی کائیاں' جب

کبھی لڑائی کی چھیڑ کرتی رہتی، پھر آخر کوئی کیسے نہ لڑے — لیکن
وہ مجھے مناتی بھی تو لیتی تھی بڑے مزے سے اور میں نہ مانتا
تو رونے لگتی اور ایسا روتی کہ مجھے ماننا ہی پڑتا — ارے
چھیڑ کرتی تو کیا، جب میں ہی نہ لڑتا تو وہ کیسے لڑتی اور کوئی
خواہ مخواہ تھوڑے ہی لڑتا ہے وہ تو پہل ہمیشہ میری ہی طرف
سے ہوتی تھی۔ میں اس کی گڑیا کے کپڑوں کو ملگجا دیتا تو وہ انہیں
مجھ سے چھین لیتی، میں اسے منہ چڑا دیتا اور — لیکن
لڑائی کیا کوئی بہت دیر کے لئے تھوڑے ہی ہوتی تھی۔ یہی
کوئی پندرہ بیس منٹ اور اس کے بعد ہم پھر اسی طرح کھیلنے
لگتے۔ لیکن کبھی کبھی ہماری لڑائی جو تہمیہ، بانو وغیرہ سے ہوتی
— تب تو اختر، زبیدہ اور میں ایک طرف ہوتے تھے۔
اور پھر لڑائی سات سات آٹھ آٹھ دن تک رہتی تھی، وہ تھیں
بھی بڑی لڑاکنیں، جب دیکھو بڑی بی کی طرح لڑنے پر تیار۔
اسی سے تو ہم میں اور ان میں بنتی نہ تھی۔ جب دیکھو گڈے ہی
کا بیاہ کرتی تھیں جس میں جہیز خوب ملے اور پاس سے کچھ نہ
خرچ ہو۔ ہونہہ بڑی آئیں وہاں سے، اسی لئے تو مار بھی
کھاتی تھیں مولوی صاحب سے — ہاں مولوی صاحب بھی
جو آتے تھے، کالی کالی ڈاڑھی رکھے، جو سر ہلا کر قل ہو اللہ احد
کہتے تو ان کی ڈاڑھی اس طرح ہلتی جیسے بلاقی کا بکرا اگر دن ہلا
ہلا کر میں میں کرے۔ ہر وقت ایک ڈنڈا سا ہاتھ رکھتے۔ کچھ
سرخ سرخ سا موٹا سا۔ مارتے تو وہ ہاتھ سے تھے۔ لیکن
ہم لوگ ان کے اس ڈنڈے کو دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ مار —
جیسی مار تو ہم لوگوں نے ان سے کبھی نہیں کھائی۔ ہاں البتہ
انھوں نے ہمیں گھرکا ضرور تھا۔ وہ ڈانٹتے بھی تھے تو کتنے
زور سے — معلوم ہوتا تھا جیسے کیا معلوم کیا ہو گیا بادل بھی
تو اتنے زور سے نہیں گرجتا — ہم ان کی ڈانٹ سن کر دبنے
لگتے، ہاں رونے لگتے۔ اور رونے میں تو بھئی آفتاب بڑا
وہ تھا۔ ذرا سا کچھ ہوا کہ چلا چلا کر رونے لگتا۔ جیسے کسی نے
حلال ہی تو کر دیا ہے اُسے۔ اور پھر گھنٹوں اسی طرح چیختا۔
ارے میں کیا کوئی بھی اُسے پسند نہیں کرتا تھا وہ جو ہم
وہاں صحن میں رسی سے کود نہیں رہے تھے۔ میں اور اختر
اسے گھما رہے تھے اور وہ کود رہا تھا۔ کہ رسی اس کے پیر
میں پھنس گئی اور وہ گر پڑا۔ اب آخر اس میں ہمارا قصور رہی کیا

تھا۔ لیکن وہ کتنی دیر تک چلا چلا کر رویا کیا۔ اسی وجہ سے تو
ہم اسے کبھی اپنے ساتھ کھلاتے نہ تھے۔ وہ ہی خوشامد
کرتا تو کہتے کہ آؤ کھیل لو۔ لیکن پہلے وعدہ لے لیتے کہ ویسے
روؤگے تو نہیں۔ مگر وہ جب بھی گرتا یا کچھ ہوتا تو رونے
لگتا اور ہمیں اس کی وجہ —

"ہاں، چاند ہو گیا" کسی نے گلی میں کہا اور میں چونک
پڑا، چاند ہو گیا اور میری نگاہیں پاس کے کوٹھے پر گئیں۔
اور مجھے اختر کا چہرہ یاد آیا — وہ گول گول آنکھیں، وہ
صبیح چہرہ — چاند ہو گیا! میں نے دوسرے دن کا
اپنا پرانا طنزیہ فقرہ یاد کیا — نیم کے پیڑ کی طرف ایک
ناشپال ٹوٹتے ہوئے ستارے کی طرح اٹھ کر بجھ گیا۔ اور
بھلکی وہی مترنم آواز میرے کانوں میں گونج اٹھی ٭

نور قمر

کبھی میری نگاہوں سے تو دیکھو سادگی اپنی

از حضرت قمر سہسرامی

سرور و کیف سے معمور ہے اب زندگی اپنی
سہانا باغ اپنا ہے سہانی چاندنی اپنی

مصیبت ہو گئی ہے اب یہ عقل و آگہی اپنی
الٰہی کیا ہوئی وہ روز و شب کی بیخودی اپنی

مبارک ماہ و انجم کو ہو یہ تابندگی اپنی
عطا کر اے ضیائے حسن دل کو روشنی اپنی

محبت کا بھلا ہو کر دیا دنیا سے بیگانہ
بڑی ہی کشمکش میں مبتلا تھی زندگی اپنی

یقیں کیوں آگیا اب میرے جذباتِ محبت کا
مرے اشکوں میں کیا صورت کسی نے دیکھ لی اپنی

نہ ہوتے مہر و مہ روشن نہ گلشن پہ نکھار آتا
اگر تم مستعار ان کو نہ دیتے روشنی اپنی

اگر تم ہی نہیں ہو چارہ فرمائی پر آمادہ
تو منت کش نہ ہوگی غیر کی بیچارگی اپنی

تصور سے بھی جس محفل کے اپنا دل لرزتا ہے
وہیں مجبور کر کے پھر تباہی لے چلی اپنی

ہمارے ذوق بے پایاں سے دنیا محو حیرت ہے
قیود بندگی سے ماورا ہے بندگی اپنی

حیات جاوداں اس کو ملیگی کیا محبت میں
جسے محبوب ہے اب تک حیات عارضی اپنی

نہ جانے حال کیا ہوتا ہمارا ان کی فرقت میں
اگر مانوس رنج و غم نہوتی بیکسی اپنی

تمہارا دل بھی بول اٹھیگا میرا ہمنوا ہو کر
کبھی میری نگاہوں سے تو دیکھو سادگی اپنی

رہا کچھ واسطہ مجھکو نہ شورش گاہ ہستی سے
دل وحشی نے اک دنیا بسالی ہے نئی اپنی

کہاں ہم اور کہاں ان کی نوازشہائے بے پایاں
خدا کی شان ہے یہ، ایسی قسمت تو نہ تھی اپنی

سبکسارانِ ساحل چیخ اٹھے میری جرأت پر
رخِ امواج پر جب میں نے کشتی چھوڑ دی اپنی

بڑی مشکل سے اپنی ذات کا عرفان ہوتا ہے
وہ انساں ہو گیا جس نے حقیقت جان لی اپنی

قمر ان کو نہیں احساس تک میری وفاؤں کا
خوشی پر حسن کی قربان کر دی میں نے ہر خوشی اپنی

جھوٹ کی راکھ

بیرسٹر کیدار ناتھ اگرچہ جیکر یا سپرو کی طرح شہرہ آفاق نہ تھے لیکن فوجداری مقدمات کی پیروی میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ دہلی میں اُن کی صوبائی شہرت کو چار چاند لگ رہے تھے۔ وہ ایک کامیاب فوجداری وکیل تسلیم کئے جا چکے تھے۔ ولایت سے لوٹنے کے بعد انہوں نے دہلی کو وکالت کے پیشے کے لئے منتخب کیا تھا۔

خونیوں، انقلابیوں اور تشدد پسندوں کے مقدموں میں وہ قابل رشک کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے نوجوانی میں پریکٹس شروع کی تھی۔ اور سات آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں اُن کا نام زبان زدِ خاص و عام ہو گیا تھا۔

دہلی کا ایک تاجر لالہ ہرپال سنگھ اس وقت بمبئی میں تاجرانہ شان و شوکت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ بیوی کو زہر دے کر ہلاک کر دینے کے سنگین جرم میں ماخوذ تھا۔ کورٹ میں اس کے خلاف مقدمہ دائر ہو چکا تھا۔ اور اخبارات میں اس مقدمہ کا بڑی شد و مد سے ذکر ہو رہا تھا۔ اُس نے بیرسٹر کیدار ناتھ کی دانشمندی، فاضلانہ قابلیت اور وکیلانہ شہرت پر پورا پورا بھروسہ کیا۔ اور بمبئی کے عام قانون داں طبقہ سے گریز کر کے بیرسٹر موصوف کو اپنا پیروکار منتخب کیا۔ وہ اعتماد کی حدود سے گزر کر یقین کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔ اُسے یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "اِس مقدمہ میں میری بریت بیرسٹر صاحب کی ذکاوت و فطانت پر مبنی ہے اور شکست میری شومیٔ قسمت پر!" چار دن، پورے چار دن تک بیرسٹر کیدار ناتھ کو نہ راحت و چین میسر تھا نہ کھانے پینے کا ہوش۔ وہ واقعات کے ادھیڑ بن میں کھوئے ہوئے تھے گواہوں کے بیانات اور مقدمہ کے اہم کاغذات نے اُن کے ہوش و حواس کو جذب کر لیا تھا۔ بالآخر اُن کی یکسوئی، جاں کاری اور کاوشِ فکر کے بہترین نتائج مرتب ہوئے۔ اور کورٹ نے لالہ ہرپال سنگھ کو بے داغ ثابت کر کے بری کر دیا۔ اِس فتح کے بعد اُن کے چہرے پر مسرت و طمانیت کا نور جھلکنے لگا۔

میٹھی زبان کی ایک کہانی

از جناب غلام محمد ناظر انصاری جلگاؤں

شام کو پنجاب میل کی روانگی کے وقت وہ اسٹیشن پر حاضر تھے بوری بندر کے اسٹیشن پر یوں تو ہمیشہ بھیڑ رہتی ہے۔ لیکن گاڑی کے چھوٹنے کے وقت اُس میں خاص اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیدار ناتھ ایک کیف و سرور کے عالم میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔

اپنا تمام زادِ سفر (اور وہ تھا ہی کیا؟ ایک سوٹ کیس اور ایک ویلیس) سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں رکھ کر ایک سیٹ پر اُنھوں نے قبضہ کر لیا۔ باقی ڈبہ خالی پڑا رہا۔ گاڑی کی روانگی کو کوئی پانچ سات منٹ کی دیر تھی۔ وہ کسی کے منتظر نظر آتے تھے برقی گھڑی کی منٹ کی سوئی نے ایک منٹ کا فاصلہ طے کیا۔ اتنے میں بری الذمہ ملزم ہرپال سنگھ پھولوں کا ایک بہت بڑا ہار اور گلدستہ لئے پلیٹ فارم پر نہایت تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا آیا۔ ایک منٹ اور ختم ہوا۔ اُس نے کیدار ناتھ کے گلے میں ہار ڈالا اور گلدستہ ہاتھ میں دے کر کہنے لگا "میری رفیقہ حیات تو طویل علالت سے پریشان ہو کر زہر کھا کر مر گئی۔ میرا نام بھی ڈوبتا تھا۔ آج آپ کی بدولت مجھے نیک نامی حاصل ہوئی" یہ الفاظ ادا کرتے وقت اُس ساڑھے چھ فٹ اونچے پنجابی نوجوان کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

گاڑی چھوٹنے سے ایک منٹ قبل اُس نے ایک بند لفافہ بیرسٹر کی نذر کیا۔ اُس پر "آپ کی سیوا میں" لکھا ہوا تھا۔ وہ "نہیں" کہنا چاہتے تھے کہ ایک اینگلو انڈین دوشیزہ تیز قدمی سے آئی اور نہایت شیریں کلامی سے انگریزی میں بیرسٹر سے مخاطب ہوئی: "کیا مجھے اندر جگہ مل سکتی ہے؟"

"جی آئیے شوق سے آئیے" بیرسٹر نے انگریزی میں جواب دیا۔ اور دروازے سے ہٹ کر اُسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ وہ ڈبے میں داخل ہوئی اور ریل چل دی۔

تقریباً پانچ منٹ تک دونوں نے گفتگو کی۔ بیرسٹر انگریزی تہذیب و آداب سے واقف تھے۔ اِس تو طالب کیسے شناسا ہو [illegible]

انہوں نے اسٹیشن پر "ایوننگ نیوز" اور "السٹریٹڈ ویکلی" خرید لیا تھا۔ ایوننگ نیوز کا مطالعہ کرنے کے بعد السٹریٹڈ ویکلی پڑھنے میں مصروف تھے۔ "ایوننگ نیوز" کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس دوشیزہ نے ایک دلکش مسکراہٹ سے اپنی شیریں آواز میں پوچھا۔ "آپ کو کوئی حرج تو نہ ہوگا؟"

"حرج کیا معنی! مجھے بیحد مسرت ہوگی"۔ یہ کہکر بیرسٹر نے اخبار اس دوشیزہ کو دے دیا۔ اخبار لیتے وقت اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس ہوا۔ انہیں خیال ہوا کہ اس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے۔

بیرسٹر کیدار ناتھ اپنی وضع کے پابند تھے۔ ہر چند کہ وہ یورپ کی سرزمین سے لوٹے تھے۔ لیکن خاندانی روایات کو برقرار رکھنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ خاندانی حیثیت سے بھی وہ ایک بلند مرتبہ شخصیت کے مالک تھے۔ اس کی حرکات سے ان کے کان کھڑے ہوگئے اور انہوں نے اس کی طرف سے نظر ہٹالی۔

اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکالا۔ بال سنوارے۔ پھر اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ چند منٹ کے بعد ننھے سے "پف" سے رخساروں کا پوڈر صاف کیا۔ غرض اس کی اس قسم کی حرکات جاری تھیں۔ وہ دزدیدہ نگاہوں سے بیرسٹر کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ گویا وہ اپنی دزدیدہ نگاہیں بیرسٹر پر صرف کر رہی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے ہمسفر کو کسی نہ کسی طرح اپنی طرف راغب و متوجہ کیا جائے۔ کیدار ناتھ بھی بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ انہوں نے اس کی حرکتوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی تھی۔ اس نے دریافت کیا "کیا آپ مجھے اپنا السٹریٹڈ ویکلی دیجئے گا؟" اس کے لبوں پر وہی دلکش مسکراہٹ، آواز میں شیرینی اور آنکھوں میں شوخی نظر آئی۔ بیرسٹر نے اس کا سوال سن کر اس کی طرف دیکھا۔ گویائی کے وقت اس کے لہائے رنگیں نہایت حسین نظر آرہے تھے۔

اگر اس کی نگاہوں میں شوخی نہ ہوتی تو کیدار ناتھ کم سے کم اس سفید فام دوشیزہ کے حسن صبیح اور رقیق نگاہوں سے استعمال کی ہوئی خوبصورتی کے ضرور معترف ہوتے۔ اور اس جلبنہ سے متعارف ہوجانے کی مسرت اور تسلی ان کے چہرے سے نمایاں ہوجاتی۔

بیرسٹر نے دوربی سے ویکلی کا پرچہ اس کے ہاتھ میں رکھا۔ اس نے ہنستے ہوئے پرچہ لیا اور "تھینک یو ویری مچ" کہکر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اب دادر کا اسٹیشن آگیا اور گاڑی ٹھہر گئی۔ ایک لمحہ کے بعد گاڑی پھر روانہ ہوئی۔ کیدار ناتھ نے ایک موٹا سا چروٹ نکال کر جلایا اور دھوئیں کے بادل بنانے لگے۔ چروٹ پیتے وقت سورج کی کرن کی طرح چمکتا ہوا ایک خیال ان کے دماغ میں آیا۔ انہوں نے وہ لفافہ جس پر "آپ کی سیوا میں" لکھا ہوا تھا جیب سے نکالا۔ اور اسے چاک کیا۔ تو معلوم ہوا کہ سو سو روپے کے تین نوٹ رکھے ہیں۔ وہ روپے لالہ ہریال سنگھ نے نہایت خلوص قلب کے ساتھ بیرسٹر کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ وہ نوٹ ہاتھ میں لیکر کہنے لگے "میری فیس تو پہلے ہی مل چکی ہے۔ اب اس غریب نے یہ روپے فضول دیئے۔ کیا ضرورت تھی؟" غیر ارادی طور پر ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ تینوں نوٹ انہوں نے جیب میں رکھ لئے۔

اس وقت بالکل اتفاقی طور پر ان کا طائر خیال اپنی ہمسفر خاتون کی طرف پرواز کیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ اس کی پریشان نظریں ان کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہی ہے۔ اس عرصہ میں گاڑی دادر کو چھوڑ کر بہت آگے نکل گئی تھی۔ چند لمحات کے بعد اس دوشیزہ نے اپنے بٹوے میں ہاتھ ڈالا اور کچھ ٹٹولنے لگی۔ ساتھ ہی زور سے چلا کر کہنے لگی "یا خدا! اب میں کیا کروں؟"

اس کی چلاہٹ سن کر کیدار ناتھ نے ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا "کیا ہوگیا؟"

"ہائے اللہ میرا ٹکٹ!"

"ذرا غور سے بٹوے میں دیکھئے"

"جی میں تو بٹوے میں اچھی طرح دیکھ چکی ہوں۔ میرا ٹکٹ اور روپے کہیں گر گئے ہیں۔ کیوں صاحب! اب میں کیا کروں؟"

اس نے مظلوموں کی طرح گریہ زاری کے لہجہ میں کہا۔ بیرسٹر صاحب کچھ دیر غور کرنے لگے ان کے دل میں ہمدردانہ جذبات کی لہریں اٹھیں۔ ان کے دل نے انہیں اس کی امداد پر آمادہ کیا۔

"کہاں جائیں گی آپ؟" انہوں نے پوچھا۔

"کہاں؟ فی الحال مجھے اگت پوری تک جانا ہے لیکن میرا ٹکٹ بمبئی سے راولپنڈی تک کا ہے۔ کیوں صاحب!

اب کیا کروں میں؟ اب میرا کیا حشر ہوگا؟ مجھے ریل سے اُترنے نہ دیا جائیگا اور ٹکٹ طلب کیا گیا تو میں کیا کہوں گی؟" وہ ہچکیاں لیکر رونے لگی۔

بیرسٹر کیدارناتھ پر سکتہ سا چھا گیا۔ وہ ایک منٹ کے لئے خاموش ہو کر غور کرنے لگے۔ اتنی ہی دیر میں اس عورت نے اپنا پینترا بدلا۔ ہچکیاں اور آہ و زاری بند کر دی۔ اور پوچھا "کیا آپ مجھے عارضی طور پر ایک سو روپیہ عنایت کر سکتے ہیں۔ راولپنڈی پہنچکر میں آپ کے پتہ پر بھیجدوں گی۔"

"ایک سو روپیہ"

"آپ کے پاس موجود ہیں۔ میں نے دیکھے ہیں۔"

"مگر وہ تمہارے تو نہیں ہیں۔" کسی قدر خشمگیں آواز میں بیرسٹر کیدارناتھ نے جواب دیا۔

"لیکن حقیقتاً مجھے اُن کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے درکار ہیں" اُس کا اب لہجہ تبدیل ہو چکا تھا۔

"ہرگز نہیں مل سکتے۔"

"مجھے ملنا ہی چاہئے۔ ورنہ میری ذلت و خواری ہوگی۔"

"ہرگز نہیں سو تو کیا میں تمہیں ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔"

"انکار کرنے سے پیشتر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ میں آپ سے بخوبی واقف ہوں۔ آپ دہلی کے مشہور بیرسٹر کیدارناتھ ہیں۔"

خفیہ پولیس کے کسی کارندے کی طرح جب اُس نے بیرسٹر کا نام و نشان۔ وطن اور پتہ بتایا تو کیدارناتھ اُس کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔

"حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے اپنا نام اور پتہ اس تھیلی پر لکھا ہے۔ اور "ایوننگ نیوز" میں آپ کا تذکرہ ہر دلعزیز وکیل کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔"

اس کے مشاہدہ سے بیرسٹر کو پتہ چل گیا کہ میرا واسطہ ایک خطرناک حد تک ذہین خاتون سے پڑا ہے۔

"تو کیا طے کیا آپ نے؟ ایک سو روپے کا نوٹ دیجئے گا یا نہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" کیدارناتھ اُسے آمادہ بہ اصرار دیکھ کر مشتعل بلند ہو گئے۔

"پھر غور کیجئے آپ کے روبرو آپکی پوری زندگی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں ایک مرتبہ نہیں کہہ چکا تو آخر تک اُسی پر قائم رہوں گا۔"

اب وہ اُٹھی اور ڈبے کے غسل خانے میں گئی۔ بیرسٹر صاحب کے دماغ میں تخیلات کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ وہ اُسی حالت میں چروٹ پیتے رہے۔ راکھ جھٹکنے کی طرف بھی اُن کی توجہ راغب نہ ہوئی۔

وہ غسل خانے سے نکلی۔ اب اُس کا رُوپ ہی کچھ اور تھا۔

"دیکھئے بیرسٹر صاحب ایک سو روپے کے لئے ضد نہ کیجئے۔"

"میں صاف الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں ہرگز ہرگز روپیہ نہ دونگا۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ تو پھر ایک نیا قصہ سُنئے۔ آپ نوجوان ہیں۔ میں ایک دوشیزہ۔ ڈبے میں دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ بیرسٹر کیدارناتھ "کالا آدمی" ایک حسین دوشیزہ "گریسی ایلین اسمتھ" کو تنہا پاکر اُس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اس کش مکش میں گریسی کے ہاتھوں اور پیروں کو کئی جگہ نوچا جس سے متعدد زخم ہو گئے۔ یہ دیکھئے۔" یہ کہکر اُس نے ہاتھوں اور پیروں پر خراشوں کے نشانات بیرسٹر کو دکھائے۔ "اور آگے سُنئے۔ اسی چھیڑ چھاڑ میں گریسی کے بال پریشان ہو گئے۔ بوس و کنار کی وجہ سے اُس کے منہ کے بالائی حصہ کی "روز" صاف ہو گئی۔ سب سے زیادہ اہم اور پختہ ثبوت یہ کہ بیرسٹر کیدارناتھ نے گریسی کا فراک سینے کے اُبھار کے پاس ہی چاک کر دیا۔ دیکھئے یہ دیکھئے اب یہ قصہ قریب الختم ہے۔ اب میں ذرا رُکتی ہوں اور آپ سے پوچھتی ہوں۔"

اُس نے اپنے سینہ پر سے فراک چاک کیا۔ اور سینے کے اُبھار کو عُریاں کر دیا۔ اُس کی بے حیائی دیکھ کر بیرسٹر شرم کے مارے پانی پانی ہو گئے۔ وہ اس کے قریب سے بہت سٹ پٹائے۔ اُن کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ انھوں نے سوچنا چاہا لیکن اُس نے مہلت نہ دی اور کہا "بیرسٹر صاحب! آپ کے خلاف کافی سے زیادہ پختہ شہادتیں موجود ہیں۔ آپ کے سامنے آپ کی زندگی، پیشہ، دولت، شہرت، عزت سب کچھ ہے۔ کیا سو روپے کے لئے آپ سب کچھ کھونا چاہتے ہیں۔"

بیرسٹر نے غور کیا "سب کچھ کھو دونگا۔ لیکن اس کمبخت کی

ذلیل حرکتوں سے شکست نہ کھاؤں گا۔ انہوں نے اسی ضد سے جواب دیا: "جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو۔ لیکن روپے ہرگز نہ ملیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ گریسی نے اس سیاہ دیو کے پنجے کی گرفت سے اپنے آپ کو رہا کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ آخر اُس کا ہاتھ زنجیر تک پہنچا" کلیان اسٹیشن آنے سے بیشتر.... پھر غور کیجئے۔ آخری موقع، آخری وقت، آخری مہلت۔ کیا نہیں؟ جواب ندارد! اچھا دیکھئے اس کہانی کا انجام۔"

کھٹ کھٹ کر کے اُس نے زنجیر کھینچی۔ گاڑی رُکی۔ ہر طرف شور و غل ہونے لگا۔ گارڈ، ڈرائیور۔ آدھے کالے، آدھے گورے لوگ ڈبے کے قریب جمع ہو گئے۔ مسافروں نے تماشائیوں کی طرح ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا۔ اس انداز سے کہ گارڈ کو واقعہ کی صحت کا احساس ہو جانے۔ گریسی نے نیچے اُتر کر رونی آواز میں ہچکیاں لے لے کر کہا "میں.... میں نے.... کھینچی زنجیر! یہ.... یہ.... سیاہ دیو۔ حیوان، اس نے مجھ سے جبر کرنا چاہا۔ اُف!"

"کس نے؟" گارڈ نے چڑ کر کہا۔

"اس .... نیچ، ذلیل حیوان نے"۔

بیرسٹر کیدار ناتھ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اور کہنے لگے: "جھوٹ ہے یہ سب"

اتنے میں ریلوے پولیس کا ایک افسر موقعۂ واردات پر پہنچا۔ حالات کا علم ہوتے ہی اُس نے گریسی کا بیان لکھ کر اُس کے دستخط لے لئے۔

"آپ کو زیرِ حراست لیا جاتا ہے۔ کوئی ضامن ہے آپ کا؟" پولیس افسر نے دریافت کیا۔

"ضامن، جی نہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ کو ہمارے ہمراہ آنا ہوگا۔"

چروٹ پیتے ہوئے نہایت اطمینان سے کیدار ناتھ نے جواب دیا: "ٹھیک ہے۔ میرے اسباب کی تلاشی لے لیجئے۔ اور فہرست تیار کیجئے۔"

تمام اسباب کھولا گیا۔ اُس کی فہرست تیار کر کے اسباب پولیس نے ضبط کیا۔ قریب کے کمپارٹمنٹ سے دو اینگلو انڈین

"ہم نے اپنے کمپارٹمنٹ میں پڑوس کے ڈبے سے چلانے اور چیخ پکار سنی" انہوں نے کہا۔

گرفتاری کے وقت بیرسٹر کا چروٹ ممی ٹین کی ڈبیا میں محفوظ طور پر رکھ دیا گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں قیدی اپنی بے عزتی کے خوف سے چروٹ کے ذریعہ سے کپڑوں کو آگ لگا کر خودکشی نہ کر لے۔ اس وجہ سے چروٹ کا ضبط کیا جانا ضروری تھا۔

مقدمہ کی کارروائی باقاعدہ طور پر عمل میں آئی۔

اخبارات کو ایک مزیدار چیز ہاتھ آگئی۔ اینگلو انڈین اخبارات گلے پھاڑ پھاڑ کر زہریلی پھنکار مارنے لگے۔ گریسی الین اسمتھ، ریلوے گارڈ، افسرانِ پولیس، ڈاکٹر اور قریب کے کمپارٹمنٹ کے دو شخص گواہ تھے۔ عدالت نے اُن کے بیانات لئے۔ بیرسٹر کیدار ناتھ پر ایک خاتون کی عصمت ریزی کا الزام عائد کیا گیا۔ ملزم نے سرکاری گواہوں کو جرح کے لئے طلب کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کیدار ناتھ بذاتِ خود جرح کر رہے تھے۔ چند سوالات کے بعد انہوں نے دریافت کیا۔

"جب آپ ڈبے کے قریب آئے اُس وقت میں کیا کر رہا تھا؟"

"آپ گدی پر بیٹھے چروٹ پی رہے تھے۔"

"آپ کو معلوم ہے نا کہ وہ چروٹ آپ کی موجودگی میں ضبط کیا گیا؟"

"جی"

"اچھی طرح غور کر لیجئے۔ سمجھے آپ۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جو چروٹ میں پی رہا تھا اُس پر تقریباً پون انچ راکھ جم گئی تھی۔ سچ ہے نا یہ؟"

گواہ پریشان ہو گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ نفی میں جواب دے یا اثبات میں۔

"یاد کیجئے اپنے حافظے پر زور ڈالئے۔ اگر آپ کے خیال میں راکھ مطلق نہ تھی تو ویسا کہئے۔"

"جی نہیں۔ راکھ ضرور تھی۔ چروٹ کے جلتے ہوئے سرے پر وہ راکھ تھی۔"

"یہی ہے نا وہ چروٹ؟" ضبط شدہ اسباب میں سے چروٹ نکال کر انہوں نے گارڈ کو دکھایا۔

"جی ہاں راکھ بھی یہاں موجود ہے"
"حضورِ عالی! دوسرا گواہ طلب کیا جائے"
"ریلوے پولیس افسر مسٹر جادھو شہادت کے لئے پیش ہو گئے۔ اُن پر بھی یہی جرح کی گئی۔ گریسی کے بیان میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ جس ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا تھا۔ اس نے یہ رائے دی کہ یہ زخم اچھے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس نے جسم کو نوچا ہو۔

بیرسٹر کیدار ناتھ نے نصف گھنٹے میں اپنے تحفظ کی صورت پیدا کر لی۔

دوسرے دن مقدمہ کا فیصلہ سنا یا گیا۔ رطب و یابس سے احتراز کر کے فیصلہ کا اختصار یہ تھا:۔

"اگرچہ سرکاری گواہوں کے بیانات کسی قدر قابلِ قبول ضرور ہیں۔ لیکن ملزم کو سزا دینے کے لئے ناکافی ہیں۔ علاوہ ازیں بیرسٹر کیدار ناتھ چروٹ پی رہے اور چروٹ پر ایک پونہ انچ راکھ جم گئی تھی۔ اس کی تصدیق سرکاری گواہ کر رہا ہے۔ چروٹ پر اس قدر راکھ جمنے کے لئے ضروری تھا کہ اُسے قریباً نصف گھنٹے تک پیا جاتا۔ معمولی حرکت سے راکھ جھڑ جاتی ہے۔ لہٰذا فریادی کے گواہ عاصمات گیتی کے بیان کے مطابق چھیڑ چھاڑ، کھینچا تانی یا نوچا نوچی ہوئی ہوتی تو راکھ تو کجا چروٹ بھی اپنی جگہ قائم نہ رہتا۔ لیکن وہ راکھ سمیت اپنی جگہ قائم تھا۔ اس لئے بیرسٹر کیدار ناتھ اپنی نشست سے تقریباً نصف گھنٹہ تک سے مس نہیں ہوئے ہوں گے۔ گویا یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ انہوں نے گریسی کی عصمت ریزی کے ارادہ سے چھیڑ چھاڑ کی ہو گی۔ علاوہ ازیں ضبط شدہ چروٹ ٹین کی ڈبیا میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ سائنس اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ہوا نہ ملنے کے باعث جلتا ہوا سیگرٹ ایک لمحہ میں بجھ جاتا ہے۔ سرکاری گواہ کے بیان کے مطابق چروٹ ڈبیا میں رکھنے کے بعد اُس پر اس قدر راکھ کا جم جانا ناممکن اور خلافِ اصولِ فطرت ہے۔

اس خصوصیت سے کہ چروٹ کی راکھ موجود تھی اور سرکاری گواہوں کے بیانات میں پختگی نہیں ہے۔ میں ملزم بیرسٹر کیدار ناتھ کو بے گناہ ثابت کرتے ہوئے باعزت طور پر رہا کرتا ہوں۔ موصوف کا تمام منبط شدہ مال و اسباب انہیں واپس دے دیا جائے اور چونکہ ان کے ٹکٹ کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ اس لئے سرکار کی جانب سے اُن کے سفر کا انتظام کیا جائے"

دیکھ

از جناب علی احمد بی۔ اے

دُنیائے عقل و ہوش پہ بجلی گرا کے دیکھ
جلتا ہے کیسے طُور ذرا مُسکرا کے دیکھ

ٹھہرا نہ لوں میں عمرِ رواں کو تو بات کیا
آغوشِ منتظر میں کسی روز آ کے دیکھ

دُنیا سمٹ کے نغمہ نہ بن جائے تو سہی
تو گنگنا کے دیکھ، ذرا گنگنا کے دیکھ

شمع و چراغ سے ہوئی روشن نہ شامِ غم
دل کو جلا کے دیکھ جگر کو جلا کے دیکھ

شاید نقشِ نفس کو معطّر بنا سکوں
ہنستے ہوئے کبھی مری محفل میں آ کے دیکھ

آئی صدا جو غرق ہوئی کشتیٔ حیات
ساحل کو چھوڑ موج کو ساحل بنا کے دیکھ

خود جھک پڑیں گے دیر و حرم تیرے سامنے

قطعات

از:- جناب عبدالوہاب عاصم جے پوری

عید؟

یہ تبسم زیرِ لب ہے اے ہلالِ عید کیا   شوق کی در پردہ کچھ تائید کچھ تردید کیا؟
سچ بتا ہوگی ہماری عید بھی کل یا نہیں   وہ ملیں گے یا نہیں ہے حاصلِ اُمید کیا؟

عید کیسی

مسرت کی غربت میں امید کیسی؟   کسی سے یہاں دید وا دید کیسی
گلے مل رہے ہیں سب آپس میں لیکن   کہاں تم کہاں میں مری عید کیسی

عید مبارک

یہ صبح سے تا شام سحر کا عالم   یہ دل میں محبت کے اثر کا عالم
ہو عید مبارک کہ مسلمانوں میں   آتا ہے نظر شیر و شکر کا عالم

یک روز دو عید

بارک اللہ چہ عید است نہے عید سعید   روز عید آمدۂ آمدہ یک روز دو عید
للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست   آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

رقاصہ کی محبت

نفسیاتی افسانہ

محترمہ آنسہ ہاجرہ مسرور لکھنوی

چھوم چھن ن ن چھوم.... نازک اندام رقاصہ ناچتے ناچتے ہاتھ میں شراب سے لبریز ساغر تھامے رشدی کی طرف بڑھی جو ایک گاؤ تکیے پر کہنیاں ٹیکے اسے نیم وا آنکھوں سے تک رہا تھا۔ اس کے گھنگریالے بال اس کی چوڑی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ رہ رہ کر کانپ رہے تھے۔ وہ رقاصہ کو چاہتا تھا لیکن عجیب طریقے سے۔ زمرد لچکتی، بل کھاتی، اپنے فلسفی عاشق کے سامنے کھڑی ہوگئی اور شراب کا چھلکتا ہوا ساغر بڑھا کر بولی "پیجئے"۔

"میں یہ شراب نہیں پیتا" وہ جیسے خواب میں بول اٹھا۔

"وسکی حاضر کی جائے؟" وہ التفات سے مسکرائی۔

"نہیں" وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"برانڈی لاؤں؟" وہ پھر مسکرائی۔

"نہیں" اس کی آنکھوں سے پاگل پن جھانک رہا تھا۔

"اب آپ ہی بتا دیں کونسی چاہئے" رقاصہ نے اپنی بھنویں تان کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"جس کا نشہ کبھی نہ اترے" رشدی نے پہلی بار کسی قدر بیباک ہو کر کہا۔

"ایسی شراب؟"۔ رقاصہ کی کافوری پیشانی پر ہلکی ہلکی سلوٹیں ابھر آئیں۔ وہ مڑی اور ساغر ایک چھوٹی سی میز پر رکھ کر کھڑکی کے قریب تن کر کھڑی ہوگئی۔ جیسے آج وہ رشدی کی عجیب باتوں کا جواب دینے کا مصمم ارادہ کر چکی ہو۔ اس نے ایک بار اس فلسفی قسم کے حسین نوجوان کو نظر بھر کر دیکھا۔ جو آج آٹھ روز سے برابر ہر رات ایک بڑی رقم بوڑھی نائکہ کے ہاتھ پر رکھ کر اسے اپنی عجیب و غریب باتوں میں الجھایا کرتا تھا۔ وہ ہر رات اسی طرح تکیے پر کہنیاں رکھے اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا کرتا اور رقاصہ اس کے سامنے ناچتی رہتی۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر کسی کوچ پر پڑ رہتی۔ لیکن وہ عجیب نوجوان بیٹھا اسے اس وقت تک دیکھا کرتا جب تک سپیدۂ سحر نمودار نہ ہو جاتا تھا۔

رقاصہ کو دن میں کئی بار اس کا خیال آتا۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ آخر وہ یہاں کیوں آتا ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے؟ لیکن اس وقت وہ پریشان سی ہو رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔

رقاصہ نے اپنی بات پوری کی "ایسی شراب تو کہیں نہیں جس کا نشہ دائمی ہو اور .... " وہ کچھ اور بھی کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

رشدی مسکرایا اور بولا "ہے کیوں نہیں؟"

"اچھا تو ایسی شراب کہاں ہے؟" رقاصہ اب اس سے بہت دلچسپی لے رہی تھی۔

"وہ شراب جس کا نشہ تا دم مرگ باقی رہ سکتا ہے۔ وہ تمہاری خوبصورت نیم باز آنکھوں سے ڈھلتی ہے" اس نے ان آٹھ راتوں کی تنہائیوں میں پہلی بار اس کے حسن کی تعریف کی تھی۔ رقاصہ کو رشدی کی زبان سے اپنی تعریف بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس نے اپنی شیشے کی مانند چمکتی ہوئی گردن کو ایک دلکش جنبش دی جس سے اس کی سیاہ ناگن سی لمبی چوٹی پشت پر لہرا کر رہ گئی اور اس کا چہرہ متبسم ہو گیا۔ اس کے دل میں رشدی سے گھل مل جانے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔

"اچھا تو یہی پیجئے" زمرد ایک توبہ شکن انداز سے اس کی جانب بڑھی۔

"ٹھہر جاؤ زمرد!" وہ سخت لہجے میں بولا۔ رقاصہ ٹھٹک کر کھڑی رہ گئی۔ وہ کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے دانتوں سے دبا لیا۔ رقاصہ نے محسوس کیا کہ یہ اس کے حسن کی زبردست توہین ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر باہر آسمان کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اپنے خیالات بنا رہا تھا۔ آسمان پر سیاہ ابر چھایا ہوا تھا۔ لیکن ایسے گہرے ابر میں سے کہیں کہیں دو ایک ستارے موقعہ پا کر جھانکنے

گئے۔ لیکن فضا پر چھائی ہوئی زندہ بیداری دیکھ کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے ماہتاب پھر ابر میں چھپا لیتے۔ کبھی کبھی دُور اُفق میں بجلی اس طرح چمک اٹھتی جیسے کسی تھکے ماندے مسافر کو اپنی منزل کا خیال آجائے۔ بجلی کے چمکنے سے آسمان پر روشنی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ جاتی۔

وہ یکایک رقاصہ کی طرف پلٹا جو اب مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

"زمرد! اتنی پاک شراب ایسی ناپاک جگہ میں کیسے بِک سکتی ہے۔ جہاں شیطان اپنے گندے تنفس سے پاکبازی کا گلا گھونٹ دیتا ہو جہاں ......"

چھن ن ن ن ۔۔۔۔ رقاصہ غصّے سے کھڑی ہو گئی۔ "پاکبازی اور رقاصہ کے کوٹھے پر؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "آپ یقیناً بہک رہے ہیں۔ آپ آخر یہ کیوں بھول گئے کہ یہ ایک حُسن فروش کی خوابگاہ ہے۔ جہاں صرف وہی لوگ آتے ہیں جو دولت خرچ کرنے کے بعد اپنے دامن میں گناہ سمیٹ لے جاتے ہیں۔ جہاں پاکبازی محض ایک دیوانہ پن ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اور پھر مسہری پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کی کنپٹیاں دھک دھک کر رہی تھیں۔

"زمرد! یہ تمھاری بھول ہے۔ کیا ایک رقاصہ پاکباز نہیں ہو سکتی؟" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"آہ رشدی! آپ بار بار پاکبازی کا نام لیکر میرے دل پر چرکے نہ لگائیں۔ میں رقاصہ ہوں۔ میرا مقصدِ حیات صرف چاندی کے سکّے حاصل کرنا ہے۔ بھلا ایک رقاصہ کو پاکبازی سے کیا سروکار۔" اس نے مسہری پر گر کر اپنے چہرے کو بازوؤں میں چھپا لیا۔ شاید وہ اپنی حقیقت کو سمجھ کر رو رہی تھی۔ وہ زور زور سے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کا نیم عریاں صندلیں جسم بار بار تھرتھرا اٹھتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی قیمتی ہیرا کسی حسین گردن میں پڑا جھول رہا ہو۔ جس سے ہلکی ہلکی نورانی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ رشدی خاموش تھا۔ وہ اسے چھیڑ کر پشیمان تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کے آبدار موتیوں جیسے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ اسے تسلیاں دے اور اسے معصوم بچّوں کی طرح تھپک تھپک کر چپ کرا دے۔ لیکن وہ جلد ہی اپنے عارضی خیالات کے جال سے نکل گیا۔ اس نے سوچا۔ کیا آج میں اپنی پاک محبت میں نفس کو دخل دُوں۔ کیا وہ اس کے جسم سے محبت کرتا ہے؟ نہیں! اسے تو رقاصہ سے پاک محبت ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے رقاصہ سے کیا چاہا تھا..... معاً رقاصہ بل کھاتی ہوئی مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید رشدی کے تغافل نے آگ پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ تقریباً چیخ اٹھی۔

"اب آپ کیوں خاموش ہیں۔ میرے دل پر چرکے لگائیے نا، میرے دل کے پھپھولے پھوڑ ڈالئے اور پھر ہنسئے۔ میرے زخموں پر نمک چھڑکیے اور قہقہے لگائیے۔ آپ سمجھتے ہیں عورت عصمت فروشی کرنے کے بعد خوش رہتی ہے۔ نہیں کبھی نہیں! بلکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ اور میں نے تو ایک طوائف کے ہاں آنکھیں کھولیں۔ جہاں ہر طرف گناہ آلود دھند چھائی رہتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ آتے ہیں اور گناہ کو دُنیا کی لطیف ترین چیز بتاتے ہیں۔ پاکبازی کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ سب میرے کوٹھے سے اُترنے کے بعد معصوم بن جاتے ہیں۔ اپنی نظروں میں بھی اور دنیا کی نظروں میں۔ رشدی! رشدی!! کیا میں اس کوٹھے سے اُترنے کے بعد دُنیا کی نظروں میں معصوم بن جاؤں گی؟ نہیں! اس وقت بھی تمہاری دُنیا اور تمہاری سماج مجھے طوائف کے ذلیل نام سے یاد کرے گی۔"

وہ تھک کر دم لینے لگی۔ ذرا دیر بعد پھر بولی: "اُف میرا ضمیر سسک سسک کر قریب المرگ ہو چکا تھا۔ لیکن آہ آج آپ نے پھر اس میں احساس کی رُوح پھونک دی۔ آپ خوش ہوں گے کہ آپ نے مجھے میری حقیقت سے آگاہ کیا اور ...." اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ سنبھل کر بولی: "کاش! آپ یہاں کبھی نہ آتے۔" وہ پھر بڑبڑائی: "کاش! آپ بھی حُسن کے عام خریداروں کی طرح ہوتے۔ لیکن مجھے کیا ہوا جا رہا ہے؟ میں کیا کہہ رہی ہوں!"

اب اس کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے۔ اس کی موٹی موٹی غلافی آنکھوں میں آنسو اُبل رہے تھے۔ وہ اُس وقت سبز برقی روشنی میں نہایت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا باریک ریشمی لباس ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے اُڑ رہا تھا۔

رشدی حیران و ششدر کھڑا تھا۔ اس نے کبھی کسی عورت کو اس قدر غضب ناک نہ دیکھا تھا اور پھر اس قدر نرم۔ وہ رقاصہ کی سسکیوں میں نہ جانے کتنی مظلوم عورتوں کی چیخ پکار سن رہا تھا۔ رقاصہ پھر چونکی "رشدی چلے جایئے۔ فوراً جایئے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں" وہ چلائی۔ اس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ بالکل دیوانی ہو رہی تھی "چلیئے" وہ چیخ اٹھی "میں آپ سے محبت نہیں کرسکتی۔ میں رقاصہ ہوں مجھے صرف پیسہ سے محبت ہونی چاہئیے" اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اس نے ایک بار پوری قوت سے رشدی کو دروازے سے دھکیل دیا۔ اور جلدی سے بند کر لیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک دروازے سے لگی کھڑی رہی۔ نیچے سڑک سے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی وہ دوڑ کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ چھوٹی سی کار لمبی سڑک پر دوڑ گئی۔ وہ دیر تک نظروں میں چھائے موٹر کی سرخ بتیوں کو دیکھا کی۔ پھر نڈھال ہو کر مسہری پر پڑ رہی۔ اسے خیال آیا۔ اب شاید وہ کبھی نہ آئے گا۔ اب کوئی تمام رات اسے کھوئی کھوئی نظر سے نہ دیکھے گا۔ اب کوئی اسے اپنی عجیب باتوں سے پریشان نہ کرے گا۔ اسے وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی نظریں در و دیوار پر دوڑانا شروع کیں۔ ایک جگہ اس کی نظریں رک گئیں۔ یہ کیا؟۔ رشدی کی سیاہ شیروانی کھونٹی پر جھول رہی تھی۔ وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔ کہ کیوں نہ اس نے یاد کر کے اس کی شیروانی دے دی۔ اس نے شیروانی اتار لی اور اسے لے کر مسہری پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایک دم اسے محسوس ہوا کہ جیب میں کوئی سخت چیز ہے۔ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے اسے کھولا۔ یہ کیا۔ رشدی کی حسین تصویر۔ وہ بڑی دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے تصویر اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگالی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ زیرِ لب بڑبڑائی "پیارے رشدی میں تم سے محبت کرتی ہوں"۔

خرابِ محبت

بڑھا جس قدر اجتنابِ محبت
وہ آئے ہیں ہے داد ملنے کا موقع
بہم لڑ رہی ہیں مری اُن کی آنکھیں
پیئے جا اسی طرح آنسو پیئے جا
محبت کی طفلی ہے جب اتنی چنچل
چھلکتے ہی کو ہیں اب آنکھوں سے آنسو
تغافل بہ ظاہر تلطف بہ باطن
محبت ہے کیا چیز وہ پوچھتے ہیں
بھلاتے تھے اُن کو بھلا بیٹھے خود کو
خمار [illegible]

ٹپکنے نہ پائے شرابِ محبت

از حضرت خمار بارہ بنکوی

محبت ہوئی بے حجابِ محبت
کہاں مر گیا اضطرابِ محبت
گلے مل رہے ہیں خرابِ محبت
ٹپکنے نہ پائے شرابِ محبت
قیامت کرے گا شبابِ محبت
اُٹھا چاہتی ہے نقابِ محبت
سلامت رہے یہ حجابِ محبت
بتا دے ذرا انقلابِ محبت
ہمیں پر پڑا خود عذابِ محبت
[illegible]

کاش میں عورت نہ ہوتی

ہر مہینہ تکلیف اُٹھاتی ہوں

وہ رو رہی تھی اور اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ بہن اگر میں عورت نہ ہوتی تو اچھا تھا یا اگر ہوئی تھی تو پھر مجھ میں شرم کرنے کی عادت نہ ہوتی۔ آج سات سال ہو گئے میری زندگی تمام ہوئی جاتی ہے۔ اور تمہارے بھائی کو کچھ خبر نہیں، کہ میں مر رہی ہوں بس وہ یہ دریافت کر کے چپ ہو رہتے ہیں کہ "آپ زیادہ تر لیٹی کیوں رہتی ہیں"؟ پیاری بہن! تم ہی بتاؤ میں کس منہ سے کہوں کہ میں کیا بیمار ہوں۔ مجھے تو اپنی زبان سے کہتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے کہ میں ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہوں اور مجھے اس زمانہ میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا تم کسی ذریعہ اُن تک یہ بات پہنچا دو شاید وہ میرا علاج کرا دیں۔

سہیلی نے جواب دیا۔ پیاری بہن! اب ہمیں اپنے مردوں تک ایسی بات پہنچانے کی ضرورت ہی نہیں ہے میں نے بہت سے اخباروں میں پڑھا ہے کہ عورتوں کی تمام خفیہ بیماریوں کی بہترین دوائیاں دہلی کے "زنانہ دواخانہ" میں ملتی ہیں۔ اور مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ اس دواخانہ کی ہر دوا نہایت عجیب اثر رکھتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عورتوں کی بیماریوں کو عورتیں ہی بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دواخانہ کی دوا "کورس" بہت عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی عورت ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہو، ایام کم آتے ہوں یا رک رک کر اور تکلیف کے ساتھ آتے ہوں یا زیادہ آتے ہوں، یا مہینہ میں دو تین دفعہ آجاتے ہوں یا بالکل نہ آتے ہوں یا ایام کی اور کوئی خرابی ہو بہرصورت یہ دوا اپنا اثر کرتی ہے اور خواہ کیسی ہی کمی زیادتی ہو اس دوا کو استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ بالکل صحیح وقت پر اپنی مقررہ مقدار میں بغیر کسی درد اور تکلیف کے ایام ماہواری آنے لگتے ہیں۔ بڑی عجیب دوائی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس دوا کو سینکڑوں بہنوں نے استعمال کر کے اپنی صحت ٹھیک کی ہے اسی طرح تم بھی

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ اے بی ۲۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر "کورس" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کر لو تندرست ہو جاؤ گی۔ اور ہاں! دوا کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ ایک شیشی "کورس" دو روپے آٹھ آنے کو ملتی ہے۔ اور سات آنے محصول کے خرچ ہوں گے۔ چنانچہ اس بیچاری نے کورس کی شیشی منگا کر استعمال کر لی۔ اب وہ بالکل تندرست ہے۔ ہر ماہ اپنے مقررہ وقت وہ ایام سے بغیر کسی درد اور [illegible]

رباب کا آخری تار

معاشرتی افسانہ

از جناب شیدا کیوروی

چاند کی روشنی ایک الم انگیز نشاط یا نشاط انگیز الم کی ترجمان ہے اس کی ہر کرن میں ایک ایسا لطیف کرب چھپا ہوا ہے جس سے آنکھوں کو آنسو ملتے ہیں اور لبوں کو تبسم، ——— اور ایسی ہی چاندنی میں جب وہ اپنا ٹوٹا ہوا ستار اٹھا کر بجاتی تو جمنا کی موجیں ساحل پر سر ٹیک ٹیک کر ماتم کرتیں۔ سامنے کی چھوٹی سی پہاڑی کا ذرّہ ذرّہ اس کے دلدوز نغموں میں محو ہو جاتا۔ کوئی نہ جانتا کہ یہ آوارہ حال اور بیکس حسین لڑکی کہاں سے آئی؟ ہاں کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ دن رات موسیقی کا کھیل کھیلنے والی عورت کہاں جائیگی؟ چرواہے اپنے ریوڑ لئے اس کے پاس سے گذر جاتے تو اسے بدستور نالہ سرائیوں میں محو دیکھتے۔ اور سورج پہاڑی کی چوٹیوں کا منہ چومتا ہوا جب نکلتا تو اسے ستار بجانے میں مصروف پاتا۔

اس نے دنیا کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ دنیا والوں سے ہمیشہ کیلئے قطع تعلق کر چکی تھی کیونکہ دنیا والوں نے اس کی کوئی قدر نہ کی یہی نہیں بلکہ زمانہ کی بیرحم ہستیوں نے اس پر ظلم کیا۔ اس سے بیرحمی کا برتاؤ کیا۔

عورت اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ مگر رجنی کے دل سے ——— اس پہاڑی کی گود میں پناہ لینے والی جوگن کے دل سے کوئی پوچھتا۔ کہ محبت کے بجائے انسانوں نے اس کے نازک دل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کے تمام نغمے روح کی گہرائیوں سے نکلنے والے نالے تھے جن میں مایوسیوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ جب آدھی رات کے سناٹے میں وہ اپنی داستان غم سناتی تو پہاڑی کی اونچی اونچی چوٹیاں اس کی ہمنوائی کرتیں ——— گویا اسے تسلی دیتیں کہ یہ تکلیف چندروزہ ہے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اب دنیا اس کے لئے بے کیف ہے۔

اب اس کی مسرتیں دوبارہ واپس نہیں آسکتیں۔ یہ ناامیدی اسے اور بھی بے چین کئے دیتی تھی اور اس کا نغمہ ایک دلخراش فریاد۔ ایک المناک نالہ سے بدل جاتا اور ساری دنیا لرز جاتی۔ کانپ اٹھتی۔ اب اسے شہر کا بھول کر بھی خیال نہ آتا تھا اور وہ پہاڑی کے دامن میں موجیں مارنے والی جمنا کے کنارے اپنی مرحوم جوانی پر ماتم کر رہی تھی۔

اسے یاد تھا ——— کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب وہ اپنے میکے میں کمسن اور نوعمر سہیلیوں کے ساتھ گڑیا کھیلنے میں مصروف رہتی تھی، اور سبھی اپنے پرائے اس سے محبت اور پیار سے پیش آتے تھے۔ ماں باپ کی یاد آتے ہی اس کی آنکھوں سے ایک مقدس گنگا بہہ جاتی۔ پھر اسے وہ گھڑی یاد آتی جب محض روپے کی لالچ سے اس کے باپ نے اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو توتلی زبان میں بمشکل اظہار مدعا کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کے متعلق ایک ایسا خوبصورت اندازہ لگایا تھا جس سے وہ جوانی کی لطافتوں میں کھو جاتی لیکن اس کی یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ افسوس وہ اس کی خباب آلود بیتابیوں کو بھی نہ سمجھ سکتا تھا ——— اس کی مخمور آنکھیں صہبائے جوانی کے لبریز جام تھے جن کے اندر شباب کی رعنائیاں کروٹیں لے رہی تھیں امنگوں سے بھرا دل پہلو میں مچل رہا تھا۔ مگر اس کے حسن کی جلوہ آرائیاں ایک معمہ بن کر رہ گئیں۔ وہ گھر کی رانی بن کر آئی تھی مگر کسی کے من کی رانی نہ بن سکی۔ وہ ایک بڑے گھر کی بہو تھی۔ زیورات سے لدی ہوئی۔ مگر زیورات کی جھنکار ——— بھڑکیلی پوشاکوں کی زرپاشیاں اس کے نوجوان دل کے لئے تسکین کا باعث نہ بن سکیں۔

اس کا شوہر کمسن تھا ——— بیاہ کیا چیز ہے؟ دس برس کا لڑکا ان باتوں کو کیا جانے۔ وہ رجنی کو دیکھ کر خوش تھا۔ ایک معصوم بچہ کی طرح جو بنی ٹھنی دلھن کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس نے گھونگھٹ سے یہ دیکھا تو سن ہو کر رہ گئی کہ اس کا پتی دیو، جیون کا ساتھی ——— ایک لڑکا تھا اور ناداں جس کی باتوں میں بھولا پن تھا اور جسے سکول کی کتابوں اور کھیل کود کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسکی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے کلیجے میں خنجر بھونک دیا ہو۔

ماضی کے دھندلے سائے رجنی کی نظروں کے سامنے پھرتے رہتے ہیں ——— ایک دن وہ اپنی بے کیف زندگی پر رو رہی تھی اس کا ننھا شوہر دبے پاؤں آیا اور آتے ہی دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں میچ لیں۔ وہ سمجھ گئی۔

"چھوڑ دو ——— ماتا جی دیکھ لیں گی"

اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ [illegible] نے پلٹ کر دیکھا تبسم چہرے پر کھیل رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا "تم نے ہاتھ کیوں کھینچ لئے مسکراتی ہوئی آنکھیں کہہ رہی تھیں": یہ ہاتھ پھر ایک مرتبہ ان آنکھوں پر رکھ دو جن کے اندر پتی کی محبت موجزن ہے۔ کیا اس کی گرمی تمہارے ہاتھوں نے محسوس کی؟ کیا تمہارے دل نے دل کی دھڑکنے کی آواز بھی سنی؟ تم کتنے بھولے اور نادان ہو، رجنی کی بیتابی کو بھی نہیں سمجھ سکتے — اور پھر آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے نکل پڑے۔

اس کے شوہر نے رجنی کو بے سبب روتے ہوئے دیکھ کر نہایت معصومانہ انداز میں پوچھا۔

"تم رو رہی ہو؟"

"——"

"کیوں رو رہی ہو؟"

"تم نہیں جان سکتے"

"اچھا! تو ماتا جی سے کہوں کیا؟"

"نہیں!!" رجنی نے کہا "ایسی بات ماتا جی سے نہیں کہتے"

"تو پھر پتا جی سے"

"اونہہ" وہ سر ہلا کر بولی۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو پتی دیو سے کچھ کہہ رہے تھے۔ سر کی جنبش، دل کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ لیکن وہ سمجھ نہ سکتا۔ اس وقت یہ کہہ کر رجنی نے دل کو تسلی دے لی "ابھی کمسن ہے۔ نہیں سمجھ سکتا۔ نادان ہے۔ اس کی عمر ہی کیا ہے بچپن میں سب ہی نادان ہوتے ہیں۔ اس میں ان کا کیا قصور" دفعتاً اس کی آنکھوں کے آگے اپنے پتی دیو کی جوانی کی تصویر پھرنے لگی — آج سے دس برس بعد وہ ایک خوبصورت جوان ہوگا۔ یہ بھولی آنکھیں کس قدر شوخ ہوں گی۔ اس وقت کس انہماک سے مجھے دیکھیں گی۔ یہ زبان جس پر بچپن کی معصومیت نے بچپن کا تالا ڈال دیا ہے۔ کس بے باکی سے مجھ سے اظہارِ محبت کریگی۔ یہ ہاتھ جو بچپن کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ محبت کا پیغام لے کر بڑھیں گے۔ کس گرمجوشی سے مجھے دبائیں گے! ان کی گرفت کس قدر سنگین مگر پُر کیف ہوگی"

اسے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب اس کے شوہر کو ابتدائی تعلیم کے بعد بنارس یونیورسٹی بھیجا گیا تھا۔ رمیش — اس کا پتی دیو [illegible] کے مراحل طے کر رہا تھا اور

بیچاری رجنی مستقل کش مکش میں زندگی کے لمحے گزار رہی تھی۔ دن اچھے یا بُرے گزر ہی جاتے ہیں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ عیش اور سُکھ کے دن بیتتے دیر نہیں لگتی مگر غم و اندوہ کے تلخ لمحات پہاڑ کی طرح گزرتے ہیں۔ رجنی کے دل میں تمناؤں کی نازک موجیں اُمید کے ساحل سے ٹکرا لیتی تھیں۔ اس کی خواہشات کے تار مضرابِ آرزو کی پے بہ پے ضرب سے جھن جھنا کر شکستہ ہو گئے تھے۔ اور اس طرح اس نے آٹھ سال کی طویل مدت آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی۔ بالآخر وہ دلکش منظر اس کی نظروں کے سامنے پھر جاتا جب اس کے پتی دیو وکیل بن کر گھر آنے والے تھے۔ گھر میں غیر معمولی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ گھر کے سب لوگ خوش نظر آ رہے تھے۔ رجنی بھی خوش تھی — خلافِ معمول آج وہ بھی مسکرا مسکرا کر مسرت کا اظہار کر رہی تھی۔ آج اس کے پتی آئیں گے — اسے خوشی کیوں نہ ہوتی؟ "جانے وہ مجھے دیکھ کر کیا کہیں گے" وہ سوچنے لگی "جب وہ مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ اس وقت میں کیسی تھی؟ مگر اب میری خواہشات کا طائر پَر پھڑ پھڑا کر تھک گیا۔ جوانی کی رعنائیاں فراق کے صدموں سے مسخ ہو گئیں۔ جوانی کا آفتاب ڈھلنا شروع ہو گیا۔ آنکھوں کی مستی روتے روتے بہہ چکی ہے۔ گالوں کی سُرخی بھی پیلی پڑ گئی تھی۔ ہونٹوں کی جوالہ خشک ہو گئی۔ میں تئیس برس کی ہو گئی۔ چہرے سے بڑھاپا ٹپکنے لگا" یہ سوچتے سوچتے وہ پریشان ہو گئی اور جلدی سے آئینہ اُٹھا کر اپنا چہرہ دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ابھری ہوئی کھال ہڈیوں کے ساتھ چپک گئی آنکھوں کی خوبصورتی اور جوانی کا رُوپ سب کھو دیا" معاً اسے خیال آیا: "اور وہ کیسے ہوں گے؟" اور اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی —!

ابھی وہ اچھی طرح تصور بھی قائم نہ کر سکی تھی کہ ڈیوڑھی پر ایک تانگہ آکر رُکا۔ رجنی دروازے سے چپٹ کر دیکھنے لگی — وہ انگریزی کپڑے میں ملبوس چھڑی گھماتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ ماتا کو پرنام کیا۔ ماں فرطِ انبساط سے دیوانی ہو رہی تھی۔ رجنی خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔ اس کا شوہر اس کے تخیل سے بھی بڑھ کر خوبصورت نکلا۔ جوانی نے لڑکپن کی وضع قطع کو تبدیل کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی — رات گئے پتی کے لئے آتما کی سیج بچھا دوں گی —

[illegible] سے ان کے تلووں کو آنکھوں سے سہلا کر بیدار کروں گی اور جب وہ باہر چلے جائینگے تو میں انتظار میں دن تھوڑا ہی کاٹوں گی — پہاڑ کاٹوں گی۔ لیکن اس کی یہ امیدیں ہنستے ہنستے رو پڑیں۔ جب اس نے اپنے پتی سے ایک دن بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"پران ناتھ! میں آپ کی استری ہوں"۔

"کون کہتا ہے؟ تم جو ایک ہڈیوں کی ڈھانچہ ہو — ایک بے رونق بت! بھلا ایک نوجوان کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے"۔

رجنی کو ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے مجروح دل پر گھونسا مارا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔

"بیاہ سے انکار کر رہے ہو؟"

"ہاں" وہ بولے۔ "ایک بوڑھی عورت ہرگز میری بیوی نہیں ہو سکتی"۔

"مگر جب بیاہ کر کے لائے تھے اُس وقت آپ —"

"میں کمسن تھا" وہ بات کاٹ کر بولے۔ "یہی کہنا چاہتی ہو نا۔ اس غلطی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ بچپن کی باتیں بچپن کے ساتھ ختم ہو چکی ہیں"۔

امیدوں کا وہ قلعہ جو رجنی نے برسوں کی محنت کے بعد تیار کیا تھا ایک ہی جھکولے میں مسمار ہو گیا۔ ریت کی دیوار ایک ہی جھونکے سے بیٹھ گئی۔ عورت زندگی میں ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہے۔ وہ مردوں کی طرح بار بار محبت کا سودا نہیں کرتی۔ رجنی پریم پجارن تھی۔ اس کی زندگی کا سہارا اس کا پتی تھا۔ مگر پتی کی بے اعتنائی نے اس کا دل توڑ دیا۔ اس کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ مرد خود غرض ہوتا ہے۔ اس کے دل میں محبت کا ایک شائبہ نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھیں جوانی ڈھونڈتی ہیں۔ جوانی میں وہ اندھا ہوتا ہے اور بڑھاپے میں خونخوار۔ وہ بوڑھا ہو کر بھی جوان عورت کو ڈھونڈھتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کا جوان شوہر — اس کے لئے رجنی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جوانی آنکھوں کے آگے جوان عورت دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس نے جلد ہی ایک جوان بیوی ڈھونڈ لی۔ اور رجنی کو جس نے رو رو کر اپنی جوانی گنوا دی، ٹھکرا دیا۔

اسے آج بھی وہ دن یاد ہے جب اُسے ہمیشہ کے لئے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کی [illegible] اپنے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ اور وہ رو دیتی اور بس —! روتی رہتی۔ آج بھی وہ روتے روتے اٹھی۔ چاندکی [illegible] کرنیں کائنات پر گویا تبصرہ کر رہی تھیں۔ چاند کی کرنوں کے حضور میں جمنا کی سبک موجیں ایک دھیما ساجل ترنگ بجا رہی تھیں۔ آسمان کے کاسنی دامن پر چھوٹے بڑے رنگین تارے آنسو بہا رہے تھے۔ رجنی اٹھی۔ اپنی پلکوں کی لامحدود وسعتوں سے قدرت کے ان عریاں مناظر کی حفاظت کرتی ہوئی جمنا کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی نغمہ طرازیوں میں محو ہو گئی۔ بے اختیاری کے عالم میں اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی لرزتی ہوئی انگلیاں ستار پر کس طرح پڑ رہی ہیں۔ اور زبان سے کیسے اور کیا کچھ آگ بھرے نغمے نکل رہے ہیں۔ آج اس کے راگ حد درجہ دردناک اور المناک تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح سمٹ کر اس کی آواز میں سما گئی ہے۔ وہ نہایت درد انگیز لہجہ میں موسیقی کی بارش کر رہی تھی اور اس کے ستار کے تاروں سے ایک انتہائی مغموم نغمہ نکل نکل کر فضا میں سوز و گداز بھر رہا تھا۔ چاندنی اس کی دردناک حالت دیکھ کر آنسو بہا رہی تھی اور وہ روز کی طرح آسمان کے جھلملاتے ہوئے ستاروں کو اپنی غمگین کہانی سنا رہی تھی — سنائے جا رہی تھی — نہایت دکھ بھرے لہجہ میں اپنا روں کی ساری قوتوں کے ساتھ وہ ستار بجا رہی تھی۔ یکا یک اس کی ستار کا ایک تار ٹوٹ گیا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ زندگی کا آخری تار جو حوادث زمانہ سے بچ کر رہ گیا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا —!!

وہ اٹھی اور پریشانی کے عالم میں ایک تیز نغمہ کی طرح شہر کی جانب بھاگی!!! —

دردِ آزادی

نظم

از جناب غبار بارہ بنکی

لڑکپن میں حسیں سا ایک طوطا میں نے پالا تھا
مری اماں کو "ماں" کہتا تھا بھائی جان کو "بھیا"
کبھی اک فلسفی کی طرح وہ خاموش رہتا تھا
کبھی باتوں کے سننے کو سراپا گوش رہتا تھا،
سحر کا تھا سہانا وقت اور دن تھے بہاروں کے
زر افشاں حاشئے تھے صبح کے نازک کناروں کے
خراماں صبح کی تفریح کو میں باغ میں آیا،
مرے ہاتھوں میں پنجرا تھا اور اس میں طائرِ دانا
کہک کوئل کی رقصندہ تھی باغوں کی فضاؤں میں
پڑی تھیں پر سمیٹے تتلیاں پھولوں کی چھاؤں میں
اسی رنگیں سماں میں ناگہاں اک سبز سا طوطا
پھدک کر جوش میں پنجرے کی چوٹی پر وہ آبیٹھا
مسرت میں مرے طوطے نے بازو اپنے پھیلائے
ملے وہ ایسے جیسے ملتے ہیں جو بچھڑے ماں جائے
اشارے سے کہا اے بھائی جاں پنجرے میں آبیٹھو
کہاں آوارہ آوارہ سے ان باغوں میں پھرتے ہو
یہ ہے کہنے کو اک کنج قفس لیکن ہے گھر میرا
ہلاکِ عیش و عشرت ہو گیا خوف و خطر میرا
سوا ماں باپ سے شیدا ہیں مجھ پر میرے گھر والے
تمہاری جان کے رہتے ہیں لیکن ہر گھڑی لالے

وہ رہتے سہتے سب سے ہو گیا مانوس تھا اتنا
بڑے ہی پیار کے لہجے میں سب کے نام لیتا تھا
کبھی اک منطقی بن کر تکلم کوش رہتا تھا
وہ سوتے جاگتے ہر حال میں باہوش رہتا تھا
کنول مرجھا چکے تھے چرخ پر روشن ستاروں کے
نمایاں ہو چکے تھے کچھ نشاں کرنوں کے دھاروں کے
سہانا وقت تھا، ٹھنڈی ہوا تھی نور کا تڑکا
فضا کی کیفیت سے مست ہو کر وہ چہک اٹھا
لچک کر جھومتی تھیں ڈالیاں ٹھنڈی ہواؤں میں
نظر کھوئی چلی جاتی تھی ان رنگیں اداؤں میں
فرازِ شاخ سے پر جوڑ کر نیچے اتر آیا سا
نہایت والہانہ طرز سے کچھ دیر تک چہکا
ہرے پر تیلیوں کی درز سے باہر نکل آئے
یہ منظر دیکھ کر آنسو مری آنکھوں میں بھر آئے
مزے سے کھاؤ پھل، دودھ اور مٹھائی کا مزا چکھو
مجھے دیکھو مرے خلد آشیاں پنجرے کو تم دیکھو
ہے اب پروردۂ امن و سکوں اک ایک پر میرا
کسی کے سامنے جھکتا نہیں واللہ سر میرا
میاں مٹھو کوئی کہتا ہے کوئی میرے ہریالے
کوئی شاہیں کہیں ایسا نہ ہو آکر تمہیں کھالے

سخن محبوس طوطے کا نہ اس آزاد کو بھایا
بدل دی ہے اسیری نے مرے بھائی تری کایا
اسیری کی یہ تیری زندگی ہے موت سے بد تر
نہیں ہیں آشنا پرواز سے ہرگز ترے شہپر
ذرا زنداں سے اپنے دیکھ لے ان سبزہ زاروں کو
ذرا دیکھ ان شفق زاروں کے زر افشاں کناروں کو
پپیہے کی الاپیں اس جگہ مستانہ آتی ہیں،

ہلا کر سر بڑے ہی درد کے لہجے میں چلایا
جگہ تیری کہاں تھی اور کہاں تقدیر سے آیا
تری فطرت کے جوہر ہو گئے گم اس جگہ آکر
ارے کم فہم زنداں کو سمجھتا ہے تو اپنا گھر
ذرا دیکھ ان مچلتے اور بہتے آبشاروں کو
ابھی دیکھا کہاں ہے تو نے فطرت کی بہاروں کو
گھنگی کوئلیں آکے اپنی لے سنا [illegible] ہیں

قطاریں مست بھونروں کی یہاں جب گنگناتی ہیں
فضائیں تا زمیں تا آسماں سب جھوم جاتی ہیں!

مری آزادیاں کہتی ہیں مجھ سے ہے جہاں میرا
زمیں اک فرش پا ہے اور فلک ہے سائباں میرا

مہکتے پھولوں سے ہر دم لبالب ہے آشیاں میرا
بہاریں سب کی سب ہیں میری اور ہے گلستاں میرا

مری پرواز ہے آزاد قید و بند امکاں سے
مری نظروں کو ہیں گلچیناں ہر اک گلستاں سے

مرا ہر ایک پر معمور ہے فیض بہاراں سے
تجھے تو واسطہ ہے مرتے جیتے ایک زنداں سے

ابھی دیکھا کہاں ہے تونے زور بال و پر میرا
فلک پیما پہاڑوں وادیوں میں ہے گذر میرا

کہیں اونچا ہے شاخ کہکشاں سے آج گھر میرا
ہے بحر و بر پہ قبضہ ہر گھڑی المختصر میرا

نہا لیتا ہوں تپتے وقت بہتے آبشاروں میں
ٹہلتا ہوں بوقت دھوپ جا کر مرغزاروں میں

کبھی میں سن سے اڑ جاتا ہوں دریا کی کناروں میں
غرض مسکن مرا رہتا ہے فطرت کی بہاروں میں

مرا ماحول ہے آزاد میں آزاد رہتا ہوں
کڑی پڑتی ہے جو آزادیوں میں اس کو سہتا ہوں

جو دکھ سکھ کہنا ہے مجھکو وہ اپنے دل سے کہتا ہوں
غرض آزادیوں کی موج میں ہر وقت بہتا ہوں

تری دنیا ارے قیدی یہی چھوٹا سا زنداں ہے
انھیں توڑے ہوئے دو پھول میں تیرا گلستاں ہے

اسی بالشت بھر کے صحن میں ہر دم خراماں ہے
انھیں بیرحم انسانوں کے قبضہ میں تری جاں ہے

سنی جب طایر محبوس نے یہ گفتگو اس کی!
نگاہ یاس سے دیکھا کیا اور اک پھریری لی!

اٹھا سینے سے دل میں اس کے ایسا درد آزادی
غبار خستہ اس نے بس پھڑک کر جان ہی دیدی

یہ ہے آزادیوں کی ایک رنگیں داستاں سن لو
بہت آزادیوں کا مول ہوتا ہے گراں سن لو

طلب کرتی ہے آزادی تمھاری اب تو جاں سن لو
اگر کرنا ہے کچھ یہ گوش دل سے مہرباں سن لو

دس برس کا جریان تین دن میں

اس پر تعجب کیوں؟

دوا جوہر اعظم کا اثر ہی یہ ہے۔ اسی لئے تو ہزاروں ڈاکٹر اس دوا کی سفارش کرتے ہیں۔ اگر کسی مرد کو پیشاب کے پہلے یا بعد میں قطرہ گرتا ہو یا ٹٹی کے وقت پیشاب کے راستہ دھات گرتی ہو یا کوئی ایسا ویسا خیال آتے ہی رطوبت خارج ہونے لگے تو سمجھ لیجئے۔

یہ جریان ہے اور یہ مرد کی رہی سہی خفیف طاقت بھی ختم کر دے گا۔ اس مرض کا صرف ایک علاج ہے جسے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ڈاکٹروں اور بڑے بڑے طبیبوں نے تسلیم کیا اور بتایا کہ "جوہر اعظم" جریان کا مرض دور کرنے کیلئے حد درجہ کامیاب دوا ہے۔ اور اب تک ہزارہا مریضوں کو بالکل ٹھیک کر چکی ہے۔ دوا جوہر اعظم کی ایک ایک خوراک مریض کو ثابت کرتی ہے کہ واقعی جوہر اعظم اس مرض کا حقیقی علاج ہے۔ ایک شیشی ایک مریض کو پورا تندرست کر دینے کے لئے کافی ہے۔

منیجر زنانہ دواخانہ ۳۴ اے۔ بی دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر یہ دوا بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپئے آٹھ آنے ہے پارسل کا محصول ہندوستانی خریداروں سے نہیں لیا جاتا۔ اس طرح آپ کو گھر بیٹھے دوا پہونچ سکتی ہے۔

تین دن میں جریان ختم عام طور پر "جوہر اعظم" کے متعلق لوگوں کا تجربہ ہو چکا ہے کہ مرض تو اس دوا سے تیسرے ہی دن ختم ہو جاتا ہے لیکن احتیاطاً پوری شیشی استعمال کر لینا لازمی ہے۔ تاکہ دوبارہ مرض نہ ابھر آئے۔ کیونکہ پوری شیشی کے استعمال سے مرض کی اصل بنیاد تک ختم ہو جاتی ہے۔

جلد ۳۸ | فہرست مضامین نومبر ۱۹۴۲ء | نمبر ۹

نمبر	مضمون	نگارندہ	صفحہ
	ملاحظات	ادارہ	۲
۱	اخبار و افکار		۳
۲	حقائق و معارف	حضرت سیماب / مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	۹
	علمی وادبی مضامین		
[illegible]	احمد بن الیاس	جناب مولوی نور احمد خاں	۱۷
[illegible]	جہانگیر کا عدل	جناب پیر غلام دستگیر نامی	۲۵
[illegible]	ترکی اور مغربی رجحانات	جناب سید حسین رضوی	۳۶
[illegible]	عالمگیر زبوں حالی	جناب توکل ڈبائوی	۴۸
[illegible]	ہندوستان کی تلوار	جناب امداد علی مضطر میرٹھی	۶۳
[illegible]	شروع تا فصیح ہے یا غیر فصیح	جناب سید دل محمد فضا جالندھری	۶۵
	افسانے اور ڈرامے		
۱[illegible]	ایک رات	جناب سیٹھ عبدالغنی	۱۳
۱[illegible]	مختصر کہانیاں	جناب محمد یونس احمر	۲۱
۱[illegible]	سمرہل سے شملہ	جناب بیگ زادہ	۳۰
۱[illegible]	کرایہ کا مکان	جناب خان شبیر احمد خاں	۴۴
۱[illegible]	خشک مسکراہٹ	جناب محمد صابر ضبط	۵۳
۱[illegible]	ریل کی پٹری پر	جناب راز چاند پوری	۵۶
[illegible]	تماشہ	جناب شبیر حسین رضوی	۷۲

منظومات

نمبر	مضمون	نگارندہ	صفحہ
۱۷	بندگی میری	حضرت محوی صدیقی	۴
۱۸	غزل	حضرت ہادی مچھلی شہری	۲۴
۱۹	جام عرفاں	حضرت دل شاہجہانپوری	۳۰
۲۰	نقش فریادی	جناب اجتبیٰ حسین رضوی	۳۲
۲۱	لمعات	جناب تیز امرتسری	۲۹
۲۲	حفظ خودی	جناب افسر احمد نگری	[illegible]
۲۳	غزل	جناب سید اکبر عباس سہارنپوری	۳۳
۲۴	جذبات فضا	جناب فضا جالندھری	۳۵
۲۵	کہانی ہماری	جناب بیدار کانپوری	۳۵
۲۶	زبان اردو	جناب اختر سہسرامی	۴۰
۲۷	غزل	جناب عاصم جے پوری	۴۱
۲۸	چوپائی	جناب قمر سہسرامی	۴۷
۲۹	عشق اور موت	جناب حکیم گلچیں کرتالی	[illegible]
۳۰	داستان	جناب حسرت عزیزی	[illegible]
۳۱	دعا نہ ہوئی	جناب شوکت حمید	[illegible]
۳۲	نوائے سرکش	جناب حافظ رامنگری	۴۴
۳۳	قاتل سے ملا	جناب ہلال پریمی	۴۹
۳۴	سجدۂ بے جبیں	جناب سیف ندوی	۶۱
۳۵	غزل	جناب عبدالغفور سلیمان	۶۱

مقصود محمد عالم ایم اے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا

ملاحظات

از:-
ادارہ

"عالمگیر" کا خاص نمبر ۱۹۴۳ء کتابت و طباعت کے بہت سے مرحلے طے کر چکا ہے۔ یہ شاندار اشاعت جو انشاء اللہ اس برس کا قابل فخر صحافتی کارنامہ ہوگی یکم دسمبر تک محفل مطالعہ میں آجائیگی "خاص نمبر" اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے کس درجہ عظیم الشان ہوگا؟ اس کا اندازہ فہرست مضامین سے لگایا جا سکتا ہے جو زیر نظر شمارہ میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔ ہماری سعی و کوشش اور محنت و کاوش کے خوشگوار نتائج اس امر سے ظاہر ہیں کہ اس زمانہ میں جب بدترین کاغذ بھی سایہ ہما بن چکا ہے "خاص نمبر" اتنے بڑھیا اور قیمتی کاغذ پر چھاپا گیا ہے جو زمانہ قبل از جنگ میں بھی با افراط میسر نہ آ سکتا تھا ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام خاص نمبر کا انتہائی اشتیاق کے ساتھ خیر مقدم کریں گے اور "عالمگیر" کے حلقہ اشاعت کو وسیع بلکہ وسیع تر کرنے کے لئے اپنی تمام امکانی قوتوں سے کام لیں گے۔

زیر نظر اشاعت مندرجات کی کثرت کے باعث امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ احمد بن الیاس۔ جہانگیر کا عدل اور ہندوستان کی تلوار تاریخی مقالے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے قارئین کے ذوق مطالعہ کو مسرت پہنچانے کا باعث ہونگے۔ "ترکی اور مغربی رجحانات" اور "عالمگیر زبوں حالی" سیاسی انتقاد کا بہترین نمونہ ہیں۔ جن کے مطالعہ سے جدید ترکی کے رجحانات اور موجودہ عالمگیر زبوں حالی کے اسباب و محرکات کا کوئی گوشہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ "شروعات" والا مضمون تحقیقی اعتبار سے افادی حیثیت رکھتا ہے۔

اشاعت زیر نظر میں سات افسانے ہیں جو اپنے موضوعات کے پیش نظر نفسیات نگاری اور محبت ترجمانی کے آئینہ دار ہیں۔

منظومات ڈیڑھ درجن کے قریب ہیں جن میں محوی صدیقی بادی مچھلی شہری۔ دل شاہجہان پوری جیسے اساتذہ۔ نیر امرتسری فضا جالندھری۔ اختر سہسرامی، عاصم جے پوری اور قمر سہسرامی جیسے ترقی پسند اور جذبات نگار شعرا بھی شامل ہیں۔ منظومات کا حصہ دور حاضر کی تمام مقبول ترین اصناف کا حامل ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

معاونین کرام سے گزارش

مولانا اظہر امرتسری آج کل اپنا دیوان مرتب کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے تنقیدی مضامین بھی کتابی صورت میں شائع کرنے کی فکر میں ہیں۔ آپ کے مضامین اور نظموں کا زیادہ حصہ چونکہ "عالمگیر" ہی میں اشاعت پذیر ہوتا رہا ہے اس لئے عالمگیر کے ان پرچوں کی ضرورت ہے جن میں مولانا کی نظمیں اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں یہ ضرورت دفتر عالمگیر سے پوری ہو سکتی تھی لیکن بدقسمتی سے فائلیں گم ہو چکی ہیں اس لئے قارئین کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر کسی کے پاس ۱۹۳۰ء سے لیکر ۱۹۴۲ء تک کے فائل محفوظ ہوں تو وہ یا مولانا اظہر کے مضامین اور نظموں کے تراشے بھیجدیں یا فائل ہی عاریتاً روانہ کردیں امید ہے قارئین کرام اس گزارش کو شرف قبول بخش کر ہمیں ممنون و متشکر فرمائیں گے (ادارہ)

اخبار و افکار

عدالتیں اور اردو

حکومت پنجاب اور چند دوسری صوبائی حکومتیں بارہا اعلان کر چکی ہیں کہ عدالتی زبان اردو ہے۔ لیکن عدالتوں کے طریق کار پر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ اعلان بے حقیقت نظر آئیگا۔ وکلاء کے لئے انگریزی داں ہونا ضروری ہے بلکہ تعلیم قانون کیلئے انگریزی دانی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ عدالتوں کی زبان اگر اردو ہے تو پھر قانونی تعلیم اور اس کے مبادیات بھی اردو میں کیوں نہیں؟ اس کے بعد عدالت کی کارروائی اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھائی جاتی ہے اور انگریزی تحریر کو اردو روداد پر بہرحال ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مجسٹریٹوں کے فیصلے عام طور پر انگریزی میں ہوتے ہیں کیا حکومت پنجاب یہ بتا سکے گی کہ عدالتی زبان اگر اردو ہے تو صاحب عدالت اپنا فیصلہ اردو میں کیوں نہیں صادر کرتا؟ کیا اس مضحکہ خیز طرز عمل سے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ ہماری حکومت اردو کے متعلق اپنے عزم و ارادہ اور فیصلہ و قرارداد پر خود بھی غور کرنے کے قابل نہیں ہو سکی؟

سرکاری اشتہارات اور ماہانہ رسائل

آج کل حربی پروپیگنڈے کے لئے اشتہارات کا سلسلہ حیرت انگیز طور پر وسیع کیا جا رہا ہے لیکن اس چشمہ سے صرف روزنامے یا چند ہفتہ وار اخبار ہی سیراب ہوتے ہیں ماہانہ رسائل کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے حالانکہ رسالے اخباروں کی بہ نسبت انتہائی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور ان کا حلقۂ اشاعت بھی ان لوگوں تک وسیع ہوتا ہے جو حربی سرگرمیوں میں حکومت کے معاون ہو سکتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند کے شعبہ نشر و اشاعت نے اس حقیقت کو محسوس ہی نہیں کیا یا وہ مراحم حاکمانہ کی بوچھاڑ کا مستحق صرف اخبار ہی کو سمجھتی ہے۔ یہ غلط اندیشی نہ صرف رسائل کی حق تلفی کا باعث ہے بلکہ اس سے حکومت کے مقاصد کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے کیونکہ رسائل کی آواز جن حلقوں تک پہنچ سکتی ہے۔ وہاں اخبارات کی رسائی آسان نہیں امید ہے کہ اس غلطی کا ازالہ کیا جائے گا۔

آزاد عظیم آبادی

گزشتہ مہینے بہار کے مشہور قادر الکلام شاعر حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم اعلیٰ درجہ کے شاعر ہونے کے علاوہ نقاد فن۔ ادیب، عالم اور خادم تعلیمات بھی تھے۔ بہار جیسی قدامت زدہ سرزمین میں سب سے پہلے جدید شاعری کی شمع جس شاعر نے روشن کی وہ حافظ آزاد ہی تھے۔ مرحوم عام بہاری شاعروں کی طرح تنگ نظر اور تعصب گزیدہ نہ تھے۔ بلکہ وہ بلا امتیاز صوبہ و علاقہ ہر خادم اردو کا احترام کرتے تھے۔ ان کا کلام دور حاضر کی شاعری میں قابل قدر حیثیت رکھتا ہے۔ مرحوم کی موت سے صوبۂ بہار کی ادبی دنیا کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی کے اسباب نظر نہیں آتے خداوند کریم مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اس حادثہ میں ہمیں مرحوم کے فرزندوں اور دیگر افراد خاندان سے دلی ہمدردی ہے۔ (ادارہ)

بندگی میری

اثر:۔
علامہ حضرت محوی صدیقی لکھنوی

ہوئی تباہ محبت میں زندگی میری — نہ لی خبر مرے بیدرد نے کبھی میری
دیا ہے اس نے ہزاروں کو درس عبرت و ہوش — عجیب چیز ہے دنیا میں بیکسی میری
نہیں یہ معجزۂ چشمِ ناز تو کیا ہے — کہ اک نگاہ میں دنیا سنور گئی میری
بلائے جاں ہیں جب آرائش و جمال و شباب — تو کیوں ہلاکِ ملامت ہو زندگی میری
ابھی خدا نہ کرے ہو وہ آشنائے وفا — ابھی ہے تشنۂ تکمیل عاشقی میری
بس اے نگاہ ترحم بس اے تبسم ناز! — نہ دیکھ لے کہیں یہ آسماں خوشی میری
پھر اب یہ ہاتھ ہیں اور ان کا دامنِ رنگیں — جو پائمال ہوئی آرزو ہوئی میری
کسی کی یاد نے اُف پھر جگا دیا آ کر — لگی تھی آنکھ شبِ غم ابھی ابھی میری
بس اب تو رحم کر اے چارہ سازِ دردِ فراق — یہ رات بھی تو نہیں رونے گذر گئی میری
اُدھر یہ حال کہ تیور پہ بات بات میں بل — اِدھر یہ رنگ کہ رکتی نہیں ہنسی میری
بجا نہیں ترا شکوہ، تغافلِ جاناں — کب التفات کے قابل ہے خستگی میری
خدا کسی کو نہ دے ذوق دردو لذّتِ غم — تباہ کی انہیں دونوں نے زندگی میری
کہیں یہ کشتۂ بیدادِ غم نہ ہو جائے — فسردہ رہتی ہے ہر وقت زندگی میری
مذاقِ سوزِ محبت جو تو نے پایا ہے — تو سیکھ طرزِ وفا شانِ بندگی میری

بڑا کرم ہو مرے حالِ زار پر محوی
خبر جو لینے رہیں وہ کبھی کبھی میری

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۳ء

علم و تاریخ اور ادب و شعر کا بہار آفریں چمنستان

بکم دسمبر ۱۹۴۲ء کو حسب معمول عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۴۳ء جلوہ گہ اشاعت پر آئیگا، کاغذ کی گرانی و نایابی کے باوجود اس خاص نمبر کو حقیقی معنوں میں خاص نمبر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ ذیل کی مختصر فہرست پر ایک چھپلتی ہوئی نگاہ بھی ڈالنے سے معلوم ہو سکے گا کہ اس اشاعت خصوصی کا ہر مضمون، ہر افسانہ اور ہر نظم فی الواقع خاص ہے!

علمی و ادبی مضامین

قرطاجنہ کا محاصرہ ←۔۔۔۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد

دولت کارتھیج کا وہ مقام ولادت جسے رومیوں نے اپنے فوجی آغوش میں لے لیا لیکن قرطاجنہ والوں نے حریت و خود مختاری کے لئے کس عدیم النظیر بہادری کا ثبوت دیا؟ اس کا جواب مولانا آزاد کے قلم حقیقت رقم سے سنئے۔ وطن پرستی کے جوش میں ڈوبا ہوا مقالہ،

تحریک ادریسیہ ←۔۔۔۔۔ مولانا اظہر امرتسری

ایک بے سروسامان سید انقلاب کا جھنڈا لے کر اٹھا۔ خلافت عباسیہ نے اس جھنڈے کو تار تار کر دیا۔ لیکن جوش انتقام ادریس کو مراکش لے گیا۔ یہاں ادریسیوں کو کتنے حشر افگن اور انقلاب انگیز مرحلوں سے گزرنا پڑا؟ اس کا جواب یہ مقالہ ہی دے سکے گا۔

پرتگیز ہندوستان میں ←۔۔۔۔۔ مولوی نور احمد خاں

شاہ فلپ دوم کے عہد میں جب پرتگیزوں کا شیرازہ پریشان ہو گیا تو جو پرتگیز ہندوستان میں تھے انھوں نے کس طرح بحر و بر کو اپنی قزاقانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا؟ یہ ہیجان خیز داستان اس سیر حاصل مقالہ میں پڑھئے۔

(ورق الٹیے)

سیرتِ رسولِ پاک اور شعر ←── عاصم جے پوری

سیرتِ نبوی کو شعر سے وہی نسبت ہے جو عصائے کلیم کو جادو سے اور دمِ عیسیٰ کو مُردوں سے تھی۔ یہ پر معارف مضمون اسی مرکزی نقطے کے گرد گھومتا ہے۔ آپ لائق مقالہ نویس کے طرزِ استدلال کی داد دینے پر مجبور ہوں گے۔

شہنشاہ اکبر پیکرِ الفاظ میں ←── سید ارشاد حسین آزہر

شہنشاہِ ہند اکبرِ اعظم کی شاہی زندگی پر تو بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے ذاتی حالات ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں۔ اس مضمون میں اس کے خدوخال، حرکات و سکنات اور مشاغل و رجحانات پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

پر اسرار افریقہ ←── ماسٹر ممتاز حسین سہیل

افریقہ کو تاریک اور پر اسرار براعظم کہا جاتا ہے اور سیاح وہاں کے قدیم باشندوں کی جہالت اور توہم پرستی کے متعلق عجیب و غریب افسانے سناتے ہیں۔ یہ مضمون انہی حیرت انگیز حالات کا آئینہ دار ہے۔

دنیا کی مشہور ہستیاں اور ان کے پیشے ←── عزیز گورکھپوری

چھوٹے پیشہ وروں کو عام طور پر نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی اکثر ممتاز ترین شخصیتیں حقیر درجہ سے نکل کر ہی بلند مرتبوں پر پہنچی تھیں، سبق آموز مختصر مضمون۔

مثنوی سحر البیان کی چند خامیاں ── محمد ریاض الحق ایم۔ اے

مثنوی سحر البیان کا شمار اُردو شاعری کے درخشاں کارناموں میں سے ہے۔ لیکن اس مقالہ میں مثنوی کا تاریک پہلو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

احکاماتِ عالمگیری ←── خالد حسن قادری

"احکاماتِ عالمگیری" یہ کتاب، جو عبدالحمید خاں نبیرہ عالمگیری نے فارسی میں لکھی تھی عرصے سے نایاب ہے۔ لائق مضمون نگار نے تلاش و جستجو کے بعد اس کتاب کا اردو ترجمہ شروع کیا ہے ان احکامات کا کچھ حصہ "خاص نمبر" میں ملاحظہ کیجئے۔

ہمالیہ کے سفید دیو ←── مولانا محمد اسمٰعیل ناصح

سیاحوں کا بیان ہے کہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر کوہ پیکر سفید دیو آباد ہیں جن کے قدموں کے نشانات بھی بعض اوقات برف پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو عجیب و غریب روایات مشہور ہیں وہ اس اچھوتے اور نرالے طرز کے مقالہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

〈وغیرہ وغیرہ〉

افسانے اور ڈرامے

قید کے تین دن ←── سید احسان علی شاہ بی۔ اے

تاریخِ اسلام کا ایک انتہائی ڈرامائی واقعہ۔ ثمامہ بن آثال کے قبولِ اسلام کا ایمان افروز نظارہ۔ جسے فاضل افسانہ نویس نے ادیبانہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ تاریخ و افسانہ کا حسین ترین امتزاج ──!

فسونِ خواب ←── شبلی بی۔ کام

فرانس کے شہرۂ آفاق داستان گو "گاشیئر" کا ایک طویل افسانہ جو رنگینی و دل آویزی اور لطافت و حسنِ بیان کے لحاظ سے "قلوپطرہ کی ایک رات" سے بھی بازی لے گیا ہے۔ آپ اس افسانہ کو بار بار پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔

فرعون کی محبوبہ ←── میرزا ادیب بی۔ اے

فرعون قاہر رعمسیس ثانی کس طرح ایک یونانی حسینہ کے قدموں میں سرنگوں ہو گیا؟ اس افسانے کا ایک مرتبہ پہلے بھی اعلان ہو چکا ہے لیکن بدقسمتی سے یہ افسانہ کہیں کھو گیا تھا اب میرزا صاحب نے اسے دوبارہ ایک ڈراما کی صورت میں سپردِ قلم کیا ہے۔

ہماری قلیں ←——— ڈاکٹر شفیق الرحمان

یہ مزاحیہ جواب مضمون پڑھ کر آپ کے لبوں پر تبسم رقص کرنے لگے گی۔ شوخ نگاری اور طنز آفرینی کا دلکش نمونہ۔

اُمنگیں ←——— احمد شجاع پاشا جالندھری

انگریزی کے مشہور ناول نویس والٹر سکاٹ کی ایک دلدوز ٹریجڈی جس کا ہر کردار امنگوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے ملکہ الزبتھ کے عہد کا یہ تاریخی افسانہ آٹھ باب میں ختم ہوتا ہے۔

جنازہ ←——— سید انتصار حسین نیوتنوی

اپریشن کے بعد عموماً ایک گھنٹی بجتی ہے اور وہ بجے جا رہی تھی، جیسے موت اور زندگی لڑ چکنے کے بعد ایک ساتھ غل مچا رہی ہوں اور دوسری طرف اپریشن کے کمرہ میں ..... رقت انگیز افسانہ۔

میں اور وہ ←——— ظفر واسطی شاہ آبادی

اس افسانہ میں آپ کو حقیقت و افسانہ کا ایک ایسا رنگین امتزاج [illegible] کہ آپ کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ دلچسپی افسانے سے ہے یا حقیقت سے۔ پھر لطف یہ ہے کہ سارے افسانے میں ہیرو ہیروئن یا کسی اور کردار کا نام تک نظر نہ آئے گا۔

جرنیل بورس مارکووچ کی داستان معاشقہ (صابر نور محلوی)

عہد زار کا ایک جرأت آفریں رومان۔ جس کو پڑھتے ہوئے کبھی آپ حسن و عشق کی رنگین فضا میں کھو جائیں گے کبھی آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے اور کبھی آپ کے دل سے آہ نکل جائے گی۔

جھروکے سے ←——— شوکت صدیقی لکھنوی

ایک نوجوان یونہی بیٹھے بیٹھے جھروکے پر نظر ڈالی تو ساری کائنات جگمگا گئی کیوں؟ اس کا جواب اس رومانی افسانہ میں ملے گا۔

جہلم کے اُس پار ←——— طفیل ملک

جہلم کنارے کی ایک حسین و جمیل کہانی۔ دو معصوم دلوں کا ارتباط اور اس کے بعد——؟

——— وغیرہ وغیرہ ———

منظومات

- موجِ فصاحت ←——— حضرت جلیل
- افکارِ تازہ ←——— حضرت سیماب اکبر آبادی
- سفینۂ نوح ←——— حضرت نوح ناروی
- جذباتِ عالیہ ←——— حضرت محوی صدیقی
- حسنِ بیان ←——— حضرت اظہر امرتسری
- یادِ ایام ←——— حضرت شفق ٹونکی
- لطفِ بیان ←——— حضرت نظیر لودھیانوی
- افسانہ در افسانہ ←——— حضرت دل شاہجہانپوری
- فردوسِ تمنا کی قسم ←——— حضرت کوکب شاہجہانپوری
- میری خوشی خوشی نہیں ←——— حضرت ہادی مچھلی شہری
- ریاضِ خلیل ←——— حضرت خلیل بیگوسرائی
- محبت کی حقیقت ←——— حضرت راز چاندپوری
- زمانے کا پیغام ←——— حضرت محمود اسرائیلی
- تارے ←——— جناب اندرجیت شرما

خمریات ــــ حضرت ماہر القادری ــــ حضرت دعا ڈبائیوی [illegible]

نظم ــــ حضرت ضیا جالندھری

علاوہ ازیں

حضرات حاجی نبی احمد بریلوی - عاصم جے پوری - آثر گوالیاری - زخمی بیگوسرائی - سلیم علوی فرحت شاہجہانپوری - خلیق برہانپوری - تسکین بریلوی - وغیرہ وغیرہ کا تازہ کلام

مقالاتِ مدیری

اخبار و افکار ــــ حقائق معارف ــــ تحقیق و تصحیح ــــ نقد و نظر

خاص نمبر ۱۹۴۳ء

مُفت

حاصل کرنے کیلئے اسی "خاص نمبر" سے عالمگیر کی سالانہ خریداری قبول فرمالیجئے تاکہ نو عام اشاعتوں کی علاوہ آپ کو ماہ اپریل ۱۹۴۳ء میں شایع ہونے والا معرکہ آرا "تاریخ نمبر" اور ماہ جون ۱۹۴۳ء میں شایع ہونے والا ہنگامہ پرور "سالانہ نمبر" بھی مُفت مل سکے! سالانہ چندہ صرف چار روپے آٹھ آنے معہ محصولڈاک

مینجر رسالہ "عالمگیر" سید مٹھا بازار لاہور

حقائق و معارف

جعفر و عباسہ کے افسانے کا محققانہ محاکمہ

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کا اہم ترین مقالہ

تاریخی چانڈو خانے کی گپ،

جعفر و عباسہ کا افسانہ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کی ایک افسوسناک دروغ بافی ہے جسے لوگوں نے افسانہ طرازی کی قوت سے اس درجہ اونچا کر دیا ہے کہ حقیقی واقعہ بھی اس کے سامنے پست نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم نے اس کذب طرازی کو سر سے پاؤں تک عریاں کر کے دکھا دیا ہے اس لیے یہ مقالہ تاریخی معلومات میں اہم ترین اضافے کا باعث ہے امید ہے قارئین کرام اسے پڑھ کر مرحوم کیلئے دعائے مغفرت کریں گے۔ (مدیر)

ہندوستان میں جب نادر شاہ ایرانی آیا اور صلح و آشتی کے ساتھ ہندوستان کا بادشاہ محمد اس کو مہمان عزیز کی حیثیت سے دہلی میں لایا تو کسی چانڈو خانے میں کسی شخص نے نشہ کی حالت میں کہا کہ "واہ محمد شاہ پیا کیا کام کیا ہے کہ قزلباش کو قلعہ میں لا کر قلماقنیوں کے ہاتھ سے قتل کرا دیا" یہ بے پر کا کوا اڑا اور اس نے اڑتے ہی تمام دہلی میں ایرانیوں کے سر اڑوانے شروع کرا دیئے۔ آخر مجبور ہو کر نادر شاہ ایرانی نے قتل عام کا حکم دیا اور دہلی میں وہ قتل عام ہوا جس کی نظیر آج تک دہلی نے نہیں دیکھی۔ بس ٹھیک اسی قسم کی بات ہے کہ کسی نے جعفر برمکی کے قتل کا سبب اس طرح تصنیف کر کے بیان کیا کہ :۔

"ہارون الرشید عباسی کی بہن اور مہدی کی ایک بیٹی عباسہ تھی۔ ہارون کو اپنی اس بہن سے بے حد محبت تھی۔ اسی طرح جعفر بن یحییٰ اس کا وزیر اعظم بھی ہارون کا جلیس و ندیم اور ہمہ اوقات ساتھ رہتا تھا۔ ہارون جعفر و عباسہ کے ساتھ مل کر شراب نوشی کیا کرتا تھا۔ ہارون شراب نوشی کے جلسہ میں جس طرح اپنی بہن کو شریک رکھنا چاہتا تھا اسی طرح اس کو اپنے وزیر اعظم جعفر کا شریک رکھنا بھی ضروری تھا لہذا ہارون الرشید نے عباسہ کا نکاح جعفر سے کر دیا تھا کہ ایک دوسرے کا دیکھنا مباح ہو جائے لیکن جعفر و عباسہ دونوں کو تاکید کر دی تھی کہ زن و شوہری کے تعلقات ہرگز نہ ہونے پائیں مگر جعفر و عباسہ اس امتناعی حکم کی حد میں نہ رہ سکے۔ ہارون کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے جعفر کو قتل کرا کر اس کے تمام خاندان کو برباد کر دیا۔"

یہ چنڈو خانے کی گپ جب ہمارے زمانہ کے ناول نویسوں اور پڑھے لکھے جاہلوں کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے حسب عادت رنگ آمیزی کر کے اس دروغ کو ایسا فروغ دیا کہ آج کل جس اردو داں کو دیکھیے اس نامعقول دروغ بافی پر آیت و حدیث سے بڑھ کر ایمان رکھتا ہے اور اس کے خلاف کچھ بھی سننا پسند نہیں کرتا۔

یہ افواہ قتل جعفر سے سو برس کے بعد تصنیف ہوئی اور طبری نے اس کا ذکر اپنی تاریخ میں کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ واقعہ کی شکل چونکہ عجیب و غریب بیان کی گئی ہے جس کے اندر کافی ندرت موجود ہے لہذا عجائب پسند طبیعتیں اسی طرف زیادہ جھکنے لگیں اور ہر شخص نے ہارون الرشید کے حالات لکھتے ہوئے اس افواہ کو بھی ضرور نقل کیا اور آج مجبوراً ہمیں بھی اس ناگفتنی کہانی کا ذکر کرنا پڑا۔ طبری اور دوسرے مورخین نے قتل جعفر کے دوسرے اسباب بھی بیان کئے ہیں۔ لیکن ان میں سے جھوٹے اور سچے کو الگ الگ انتخاب کرنے کے لئے عقل و درائت سے کام لینے کی کوشش بہت کم لوگوں نے کرنی چاہی ہے۔

(۱) ہارون الرشید خلفاء عباسیہ میں پانچواں خلیفہ ہے۔ عباسی

کو اپنے خاندان کی عظمت اور اہل عرب میں نسب کے اعتبار سے اشرف ہونے کا فخر تھا۔ تمام ملک عرب ان کی خاندانی سیادت و بزرگی تسلیم کرتا تھا۔ ان کی خاندانی عظمت ہی تھی جس کے سبب وہ بنو امیہ کے خلاف کوشش کرنے پر آمادہ اور پھر اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ اب جبکہ ان کو قریباً تمام عالم اسلام کی خلافت و حکومت بھی حاصل تھی تو ان کا فخر نسبی اور بھی بڑھ گیا تھا۔ عرب کی عصبیت اور ناموس کا پاس و لحاظ بھی عام طور پر سختی کے ساتھ موجود تھا اندریں صورت یہ کیسے ممکن تھا کہ ہارون الرشید جیسا خلیفہ اپنی بہن کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دے جس کو وہ نسباً غلام زادہ اور مجوسی النسل نیز نطفہ ناتحقیق شخص کا پوتا سمجھتا تھا۔ یہ مانا کہ وہ جعفر کو اپنا بھائی سمجھتا تھا اور اس کے باپ کو اپنا اتالیق ہونے کے سبب ابا جان کہہ کر پکارتا تھا لیکن بہن کا نکاح کرتے وقت وہ قوم و خاندان اور نسب کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر ہارون الرشید آج کل کے لوگوں کی طرح بیاہ شادی کے معاملہ میں بہت ہی زیادہ آزاد خیال ہو گیا تھا تو اس کے خاندان کے لوگ جو یکجدی اور تعداد میں بہت زیادہ موجود تھے اس نکاح کو اپنی خاندانی بے عزتی سمجھ کر کسی طرح خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی طرح خود عباسہ بھی اپنی ایسی بے عزتی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

(۲) ہارون الرشید جیسا مذہبی شخص جو ایک سال حج اور ایک سال جہاد کرتا تھا اور عالم اسلام کا سردار و خلیفہ تھا۔ شرابنوشی کی مجلسیں گرم کرے کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ بنو امیہ میں کسی ایک خلیفہ نے اگر کہیں نبیذ یا شراب استعمال کر لی تو ساری دنیا میں شور مچ گیا اور آج تک مورخین اس کے اس فعل بد کو خصوصیت سے بیان کرتے چلے آئے۔ لیکن ہارون الرشید جو علما اور باخدا لوگوں کی مجلسوں میں تنہا جا کر چپ ہوئے بوریئے پر بیٹھتا اور ان کی نصیحتیں سن کر زار و قطار روتا ہوا اٹھ کر آتا تھا وہ بھلا شراب یعنی پیشاب جیسی پلید چیز سے کیونکر تعلق رکھ سکتا تھا۔ فضل بن عیاض۔ ابن سماک۔ سفیان ثوری جیسے بزرگ اس کے دوست و ہمنشیں ہوں۔ پنجوقتہ نماز نہایت پابندی اور خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھتا ہو بالخصوص نماز فجر ہمیشہ ہی اول وقت پڑھنے کا عادی ہو اور علاوہ پانچ وقت کی نمازوں کے سو رکعت نفل روزانہ ادا کرتا ہو ایسے شخص کو شرابخوار بتانا کس قدر بیحیائی اور ظلم ہے۔ جس شخص نے رات کو شراب پی کر مجلس گرم کی ہو وہ نماز فجر میں کیسے شامل ہو سکتا ہے۔ جس کو شراب پینے کی عادت ہو اس کی نمازوں میں خشوع خضوع کہاں پایا جا سکتا ہے۔

(۳) علماء عراق نے نبیذ کے جواز کا فتویٰ دیدیا تھا اور بعض امراء نبیذ کا استعمال کرتے تھے لیکن اس کو شراب کی بدمستیوں سے کوئی نسبت نہیں۔ ہارون الرشید کی نسبت تو یقینی طور پر یہ بھی ثابت نہیں کہ اس نے کبھی نبیذ کے دور چلائے ہوں اور ایسی مجلسیں گرم کی ہوں جیسی کہ مذکورہ جھوٹی روایات میں مذکور ہے۔ ہارون الرشید کے زمانے تک عرب کی وہ سادگی اور سپاہیانہ زندگی موجود تھی جس میں شرابخواری کو کوئی دخل نہیں مل سکتا تھا۔ عربی شرافت جس کا ہارون سب سے زیادہ مدعی تھا ہمیشہ سے شرابخواری کو مذموم اور برا ٹھہراتی تھی۔ حتیٰ کہ شرفائے عرب عہد جاہلیت میں بھی شراب نہیں پیتے تھے۔ وہ اس کو شرفا کا شیوہ نہیں جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور بہت سے شرفائے عرب عہد جاہلیت میں بھی کبھی اس پلید چیز کے پاس تک نہیں گئے۔ ہارون الرشید اس ذلت و پستی کو احکام اسلام سے قطع نظر کر کے بھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔

(۴) اس بے دینی اور عام بے حمیتی کے زمانہ میں بھی جبکہ ہندوستان میں حکومت اسلامی باقی نہیں ہے اور حکومت موجودہ کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں ہے کوئی بے غیرت سے بے غیرت اور ذلیل سے ذلیل شخص بھی گو وہ کیسا ہی علانیہ شراب کیوں نہ پیتا ہو یہ کسی طرح پسند نہیں کر سکتا کہ اس کی بہن بھی اس کے ساتھ شرابخواری کرے ہمارے ملک میں چمار اور بھنگی زیادہ شرابخواری کرتے ہیں۔ غالباً ان بھنگیوں اور چماروں سے بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی بہنوں کو لے کر غیر مردوں کے ساتھ شراب کے دور چلائیں۔ چہ جائیکہ ہارون رشید عباسی جس کے دربار میں تابعین اور تبع تابعین موجود تھے ایسی بیحیائی کا ارتکاب کرتا اور غیرت کے مارے مر نہ جاتا۔

(۵) جو لوگ زنا چوری اور شرابخواری کرتے ہیں وہ عموماً اپنے اہل خاندان کو ان کاموں سے ہمیشہ باز رکھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ اگر ہارون کو یہ پلید عادت ہو بھی گئی تھی تو وہ اپنی بہن کو تو ہرگز شرابخواری پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی چہیتی بیوی زبیدہ خاتون جس کے ساتھ اس کی محبت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی غالباً سب سے پہلے اس شرابخواری میں شریک ہو سکتی تھی، لیکن زبیدہ خاتون کی نسبت تو کسی نے اس قسم کا کوئی اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ اور اس کی زندگی کے دامن پر اس پلید چیز کی

ذرا سی بھی عجیب نہیں بٹنے پائی۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ زبیدہ خاتون کے محل میں تو ہر وقت قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے اور اس کا عاشقِ زار خاوند جعفر و عباسہ کے ساتھ مصروف شرابنوشی ہے۔

(۶) مورخین نے یہ واقعہ بوثوق نقل کیا ہے کہ حکیم جبریل ایک یہودی طبیب ہارون الرشید کے دربار میں تھا اور دسترخوان پر خلیفہ کے ساتھ ہوتا اور کوئی مضر چیز دیکھتا تو خلیفہ کو اس کے کھانے سے روکدیتا تھا۔ ایک مرتبہ خلیفہ کے لیئے مچھلی خوان میں لگ کر آئی خلیفہ نے اس کے کھانے کا ارادہ کیا۔ حکیم نے خلیفہ کو اس کے کھانے سے روک دیا اور خانساماں سے کہا کہ اس کو اٹھا کر لے جاؤ۔ اس کے بعد اتفاقاً خلیفہ کے کسی خادم نے دیکھا کہ اسی مچھلی کو حکیم جبریل اپنی قیامگاہ پر جاکر خود نوش فرمارہے ہیں۔ اس وقت یہ حقیقت کھلی کہ حکیم نے مچھلی کو اپنے کھانے کے لیئے روکا اور ہارون کو اس کے کھانے سے باز رکھا تھا۔ خادم نے یہ خبر خلیفہ تک پہنچادی۔ بات تو یہ محض ہنسی کی تھی اور ہارون بجز ہنسنے کے امیر کو کچھ نہ کہتا لیکن حکیم کو جب معلوم ہوا کہ خلیفہ میری اس حرکت سے مطلع ہو چکا ہے تو اس نے مچھلی کے تین قتلے الگ الگ تین پیالوں میں رکھے۔ ایک پیالے میں گوشت اور دوسری کھانے کی چیزیں جو دسترخوان پر ہارون نے کھائیں ملادی تھیں۔ دوسرے قتلے پر برف کا پانی ڈالا تھا تیسرے پیالے میں شراب ڈالدی تھی۔ یہ تینوں پیالے خلیفہ کی خدمت میں پیش کرکے کہا کہ ان دونوں پیالوں میں آپ کا کھانا ہے اور اس تیسرے پیالے میں میرا کھانا ہے۔ دیکھا تو وہ دونوں قتلے چند چند ہی گھنٹے کے بعد سڑکر بدبو دینے لگے تھے اور جس پیالے میں شراب تھی اس میں مچھلی کا گوشت پانی ہوکر شراب میں مل گیا تھا اس طرح حکیم نے اپنی شرمندگی دور کی اور خلیفہ کو بتایا کہ میں چونکہ شراب پیتا ہوں لہذا میرے لیئے یہ مچھلی نقصان رساں نہ تھی اور آپ چونکہ شراب نہیں پی سکتے لہذا میں نے مچھلی کو روکدیا تھا اس حکایت سے بھی صاف ثابت ہے کہ ہارون کو شراب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

(۷) حقیقت یہ ہے کہ عباسہ کی شادی ہارون نے محمد بن سلیمان سے کردی۔ جب محمد بن سلیمان کے فوت ہونے پر عباسہ بیوہ ہوگئی تھی تو اس کی دوسری شادی ابراہیم بن صالح بن علی سے کردی جو ہارون کے قریبی رشتہ دار اور آل عباس سے تھے ایک ایسی شریف و پاکباز عورت کی نسبت ایسا سفید اور بے سروپا جھوٹ بولنا جھوٹ بولنے والے کی انتہائی رذالت و کمینہ پن کا ثبوت ہے اور جو شخص اس جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرے اس کی افتادِ فطرت بھی یقیناً بہت پست و ذلیل ثابت ہوجاتی ہے۔ پھر سب سے عجیب بات اس سفید جھوٹ میں یہ ہے کہ جعفر و عباسہ کے ایک دوسرے کے چہرے پر نظر ڈالنے کو مباح کرنے میں تو ہارون کو شریعت کی پابندی کا اس قدر خیال تھا مگر شرابخواری کرتے ہوئے وہ شریعت کو بالکل بھول جاتا تھا۔

هر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا
(فانی بدایونی مرحوم)

فقط دو چار اجزا اور ان کی بھی حقیقت کیا
کھلونا ہی تو ہے دل توڑ ڈالیں توڑنے والے
(حضرت نوح ناروی)

بجھتی نہ دیکھی آج تک اس تشنہ لب کی تشنگی
موجیں ہزار آتی رہیں جاتی رہیں ساحل کے پاس
(اختر نگینوی)

اوروں کو دیکھتے ہو میری طرف بھی دیکھو
رکھتا ہے کچھ توقع میرا دلِ حزیں بھی
(وحشت کلکتوی)

(مرسلہ اسعد سدیدی)

غزل

دلِ حزیں سے غمِ ماسوا نہیں جاتا

حضرت ہادی مچھلی شہری

تشکیبِ خاطرِ اہلِ رضا نہیں جاتا — تڑپ رہے ہیں مگر کچھ کہا نہیں جاتا
دلِ حزیں کا فسانہ ارے معاذ اللہ — وہ کیا سنیں گے کسی سے سنا نہیں جاتا
خدا نے عشق میں ہمت ہی ایسی کم دی ہے — کہ دل شکستہ ہے اور آسرا نہیں جاتا
دلِ ہوس زدہ آسودۂ نگاہ نہیں — وہ سامنے ہیں مگر حوصلا نہیں جاتا
تو مل گیا ہے مگر جوشِ آرزو ہے وہی — دلِ حزیں سے غمِ ماسوا نہیں جاتا
الٰہی حشر دلِ مدعا کا کیا ہوگا — کہ بارِ ترکِ تمنا سہا نہیں جاتا
تلاشِ نقشِ تمنا ہے سعی بے حاصل — جو مٹ چکا ہے وہ اے دل بنا نہیں جاتا
نہ پہنچے گا پائے طلب خارِ راہ سے کب تک — قدم قدم پہ کوئی دیکھتا نہیں جاتا
نظر میں ہیں ابھی رنگینیاں گلستاں کی — بہارِ رفتہ کا ماتم کیا نہیں جاتا
خیالِ شوق سے مایوسیاں نہ برہم ہوں — میرے نصیب کا لکھا مٹا نہیں جاتا

غلط سکون کی تھی آرزو کہ اب ہادی
بترکِ دردِ محبت جیا نہیں جاتا

ایک رات

نفسیاتی افسانہ

از جناب سیٹھ عبدالغنی (عثمانیہ)

"بابا!" بازو کے کمرے سے آواز سنائی دی۔
"وہ یہاں نہیں ہیں دوسرے کمرہ میں سو رہے ہیں۔"
"تم ابھی پڑھ رہے ہو۔ سو جاؤ رات بہت ہوگئی۔"
"ہاں! سو جاؤں گا۔ کالج کا کچھ کام کرنا تھا اس لئے اب تک بیٹھ گیا"
"اچھا اچھا، سو جاؤ۔"
"جی"
"دیکھو پانی پڑ رہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے۔ اپنے کمرہ کا دروازہ بند کرکے سو جانا۔"
"جی اچھا!"

ہوسٹل میں کوئی سیٹ خالی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے جگہ نہ مل سکی یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اپنی درخواست دیر میں بھجوائی۔ ان سے ملنے کے بعد انھوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ سیٹ خالی ہونے کے بعد پہلے تمھارا لحاظ کرونگا۔ انھیں اس بات کا افسوس تھا۔ مجھے ہوسٹل میں جگہ نہ مل سکی۔ جیسا کہ کالج میں یا ہوسٹل میں ہر اس لڑکے کی طرفداری کی جاتی ہے جو بحیثیت شاعر، افسانہ نویس یا کھلاڑی کے مشہور ہو، چونکہ میرے افسانے ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوکر خراج تحسین کا باعث ہوا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے کالج کے مشاعروں میں میرا حصہ رہا کرتا تھا اس لئے ساتھی اور استاد بھی مجھے وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور موذب صاحب کو میرا خاص خیال اس لئے رکھنا ضروری تھا۔ بہرحال شہر میں رہ کر ہوسٹل کی پرلطف زندگی کو چند دن کے لئے خیرباد کہنا پڑا ہے۔ جن صاحب کے یہاں میرا قیام تھا۔ وہ رشتہ میں میرے کچھ ہوتے تو نہیں تھے۔ البتہ والد صاحب اور ان کی گہری دوستی تھی جو کئی برس سے چلی آ رہی تھی۔ ایک جان دو قالب تھے۔ یہ تعلیمات کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ کافی اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے، اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی ان کے خاندان میں چلا آ رہا تھا اس لئے غرضمندوں کی آمد ان کے پاس ہمیشہ رہا کرتی تھی۔

قریب کے گرجا گھر سے ٹن ٹن گیارہ بجنے کی آواز آ رہی تھی اور اور میں بستر پر پڑا کروٹیں بدل بدل کر نیند کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بارش رک گئی تھی اور ہوا آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتی چل رہی تھی۔

"آؤ جی! ڈر کیا ہے۔ سب سو گئے ہیں۔" دھیمی آواز میں لڑکھڑاتے ہوئے کسی نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوف و ہراس اس کی طبیعت پر طاری تھا۔

"چھوڑیئے نا؟" نسوانی آواز تھی۔

اب میری نیند غایب ہوگئی۔ آواز کی طرف کان کھڑے کئے۔

"ہم کہہ رہے ہیں آؤ۔" بھاری آواز تھی۔

"ہمیں آپ ستا کیوں رہے ہیں۔ جانے دیجیئے۔" ساتھ ہی چھن چھن چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔

میں پریشان تھا کہ ماجرا کیا ہے؟ اس گھر میں تو کوئی عورت نہیں ہے۔ صرف ہم تین آدمی ہیں۔ ایک میں، دوسرے ان کا بیٹا تیسرے وہ خود۔ پھر یہ چوڑیوں اور نسوانی آواز کہاں سے۔ وہ قریب محلہ جو کل گاؤں سے آئی ہے کب سے سو چکی ہے۔ لیکن یہ باریک آواز اسی کی تھی اور بھاری آواز صاحب خانہ کی۔

"کوئی دیکھ لیگا، آؤ نا!"
"سب تو سو گئے ہیں۔"
"کوئی جاگ اٹھے گا تو ——؟"
"تو اچھا ہے۔"

اب تک میں ان ادھورے ادھورے جملوں کو نہ سمجھ سکا۔ آدھی رات گزری ہے۔ ایک اجنبی مرد اور عورت میں یہ کیسی گفتگو؟

"ہم دونوں کی بدنامی ہوگی۔" صاحب خانہ کی آواز تھی۔

"میرا تو یہاں کوئی نہیں ہے۔ ایک معصوم چھوٹی بہن ہے وہ گئی ہے۔ ہاں گھر تمھارا ہے۔ یہاں سب لوگ تمھارے ہیں۔ پھر کون کیا تمھیں بدنام کرنے چلے۔ بدنامی ہوگی تو میری ہوگی۔ بیوا کے نام سے مشہور کرائی جاؤں گی۔"

"اوہ! —— یہ معاملہ ہے۔ دنیا میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جن کا ظاہر اور، باطن اور ہے، چہرہ اور لباس سے ان کی شرافت ایک

ثابت ہو۔ لیکن ان کی گھریلو زندگی مصیبت اور گناہوں سے پُر ہو۔ انسانی کا درد، دل میں رکھے۔ صنفِ نازک سے ہمدردی کا دعویٰ کرے۔ لیکن غیاب میں گھر کی چار دیواری کے اندر صرف اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ان کے انمول موتی کو چکنا چور کرنے کو تیار ہو۔

"ارے باتیں بہت بنا رہی ہو، چلو بھی" وہی بھاری آواز تھی

"کہاں چلوں؟"

"گھبرائی کیوں کھائے جا رہی ہو — آؤ پیاری!"

"ایک غیر عورت کو پیاری کہتے ہوئے شرم نہیں آتی"

"اوہو! — شرم! — یہ نیا لفظ تم مجھے سنا رہی ہو۔ آؤ تو!"

"ارے تم مجھ سے لگے کیوں جا رہے ہو؟"

"اس لئے کہ میں تم سے —"

شاید اسی لئے جلد سو جانے اور کمرہ کا دروازہ بند کر لینے کے لئے کہا گیا تھا۔ تاکہ میں اس معاملے سے آگاہ نہ ہو سکوں اور ان کی آوازیں میرے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔

"عورت کی کمزوری اور اس کی تنہائی و بیکسی سے فائدہ اٹھا رہے ہو" باریک آواز تھی۔ آواز میں درد تھا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ ہر زمانے میں یہی ہوتا رہا تھا"

"تم جیسے درندہ صفت انسانوں کا یہ مسلک رہا ہو کہ ایک مہمان نا انصافی کرے لیکن ایسی مستثنیات سے قاعدہ کلیہ ٹوٹ نہیں سکتا بہت سی شریف اور انسانیت کی بہی خواہ ہستیاں ہیں جو ہم بیچاروں اور بیکسوں کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ میں اس سے پہلے تم کو بھی ان میں سے ایک سمجھ رکھا تھا۔ لیکن —"

"لیکن کیا —؟ کیا میں نے تمہاری ان آرزوؤں اور امیدوں کو پورا نہیں کیا جو تمہارے لئے خواب تھیں۔ تمہیں یہ چین کے دن کہاں نصیب ہوتے۔ تم ہوتیں اور گاؤں میں تمہاری اندھیری کوٹھڑی اور دھوئیں سے کالے کالے کپڑے تمہارے گورے گورے جسم پر۔ لیکن اب دیکھو تمہاری حالت کیا ہے؟ تم اپنی اس حالت کا مقابلہ موجودہ حالت سے کرو۔ تمہاری شرافت تمہیں خود میرا ممنون ہونے پر مجبور کرے گی۔"

"مجھے اس سے کب انکار ہے۔ میں تمہاری بہت ممنون ہوں، اور عمر بھر میں اور میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تمہارے احسان مند رہیں گے"

"تو پھر کس لئے سب مجھے یہ سب تمہیدی اور لمبی گفتگو کرنی پڑتی ہے"

"ممنون اور احسان مند ہونے کے کیا یہی معنی ہیں کہ تمہارا ہر وہ حکم جو میرے لئے باعثِ تحقیر ہو۔ دنیا والوں اور مالکِ حقیقی کو منہ دکھانے کے قابل نہ بنائے۔ تعمیل کروں۔ میں تمہاری اس عنایت کی بہت ممنون ہوں کہ ایک گرتی ہوئی کو سنبھالا۔ سماج کی ایک مظلوم ہستی پر رحم کیا اور اس قابل بنایا کہ اپنی کمزور اور بیکس ماں اور بھائیوں کی مدد کر سکے۔ لیکن کیا میں یہ بھی پوچھ سکتی ہوں کہ انسان کسی پر بھلائی اس لئے کرتا ہے کہ اس کو آئندہ دہرانے کا موقع ملے یا اپنے فرض کی تکمیل کے لئے تاکہ اپنا مقصدِ حیات پورا ہو"

"کوئی اپنے کئے ہوئے احسانات کو دہرانا یا موقع کے ساتھ جتلانا نہیں چاہتا لیکن اگر اس کو دہرانے پر مجبور کیا جائے تو وہ کیا کرے بات میں بات نکلتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ یقین رکھو کہ دنیا میں کوئی بھی انسان چاہے وہ تمہاری نظر میں کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو ہر اس کام کے ساتھ جو اس کے ہاتھوں سے تکمیل پاتا ہے اپنی آرزوئیں اور خواہشیں وابستہ رکھتا ہے"

"میرے کام کے بنانے میں شاید تمہاری بھی کوئی آرزو تھی؟"

"ہاں تھی۔ اس لئے تم جیسی کو اندھیرے سے اُجالے میں لایا"

"تو اس احسان میں آپ کی غرضمندی مضمر تھی۔ کاش مجھے یہ پہلے معلوم ہوتا"

"کیا کرتیں؟ دام ایسے پھیلائے گئے تھے کہ ہر صورت سے تمہیں گرفتار ہونا پڑتا"

"ہٹ کمبخت! ہٹا ہاتھ یہاں سے — ایک غیر عورت پر یہ دست درازی؟"

"ایسی دست درازیاں تو بہت ہو چکی ہیں۔ تم جیسی غیر اور شریف عورتوں کو بہت دیکھ چکا ہوں۔ لیکن — لیکن آخر انہیں میرے سامنے اپنی ہار ماننا پڑی"

"تو یہ تمہاری رکیک اور شرمناک حرکت فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے"

"یہ سب باتیں —! تمہاری یہ سب اپنی گفتگو۔ رہنے بھی دو۔ چلو تیار ہو جاؤ"

— "سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

"کیا فائدہ دیر کرنے سے رہائی تو ناممکن ہے"

"میں نے مانا کہ تمہارے آہنی پنجے سے رہائی ناممکن ہے۔ لیکن یہ بھی یقین رکھو کہ عورت فطرتاً کمزور ہونے کے باوجود دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے

عصمت کی شرافت پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے ۔ اور اس کے شفاف آئینے پر داغ لگنے کو ہوتا ہے۔"

"یہ کہتے ہوئے میں نے تم جیسی بہت سی ہستیوں سے سنا ہے ——— لیکن ———" قہقہہ سنائی دیا اور ساتھ ہی آہستہ سسکیاں بھرنے کی آواز آ رہی تھی۔

"خدا کے لئے چھوڑ دو مجھے ۔ رحم کرو میرے حال زار پر"

"پگلی ! یہ کوئی خدا کا دربار نہیں ہے کہ بندہ کی دعا اور گڑگڑانے پر اللہ میاں کی رحمت جوش میں آجائے اور اس کے رحم و کرم سے گنہگار کی مغفرت ہو ۔ اور اس کو نجات ملے ——— لیکن یہ تو میرا دربار ہے ۔ یہاں تو ایسی دعائیں کبھی قبول نہیں کی جاتیں ۔ اور نہ ایسے گنہگاروں کی نجات ممکن ہے"

"چھوڑ دو مجھے ——— چھوڑ دو"

"باجی ! باجی !" ——— اس کی چھوٹی بہن پکار رہی تھی۔

"باجی ! پانی پلایئے ۔ پیاس ہو رہی ہے"

"چھوڑیئے مجھے اس بچی کو تو پانی پلا آؤں"

"باجی ! تو کہاں ہے ؟ آتی کیوں نہیں ؟"

"او سیاہ باطن انسان چھوڑ ——— ! کیا تیرے پاس اس معصوم کے لئے بھی رحم نہیں !"

"ہاں میں عورت کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں ۔ دھوکہ اس کا شعار ہے"

"تم کو دھوکہ دیکر جاؤ گی بھی کہاں ؟"

"چپ ! سو جائے گی وہ خود"

سسکیاں ہر دم تیز ہو رہی تھیں۔

"تیری نیت بدل گئی ہے ۔ اب تو وہ نہیں ہے جو پہلے تھا ۔ کیا ہوئیں تیری وہ ہمدردیاں جو میرے ساتھ تھیں ۔ اور ———"

"ہمدردیاں بدستور قائم ہیں اور زیادہ ہوا کریں گی ۔ لیکن تجھ ہی سے تو اس کا انکار ہے"

"لیکن یہ تیری ہمدردیاں میری بے آبروئی کا پیغام لا رہی ہیں ۔ ایسی ہمدردیوں سے کیا فائدہ ؟"

"رہنے دو ان باتوں کو"

"او انسان ! میں تجھ سے اب آخری ہمدردی چاہتی ہوں"

"کیا ——— ؟"

"بس یہی کہ اب مجھکو چھوڑ دے ۔ بچی پانی کے لئے ترس رہی ہے ۔ اس بے گناہ کے واسطے چھوڑ دے ——— چھوڑ دے"

"یہ تو ناممکن ہے ۔ کسی صورت سے بھی میرا یہ فعل" ہمدردی " کہلائے جانے کا مستحق نہیں ——— میں تجھے اب آخر بار موقع دیتا ہوں سوچو ——— !"

"بہت سوچ چکی ۔ مگر ——— !"

"مگر وگر کچھ نہیں ، چلنا ہوگا"

"دنیا والے کیا کہیں گے تیری اس حرکت پر ؟"

"وہ تو سوتے پڑے ہیں ۔ جاگ رہے ہیں تو صرف ہم دو ——— اور وہ بھی اس کمرے میں بند"

"دنیا والے تو تجھے دیکھ نہیں سکتے ۔ لیکن غیبی ہستی تو تیری ان حرکات سے ہر دم آگاہ ہو رہی ہے ۔ دنیا والوں کی نظروں سے تو اوجھل ہے لیکن تیرے پیدا کرنے والے کی نظروں سے تو اوجھل نہیں ۔ اور آخرت میں تو اپنے اس فعل کا کیا جواب دیگا ؟"

"اونہہ ! ——— غیبی ہستی ! ——— پیدا کرنے والا ——— آخرت یہ سب ہمارے ہی ڈھکوسلے ہیں اور ہمارے ہی من گھڑت قصے ہیں ۔ جو تم جیسے بھولے انسانوں کو رام کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں ۔ ورنہ کون خدا ، کس کا خدا ، کہاں کا روز آخرت ؟"

"تو تم ہر روز ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور خاص مرشدانہ انداز سے کس کے احکام کا پرچار اپنے مریدوں اور دوستوں کے سامنے کرتے ہو ۔ دیکھو خدا کی ہستی ہر جگہ موجود ہے ۔ ہمارے افعال پر ہر دم اس کی نگاہ رہتی ہے ۔ اس کے احکام کی پابندی کرو ۔ بُری چیزوں مثلاً جھوٹ ، غیبت ، زنا وغیرہ سے بچو ! اب یہ الفاظ تمہاری زبان سے کیسے نکل رہے ہیں ۔ اور جب تم خدا کی ہستی کے وجود اور روز جزا کے قائل نہیں ، تو پھر یہ ناصحانہ لباس ، چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی اور ہاتھ میں تسبیح کس لئے ؟"

قہقہہ ——— "صرف دنیا والوں کو دھوکہ دینے اور اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے دنیا سیدھی باتوں سے کبھی رام نہیں ہوتی مکاری ، دغا بازی ، اور جھوٹ کو اپنا شیوہ بنانا پڑتا ہے ۔ جب کہیں انسان کو دنیا میں پھلنے کے لئے مواقع میسر آسکتے ہیں"

"آ ——— ہ ، میں دھوکہ کھا گئی"

"کچھ بُرا نہیں ہوا ——— اس میں تمہارا ہر طرح کا فائدہ ہے"

"ہاں ہوگا ۔ جیسا کہ اب ہوا"

"نادان ! سوچ ، تیرے پچھلے دن کس مصیبت سے

تیری زندگی ایک ظالم، غنڈہ، شرابی کے ہاتھ سونپ دی گئی تھی اس وقت ہر گھڑی تیرے لئے وبال جان تھی۔ تو نے وہ دن رو رو کر کاٹے۔ میری کوشش سے تجھے اس زندگی بھر عذاب سے نجات ملی اور یہ سکون کے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔ اب تجھے ہر طرح سے آرام ہے۔"

"لیکن اس سکون اور آرام سے جو عزت اور شرافت بیچنے پر مجبور کرے وہی پچھلے درد بھرے دن بدرجہا بہتر تھے۔"

"ارے تجھے اس لئے بھی میرا ممنون ہونا چاہئے تھا کہ تجھے اپنے سخت گیر باپ سے نجات ملی۔ جو تیری آزادی اور ہر کام میں مانع ہوا کرتا تھا۔"

"وہ تو قدرت کے ہاتھوں سے ہوا۔ تمہارا اس میں کیا کمال تھا"

"تو اس سے ناواقف ہے یہ میرے ہی کرتوت تھے جس کی وجہ سے تمہارے باپ نے بلک بلک کر اپنی آخری سانس چھوڑی۔ میرے ہی اشارے سے ڈاکٹر نے اسے زہر دیا تھا۔ اور تمہاری پڑوسن نے کھانے میں نیلا تھوتھا تمہاری ماں کو دیا ہے۔ جو اب بستر مرگ پر پڑی کراہ رہی ہے۔"

"آہ ـــ ظالم انسان یہ سب تیرے ہی کرتوت تھے ـــ او انسانیت کے دشمن!"

"مجھے تیرے خاندان سے نہ دشمنی تھی۔ نہ میں کسی قسم کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ پھر یہ کیوں اور کس لئے ـــ صرف میں ہی جانتا ہوں لیکن آج تجھ پر یہ راز پہلی اور آخری بار ظاہر کئے دیتا ہوں۔ مجھے اپنے شوہر سے قطع تعلق کرنے اور بے ماں باپ کے ہونے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں چاہتا یہ تھا کہ تیرے یہ سب سہارے ٹوٹ جائیں۔ اور تجھے صرف میرا سہارا حاصل ہو۔ اور وہی میں آج دیکھ رہا ہوں برسوں کی امیدیں آج پوری ہو رہی ہیں۔"

"آہ ـــ چھوڑ دے ظالم انسان!"

"ـــ"

"شیطان، ہاتھ ہٹا لے یہاں سے۔"

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ میں یہ سب دیکھ کر تھک گیا تھا معلوم نہیں کب سو گیا۔ لیکن اچھی طرح یاد ہے کہ سونے سے پہلے کچھ سن نہ سکا۔

"میاں اٹھو!" صاحب خانہ مجھے "میاں" سے تخاطب کرتے تھے "آخری وقت ہے۔ نماز پڑھ لو۔"

پریشان تھا۔ آخر میرے کان مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہے ہیں کل رات میں نے کیا سنا تھا اور اب کیا سن رہا ہوں۔"

"اٹھو میاں! وقت قریب ہے خدا کو یاد کر لو۔"

وہ برآمدے میں نماز کی چوکی پر بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں تسبیح تھی ـــ لب ہل رہے تھے۔

دوسرے سرے پر مسلمہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھی تھی، اس کے بال پریشان تھے اور چہرے کی سرخی غایب تھی۔

احمد بن الیاس

صفر ۷۵۲ھ کا ذکر ہے ایک دن خواجۂ جہاں ملک زادہ احمد بن الیاس عصر کی نماز پڑھکر جامع تغلق سے باہر آرہا تھا کہ اسے جمنا گھاٹ کی طرف سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا نظر آیا۔ ان دنوں سلطان محمد گجرات کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اور ملک احمد اس کی عدم موجودگی میں بطور نائب السلطنت کام کر رہا تھا۔ عرصہ سے بادشاہ کی خبر خیریت کا کوئی خط نہیں آیا تھا جس سے اس نمکخوار وزیر کی طبیعت پژمردہ سی رہتی تھی۔ اب جو دور سے گرد اڑتی نظر آئی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

اب سوار قلعہ کے دروازے کے قریب آگیا تھا۔ خواجہ جہاں نے ایک امیر سے کہا۔ "پتہ کرو۔ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟"

تھوڑی دیر بعد امیر نووارد کو ہمراہ لیکر حاضر ہوا۔

سوار نے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ کپڑوں پر گرد کی تہیں جم رہی تھیں۔ سفر کی کلفت سے چور چور ہوا جاتا تھا۔ اس نے آتے ہی ڈھاٹا کھول دیا اور خواجہ جہاں کے قدموں پر گر پڑا۔

"اوہ۔ کون ــــ التون؟ میرا محبوب غلام!!"

خواجہ جہاں نے فکرمند ہو کر کہا۔

"لشکر شاہی کو کیسے چھوڑا؟"

"میں خلوت میں عرض کرونگا۔ میرے آقا" غلام نے ہانپتے ہوئے عرض کیا۔

خواجہ جہاں التون کو ہمراہ لیکر فوراً ایک گوشے میں پہنچا۔ اور کہا "جو کچھ کہنا ہو جلدی جلدی کہہ ڈالو"

التون نے رازدارانہ طور پر کہنا شروع کیا "میرے آقا! آپ کا سلطان دنیا سے چل بسا۔ مغلوں نے لشکر لوٹ لیا۔ تاتار خان اور فیروز خاں گم ہیں۔ خدا معلوم مغلوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے یا کہیں مارے گئے"

فرطِ غم سے خواجہ جہاں بیقرار ہوگیا مگر دامن صبر کو ہاتھ سے جانے نہ دیا زیر لب انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہنے لگا "اے غلام تو نے بڑی منحوس خبر سنائی ہے"

دورِ تغلق کا ایک مدبّر

از جناب مولوی نور احمد خاں منشی فاضل

التون۔ خداوند نعمت! تقدیر سے چارہ نہیں۔

خواجہ جہاں۔ سلطان نے کب اور کہاں انتقال کیا۔

التون۔ اے خواجہ جہاں! ہندوستان کے شہنشاہ نے ۲۱ محرم کو ٹھٹھہ کے مقام پر اپنی جان "جان آفریں" کے سپرد کر دی۔

خواجہ جہاں۔ کچھ وصیت کا بھی علم ہوا؟

التون۔ اتنا سنا گیا تھا کہ سلطان نے فیروز خاں کو اپنی رعایا پر شفقت کرنے کی تلقین کی اور مرنے سے پہلے یہ اشعار پڑھے ؎

بسیار دریں جہاں چمیدیم ۔۔۔ بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم ۔۔۔ ترکان گرانبہا خریدیم
کردیم بسے نشاط آخر ۔۔۔ چوں قامت ماہ نو خمیدیم

"آہ! سلطان تیرا وجود بھی ایک طوفان تھا" یہ کہہ کر ٹھنڈے سانس بھرتا ہوا دیوان خاص میں آیا۔ اور امرائے دولت کو اس سانحہ سے مطلع کرکے ماتم میں ہو بیٹھا۔ اس وقت خواجہ کو دگنا غم تھا ایک تو بادشاہ کے مرنے کا اور دوسرا فیروز خاں کی گم شدگی کا کیونکہ خواجہ جہاں فیروز خاں کو دل سے چاہتا تھا اور سلطان کی وصیت کے بموجب اسی کو تاج و تخت کا مالک دیکھنا چاہتا تھا۔

چند یوم اسی طرح گذر گئے۔ فیروز خاں کی کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی۔ فتنہ و فساد کے ان ایام میں تخت کا بادشاہ سے محروم رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے خواجہ جہاں نے سلطان مرحوم کے فرزند کو تخت نشین کر دیا۔ اور خود کاروبار سلطنت کو نہایت مستعدی سے سرانجام دینے لگا۔

ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک دن اطلاع آئی کہ سلطان فیروز تخت پر بیٹھ چکا ہے اور پایۂ تخت کی طرف بڑھا چلا آتا ہے خواجہ جہاں کو شہزادے کے تخت نشین ہونے پر افسوس ہوا مگر اب غلطی ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ آنے والے خطرے کے لئے لشکر تیار رکھے۔ اور جب تک صلح کی کوئی صورت نہ نکلے بچاؤ کرے چنانچہ اس نے بیس ہزار کے قریب فوج فراہم کر لی۔ مگر خزانے تو

سلطان مرحوم کی ستائیس سالہ بذل وسخا کے سبب خالی ہو چکا تھا، اور اگر کچھ تھا بھی تو چند دنوں میں ختم ہو گیا۔ اس لئے خواجہ نے تالیف قلوب کے لئے سونے چاندی کے برتن اور جواہرات دینے شروع کئے لیکن چونکہ سلطان فیروز نہایت فیاض اور عدل پرور نوجوان تھا اس لئے رعایا اس کی حکومت کی خواہاں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امرا اور اکابر سلطنت ادھر کو بھاگنے لگے۔ جب خواجہ جہاں نے لوگوں کے اس میلان کو دیکھا تو اسے بادشاہ سے مقابلہ کرنا سودمند نظر نہ آیا۔ اس لئے اپنی جمعیت کو ہمراہ لیکر ہانسی جا پہنچا۔ ہوا خواہ امراء نے حاضر ہو کر عرض کی کہ "آپ تو سلطان فیروز کی خدمت میں جا رہے ہیں۔ ہمارے متعلق کیا حکم ہے؟"

خواجہ جہاں نے فرمایا "اے یاران بے ریا! سلطان محمد کے بیٹے کو بادشاہ بنانے میں میری کوئی ذاتی طمع مضمر نہ تھی۔ جب میں نے سنا کہ سلطان نے وفات پائی اور لشکر کو مغلوں نے لوٹ لیا اور تاتار خاں و فیروز خاں وہاں سے غائب ہیں تو میں نے ملک کی بھلائی اور خلق کی بہبودی کی خاطر پسر محمد شاہ کو بادشاہ بنا دیا میں نے بہت سی خطائیں اور غلطیاں کی ہیں۔ مگر وہ سب خلق کے بچاؤ اور شور و غل سے۔ ورنہ مجھے بادشاہی سے کیا کام تھا۔ میں سلطان فیروز کو محمد شاہ کے عہد میں بیٹا کہتا تھا اور وہ مجھکو باپ۔ میری بہو بیٹیاں اس کے گھر میں جاتی تھیں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ خدا کو کیا منظور ہے۔ مگر سلطان فیروز نیک مرد ہے۔ مجھے بھی اور تم کو بھی معاف کر دے گا"

خواجہ جہاں اسی سال کا پیر مرد۔ جس کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے یہ کہہ رہا تھا اور اس کے خیر سگال دوست رو رہے تھے۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو انھوں نے متفق ہو کر عرض کیا۔ "اے خواجہ! بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ امور حکومت میں باپ بیٹے کے تعلقات کی پروا نہیں کرتے۔ سہو اور غلطی میں تمیز نہیں کرتے۔ فیروز شاہ لاکھ نیک مرد سہی مگر وہ دستور قدیم کے خلاف نہ چلے گا"

اس سے خواجہ کے چہرے پر یاس اور قنوط کی ایک لہر دوڑ گئی، مگر فوراً سنبھلا اور سنبھل کر بولا۔ "میرے جاں سپار دوستو! اگر میں واپس دہلی جا کر قلعہ بند ہو بیٹھوں۔ اگرچہ میرے پاس لشکر اور ہاتھی بکثرت موجود ہیں لیکن اس کے باوجود سلطان فیروز دہلی کو

حج کرے گا۔ اس سے مسلمانوں کی حکومتیں نااہلوں کے ہاتھ پڑ گئیں۔ کیا اس بڑھاپے میں میرے لئے مناسب ہے کہ قیامت کو روسیاہی کا داغ چہرے پر لے کر قبر سے اٹھوں۔ اب میں رضائے الٰہی پر راضی ہو چکا ہوں۔ جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہو کر رہیگا۔"

امراء نے جب دیکھا کہ خواجہ جہاں سلطان کے دربار میں جانے پر مصر ہے تو فوراً لوٹ گئے اور کئی اس کے ہمراہ روانہ ہوئے۔

ظہر کا وقت تھا۔ فیروز بخت سلطان فتح آباد میں کرسی پر بیٹھا دربار کر رہا تھا کہ دور سے خواجہ جہاں اس ہیئت میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ پگڑی سر سے اُتری ہوئی۔ سر ننگا اور مُنڈا ہوا۔ تلوار برہنہ گلے میں حمائل۔ شرافت مجسم سلطان نے فوراً ایک امیر کو بھیجا کہ جا کر پگڑی بندھوائے اور چوڈول زریں جو خاص اس کی سواری کا تھا بھیجکر ہدایت کی کہ خواجہ جہاں کو باغ کے تختہ میں بٹھایا جائے میں وہیں ملاقات کو آتا ہوں۔ امرائے دربار جو علی الاعلان خواجہ کی جان کے دشمن ہو رہے تھے بادشاہ کو ادھر جھکتے دیکھا تو سب نے دست بستہ عرض کی "خداوند تعالے کے فضل و کرم سے آپ بادشاہ ہو گئے۔ دہلی بھی فتح ہو گئی اور خواجہ جہاں بھی خدمت میں پہنچ گیا اب کسی قسم کا خدشہ نہیں رہا۔ مسلمان پر ایک حج فرض ہوتا ہے۔۔ جہاں پناہ ہم سب کو حج ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔"

سلطان ان کا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "جب کبھی امیروں وزیروں سے لغزش ہوئی ہے۔ گذشتہ سلاطین نے ہمیشہ ان سے درگذر کی ہے"

انھوں نے عرض کیا۔ "ولی نعمت! گناہ دو طرح کے ہیں ایک کبیرہ دوسرے صغیرہ۔ صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں تو کچھ قباحت نہیں۔ مگر کبیرہ گناہوں سے درگذر کرنے میں انجام کار بڑی پشیمانی ہوتی ہے۔ خواجہ جہاں نے دنیاوی لالچ سے ایک معصوم بچے کو تخت پر بٹھا دیا۔ خزانہ کا سارا روپیہ برباد کر دیا اور جب کچھ نہ رہا تو سونے چاندی کے برتن اور جواہر دے ڈالے اس پر بھی جب وہ رعایا کو اپنا طرفدار نہ بنا سکا تو مجبوراً جہاں پناہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اگر اسے ہم پر غلبہ حاصل ہوتا تو کسی کو زندہ نہ چھوڑتا۔ جو ہماری سمجھ میں آیا عرض کر دیا۔ آگے بادشاہ کو اختیار ہے"

بادشاہ خواجہ جہاں کا بیحد احترام کرتا تھا۔ اور اسے شہزادگی کے زمانہ میں آبا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ جب دیکھا کہ سارا دربار اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ دربار برخاست کر کے خواجہ جہاں سے ملاقات کی اور پھر محلسرا میں چلا گیا۔

اس صدمہ نے فیروز شاہ کے قلب و دماغ پر اتنا بڑا اثر ڈالا کہ وہ بیمار ہو گیا اور کئی دن تک باہر نہ نکلا۔ آخر کار ایک دن عماد الملک کو بلا کر کہا۔ "میں خواجہ جہاں کا معاملہ تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ جو مناسب معلوم ہو کرو۔"

عماد الملک نے یہ معلوم کر کے کہ بادشاہ خواجہ جہاں کو دل سے چاہتا ہے یہ معاملہ کونسل میں پیش کیا۔ دیر تک اس کے متعلق بحث و تمحیص ہوتی رہی آخر طے یہ پایا کہ۔

"خواجہ شمع سحری ہو رہا ہے۔ اسے سامانہ کا موضع جاگیر میں دیکر رخصت کر دیا جائے تاکہ باقی عمر عبادت الٰہی میں بسر کرے۔"

خواجہ جہاں اپنے متعلق یہ حکم سن کر سامانہ کو چل پڑا لیکن ابھی چند منزلیں طے کی تھیں کہ عقب سے شیر خاں اسے آ ملا۔ خواجہ نے معلوم کر لیا کہ یہ میرے لئے عزرائیل بن کر آیا ہے۔ کہا۔ "ذرا مجھے دوسرے خیمے تک جانے کی اجازت دی جائے"۔ وہ اس میں جا کر نماز پڑھنا چاہتا تھا شیر خاں نے اجازت دیدی۔ خواجہ فی الفور خیمہ میں پہنچا۔ وضو کر کے نماز شروع کرنا چاہتا تھا کہ قاتل ننگی تلوار ہاتھ میں لئے داخل ہوا۔

خواجہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ پوچھا تمھاری تلوار تیز ہے؟ قاتل نے تلوار دکھائی اور خواجہ نے الٹ پلٹ کر دیکھی اور پھر واپس کر دی۔ اور کہا جب میں نماز سے فارغ ہو لوں تب مجھ پر وار کرنا۔ اس کے بعد خواجہ نے نماز پڑھنا شروع کی۔ رکوع کے بعد سجدہ کے لئے سر زمین پر رکھا دو دفعہ سبحان ربی الاعلیٰ کا ورد کیا تیسری بار "سبحان" کا لفظ زبان پر تھا کہ قاتل نے تلوار مار کر سر تن سے جدا کر دیا۔

جام عرفان

رباعیات

از حضرت دل شاہجہاں پوری

اخلاق مکمل کا سراپا کہئے　　یا نور کا بہتا ہوا دریا کہئے
گل کہئے کہ بوئے گل سبھی کچھ کہہ کر　　تحقیر امام ہے تو پھر کیا کہئے

اے اہل نظر تمہیں یہ خبر ہے کہ نہیں　　کچھ جبر و تشدد کا اثر ہے کہ نہیں
دنیائے شعور کیلئے ہے اک درس　　روداد امام پہ نظر ہے کہ نہیں

وہ کون حقیقت میں جو تھے فخر انام　　مقبول نبی ابن علی عرش مقام
جمعیت مسلم کی مکمل تشبیہ　　جس طرح کہ تسبیح کے دانوں میں امام

وہ چشمۂ فیض بحر ذخار علیؑ　　وہ مطلع نور حیدر انوار علیؑ
قائم برضائے حق رہے آخر تک　　یعنی ہمہ تن مظہر ایثار علیؑ

فرمان رسول کی نگہبانی کی　　طے منزل تسلیم بآسانی کی
باطل کے خلاف حق پرستی کی دلیل　　ایماں کیلئے جان کی قربانی کی

تعلیم رسالت سے یہ بیداری تھی　　مقتل میں شہادت کی بھی تیاری تھی
نیت کی بھی تکمیل دم آخر تک　　یہ خلق عظیم یہ رواداری تھی

کافی یہ دلیل ہے صداقت کیلئے　　وعدہ تھا فقط بخشش امت کیلئے
تکمیل نبوت کی ہے تصدیق حسینؑ　　سر پیش کیا گیا شہادت کیلئے

بخشش کا امام نے سبق یاد کیا　　ہنگام غضب ضبط سے دل شاد کیا
کہتا تھا غلام کاظمین الغیظ　　تعزیر یہ دی گئی کہ آزاد کیا

پُر درد بہت ہے یہ کہانی سن لو　　مظلوم امام کی زبانی سن لو
مجھ پر ہے فقط ابن علی کا الزام　　ہوں نسبت رسول کی نشانی سن لو

روداد بہ رنگ خونفشانی سن لو　　خاموش لبوں کی ترجمانی سن لو
معصومیٔ اصغر پہ چلے جور کے تیر　　فریاد زبان بے زبانی سن لو

اک موج کرم چشمۂ رحمت ہے حسینؑ　　ایمان مکمل پہ دلالت ہے حسینؑ
آغوش بتولؑ میں جو شاداب ہوا　　وہ گلبن گلزار نبوت ہے حسینؑ

تصدیق ہوئی مسلک کامل یہ ہے　　اس دہر میں فرق حق و باطل یہ ہے
قائم برضائے حق رہے پائے ثبات　　دلدادۂ تسلیم کی منزل یہ ہے

تفریق ہے مخصوص جہالت کیلئے　　توحید ہے درس حق کی دعوت کیلئے
سمجھو! یہ دوراہے میں بھٹکنا کیسا　　جب ایک ہی مرکز ہے ہدایت کیلئے

مختصر کہانیاں!

نوشتہ :- رابندر ناتھ ٹیگور آنجہانی
ترجمہ :- جناب محمد یونس احمر

ایک دن

مجھے دوپہر کی سنہری لیکن دلدوز گھڑیاں یاد آ رہی ہیں — بارش کے صاف وشفاف قطرے رفتہ رفتہ خاموش ہو گئے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں سینے کو گدگدا رہی تھیں۔

گھر میں بھیانک تاریکی اور گہرا سکوت تھا۔ دل دنیوی دھندوں سے اچاٹ سا ہو گیا اور میں نے ملہار کے سُر میں بارش کا راگ چھیڑنا شروع کیا۔

سامنے کے گھر سے وہ یک بیک میرے دروازے تک آئی۔ لیکن پھر واپس ہو گئی۔ پھر ایک دفعہ باہر آکر رک گئی۔ اس کے بعد دبے پاؤں اندر آئی اور بیٹھ گئی — ہاتھوں میں کشیدہ کاری کے اوزار لیے۔ سرنگوں ہو کر پھول کاڑھنے لگی۔ پھر سلائی ختم کرنے کے بعد چلمن کے قریب آکر فطرت کے گہرے سکوت پرور مناظر سے دل بہلانے لگی۔

بارش بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اور میرے گیت کی سانس بھی اکھڑ گئی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنی سیاہ لمبی لٹوں کو سنوارنے لگی۔ اس کے بعد اور کچھ نہ ہوا — لیکن بارش اور تاریکی میں مدغم ہو کر وہ حسین لمحے میری شہ رگ میں شمشیر کی انی کی طرح چبھ گئے۔

تاریخ میں راجاؤں اور بادشاہوں کے افسانے اور جنگ کی کہانیاں جلی حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ مگر وہ دوپہر کی ایک مختصر حسین گھڑی میں خاموشی میں پروئی ہوئی شیریں باتیں تاریک کٹیا میں ڈوب کر رہ گئیں — صرف انہی دو دلوں کو یہ حسین لمحے دعوت دید دے کر رہ گئے۔

پہلا سوگ

جنگل کی چھاؤں میں جو راستہ تھا وہ آج گھنی گھاس سے ڈھک گیا ہے —!

خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز یکایک میرے کان میں آئی

"کیا مجھے پہچانتے نہیں ؟"

میں نے گھوم کر اس مرقع حسن و جمال کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کچھ کچھ یاد آ رہا ہے لیکن نام نہیں بتا سکتا۔"

اس نے کہا۔ "میں تمہیں بہت دنوں سے جانتی ہوں — آہ وہ پچیس سال کا سوگ!"

اس کے بعد اس کی نیلی آنکھوں کی پتلیوں میں چند بلوریں قطرے دکھائی دیئے جو اس طرح چکاچوند پیدا کر رہے تھے جیسے چاند کی سنہری شعاعوں کی چمکیلی روشنی۔

متحیر ہو کر میں کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ "اس دن میں نے تمہیں ساون کے بادل کی طرح سیاہ دیکھا تھا۔ اور آج آبن کی سنہری چھاؤں میں دیکھ رہا ہوں — کیا تمہاری آنکھوں سے اس دن کے سارے پانی بہہ گئے؟"

اس کی زبان کو حرکت نہ ہوئی۔ صرف لبوں پر تبسم پھیل گیا مجھے احساس ہوا کہ اس سنہرے تبسم کی حسین لڑیوں میں تمام کیفیتیں روپوش ہو گئی ہیں۔ بارش کے بادل نے نازک کلیوں کی ہنسی سیکھ لی

میں نے سوال کیا۔ "کیا میری زندگی کے ان پچیس برسوں کی رومان پرور راتیں تمہارے دل کے گوشے میں قائم ہیں؟"

اس نے کہا۔ "ذرا میرے اس گلے کے ہار کو تو دیکھو۔"

میں نے دیکھا — اس دن کی نسبت مالا اب تک نہ مرجھائی تھی۔ میں نے کہا۔ "میری تمام چیزیں تو مرجھا گئیں۔ لیکن تمہارے گلے سے میری پچیس سال کی جوانی اب تک نہ مل سکی۔"

آہستہ آہستہ اس نے اپنے گلے سے مالا اتار کر میرے گلے میں ڈال دی اور بولی۔ "یاد ہے اس دن تم نے کہا تھا — دیکھو کبھی عیش وعشرت کی خواہش نہ کرنا بلکہ غم ہی زندگی کی روح ہے اور اسی کی تمنا تمہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے پانی پانی ہو کر کہا۔ "ہاں میں نے کہا تھا — لیکن جانو ہے کتنے دن گزر گئے اور یہ گئی گذری باتیں فراموش بھی کر دی گئیں

وہ بولی۔ "وہ شناسائے راز! آہ اس نے تو ہمیں بھلا دیا۔ میں آج بھی اس کشش منزلے میں بیٹھی ہوں ——— مجھے خوش آمدید کہو پیارے!"

میں نے اس کے نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔ "کیا یہ تمھاری خود ساختہ مورتی ہے؟"

وہ بولی۔ "دل کی جوالہ آج تو شانتی میں بدل گئی میرے محبوب!"

بادل

———(۱)———

وصل کی پہلی شب کو بانسری نے کیا کہا تھا؟

اس نے کہا تھا۔ "وہ انسان میرے حلقۂ زنجیر میں آیا ہے جو آنکھوں سے بہت دور تھا۔"

اور یہ بھی کہا تھا۔ "جسے قید نہیں کر سکتی تھی ——— آج وہ قیدی بن کر سامنے کھڑا ہے۔ جسے پا نہیں سکتی تھی اسے حاصل کر لیا ہے"

لیکن اس کے بعد بانسری کی راگنی خاموش کیوں ہو گئی؟

شاید اس نے کچھ فراموش کر دیا تھا ——— تخیل کی دھاریں سست پڑ چکی تھیں۔

محبت کا وصل ہی آنکھوں کی راہ سے تصویر بن کر نظر آتا ہے۔ اور جدائی کی گھڑیاں دور ——— بہت دور کراہتی ہیں!

دو روحوں کے درمیان جو لامحدود آسمان کھڑا ہے۔ وہاں شہر خموشاں کی سی ویرانی چھائی رہتی ہے۔ اور اسی گہری خاموشی میں جگر کو پاش پاش کرنے کے لئے بانسری کی راگنی الاپی جاتی ہے۔ جانتے ہو لامحدود آسمان میں سوراخ کئے بغیر بانسری کا راگ نہیں پھوٹ سکتا۔

میری قربت کا وہی آسمان آندھیوں سے ڈھک گیا تھا اور خیالات کے طوفان مچل رہے تھے۔

———(۲)———

کبھی کبھی جب تاروں بھری راتیں میرے افسردہ و مغموم دل کو بستر استراحت سے جگا دیتی ہیں۔ اس وقت یکایک مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے جانی پہچانی شکل کو عرصہ ہوا کھو دیا ہے۔

آہ یہ جدائی کی تحصیت دہ گھڑیاں کیسے گذریں گی؟ ——— جس جدائی کا بادل میرے باطن سے چمٹا ہوا ہے۔

دن کے اختتام کے بعد اپنی کٹیا میں قدم رکھتے ہی جس کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع کرتا ہوں وہ کون ہے؟ وہ تو دنیا کے لاکھوں نفوس میں سے ایک ہے! وہی تو میری زندگی ہے! لیکن نہ جانے کیوں اور کس خواہش کے زیر اثر اس نے جادہ پیائی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔

کبھی احساس ہوتا ہے کہ دن کی کس روشن اور تابناک گھڑی میں اس دوشیزہ سے گفتگو کا سلسلہ شروع کروں؟ اور شام کی تاریک ساعتوں میں کس طرح ——— ایک بار اس سے ملاقات کی بھیک مانگوں؟

———(۳)———

اس وقت سال نو کی شمالی ہوا پرواز کر کے مشرقی افق میں داخل ہو گئی۔ اور یک بیک اُجین کے شاعر کی بات دل میں پیوست ہو گئی، خیال آیا کہ محبوبہ کے پاس پیامبر بھیجوں ——— اس خیال سے میری راگنیاں فضائے بسیط میں لہرانے لگیں اور میں تخیل کی لہروں میں دم بخود کھڑا رہا۔

لیکن اسے بہرحال جانا ہی پڑے گا۔

جس دن زمین پر شادی کی درد بھری بانسری بجائی جا رہی تھی ——— اس دن ہم دونوں کا ملاپ ہوا تھا ——— وہ دن ——— آہ! وہ گذرا ہوا دن ہماری آنکھوں کے سامنے دائمی بسنت بن گیا۔ اس کی خوشبوئیں۔ آج بھی شاعرانہ جذبات کے سمندر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور دلوں کے اندر زندگی رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سوچتا ہوں کہ بارش کے نغمے سے البیلے قطرے کی شیریں باتوں کو اپنی باتوں میں گوندھ کر محبوبہ کے کان تک پہنچا دوں ——— جہاں وہ سیاہ لمبی لٹیں بکھرائے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گی۔

———(۴)———

دور، بہت دور سے، لامحدود آسمان زمین کی نرم و نازک چھاتی سے آ کر لپٹ گیا۔ اور آہستہ سے بولا۔

"میں تمھارا اور صرف تمھارا ہوں"

زمین بولی۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ تم سربلند ہو اور میں حقیر ہوں"

آسمان نے کہا۔

"دیکھتی نہیں! میں نے اپنے چاروں طرف بادل کی لکیر کھینچ دی ہے"

زمین نے جواب دیا۔

"تمھارے سینے کے اندر زریں شعاعیں لہریں لیتی ہیں اور میری چھاتی تو تاریکیوں کی وادی ہے"

آسمان نے کہا۔

"آج میں اپنے چاند، سورج اور بیشمار تاروں کو گم کرکے آیا ہوں صرف تم اور تم ہی میری جان ہو۔"

زمین بولی۔ "یہ سن کر میرا پژمردہ دل چنچل ہو کر کانپ اٹھتا ہے کہ تم تو غیر متحرک اور مضبوط ہو۔"

آسمان نے کہا۔ کیا تم نہیں دیکھتیں میری آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے قطرے تھرتھرا رہے ہیں۔ آج تمہارے روشن اور خوبصورت دل کی طرح میرا نصیب بھی روشن ہو گیا ہے پیاری!

یہ کہہ کر آسمان اور زمین دونوں اپنی طویل جدائی سے گھبرا کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے اور آنکھوں سے مینہ کا جھرنا بہنے لگا

——(۵)——

ہماری جدائی سے پہلے آسمان اور زمین کا ملاپ ہوا تھا مجھ کے نزدیک جو بات ناقابل بیان تھی۔ وہی یکایک چونک کر گدگدا دیتی ہے۔ اس کے بالوں کے سیاہ گچھے نیلے آسمانوں میں لہرا اٹھتے ہیں اس کی کالی کالی آنکھوں کی راگنی بادل کے ملہار میں ناچتی رہتی ہے اور اس کا دل رہ رہ کر لرزنے لگتا ہے۔

جب جھینگروں کے شور سے زمین تھرتھر کانپ اٹھتی ہے —— اور جب بادل کی ہوا چراغ کو کپکپا جاتی ہے۔ اس وقت وہ دنیا کو چھوڑ کر بھیگی ہوئی گھاس کو طے کرکے۔ اندھیری رات کی پروا نہ کرتے ہوئے میرے مغموم دل میں جگہ تلاش کرنے آتی ہے۔

سوغات

پوجا کی دلنواز گھڑی قریب آگئی تھی۔ مٹھائیوں کی دکانیں رنگا رنگ کی خوبصورت چیزوں سے اٹی پڑی تھیں اور پرکیف نغمے مجھے دعوت نظارہ دے رہے تھے۔

ماں قسم قسم کی سوغات تقسیم کرنے میں مصروف تھی۔

بڑا لڑکا پردیس میں سرکاری افسر تھا۔ منجھلا سوداگری کے سلسلے میں غیر ممالک کا دورہ کرتا تھا اور کئی لڑکوں نے آپس میں لڑ جھگڑ کر الگ الگ مکان لے لیا تھا۔

چھوٹا بچہ صدر دروازے میں کھڑا متحیر نگاہوں سے سوغات کی ہما ہمی کو دیکھ رہا تھا جسے بوقلموں رومالوں سے ڈھانک کر مختلف گھروں کو بھیجا جا رہا تھا۔

دن ختم ہو گیا۔ سوغات بھی ختم ہو گئی —— اور سورج کی آخری ہی کبھی شعاعیں بھی شام کو الوداع کہہ کر افق مغرب میں ڈوب گئیں۔

بچہ گھر واپس آ کر ماں سے بولا۔ "ماں تم نے سب لوگوں میں سوغات تقسیم کر دی لیکن مجھے؟"

ماں ہنس کر بولی۔ "ہاں میں نے تو سب کو بانٹ دی۔ مگر جانتے ہو میں نے تمہارے لئے کیا رکھ چھوڑا ہے؟" یہ کہہ کر اس کی سنہری پیشانی پر محبت کے گرم گرم بوسے ثبت کر دیئے۔

بچہ روتی آواز میں بولا۔ "تو کیا مجھے سوغات نہیں ملیگی؟"

"ہاں اس وقت پاؤ گے جب تم بھی آنکھوں سے ہٹ دور چلے جاؤ ——"

"اور جب قریب رہونگا تو کیا ہاتھوں کی چیز نہیں ملیگی؟"

ماں اپنے دونوں ہاتھوں سے بچہ کو گود میں لے کر بولی۔

"دیکھو! یہی تو میرے ہاتھوں کی چیز ہے۔"

رتھ جاترا

رتھ جاترا کا دن قریب آ رہا تھا۔

اس لئے رانی، راجہ سے بولی۔ "چلو رتھ دیکھنے جائیں۔"

راجہ نے کہا۔ "اچھا"

گھوڑے کی سواری تزک و احتشام کے ساتھ اصطبل سے نکلی ہاتھی قطار اندر قطار بڑی شان و شوکت سے جانے لگے۔ پپیہوں نے سریلی تان چھیڑ کر سفر کا آغاز کیا۔ سپاہی بارعب چہرہ بنا کر روانہ ہوئے۔ سب سے پیچھے خادمائیں اور خادموں کی ٹولی جا رہی تھی۔

لیکن ایک دکھی آدمی اس سفر میں ساتھ نہ ہو سکا۔

سردار نے آ کر اس سے کہا —— "ارے تجھے جانا ہے تو ہمارے ساتھ آ ——"

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میرا جانا مناسب نہیں۔"

راجہ کے کان تک یہ بات پہنچ گئی کہ رتھ کو دیکھنے کے لئے تمام تماشائی چلے گئے لیکن وہ دکھی نہیں گیا۔

راجہ نے وزیر سے کہا۔ "اسے دربار میں حاضر کرو۔"

سڑک کے کنارے اس دکھی کا جھونپڑا تھا۔ جب ہاتھی وہاں تک پہنچا تو وزیر نے آواز دی۔ "ارے دکھی! تماشا کرنے دیکھنے جائیگا تو چل ——!"

دکھی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "کہاں تک جاؤنگا بھائی! ٹھاکر کے دروازے تک مجھ میں جانے کی سکت ہی کہاں ہے؟"

وزیر نے کہا۔ "کیا تجھے ڈر لگتا ہے۔ خوف کھانے کی کوئی بات نہیں۔ راجہ اپنے ہمراہ لے جائے گا۔"

دکھی بولا۔ "کیا راجہ کی راہ میری راہ ہو سکتی ہے؟"

وزیر گویا ہوا "اس کا مطلب؟ — کیا تو اس جاترا میں شرکت نہیں کرے گا؟"

دکھی نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھاکر رتھ میں سوار ہو کر میرے دروازے تک خود آئیں گے۔"

وزیر یہ سن کر ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ "تیرے دروازے تک رتھ کے آنے کی نشانی کیا ہے؟"

دکھی نے جواب دیا۔ "اس کے رتھ کی کوئی نشانی نہیں۔"

وزیر بولا۔ "آخر ایسا کیوں؟"

دکھی نے کہا۔ "وہ دیکھو سواری آ رہی ہے۔"

وزیر نے کہا۔ "کہاں ہے وہ رتھ؟ بتاؤ تو سہی!"

دکھی نے انگلی سے اپنے دروازے کی طرف اشارہ کر کے رتھ دکھائی جس کے دونوں طرف سورج کی شعاعیں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔

(بنگالی سے)

نقشِ فریادی

از:-
از جناب اجتبیٰ حسین رضوی ایم۔ اے

ہستی کے مرقع کا ہر نقش ہے فریادی — اشکوں کی یہ کھیتی ہے آہوں کی یہ آبادی
غم فطرتِ ہستی ہے غم لازمۂ ہستی — اک حکمتِ سطحی ہے تفریقِ غم و شادی

مضطر ہے ہر اک ذرہ اس عرصۂ ہستی کا — جو ہے وہ تڑپتا ہے جو ہو گا وہ تڑپے گا
تدبیرِ سکوں یعنی اک محنتِ لاطائل — فطرت سے کہیں بچ کر دھارے سے کہیں تھم جا

سرگرمِ عمل اب تک وہ جنبشِ اول ہے — سورج کی شعاعوں سے ذرات میں ہلچل ہے
بجھتے ہیں چمکتے ہیں ملتے ہیں سمٹتے ہیں — یہ فرصتِ بینائی اک قیدِ مسلسل ہے

مر جائیں تو مر کر بھی جینے کا قرینا ہے
فریاد کہ جیتے ہیں فریاد کہ جینا ہے

جہانگیر کا عدل

تاریخی مقالہ

از جناب پیر غلام دستگیر نامی

مغلیہ خاندان میں نورالدین جہانگیر عادل مشہور ہے۔ اس کے عدل و انصاف کے قصے زبان زد عوام ہیں۔ اس کی نصفت شعاری کی شہرت کی وجہ سے داستان طرازی اور رنگ آمیزی کرنے والے شاعروں نے اس کے عدل کے بیان میں اس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کہ اسے بیوقوف بنا دیا ہے مثلاً یہ قصہ کہ نور جہاں ایک پرندے پر تیر چلاتی ہے جو اچٹ کر ایک دھوبی کی پشت میں پیوست ہو کر اس کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے اور جہانگیر اس اتفاقی قتل کی سزا یہ تجویز کرتا ہے کہ جس طرح نور جہاں نے زوجۂ گازر کو بیوہ بنایا ہے اسی طرح وہ دھوبن جہانگیر کو پاداش جرم میں قتل کر کے نور جہاں کو بیوہ بنا دے۔ یہ مضحکہ خیز داستان جہانگیر جیسے دانا شہنشاہ کی انصاف پژوہی پر بہت بڑا حملہ ہے اور اس کے اس اصول کے خلاف ہے کہ ایک کے گناہ کے عوض دوسروں کو سزا کیوں دی جائے۔ اس باب میں ہم تزک جہانگیری سے ایک دلچسپ قصۂ فساد درج کرتے ہیں جس کے آخری فقرے سے ہمارے دعویٰ کا ثبوت مترتب ہوتا ہے۔

باغیوں کی خونریزی ۔ ۲۷ شعبان ۱۰۱۴ھ کو اُمیراج ولد بھگوانداس عموی راج بھان سنگھ کے بیٹوں سے عجیب حرکت سرزد ہوئی ان بے سعادتوں کے نام ابھے رام، بیجے رام اور شیام رام تھے شورش پسندی اور بد اعتدالی ان کی داخل فطرت تھی۔ ابھے رام سے بہت سی بے عنوانیاں سرزد ہو چکی تھیں مگر ہم نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ یہ بے سعادت اپنے بیوی بچوں کو چوری چھپے اپنے وطن اس نیت سے بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ بعد میں خود بھی بھاگ کر ہمارے بدخواہ رانا کے پاس جا کر پناہ لیں اور دشمنوں کے ساتھ مل کر فساد برپا کریں۔

ہم نے رام داس اور دیگر راجپوت اُمرا سے کہا کہ اگر تم میں سے کوئی ضامن ہو تو ہم ان بدبختوں کے منصب اور جاگیر کو برقرار رکھ کر پچھلے گناہ معاف کر دیں۔ مگر ان کے پرلے درجہ کی شوربختی اور بدبختی کے باعث کوئی ضامن نہ بنا۔ ہم نے امیرالامرا کو حکم دیا کہ جب ان تیرہ بختوں کی کوئی ضمانت نہیں دیتا تو اُس وقت تک ان کو کسی بندۂ درگاہ کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ابراہیم خاں کاکر جو بعد ازاں دلاور خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا اور حاتم پیشرنگلی المخاطب بہ شہنواز خاں کے سپرد کر دیئے گئے۔

جب ان جاہلوں سے یراق دور کرنے لگے تو وہ پاس مراتب ادب کو بالائے طاق رکھ کر نوکروں سمیت فساد اور لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ امیرالامرا نے یہ بات ہمارے گوش گزار کی۔ ہم نے فرمایا کہ ان سیاہ بختوں کو ان کے اعمال کی جزا دی جائے۔

امیرالامرا نے ان کی دفع کا قصد کیا۔ ہم نے شیخ فرید کو بھی عقب میں روانہ کر دیا۔ اس جماعت میں سے دو راجپوت ایک شمشیر لیکر اور دوسرا جمدھر پکڑ کر امیرالامرا کے روبرو ہوئے اس کے ملازموں میں سے ایک جمدھر دار کے مقابل ہوا اور جمدھر کے زخم سے مارا گیا مگر اسے بھی پارہ پارہ کر دیا گیا۔ شمشیر والے سے امیرالامرا کا ایک افغان ملازم لپٹ گیا اور اسے نابود کر دیا۔ دلاور خاں جمدھر کھینچ کر ابھے رام کی طرف جو دوسرے دو اشخاص کے ساتھ پاؤں جمائے کھڑا تھا۔ متوجہ ہوا اور ایک کو زخم پہنچا کر تینوں کے ہاتھوں تو زخم کھا کر گر پڑا اتنے میں امیرالامرا کے آدمیوں نے ان خونیوں کو قتل کر دیا۔ راجپوتوں میں سے ایک تلوار کھینچ کر شیخ فرید کی طرف بڑھا۔ اس کا حبشی غلام روبرو ہوا اور اس راجپوت کو نیچے گرا دیا۔ یہ شورش دولتخانۂ عام و خاص میں واقع اور یہ سیاست بہت سے ناعاقبت اندیشوں کی تنبیہ کا باعث ہوئی۔

ابوالنبی ازبک نے عرض کیا کہ اگر اس قسم کی حرکت ازبکوں میں ہو تو اس جماعت کے سلسلہ اور قبیلے کو تخم سوخت کر دیا جاتا ہے ہم نے جواب دیا کہ چونکہ یہ طائفہ والد بزرگوار کا رعایت کردہ اور تربیت یافتہ ہے ہم مراعات نوازشگی مدنظر رکھتے ہیں اور مقتضائے عدالت بھی یہی ہے کہ ایک شخص کی تقصیر اور جریمہ کے عوض دوسرا سے مواخذہ نہ کیا جائے"

قتل ہوشنگ ۔ ہماری خدمت میں عرض کیا گیا کہ ہوشنگ برادر زادہ خان عالم نے ناحق خواہ کر دیا ہے۔ ہم نے حضور میں طلب

کرکے بازپرس کی۔ ثبوت کے بعد اُس کے قصاص کا حکم دے دیا حاشا کہ ان امور میں ہم نے کبھی شہزادوں کی رعایت نہیں کی۔ امرا اور دوسرے لوگوں کا ذکر۔ امید ہے کہ توفیق رفیق رہے گی۔

مقرب خاں اور اس کے نوکر کو سزا: ایک بیوہ عورت نے مقرب خاں کا شکوہ کیا کہ اس نے میری بیٹی کو بندر کھنبایت میں جبراً چھین کر گھر میں ڈال لیا ہے۔ میں مدت تک اس سے بیٹی طلب کرتی رہی آخر اس نے کہدیا کہ وہ مرگئی ہے۔ ہم نے یہ سنکر تفتیش کا حکم دیا۔ بڑی جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ اس تعدی کا بانی اور باعث مقرب خاں کا ایک نوکر ہے۔ ہم نے فرمایا کہ اسے سزا دی جائے۔ مقرب خاں کا نصف منصب کم کر دیا گیا اور اس ستم رسیدہ ضعیفہ کو مدد معاش اور زادِ راہ مرحمت فرما کر رخصت کیا۔

مادر کش کا قتل: موضع قاضیاں میں جو نواحِ اجین میں واقع ہے منزل ہوئی۔ اس جگہ آم کے درخت خوب پھیلے ہوئے تھے۔ ڈیرہ دریا کے کنارے کھڑا کر کے بڑی دلنشیں جگہ ترتیب دی ہوئی تھی۔ بہادر ولد غزنی خاں اس منزل میں سیاست کو پہنچا۔

ہم نے اس بے سعادت کو وفاتِ پدر کے بعد نواز کر قلعہ اور ولایت جالو جو اس کے آباو اجداد کی جگہ تھی مرحمت کی۔ جب وہ خورد سال تھا اس کی ماں بعض قبائح (بری باتوں) سے منع کرتی تھی۔ اس روسیاہ ابدو ازل نے چند ملازموں کے ساتھ گھر میں گھس کر اپنی مادرِ حقیقی کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ ہمیں یہ خبر پہنچی تو ہم نے اسے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب اس کا گناہ ثابت ہو گیا تو ہم نے فرمایا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

راجہ کے بیٹے کو سزا: راجہ بکرماجیت کا بیٹا کلیان گجرات سے آیا اس مفسد کے متعلق بہت سی بری باتیں ہمارے گوش گزار ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ اس نے ایک لوتی نام مسلمان عورت کو اپنے گھر میں ڈال لیا تھا اور اس امر سے خائف ہو کر کہ مبادا یہ بات شہرت پذیر ہو جائے اس کے ماں باپ کو قتل کر کے گھر میں درگور کر دیا تھا۔ ہم نے حکم دیا کہ اسے قید میں رکھا جائے تاکہ اس کے اعمال و افعال کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ تحقیق کے بعد ہم نے فرمایا کہ پہلے اس کی زبان کاٹی جائے اور تاعمر مقید رہے اور کھانا سگ بانوں اور حلال خوروں کے ساتھ کھائے۔ اسی دن کلیان کے بھائی موہن داس کو دو لاکھ روپیہ کا تحویلدار بنا کر احمد بیگ کے ساتھ افغانان بنگش کی تادیب کے لئے بھیجا گیا۔

احمد آباد میں معمولی دادرسی: جہانگیر نے دارالسلطنت آگرہ میں اپنے پہلے ہی سنہ جلوس میں چار من وزنی زنجیر طلائی جس سے ساٹھ عدد طلائی زنگ دگھنٹیاں پیوست تھیں دریا کے کنارے سے قلعہ کے شاہ برج تک لگوا کر مظلوم فریادیوں کے لئے دادخواہی آسان کر دی تھی۔ اگر کوئی ستم رسیدہ ماتحت گورنروں یا قاضیوں سے داد نہ پاسکتا تو آکر زنجیرِ عدل ہلاتا اور شہنشاہ سے انصاف پاکر واپس جاتا۔ جب یہ شہنشاہ دورے پر ہوتا تو وہاں بھی ہر شخص کو اجازتِ تظلم ہوتی۔ جہانگیر احمد آباد گجرات جاتا ہے اور اس شہر کی وہ جن الفاظ میں تعریف کرتا ہے وہ سننے کے لائق ہے۔

"ہم حیران ہیں کہ احمد آباد کے بانی کو جو خوبی اور لطافت منظور تھی کہ ایسی بے فیض سرزمین میں شہر آباد کیا۔ اس کی ہوا سموم زمین کم آب۔ ریگ بوم گرد و غبار بے حد۔ پانی بہت زبوں اور ناگوار۔ شہر کے قریب ایام برسات کے علاوہ رود خانے ہمیشہ خشک۔ کوئیں اکثر شور اور تلخ۔ اور سوادِ شہر میں واقع تالاب دھوبیوں کے صابون سے دوغاب (لسی) بنے ہوئے ہیں۔ امیر آدمیوں نے اپنے گھروں میں تالاب بنا رکھے ہیں جن کو بارش کے پانی سے بھر لیتے ہیں اور وہیں سے سال بھر آب نوشی کرتے ہیں۔ جس پانی تک ہوا نہ پہنچے اور بخار نکلنے کی راہ بند ہو اس کے مضرات ظاہر ہیں۔ شہر کے باہر سبزے اور باغوں کی جگہ تمام صحرا از قوم زار ہے اور جو نسیم کہ تھوہڑوں پر سے ہو کر آئے اس کا فیض معلوم۔ ع

اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

(یعنی میں ایسی خوبیوں والے شہر کو کس نام سے موسوم کروں)

ہم نے قبل ازیں احمد آباد کو گرد آباد سے موسوم کیا تھا۔ اب اس کا سموستان نام رکھیں یا بیمارستان کہیں یا زقوم زار یا جہنم آباد کے نام سے پکاریں۔ کیونکہ اس میں یہ سب صفات موجود ہیں۔ اگر موسم برسات مانع نہ ہوتا تو ہم اس محنت سرا میں ایک دن بھی نہ ٹھہرتے اور سلیمان وار ہوا کے تخت پر بیٹھکر باہر چلے جاتے۔ اور خلق خدا کو اس رنج محنت سے خلاصی دلاتے۔

احمد آباد کے لوگ بڑے ضعیف اور عاجز ہیں۔ ہم نے اس خیال سے کہ مبادا لشکریوں میں سے کوئی شخص لوگوں کے گھروں میں جاکر فقرا و مساکین کو ستائے اور قاضی و میر عدل لحاظ کی وجہ سے موافقت کریں اور مظلوم ظالموں سے عہدہ برآنہ ہو سکیں، یوم نزولِ اجلال سے حدت و حرارت کے باوجود، یہ معمول بنا لیا ہے

کہ ہر روز عبادت سے فارغ ہو کر دو پہر کو اس جھروکے میں بیٹھیں جو دریا کی طرف ہے اور در میان دروں دیوار اور یسا دل (نقیب) اور چوبدار کسی طرح حائل اور مانع نہیں اور بمقتضائے عدالت داد خواہوں کی فریاد سن کر ستم کیشوں کو ان کے جرائم اور تقصیرات کے مطابق سیاست فرمائیں۔ ہم نے ایام ضعف میں کمال درد والم کے باوجود جو اس شہر میں لاحق ہوا۔ بدستور معہود جھروکے میں بیٹھ کر اپنے لئے تن آسانی حرام رکھی ؎

بہر نگہبانیٔ خلقِ خدا — شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
از پے آسودگی جملہ تن — رنج پسندم بہ تنِ خویشتن

(یعنی خلق خدا کی نگہبانی کے لئے میں رات آنکھ نہیں لگاتا اور خلق خدا کی نگہبانی کے لئے اپنے وجود پر تکلیف گوارا کر لیتا ہوں)

اللہ کے کرم سے عادت ایسی ہو گئی ہے کہ رات دن میں دو تین ساعت سے زیادہ نیند میں وقت برباد نہیں کرتا۔ اس میں دو فائدے مدِ نظر ہیں۔ ایک حالاتِ ملک سے آگاہی اور دوسرا یادِ حق میں بیدار دلی حیف ہے کہ یہ چند روزہ عمر غفلت میں بسر ہو جائے حالانکہ خوابِ گراں (بعد مرگ) درپیش ہے۔ اس بیداری کو جو خواب میں بھی نظر نہ آئے گی۔ غنیمت جان کر ایک لمحہ بھی یادِ حق سے غافل نہ رہنا چاہئے ع

باش بیدار کہ خواب عجبے درپیش است"

(یعنی جسقدر ہو سکتا ہے جاگ لے کیونکہ پھر تجھے بڑی گہری نیند سونا ہے) اسی مفہوم کو کسی نے اردو میں اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

یہی وہ جہانگیر ہے جس کے متعلق متعصب لوگ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ شراب میں بدمست اور عیش و آرام میں مستغرق رہتا تھا آپ نے دیکھ لیا کہ جہانگیر انصاف کے معاملے میں کسی شہزادے اور امیر و وزیر کی پروا نہیں کرتا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کا پابند ہے کہ ظالم خواہ کتنا ہی بڑا ہو میرے سامنے بہت ہی حقیر ہے جب وہ ظلم کرے اور مظلوم خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو میری نظروں میں بڑا ہے جب اس پر ظلم کیا گیا ہو۔

بادشاہ کا درویشوں کی خدمت میں قیام۔ انصاف عدالت کا مجسمہ جہانگیر صرف مظلوموں ہی کی داد رسی نہیں کرتا بلکہ محتاجوں اور غریبوں کو دولتخانے میں بلا کر ان کی حاجت بر آری کرتا ہے اور خود ان کی خدمت میں کھڑا رہتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس کی اپنی تحریر:۔

روز مبارک شنبہ ۱۲ شہریور ماہِ الٰہی ۱۳ سنہ جلوس مبارک مطابق ۲۲ رمضان ۱۰۲۷ھ کو اڑھائی ساعت بخوبی گزرنے پر مبارک جھنڈے دارالخلافہ آگرہ کی طرف لہرائے۔ دولتخانہ سے تال کاکریہ تک جو روایاتِ اقبال کا محلِ نزول تھا۔ میں حسب دستور نثار کرتا ہوا چلا۔ اسی دن وزن شمسی کا جشن منعقد ہوا۔ سنہ شمسی کے حساب سے اس نیاز مندِ درگاہِ ایزدی کی عمر کا پچاسواں سال مبارک شروع ہوا اور مقررہ ضابطہ کے مطابق میں محل اور دوسرے اجناس سے تلا اور مروارید اور گل زریں نثار کئے اور چراغاں کا ملاحظہ کر کے رات حرم سرائے دولت میں عیش و عشرت میں بسر کی۔ بروز جمعہ بائیسویں تاریخ کو میں نے حکم دیا کہ تمام مشائخ اور ارباب سعادت کو جو اس شہر میں رہتے ہیں حاضر کرو تاکہ وہ میرے ساتھ روزہ افطار کریں۔ تین رات یہی معمول رہا۔ ہر رات مجلس کے آخر تک میں خود کھڑا ہو کر زبانِ حال سے کہتا تھا ؎

خداوندگارا تو نگر توئی — توانا و درویش پرور توئی
نہ کشور کشائم نہ فرماں دہم — یکے از گدایانِ ایں درگہم
تو بر خیر و نیکی دہم دسترس — وگرنہ چہ خیر آید از من بکس
منم بندگاں را خداوندگار — خداوند را بندۂ حق گزار

ترجمہ:۔ یا اللہ سب دولت و مال تیرا ہی ہے۔ تو ہی طاقت والا اور غریب پرور ہے۔ جہانگیر نہ فاتح ممالک ہے نہ بادشاہ بلکہ تیری درگاہ کا ایک فقیر ہے بھلائی اور بخشش کی توفیق تجھی سے ملی ہے اگر تجھ سے نہ ملتی تو میں نیکی کب کر سکتا تھا۔ مجھے بندے اپنا بادشاہ سمجھتے ہیں مگر میں تو تیرا ایک حق گزار بندہ ہوں۔

یہ رقت خیز مضمون پڑھ کر غور کرو کہ جہانگیر کس قدر علم منکسر المزاج اور درویش نواز بادشاہ تھا۔

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۳ء کے مضمونوں، افسانوں اور نظموں کی ایک مختصر فہرست اسی پرچہ میں کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں۔

لمعات

سوز کے ہاتھوں میں دل کا ساز ہے — ساری محفل گوش برآواز ہے
موت ہی میں زندگی کا راز ہے — عشق کا انجام اک آغاز ہے
کس کے شوقِ دید کی پرواز ہے — آسماں پر چشمِ انجم باز ہے
زمزمہ پرداز دل کا ساز ہے — سوز میں ڈوبی ہوئی آواز ہے
بے پروبالی نہیں ننگِ وجود — دل میں جبتک حسرتِ پرواز ہے
سابقہ ہے تلخئ انجام سے — اب کہاں وہ لذّتِ آغاز ہے
عشق کو چاکِ گریباں سے فروغ! — حُسن کو پردوں پہ فخر و ناز ہے
آرہی ہیں ہچکیوں پر ہچکیاں — صاف آوازِ شکستِ ساز ہے
آپ کی شانِ تغافل کی قسم! — جذبۂ دل پر مجھے بھی ناز ہے
سوزِ پیہم عشق میں ذوقِ سلیم — جُرأتِ رندانہ حرص و آز ہے

پارساؤں میں تو نیتّرؔ ہے ذلیل
مے پرستوں میں مگر ممتاز ہے

جنابِ نیتّرؔ امرتسری

حفظِ خودی

نویدِ عزم و عمل، مُردۂ مذاقِ نمود
سُراغِ جادۂ ہستی ہے گردِ راہگذار
مآلِ غنچہ و گلُ ناگزیر ہے لیکن
خودی کی موت سے ہے بند و بست بوم و زغن
خدا بچائے کہ مغرب کے خارزاروں میں
خراب و خستہ رہی ہے ازل سے تا امروز
حیات ضبطِ فغاں کے سوا کچھ اور نہیں

بدل رہا ہے خرد کا نظامِ زنگ آلود

از جناب آفسر احمد نگری

بدل رہا ہے خرد کا نظامِ زنگ آلود
اگر نگاہ سے اوجھل ہو منزلِ مقصود
نہ ہو ملولِ خزاں ہے بہار کا مقصود
خودی ہو زندہ تو دنیا فضائے لامحدود
سجا رہی ہے خرد بزمِ نادر و نمرود
وہ قوم جس پہ مسلط ہوئی بلائے جمود
بکاو نالہ کا دشمن ہے آسمانِ کبود

نہ ترجمانِ شبابی نہ رازدانِ شعیب
مری نوائے پریشاں ہے زندگی کا سرود

سمر ہل سے شملہ

دلگداز افسانہ

از جناب بیگ زادہ

یہ تو ناممکن ہے کہ آگ کے ساتھ تیل رہے اور نہ جلے۔ کوئلے انگاروں میں ملیں اور نہ سلگیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اور وہ ساتھ رہیں اور ہمارے دلوں میں محبت کی آگ روشن نہ ہو؟ وہ سکول میں پڑھتی تھی تو کیا ہم چھٹی کے بعد ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھتے تھے؟ اور اگر میں دفتر سے دیر میں آتا تو کیا تھا؟ اتوار کو تو ہماری چھٹی ہی ہوتی تھی۔ درست ہے کہ اس کی والدہ گھر میں رہتی تھی یہ بھی مانتا ہوں کہ اس کے والد اتوار کو دفتر نہیں جاتے تھے مگر ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ کیا کیوپڈ کو تیر مارنے کے لئے چند سکنڈ کافی نہیں ہوتے؟ صیاد کے سوا بے آواز تیروں کو چلتے ہوئے کون دیکھ سکتا ہے؟ یہیں تو قہقہے، مترنم آوازیں اور چوڑیوں کے لطیف نغمے صرف محبت کے زخم ہی پر نمک کا کام دیتے ہیں۔ پھر یہ کیسا غضب تھا کہ ہم دونوں ہی، دو مختلف ارادوں کے ساتھ۔ وہ سکول جانے کے خیال سے اور میں دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلتے اور سمر ہل سے شملہ تک ہمارا ساتھ رہتا۔

شروع شروع میں اس کے والد اس کے ساتھ جاتے رہے ہونگے لیکن میری قسمت، ایک شام مجھے مال پر ٹہلتے دیکھ لیا۔ زبردستی گھر لے گئے۔ اس کی ماں نے کہا۔ بیٹا! اپنا گھر ہوتے ہوئے "میس" میں ٹھہرنا کیا معنی؟ باپ بیٹی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور دوسرے دن سامان لاتے ہی بنی۔ "میس" چھوڑنے کا افسوس تھا لیکن کیا کیا جاتا؛ قہر درویش برجان درویش۔ ادھر "میس" اور اس کی ادبی فضا چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا اور ادھر ان مہربانوں سے کچھ کہنے سننے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مصرعہ اس سے جس کی شکل دیکھتے ہی کہنا پڑا تھا ؎

سفاک ہیں تیوریں بھی ہیں قاتل نظر بھی ہے
کیا ہو گئے ہو تم، تمہیں اسکی خبر بھی ہے

اول اول اس کے والد بھی ہمارے ساتھ جاتے رہے۔ آگے آگے وہ اس کے برابر میں کبھی الٹا۔ میں کبھی آگے، کبھی پیچھے۔ جیسے مناسب ہوتا۔ جب تک راستہ سونا اور سنسان رہتا پیچھے پیچھے چلتا۔ چھوٹے میدان سے آگے بڑھکر جہاں عام طور پر آمد و رفت زیادہ رہتی ہے آگے ہو جاتا۔ لیکن جلد ہی ان کی ڈیوٹی بدل گئی اور اب بادلوں میں چھپے ہوئے چاند اور مخمل میں لپٹے ہوئے اس حسین گلابی موتی کو سکول پہنچانا میرا فرض قرار دے دیا گیا۔ بتایئے اگر وہ اپنے سفید پیروں کو سیاہ سینڈلوں میں چھپالے۔ سیاہ نقاب اور کالے برقعہ میں اپنے گلابی چہرے اور متناسب بدن کو پوشیدہ کرلے تو اسے بادلوں میں چھپا ہوا چاند اور مخمل میں لپٹا ہوا موتی کہنے میں کیا ہرج ہے؟

(۲)

پہلے پہلے تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ جاتے ہوئے بھی شرم آئی اور چند دن تک تو یہ عالم رہا کہ میں چند قدم آگے اور وہ چند قدم پیچھے، نہ ہنسنا، نہ بولنا، نہ بات نہ چیت، جیسے ایک دوسرے کو جانتے ہی نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے محض بے تعلق ہوں۔ منہ چھپائے جلد جلد منزل مقصود پر پہنچنے کی دعائیں مانگتے لمبے لمبے ڈگ بھر اور راستہ جو بہت طویل معلوم ہوتا طے کرنے میں مصروف رہتے آہستہ آہستہ ہماری یہ بے تعلقی ختم ہو گئی۔ اس نے پیچھے پیچھے چلنے کی بجائے میرے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی اپنی شرارتیں اور سہیلیوں کے قصے بھی بیان کرنے لگی۔ انتہا یہ کہ وہ طویل راستہ جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا اور وہ لامتناہی وقت جو کسی طرح گذرتا نہ تھا آنکھ جھپکنے میں تمام ہونے لگا۔

میری سادہ زندگی میں بھی ایک شاعرانہ تغیر رونما ہونے لگا۔ دفتر میں جب مجھے کوئی کام نہ ہوتا تو آنکھیں بند کر کے ذہن میں اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا۔ سیاہ سینڈلوں میں پیروں کی جھلکتی ہوئی سفیدی، چلنے میں اٹھتے ہوئے پائنچوں سے بے پردہ ہوتے ہوئے ٹخنے اور جھانکتی ہوئی پنڈلیاں۔ برقعے میں سے دونوں سفید کافوری ہاتھ باہر۔ ایک ہاتھ سے چھتری سنبھالے دوسرے ہاتھ سے کتابوں کو سینہ سے لگائے ایک مستانہ تیز روی سے چلتا....

ایسی تصویر ہوتی ہی نہ ہوتی کہ کوئی مجھے جھنجوڑ کر جگا دیتا۔ اس دلچسپ وقفے میں جو میرے لئے صرف چند ہی سکنڈ کا ہوتا کچھ ضروری کام آجاتا جب کئی آوازیں دیئے جانے پر بھی ہوشیار نہ ہوتا تو جھنجوڑنا اٹھا دیا جاتا۔ لوگ میرے عجیب و غریب نام رکھتے کوئی "از خود رفتہ" کہتا کوئی "از دست رفتہ"۔

شاید میں حسن کے جادو سے مسحور ہو کر بیخود ہی ہو گیا تھا۔ اگر ایسا نہ تھا تو درختوں کے پتوں سے بارش کے پانی کی ٹپکتی ہوئی بوندیاں جو دفتر سے آتے وقت کپڑوں پر گرتیں میرے جذبات میں کیوں تلاطم پیدا کر دیتیں؟ میری زبان سے کیوں بے اختیار نکل جاتا کہ خدا کی قدرت دیکھو حلق خشک ہوتا ہے بادل، لیکن یہ پانی کی بوندیں جب بھی گرتی ہیں کپڑوں ہی پر گرتی ہیں۔

اب ہم کافی بے تکلف ہو گئے تھے اور ہماری بے تکلفی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ قدم ملا کے ساتھ ساتھ چلتے۔ آنے جانے والوں پہ ریمارک بھی پاس کرتے۔ ہنسی بھی اڑاتے اور جب راستہ سنسان ہوتا، تو ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی آرزوئیں دل میں لئے۔ ایک جوش کے ساتھ چلتے۔ وہ برقی رو جو ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑنے سے ہمارے بدن میں دوڑ جاتی ایک عجیب احساس اور ایک نہ بھولنے والی کیفیت کی مظہر ہوتی وہ ہیجان جو ایک رومان انگیز لمس کے بعد ہمارے جذبات میں پیدا ہوتا۔ اس پر ہمارے لئے یا کم از کم میرے لئے تو قابو پانا نہایت ہی مشکل ہو جاتا۔ سارا راستہ ختم ہو جاتا۔ وہ سکول پہنچ جاتی اور میں دفتر ــــ لیکن جذبات کا طوفان اسی طرح باقی رہتا۔

——— (۳) ———

پھر جب اسے دوسرے دن دیکھتا تو دل میں ایک خلش سی محسوس ہوتی۔ جب اس کے ہمراہ رواں ہوتا تو سینے میں ایک چبھن کا احساس کرتا اور جب اسے سکول کے دروازے پر چھوڑ کر روانہ ہونے لگتا تو منہ سے ایک سرد آہ نکل جاتی۔ یہ خلش جو محسوس ہوتی اور یہ چبھن جس کا احساس کرتا کیا یہ وہی نہ تھی جس کو شاعر یوں بیان کرتا ہے ؎

وہ آتے ہیں تو دل میں اک خلش محسوس ہوتی ہے
بتا اے ہمنشیں اس کو محبت تو نہیں کہتے

پھر یہ ملکیں ہی تو ہیں جنہوں نے اس محبت کو عشق اور ہیجان کو کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ شملہ کے رہنے والے خوب جانتے ہیں کہ کھلے ہوئے موسم میں گلین (ڈنگ گھاٹی) کیسی تفریح کی جگہ ہوتی ہے۔ سرسبز وادی میں رنگ رنگ کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت چشمہ کے دونوں کناروں پر سبزہ۔ سامنے پہاڑی پر نظر ڈالئے تو سارا پہاڑ مخمل پوش۔ اگر میدان کو دیکھئے تو کچھ عجیب ہی منظر گھاس کی یہ حالت کہ اگر ننگے پیر پھرو تو ایسا معلوم ہو کہ سبز قالین کے فرش پر چل رہے ہو۔ صاف پانی پر جھکے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے گویا ماہر آئینہ دیکھنے میں مشغول ہیں۔ پیچ کھاتی اور لہراتی ہوئی پگڈنڈیاں۔ درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں شملہ کی خنک اور مستی بھری ہوا۔ جگہ جگہ سے سوتوں سے رستا اور پتھروں سے ٹپکتا ہوا پانی۔ تمام روکوں سے آزاد اور تمام بندشوں سے بے پروا۔ ایک جنون اور ایک جوش کے ساتھ کوہ کو بھرتا۔ پتھروں سے گر گر کر جھرنے اور آبشار بناتا محبوب سے ملنے کی دھن میں بہتا چلا جاتا ہے۔

——— (۴) ———

یہی تو وہ دلفریب جگہ تھی جہاں ہمارے رومانی دن گذرتے کسی خوشبودار جھاڑی کے سائے میں کسی صاف سے پتھر پر گھٹنوں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ چشمہ کا صاف پانی ہمارے پیروں کو چومتا ہوا گذرتا۔ ہلکی ہلکی دھوپ پتوں سے چھن چھن کر ہمارے اوپر پہنچتی خنک ہوا فضا کو گرم بھی نہ ہونے دیتی اور اس کے جھاڑی سے ٹکرا ٹکرا کر گذرنے سے ہمارے اوپر جنگلی پھولوں کی بارش ہو جاتی۔ ہوا کے زور سے پتے ایک دوسرے سے ایسے ٹکراتے جیسے اس خوشی میں وہ بھی ہمارے شریک ہوں اور تالیاں بجا بجا کر داد دے رہے ہوں دور سے کسی "پکنک" پارٹی کے گانے والوں کی درد بھری آوازیں آتیں اور ایسا سماں بندھتا کہ ساری کائنات مست ہو جاتی کوئل اور پپیہے وجد میں آ کر کو کو اور پی پی کرنا بھول جاتے۔ پانی اپنی روانی اور درخت اپنا جھومنا بند کر دیتے پھر مستی بھری ہوا بھی ساکت ہو جاتی۔

——— (۵) ———

ہاں! یہی تو وہ وقت ہوتا جسے شاعر جوانی کی بہار کہتے ہیں یہی تو وہ سکوت ہوتا جس میں صرف عاشق اور معشوق کے دلوں کی دھڑکن ہی خلل انداز ہوتی ہے اور یہی وہ موقع ہوتا جب ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے ہونٹ ایک دوسرے کو محبت کا پیغام "نہیں نہیں محبت کا ہدیہ" پیش کرتے ہیں۔

ہمارا واپسی کا راستہ بہت [illegible] تھا۔ ایک طرف اونچا پہاڑ دوسری طرف نیچے گہری کھڈ۔ بیچ میں ایک پتلی سی پگڈنڈی۔ چھوٹے چھوٹے پودوں اور شاداب درختوں کی شاخوں کی اس قدر کثرت کہ اس تنگ سے راستہ پر بھی چلنا مشکل ہو جائے رفتن نہ پائے ماندن اگر قدم ذرا بہکیں تو گرنے والے کا پتہ نہ چلے۔ کفن دفن تو کیا۔ کوئی رونے اور پھول چڑھانے والا بھی نہ ہو۔ مرتے کیا نہ کرتے گھر واپس جانا بھی ضروری تھا۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے خدا کا نام لے کر چل کھڑے ہوئے۔ اس دلچسپ تفریح کے بعد جس کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی اور اس خوشگوار سانحہ کے بعد جس کی شیرینی اس وقت بھی ہونٹوں پر تھی اور اب بھی ہے اس راستے کو طے کرنا ایک عجیب سی بات تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنتی پل صراط کو طے کر کے بہشت میں داخل ہوں گے مگر اس کے برعکس ہم دونوں جنت کے مزے لوٹ کر پل صراط پر سے گذر رہے تھے۔

شاید خدائے واحد کو ہمارا یہ طرز عمل پسند نہ آیا تھا۔

اگر میں ہندو یا قدیم یونانی مذہب کہ جس میں ہزاروں دیوتاؤں کی پوجا کا تصور ضروری ہے ماننے والا ہوتا تو اس سے کہتا۔ "آ اے میری پیاری ادھر آ، ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں۔ پھر ایک ساتھ اس پہاڑ پر سے کود پڑیں۔ اور عشق کے دیوتا پر قربان ہو جائیں۔ عشق کا دیوتا خوش ہو کر نہ صرف ہمارے گناہوں کو معاف کرا دے گا بلکہ ازلی چین اور ابدی مسرت بھی بخشوائے گا۔"

"دیوار ہم گوش دارد" شاید درست نہ ہو لیکن سمرپل سے چلتے جاتے ہوئے راستہ میں پڑنے والا "آرام گھر" جہاں آتے جاتے مسافر بیٹھ کر دم لیتے ہیں۔ جہاں شام کو تفریح کرتے ہوئے حسین جوڑے ذرا سستا کر سینما جانے کا پروگرام بناتے ہیں۔ جہاں سکول سے آتی ہوئی لڑکیاں اور دفتر سے لوٹتے ہوئے بابو اچانک آنے والی بارش سے بچنے کے لئے پناہ لیتے ہیں اور جہاں چھپتے چھپاتے پہاڑنوں کو لائٹین کے سگرٹ اور پیڈرو کی ڈبیاں پیش کی جاتی ہیں۔ ہماری محبت کا رازدار ضرور تھا۔ اس نے بیسیوں مرتبہ ہماری محبت کی گفتگو سنی تھی۔ بیسیوں مرتبہ ہمیں پہلو بہ پہلو بیٹھے مناظر قدرت کا لطف لیتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ ہمارے اعتراف محبت کو بھی نہ بھولا تھا۔

جب ہم گھر سے چلے تو مطلع ابر آلود تھا۔ تھوڑی دور جانے [illegible] بوندیاں بارش کی جلو میں لئے آ پہنچیں [illegible] تھا کہ ادھر آگے بڑھے تھے کہ بارش تیز ہو گئی اور پھر بہت تیز۔ چھتریاں کب تک پناہ دیتیں آخر اس آرام گھر میں پناہ لینی پڑی۔

ایک تو شملہ کی ٹھنڈک دوسرے موسلا دھار بارش۔ پھر دو جذبات بھرے دلوں کی تنہائی۔ ہم سے خاموش نہ رہا گیا۔ کبھی شملہ کے موسم کا ذکر ہوا۔ کبھی نیچے وادی کے سرخ سرخ مکانوں! اور سرسبز درختوں کا۔ کبھی پتوں پر پڑے ہوئے پانی کے قطروں کا جو اچانک دھوپ نکل آنے سے چمکنے لگے تھے۔ پگھلی ہوئی چاندی سے تشبیہ دی اور کبھی سامنے والی پہاڑی جو پہلے دھوپ سے چمک رہی تھی اور اب کالے کالے بادلوں میں چھپ گئی تھی گفتگو کا موضوع ٹھہری غرض بہت دیر تک یونہی بات چیت کرنے کے بعد جب گل و بلبل کا ذکر آیا اور ان کے تعلق پر بحث ہوئی تو مجھے کہنا پڑا ؎

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں؟

یہ گلین ذنگ گھاٹی جانے سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے۔

اگر ایسا ہوتا کہ ہم محبت [illegible] اور [illegible]
اسی طرح ایک دوسرے کی محبت میں چور رہتے۔ یہاں تک کہ وہ آخری وقت آجاتا جب ہم پہلو بہ پہلو بیٹھے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جان، جانِ آفریں کے سپرد کرنے کے لئے تیار ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اگر یہ سب ممکن نہ تھا اور یہ پُر مسرت گھڑیاں محض ایک خواب ہی تھیں تو ہمارا ہمیشہ ہی نیند میں مدہوش رہنا کتنا پیارا اور کیسا بھلا ہوتا۔ ہائے افسوس! اس فانی دنیا میں دوام نہیں خوشی کی یہ گھڑیاں اور مسرت کی یہ چند ساعتیں کتنی جلد گذر گئیں۔ اب رنج کی گھٹائیں اور غم کے بادل تلے گھر رہے ہیں۔ مہینہ کی پہلی ہو چکی دفتر کے دہلی جانے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا۔ کون جانے اگلے سال شملہ آسکوں یا نہ آسکوں؟ ہم آئندہ زندگی میں پھر کبھی ملیں یا نہ ملیں؟ اب فراق کا لا متناہی زمانہ —— زمانہ ہی نہیں تمام زندگی کی رو رو کر گذارنے اور تڑپ تڑپ کر تمام کرنے کے لئے باقی ہے

کیا یہی ہے محبت کا انجام؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کریں؟ کاش! محبت سے پہلے ہی انجام پر غور کیا ہوتا۔ اگر ایسا نہ کر سکے تھے تو "لیلیٰ" کی پگڈنڈی پر سے گر کر مر گئے ہوتے۔ آہ! ہم ہندوستانی عاشق نہ مرنا جانتے ہیں نہ محبت کو بھول سکتے ہیں!

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم اس قدر سست کیوں رہتے ہو۔ تمہارے چہرے کا رنگ زرد کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ تمہاری وہ اگلی شوخیاں کیا ہوئیں؟ تمہاری اس اداسی کا سبب پہلے تو میں یہ سب کچھ سن کر خاموش ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہنس دیتا تھا۔ اور بات کو ٹالنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن آج اس راز کو جسے ہمیشہ سینے کے پردے اور دل کی تہوں میں چھپائے رکھا بے نقاب کر دیا ہے اور وہ بھی ایک موہوم سی امید پر ——!

شاید کسی پڑھنے والے کی دعاؤں کی صدقے میں گوہرِ مقصود کو پالوں ——!

غزل

زندگی کی آرزو باقی نہیں!

از جناب سید اکبر عباس بہار نپوری

دل میں کوئی آرزو باقی نہیں — زخم ہے لیکن لہو باقی نہیں
کھل گیا دُنیائے فانی کا فریب — وہ طلسمِ رنگ و بو باقی نہیں
جی رہے ہیں موت کی اُمید میں — زندگی کی آرزو باقی نہیں
مل گئے وہ گوشۂ دل ہی میں — اب تلاشِ چار سو باقی نہیں
شوق کو یہ ضد کہ ان سے کچھ کہیں — اور تابِ گفتگو باقی نہیں
ہو بھلا ساقی کی چشمِ مست کا — حسرتِ جام و سبو باقی نہیں
اب تو اکبرؔ ہم ہیں جویائے خودی
اب کسی کی جستجو باقی نہیں

جذباتِ فضا

خوابِ راحت میں ہیں مست محوِ سرِ بام ابھی — نالہ ہے عاشقِ شوریدہ ترا خام ابھی
گوشۂ دل میں تمنائیں جو تھیں چونک اٹھیں — چپکے چپکے سے لیا کس نے مرا نام ابھی
ادبری تیرگیٔ بخت پہ ہنسنے والے — تو نے دیکھی ہی نہیں گردشِ ایام ابھی
پسِ پردہ ہی رہے عشوۂ آغازِ شباب — یوں نہ آراستہ ہو تو سحر و شام ابھی
دعویٔ زہد پہ بھی حسن پرستی نہ گئی — زیبِ آغوش ہے اک شاہدِ گلفام ابھی
لطف فرمانہ سہی محوِ تغافل نہ سہی — مجھکو ہے شکوۂ محرومیٔ پیغام ابھی
بارہا دیکھ چکے جلوۂ حسنِ دلکش — آنکھ ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
آشکارا کیا کیوں رازِ اناالحق کہہ کر — عشقِ منصور سرِ دار تھا کیا خام ابھی
تیرے جلوؤں سے ہے رنگین مری صبحِ امید — تیرے گیسو سے مہکتی ہے مری شام ابھی
گر ہوں آغازِ محبت ہی سے مجروحِ الم — اپنے دل میں ہے فضاؔ کاوشِ انجام ابھی

از سید دل محمد فضا جالندھری

کہانی ہماری

سُنے گا کوئی کیوں کہانی ہماری — ہماری کہانی، زبانی ہماری
اُدھر ہے نگاہوں کی جادو بیانی — ادھر ہے فقط بے زبانی ہماری
اُمنگیں دلوں میں تمہارے ہمارے — جوانی تمہاری جوانی ہماری
جوانی کی راتیں محبت کی باتیں — یہی تو ہے بس زندگانی ہماری
اشاروں پہ چلتے رہے ہم تو تیرے — مگر ایک بھی تو نے مانی ہماری؟
رہی دل کی دل میں نہ ارمان نکلے — کٹی ہجر میں زندگانی ہماری
مٹایا ہمیں اب نہ دل کو مٹاؤ — رہے کچھ تو قائم نشانی ہماری
نہ دھو داغِ خوں اپنے دامن کا پیارا — یہی آخری ہے نشانی ہماری
جو بیدار [illegible] — [illegible] زندگانی ہماری

از جناب بیدار کانپوری

ترکی اور مغربی رجحانات

مقالہ

ترجمہ از جناب سیّد حسین رضوی بی اے

اگر ہم انگریزی اور جرمن نظامِ حکومت کو اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ان دونوں قوموں کی تاریخ کا مطالعہ لابدی ہے کیونکہ دورِ حاضرہ کا پیچیدہ نظامِ حکومت مرورِ زمانہ کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے جب تک ہم تاریخی پس منظر سے واقف نہ ہو جائیں۔ موجودہ تمدّن و معاشرت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہر نظامِ حکومت در اصل کسی سیاسی، تمدنی اور مذہبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک مرقع ہوتا ہے اور یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے اتنا قریب کا تعلق رکھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

اس چیز کا بہترین نمونہ ہم کو ترکی میں ملتا ہے جہاں مذہب اور سلطنت ایک واحد شخصیت یعنی سلطان کے اندر مرکوز ہو گئے تھے۔ اسلام میں دنیوی اور مذہبی منصب ایک واحد ادارہ ہے اسلام مذہب عیسوی کے برخلاف نہ صرف اپنے پیروؤں کی مذہبی زندگی میں بھی اسی کا اثر جاری و ساری ہے۔

ہر شخص اس بات کو جانتا ہے کہ جب ترکی کے اندر یکایک انقلاب ہوا تو تمام اسلامی دنیا انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی ترکوں کی زندگی میں یہ کتنا بڑا انقلاب تھا کہ انہوں نے اپنے ماضی کے معمول کو توڑ ڈالا اور قدیم روایات کو یکے بعد دیگرے چھوڑتے چلے گئے ان تمام واقعات اور انقلابات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اور گذشتہ چند برسوں میں ترکی کی ترقی کے لئے یہ بہت کچھ مناسب ہوگا کہ ترکی کی قبل اور بعد از جنگ عظیم کی حالت کا نقشہ پیش کر دیا جائے۔

قبل اس کے کہ ترکی میں مذہب کی حیثیت کو واضح کیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ گذشتہ صدی کے دوران میں مذہب کی جو حالت دوسرے اسلامی ممالک میں پائی جاتی تھی اس پر ایک نظر ڈالی جائے جہاں تک مذہب کی حالت دوسرے اسلامی ممالک میں پائی جاتی تھی اس پر ایک نظر ڈالی جائے جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ترکوں نے اسلام کی اصلاحی تحریکات میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا اور نہ انھوں نے بذاتِ خود کسی تحریک کی بنا ڈالی جتنی بھی اصلاحی تحریکات تھیں وہ دوسرے ممالک میں شروع ہوئیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں علامہ جمال الدین افغانی کو ایک تحریک کی رہبری کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ علامہ مرحوم پان اسلامزم کے مبلغ تھے ان کا مطمعِ نظر یہ تھا کہ قدیم روایات کو ترک کیا جائے اور ان کی بجائے لبرل ادارے قائم کئے جائیں تاکہ ان کے ذریعہ اسلام اور اسلامی ممالک کو حیاتِ نو میسّر ہو سکے ہندوستان میں جو تحریک شروع ہوئی اس میں پیش پیش ہستی سر سیّد احمد خاں مرحوم کی تھی ان کا اور ان کے احباب کا یہ خیال تھا کہ حقیقی اسلام موجودہ تمدّن اور معاشرت کا دشمن نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ اجتہاد میں تھا نہ کہ تمدّنِ ماضیہ کی اندھی تقلید میں۔ مصر میں اصلاحی تحریک کا تعلق محمد عبدہٗ سے تھا۔ جو ۱۸۹۹ء سے وہاں کے مفتی اعلیٰ تھے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے انہوں نے اور ان کے پیروؤں نے تقلید کی حد درجہ مخالفت کی اور بالآخر وہ مصر میں اجتہاد کو جو قرآن کریم اور سنت کی تعلیم پر مبنی تھا پھر سے داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے ان کا رسالہ "المنار" اب تک مصری تخیلات پر کافی اثر ڈال رہا ہے۔

یہ واقعہ کہ ترکوں نے اصلاحی تحریکات میں نسبتاً بہت دیر میں حصہ لینا شروع کیا اس وجہ سے اور بھی تعجب خیز ہو جاتا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے اسلامی ممالک میں اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے اور باوجود اس کے بے پرواہ تھے اس کی ایک وجہ اس واقعہ میں مضمر ہے کہ فطرتاً ترکی نسل بہ نسبت نظری ہونے کے زیادہ عملیت پسند واقع ہوئی ہے اور ان کو فلسفیانہ تصورات اور منطقی ذہنیت کی وہ نعمت میسّر نہیں جو صرف عربوں کا حصہ ہے اس کے علاوہ اسلام کی مذہبی ترقی میں بھی ترکوں کا کچھ حصہ نہیں۔ کیونکہ جب انھوں نے اسلام

قبول کیا اس وقت تک وہ ایک کامل مذہبی نظام کی حیثیت سے ترقی پاچکا تھا۔ اس کے بالکل برعکس ترکوں نے یورپی تمدن اور مادی ترقیات میں ضم ہونے کی کوشش کی۔ مغربیت کی تحریک ان کے ہاں عسکری نقطۂ نگاہ کی وجہ سے پیدا ہوئی کیونکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ مغرب کی عسکری برتری کے سامنے نیچا نہ دیکھیں مغربی ملاپ Impact of the West کو ٹائن بی Co Toynbee نے اپنی کتاب "ترکی" میں بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جیسے جیسے ترک یورپ کے اثر میں آتے گئے ویسے ویسے نوجوان ترکوں اور اسلام کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی۔ یہی وہ چیز تھی جو بیسویں صدی کی ابتدا میں صحیح معنوں میں ظہور پذیر ہوئی۔ اسی کو ترک مغربیت Occidentalism کہتے ہیں یہ صرف یورپ کی اندھی تقلید تھی جس میں روحانیت کا پتہ نہ تھا نوجوان ترک جو یورپ میں ایک خاص طور سے پیرس میں تعلیم پا رہے تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ترکی کو یورپ کے سانچے میں ڈھال دیا جائے اور قدیم روایات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔

ترکوں کی اس فوری مغرب پرستی کی بہترین مثال ہم کو جنگ عظیم سے قبل کے مشہور ترکی انشا پرداز احمد حکمت کی کتاب "ضمیر العتیجا" میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں ایک نوجوان ترک کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو پیرس سے اپنی تعلیم ختم کرکے وطن واپس ہوتا ہے۔ نوجوان ترک مشرقی ماحول بالکل غیر مانوس معلوم ہوتا ہے اور وہ اس میں ایک بے چینی محسوس کرتا ہے۔ احمد حکمت بہت پُر لطف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح سے نوجوان اپنے پورے گھرانے کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے ابتداً وہ ملازمین کو وردی پہناتا ہے اور باورچی کو فرانسیسی کھانے پکانے کا حکم دیتا ہے۔ حرم کے طریقہ کو ترک کرکے اپنی بھولی بھالی بچی کو مغربی راستہ پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ پورے گھر کے اندر ایک طوفان عظیم برپا ہو جاتا ہے جب اس کے بوڑھے چچا کے لئے یہ سب تبدیلیاں ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں تو وہ بھتیجے کو ایک نصیحت آمیز لکچر دیتا ہے اور مشرقی اور مغربی میں بنیادی فرق سمجھاتا ہے۔ سزا کے طور پر نوجوان کو ایشیائے کوچک کے شمال مغربی حصہ کے ایک مقام سنگلداک کو کوئلے کی ایک کان میں کام کرنے کے لئے بھیج دیتا ہے۔ پانچ سال کے بعد نوجوان سنگلداک کے ماحول سے متاثر

ہوکر وطن واپس ہوتا ہے تو سارا مغربیت کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے
دوسری وجہ جس کی بدولت ترکی تیز رفتاری کے ساتھ مغربیت کی طرف بڑھا وہ سلطان عبدالحمید کے چونتیس سالہ دور حکومت کی سخت گیر اور دہشتناک پالیسی تھی۔ سلطان انتہا سے زیادہ تنگ نظر اور پرانے خیال کے حامی تھے۔ اور اسی بنا پر نوجوان ترکوں، اور کٹر ملاؤں کے درمیان کسی قسم کا بحث مباحثہ ممکن نہ تھا بنا بریں مصالحت کے جتنے امکانات تھے وہ ختم ہو گئے اور اس کا نتیجہ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سلطان نے ملک کو ایک نیا دستور دینے کا اعلان کیا۔ لیکن چونکہ اپنا وعدہ ٹھیک طرح پر ایفا نہ کر سکے اس لئے ان کو ۱۹۰۹ء میں تخت سے معزول کر دیا۔ اس زمانے سے پھر ان تمام مذہبی مسائل پر جو سلطان عبدالحمید کے زمانے میں دبا دئے گئے تھے۔ بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ جنگ عظیم کے شروع ہونے کی وجہ سے یہ مسائل کسی قسم کا مزید نشوونما نہ پاسکے۔ کیونکہ جنگ نے ترکوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو زمانے کی رفتار سے چلائیں۔

ترکی میں تین نمایاں جماعتیں پائی جاتی تھیں ایک قدامت پسندوں کی جماعت تھی۔ جو قدیم روایات میں اصلاح یا ترمیم و تخفیف کی مخالفت کے لئے ہر طرح سے آمادہ تھی ان کا مطمح نظر تھا کہ ہر قربانی پر اسلام کی اسی پرانی شوکت کو برقرار رکھا جائے جو اب تک ترکی کے اندر پائی جاتی تھی۔ اس جماعت کے اثرات سلطان عبدالحمید کے بعد زائل ہونے لگے تھے یہاں تک کہ انقلاب ۱۹۰۸ء کے بعد وہ معدوم ہو گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دو بڑی طاقتور جماعتیں ترکی میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھیں ایک قومی جماعت اور دوسری اصلاحی جماعت، قومی جماعت کے رہنما مشہور فلسفی شاعر ضیا گوک الپ تھے اور دوسری جماعت کے محمد عاقف اور وزیر اعظم سعید حلیم پاشا تھے۔ پہلی جماعت سیاسی تھی اور دوسری مذہبی۔ جہاں تک مذہبی مسائل کا تعلق ہے یہ بہت دلچسپ بات تھی کہ یہ دونوں جماعتیں ایک عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتی رہیں۔ دونوں نے فی زمانہ اسلام کی حالت کو قبول نہیں کیا کیونکہ یہ اتفاقی ترقیوں کا نتیجہ تھا ان کی خواہش تھی کہ وہ ترکی کو اپنے [illegible]

پیغمبر صلعم کے زمانے کا اسلام دکھیں اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے اس زمانہ کی شریعت اور اسلامی قانون کو بالکل رد کر دیا اور یہ کوشش کی کہ اجتہاد پھر سے زندگی کا ایک جزو لاینفک بن جائے دونوں گروہ وسیع معنوں میں زمانہ کا ساتھ دینے کے مدعی تھے اور ان کا مسلک بھی ایک ہی "اسلام لاشمک" یعنی اسلام پسندی تھا۔ لیکن دونوں گروہ نے اس لفظ کے معنی کی تعبیر اور سیاسی اہمیت مختلف نقاط نگاہ سے کی اور یہی ان دونوں جماعتوں کے اندر تفریق کا باعث ہوا۔

قومی جماعت کا پروگرام تین مقاصد پر مشتمل تھا یعنی "ترک نوازی" اسلام پسندی اور رفتار زمانہ کا ساتھ اسلام پسندی سے قوم پرست ترکوں کا مطلب اس اسلام کی پیروی تھی جو اپنی ابتدائی حالت میں عرب میں پایا جاتا تھا اور جو بعد کی تبدیلیوں سے پاک تھا۔ ان کے نزدیک ہر مذہبی چیز کی بنیاد قرآن کریم تھا۔ لیکن ان کے پروگرام کا اہم حصہ سیاسی اور معاشری تھا۔ ان کی نظر میں سلطنت کا تخیل دوسرے تمام تخیلات پر حاوی تھا۔ قومی تخیل دراصل ان کے خیالات کا مرجع تھا۔ اسلام صرف مذہبی زندگی کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جن قوم پرست ترکوں نے مذہب کو ایک محدود دائرے میں مقید کر دیا تھا یعنی یہ کہ مذہب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قوم کی دنیوی اور سیاسی زندگی پر بھی اپنا اثر ڈالے۔ انہوں نے مذہب اور سلطنت میں کلیتہً تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی ان کا نصب العین یہ تھا کہ حکومت مکمل طور پر دنیوی ہونی چاہئے نہ کہ مذہبی۔

اس کے برعکس اصلاحی جماعت کا مطمع نظر صرف "اسلام لاشمک" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابتدائی زمانے میں جو اسلام کی حالت تھی اس پر عمل کیا جائے اور ان تمام خیالات کو اسلام سے خارج کر دیا جائے جو مرور زمانہ سے اس کے اندر داخل ہو گئے تھے اور جنھوں نے اسلام کی سادگی اور نفاست کو برباد کر دیا تھا۔ اس چیز نے انہیں مجبور کیا کہ وہ فقہا کی کج بحثی کو ترک کر کے اجتہاد پر عمل کریں۔ اور ہر مسئلہ کا تصفیہ اجماع کی روشنی میں اپنے ماحول کے لحاظ سے کریں۔ اسلام لاشمک کو اپنے پروگرام کی بنیاد بنا کر انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام میں دنیوی اور مذہبی دائرے علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں ان کے لئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ظہور کا لازمی ذریعہ اور منبع صرف اسلام تھا۔

جنگ عظیم کے اثرات سے ترکی بھی نہ بچ سکا اور اس کو جنگ میں شریک ہونا پڑا لیکن جنگ میں ترکی کا بہت نقصان ہوا اور وہ بالکل بے دست و پا متحدین کے رحم و کرم پر پڑا ہوا تھا ترکی مختلف مصائب سے گذرتا ہوا یہاں تک کہ صلح نامہ لوزان ۱۹۲۳ء کی بدولت اس کے چھینے ہوئے حقوق پھر واپس مل گئے اور وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پھر دنیا کے سامنے نمودار ہوا۔

صلح نامہ لوزان پر دستخط کر کے ترکی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اپنی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ ترکی بنا اور اس کی پوری قومی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑ گئی اب اس کو اپنی تنظیم کرنی تھی۔ اور اپنے کو اس قابل بنایا تھا کہ ایک ترقی یافتہ قوم کی حیثیت سے ہر خارجی طاقت کا مقابلہ کرے۔

یہ ایک مرتبہ پھر ہمیں ترکی جدید میں مذہب کی نوعیت کی طرف واپس لاتی ہے۔ اس سے تو آپ واقف ہو گئے ہیں کہ زمانہ سابق میں ترکی ایک مذہبی سلطنت تھی سلطان ترکی بہ حیثیت بادشاہ کے ۲ کروڑ ترکی باشندوں کا حکمران اور اپنے مذہبی منصب کے اعتبار سے ۳۰ کروڑ مسلمانوں کا خلیفہ تھا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح سے قومی جمعیت انگورہ کے ایک قانون کی رو سے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو سلطان کے منصب کو ختم کر دیا گیا نئے منتخب شدہ خلیفہ عبدالمجید آفندی صرف مذہبی سردار تھے۔ انہیں امور حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

قسطنطنیہ پر سے خارجی اقتدار ہٹائے جانے کے بعد ۹ اکتوبر کو ترقی جمہوریہ کا اعلان ہوا اور قومی مجلس اعلیٰ کی ایک قرارداد کی رو سے مصطفےٰ کمال پاشا کو بہ غلبہ آرا جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا مارچ ۱۹۲۴ء کے ایک اعلان کی رو سے نام نہاد منصب خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ مذہب اور سلطنت کے درمیان تفریق پیدا کر دینا قوم پرست ترکوں کی ہمت اور جوانمردی کی ایک بین دلیل ہے اس جرأت کا اندازہ ٹھیک طور پر وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جو یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کس طرح صدیوں سے ترکی سلطنت اور اسلام ایک دوسرے میں ضم ہو گئے تھے اور یکایک ان میں علیحدگی پیدا ہو گئی اس حیرت انگیز واقعے کی وجہ سے عام طور سے یہ پیشگوئی کی جاتی تھی کہ ترکی کو اسلامی دنیا کی رہبری کا جو شرف حاصل تھا وہ اب باقی نہیں رہیگا۔ لیکن یہ غلط ثابت ہوا پہلی مرتبہ ہم ترکی کے اندر

ایک ایسی حکومت چاہتے ہیں جو کلیتہً قومیت پر مبنی ہے مذہب اب بھی موجود ہے لیکن وہ صرف ذاتی عقائد کی حد تک ہے۔ حکومت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اب ہم جدید ترکی میں اسلام کی حالت پر بحث کریں گے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ترکی کے اس فوری انقلاب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا کوئی واقعہ ابتک اسلامی اور عیسوی دنیا کے سامنے پیش نہیں آیا تھا۔ ترکی جمہوریہ بن گیا، خلافت ختم ہوگئی سلطنت اور مذہب میں تفریق پیدا ہوگئی۔ مدارس میں سے مذہبی عناصر کو کلیتہً نکال دیا گیا، درویشوں کے گروہ کو فنا کر دیا گیا۔ یورپی لباس اور لاطینی رسم الخط داخل کیا گیا، جمعہ کے بجائے اتوار کو تعطیل ہونے لگی۔ عورتوں کو بالکل آزادی دیدی گئی غرض ہر شعبہ زندگی میں ایک تغیر رونما ہوا ان تمام تبدیلیوں کو ایک زندہ قوت کے طور پر موجودہ ترکی جاکر دیکھا جاسکتا ہے

یہ ہم کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ترکی رہنماؤں نے جو کچھ کیا وہ سیاسی ضروریات کے ماتحت کیا۔ ۱۹۲۳ء کے چند برسوں بعد تک تو حالت بہت غیر اطمینان بخش تھی۔ تمام تبدیلیاں جو ترکی میں ہوئیں ان کا صرف ایک مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے کم سے کم عرصہ میں قوم پرست جماعت کے لائحہ عمل پر عمل پیرا ہو کر ترکی کو ایک ترقی یافتہ اور موجودہ تخیل کے لحاظ سے مہذب سلطنت بنا دیا جائے۔ ترکی کے متعلق اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں غیر مذہبی حکومت ہوگی اگر ہم اسلام کے وہی معنی سمجھتے ہیں جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد سے ایک عجیب صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا رہا تو یقیناً ترکی کے غیر مذہبی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی لیکن اگر ہم ترکی کو ان احکام کی روشنی میں دیکھیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔ تو ہم کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ علمائے اسلام کا فتوے ترکی کے متعلق غلط تھا۔ تمام اصلاحات جو ترکی میں عمل کی گئیں ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو دور کر کے حقیقی اسلام کی حفاظت کیجائے بدقسمتی سے کٹر مسلمان ابتدائی اسلام اور بعد کے اسلام میں امتیاز نہ کر سکے اور اسی وجہ سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکوں نے ہر اسلامی حکم کی خلاف ورزی کی۔ لیکن دراصل ترک اسلام ترکوں کا کبھی مقصد نہ تھا۔ اب بھی ترکوں کا مذہب اسلام ہے لیکن اصلاحات کے ذریعہ انہوں نے صرف اتنا کیا ہے کہ بعد کے اسلام کے اندر سے خرابیاں دور کر کے اسلام کو اسی حالت پر لے آتے ہیں جس کی تعلیم پیغمبر صلعم دی تھی ترکی کے دستور کے دستور کے دفعہ (۲) میں صاف لکھا ہوا ہے کہ "ترکی سلطنت کا مذہب اسلام ہے، سرکاری زبان ترکی ہے اور حکومت کا دارالسلطنت انگورہ ہے" اب اس سے بڑھ کر ترکی کے اسلامی سلطنت ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ تمام اصلاحات فوری اور مصنوعی طور پر کی گئیں اس لئے نہ تو ان میں اعلیٰ صفات ہونگی اور نہ ان میں استقلال ہوگا اس کا جواب صرف یہی ہے کہ اب تک تو کوئی خرابی پیدا ہوئی نہیں ہے یہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ترکی کے نفسیاتی اور مذہبی انقلاب کی بنیادیں زمانہ دراز سے کھڑی کی جارہی تھیں۔ ترکی کے مغربی ممالک سے گہرے تعلقات پیدا ہو چکے تھے اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہر شعبہ زندگی میں یورپی اثرات کارفرما تھے۔ جنگ عظیم نے صرف ان کو تکمیل کو پہنچا دیا۔ نئی تبدیلیوں سے ملک کا ہر باشندہ یہاں تک کہ اناطولیہ کے دور دراز کے قصبات بھی متاثر ہو چکے ہیں عوام ان تبدیلیوں سے نہ صرف مطمئن نظر آتے ہیں بلکہ زندگی کے متعلق ان کے نظریات بھی بدل گئے ہیں۔ تمام ملک معاشری اور تمدنی ترقیوں کے زینے طے کرتا چلا جارہا ہے۔ مدارس کی حالت بالکل بدل چکی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ترکی حکومت سمجھتی ہے کہ نوجوان قوم کی امیدوں کا مرکز ہیں لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیئے جو ان کو صحیح معنوں میں اپنی قوم کا ہمدرد اور پاسباں بنادے عورتوں کی وہی حالت ہوگئی ہے جو یورپین عورتوں کی ہوتی ہے اور اب وہ ان قیود اور پابندیوں سے آزاد ہو چکی ہیں جو جمہوریہ سے قبل ان پر عائد کی گئی تھیں۔

جن چیز پر ہم خاص طور سے زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ترکی کے اندر تمام تغیرات انقلاب کا نتیجہ ہیں۔ دوسرا جزو بھی کافی اہم ہے۔ حقیقی انقلاب وہی ہوتا ہے جس کا نتیجہ نہ صرف حکومت اور سیاسیات کا تغیر ہوتا ہے بلکہ سماجی اور تمدنی خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ ترکی کے انقلاب کی حقیقی خوبی اسی چیز میں مضمر ہے۔ انقلاب ترکی اتنا زبردست واقعہ ہے جو اب تک دنیائے اسلام میں وقوع پذیر نہیں ہوا۔ عوام ان تمام پرانی دقیانوسی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے جو ان کے مصائب کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ترکوں کا یہی عقیدہ انکی تبدیلی کا باعث ہوا ترک مصطفےٰ کمال مرحوم کو اپنا سردار باپ اور نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اس سے ترکوں کی ضبط و نظم کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے جو ان کی نسل کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔

اگر ہم حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترکوں کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت بڑی ناانصافی ہوگی اگر ہم ان کو اسلام کے مخالف کہیں جو کچھ انہوں نے کیا وہ صرف اتنا تھا کہ پرانی چیزوں میں نئی روح پھونک دی اور یاں اسلام کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ اسلام کے اندر بے انتہا پنہاں قوتیں مضمر ہیں جن کا اظہار کوشش عمل سے ممکن ہے اسلام کی عظمت کی تاریخ اسلامی نادر الوجود ادب اور سادگی ہی ایسی چیزیں ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن پھر اسلام بنی نوع انسان کی نجات کا باعث ہوگا۔ اگر ہم اس کے اندر عقیدہ اور ایمان راسخ رکھیں تو آج ہم بھی ویسے ہی ہو سکتے ہیں جیسے کہ ترک۔

(اسلامک ریویو)

زبانِ اُردو

رُباعیات

جناب اختر سہسرامی ایم۔اے

دنیائے ادب میں ہے وقارِ اُردو
گویا خود نطق ہے نثارِ اُردو
ہے گلشن ہند میں اسی سے رونق
لاریب ہے بیخزاں بہارِ اُردو

ہیں اہلِ نظر مرتبہ دانِ اردو
ملتا ہے انھیں لطفِ بیانِ اُردو
بے مثل ہے دل کی ترجمانی کیلئے
محبوب ہو کیوں کر نہ زبانِ اُردو

سینچا ہے بزرگوں نے نہالِ اردو
چھوڑیں گے کبھی ہم نہ خیالِ اُردو
ہے باعثِ فخر ہند والوں کیلئے
سب مانتے ہیں آج کمالِ اُردو

سج دھج میں نرالی ہے زبانِ اُردو
افکار میں عالی ہے زبانِ اردو
شاہوں کی زبان پر چڑھی رہتی ہے
کس ناز کی پالی ہے زبانِ اُردو

غزل

راس آیا نہ ترا ہوش دل زار مجھے

از جناب عاصم جے پور

باغ سے کام نہ صحرا سے سروکار مجھے
دیکھتا ہوں جو دکھائے نگہِ یار مجھے

یاد کرتے ہوں نہ یارانِ قدح خوار مجھے
کیوں نظر آتے ہیں سرخوش در و دیوار مجھے

آگیا حسن کی بیباک نگاہو میں حجاب
راس آیا نہ ترا ہوش دلِ زار مجھے

پوچھتے ہیں نگہِ شوق سے قیمت اپنی
وہ نظر آتے ہیں خود اپنے خریدار مجھے

ہمنشیں بیخودیِ شوق کا عالم مت پوچھ
ہر قدم راہِ محبت میں ہے دشوار مجھے

میں رہا دوست کی بیگانہ وشی سے بیتاب
اس نے ساغر نہ دیا جان کی سرشار مجھے

لاکھ ملنے کو ملے حسن کی دولت والے
نہ ملا کوئی محبت کا خریدار مجھے

بجلیاں گرتی ہیں اب بھی جو سرِ راہگذر
ابھی زندہ نظر آتا ہے دل زار مجھے

اے خوشا نام کہ آتا ہے تو اس نام کے ساتھ
عاصم آجاتی ہے بوئے نگہِ یار مجھے

کرایہ کا مکان

ایڈگر ویلیس کا ایک جاسوسی افسانہ

ترجمہ:- جناب خان شبیر احمد خاں (جبلپور)

بوڑھی عورت ہانپتی ہوئی سینٹ طور بلڈنگ کے زینہ پر چڑھ رہی تھی۔ موسم گرما کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔

وہ ایک قیمتی لباس پہنے تھی۔ سینٹ طور کی عمارتیں پرانی وضع کی ہیں۔ وہاں "لفٹ" بھی نہیں ہیں اور قلی تو شاذو نادر ہی ملتے ہیں۔ زینہ کسی قدر عمودی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھی عورت اس پر چڑھتے چڑھتے تھک گئی ہے۔ کیونکہ وہ کسی جگہ دم لینے کے لئے ٹھہری، وہ برابر اس طرح چڑھتی چلی جارہی تھی گویا اس جگہ سے کافی مانوس ہے۔ آخر کار مکان کی آٹھویں منزل پر پہنچکر اس نے جیب سے کنجی نکالی۔ وہ کمرے کے قفل میں کنجی لگانے ہی کو تھی کہ کچھ آہٹ پاکر ٹھہر گئی۔ آہٹ کمرے کے اندر سے آئی۔ اس نے پریشان ہوکر چاروں طرف دیکھا اور ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ کمرے میں داخل نہ ہوگی۔ لیکن فوراً ہی کسی نتیجہ پر پہنچکر اس نے گھنٹی بجائی، کوئی جواب نہ ملا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس مرتبہ ایک بلند قامت تندرست و توانا مرد نے دروازہ کھولا۔

"مسٹر آرچبالڈ ونٹر ہیں؟" بوڑھی عورت نے کوشش سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتہ چلا تھا کہ یہ مکان کرایہ پر خالی ہے۔ ایجنٹ ——سمتھ اور سنگٹن —— " وہ اپنے بٹوہ میں کچھ تلاش کرنے لگی، "مجھے دیکھنے کے لئے مشورہ دیا گیا تھا۔ لیکن میں —— میں ——" عورت کچھ سوچنے لگی۔

"کوئی مضائقہ نہیں" مرد نے جواب دیا۔ "میں ہی مسٹر ونٹر ہوں۔ تشریف لائیے"

بوڑھی عورت کمرہ کے اندر داخل ہوگئی۔

"آپ بہت اچھے آدمی ہیں" اس نے بٹوے کی تلاش ختم کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام —— فلیکس مین —— مسز فلیکس مین ہے۔ میں دیہات میں رہتی ہوں —— سفوک کے قریب —— مجھے اور میری بیٹی کو تین ماہ کے لئے کرایہ پر ایک مکان کی ضرورت ہے۔ سیڑھیاں نہایت تکلیف دہ ہیں"

مسٹر ونٹر مسکرائے۔

"یقیناً آپ درست کہتی ہیں" اس نے معنی خیز نگاہوں سے عورت کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "مجھے بھی بعض اوقات اس سے تکلیف ہوتی ہے"

بوڑھی عورت نے عذر کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "لیکن آپ کے ساتھ ایسا نہ ہونا چاہئے مسٹر ونٹر! آپ جانتے ہیں میری عمر تقریباً ساٹھ برس کی ہے۔ میرے لئے سیڑھیاں بے آرامی کا موجب ہو سکتی ہیں۔ لیکن آپ ——"

وہ زور سے ہنسا "لیکن کیا ایسی گرم دوپہر میں بھی نہیں! کیوں مسز فلیکس مین ——؟"

"میں سمجھ گئی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اتنی معمر تو معلوم نہیں ہوتی"

"قطعاً نہیں!" اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"آپ بہت بھلے آدمی ہیں" عورت نے جواب دیا "لیکن مکان کے متعلق کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آپ کو عذر تو نہ ہوگا"

"عذر تو کچھ نہیں۔ لیکن —— بات یہ ہے کہ میں ابھی ایک ہفتہ کے لئے باہر جارہا ہوں" اس نے کمرہ میں رکھے ہوئے دو سوٹ کیسوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تو میں پھر کبھی حاضر ہونگی۔ مجھے آپ کو اس وقت تکلیف دینا نہیں چاہئے" وہ دروازے کی طرف واپس آئی۔ لیکن مرد تیزی سے آگے بڑھا اور دروازے کی طرف پشت کرکے کھڑا ہوگیا۔

"مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں مسز فلیکس مین! —— آپ چند منٹ میں سارا مکان دیکھ سکتی ہیں —— اور آپ جانتی ہیں کہ میں کرایہ پر مکان دینا چاہتا ہوں ——" اس کے چہرے پر ایک بھدی سی مسکراہٹ تھی۔

"آپ بہت مہربان ہیں" بوڑھی عورت نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"بالکل نہیں —— قطعاً نہیں ——" وہ دو بارہ اسی طرح مسکرایا۔ "ہاں! تو آپ کونسا حصہ پہلے دیکھنا چاہتی ہیں؟ باورچی خانہ یا"

خیال میں یہی سب سے زیادہ اہم جگہ ہے۔ اس برآمدے کی دوسری طرف" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مکان کے متعلق آپ کی معلومات خوب ہیں" یہ کہتے ہوئے بوڑھی عورت اس کے پیچھے ہولی۔

"اور یہاں کیا ہے؟" عورت نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ... یہ... یہ... سونے کا کمرہ ہے" وہ ہکلا رہا تھا۔

"لیکن — اسے — آپ اسے بھی دیکھ سکتی ہیں"

یہ صاف ستھرا ہوادار کمرہ تھا کھڑکیوں سے سینٹ لورر گارڈن کا دلفریب منظر دکھائی دے رہا تھا۔

"میں یہاں کتنے آرام سے سو سکتی — کاش — مسٹر ونٹر —"

"اس میں کیا شک ہے۔ مکان کے تمام کمروں میں سے خاموش یہی کمرہ ہے" اس نے تائید کی۔

پلنگ پر ایک کھلا ہوا سوٹ کیس پڑا تھا جسے مسز ونٹر نے پریشان نظروں سے دیکھا۔

"لیکن دراصل میں اسے ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال کرتا ہوں" وہ ہکلانے لگا" اور جب باہر جاتا ہوں تو اپنا سامان یہیں چھوڑ جاتا ہوں"

"آپ بہت بے پروا ہیں" وہ زور سے ہنسی۔

مرد فوراً اس سے مخاطب ہوا" ناگوارِ خاطر نہ ہو تو میں ابھی ایک لمحہ میں حاضر ہوا۔ میں دوسرے کمرے میں ایک جلتا ہوا سگرٹ چھوڑ آیا ہوں"

"اچھا! آپ جا سکتے ہیں" اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر آئی اور فوراً غائب ہو گئی۔

جونہی وہ برآمدے میں چار چھ قدم آگے بڑھا بوڑھی عورت تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئی اور کھلے ہوئے سوٹ کیس میں نہایت پھرتی سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ یکایک اس کی انگلیاں کسی سخت چیز سے مس ہو گئیں اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اسے کھینچ کر اپنے بٹوے میں رکھ لیا اور نہایت خاموشی سے برآمدے میں واپس آ گئی۔

مسٹر ونٹر ٹیلیفون پر بول رہے تھے۔ اس نے برآمدے کے اس کونے سے ان کی دھیمی دھیمی آواز سنی۔ وہ بہت کچھ سمجھ گئی کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ فوراً ہی آگے آئی اور کمرے کے دروازے پر جو قفل پڑا تھا اس کی کنجی نکال لی۔

مسٹر ونٹر کی دبی ہوئی آواز آنی بند ہو گئی۔ مسز ملیکس مین نے بلند آواز سے پکارا "مسٹر ونٹر! کیا میں باورچی خانہ دیکھ آؤں؟"

آواز سنتے ہی وہ آدمی اس طرح آیا گویا اس کی آواز سنتے ہی گھبرا گیا ہے۔

"باورچی خانہ.... ارے ہاں... آپ دیکھ سکتی ہیں" اس نے کسی قدر درشت لہجہ میں کہا۔ عورت اسے بھانپ گئی لیکن پریشانی چھپانے کے لئے اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

جب وہ باورچی خانہ میں داخل ہوئی۔ مسٹر ونٹر اس کے نزدیک تھے

"اوہو! یہ بہت ہی باقاعدہ بنا ہے" اس نے اطمینان سے کہا "اور......"

مسٹر ونٹر کا ہاتھ جونہی اس کے کاندھے پر پڑا وہ چونک اٹھی۔

"محترمہ! بڑے تعجب کی بات ہے" اس نے کہا۔

"کیا مطلب آپ کا؟ میں کچھ نہیں سمجھی"

"میں نے ابھی فون پر اپنے ایجنٹ سے پوچھا۔ وہ مسز ملیکس مین کو جانتے ہی نہیں"

"کیا حماقت ہے" بوڑھی عورت نے تیز ہو کر کہا" مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ مجھے ان سے گفتگو کرنے دو"

"نہیں! کوئی ضرورت نہیں" اس کی گرفت کاندھے پر سخت ہو گئی۔ "تمھیں یہاں ٹھہرنا ہوگا تاوقتیکہ پولیس نہ آ جائے"

"لیکن تم پولیس کو کیوں بلاؤ گے؟" اس نے کڑک کر کہا" یہ کوئی شریفانہ حرکت نہیں ہے۔ میں ابھی آپ کے مکان سے چلی جاتی ہوں"

"ایسا نہیں ہو سکتا" مرد نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا" آپ یہاں سے اس طرح نہیں جا سکتیں۔ شروع ہی سے مجھے تم پر شک تھا کیونکہ سمتھ اور نیگشن کے پاس اس مکان کے متعلق کوئی خبر ہی نہ بھیجی گئی تھی"

"لیکن انھوں نے تو مجھ سے کہا تھا" عورت نے کہا۔

"فضول بحث ٹھیک نہیں مولانا! آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں پولیس سے کہیں" مرد کی آواز زیادہ سنجیدہ ہو گئی "جب تک کانسٹبل

تمھیں پتا تھا تمھیں اس باورچی خانہ میں ٹھہرنا ہوگا اور میں دروازے پر تالا لگائے دیتا ہوں۔"

بوڑھی عورت قریب قریب رو پڑی۔ "میں کچھ بھی نہیں سمجھی کیا تمھارا مطلب ہے؟" اسے غصہ آگیا۔ "تمھیں اس ذلیل حرکت کی جرأت کیونکر ہوئی؟ میں کہتی ہوں مجھے جانے دو۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ مرد نے اسے روک لیا۔

"ایسی کوئی حرکت نہیں ہونی چاہیئے۔" اس نے دھمکی دی۔ "مزید پریشانیوں میں پھنسنے کی کوشش نہ کیجیے۔" اس نے اپنی جاکٹ کی جیب سے پستول نکالا "جانتی ہو یہ کیا ہے؟"

بوڑھی عورت خوفزدہ ہوکر دیکھنے لگی۔ "آپ ایسا نہ کیجیے۔" اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

پستول جیب میں واپس چلی گئی۔ "اگر ضرورت پڑی تو اسے استعمال کیا جائے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب میں جو حکم دوں تمھیں اس کی تعمیل کرنی ہوگی۔ اس جگہ بیٹھ جاؤ۔"

بوڑھی عورت کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنا بٹوہ کھولا اور رومال تلاش کرنے لگی۔

مرد ایک لمحہ کے لئے دروازے کی طرف مڑا۔ یکایک بوڑھی عورت کی حالت بدل گئی۔ اس نے رومال کے ساتھ پرانے فیشن کا ایک چھوٹا سا ریوالور بھی بٹوے سے نکال لیا۔ وہ بہت ہی اچھے قسم کا ریوالور تھا۔ جس پر چاندی کا ملمع کیا ہوا تھا اور اس کا دستہ نہایت ہی چمکدار تھا۔

"مسٹر ڈنٹر!" اس نے آہستہ سے کہا۔

مرد نے پلٹ کر دیکھا۔

"ہاتھ اونچے کرو سر سے اونچے۔" بوڑھی عورت نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

اس نے غصہ سے بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔

"فوراً" عورت نے تیزی سے کہا۔

مرد نے دیکھا کہ ریوالور کی نالی اس کے سر سے دو فٹ کے فاصلے پر چمک رہی ہے۔ اس کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

عورت مسکرائی۔ "اچھا مسٹر ڈنٹر آپ اپنا چہرہ دیوار کی طرف کرلیں۔ ہاں، اور آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ پہلے آدمی نہ ہونگے جس پر میں ریوالور چلاؤنگی۔ اگر آپ نے ذرا بھی میری مرضی کے خلاف کوئی حرکت کی تو ——" مرد نے خوفناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن مجبوراً حکم ماننا پڑا۔

اسے محسوس ہوا کہ ریوالور کی نالی اس کی گردن کے پاس چھو رہی ہے اور بوڑھی عورت اس کی جاکٹ کے جیب سے پستول نکال رہی ہے۔ وہ غصہ سے گالیاں بکنے لگا۔

"اگر تم نے اس قسم کے الفاظ پھر استعمال کئے تو یقیناً میں تمھیں گولی ماردونگی۔ سمجھے؟" عورت نے غصہ سے کہا۔

"ہاں!" اس نے غرا کر کہا۔

"اچھا مسٹر آرچبالڈ ڈنٹر۔ آپ کا اصلی نام اور پیشہ کیا ہے؟"

"کوشش کرو اور پتہ لگاؤ۔" مرد نے جواب دیا۔ "مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور پیشہ کیا ہے؟"

"تمھیں جلد ہی پتہ چل جائیگا۔" عورت نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا تم جواہرات اور نقدی کی تلاش میں نہیں تھے؟"

"کیا میں —— ؟"

"میرے سوال کا جواب دو۔" عورت نے ڈپٹ کر کہا۔ ریوالور کی نالی پھر سختی سے گردن میں چبھی۔

"ہاں!" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"اور سب مال ان دونوں سوٹ کیسوں میں بھر کر روانہ ہونے والے تھے کیوں؟"

"ٹھیک ہے۔" گردن پر ریوالور کا دباؤ کم ہوگیا۔

"میں ان سوٹ کیسوں کی حفاظت کرونگی مسٹر ڈنٹر۔" عورت طنز آمیز لہجہ میں کہنے لگی۔ "وہ میرے پاس زیادہ محفوظ رہینگے۔ آپ نہایت سلیقہ مند ہیں۔ آپ نے کتنی احتیاط سے انھیں رکھا ہے۔"

ان طائم جملوں نے اس کے غصہ کو بھڑکا دیا۔

"اوھدا —— اگر میں ——" اس نے بکنا شروع کیا۔

ریوالور کی نالی گردن میں پھر چبھنے لگی۔ "معاف کیجیے۔" اس نے جملہ ختم کیا۔

"تم اس لائق نہیں ہو۔" عورت پُر مطمئن لہجہ میں کہنے لگی۔ "تم ایک بدزبان بدمعاش ہو۔ اس طرف چلو۔ تمھارے لئے یہ بہتر ہوگا کہ تم بغیر کسی شرارت کے میرا حکم مانو۔ مجھے معلوم ہے تمھارا ارادہ کیا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ تم ٹیکسی کے لئے ٹیلیفون کر رہے تھے اور تمھارا ارادہ مجھے کمرہ میں قید کرنے کا بھی تھا کیوں؟"

"نہیں نہیں قطعاً نہیں —— میں قسمیہ کہتا ہوں میرا یہ

ارادہ بالکل نہ تھا۔"

"نہیں تمہارا ارادہ تھا اور تمہیں جاننا چاہئے کہ مجھے تمہارے تمام ارادوں کی خبر ہو چکی ہے۔ ہاں! ــــ ونٹر ایک ہفتہ کے لئے باہر جا رہا ہے۔ میں یہاں کمرے میں بند کر دی جاتی۔ اور آپ سامان لیکر غائب ہو جاتے۔ خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا!"

"سب ٹھیک ہوتا" اس نے جواب دیا ــ "کوئی نہ کوئی تمہاری مدد کے لئے آجاتا"

"کیا واقعی!" اس نے ترش لہجہ میں کہا۔ "تو پھر تمہارے لئے بھی یہی بہتر ہوگا۔ میں تمہیں کمرے میں بند کر کے قفل لگا جاتی ہوں اور آخر کبھی کوئی آکر تمہاری مدد کریگا"

"میرے خدا ــ!" اس نے التجا کرتے ہوئے کہا "امید ہے کہ آپ ایسا نہیں کرینگی۔ میں صرف آپ سے مذاق کر رہا تھا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں آپ کو کمرے میں مقفل کر کے کبھی نہ جاتا۔ صرف آپ کو دھمکا کر چلا جاتا"

"تو پھر میں بھی تم کو دھمکاؤنگی مسٹر ونٹر!"

وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے پیر گھبراہٹ سے کانپ رہے تھے۔

"اس طرف دیکھو" عورت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

وہ مڑا ــ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

عورت نے ریوالور کی شست اس کے سینہ کی طرف باندھی۔

"اگر تم نے اپنے ہاتھ ذرا بھی نیچے کئے تو میں گولی مار دونگی۔ اس سونے کے کمرے میں آہستہ آہستہ جاؤ۔ بہت ہی خاموش کمرہ ہے"

مرد نے قدم بڑھایا اور ٹھنڈی سانسیں لینا شروع کیں ــ

"میں تمہارے پیچھے موجود ہوں" عورت نے کہنا شروع کیا "اس طرف کونے میں جاؤ دیوار کی طرف منہ کرو۔ اور اسی طرح کھڑے رہو جب تک میں دوسرا حکم نہ دوں"

مرد بہت جزبز ہوا لیکن حکم عدولی کی جرأت نہ کر سکا۔

جونہی وہ دیوار کے قریب پہنچا۔ دروازہ بند ہوا اور قفل میں چابی گھمانے کی آواز آئی۔ برآمدے سے عورت نے تمسخر انگیز لہجہ میں کہا۔ "پانچ منٹ بعد مسٹر ونٹر آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کمرے کے باہر نہ آئیں۔ میں آپ کو بھوکا مرنے نہ دونگی۔ ابھی پولیس آتی ہے۔ وہ آپ کو آزاد کر دیگی"

چند لمحہ بعد دوسرا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی جسے سنتے ہی مرد کی قوت ضبط ختم ہو گئی۔ اس نے دیوانوں کی طرح بکنا شروع کیا اور دروازے کو مکوں سے توڑنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

عورت یہ سب کچھ سن رہی تھی ۔ وہ مکان سے باہر نہ گئی تھی بلکہ سامنے کے کمرے میں ٹیلیفون کر رہی تھی۔

"کیا یہ چیلسا پولیس سٹیشن ہے؟" اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں لیڈی ونٹر ہوں ۔ اپنے بیٹے کے مکان نمبر ۹ سینٹ لورہ بلڈنگ سے بول رہی ہوں۔ کیا آپ فوراً کچھ سپاہی یہاں بھیجیں گے۔ میں نے ایک چور کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ وہ اس مکان سے میرے بیٹے کی نقدی اور جواہر چرانے لئے جا رہا تھا۔ مہربانی کر کے جلد انتظام کیجئے۔ تکلیف تو ضرور ہوگی۔ شکریہ!"

تھوڑی دیر بعد ہی تین سپاہی کمرے میں مقید مرد کو ہتھکڑیاں ڈال کر لے گئے۔

انھوں نے اس کا نام میلیش تبلایا۔ "فلیش میلش" ایک مشہور اور خطرناک بدمعاش تھا۔

"لیکن محترمہ! آپ نے اسے کس طرح پہچان لیا اور کمرے میں کس طرح بند کیا۔ میں اسے سمجھ نہیں سکا" ایک سادہ پوشاک والے افسر نے پوچھا جو میلیش کے جانے کے بعد تفصیلات معلوم کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ "یہ بڑا دشوار کام تھا"

"واقعی!" بوڑھی عورت نے جواب دیا "جونہی میں کمرے میں داخل ہوئی میں پہچان گئی کہ وہ بدمعاش ہے اور مجھے دھوکہ دے رہا ہے اور میں نے کوشش کی کہ اسے ذرا بھی شک نہ ہونے پائے"

وہ مسکرانے لگی "اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں یہاں اپنے بیٹے کی غیر حاضری میں آکر رہنے والی ہوں۔ میں اسی طرح اکثر آکر رہی ہوں ــــ"

سادہ پوشاک والے آدمی نے سر ہلایا۔

"لیکن ریوالور کے متعلق محترمہ؟"

"ارے وہ!" وہ زور سے ہنس پڑی۔ "تقریباً چالیس برس پہلے جب میں اپنے شوہر کے ساتھ بغرض سیاحت مشرقی ممالک کی طرف گئی تھی تب سے وہ میرے پاس ہے۔ میرے مرحوم شوہر کی یہ تاکید تھی کہ یہ چیز مجھے ہمیشہ اپنے پاس رکھنی چاہئے۔ اور شاید اسے کبھی بھرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہے لیکن میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ میں بزدل ہوں بلکہ یہ میری عادت ہی ہو گئی ہے"

"خوب!" افسر نے تعریف کے لہجہ میں کہا۔
"اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے استعمال کیا۔ اس مرتبہ اتفاق سے میں اسے سوٹ کیس میں رکھ گئی تھی اور موقع پاتے ہی میں نے اسے نکال لیا۔ میں نے سینما کئی بار دیکھا ہے۔ جب میں نے ریوالور استعمال کیا تو وہی الفاظ دہرائے جو اکثر فلم میں دیکھے تھے — "ہاتھ سر سے اونچے اٹھاؤ وغیرہ ——!" اور لہجہ بھی بالکل ویسا ہی اختیار کیا اور یہ بہت موثر ثابت ہوا —— حالانکہ مجھے کامیابی پر شک تھا۔"

"او خدا!" مسز اغرساں سارجنٹ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "تکلیف کی معافی چاہتا ہوں محترمہ!"

"معافی کی کوئی ضرورت نہیں یہ لو اس بدمعاش کا پستول۔"

مسز اغرساں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

چوپاٹی

بمبئی کی ایک جلوہ بداماں تفریح گاہ

از جناب قمر سہرامی

یہ سمندر کا کنارہ شام کا دلکش سماں
یہ مناظر روح پرور یہ شفق کی سرخیاں

دیکھیئے تو اک طرف پانی ہے تا حدِ نظر
اور اُس سے دُور جا کر مل گیا ہے آسماں

اک طرف قدرت کے ہیں اتنے مناظر دلفریب
دوسری جانب ہے انسانوں کا اک سیلِ رواں

ان میں ایسی صورتیں بھی ہیں کہ جن کو دیکھ کر
کہہ سکے انسان ساحل بن گیا ہے گلستاں

یہ مکمل حسن اور پھر ریشمی ملبوس میں
جیسے رقصاں ہر طرف ہوں خوش نما تتلیاں

ایک اک صورت ہے فطرت کا مکمل شاہکار
خلد سے گویا اُتر آئی ہیں کچھ حوریں یہاں

بے تکلف بیٹھ جاتی ہیں وہ فرشِ خاک پر
مخملی صوفوں پہ بھی ہے بیٹھنا جن کو گراں

سرخیاں رخسار کی نور شفق پر خندہ زن
اور نگاہِ شوخ میں رقصاں ہزاروں بجلیاں

ایک اِک پیکر یہاں کا اِک مرصّع نظم ہے
کوئی دیکھے شاعرِ فطرت کی جادو کاریاں

کون اپنے ہوش اور دل کی حفاظت کر سکے
ہر قدم پر سیکڑوں چالاک رہزن ہیں جہاں

یہ وہ نظارے ہیں جن سے شیب پاتا ہے شباب
کس طرح پھر ہوش میں اپنے رہے کوئی جواں

حسرتوں کا دل میں اک طوفان پیہم ہے بپا
دسترس ممکن نہیں ہیں سیکڑوں مجبوریاں

جو سمندر میں ہیں ساحل پر وہ آسکتے نہیں
جو ہیں ساحل پر وہ دریا میں بھی جا سکتے نہیں

عالمگیر زبوں حالی

موجودہ کشمکش کا مالی و اقتصادی پہلو

ترجمہ: جناب توکل ڈبائیوی ایم - اے

موجودہ عالمگیر بے چینی دراصل صرف سیاسی انتشار اور بدنظمی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقی اسباب کچھ اور بھی ہیں اور بہت گہرے اور اہم بھی ہیں۔ موجودہ جنگ اس میں شک نہیں، سیاست کے جسم کا ایک ناروا مرض ضرور ہے۔ لیکن سیاست کے جسم کی نشوونما کا دارومدار ہمارے مالی اور معاشری نظام پر ہے اسی لئے موجودہ پریشانیوں کے حقیقی اسباب یقیناً سماجی اور مالی ہیں جن کی صحیح طور سے تحقیق و تلاش کے لئے ہمیں ذرا غور و فکر سے کام لینا پڑیگا۔ جنگ صرف اس طرح شروع ہو گئی کہ ہٹلر ایک خراب اور بدخواہ شخص تھا بلکہ اس کا راز ہمارے عہد کی موجودہ معاشری سماجی اور مالی بدعنوانیوں میں چھپا ہوا ہے جس میں اوروں کی طرح ہٹلر کی ذہنی قوتوں کی بھی نشوونما ہوئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہٹلر نے ماحول کا اثر کچھ اس طرح اور اتنا زیادہ قبول کیا کہ اس میدان میں کوئی دوسرا اس کا حریف نہیں بن سکا...... آج وہ دنیا کے نظام کو تہ و بالا کرنے پر تُلا ہوا نظر آتا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے لندن میں مختلف ممالک کے چند مدبروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں انہوں نے سر جوڑ کر موجودہ عہد کی عالمگیر بے چینی اور بے سکونی کے اسباب کی تہ تک [illegible] تھا اور اس مرض کی تمام علامتوں کو سمجھنا چاہا تھا۔ [illegible] دنیا میں انتشار اور بے سکونی کا باعث بنا ہوا ہے۔ بحث و مباحثہ کے بعد مرض کی جس طرح ان لوگوں نے تشخیص کی ہے اس کے خاص خاص اجزا مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) انسان کے وجود اور اس کے حقوق کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں ہے۔

(۲) انسان کی فطرت میں "بھیڑ چال" کے مصداق عمل کرنے کی عادت موجود ہے وہ فرداً فرداً غور و فکر سے بہت کم کام لیتا ہے۔

(۳) لوگوں کے ذہنی اور سماجی اعتقادات میں بہت زیادہ فرق ہے۔

(۴) آپس میں عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرنا اور یہ نتیجہ ہے لوگوں کی روحانیت کے کمزور ہو جانے کا۔

(۵) مذاہب کے ارکان کی طرف بے توجہی۔

(۶) اپنے پڑوسی پر حاوی رہنے کی خواہش رکھنا۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا اسباب آپس میں ایک دوسرے سے منطقی طور پر بہت قریب کا واسطہ رکھتے ہیں لیکن ان اسباب میں دو سبب بہت خاص ہیں ایک تو یہی کہ لوگوں کے ذہنی اور سماجی اعتقادات میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ سائنس نے جس میں "طبیعات اور علم کیمیا" کی تعلیم بطور خاص شامل ہے، موجودہ صدی کے آخری پچیس برسوں اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس کے سامنے باقی تمام علوم کی بہت کم اہمیت باقی رہ گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ اصولی طور پر یہی ہوا کہ انسان لاتعداد نئے نئے طریقوں اور نئی نئی ترکیبوں کو استعمال کرنے لگا۔ نئی نئی مشینوں کی ایجاد نے صنعت و حرفت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے یہ بات اب چھپی ہوئی نہیں رہی ہے بجلی بھاپ اور پیٹرول کی مدد سے چلنے والی مشینوں نے صنعت و حرفت کو صرف ایک انسان کے ہاتھ میں کچھ اسقدر مقید و محدود کر دیا کہ اس میں انسان کا وجود "علاؤ الدین کے طلسمی چراغ" سے کسی طرح کم نہیں سمجھا جاتا۔ یہ سرمایہ دار انسان کی ہر ضرورت کو اپنی دولت کے زور سے کچھ اس طرح پورا کرنے قابل ہو گئے ہیں کہ اگر تھوڑے سے مبالغہ کے ساتھ ان سرمایہ داروں کو موجودہ دنیا کا "جن اور دیو" بھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آنکھ جھپکاتے اور چٹکی بجاتے اپنی دولت کے ذریعہ سے وہ دم بھر میں ایسے ایسے کام لیتے ہیں جو پرانے زمانہ کے قصوں میں ہم صرف جنوں اور دیووں کے متعلق پڑھا کرتے تھے یوں تو سرمایہ دار بھی انسان ہوتے ہیں اور انکی دست نگر بھی انسان ہوتے ہیں لیکن کاش سرمایہ دار انسانیت کے جامہ کو پہنے رکھتے ہیں۔ ان سرمایہ داروں نے قیامت تو یہی کی کہ صنعت و حرفت کی نئی نئی ایجادات کی برکات کو صرف اپنی ذات تک محدود کر لیا اور اپنے ہم جنسوں سے مطلقاً ہمدردی [illegible]

رکھی ورنہ دنیا میں کم از کم ایسی بے سکونی تو ہرگز نہ پھیلنے پاتی۔ دنیا کا تین چوتھائی حصہ آجکل ان مغربی اقوام کے قبضہ میں ہے جنہوں نے سب سے پہلے ان نئی ایجادات سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اور پھر رفتہ رفتہ فائدہ اور کثیر نفع کی لذت کو اپنے لئے کچھ اس طرح وقف کر لیا کہ وہ کیسی ہی نازک ترین صورتِ حالات میں بھی اس سے محروم رہنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ سرمایہ داری سے متعلق داستان کا بس یہی لب لباب ہے۔

بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ دنیا میں بے چینی کا باعث مختلف ممالک کی حکومتوں کی حکمت عملی ہے حالانکہ واقعہ کچھ اور ہے۔ دراصل حکومت کی پالیسی بھی انہی خودغرض سرمایہ داروں کے ہاتھوں کی خطرناک ذہنیت کی روشنی میں تعمیر ہوتی ہے اور حکومت کے اراکین کی اہمیت سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہوتی کسی خاص حکومت کے وہ اراکین یقیناً باہمت اور قابلِ مبارک باد ہوتے ہیں جو سرمایہ داروں کی ذہنیت کو کچل کر رکھ دیں ورنہ عام طور سے ہر حکومت کو ان کی شاطرانہ چالوں کے سامنے سرِ تسلیم خم ہی کرنا پڑتا ہے.....
اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ دار قوم یا ملک کے اجتماعی فائدہ کے لئے کبھی قدم نہیں اٹھاتے بلکہ ان کے ہر اقدام میں ان کا ذاتی فائدہ چھپا ہوا رہتا ہے تو پھر معلوم ہوا کہ ہر حکومت کو اپنے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کی حفاظت کا بطورِ خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد آپ بہ آسانی سمجھ سکیں گے۔ کہ جنگ شروع ہی اس وقت ہوتی ہے۔ جب مختلف اقوام کے سرمایہ داروں کی خودغرضیوں میں تصادم ہو جاتا ہے اور ہر قوم کی حکومت اپنے اپنے سرمایہ داروں کی حفاظت کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے اور اس طرح حکومتوں میں اختلافِ رائے شروع ہو کر ان کے درمیان بہت جلد جنگ کی نوبت آجاتی ہے۔

یہی تو وجہ ہے کہ جب بھی دنیا کے موجودہ نظام میں اصلاح کا سوال کسی ذمہ دار مجلس کے سامنے پیش ہوتا ہے تو سب سے پہلے مالی اصلاحات کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سر محمد ظفر اللہ خاں نے اپنے ایک نشریہ میں چند طریقے بتائے تھے جن پر عمل کرنے سے موجودہ نظام میں بڑی حد تک اصلاح کی امید ہو سکتی ہے ان میں کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) سود لینے اور دینے کا طریقہ یک قلم موقوف کر دیا جائے
(۲) زراندوزی کا سدِ باب کیا جائے۔
(۳) تجارت میں "مبادلہ اشیا" کے اصول پر عمل کیا جائے
(۴) ہر حکومت اپنی محکوم رعایا کی شکم پری، رہائش، تن پوشی اور تعلیم کی طرف خاص توجہ دے۔
(۵) بنی نوعِ انسان میں رنگ اور نسل و نسب کی بنا پر کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔

مندرجہ بالا تجاویز پر مفصل بحث کا موقع یہاں نہیں ہے کہ آیا ان تجاویز کو کس حد تک عملی جامہ پہنائے جانے کا امکان ہے لیکن ان تجاویز پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی کم از کم یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سر موصوف کا پروگرام مکمل طور سے مالی ہے اس میں تو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ایک سرمایہ دار اپنی دولت میں دن دونا رات چوگنا اضافہ جسقدر سود کی قبیح رسم سے کرتا ہے اتنا اور کسی ذریعہ سے نہیں کرتا۔ تجارت کا موجودہ طریقہ بھی اسی طرح ناجائز طور پر دولت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ غرضیکہ سرمایہ دار اپنے فائدہ کے سامنے قوم و ملک کے اجتماعی فائدہ کو قربان کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتا۔

بین الاقوامی تجارتی مجلس کے دفتر سے جو کچھ عرصہ پہلے جینوا میں قائم تھا ایک پروگرام شائع ہوا ہے جس کو جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد عملی جامہ پہنانے کے لئے پرزور سفارش کی گئی ہے۔ پورا پروگرام معاشری، سماجی اور مالی اصلاحات سے متعلق ہے۔ دنیا کی صنعت و حرفت پر بین الاقوامی تعاون اہل دنیا کی معیشت کے لئے ایک عالمگیر نظام کا قیام، ایک بیروزگاری کا کامل طور سے انسداد اس پروگرام کے چند خاص اجزا ہیں۔ پورا پروگرام مندرجہ ذیل گیارہ دفعات پر مشتمل ہے۔

(۱) دنیا میں کاروبار کے وسائل کی توسیع کے لئے بین الاقوامی پالیسی کا اختیار کرنا۔
(۲) معاش کی خاطر ایک ملک سے دوسرے ملک میں لوگوں کا پہونچنا اور ان کے لئے ذرائع کا بہم پہونچانا۔
(۳) معاشری اور مالی صورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے عالمگیر اصول میں کامل اتحاد اور صفائی۔
(۴) بیروزگاری کا انسداد۔
(۵) مشینوں کی عملی تعلیم۔

(۶) مختلف مذاہب اور اقوام کے افراد کے ساتھ یکساں برتاؤ

(۷) کام کرنے والوں کی اجرت کا انتظام جہاں اُن کی استعداد اور محنت کے مطابق ہونا چاہیئے وہاں فائدہ کی تقسیم ایسے مناسب سے ہونی چاہیئے کہ کوئی کام کرنے والا مایوس نہ رہنے پائے۔

(۸) ان کام کرنے والوں کی شکم پری کے لئے کم سے کم اُجرت کا مقرر ہونا جو خود تلاش کرنے سے معذور ہیں۔

(۹) کام کرنے والوں کے لئے عمدہ ماحول کا مہیا کرنا اور ان کی رہائش کے لئے کافی گنجائش مکانات تعمیر کرنا۔

(۱۰) ترقی کے یکساں اور فوری امکانات پیدا کرنا۔

(۱۱) کام کرنے کے تحقیق یافتہ ذرائع کا بہم پہونچانا۔

مندرجہ بالا پروگرام کو پیش کرتے ہوئے بین الاقوامی تجارتی مجلس کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر مسٹر چیلان نے اپنے پروگرام کی اس طرح تائید و حمایت کی تھی۔

"اس میں شک نہیں کہ یہ پروگرام اصلاح کی دشوار گزار منزل پر ہمارا ابتدائی قدم ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس پروگرام کے مطابق اپنی جدوجہد کو جاری رکھ سکے تو ہمارا اپنی منزل مقصود پر جلد پہنچ جانا چنداں مشکل نہ ہوگا۔ ہمارا یہ پروگرام کام کرنے والوں کے لئے نہ صرف ذرائع پیدا کرتا ہوگا بلکہ ان کی مالی حالت کو بھی سنبھالے رکھے گا۔ یہ بات تو اب مسلّمہ ہے کہ اب مالی حفاظت کے بغیر دنیا کی موجودہ بے چینی رفع نہیں ہو سکتی"۔

مضمون کے اختتام پر مجھے اب اس سے زیادہ اور کچھ کہنا نہیں ہے کہ موجودہ عہد کی اصلاح کا دارومدار سیاسی بندیوں پر اتنا نہیں ہے جتنا افراد کی فرداً فرداً مالی حفاظت پر ہے مستقبل قریب و بعید میں جنگ اور اس کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے اگر کوئی چیز ہمیں محفوظ رکھ سکتی ہے تو وہ دنیا کے افراد کی زندگیوں و مالی اور معاشری جکڑبندیوں سے آزاد رکھنا ہے۔

[illegible]

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ

کے بارے میں

اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ کے ایک مشہور ڈاکٹر و حکیم حاذق کی ذاتی تجربہ کی تازہ ترین چٹھی

کی ہو بہو نقل جس نے اپنے مطب میں لا علاج آنکھوں کے مریضوں پر پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کا استعمال کرنے کے بعد تحریر کی

9/10/62 شریمان محترم پنڈت صاحب زاد لطفکم، آداب بعد نیاز

چار ماہ ہو چکے ہیں جب سپیشل پوٹینسی کی چار شیشیاں لیکر بغیر ریل یا درج کرائے لے آیا تھا۔ گھر کے حالات اور امورات درج سے حاضر نہ ہو سکا۔ اس پرل کلوریم کی شیشیاں مالیت ایک صد روپیہ کی لایا تھا وہ بھی ختم ہو چکی ہیں پہلے تو ارادہ تھا کہ بذریعہ پارسل اور مال منگواؤں مگر دو شنوں کی اطلاعات بھی مد نظر تھی اور ساتھ ہی شادی کی خوشی کی مبارکباد بھی ضروری تھی اس لئے خود عنقریب حاضر ہونگا تاکہ دونوں کام ہو جائیں۔ ادویات کے فوائد یعنی پرل کلوریم کے فوائد بطور سرٹیفکیٹ مندرجہ ذیل ہیں تاکہ آپ اپنی طرف سے اخبار میں شایع کرا دیں۔ میں شیشیاں بیچنے کے علاوہ مریضان چشم کا علاج بھی اپنے مطب میں کرتا ہوں جس کے کثیر فوائد اور معجز نمائی خاصیتیں حسب ذیل ہیں شایع کر دیں۔

(۱) سفید موتیا بند کا ایک مریض جس کا نام اللہ دتا تھا جس کو چار ماہ سے سفید موتیا اترا ہوا تھا نارمل پوٹینسی کی دو شیشیوں نے وہ معجز نما فائدہ کیا کہ مریض بالکل صحتیاب ہے عرصہ ... میں کوئی تکلیف نہیں ہے بالکل شفایاب ہو گیا آپ کو مبارک ہو (۲) موضع جراداں جو ہمارے نزدیک ہی ایک گاؤں ہے وہاں کے نمبردار کی عورت جو آنکھ کی تکلیف ... سخت دکھی تھی آنکھ دکھی تھی پانی بہتا تھا نہ دن کو آرام نہ رات کو چین تھا پرماتما کے فضل سے صرف تین یوم کے علاج نارمل پوٹینسی سے بالکل آرام ہو کر شفایاب ہو گئی ... حق میں دعائے خیر دیتی تھی (۳) عرصہ ایک سال سے ایک مریضہ آنکھوں کا علاج کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھ کا ڈیلا پھول کر بیر سے بھی موٹا ہو گیا مریضہ دن رات بے چین تھی ... ارادہ ہوا کہ آنکھ سے ڈیلہ نکلوا دیا جائے مجھ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے نارمل پوٹینسی سے علاج شروع کیا دوسرے ہی روز پانی بہنا اور درد بند ہو گیا اور اب میرے زیر علاج ہے ... کامل صحت کی امید ہے (۴) اکال گڑھ کے ایک درزی امام دین کی ۹ سالہ لڑکی کے ککرے تھے وہ کسی ڈاکٹر سے کاسٹک لگواتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھ کا ڈیلہ سفید ہو گیا اور آنکھ سے پانی ... رات بہنے لگا اور درد سے لاچار لڑکی دن رات آرام نہ کر سکتی تھی میرے پاس آئے صرف تین یوم میں کلی آرام ہوا درد اور پانی بہنا تو پہلے ہی روز بند ہو گیا اور لڑکی پہلے ... ہو گئی (۵) یہی حالت چوہدری عنایت اللہ صاحب نمبردار کی بیوی کی تھی آنکھ کی سرخی درد اور پانی بہنے سے سخت تکلیف تھی پرماتما کے فضل سے تین روز میں نارمل پوٹینسی سے ... صحت حاصل کی (۶) ایک ... سید ... کا مریض جو ذات کا چنگڑ اور سید نگر گاؤں کا رہنے والا تھا دو ماہ کے متواتر علاج سے بالکل شفایاب ہوا (۷) چھوٹی چھوٹی مرضیں مثلاً آشوب چشم آنکھ سے پانی بہنا وغیرہ کے پندرہ مریض صحتیاب ہوئے (۸) چند آنکھ کے ۸ مریض پڑبال کے دو مریض ناخنہ کے پانچ مریض ابتدائی موتیا بند سفید کے پانچ مریض بالکل صحتیاب ... اب دوائی کا اسٹاک میرے پاس ختم ہو چکا ہے چند دنوں تک یا دسہرہ سے پہلے حاضر ہونگا کچھ اشتہار اور بورڈ میرے نام کے بنا جاؤ اور کوئی اچھا طریقہ ... تیار کر ... چاہتا ہوں آپ کا نام روشن کروں اب چونکہ لوگوں میں مشہوری ہو رہی ہے اگر زیادہ بڑھ گئی تو ایک دو روز کے واسطے آپ کو یہاں بلاؤں گا۔ میرے لائق کوئی خدمت ...

داس برج لال جوشی حکیم حاذق۔ جوشی فارمیسی اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ

قیمتیں: سپیشل پوٹینسی گیارہ روپے چار آنے۔ نارمل پوٹینسی بڑی چار روپے چار آنے۔ چھوٹی شیشی دو روپے چار آنے علاوہ محصول ڈاک و خرچ پیکنگ ... طریقہ استعمال ہر زبان میں ہمراہ شیشی ہوگا۔ سپیشل پوٹینسی کی دوائی منگوانے کیلئے مبلغ پانچ روپیہ پیشگی آنا لازمی ہیں۔ اپنے شہر کے مشہور دوا فروشوں سے طلب ... نقال پیدا ہو چکے ہیں ان کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لئے کارڈ بورڈ کے ... پر موجود ... کا فوٹو ملاحظہ فرما کر اصلی چیز کو حاصل کریں۔

مینیجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ (اے ایل) ۹ - ایبٹ روڈ - لاہور

عشق اور موت

ٹینی سن کا پرتوِ خیال

از جناب حکیم گلچیں کرنالی

(۱)
ازل کا سماں کیا مسرت فضا تھا، سہانا سہانا عجب خوشنما تھا،
بسی تھی نہ اب تک یہ دنیائے رنگیں بسانے کا سامان مگر ہو رہا تھا،
نہایت حسیں بخششیں ہو رہی تھیں "عطائے الٰہی" کا دفتر کھلا تھا
ستارے ابھی روشنی لے رہے تھے مہ و مہر کو نور گو مل چکا تھا
گلوں پر تو رنگینیاں لٹ رہی تھیں حسینوں کو درسِ حیا مل رہا تھا
فلاطوں، ارسطو و بقراط و سعدی انھیں حکمت و فلسفہ مل چکا تھا
غزالی و رازی و رومی و حافظ تصوف میں کامل انھیں کر دیا تھا
کسی کو شجاعت، کسی کو درایت کہیں دولت و زر "عطا در عطا" تھا
ادھر حسن لیلےٰ کو ہوتا تھا بخشش دل قیس کو عشق ادھر مل رہا تھا
فرشتے یہ منظر کھڑے دیکھتے تھے
جمائے پرے کے پرے دیکھتے تھے

(۲)
یہ قدرت کی محفل جمی کی جمی تھی، ہر اک شے میں اک دلکشی دلبری تھی
تبسم تھا ہونٹوں پہ غنچوں کے رقصاں لبوں پر گلوں کے ہنسی آ رہی تھی +
چلے تھے نہ جھونکے ابھی تک خزاں کے ہری شاخ نو رستۂ زندگی تھی
جہاں پر ضیا پڑ رہی تھی ہلکی ہلکی سہانی عجب روشنی کی گھڑی تھی
اسی عرصہ میں کچھ "پری زادیوں" کی نہایت "حسیں صف" چلی آ رہی تھی
بداماں نور جس کا طبیعت سی بجلی اک اس "دستۂ گل" میں "ایسی کلی" تھی
اداؤں میں فتنے تبسم میں شوخی نظر میں لئے "جادوئے نیستی" تھی،
فرشتے سے یہ عشق کے میں نے پوچھا کہ یہ کون تھی؟ کس چمن کی کلی تھی
فرشتہ ذرا مسکرا کر یہ بولا، کہ یہ موت تھی، دشمن زندگی تھی
یہ کہہ کر فرشتے نے جا اس کو روکا مگر "موت" کچھ "عشق" سے جھینپتی تھی
چلے گا نہ جادو ترا مجھ پہ ہرگز کہا عشق نے موت بھی سن رہی تھی
مگر کچھ نہ بولی نگاہیں چرائے کھڑی شرم آگیں ہنسی ہنس رہی تھی

ذرا آنکھ اٹھتے ہی شرما کے بھاگی
بہت عشق سے موت گھبرا کے بھاگی

خشک مسکراہٹ

افسانہ

از جناب محمد صابر منبط ایم اے (سی ایل)

رنجیت ایک تصویر کے خاکے میں رنگ بھرنے میں محو تھا اس نے کسی عورت کے نرم و نازک قدموں کی چاپ سنی پھر بھی وہ موقلم کو اپنے خاص انداز میں پکڑے برابر رنگ بھرتا رہا یہ کسی فلم ایکٹرس کی شبیہ تھی جو وہ تیار کر رہا تھا پہلی ہی نظر میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں نظر آتی تھی وہ لبوں پر ایک خشک سی مسکراہٹ تھی وہ اپنے فن میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اسے یہ بھی علم نہ ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہے اس کی نگاہیں پردے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ کی جنبش موقلم سے پردے پر گلکاریاں کر رہی تھیں اسنے کسی کے سانس لینے کی آواز محسوس کی پھر بھی اپنے کام میں لگا رہا۔ اس کے جسم کو کسی نے خفیف سی جنبش دی۔ پھر بھی وہ نہ چونکا مگر کان پر ہلکی سی گدگدی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ اس کے خیالات کا شیرازہ پریشان ہو گیا۔ اس نے برش کو جھنجلا کر زمین پر پھینک دیا اور اپنے کان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنی نگاہوں کو پردے سے ہٹا لیا اسوقت اس کا دل مختلف جذبات و احساسات سے لبریز تھا۔ ایک دم وہ ادائے استغنا سے جس میں غصہ بھی جھلکتا ہوا نظر آ رہا تھا دیکھنے کے لئے پیچھے مڑا دو روشن اور چمکیلی آنکھوں کو اس نے اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے پایا۔

"یہ کیا حرکت ہے"؟ اس نے کرخت لہجے میں دریافت کیا۔ وہ نووارد عورت میز کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی وہ رنجیت کی طرف ایسی نظروں سے تکتی رہی جیسے زخم خوردہ ہرنی اپنے شکاری کو دیکھتی ہے۔

"کیا تم نہیں جانتے، کیا تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟" اس نے روکھے پن سے کہا۔

"نہیں........" رنجیت نے اس طرح رک رک کر جواب دیا جیسے کچھ سوچ رہا ہے اور حیرت زدہ آنکھوں سے اپنے دیوار کے نقش و نگار کے پیچ و خم کو دیکھنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل کے تاریک گوشوں میں روشنی کی اس رمق کو جو ایک ہار چکا کر تاریکی میں تحلیل ہو چکی تھی ابھار کر اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ عورت اس منظر کی تاب نہ لا سکی اور ایک جذبۂ بے اختیار سے اپنے ہاتھوں کو رنجیت کی گردن میں حمائل کر دیا۔ مگر رنجیت بت کی طرح خاموش کھڑا رہا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟ کیا تم یہی چاہتے ہو کہ میں اپنی زبان سے کہوں..... (وہ ایک لمحے کے لئے رکی) "نہیں نہیں" اپنے بڑھتے ہوئے جذبات پر اس عورت نے قابو پاتے ہوئے کہا اور جس بے قراری سے باہیں رنجیت کی گردن کے گرد پہنچی تھیں اسی اضطراب کے ساتھ اپنی جگہ واپس آ گئیں اب وہ خاموش کھڑی تھی ساکت و جامد بالکل اسی طرح جیسے سمندر آنے والی طوفانی رات کے انتظار میں ہو۔

رنجیت کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ پریھا...... ایک فلم ایکٹرس.... جس کی وہ تصویر بنا رہا ہے...... کیا وہ اس سے پیار بھرے لہجے میں باتیں کر رہی ہے۔ کیا اس لئے کہ وہ اس کی تصویر بنا رہا ہے....... نہیں بیساختہ اس کی زبان سے نکلا...... پھر اس نے سوچا۔ تو یہ سب کھیل....... یہ تمام اداکاری حقیقی ہے.... کیا یہ ممکن ہے، وہ اسی دماغی الجھنوں میں مبتلا تھا۔

"کیا تم کچھ نہیں سمجھے، کیا تمہیں اب تک میری باتوں کا احساس نہیں ہوا" اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

یہ سچ ہے کہ اس نے آج تک کسی فلم ایکٹرس کو جیتا جاگتا اس سے پریم کی باتیں کرتے نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ اس لئے اسکے دماغ کا توازن قائم نہ رہا۔ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے اسی بنا پر تمہیں اس کی خامیوں کو درگذر کرنا چاہئے اسے معاف کر دینا چاہئے۔

"مجھے معاف کر دو" رنجیت نے بھی اسے اپنے بازو میں دباتے ہوئے کہا۔

"نادان نہ بنو پیارے" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آخر تم نے میرا بگاڑا ہی کیا ہے؟"

رنجیت کو اس کے ضمیر نے پھر جھنجھوڑا۔ اس نے یکایک غضبناک لہجے میں کہا "تو، تو، شیطان کہیں کی، مجھے کہتی ہے کہ میں تیرے ساتھ گناہ کی تاریکیوں میں کھو جاؤں، گم ہو جاؤں، ہمیشہ کیلئے"

"اسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ تمہی سے بیاہ کروں اب صرف تم... ہی..... سے۔"

رنجیت پھر سنبھلا اس کا سر جو ابھی نیکی کی عظمت سے بلند تھا آہستہ آہستہ جھک گیا۔ ایک خشک سی ہنسی اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

"کیا تم یہاں میرے ساتھ ریہرسل کرنے آئی ہو کیا تمہیں اس قسم کا پارٹ ادا کرنا ہے"۔ اس نے مذاق کے طور پر یہ بھا سے پوچھا۔

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی "تم ایک ایسے آرٹسٹ سے شادی کرنا چاہتی ہو جسے روزی کمانے کے لئے بھی بڑی کشمکش کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک شخص جو اپنی گذران مشکل سے کر سکتا ہے شادی کا خیال بھی کس طرح کر سکتا ہے اور پھر شادی بھی ایک فلم ایکٹرس سے۔"

"خدا کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے تمہیں اس کی فکر نہ کرنی ہوگی میرے پاس اتنا ہے کہ ہم دونوں مزے سے... "

"شعلوں کی لپیٹ میں کود پڑ سکتے ہیں نا" رنجیت نے پھر غصہ سے بیتاب ہو اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "کیا تم یہ خیال کر رہی ہو کہ میں تمہارا دست نگر بن کر رہوں گا یہ تمہارا خیال بالکل غلط ہے اور میں..... میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ نہ کبھی کر سکتا ہوں اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا، یہ کہہ کر بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور دروازے کو اتنے زور سے بند کیا کہ پربھا ڈر گئی وہ کانپ اٹھی اور چند لمحوں کے بعد وہ بھی اسٹوڈیو سے باہر چلی گئی۔

دو ہفتے تک پربھا اسٹوڈیو میں نہ آئی اور رنجیت نے اطمینان سے اس کی تصویر کو مکمل کر دیا۔ اس نے حتی الامکان اسے اپنی فن کاری کا شاہکار بنانے کی کوشش کی وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا۔ مگر ایک عجیب بات تھی اور یہی اس تصویر کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی مگر مصور اس سے مطمئن نہ تھا۔ اس نے ہر زاویے سے تصویر کو دیکھا وہ ایک بار پھر کوشش کرنا چاہتا تھا کہ اس مسکراہٹ کی نوعیت کو بدل دے اور اسی ارادہ سے وہ اپنی تصویر کو بار بار غور سے دیکھ رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی،

رنجیت نے دروازہ کھولا اور ایک ضعیف شخص اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات لئے داخل ہوا۔ اس کی کھانسی کی آواز کمرے کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔

"کیا تمہارا نام رنجیت ہے"؟ اس نے کھانستے ہوئے آہستہ سے دریافت کیا۔

"جی ہاں"! رنجیت نے بے صبری سے جواب دیا۔

"۱۵ر جون ۱۹۱۴ء کیا تھا۔ یہی پیدائش کی تاریخ ہے"؟ اس شخص نے کاغذات پر ایک معنی خیز نگاہ ڈال کر پوچھا،

"جی ہاں بجا فرمایا آپ نے" اس نے جواب دیا،

"میں تمہیں ایک بری خبر سنانے آیا ہوں مسٹر رنجیت! کیا تم اس کے سننے کے لئے تیار ہو"۔ ضعیف شخص نے بزرگانہ انداز میں سوال کیا۔

رنجیت اس دوران میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔ وہ بولا۔ "میں بری سے بری خبر بھی سننے کے لئے تیار ہوں، فرمایئے وہ منحوس خبر کیا ہے؟ جس کے سنانے کے لئے آپ نے یہاں تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائی"؟

"کیا تمہارا کوئی بھائی رنگون میں سکونت پذیر تھا"؟

"جی ہاں! لیکن مجھے ان کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں، میرے بڑے بھائی رنگون میں رہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اس وقت چھوڑا تھا جب میں بالکل بچہ تھا"۔ رنجیت نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے نووارد بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"چار مہینے ہوئے ایک ہوائی حملے کے دوران میں ان کا انتقال ہو گیا ہے" بوڑھے نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"اُف خدایا، یہ میں کیا سن رہا ہوں"؟ رنجیت نے ایک سرد آہ بھر کر کہا،

"انہوں نے مرنے سے ایک ماہ قبل مرحوم نے بینک کا حساب [illegible] کلکتہ میں تبدیل کر دیا تھا اور یہ بھی تاکید کر دی تھی [illegible]

وہ کسی سانحہ کا شکار ہو جائیں تو ان کے بعد یہ سرمایہ تمہیں دیدیا جائے۔ تمہارے بھائی کے اب پچاس ہزار روپئے اب تمہارے نام منتقل کر دئے گئے ہیں۔ رنجیت اپنے بھائی کی موت کی خبر سن کر بہت غمزدہ ہوا وہ اپنے لئے دنیا میں تنگی محسوس کرنے لگا غم سے اس کا دل بھر آیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس بات نے اسے مسرت سے پاگل بنا دیا کہ بہت جلد پچاس ہزار روپئے کی خطیر رقم ملنے والی ہے۔ انسان جذبات کا پتلا ہے اس کی فطرت کس قدر متغیر واقع ہوئی ہے یہی انسان کی زندگی کا راز ہے یہی نوع انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کا اسے یقین نہ آتا اگر بنک کا آدمی اس کے سامنے دستاویز لئے کھڑا نہ ہوتا۔ اسے یقین کرنا ہی پڑا وہ خوبصورت تصویر جو ابھی اس کی مسرت کا مرکز تھی اسے مختلف رنگوں کا ایک دھبہ نظر آنے لگی۔ اسے کمرے کی ہر چیز رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ زمین اس کے پاؤں کے نیچے دھنستی ہوئی محسوس ہونے لگی ایک ثانیہ کے بعد اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور کسی نسوانی آواز سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا۔

رنجیت اور پربھا نے ایک شاندار مکان کرایہ پر لے لیا تھا یہ بالکل جھیل کے کنارے واقع تھا۔ اگلے حصے کا منظر خوشنما اور دلفریب تھا، برآمدے میں پربھا رنجیت کے قریب بیٹھی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جس میں سچی محبت جھانکتی دکھائی دیتی تھی۔ پربھا نے رنجیت پر اپنا نازک بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"پیارے اب ہماری شادی ہو گئی ہے میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک تلخ حقیقت سے آگاہ کر دوں کیا تم مجھے معاف کر دوگے؟ اگر میں تمہارے سامنے اپنے قصور کا اعتراف کر لوں"

رنجیت نے ہنس کر کہا "پربھا! اس وقت تو تم بلا کی حسین نظر آ رہی ہو۔ میں تمہیں دیکھ کر اپنے دل میں بے پناہ مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو سب کچھ معاف کر دوں گا"

اس نے اپنی مخمور اور چمکدار آنکھوں کی شریر پتلیوں کو حرکت دے کر کہا "تمہارے بھائی اب تک زندہ ہیں صحیح و سلامت ہیں"

"کیا یہ سچ ہے کہ میرا بھائی زندہ ہے" رنجیت نے کرسی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

"اور" پربھا متحکم آواز سے کہنے لگی "پچاس ہزار روپئے تمہیں نہیں مل سکتے"

"لیکن بنک کے آدمی نے مجھے یقین دلایا ہے کیا وہ جھوٹ کہہ سکتا ہے"

"آہ وہ بوڑھا رمیش"۔

"کون"

"آہ بنک کا ایجنٹ"۔

"کیا تم سچ کہتی ہو کہ وہ جھوٹا تھا۔ دغا باز تھا"

"نہیں پیارے وہ میرا بھائی دیکھو ناراض نہ ہو تم نے مجھ سے پہلے ہی وعدہ کیا ہے کہ تم ناراض نہ ہوگے"۔

"ہائے تم نے کیا کیا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا"

"میں جانتی ہوں" اس نے کہا اور اپنے نازک ہاتھ سے اس کے بال سنوارنے لگی "کیا تم نہیں جانتے کہ میں تم سے......"

"ہاں میں جانتا ہوں تم نے مجھے دھوکا دیا ہے"۔

"نہیں پیارے! ہمارے اس رومان کی قیمت پچاس ہزار روپئے ہے"۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

جب وہ مسکرا رہی تھی تو رنجیت کو خیال آیا کہ یہ ویسی ہی خشک مسکراہٹ ہے جو اس کی تصویر میں پربھا کے لب لعلیں پر رقص کر رہی ہے۔

داستاں

جلوے فروغ دہر اسی دل ستاں کے ہیں
جلے نہیں۔ چراغ یہ کون و مکاں کے ہیں

ہجر حبیب رشک عدو، فکر آسماں
دل ایک ہے مگر الم اس میں جہاں کے ہیں

اے برق لالہ و گل و نسریں کا واسطہ
گلشن میں چار تنکے مرے آشیاں کے ہیں

سب کچھ تو جانتے ہیں مگر اس کا کیا علاج!
کہتے ہیں وہ کہ نالے یہ کس ناتواں کے ہیں

اللہ میرے عشق کی روداد کے مزے
مشتاق وہ بھی آج مری داستاں کے ہیں

حسرت میں ان کو ڈھونڈھ ہی لونگا بقول داغ
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

ریل کی پٹری پر

نوشتہ:۔ گارشن (روسی)

مترجمہ:۔ جناب اختر رازچاندی پوری

سیمن ایوانوف ریلوے لائن پر ایک چوکیدار تھا۔ اس کی چوکی سے نزدیک ترین اسٹیشنوں کا فاصلہ ایک جانب بارہ ورسٹ اور دوسری جانب دس ورسٹ تھا۔ گذشتہ سال وہاں سے چار ورسٹ کے فاصلہ پر ایک بڑا کارخانہ جاری ہوا تھا اور اس کی بلند اور سیاہ چمنیاں جنگل کے اس طرف سے بھی نظر آتی تھیں۔ اس کارخانے کے نزدیک ان چوکیوں کے سوا جن میں سے ایک میں سیمن رہتا تھا اور کوئی آبادی نہ تھی۔

سیمن ایک اداس، افسردہ اور دل شکستہ شخص تھا۔ اب سے نو سال پیشتر وہ ایک فوجی افسر کا اردلی تھا اور میدان جنگ میں بھی ایک بار وہ اس کے ساتھ رہ چکا تھا۔ اس نے بھوک اور سردی کی تکالیف برداشت کی تھیں۔ وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جلا تھا، اسے گرمی اور کہر کے زمانے میں چالیس پچاس ورسٹ چلنا پڑا تھا وہ توپوں کی آتش باری کے سایہ میں رہا تھا۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے اسے کوئی گولی نہ لگی تھی۔ اس کی رجمنٹ اور ترکوں کے درمیان جو خندق کی دوسری طرف تھے مسلسل آتش باری جاری رہی تھی جو صبح سے شام تک کبھی نہ رکتی تھی۔ سیمن کا افسر بھی صف اول میں تھا اور وہ اپنے افسر کے لئے دن میں تین بار کھانا اور گرم چائے فوجی باورچیخانہ سے جو ایک غار میں تھا لے جاتا تھا۔ اسے راہ میں ایک میدان پار کرنا پڑتا تھا اور گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے چاروں طرف سے گزرتی تھیں اور پھر پتھروں سے جا ٹکراتی تھیں۔ وہ خوفزدہ ہو جاتا مگر قدم بڑھائے جاتا تھا۔ افسر اس سے بہت خوش تھا کیونکہ اسے ہمیشہ گرم چائے ملتی تھی۔

وہ صحیح و سلامت میدان جنگ سے واپس ہوا لیکن اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں درد رہنے لگا۔ اس وقت سے اس پر اور بھی افتادیں پڑی تھیں۔ جب وہ گھر واپس آیا تو اس کا بوڑھا باپ اور اس کا چار سالہ لڑکا گذر گیا۔ اب صرف وہ اور اس کی بیوی رہ گئی اسے کھیتی باڑی میں کوئی نفع نہ ہوا الغرض ہوتا بھی کس طرح کیونکہ ورم شدہ ہاتھوں اور پاؤں سے ہل جوتنا کوئی آسان کام نہیں۔ آخر کار وہ دونوں میاں بیوی اپنے گاؤں کو خیرباد کہہ کر تلاش معاش میں روانہ ہوئے۔ انھوں نے خارکوف اور ڈان میں ریلوے کی نوکری تلاش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کچھ دنوں بعد اس کی بیوی کو ایک جگہ ملازمت مل گئی۔ اور وہ خود ملازمت کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ ایک مرتبہ اسے ریل میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ راہ میں جب ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جب اس نے نگاہ ڈالی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ وہاں کے اسٹیشن ماسٹر کو جانتا تھا۔ سیمن نے اسے اور اسٹیشن ماسٹر نے سیمن کو دیکھا اور انھوں نے ایک دوسرے کو شناخت کر لیا اسٹیشن ماسٹر اس کی "رجمنٹ" میں ایک افسر تھا۔

"تم ایوانوف ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب! یہی میرا نام ہے"

"یہاں تم کیسے آئے؟"

سیمن نے تمام رام کہانی سنادی۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟"

"معلوم نہیں میرے آقا!"

"کیا مطلب ہے اس سے تمھارا — بیوقوف! تم کو کچھ معلوم نہیں"

"ہاں جناب! کیونکہ مجھے ابھی کہیں ملازمت نہیں ملی ہے مجھے ابھی ملازمت تلاش کرنی ہے"

اسٹیشن ماسٹر نے اس کی طرف دیکھا — کچھ سوچا اور کہا "دیکھو میرے دوست! تم فی الحال یہیں اسٹیشن پر ٹھہر جاؤ۔ میرا خیال ہے تم شادی شدہ ہو؛ تمھاری بیوی کہاں ہے؟"

"ہاں جناب! درست ہے۔ میں شادی شدہ ہوں میری بیوی کرسک میں ایک تاجر کے یہاں ملازم ہے"

"اچھا تو تم خط لکھ کر اپنی بیوی کو یہاں بلا لو۔ میں تمھیں ایک "فری پاس" دلا دونگا۔ جلد ہی ہماری ایک چوکی خالی ہونے والی ہے۔ میں تمھارے متعلق اس حلقہ کے افسر سے گفتگو کرونگا"

"میرے آقا - میں آپ کا بہت احسان مند ہوں" سیمن نے کہا۔

وہ اسٹیشن پر رہنے لگا۔ وہ اسٹیشن ماسٹر کے باورچی خانہ کے لئے لکڑیاں پھاڑ دیا کرتا تھا۔ اور اسٹیشن کے برآمدے اور پلیٹ فارم پر جھاڑو دیا کرتا تھا۔ ہفتہ عشرہ میں اس کی بیوی بھی وہاں آگئی اور سیمن ایک ٹھیلے پر اپنا اسباب رکھ کر اپنی چوکی پر گیا جو کہ بالکل نئی اور گرم تھی۔ اس کا سابق مکین ایک چھوٹا سا باغ چھوڑ گیا تھا، اور ریلوے لائن سے ملحق تقریباً ایک ایکڑ زمین قابل کاشت تھی۔ سیمن یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سوچنے لگا کہ وہ کس طرح کاشت کرے گا اور ایک گائے اور ایک گھوڑا خریدے گا۔

اسے ریلوے کی طرف سے وہ تمام چیزیں ملیں جن کی اسے ضرورت تھی —— ایک سبز اور ایک سرخ جھنڈی —— ایک لالٹین۔ ایک ہارن (بھونپو) —— ایک ہتھوڑا —— ایک پانا نٹ کسنے کے لئے۔ ایک سبل۔ ایک پھاوڑا۔ ایک جھاڑو —— دو بالٹیاں اور بکس —— ان چیزوں کے علاوہ اسے دو کتابیں بھی دی گئیں یعنی ریلوے کے قواعد اور ٹائم ٹیبل۔ اول اول سیمن رات بالکل نہ سو سکا۔ وہ ہمیشہ ٹائم ٹیبل پڑھتا رہتا تھا۔ اگر کوئی ٹرین دو گھنٹہ بعد آنے والی ہوتی تو وہ اپنے حلقہ کا ایک چکر لگا آتا اور گھر کے پاس پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ جاتا اور سنتا کہ کہیں ریل کی پٹریاں تو نہیں گونج رہی ہیں؟ ریل گاڑی کی آواز تو نہیں آرہی ہے؟ اس نے تمام قواعد ازبر کر لئے حالانکہ اسے ہر لفظ ہجے کرکے پڑھنا پڑتا تھا تاہم اس نے ان سب کو ازبر کر لیا۔

موسم گرما میں اس کا کام آسان ہو جاتا تھا کیونکہ اول تو ان دنوں کہرہ ہوتی تھی اور ریل گاڑیاں دور ہی سے نظر آجایا کرتی تھیں دوم اس لائن پر بہت کم گاڑیاں آیا کرتی تھیں۔ اس لئے دن میں اپنے حلقہ کا دو بار چکر لگا آیا کرتا تھا۔ ادھر ادھر نٹ کس دیا کرتا تھا۔ پتھر کی گٹیوں کو درست کر دیا کرتا تھا اور پھر گھر واپس آجایا کرتا تھا۔ اپنی زمین کی کاشت کرے لیکن اس میں ایک رکاوٹ تھی۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا تو اسے روڈ ماسٹر سے اجازت لینا پڑتی تھی جو اس حلقہ کے افسر کے پاس ایک رپورٹ بھیجتا تھا۔ اس سے پیشتر کہ اس کی درخواست منظور ہو کام کا وقت گذر جاتا تھا۔ اس لئے سیمن اور اس کی بیوی اپنی موجودہ زندگی کو بے کیف محسوس کرنے لگے۔

تقریباً دو ماہ اسی طرح گذر گئے۔

سیمن نے پڑوس کے چوکیداروں سے دوستی پیدا کر لی۔ ان میں سے ایک بہت ہی بوڑھا تھا جس کی میعاد ملازمت ختم ہونے کی بہت دنوں سے افواہ تھی کیونکہ وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتا تھا اور اس کی بیوی اس کا کام کر دیا کرتی تھی۔ دوسرا چوکیدار جو اسٹیشن کے قریب کی چوکی پر تھا۔ ایک دبلا پتلا جوان تھا۔ سیمن کی اس سے سب سے پہلی ملاقات ریلوے لائن پر ٹھیک اس جگہ ہوئی تھی۔ جہاں ان دونوں کے حلقے ملتے تھے۔

سیمن نے ٹوپی اتار کر اسے سلام کیا۔

"پیارے پڑوسی، خدا تمہاری صحت اچھی رکھے" اس نے کہا۔

اس کے پڑوسی نے اسے بغور دیکھا۔

"آپ کا کیا حال ہے؟" اس نے جواب دیا اور پھر گھوم کر واپس چلا گیا ——

کچھ دنوں کے بعد ان کی بیویوں میں ملاقات ہوئی۔ سیمن کی ارینا نے پڑوسی کی بیوی کو سلام کیا اس نے بھی تھوڑی سی گفتگو کی اور پھر واپس چلی گئی۔ ایک مرتبہ سیمن اس سے ملا اور اس نے کہا۔

"یہ کیا بات ہے جوان خاتون! کہ تمہارا شوہر بہت کم گو ہے"

پہلے تو وہ کچھ خاموش رہی پھر بولی "اسے تم سے بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے، خدا کے لئے تم اپنا کام کرو"

تاہم ابھی ایک ماہ بھی نہ گذرا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ جب کبھی سیمن اور واسلی کی ریلوے لائن پر ملاقات ہوتی تو وہ ایک کنارے بیٹھ کر اپنے چھوٹے چھوٹے پائپ سلگاتے اور اپنی طرز بود و باش سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے۔ واسلی اکثر خاموش رہتا لیکن سیمن بولتا ہی رہتا اور اپنے پڑوس کے گاؤں اور جنگ کی کہانیاں سناتا۔

"میں نے اپنی زندگی میں بہت تکالیف برداشت کی ہیں" اس نے کہا "اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان تکالیف کو اٹھائے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے۔ خدا نے مجھے خوش قسمت نہیں بنایا۔ جو کچھ ہماری قسمت میں خدا نے لکھ دیا ہے وہ ضرور ہونا چاہئے بھائی واسلی!"

واسلی نے پائپ میں سے راکھ گرائی اور کھڑا ہو گیا۔

"خدا ہمیں ایسی قسمت نہیں دیتا جو ہمارے خلاف ہو۔ بلکہ انسان ایسا کرتا ہے" اس نے کہا۔ "درندے بھی ہم انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ بھیڑیئے بھیڑیئے کو نہیں کھاتے لیکن انسان دوسرے انسانوں

کو زندہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔"

"نہیں نہیں بھائی۔ بھیڑیئے بھیڑیوں کو کھاتے ہیں۔ تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔" سیمن نے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ جو بات میرے دماغ میں آئی میں نے اسے بیان کر دیا تاہم انسان سے زیادہ اور کوئی جاندار بے رحم نہیں ہے۔ اگر انسان بے رحم اور حریص نہ ہوتا تو ہر شخص اچھی طرح رہ سکتا تھا۔ لیکن ہر شخص اس تلاش میں رہتا ہے کہ کب اسے موقع ملے اور وہ تمہیں زندہ دبوچ لے اور تمہارا آخری نوالہ بھی چھین کر ہڑپ کر جائے۔"

سیمن نے اس بات پر ذرا غور کیا۔

"مجھے معلوم نہیں برادر!" اس نے کہا۔ "شاید ایسا ہی ہوتا ہو تو یہ تو خدا نے متعین کر دیا ہے۔"

واسلی نے جواب دیا۔ "اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو ہمیں ایک دوسرے کا گلا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر ہم ہر نا انصافی کا الزام خدا پر لگائیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور تکالیف برداشت کرتے رہیں تو ہم انسان نہیں بلکہ چوپائے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور خدا حافظ کہے بغیر چلا گیا۔ سیمن بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"پڑوسی! تم مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہو؟" وہ اس کے چلے جانے کے بعد چلایا۔ مگر اس کا پڑوسی واپس نہ آیا۔ سیمن کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ گھاٹی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا وہ گھر واپس آیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ "ارینا! ہمارا پڑوسی عجیب شخص ہے۔ وہ آدمی نہیں بلکہ ایک غضبناک جانور ہے۔"

تاہم انھوں نے کوئی [illegible] نہ کیا۔ وہ بہت جلد پھر ملے اور بیٹھ کر پہلے کی طرح گفتگو کرنے لگے — وہی ہمیشہ کی طرح ایک ہی مضمون پر —!

"لیکن میرے دوست! اگر ہمیں بھی آدمی سمجھا جاتا تو ہم (ان) چوکیوں میں نہ رہتے۔" واسلی نے کہا۔

"چوکیوں میں کیا ہے؟ یہ اتنی بُری نہیں ہیں۔ تم ان میں رہ سکتے ہو —" سیمن نے کہا۔

"تم ان میں رہ سکتے ہو۔ یہی تمہارا مطلب ہے نا؟ تم نے اپنی زندگی میں کچھ حاصل نہ کیا۔ تم نے بہت دیکھا لیکن کچھ نہ دیکھا۔ کچھ معلوم بھی ہے تمہیں کہ ایک غریب ایک چوکی میں یا کسی دوسری جگہ کس قسم کی زندگی بسر کرتا ہے؟ وہ تمہیں زندہ کھا جائیں گے — خون چوسنے والے — وہ تمہارے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیں گے۔ اور جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے تو وہ تمہیں دور پھینک دیں گے — ایسے فضلے کی طرح جو صرف سور کے بچے ہی کے لائق ہوتا ہے۔ کیا تنخواہ ملتی ہے تمہیں؟"

"بس یہی بارہ روبلیں واسلی!"

"اور مجھے ساڑھے تیرہ روبلیں ملتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کمپنی کے قواعد کے مطابق ہم سب کی تنخواہ برابر ہونی چاہئے — پندرہ روبلیں ماہانہ مع روشنی اور ایندھن۔ یہ کس کا حکم ہے کہ ہم — تم اور میں — بارہ روبلیں یا ساڑھے تیرہ روبلیں پائیں پہلے یہ بتاؤ؟ پھر تم یہ کہتے ہو کہ ایک شخص اپنی گذر کر سکتا ہے تمہیں سمجھو کہ یہ ڈیڑھ روبل یا تین روبل کا سوال نہیں ہے۔ اگر وہ پندرہ بھی دیں تب بھی ہمارا اعتراض باقی رہتا ہے۔ گزشتہ ماہ جب ڈائرکٹر اس طرف سے گذرا تھا تو میں اسٹیشن پر موجود تھا اور میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے پاس سب طرح کی عزت تھی۔ وہ ایک خاص گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلا اور پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا — اچھا مجھے زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ اور میں اس طرف سیدھا جاؤں گا —" واسلی نے کہا۔

"کہاں جاؤ گے دوست! ہونے دو جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہاں تمہارا گھر ہے — کھانے کو کافی ہے۔ زمین ہے اور بیوی ہے جو سب کام کر سکتی ہے۔"

"زمین —؟ ذرا میری زمین کو دیکھو۔ اس میں ایک پودا تک نہیں ہے۔ گذشتہ بہار میں میں نے گوبھی کی کچھ کاشت کی تھی روڈ ماسٹر آیا اور کہنے لگا — "یہ کیا ہے؟ کوئی درخواست تم نے دی تھی؟ تمہیں اجازت مل گئی ہے؟ اکھاڑ دو انھیں فوراً — ایک نشان تک بھی باقی نہ رہنا چاہئے۔" وہ پیئے ہوئے تھا کسی دوسرے وقت وہ کچھ بھی نہ کہتا۔ لیکن وہ مدہوش تھا۔ [illegible] تین روبلیں جرمانہ کر کے چلا گیا۔"

واسلی نے خاموشی کے ساتھ پائپ کا ایک کش لیا اور پھر کہنے لگا: "اگر وہ کچھ اور کہتا تو میں اسے مار مار کر ہلاک کر دیتا"

"خوب! خوب! دوست! مجھے بتا دینا چاہئے کہ تم خدا گرم مزاج کے مالک ہو۔"

"نہیں، میں گرم مزاج نہیں ہوں۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں اسے صاف صاف اور سچ کہہ دیتا ہوں [illegible]

"ویسا ہی پائے گا۔ میں حلقے کے افسر سے شکایت کروں گا۔"

آخر اس نے شکایت کر دی۔

حلقہ کا افسر لائن معاینہ کرنے آیا۔ تین دن بعد پیٹرس برگ کی چند مشہور ہستیوں کی وہاں سے گذرنے کی امید تھی اور اسی لئے معاینہ کیا جا رہا تھا تا کہ ان کے گذرنے سے پہلے ہر چیز قاعدے سے رکھ دی جائے۔ جس جگہ ضرورت تھی وہاں پتھر کی گٹیاں ڈال دی گئیں اور انہیں ہموار کر دیا گیا۔ سلیپروں کا معاینہ کیا گیا اور جوڑوں کی ہتھوڑوں سے جانچ کی گئی۔ نٹ زیادہ کس دیئے گئے۔ کھمبوں کو رنگ دیا گیا اور ان جگہوں پر جہاں ریل سڑکوں کو پار کرتی تھی، پیلی ریت بچھا دی گئی۔ بڈھے چوکیدار کی بیوی نے اپنے خاوند کو خس و خار اکھاڑنے کو کہہ دیا۔ سیمن نے ایک ہفتہ تک سخت محنت کی اور سب چیزیں قاعدے سے رکھ دیں۔ اس نے اپنی وردی کو درست اور صاف کر لیا اور دھات کے بلّے کو اینٹ کی ریت سے اتنا رگڑا کہ وہ خوب چمکنے لگا۔ واسلی نے بھی خوب محنت کی۔ حلقہ کا افسر ایک ٹھیلے میں بیٹھ کر آیا جسے چار نوکر دھکیل رہے تھے پہئے بھنبھناتے تھے۔ ٹھیلا بیس ورسٹ فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا تھا حتیٰ کہ پہئے رونے لگتے تھے۔ ٹھیلا سیمن کی چوکی کے سامنے جا کر رکا۔ وہ باہر نکل آیا اور ایک سپاہی کی طرح سب کیفیت بیان کی۔

اس کی سب چیزیں باقاعدہ تھیں ——

"تم یہاں کب سے ہو؟" افسر نے پوچھا۔

"حضور دوسری مئی سے۔"

"اچھا شکریہ! ۱۶۴ نمبر پر کون ہے؟"

روڈ ماسٹر نے جو ٹھیلے پر اس کے ساتھ تھا جواب دیا ——

"واسلی اسپریڈونوف!"

"اسپریڈونوف —— اسپریڈونوف —— ؟ کیا وہی جسے گذشتہ سال ملامت کی گئی تھی؟"

"جی ہاں، وہی!"

"اچھا چلو۔"

نوکر ٹھیلے کو دھکیلنے لگے اور ٹھیلا روانہ ہو گیا۔

سیمن نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور سوچتا رہا۔ "یہ لوگ میرے پڑوسی کے ساتھ ضرور کوئی شرارت کریں گے۔"

دو گھنٹے بعد وہ اپنے دورے پر نکلا۔ گھاٹی میں سے کوئی شخص پٹری کے کنارے کنارے آتا تھا اسے نظر آیا جس کے سر پر کوئی سفید چیز تھی۔ سیمن نے ذرا غور سے دیکھا —— وہ واسلی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ اور کندھے پر ایک گٹھڑی تھی اور اس کے منہ پر ایک رومال بندھا ہوا تھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے دوست!" سیمن چلایا۔

واسلی اس کے بالکل نزدیک آ گیا۔ اس کا چہرہ خوفناک اور چاک کی طرح سفید تھا۔ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن وہ صاف صاف کچھ نہ کہہ سکا۔

"شہر کو جا رہا ہوں —— ماسکو کو —— محکمے کو —— !"

"محکمے کو —— ؟ نالش کرنے —— میرے خیال میں؟ چھوڑو بھی اسے بھول جاؤ ——"

"نہیں نہیں بھائی۔ میں اسے نہ بھولوں گا۔ بھولنے کا زمانہ گذر چکا دیکھو تو —— اس نے میرے چہرے پر کیسا گھونسا مارا —— خون بہنے لگا —— جب تک میں زندہ ہوں اسے کبھی نہ بھولوں گا۔ میں اسے ایسے ہی نہ چھوڑوں گا۔"

سیمن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"جانے دو —— میں سچ کہہ رہا ہوں —— حالات درست نہ ہوں گے"

"حالات کی درستگی؟ —— مجھے بخوبی علم ہے کہ حالات درست نہ ہو سکیں گے۔ تمہارا خیال تقدیر کے متعلق صحیح ہے۔ میں حالات اپنے لئے درست نہ کر پاؤں گا —— لیکن ایک شخص کو حق پر قائم رہنا چاہئے میرے دوست!"

"بتاؤ تو یہ ہوا کس طرح؟"

"ہوا کس طرح؟ اس نے سب چیزوں کا معاینہ کیا۔ وہ ٹھیلے سے اتر کر گھر میں گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ہر چیز کا بغور معاینہ کرے گا۔ اور اسی لئے میں نے ہر چیز کو سلیقے سے رکھ دیا تھا۔ وہ جانے کو تھا کہ میں نے شکایت کی۔ اس نے مجھ پر چیخنا چلانا شروع کر دیا اور کہنے لگا "یہ ایک سرکاری معاینہ ہے اور تم باورچی خانہ کے باغیچے کی شکایت کرتے ہو؟ یہ مشیران سلطنت کا معاملہ ہے اور تم اپنے گوبھی کے پھولوں کا رونا روتے ہو؟" میں ضبط نہ کر سکا —— زیادہ نہیں لیکن میرے الفاظ نے غالباً اسے ناراض کر دیا۔ اور اس نے میرے چہرے پر ایک گھونسا مارا۔ —— لیکن میں وہیں کھڑا رہا گویا ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ وہ چلا گیا اور میں ہوش میں آیا —— میں نے چہرہ دھویا اور روانہ ہو گیا ——"

"اور چوکی ——؟"

"میری بیوی ہے وہاں وہ دیکھ بھال کریگی ——— بہوت اچھا نے میں ان کو اور گاڑیاں کو۔"

واسلی کھڑا ہو گیا اور جانے کے لئے تیار ہوا۔

"خدا حافظ ایوان! میں نہیں جانتا کہ وہاں میرے ساتھ کیا ہوگا۔"

"کس طرح جاؤ گے؟"

"میں اسٹیشن ماسٹر سے مال گاڑی میں جانے کو کہونگا ——— کل تک ماسکو پہنچ جاؤں گا۔"

پڑوسی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ بہت دنوں تک وہ پھر نظر نہ آیا۔ اس کی بیوی تمام کام کرتی تھی۔ اور رات دن سوتی نہ تھی۔ وہ اس کے انتظار میں باہر بیٹھی رہتی۔ تیسرے دن انسپکٹر کی ٹرین گزری۔ ٹرین میں ایک انجن تھا۔ ایک مال گاڑی اور دو فرسٹ کلاس کے ڈبے تھے۔ واسلی اس وقت بھی وہاں کوئی نہ تھا۔ چوتھے دن سیمن کی اس کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ اس کا چہرہ فرط گریہ سے سوج گیا تھا۔ اور آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

"کیا تمہارا شوہر واپس آگیا؟" اس نے پوچھا۔

اس عورت نے صرف اپنا ہاتھ ہلایا۔ زبان سے کچھ نہ کہا اور اپنے راستے پر چلی گئی۔

سیمن کو بچپن ہی سے بید کی بانسری بنانا معلوم تھا۔ پہلے وہ بید کا گودا نکال دیتا تھا۔ پھر جہاں جہاں ضرورت ہوتی تھی سوراخ کر کے بانسری کا منہ بناتا تھا اور یہ سب کام اتنی خوش اسلوبی سے سر انجام دیتا تھا کہ بانسری پر ہر طرح کا گیت گایا جا سکتا تھا۔ وہ اوقات فرصت میں اس طرح کی بہت سی بانسریاں بناتا تھا اور انہیں مال گاڑی کے ایک گارڈ کے ہاتھ جسے وہ جانتا تھا شہر بھیج دیتا تھا۔ اور بازار میں اسے ایک بانسری کے دو پیسے مل جاتے تھے۔ انسپکٹر کے وہاں سے گذر جانے کے تین دن بعد اس نے اپنی بیوی کو چھ بجے شام کی ٹرین دیکھنے کو کہا اور خود ایک چاقو لیکر جنگل میں بانسری کے لئے بید کی شاخیں کاٹنے چلا گیا۔

وہ اپنے حلقے کے اختتام تک گیا ——— اس جگہ پٹریاں ایک تیز گھماؤ لیتی تھیں ——— اور پشتے سے اتر کر جنگل میں چلا گیا۔ تقریباً نصف ورسٹ دور ایک دلدل تھی۔ اور اسی کے نزدیک بانسری کے بہترین بید پائے جاتے تھے۔ اس نے بہت سی شاخیں کاٹیں اور ان کو لے کر واپس ہوا۔ وہ جنگل میں سے گذر رہا تھا۔ سورج پہلے ہی ڈوب چکا تھا۔ یہاں قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی اور صرف پرندوں کی چہچہاہٹ اور پاؤں کے نیچے سوکھی ٹہنیوں کی چرچراہٹ سنائی دیتی تھی۔ جب سیمن ریلوے لائن کے نزدیک پہنچا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسی آواز سن رہا ہے جو ایک دھات کو دوسری دھات پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ سیمن ذرا تیز چلنے لگا۔ لائن کے اس حصے پر تو مرمت بھی نہیں ہو رہی تھی "پھر اس کا کیا مطلب ہے؟" اس نے سوچا۔ اس نے جنگل کا سواد چھوڑ کر ریلوے لائن کے پشتے کو دیکھا۔ ریلوے لائن پر ایک شخص پالتی مارے بیٹھا تھا، اور کسی کام میں مشغول تھا۔ سیمن چپکے سے اس کے نزدیک پہنچا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید کوئی شخص نٹ چرانے آیا ہے۔ سیمن نے اسے دیکھا۔ وہ آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سبل تھا جو وہ ایک پٹری کے نیچے ڈال کر اسے ایک طرف سرکا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے چلانا چاہا لیکن چلا نہ سکا۔ اس نے دیکھا کہ وہ واسلی تھا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑا لیکن واسلی اپنا پانا اور سبل لے کر پشتے کے دوسری طرف بھاگ گیا۔

"واسلی! پیارے دوست! برادر! واپس آجاؤ! مجھے سبل دیدو۔ آؤ ہم پٹری کو اس کی جگہ پر رکھ دیں۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ آؤ۔ اور اپنی روح کو گناہ سے آلودہ نہ کرو۔"

لیکن وہ واپس نہ آیا اور جنگل کو چلا گیا۔

سیمن اکھڑی ہوئی پٹری کے کنارے کھڑا تھا اس نے بید کی لکڑیوں کو ایک طرف پھینک دیا۔ آنے والی ٹرین مال گاڑی نہیں بلکہ مسافر گاڑی تھی۔ اس کے پاس اسے روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ اپنے خالی ہاتھوں سے پٹری کو اس کی جگہ پر نہ رکھ سکتا تھا اور نہ نٹ اور "اسکرو" کس سکتا تھا۔ اسے دوڑ کر کہیں جانا چاہئے ——— اپنے گھر دوڑ کر جانا چاہئے ——— اوزاروں کے لئے ——— اے خدا ہماری مدد کر۔

وہ گھر کی جانب ہانپتا ہوا دوڑا ——— وہ دوڑتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ اب گرا ——— اب گرا ——— وہ دوڑے جا رہا تھا ——— اور اب اس کا گھر صرف دو سو گز رہ گیا تھا ——— مل کی سیٹی بجی، چھ بجے تھے اور چھ بجکر دو منٹ پر گاڑی آنے کو تھی ——— اے خدا معصوم آدمیوں کو بچا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تمام نقشہ پھر گیا ——— انجن کے پہیے اکھڑی ہوئی پٹریوں میں پھنس جائیں گے۔ وہ لڑکھڑائیں گے ——— اتر جائیں گے ——— پٹریوں کو اکھاڑ دیں گے

سلیپروں کو توڑ ڈالیں گے ـــــ اس جگہ لائنوں کا گھماؤ تھا اور رستہ پچیس گز اونچا تھا ـــــ پھر ٹرین میں ـــــ گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبوں میں ـــــ عورتیں اور بچے بھرے ہوئے ہونگے ـــــ انہیں کسی حادثہ کا خیال تک نہ ہوگا ـــــ اے خدا میں کیا کروں۔ نہیں نہیں گھر جانے کا اور پھر لوٹ کر آنے کا وقت نہیں ہے۔ خواہ میں کتنا ہی تیز جاؤں۔

سیتن گھر کی طرف نہ گیا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز دوڑتا ہوا واپس آیا۔ وہ دوڑے جا رہا تھا ـــــ مستقبل سے بالکل ناواقف تھا وہ اکھڑی ہوئی پٹڑیوں کے نزدیک پہنچا۔ جہاں ان کی لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ جھکا ـــــ ایک لکڑی اٹھائی ـــــ اسے خود بھی نہ معلوم تھا کہ کیوں؟ اور آگے دوڑا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ گاڑی کی آواز سُن رہا ہے ـــــ دور اس نے سیٹی کی آواز سُنی۔ پٹڑیاں آہستہ آہستہ گونجنے لگیں۔ اب اس میں دوڑنے کی سکت نہ تھی۔ وہ خطرہ کی جگہ سے تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر جا کر ٹھہرا۔ یکایک اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے اپنی قمیص اتاری اور اس میں سے ایک موٹی رومال نکالا۔ پھر "اے خدا میری مدد کر" کہتے ہوئے اس نے چاقو اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی پر بھونک دیا۔ خون ایک گرم پانی کے چشمے کی طرح بہ نکلا اس نے رومال کو اس خون میں تر کیا اور اچھی طرح پھیلا کر لکڑی میں باندھا اور اسے داہنے ہاتھ میں لیکر ہلانے لگا ـــــ یہ تھی سُرخ جھنڈی!

وہ وہاں کھڑا سُرخ جھنڈی ہلاتا رہا۔ وہ پہلے ہی گاڑی کو دیکھ چکا تھا ـــــ لیکن انجن ڈرائیور نے اسے نہ دیکھا تھا ـــــ ٹرین نزدیک آ رہی تھی ـــــ اور ایک بھاری ٹرین کو روک لینا آسان کام نہ تھا۔

اس کے ہاتھ سے خون بہتا رہا۔ اس نے خون کو بند کرنے کے لئے زخم کو دبایا لیکن بے سود ـــــ کیونکہ جلدی میں چاقو سے ہاتھ کی رگ کٹ گئی تھی۔ اور زخم گہرا ہو گیا تھا۔

اب اس کا سر چکرانے لگا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے کانوں میں گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نہ تو وہ ٹرین ہی کو دیکھ سکا، نہ اس کی آواز سن سکا۔ اس کے دماغ میں صرف ایک خیال تھا ـــــ میں کھڑا نہ رہ سکوں گا ـــــ میں گر جاؤں گا جھنڈی گر جائے گی ـــــ گاڑی مجھ پر سے گزر جائیگی۔ میرے اچھے خدا میری مدد کر ـــــ مجھے مدد پہنچا ـــــ"

اس کی آنکھوں کے سامنے بالکل اندھیرا آ گیا اور جھنڈی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ لیکن وہ زمین پر نہ گری۔ کسی کے ہاتھ نے اسے لے لیا اور آتی ہوئی ٹرین کی جانب اونچا کئے رہا۔ انجن ڈرائیور نے اسے دیکھا اور جلدی سے بریک لگا دیئے۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی ـــــ!

مسافر ڈبوں سے کود پڑے اور سیتن کے چاروں طرف جمع ہو گئے انھوں نے دیکھا کہ ایک آدمی خون میں لتھڑا ہوا بیہوش پڑا ہے۔ اور ایک دوسرا آدمی لکڑی لئے کھڑا ہے جس میں ایک خون آلود کپڑا بندھا ہے۔ واسلی نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر سر جھکا کر کہا ـــــ "مجھے گرفتار کر لو ـــــ میں نے ہی پٹڑیوں کے پیچ کھولے تھے۔

دُعا نہ ہوئی

از:- جناب شوکت حمید خاں پیاؔ ور بی۔ اے

آرزو کوئی مدعا نہ ہوئی ۔۔۔ درد دل کی مرے دوا نہ ہوئی،

ہے قسم تیری خوبروئی کی ۔۔۔ یاد دل سے تری جدا نہ ہوئی

وائے مجبوریاں محبت کی ۔۔۔ آہ کھینچی مگر رسا نہ ہوئی

ہے یہ عالم ترے تصور کا ۔۔۔ ہاتھ اُٹھے، مگر دعا نہ ہوئی

کس سے خاؔور وفا کی ہے امید؟ ۔۔۔ یاد بھی جس کی باوفا نہ ہوئی

نوائے سروش

خزاں گلشن میں آتی ہے بہار بے خزاں ہو کر

جناب ابو محمد امام الدین جاؔ قطعہ رام نگری

بہار آئی جہاں میں زینتِ ہر گلستاں ہو کر — ہمارا ہی گلستاں کیوں رہے وقفِ خزاں ہو کر
بنا سکتا ہے کیا ان کا مخالف آسماں ہو کر — جو مٹنے پر تُلے ہوں فارغِ سود و زیاں ہو کر
مظالم جن ستم دیدوں پہ ہر دم ڈھائے جاتے ہیں — رہیں وہ تا کجا پابندِ آئینِ فغاں ہو کر
وہی بیٹھے کیا کرتے ہیں شکوہ جورِ گردوں کا — جنھیں جینا نہیں آتا حریفِ آسماں ہو کر
یہی تو شمع و پروانہ سے ہم نے درس پایا ہے — جئیں آتش بجاں رہ کر مریں آتش بجاں ہو کر
بہر صورت نظامِ بد نظامی کو بدلنا ہے! — حلیفِ آسماں رہ کر حریفِ آسماں ہو کر
جنھیں فطرت نے عزمِ آسماں پرواز بخشا ہو — وہ کیوں رہنے لگے پابندِ دامِ گلستاں ہو کر
اگر دورِ زماں سے تم کو بہرہ یاب ہونا ہے — اٹھا لو فائدہ تم بھی شریکِ آسماں ہو کر
نہ فکرِ خار و خس مجھکو نہ خطرہ برق و باراں کا — نہایت مطمئن ہوں بے نیازِ آشیاں ہو کر
تنک بینی سے میری چشمِ تر کو دیکھنے والو — ڈبو دیگی یہی دنیا کو بحرِ بیکراں ہو کر
سمجھتے ہیں جو اپنا آشیاں گلشن کے گلشن کو — وہ کب رہنے لگے پابند شاخِ آشیاں ہو کر
نزاعِ کفر و دیں کا خاتمہ بالخیر ہے شاید — نکلتی ہے صدا ناقوس سے بانگِ اذاں ہو کر
مری فطرت ہے رہبری پیشوائی میری طینت ہے — مجھے رہنا نہیں آتا غبارِ کارواں ہو کر
تہِ گردوں نہیں ملتی کہیں جائے اماں مجھکو — ستاتا ہے زمیں کا چپہ چپہ آسماں ہو کر
میں ایسی مہربانی کو ہتک اپنی سمجھتا ہوں — کوئی کیوں مہرباں مجھ پر رہے نامہرباں ہو کر
لگی دل کی کسے کہتے ہیں وہ کیا خاک سمجھیں گے — جنھیں جینا نہیں آیا کبھی آتش بجاں ہو کر
مری آتش نوائی خار و خس کو کیا سمجھتی ہے — قفس کو خاک کر ڈالوں گا میں شعلہ بیاں ہو کر
قدم رکھنا انھیں جائز نہیں حدِّ محبت میں — محبت کو کریں رسوا جو مجبورِ فغاں ہو کر
تمھیں معلوم ہو شاید کبھی ایسا بھی ہوتا ہے — خزاں گلشن میں آتی ہے بہار بے خزاں ہو کر

برنگِ خاص آیا ہے تمھاری بزم میں جاؔفظ
سروشِ عصرِ نو کا ہم نوا و ہمزباں ہو کر

ہندوستان کی تلوار

ایک تاریخی واقعہ

(از جناب امداد علی مضطر۔ میرٹھی)

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید۔ ایک عجمی شاعر نے خدا جانے کس واقعہ سے متاثر ہو کر کہا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان تینوں چیزوں کی بدولت دنیا میں ایسے ایسے عبرتناک واقعات رونما ہو جاتے ہیں کہ دیکھ کر یا سُن کر انسان محوِ حیرت اور لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور دل پر بے بسی و بے حسی کا عالم کچھ اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ نہ وہ عیش کو عیش سمجھتا ہے نہ اُسے تکلیف ہی کا احساس ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن متوکل علی اللہ عبّاسی کے دربار میں محفل عیش و طرب منعقد تھی۔ جملہ زندہ دلانِ دربار جمع تھے اور سب لوگ اپنی خوش گفتاریوں اور بذلہ سنجیوں سے متوکل کا دل بہلا رہے تھے بر سبیل تذکرہ تلواروں کے متعلق گفتگو شروع ہو گئی اور ہر شخص اپنی اپنی معلومات و تجربہ کے متعلق تلواروں کی تعریفیں بیان کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد کسی نے کہا کہ سب سے بہتر تلوار ہندوستان کی بنی ہوتی ہے چنانچہ بصرہ میں ایک شخص کے پاس ہندی فولاد کی بنی ہوئی ایک شمشیر ہے جو تمام خوبیوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

اس شمشیرِ بے نظیر کی تعریف سنکر امیر المومنین کو اس کے حاصل کرنے کا شوق ہوا کہ اسی وقت درباری منشی کو بلا کر والیٔ بصرہ کے نام اس تلوار کو حاصل کر کے پیش کرنے کا فرمان جاری ہوا۔ والیٔ بصرہ نے دس ہزار درہم میں وہ تلوار خرید کر دربار خلافت میں بھیج دی۔ متوکل نے اسے دیکھا اور اپنے درباری کی زبان سے اس کی جو خوبیاں سُنی تھیں وہ تمام اس میں پا کر بہت خوش ہوا۔ تلوار کی صنعتی خوبیاں جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں امیر المومنین نے بچشم خود دیکھ لیں لیکن قدرت کو اس کی وہ صفت اور دکھانی تھی جس کے لیے وہ بنائی گئی تھی اور جس کی وجہ سے فطرت کو یہ عبرت انگیز و الم انگیز واقعہ تراشنا پڑا۔

اس خوبصورت تلوار کو دیکھ کر متوکل علی اللہ اس قدر مسرور ہوا کہ اپنے معتمد اور ندیم فتح خاں بن خاقان سے کہا کہ آپ کوئی ایسا خوش خو اور خوب رو جوان تلاش کرو جو تندرست و توانا ہونے کے ساتھ ساتھ بارعب بھی ہو اور اس شمشیر آبدار کو اس کی کمر سے باندھ کر حکم دو کہ وہ ہمہ اوقات میرے ساتھ رہے۔ جب تک میں دربار میں رہوں وہ میری پشت پر حاضر رہے اور جب کہیں جاؤں تو ہمراہ جائے۔"

فتح خاں نے کئی دن کی تلاش کرنے کے بعد ایک ترکی جوان کو پیش کیا۔ جس کا نام باغر تھا۔ یہ شخص ان تمام خوبیوں کا حامل تھا جو متوکل نے بتائی تھیں۔ باغر علاوہ وجیہہ و شکیل اور تنومند ہونے کے شمشیر زنی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا خلیفہ نے اپنے وزیر کے انتخاب کو بہت پسند کیا۔ اور اسی وقت وہ ہندی شمشیر اس کی کمر میں آویزاں کر کے متوکل کا نگراں مقرر کر دیا گیا۔ باغر اس خلعت کو اپنی انتہائی سرفرازی خیال کرتے ہوئے سایہ کی طرح خلافت پناہ کے ساتھ رہنے لگا۔

متوکل علی اللہ کا رحم عفو اور خوش طبعی مشہور تھی۔ چنانچہ ایک مدت گذر جانے کے بعد بھی باغر کو اپنی وفاداری اور شمشیر کو اپنے جوہر ولی نعمت کی خدمت میں پیش کرنے کا موقعہ نہ نصیب ہوا۔ اور وہ تلوار کبھی نیام سے باہر نہ نکلی اور نکلی بھی تو اس قیامت انگیز طریقہ پر کہ اس کی جوہر باریوں سے نہ صرف بارگاہِ خلافت بلکہ ہر فرد بشر نے خون کے آنسو بہائے۔

امیر المومنین نے اپنے بڑے بیٹے محمد المنتصر کو ولیعہدِ خلافت مقرر کیا۔ لیکن خدا کی شان کہ ایسے صلح اور نیک سیرت باپ کا بیٹا بے حد نافرمان نکلا اور باپ کی شان میں اس کی گستاخیاں اور نافرمانیاں اس درجہ بڑھ گئیں کہ متوکل کو مجبوراً اس کو اس منصب سے برطرف کر دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ محمد المنتصر بہت ہی ہوشیار اور بلا کا چالاک واقع ہوا تھا اس نے چند ہی روز میں فوج کے اکثر سپاہیوں کو عموماً اور ترکی نوجوانوں کو خصوصاً اپنا ہمنوا بنا لیا تھا جب اسے باپ کی اس برافروختگی اور فیصلہ کا علم ہوا تو اس نے بھی اپنی تمام قوت و حکمت کو بروئے کار لانے کا ارادہ کر لیا۔

چنانچہ ایک روز جب خلیفۂ وقت نے محمد المنتصر کو ولی عہدی سے معزول کرکے اپنے چھوٹے بیٹے محمد المعتز کی ولی عہدی کا اعلان کیا تو المنتصر اپنی ریشہ دوانیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے کمربستہ ہو گیا۔

متوکل نے المنتصر کو جب حد سے تجاوز کرتے دیکھا تو بحیثیت ایک باپ کے اسے راہِ راست پر لانے کی انتہائی کوشش کی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا نہ متوکل اسے اپنا بنا سکے نہ وہ ان کا بن سکا۔ الغرض معاملہ چند ہی دنوں میں اس قدر خطرناک صورت اختیار کر گیا کہ المنتصر نے متوکل کی جان لینے کی ٹھان لی۔

فوج کے ترکی جوانوں کے ایک مختصر گروہ سے المنتصر نے امداد چاہی۔ اور طرح طرح کے لالچ دے کر اپنے خوفناک ارادہ کی تکمیل کے لئے آمادہ کر لیا۔ المنتصر نے ترکی نوجوانوں کا انتخاب صرف اسی خیال سے کیا تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ بغیر باغز ترکی کو اپنا ہمنوا بنائے اس کا دلی مدعا آسانی کے ساتھ پورا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان غدار ترکی سپاہیوں نے متوکل کے نگران باغز کو بھی آسانی کے ساتھ اپنے ساتھ ملا کر یہ خدمت اسی کے سپرد کی۔

ایک شب جب خلیفہ اپنے بستر پر خوابِ شیریں سے ہم آغوش تھا اور اس کا وفادار وزیر فتح خاں اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ باغز مع دس ترکی سپاہیوں کے شمشیر بکف کمرہ میں داخل ہوا۔ اور اسی ہندی تلوار سے جو خلیفہ نے کمال شوق کیساتھ اپنی حفاظت کے لئے خرید کی تھی اسے قتل کر دیا یہ ماجرا دیکھ کر فتح خاں گھبرا کر اس پر جھپٹا لیکن ان لوگوں نے بڑی سنگدلی کے ساتھ اس کے بھی ٹکڑے کر ڈالے۔

اس خونریزی، سفاکی اور محسن کشی کے بعد ان سپاہیوں نے ان دونوں کی لاشوں کو ایک دری میں لپیٹ کر محل کے اندر ہی کسی جگہ دفن کر دیا اور اس کام کو انہوں نے اسقدر ہوشیاری اور دانائی کیساتھ سرانجام دیا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور قصر خلافت ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو گیا

یہ ہے ایک ایسی ہندوستانی تلوار کا مختصر سا قصہ جس کی تعریف و توصیف سننے کے بعد ایک نیکدل اور نیک سیرت خلیفہ نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے بڑے شوق کے ساتھ حاصل کیا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس کے جوہر اس لرزہ خیز طریق پر نمایاں ہوئے کہ آج تک اس واقعہ کو سن کر ہر شخص چشم پُرنم متاثر ہو کر کہہ دیا ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ سانحہ دنیا کے ہولناک ترین سانحوں میں سے ایک ہے۔

شروعات فصیح ہے یا غیر فصیح؟

ایک لسانی بحث

از جناب دل محمد فضا (منشی فاضل)

گزشتہ سال کسی صاحب نے "مدیر شاعر" سے استفسار کیا کہ لفظ "شروعات" صحیح ہے یا غلط؟ "مدیر شاعر" نے جواب میں لکھا کہ یہ لفظ نہ کسی لغت میں ہے نہ فصحا اسے استعمال کرتے ہیں۔ اور نہ کسی کی زبان پر ہے۔ البتہ یہ جہلا کی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے بعد بہت سے رسائل وجرائد میں "شروعات" کے جائز یا ناجائز ہونے پر ایک لسانی بحث چھڑ گئی جو اب تلخ صورت بھی اختیار کر رہی ہے۔ ہم ذیل میں اس لفظ کے مخالفین و مؤیدین کی آراپیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ قارئین خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ صحیح رائے کس کی ہے؟ محاکمہ سے دانستہ احتراز کیا گیا ہے تاکہ شکایت کا موقع نہ رہے۔

شروعات کے مؤیدین

(۱) مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی:- شروعات اور اولیات فصحائے اردو کے حلقہ میں رواج پاچکے ہیں۔ ہم لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہر لفظ گرامر کے کس قاعدہ کے تحت صحیح یا غلط ہے جو لفظ جس طرح فصحا کے یہاں رواج پا گیا وہی صحیح ہے۔

(۲) جناب اختر نگینوی:- شروعات جس میں بحالت استعمال ا، ت بڑھائے گئے ہیں اور جس کے معنی شروع آغاز یا ابتدا کے ہیں عام طور پر بولا جاتا ہے۔

(ب) میں نے اساتذائے مسلم الثبوت کے کلام میں نہیں دیکھا چونکہ میں خود حق اجتہاد نہیں رکھتا اس لئے خود استعمال نہیں کیا

(ج) میں اس لفظ کو مستعمل کرتا تو اس طرح کرتا ؎

پڑتی ہیں ہر آغازِ جوانی پہ نگاہیں

کچھ اور ہی ہوتا ہے شروعات کا عالم

(۳) جناب مہر گوالیاری:- شروعات کے متعلق وہی رائے ہے جو بھائی سائل کی ہے میں اس لفظ کو بالکل جائز اور درست سمجھتا ہوں۔

(۴) جناب جوش ملسیانی:- (۱) یہ لفظ خوبصورت ہے۔ نہ اس میں کراہت پائی جاتی ہے نہ ثقالت۔

(۲) یہ کسی زمانہ میں جہلا کا لفظ ہوگا۔ مگر اب فصحا کی زبان پہ شامل ہو چکا ہے۔

(۳) اس کا عام محلِ استعمال اس کے مستند ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

(۴) اگر علامات جمع کا خیال کسی طرح نہیں چھوڑا جاتا تو اور بھی بہت سے الفاظ میں جو ساخت کے لحاظ سے جمع ہیں۔ مگر اُردو میں واحد بولے جاتے ہیں۔ مثلاً بہتات۔ کرامات وغیرہ ان الفاظ میں تو جمع کسی کو نہیں کھٹکتی۔ لفظ شروعات اپنی موجودہ صورت میں علامات جمع کے لحاظ سے کیوں کھٹکتا ہے۔

(۵) کہا جاتا ہے کہ اس میں الف، ت زائد ہیں اور ان کے بغیر بھی مفہوم برقرار رہتا ہے۔ مگر تمام زوائد بیکار نہیں ہوتے باعث زینت بھی ہوتے ہیں! مثلاً بگفت کی ب۔ اسکندر؎ کا الف وغیرہ باعث زینت ہونے کی خوبی کے علاوہ بعض محل ایسے ہیں کہ وہاں۔ ابتدا۔ آغاز۔ پہل وغیرہ کی بجائے شروعات ہی مستحسن نظر آتا ہے۔

(۵) ابو المعظم نواب سائل دہلوی:- لفظ شروعات میرے نزدیک بُرا نہیں زبان زدِ عام ہونے کی وجہ سے غلط العام کے تحت میں آگیا ہے۔ میں اسے کراہت کی نظر سے دیکھتا ہوں تمہاری خاطر سے بطور سند ایک شعر موزوں کرکے بھیجتا ہوں ؎

کیا ملے اس سے کوئی ایسے سے کیا بات کرے

بد کلامی سے جو پاسخ کی شروعات کرے

(۶) ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی (دوسری رائے):- فی الحقیقت بہت سے الفاظ ہیں جو اپنی جگہ پر کچھ اصلیت کے لحاظ سے اور کچھ معنی کے سبب سے غلط ہیں۔ مگر کثرتِ استعمال نے ان میں صحیح و غلط کا امتیاز نہ رکھا۔ یہ ضرور ہے کہ جن کی معلومات وسیع ہیں وہ ان کو استعمال کرنا اچھا نہیں جانتے۔ مگر بخلاف اس کے اگر کوئی شخص استعمال کرے تو باوجود

؎ اسکندر کا الف زائد نہیں بلکہ حقیقی لفظ اسکندر ہی ہے۔ اور سکندر مخفف ہے اسکندر کا اور معرب ہے الیگزنڈر کا۔ (عالمگیر)

محقق ہونے کے کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہ ہوگا۔ غلط العام اسی صورت کے لئے ہے۔ شروعات کے متعلق مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے بغیر کسی خیال کے کہہ دیا کہ غلط ہے۔ مگر اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوا کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگوں کی زبانوں پر یہ لفظ تو عام طور سے ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص بقول حضرت سائل دہلوی اس لفظ کو لکھے تو کوئی بُرا نہیں۔

(۷) طیش مارہروی:۔ اس لفظ کو عام طور پر بولتے اور لکھتے ہیں۔ پھر یہ غلط العام فصیح کیوں نہ سمجھا جائے گا۔

(۸) دلیر مارہروی:۔ لفظ شروعات اگرچہ بروئے قواعد و ضوابط غلط ہے۔ اس کی اصل شروع ہے۔ اور کسی قاعدے سے شروعات نہیں بنتا۔ مگر یہ لفظ بہت مدت سے زبان پر جاری ہے اسلئے میرے نزدیک کسی کو یہ حق نہیں کہ اس پر اعتراض وارد کرے۔ اپنا ایک شعر بھی حاضر کرتا ہوں ؎

وہ افسانہ جو تم سے کہنے کو تھا ۔۔۔ اب اسکی شروعات کرتا ہوں

شروعات کے مخالفین

(۱) ڈاکٹر غلام جیلانی خاں صاحب برق ایم اے۔ پی ایچ ڈی لیکچرر شعبہ اردو۔ فارسی۔ عربی۔ گورنمنٹ کالج کیمبلپور: لفظِ شروعات ایک بدعت ہے اگر اسے شروع کی بجائے سمجھ کر استعمال کیا جا رہا ہے تو غلط اگر شروع کی جمع ہے تو غلط تر۔

(۲) پروفیسر سلیم فارانی ایم اے لیکچرر عربی فارسی گورنمنٹ کالج ہوشیارپور:۔ شروعات کا استعمال میرے نزدیک غیر فصیح ہے۔ قدما کے کلام میں میری نظر سے یہ لفظ نہیں گزرا۔ متاخرین کا کیا کہنا۔ ان کے نزدیک تو وہی فصیح ہے۔ جو غلط العوام ہو۔ متاخرین سے میری مراد عہدِ حاضر کے وہ شعراء ہیں جن کا دائرہ علم بہت محدود ہے۔ کسی کا شعر یا مصرعہ اس کے جواز کا ثبوت نہیں ہو سکتا جب تک اساتذہ اس کی تائید نہ کریں۔ بہر حال اس کی ثقالت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

(۳) ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی لیکچرر ڈھاکہ یونیورسٹی:۔ غلط العام اور غلط العوام دو مختلف چیزیں ہیں۔ غلط العام وہ ہے جسے خواص و عوام سب استعمال کرتے ہوں جیسے مشکور بمعنی ممنون و متشکر۔ مولینا شبلی اور بعض دوسرے دوسرے فضلا نے بھی مشکور بمعنی متشکر لکھا ہے اس لئے اب مشکور اردو میں غلط العام کے تحت میں آسکتا ہے لیکن شروعات غلط العام نہیں خواص کے یہاں میری نظر سے نہیں گزرا میرے نزدیک یہ لفظ صحیح نہیں۔

(۴) مولنٰنا سید سلیمان ندوی اعظم گڑھ:۔ غلط العام فصیح کا مقصد یہ ہے کہ لفظ قواعد کے لحاظ سے غلط ہو۔ لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے مستند ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس کو قبول کر لیا ہو۔ تنہا قبول عام سے کوئی غلط لفظ زمرۂ فصاحت میں نہیں آتا شروعات عامی لفظ ہے۔ کسی سنجیدہ صاحبِ قلم اور اہلِ علم کی تحریر میں نہیں ملا۔ ممکن ہے کبھی کسی نے اس کا استعمال کیا ہو۔ لیکن اب متروک ہے۔

(۵) مسٹر نشتر جالندھری ایڈیٹر اخبار حمایت اسلام لاہور: گرامی نامہ موصول ہوا یاد فرمائی کا شکریہ۔ (۱) غلط العام فصیح کے ذیل میں آنے والے الفاظ کے لئے ضروری ہے کہ انہیں اساتذہ نے نظم و نثر میں استعمال کیا ہو۔

(۲) میری رائے میں شروعات پر غلط العام فصیح کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

(۳) میں نے یہ لفظ کسی مستند شاعر کے کلام میں نہیں دیکھا اور نہ خود کبھی نظم و نثر میں استعمال کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک یہ غلط العوام معیوب کے ذیل میں آنے کے باعث قابلِ استعمال نہیں۔

(۴) میرے خیال میں وہ جماعت حق پر ہے جو اس لفظ کو عوام کی زبان قرار دیتی ہے۔

(۶) مولنٰنا عبد المجید سالک مدیر روزنامہ انقلاب لاہور: غلط العام فصیح کا قول میرے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اس لئے کہ بہت کم الفاظ ایسے ہیں۔ جن پر اس کا اطلاق ہو سکے عام اصول یہی ہے کہ جو لفظ مستند فصحا اپنے کلام (سنجیدہ کلام) میں استعمال کر لیں اسے علی العموم فصیح سمجھا جاتا ہے گو میں یہ رائے بھی کلیتہً قرار نہیں دیتا لفظ شروعات کسی مستند شاعر یا نثر نگار کے ہاں میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ بعض اہلِ زبان بولتے ہیں۔ لیکن مجھے اس قسم کے الفاظ کبھی پسند نہیں آتے۔ اہلِ زبان بہت سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جنکو ہم قبول نہیں کرتے۔ کیونکہ ہماری زبان دانی اکتسابی ہے جس میں علمی احتیاط لازمہ رہتی ہے۔ میں نے عمر بھر یہ لفظ نہیں لکھا۔ جو شخص اسے

استعمال کرے وہ سند کے طور پر اہلِ زبان کے قول پیش کر سکتا ہے۔ لیکن جس کے وجدان ہی کو یہ لفظ پسند نہیں آتا اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اہلِ زبان کی تقلید کا منکر نہیں ہوں لیکن اندھی تقلید کا کسی حال میں قائل نہیں "مشکور" "تشکر" کے معنوں میں تمام ثقات اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں یہاں تک کہ مولٰنا شبلی بھی لکھ جاتے ہیں لیکن میں نے عمر بھر نہیں لکھا۔ یہی میری رائے شروعات کے متعلق سمجھنی چاہیئے۔

(۷) جناب نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار لکھنو۔ خط نمبر ا۔ مکرمی تاخیر جواب پر معذرت خواہ ہوں۔ شروعات بالکل غلط ہے۔

خط نمبر ۲:۔ شروعات کے متعلق پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ یہ جاہلوں کی زبان ہے اور کوئی پڑھا لکھا آدمی نہ بولتا ہے نہ لکھتا ہے غلط العام فصیح سے اسے کیا واسطہ ؟

(۸) افصح الفصحا مولٰنا آسی لکھنوی:۔ شروعات غلط العام میں نہیں ہے بلکہ غلط العوام میں ہے اور غلط العوام پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ میں نے اساتذہ قدیم کے کلام میں یہ لفظ نہیں دیکھا اور خود بھی استعمال نہیں کیا۔ جو جماعت اس کو ٹکسالی بتاتی ہے ان سے پوچھنا چاہیئے۔ شروع موجود ہے تو شروعات کے کیا معنی؟ کیا یہ مصدر ہے؟ یا مصدر کی جمع؟ یا کیا ہے؟ اگر جمع ہے تو کسی لغت سے اس کا ثبوت نہ ملنا کیا معنی؟ بہرحال میں اس کو غلط جانتا ہوں ممکن ہے کہ کسی نے لکھا ہو مگر مشکل یہ ہے کہ غلط کی سند بھی غلط ہی پڑے گی +

(۹) مولٰنا ناطق گلاؤٹھی:۔ کارڈ موصول ہوا یہ سوالات تو آپ جگر، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری سے کرتے جو آج ہندوستان کے مقبول شاعر ہیں یا مولوی عبدالحق صاحب کا فتوے حاصل کرتے جو اردو زبان کے واحد مالک ہیں میں غریب کس شمار میں؟ حیرانی ہے کہ کیا سمجھ کر آپ نے مجھ سے استفسار رمایا۔ احد سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں اور کیوں جواب دوں مگر اس خیال سے کہ کہیں آپ بے مروتی کا الزام نہ دیں کچھ لکھے دیتا ہوں اگرچہ یہ بھی جانتا ہوں کہ موجودہ دور میں جہاں کسی بات پر اختلاف رائے ہوتا ہے وہاں استفسار سے تحقیق مقصود نہیں ہوتی بلکہ ہر فریق اپنی حمایت چاہتا ہے اور چاہے کسی غیر جانبداری سے بتائیے۔ جس فریق کی مخالفت ہو۔ وہ

بیوقوف بناتا اور بسا اوقات گالیاں بھی دیتا ہے۔ خیر یہ بھی سہی تو جواب یہ ہے۔

کہ لفظ شروعات کو جس طرح محض ابتدا کے معنی میں جہلا اور عوام استعمال کرتے ہیں یہ بھی غلط العام نہیں ہوا۔ غلط العام کے معنی یہ ہیں کہ اسی طرح فصحا اور اہلِ علم بھی بولتے ہوں اور میں نے کبھی کسی اہلِ علم کو اس معنی میں یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے نہیں سنا ؂

سند اہلِ فصاحت نہیں اندازِ عام آپ سمجھے نہیں ناطق غلط العام ابھی

اس لئے شروعات کو بھی واحد لکھنا اور بولنا نہ صرف یہ کہ غیر فصیح بلکہ غلط ہو گا۔ البتہ اگر کسی بات کام یا مرض کے مختلف اسباب و علامات ہوں تو وہاں اس لفظ کا استعمال بصیغہ جمع ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اہلِ خانہ کا چڑچڑاپن وقت پر کھانا نہ پکانا اور بات بے بات بچّوں کو مارنا جھگڑے کی شروعات ہیں۔ یا مثلاً منہ کا بے مزہ ہونا اور پاؤں کا ٹھنڈا ہو جانا بخار کی شروعات ہیں۔ مگر ایسا استعمال بھی اہلِ علم میں کم ہے کہ وہ بیشتر ایسے موقع پر علامات بولتے ہیں۔ میں نے ایسا استعمال بھی واحد نہ خود کبھی کیا۔ نہ کسی مستند استاد ماضی و حال کے کلام میں دیکھا اور یاد نہیں آتا کہ کسی عالی شاعر کے کلام میں بھی میں نے اس لفظ کا استعمال دیکھا ہو۔ البتہ افسانچی حضرات ایسا ضرور لکھ جاتے ہیں جنکی محبوبہ آج کل پگلی ہو رہی ہے۔ میرے ناگپور میں بھی کئی ایسے جہلا تراش خراش کر کے افسانہ نگاری کرتے ہیں جنہیں دو حرف سیدھے بولنے کا بھی سلیقہ نہیں اور مدیرانِ اخبارات و رسالجات میں بھی ایسی بیلیاقتی کی کمی نہیں جو سب اغلاط و خرافات کی اشاعت کی ذمہ دار ہو جاتی ہے۔

(۱۰) میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن ایڈیٹر رسالہ ہمایوں:۔ آپ کے خط کے جوابات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) لفظ غلط العام فصیح کے لئے عموماً اچھا ہے کہ مستند اساتذہ نے انہیں استعمال کیا ہو لیکن یہ قاعدہ کلّیہ نہیں اور نہ یہ قطعاً ضروری ہے اپنا اپنا رجحان ہے۔

(۲) لفظ شروعات کو میں جائز نہیں سمجھتا اور نہ مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے +

(۱۱) حضرت آرزو لکھنوی جانشین حضرت جلال لکھنوی:۔ شروعات ان لفظوں میں سے ایک ہے جو لوگوں نے اپنے زمانۂ عروج

میں مثلاً تو خوشی وغیرہ رائج کر دیئے تھے جنکو پڑھے لکھے لوگ بولتے اور لکھتے رہے مگر دیا نے ہمیشہ ایسے لفظوں سے احتراز کیا میں تو مدت العمر میں ایک بار بھی اس لفظ کو نہ بولا ہونگا چہ جائیکہ لکھتا

(۱۲) حضرت ثاقب لکھنوی :۔ شروعات اراضی ارا ضیات مولضعات یہ جملہ الفاظ باوجود غلط محض ہونے کے عرف عام میں رائج ہیں۔ اور اردو زبان میں بولے جاتے ہیں۔ شروعات بازاری اور سوقیانہ لفظ ہے۔ میں غلط العام فصیح کا معتقد نہیں دور حاضر کے شعرا چونکہ کسی اصول کے پابند نہیں ہیں اور دلی اور لکھنؤ کی مستند زبان کو طاق نسیاں پر رکھ کر اپنی دہقانی زبان اور محاورات کو ٹکسالی زبان قرار دیتے ہیں ان کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں جو جی میں آئے ارشاد فرمائیں۔

(۱۳) حضرت شفق عماد پوری مینائی :۔ لفظ شروعات لغتاً غلط ہے۔ بپاس خاطر کسی کا کوئی شعر موزوں کر دینا جس میں شروعات کسی طرح آجائے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے یہ کہنا کہ کسی نے پہلے بے سوچے سمجھے شروعات کو غلط لکھ دیا لیکن پھر کسی وجہ سے رائے بدل دی یہ بھی ایک دھوکے کی بات ہے میرے خیال میں تغلیط کے بعد تصحیح ٹھیک نہیں تغلیط بھی ایسی جو مبہم نہیں بلکہ صاف لفظوں میں تھی اور ایک مستند خواجہ تاش کی رائے سے بھی اتفاق کیا گیا تھا۔

المختصر شروعات غلط العام نہیں غلط العوام کے تحت میں ہے

(۱۴) حضرت سریر کابوری گیاوی :۔ شروعات میری نگاہ سے کسی صاحب قلم یا اہل سخن کے کلام میں نہیں گزرا۔ میری دانست میں صحیح نہیں +

(۱۵) وحید العصر حضرت بیخود دہلوی جانشین نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی :۔ شروعات کوئی لغت نہیں دلی والے جاہل مرد اور عورتیں لڑائی کے وقت یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ شروعات تم نے کی تھی میں نے پہل نہیں کی کیونکہ شروع کے املا میں ع ہے اس لئے کسی پڑھے لکھے جاہل نے شروعات کو عین سے لکھ دیا۔

(۱۶) لسان القوم مولانا صفی لکھنوی :۔ (۱) الفاظ غلط العام فصیح کے لئے ضروری ہے کہ انہیں مستند ادبا نے استعمال کیا ہے۔

(۲) لفظ شروعات پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

(۳) جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کسی مستند شاعر کے کلام میں اس لفظ کا استعمال نہیں دیکھا اور خود بھی کبھی اس کا استعمال نہیں کیا۔ اس لئے کہ میری رائے میں یہ غلط العوام ہیں۔

(۴) جو فریق اسے عوام کی زبان قرار دیتا ہے وہی حق پر ہے

(۱۷) حضرت مولانا حسرت موہانی :۔ لفظ شروعات نہ میں نے خود کبھی استعمال کیا اور نہ کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا میرے نزدیک اس لفظ پر غلط العوام کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ غلط العام نہیں۔ فقط۔

(۱۸) خان بہادر مولانا رضا علی صاحب وحشت کلکتوی :۔ لفظ شروعات پر غلط العام فصیح کا اطلاق نہیں ہو سکتا میں نے کبھی اس لفظ کو استعمال نہیں کیا اور نہ کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا ہے مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مولانا شبلی کسی کی نثر میں بھی میں نے یہ لفظ نہیں دیکھا یہ عوام کی زبان کا لفظ ہے اور بے ڈھنگا ہے۔

(۱۹) اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری :۔ مکرمی ابر صاحب نے مجھ سے شروعات کے متعلق رائے طلب کی تھی۔ بحالت جواز غلط العام فصیح ایک شعر بطور سند چاہا تھا۔ میں نے تفصیلی اظہار خیال کر دیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے غلط العام فصیح سے مراد مجرد عوام کی بول چال میں مستعمل ہونا سند نہیں بلکہ نظم میں شعرا کا استعمال ہو کیونکہ عوام سے شعرا تک اپنے یہاں کو بول چال کے اعتبار سے بعض لفظ غلط بولتے ہیں۔ مگر نظم میں اسکا استعمال جائز نہیں سمجھتے۔ مجرد شعرا کا نظم میں استعمال کرنا بھی سند نہیں ہے بلکہ وہ شعرا جو محقق ہیں ان کا نظم کرنا سند ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میری رائے میں شروعات کا استعمال جائز نہیں جب لفظ شروع بھی آغاز مفہوم پورا کرتا ہے تو بیہودہ حرف اضافہ کرنے کی کیا ضرورت ہے +

(۲۰) نواب فصاحت جنگ بہادر امام الفن استاذ السلطان حضرت جلیل جانشین امیر مینائی :۔ غلط العام فصیح سے مراد وہ الفاظ ہیں جو باوجود غلط ہونے کے خاص و عام کے استعمال میں آگئے ہوں۔ مثلاً سمجھ وار۔ دلدار۔ قاعدے سے غلط ہیں مگر فصحا کے یہاں بھی مستعمل ہیں چنانچہ ناسخ کا شعر ہے ؎

حسن سے خالی نہیں ہیں گھر بھرے رخسار یار
واقعی خوبی ہے جس درجہ ہو دلدار آئینہ

شروعات کا لفظ فصحا کی زبان سے میں نے نہیں سنا اور ان کے کلام میں نہیں دیکھا لہٰذا میری رائے میں اس سے احتراز اولےٰ ہے۔

(۲) علامہ حضرت سیماب اکبر آبادی :- (۱) لفظ شروعات عام اہلِ زبان کی زبان سے کبھی نہیں سنا گیا۔ البتہ جہلا کی زبان سے شاذ و نادر سنا گیا ہے۔

(۲) لفظ شروعات نہ صحیح ہے نہ فصیح اس لئے کہ فصحائے قدیم و جدید نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ میر سے داغ تک اور داغ سے سیماب تک کسی شاعر نے اپنے کلام میں استعمال جائز نہیں سمجھا پھر کس طرح سمجھ لیا جائے کہ یہ لفظ صحیح و فصیح ہے ؟

(۳) مولانا احسن مارہروی مرحوم کا دیوان ہنوز معرضِ اشاعت میں نہیں آیا۔ لیکن اس وقت تک جتنی غزلیں مرحوم کی میری نظر سے گزریں ان میں شروعات میں نے نہیں دیکھا نہ ان کی زبان سے کسی مشاعرے میں سنا حضرت نوح ناروی اور حضرت بیخود دہلوی دونوں اس لفظ کی صحت سے انکار کر چکے ہیں اب رہ گئے حضرت سائل دہلوی تو انہوں نے بھی عمر بھر اس لفظ کا استعمال نہیں کیا البتہ کسی کے پاسِ خاطر سے برجستہ ایک شعر کہہ دیا تو علم و فن میں پاسِ خاطر کا جو درجہ ہے وہ مجھے اور آپ کو اور سب کو معلوم ہے۔

آئیے اب خالص علمی نقطۂ نگاہ سے بھی شروعات کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کر کے دیکھ لیں یہ لفظ شروع سے بنایا گیا ہے عربی الفاظ کے آخر میں ات جمع کے لئے لاتے ہیں۔ جیسے حالات۔ کیفیات۔ ممنوعات۔ حکایات فروعات وغیرہ وغیرہ بنا بریں علی ہذا اس لفظ کے معنی ابتدائیں ہو سکتے ہیں لیکن یہ لفظ جہلا میں بالاتفاق مفرد ہی مستعمل ہے۔ جیسا کہ حضرت سائل دہلوی نے بھی مثلاً ایک شعر کہہ کر ثابت کر دیا تو معلوم ہوا کہ یہ جمع عربی لحاظ سے بے معنی ہے۔

(۴) جب شروعات کی جگہ ہماری زبان میں ابتدا۔ آغاز۔ پہل بسم اللہ اور شروع موجود ہیں تو پھر اس کے فضول اضافہ کے سوا انہیں معنوں میں شروعات لکھنا بے جا نہیں تو اور کیا ہے ؟

میری ذاتی رائے یہی ہے کہ شروعات نہ صحیح ہے نہ فصیح اور نہ قابلِ ترویج۔

(۲۳) حضرت جوش ملیح آبادی :- "شروعات" غلط العام نہیں بلکہ غلط العوام کی تعریف میں آتا ہے۔ عربی قواعد کی رو سے محض غلط ہے اور فارسی میں کسی ایرانی کیا معنی کسی باخبر فارسی والوں کے کلام میں بھی میری نظر سے نہیں گزرا اور نہ میں نے کبھی استعمال کیا ہے ۔

قاتل سے ملا

از جناب
ایم بلال پیریمی کوکشی

چین حسرت نہ خنجر سے نہ قاتل سے ملا
کچھ سکون مجھ کو ملا تو دلِ بسمل سے ملا

یہ بھی ملنے میں ہے ملنا کوئی اے حالِ شوق
آنکھ سے آنکھ ملی دل نہ مگر دل سے ملا

جھک کے خود دوریٔ منزل نے کیے مجھ کو سلام
میں بھٹکتا ہوا جب رہبرِ منزل سے ملا

مل گئی ساری خدائی تمہیں آسانی سے
اے بُتو ہم کو خدا بھی بڑی مشکل سے ملا

مری قسمت، کہ تمنا کے سفینے کو سکوں
کبھی دریا کبھی طوفاں کبھی ساحل سے ملا

ساری دنیا نظر آنے لگی اک مطلعِ نور
سلسلہ جب بھی نگاہوں کا ترے دل سے ملا

کعبہ و دیر میں سب ڈھونڈتے پھرتے تھے جسے
اتفاقاً وہ مجھے جلوہ گہِ دل سے ملا

مطلعِ نور چمکا کسے تو یوں ہی ہلال
دہر والوں کو اُجالا تری محفل سے ملا

سجدۂ بے جبیں!

تضمین بر غزل فانیؔ بدایونی

از جناب مغیث الدین ندوی

دل میں وہ وسعتیں نہیں، مان لیا نہیں سہی — ہاں وہ نہیں ہے آسماں خیرہ اک زمیں سہی
تجھکو تو حشر چاہیئے فتنہ اٹھے کہیں سہی — "عرصۂ حشر دور ہے، خاکِ دلِ حزیں سہی
مشقِ خرامِ ناز کر واں نہ سہی، یہیں سہی"

روزِ ازل سے ہے یہی سلسلۂ درازِ عشق — زمزمہ سے دور ہو کے بھی بجتا رہا ہے سازِ عشق
کم نہ ہو بیخودی میں بھی مرتبۂ نیازِ عشق — "سر نہیں سنگِ در تو ہے ترک نہ کر نمازِ عشق
خاکِ جبیں سے کام لے سجدۂ بے جبیں سہی"

میں تو کرونگا اعتبار آیئے یا نہ آیئے — دل بھی رہے گا بیقرار آیئے یا نہ آیئے
آپ کو ہے یہ اختیار آیئے یا نہ آیئے — "میں ہوں رہینِ انتظار آیئے یا نہ آیئے
اپنے یقیں کو کیا کروں آپ کی ہاں "نہیں" سہی

جھوٹ سمجھ کے ٹال دیں شکوۂ ناروا کہیں — ڈال کے ابروؤں پہ بل "تہمت و افترا" کہیں
یا وہ جفا و ظلم کو لطف کہیں، عطا کہیں — "سن تو لیا ہے حالِ دل دیکھیے سن کے کیا کہیں
پھر مرے منہ کی بات ہے کیسی ہی دلنشیں سہی"

آرزوؤں کا گلستاں برقِ بلا کے ہے سپرد — دل کہ جہانِ شوق تھا تیری ادا کے ہے سپرد
اس کا جو چاہے حشر کر شانِ جفا کے ہے سپرد — "فانیؔ زار پر کرم تیری رضا کے ہے سپرد
ایک نگاہ اور اگر یہ بھی نہیں نہیں سہی"

غزل

از جناب مولوی عبدالغفور سلیماں

الٰہی لغزشِ دل حاملِ میخانہ ہو جائے — یہ شیشہ ٹوٹ جائے ٹوٹ کر پیمانہ ہو جائے
مجھے تو سجدہ نذرِ دوست کرنا ہے بہر صورت — وہ سوئے کعبہ ہو یا جانبِ بتخانہ ہو جائے
ادھر آ جائیے شمعِ سحر ہم خود بجھا دینگے — کہیں ایسا نہ ہو سر آپ کے پروانہ ہو جائے
یہاں جگنو بھی جلتے ہیں اور پروانے بھی جلتے ہیں — شہیدِ ناز کی تربت ہی کیوں افسانہ ہو جائے
سلیماں آج کل اہلِ خرد کی جستجو کیسی؟
غنیمت ہے جو صدیوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

بخار

دلچسپ افسانہ

جناب شبیر حسین رضوی بی۔اے

"ایک سو دو!" نزہت نے تھرمامیٹر کو بجلی کی روشنی میں بغور دیکھ کر پڑھا۔ "بخار بڑھ رہا ہے!"

ریحانہ مسکرانے لگی۔ اسے اپنے بخار سے محبت تھی۔ بے انتہا محبت۔ وہ چاہتی تھی کہ بخار بڑھے۔ اس قدر بڑھے کہ سب اس کی زندگی سے مایوس ہو جائیں خاص طور پر اس کا شوہر رفیق۔ کیسی ہلچل مچ جائیگی اس وقت ریحانہ نے سوچنا شروع کر دیا کسی کو اپنے سر پیر کی خبر نہ ہوگی۔ سب کی آنکھوں میں آنسو ہونگے۔ سب میرے ہونٹوں کی جنبش پر نظریں جمائے بے چینی سے یہ سننے کے منتظر ہوں گے کہ میں کیا کہتی ہوں۔ اس وقت میری حیثیت دیش کے بت سے کم نہ ہوگی۔ جس کی پیشین گوئی سن کر بڑے بڑے بادشاہ سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔

ریحانہ کا کمزور دل جوش مسرت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن نزہت کی طرف مسکرا کر دیکھا جو بجلی گل کر کے ایک خوشنما لیمپ روشن کر رہی تھی۔ لیمپ کی مدھم نیلی روشنی نے کمرہ کی تاریک فضا میں پھیل کر ایک عجیب فردوس آگیں منظر پیدا کر دیا۔ برہنہ دیواریں خوشنما ریشمی پردے۔ فرنیچر سب کے سب ہلکے نیلے رنگ میں نہا گئے ——— اور نزہت بھی ——— اس کی پیاری بہن نزہت، وہ کیسی خوبصورت، کیسی نیک؟ در حقیقت نیک تھی۔

"نزہت!" مریضہ نے نقاہت کے ساتھ کہا ——— "میرے پاس آجاؤ۔ میری اچھی بہن!"

نزہت مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ روحانی کرب اس کے خوشنما ہونٹوں پر تھرتھراہٹ پیدا کر رہا تھا۔ ریحانہ نے محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبا یا ——— اپنے گرم اور کمزور ہاتھ میں جس کی تمام رگیں ابھر آئی تھیں۔

"باجی!" دفعتہ نزہت نے بیقرار ہو کر کہا۔ اور اپنی بیمار بہن کے سینہ سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ ریحانہ نے اپنے کمزور بازو اس کے کانپتے ہوئے جسم کے گرد حائل کر دیئے۔ اور محبت کے جوش سے بیقرار ہو کر اس کے ... پر منہ رکھدیا۔

"پگلی!" اس نے محبت کے ساتھ نرم اور دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "روتی کیوں ہے؟ میں بہت جلد اچھی ہو جاؤنگی ——— مجھے ہوا ہی کیا ہے؟ ... وہ دن یاد ہیں نزہت جب ہم تم اسپتال اسپتال کھیلا کرتے تھے۔ میں بیمار بنتی تھی اور تم ڈاکٹر۔ اف نزہت میں تو اب بھی یاد کر کے ہنسی سے لوٹ پوٹ جاتی ہوں۔ کیسا رعب دار چہرہ بنا لیتی تھی تو ——— وہ بھاری مردانہ آواز میں تیرا کہنا کہ اب تم بالکل اچھی ہو۔ اٹھو، کھیلو، کودو۔ اور جب میں کہتی تھی نہیں ڈاکٹر صاحب میں ابھی اچھی نہیں ہوئی میرے پیٹ میں بڑا درد ہے" تو تو کیسے روٹھ جایا کرتی تھی۔ آنکھوں سے غصہ کے آنسو جاری ہو جایا کرتے تھے۔ اور میں لاکھوں منتوں اور خوشامدوں سے تجھے مناتی تھی ——— اف ایک دفعہ تو نے بھائی جان کی پنسل ہی غصہ میں توڑ ڈالی تھی۔ جب میں نے کہا کہ یہ تھرمامیٹر غلط ہے۔ اس کا پارہ تو چڑھتا ہی نہیں ... لیکن اب تو روتی کیوں ہے۔ وہی کھیل تو ہے جو ہم اب بھی کھیل رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب تیرے پاس اصلی تھرمامیٹر ہے"

"میری باجی!" نزہت نے سسکتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ آپ خود زندہ نہیں رہنا چاہتیں۔ اسی لئے کوئی دوا اثر نہیں کرتی۔ اچھی باجی! آپ کیوں نہیں جینا چاہتیں۔ اتنے دن ہم آپ ساتھ رہے۔ اب آپ کیوں مجھے اکیلی چھوڑ رہی ہیں ——— کیوں؟ میں نے کیا خطا کی ہے؟"

جوش گریہ سے نزہت کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ وہ پوری طاقت کے ساتھ اپنی بہن سے چمٹ کر رونے لگی۔ لیکن اب ریحانہ اس کے آنسوؤں کی طرف متوجہ نہ تھی۔ اس کے سینہ میں غصہ کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ آنکھیں نفرت سے چمک رہی تھیں "ڈاکٹر! ڈاکٹر! ڈاکٹر!!" اس نے غصہ سے دانت پیس کر سوچنا شروع کیا۔ "میں اسے ہرگز کامیاب نہ ہونے دونگی۔ علاج کرنا تو خود نہیں جانتے اور الزام

میرے اوپر رکھتے ہیں۔ اپنی شکست کا بدلہ میرے خلاف ان کے کان بھر کر لینا چاہتے ہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ دیکھوں تو وہ مجھے بدنام کرکے کیسے اچھا کر لیتے ہیں؟"

نزہت کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ وہ بیٹھ کر بولی "میری اچھی باجی وعدہ کیجئے کہ اب آپ جلد اچھی ہو جائیں گی۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ آپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔"

"اچھا اچھا!" ریحانہ نے بے پروائی کی شان سے کہا "اچھی ہو جاؤنگی اور بقول ڈاکٹر صاحب مجھے ہوا ہی کیا ہے۔ پھیپھڑے بالکل ٹھیک۔ دل میں کوئی خرابی نہیں۔ جگر کا فعل بھی ٹھیک ہے۔ معدہ بکری کے معدہ کا مقابلہ کر رہا ہے ۔۔۔ پھر شکایت ہی کیا ہے۔ کیسے اچھے ڈاکٹر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی کباڑیہ کی دکان سے ڈپلوما خرید لائے ہیں۔ کھانسی بخار کا علاج تو کر نہیں سکتے۔ چلے ہیں مجھے اچھا کرنے۔ چہ خوش ۔۔۔!"

نزہت نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ زچ ہو کر اٹھی اور خاموش کمرے سے چلی گئی ۔۔۔

ریحانہ نے کروٹ لیکر اوڑھنی چادر ٹھوڑی تک اوڑھ لی۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا۔ اور نتیجہ سے خوش ہوئی۔ بخار بڑھ رہا تھا۔ "ہونھ"! اس نے زیر لب کہا۔ "بڑے آئے وہاں سے ڈاکٹر بن کر۔ ہینڈ کی راز کام پیدا شدۂ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے ڈاکٹر تو مجھے اچھا کر نہیں سکتے۔ یہ چلے ہیں اچھا کرنے ۔۔۔ بیماری پر تو کچھ بس نہیں چلتا۔ غصہ میرے اوپر اتارتے ہیں۔ دوائیں کونین بھر بھر کر دیتے ہیں کہ مجھے کڑوی لگے۔ بلا سے، اس سے میرا ہوتا کیا ہے ..... وہ "منت خوشامد کرتے ہیں۔ نزہت ہاتھ جوڑتی ہے رو رو کر اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو میں پی لیتی ہوں ۔۔۔ نہیں تو ان کی دعا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہ ۔۔۔ کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ یہ بیماری بھی کہیں کونین سے اچھی ہوئی ہے۔ یہ تو نئی بیماری ہے ابھی تک اس کا علاج ہی دریافت نہیں ہوا۔"

ریحانہ کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ برابر والے کمرے میں کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا ۔۔۔ کون ہو سکتا ہے؟ ملازم کوٹھی کے باہر رہتے تھے۔ دروازے مقفل ہو چکے تھے ..... پھر؟ سوا "ان" کے اور نزہت کے کوئی مکان میں موجود نہ تھا ۔۔۔ تو کیا وہی سرگوشیاں کر رہے ہیں؟ ...... اور اندھیرے کمرے میں .... اتنی مدد ہو گئی ہے نزہت! ریحانہ نے غصہ میں سوچا ۔۔۔ اتنی آزاد ۔۔۔ مانا کہ رشتہ ایسا ہے مگر پھر بھی ....."

نقرئی آواز کا ایک شیریں قہقہہ فضا پر چھا گیا۔ رہ رہ کے ٹھوک جاتے رہے۔ آواز نزہت کی تھی ...... اور وہ قہقہہ ہنستے ہنستے چپ کیوں ہو گئی! جیسے کسی نے اچانک منہ بند کر دیا ہو ۔۔۔ کیا؟ نہیں نہیں یہ ناممکن ہے۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ نزہت کو اپنی سگی بہن سمجھتے ہیں۔

ریحانہ اپنی بدگمانی پر شرمندہ ہو رہی تھی کہ پھر ایک قہقہہ بلند ہوا ۔۔۔ اور اسی طرح اچانک ختم ہو گیا۔ ریحانہ کا خون کھولنے لگا ۔۔۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں ۔۔۔ اعضا میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔ دل بیٹھ گیا جیسے کسی آہنی پنجہ نے زور سے دبا دیا ہے۔ اف! ۔۔۔ ایسی بے شرمی! ۔۔۔ ایسا مکر ۔۔۔ ابھی دوپہر کو میرے سینہ پر سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی اور اب میرے ہی گھر کو آگ لگا رہی ہے ..... لیکن ٹھہر تو سہی! میں یہ ہرگز نہ ہونے دونگی ..... میں خاموش نہیں رہ سکتی ۔۔۔ ابھی، اسی وقت کھڑے کھڑے گھر سے نہ نکال دیا ہو تو میرا نام ریحانہ نہیں۔ چڑیل۔ ڈائن!

یہ کہہ کر ریحانہ اٹھی اور جوشِ غضب میں دیوانہ وار پیر پٹک پٹک کر جوتے پہننے لگی۔ پیر کہیں رکھتی تھی پڑتا کہیں تھا۔ دوپٹہ فرش پر لٹک رہا تھا۔ لمبے سیاہ بالوں کی کھلی ہوئی لٹیں تمتمائے ہوئے سرخ رخساروں پر بار بار بکھر جاتی تھیں جنہیں وہ غصے میں ایک ہاتھ سے جھٹک کر پیچھے پھینک دیتی تھی ۔۔۔ بدقت تمام بائیں پیر کا جوتا داہنے پیر میں اور داہنے پیر کا بائیں پیر میں پہن کر دروازے کی طرف بڑھی جو دونوں کمروں کی درمیانہ دیوار میں تھا۔ دروازے کے قریب پہنچکر وہ رک گئی۔ رفیق اور نزہت کچھ باتیں کر رہے تھے۔ اس نے درازے سے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ رفیق آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"رفتہ رفتہ ریحانہ نے میری تمام امیدوں کا خون کر دیا میں محبت اور نرمی کا بھوکا تھا لیکن اس نے مجھ سے محبت نہیں کی، وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی ۔۔۔ میری ہر بات کا جواب چڑچڑا کر دیتی تھی۔ میں بھلی بات بھی کہتا تو اسے بری لگتی تھی۔ میں یہ بھی برداشت کر لیتا لیکن وہ میرے اظہارِ محبت سے چڑھتی تھی نفرت سے منہ پھیر لیتی تھی ....."

ریحانہ اس کے آگے نہ سن سکی۔ شرم، غصہ اور شکایت کے جذبات نے بیک وقت دل میں ہجوم کرکے اس کو از خود رفتہ

کر دیا تھا۔ کیسا مریح بہتان تھا اس کے اوپر؟ ——— کیسا سفید جھوٹ! اس نے رفیق سے صرف محبت ہی نہ کی بلکہ اسے پوجا بھی تھا۔ کیا یہی صلہ تھا اس کا؟ ——— کیا؟

ریحانہ کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ساری احتیاط کو پس پشت ڈال کر رفیق اب بلند آواز میں بول رہا تھا ——— اُف! حد ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر اس کی ذلت و رسوائی اور کیا ہو سکتی تھی اتنی بھی پروا باقی نہ تھی کہ شاید بدنصیب ریحانہ سُن رہی ہو۔ بیماری سے لب گور ہے۔ شاید یہ صدمہ نہ برداشت کر سکے ——— لیکن وہ اور چاہتے ہی کیا ہیں؛ ریحانہ تو ان کی راہ میں کانٹا ہے۔

ریحانہ یہ سوچ کر رو نے لگی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اب نہ اُسے غم تھا نہ غصہ، نہ نفرت تھی نہ شکایت ——— بس ایک خلا تھا ——— وسیع اور ناپیدا کنار ——— تاریک سنسان اور تھکا دینے والا، جو اُسے دل میں محسوس ہو رہا تھا ——— شکست خوردہ خاموش، لڑکھڑاتی ہوئی ——— سر نہوڑائے شانے جھکائے ——— وہ دروازہ چھوڑ کر ہٹی۔ لیکن دو قدم چل کر پیر خود بخود تھم گئے۔ وہ واپس آئی اور پھر دروازے میں کان لگا دیئے۔

رفیق کہہ رہا تھا ——— "جس طرح بھوک سے بیتاب طائر کسی کی پھنکی میں دانہ دیکھ کر لوٹ پڑتا ہے۔ اسی طرح میرا دل بیقرار ہو کر تمہاری مٹھی میں چلا گیا۔ خواہ تم اقرار نہ کرو لیکن تم میرا دل لے کر بہت خوش ہوئیں۔ کلی بڑھی اور بڑھ کر پھول ہو گئی ——— جو الھڑ چنچل لڑکی یہاں آئی تھی غایب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک عورت نے لے لی۔ نہیں نہیں، ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کرو۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے تم کو خبر نہ ہو۔ مگر وہی عورت تمہاری آنکھوں سے جھانک کر مسکراتی ہے ——— وہی تمہارے ہونٹوں پر رقص کر کے بلاتی ہے اشارے کرتی ہے ..... وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تم اسے روک نہیں سکتیں۔ اسے منع نہیں کر سکتیں۔ وہ تمہارا کہنا نہیں مانے گی ——— میری ہے ... میرے پاس ضرور آئے گی۔ نزہت! اس سے کہو میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دے ——— میرے پاس چلی آئے۔ آہ"

ریحانہ کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا ——— اس نے دانتوں سے نیچے کا ہونٹ دبا لیا اور اپنی آنکھوں میں ایک خونین عہد کے آثار لئے ہوئے بستر کی طرف بڑھی۔ اب زندگی بیکار تھی۔ بالکل بیکار! ——— وہ خودکشی کر لیگی ——— وہ پھر ٹھٹک کر رک گئی۔ رفیق اس کا نام لے رہا تھا ——— ریحانہ نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

" ——— نہیں! تم اطمینان رکھو۔ بالکل تکلیف نہ ہو گی ——— اثر فوراً اثر ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے اندر جسم کا سارا خون جم جاتا ہے۔ دل کی حرکت رک جاتی ہے اور بس! ——— بڑے سے بڑا ڈاکٹر لاکھ پوسٹ مارٹم کرے۔ زہر کا پتہ نہیں چل سکتا۔ یہ راہ کا کانٹا ہٹ جائے تو بس تم ہو اور تمہارا یہ جاں نثار ——— اچھا اب تم جاؤ ——— اب میں انجکشن تیار کرنے جا رہا ہوں ——— رات زیادہ آ گئی۔ خدا حافظ!"

ریحانہ اس طرح کانپ رہی تھی جیسے تیز ہوا میں شمع کی لو کانپتی ہے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو کر چمکنے لگے آنکھوں سے دہشت ٹپکنے لگی۔ حسین چہرہ خوف سے بدنما ہو گیا ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ دل بیٹھنے لگا۔ رفیق اس کا شوہر ——— اس کا محافظ، اسے زہر دینے جا رہا تھا۔ اور خود اس کی بہن ——— نزہت اس مجرمانہ سازش میں شریک تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے خود یہ شرط لگائی ہو۔

ریحانہ کو اب اپنے عمل پر اختیار باقی نہ تھا ——— اس نے آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ ——— دروازے کا ایک پٹ ہٹایا ——— اور جھانک کر دیکھنے لگی ——— کمرہ بالکل تاریک تھا۔ صرف ایک سپرٹ سے جلنے والے لیمپ کی لَو گھٹا ٹوپ اندھیرے پر غالب آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جس سے کمرہ بجائے روشن ہونے کے اور بھیانک ہو گیا تھا۔ دیواروں پر لمبے لمبے اژدہے لوٹ رہے تھے ——— لہرا رہے تھے۔ اور مُنہ کھول کھول کر اس کی طرف لپکتے تھے لیمپ کمرے کے بیچوں بیچ ایک چوبی میز پر رکھا ہوا تھا۔ رفیق ریحانہ کی جانب پشت کئے کھڑا تھا۔ سفید پتلون پہنے ——— دفعتہً ریحانہ کا دل خوف سے اچھلنے لگا۔ کمر سے اوپر رفیق کا جسم سیاہ ہو گیا تھا ——— خداوندا! یہ کیا ———؟ وہ دفعتہً سیاہ کیوں ہو گیا۔ اف! یہ غضب الٰہی کا کرشمہ ہے ..... قدرت کا

انتقام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور اسے اب بھی تنبیہ نہیں ہوتی! یہ اس کے ہاتھ میں کیا چیز چمک رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ انجکشن کی سوئی! — ریحانہ کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا — خوف و دہشت نے حواس گم کر دیئے - پنڈلیاں کانپنے لگیں - دانت کٹکٹانے لگے - اس نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے بستر کی طرف بھاگی — بے تحاشا — بدحواس — قریب پہنچکر اس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا - لیکن فوراً ہی ایک دردناک چیخ مار کر اچھل پڑی — اسے سانپ نے کاٹ لیا تھا - اف نہیں — یہ تو سانپ نہیں تھرمامیٹر تھا، ریحانہ نے تھرمامیٹر اٹھا کر پھینک دیا - اسی کمبخت نے اس کے دل میں بیمار رہنے کا شوق پیدا کیا — اسی کی بدولت رفیق، اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا - اور وہ اتنی بڑی کوٹھی میں اس کے ساتھ تنہا تھی — کوئی دوسری ہستی تھی بھی تو اس کی بہن کی — ڈائن تھی — اس کے خون سے اپنی مانگ میں سیندور بھرنا چاہتی تھی - آہ کاش وہ اپنے گھر میں ہوتی — اپنی امی کے پاس پھر کون اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا تھا — ؟ اور اس کا بھائی جمیل — ؟ کاش وہ آ جاتا — ! کون ؟

ریحانہ کا دل دھک دھک کرنے لگا - جسم سرد ہو گیا - قدموں کی آہٹ — کوئی آ رہا تھا — کوئی آ رہا تھا — اس کا بھائی — یا رفیق — نہیں یہ رفیق ہی تھا — رفیق، اس کا قاتل — ایک دردناک چیخ ریحانہ کے منہ سے نکلی — اور سناٹے کو چیرتی ہوئی سارے مکان میں پھیل گئی — وہ بھاگی بے تحاشہ — سر و پا سے بے خبر — اف! دروازہ بند تھا — چڑیل - ڈائن — جاتے جاتے ہوئے اسے باہر سے بند کر گئی تھی — اب وہ بھاگ بھی نہ سکتی تھی — اسے مرنا ہو گا - ریحانہ پر غشی کی حالت طاری ہو رہی تھی — ٹانگیں کانپ رہی تھیں — وہ فرش پر گر پڑی — ہانپتی ہوئی — کانپتی ہوئی — لیکن موت کے خوف نے اسے آہنی عزم دے دیا تھا — وہ جبراً اٹھی — نہیں اس وقت اسے غش نہ آنا چاہئے - یہ سوچکر وہ پھر اپنے بستر کی طرف بڑھی — برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا - ریحانہ چونک کر پلٹی، سفید پتلون — نیلی بش شرٹ — ہاتھ میں انجکشن کی سوئی — ہاں! یہ رفیق تھا - اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں — ریحانہ نے دوڑ کر اپنے آپ کو اس کے قدموں پر گرا دیا "رفیق! میرے پیارے!" اس نے رفیق کے گھٹنوں کو پکڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا — "مجھے کیوں مارتے ہو؟ میں تم سے محبت کرتی ہوں — رفیق! میری جان بخش دو — مجھے جانے دو — میں اسی وقت امی کے پاس چلی جاؤنگی — تم نزہت سے شادی کر لینا میں کچھ نہ کہوں گی — رفیق! رفیق — بولتے کیوں نہیں؟"

"گھبراؤ نہیں ریحانہ" رفیق نے اس کا بازو تھام کر اٹھاتے ہوئے کہا — "کون کہتا ہے کہ میں تمہیں مارنا چاہتا ہوں؟ یہ تو دوا ہے — تم اس سے اچھی ہو جاؤ گی — ادھر آؤ ڈرو نہیں"

ریحانہ رفیق سے لپٹ گئی - اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"رفیق! مجھے جان سے نہ مارو —" اس نے رفیق کی گردن میں باہیں ڈال کر کہا — "میں نزہت کو — اف! یہ کیا؟ سوئی!" اس کے برہنہ بازو میں سوئی چبھ رہی تھی — ریحانہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی —

"تمہارے تڑپنے اور گڑگڑانے سے دل کے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے" رفیق نے ریحانہ کو سینہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا کرتا سوا اس کے کوئی چارہ نہ تھا — تمہاری آنکھوں میں موت کی خوفناک تصویر پھرا کر از سر نو تمہارے دل میں زندہ رہنے کا شوق پیدا کرنا تھا — ڈاکٹر صاحب جواب دے چکے تھے — کوئی دوا اثر ہی نہ کرتی تھی — اور اثر کرتی کیونکر جب تمہاری فطرت نے بیماری سے جنگ کرنے کے بجائے اس سے سازش کر رکھی تھی اب دیکھنا کتنی جلدی اچھی ہوتی ہو"

ریحانہ رفیق کے شانے پر سر رکھے ہوئے مسکرا رہی تھی -

"اور ہاں —!" رفیق نے کہا "نزہت کو اگر تسلی دے دینا وہ بہت ڈری ہوئی ہے اُف! کیسی شرمیلی لڑکی ہے وہ — میری محبت کی فرضی داستان سُن سُن کر پانی پانی ہوئی جا رہی تھی — شروع سے آخر تک مجھ سے دس گز کے فاصلے پر بیٹھی رہی - حالانکہ میں دن ہی کو اس سارے "ناٹک" کا حال بتا چکا تھا"

"بڑے شریر ہو" ریحانہ نے رفیق کے بازو میں چٹکی لے کر کہا — "میری بہن سے میری شکایت کرتے ہوئے شرم بھی نہ آئی تمہیں؟"

رفیق نے ریحانہ کو کیا جواب دیا اور کیونکر منایا یہ معلوم کرنے کی ناظرین کو کوئی ضرورت نہیں!

ایک آدمی کی قیمت پانچ روپے

علم کیمسٹری کے ماہروں نے انسانی جسم کے اجزا کی قیمت چھ روپے بتائی ہے گویا ایک پورا انسان جو اپنے آپ کو مرد کہے چھ روپے میں فروخت ہو سکتا ہے مگر ایسے انسان جو اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم سے چربی۔ فاسفورس۔ چونا۔ شکر۔ فولاد۔ منگنیز۔ گندھک نکال دیتے ہیں ان کی قیمت دو پیسہ بھی نہیں رہتی۔

بچپن کی بری عادتیں ہوں یا جوانی کی بدچلنی ہو ان سے تمام ڈھانچہ بگڑ جاتا ہے جسم سے اوپر کی سات چیزیں قدرت نے مطابق ہر انسانی مشین کو چلانے کیلئے دی ہیں ان کو جب کوئی بداندیش انسان ضائع کر دیتا ہے تو وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قوت مردانہ کی کمزوری۔ ندامت۔ سستی۔ وقت سے پہلے بڑھاپا۔ کام کرنے کے بعد تکان کا محسوس ہونا جیسی بیماریاں آدبا تی ہیں مرد اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتے کیونکہ ان کی انرجی جواب دے دیتی ہے اور شادی کے نام سے گھبرانے لگتے ہیں۔

جسم میں ان قیمتی اجزا کو سائنٹفک طریقے سے دوبارہ داخل کر کے بہت جلد گئی ہوئی جوانی کو واپس لانے کا راز معلوم

سات دن میں جوانی کس طرح مل سکتی ہے؟

بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ جوانی کو لوٹانے کا علاج صرف سات دن میں ہو جاتا ہے مگر ان سات دنوں کے اندر پرہیز بہت ضروری ہے کیونکہ اس طریقہ سے یہ علاج کامیاب ہو سکتا ہے اس لئے صرف انہی لوگوں کو یہ کورس استعمال کرنا چاہئے جو سات دن پرہیز جاری رکھنے کا اقرار کریں اس علاج میں دو دوائیں ہوتی ہیں ایک کھانے کی اور ایک لگانے کی دونوں دوائیوں کے کورس کا نام "ری جوین" ہے کھانے کی دوا کی پہلی خوراک حلق سے اتری اور اس نے تمام اعصاب کو ہوشیار کرنا شروع کر دیا اور کمزوری بدن سے نکالنا شروع کر دیا جیسے گند دور کر دی۔ لگانے کی دوا بھی اپنے ایک قطرے کا کمال دکھاتی ہے مریض خود حیرت میں ہے کیونکہ اس میں بجلی کی طرح لہریں دوڑنے لگتی ہیں اور طاقت کا سمندر ابل پڑتا ہے۔ اس کورس میں عجیب و غریب صفات ہیں اگر کوئی تندرست انسان بھی ایک دفعہ استعمال کرے تو جوانی کا پورا سماں دیکھ لے۔

گارنٹی } اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ ہمارے ری جوین کورس سے اگر سات دن میں انسان جوان نہ ہو تو قیمت واپس کر دی جاتی ہے اور ایک پیسہ رکھنا برا سمجھا جاتا ہے۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ۔

(یہ کورس صرف انہی لوگوں کو بھیجا جائے گا جو سات دن تک صبر سے کام لینے کا اقرار کریں گے)

پتہ

اکسیری دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۱ کلاں محل (دے ایل) دہلی